حسینہ اثیر۔ جبل پور

خلک پہ ہمارے قدم آ گئے ہیں
ستارے ہیں لرزاں کہ ہم آ گئے ہیں
نہ ہمدم، نہ مونس، نہ غم خوار کوئی
کہاں یہ ہمارے قدم آ گئے ہیں
کبھی میری قسمت ہی اُلجھی رہی ہے
کبھی زلفِ جاناں میں خم آ گئے ہیں
سنبھل ساقیا! رنگِ محفل نہ بدلے
کہ لغزش میں اپنے قدم آ گئے ہیں
اثیر! اپنی منزل پہ پہنچیں تو کیسے
سرِ راہ دیرِ حرم آ گئے ہیں

حافظ مظفر حسین تاباں کاشمی

حُسن کی رنگینیاں کچھ یوں نمایاں ہو گئیں
جو نظر میری نظر میں حجاب روئے جاناں ہو گئیں
تھا فروغِ شمع میں کس کی محبت کا فروغ
سینکڑوں دل جانیں نثارِ شمعِ سوزاں ہو گئیں
یہ ہے اُن کے رُوئے روشن کے تصور کا کمال
ہجر کی تاریک راتیں جلوہ ساماں ہو گئیں
اب کسی کے بارِ احسان سے دبا جاتا ہوں میں
یوں تو میری مشکلیں ہونے کو آساں ہو گئیں
کیا محبت کیا مروت کیا صداقت کیا وفا
اب یہ سب باتیں تو زیبِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
رہ گئی تاباںؔ قیامت میں ہماری آبرو
رحمتیں جب پردہ پوشِ داغِ عصیاں ہو گئیں

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

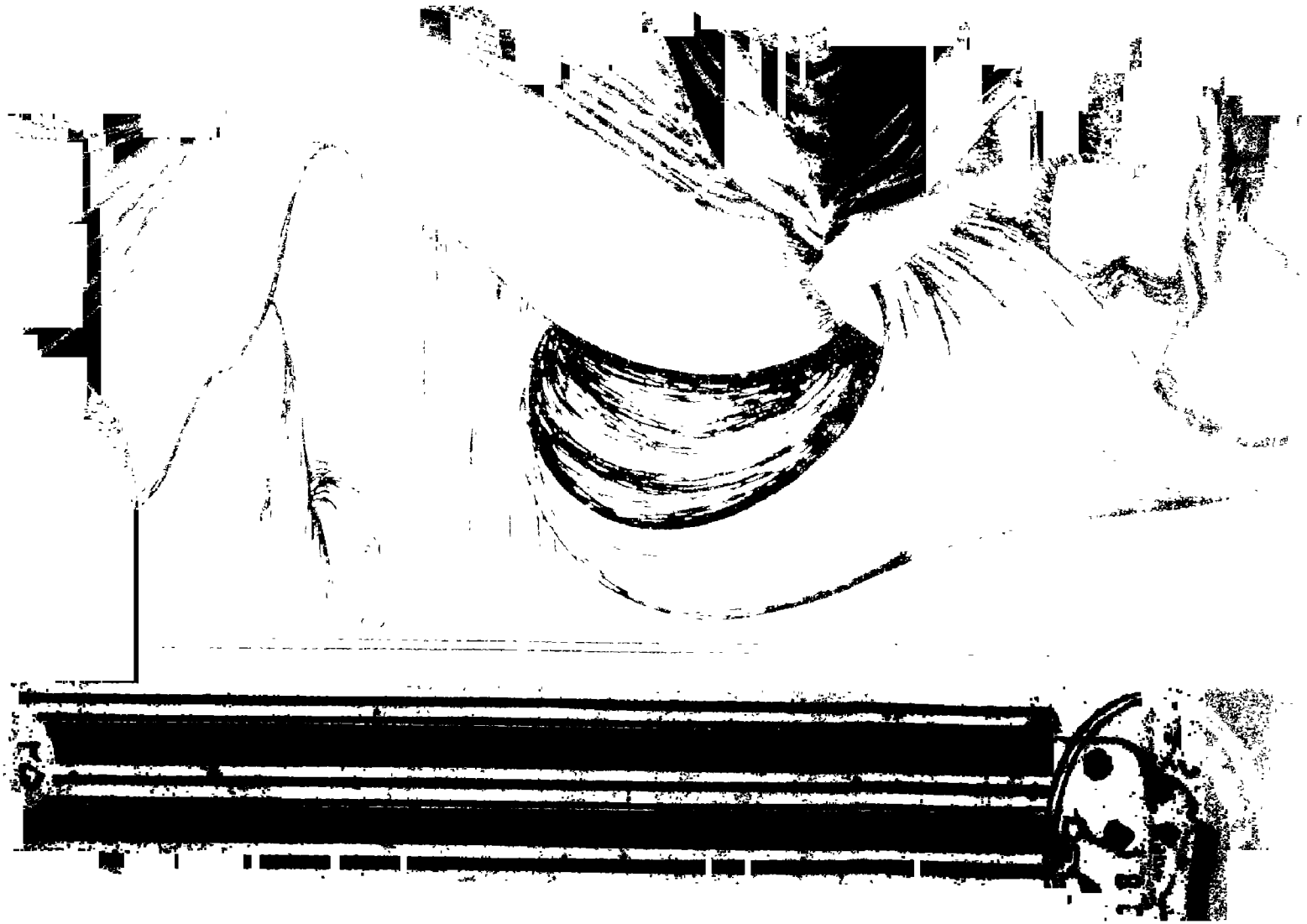

تشنہ محبت

کیف جھانسوی

دنیا کا یہ دستور بھی کتنا عجیب و غریب ہے کہ جو چیز انسان کی دسترس سے باہر ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس کے قدموں میں آجائے اُسے وہ ٹھکرا دیتا ہے۔ ریحانہ کی سرگذشت بھی اسی دستور دیرینہ کی عکاسی تھی وہ عارف سے محبت کرتی تھی۔ کسی حد تک اس کی محبت عبادت کا درجہ بھی حاصل کر چکی تھی۔ اس کے دل و دماغ عارف کے حسین تصورات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے کوئی لمحہ ایسا نہ ہوتا جو عارف کی یاد سے خالی جاتا ہو۔ اس کے باوجود بھی وہ عارف کو حاصل نہ کر سکی۔ اگر وہ چاہتی تو اپنے ہم جماعت نوجوانوں میں سے کسی ایسے کو اپنا گرویدہ بنا سکتی تھی جو عارف سے کہیں وجیہہ شکیل صاحب دولت و جائداد ہوتا اور جسے احترام اس کے ناز اٹھاتا۔ لیکن نہیں، جب اُسے اس نوعیت کے خیالات اپنے اذیت ناک محاصرے میں لینا چاہتے تھے تو وہ اپنے پر نفرین کرنے لگتی تھی۔ اور گھبرا کر عارف کی تصویر کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا کرتی تھی۔ خدا جانے عارف کے اندر اس نے کون سی ایسی خصوصیت پائی تھی کہ کسی قیمت پر بھی وہ اس کی تسکین بخش یاد سے غافل رہنے پر آمادہ نہ تھی اس کے برعکس عارف پھوٹی آنکھ بھی اس کی جانب نہ دیکھتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُسے اس سے نفرت تھی۔ نفرت کا سبب جسم کی خوبصورتی یا بدصورتی کا قطعی حامل نہ تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ریحانہ ایک مغرب زدہ لڑکی تھی۔ جو فیشن جدید کی دلدادہ اور پرستار تھی۔ جہاں سے اسے قطعی گریز تھا شارع عام پر سولہ سنگار کر کے نکلتی یا یونیورسٹی میں بے جھجک آتی تو ایسے تنگ و چست لباس میں زیب تن کئے آتی تھی کہ جسم کا زیر و بم واضح طور پر عیاں ہوتا تھا اہل نظر دل تھام کر رہ جاتے۔ دل شدت تو کیا، راہ کا مزدور بھی اس کی عنبریں زلفوں کے گھنیرے سایہ میں دو گھڑی کے لئے اپنی تھکن دور کرنے کا تمنی ہو جاتا تھا۔

عارف کے متنفر ہونے کی یہ ہی ایک خاص وجہ تھی۔ جس کا اظہار اس نے کبھی کھل کر نہ کیا تھا۔ البتہ کنایتہً اسے فہمائش کر چکا تھا کہ وہ ایسے تنگ و چست لباس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دے۔ ریحانہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر رہی یا قصداً اس نے ایسا نہیں کیا بہرکیف اس نے اپنے طرز معاشرت میں کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ عارف کی برہمی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ تکدر کی چنگاریاں شعلوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

امتحانات کے بعد یونیورسٹی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ایک دن ریحانہ اپنی چند ہم جماعت لڑکیوں کے ہمراہ پکچر دیکھنے کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر عارف پر پڑی جی تو چاہا کہ جا کر لپٹ جائے۔ لیکن اس خیال نے اس کی ہمت کو پست کر دیا کہ مبادا کہیں ہم جماعت لڑکیاں اس کا مضحکہ نہ اڑائیں۔ لہٰذا اندھے سر کا بہانہ کر کے وہ ان سے معذرت کے ساتھ جدا ہو کر عارف کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

کچھ دور چلنے کے بعد عارف ایک پارک میں تفریحاً داخل ہو گیا اور پارک کے جس گوشہ میں سیر کرنے والوں کی آمد و رفت کم تھی وہیں ایک بنچ پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ریحانہ نے سلسلۂ کلام شروع کرنے کی غرض سے ہچکی کہا:۔ "تسلیم۔!"

عارف نے چونک کر پیچھے نظر کر دیکھا تو ریحانہ کو بصد احترام سر نیاز خم کئے موجود پایا۔

"اوہو۔ تو آپ ہیں۔ آداب۔!"

عارف نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ ریحانہ بیباک اور شوخ دیدہ ہونے کے باوجود بھی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ عارف نے اسے خاموش پا کر قدرے لہجہ میں سوال کیا "کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟"

"خدمت؟ میری۔ نہیں۔ نہیں۔!"

ریحانہ اضطرار انگیز لہجہ میں بس اتنا کہہ سکی۔

"آخر آپ اس قدر گھبرا کیوں رہی ہیں۔؟"

"آپ سمجھنے کی سعی کبھی نہیں کرتے۔؟"

"نافہم جو ٹھہرا۔" عارف نے پھر ایک چٹکی لی

"نہیں۔ نہیں۔ آپ نافہم نہیں ہیں۔"

"تو پھر مجبوراً مجھے آپ کو نا سمجھ کہنا پڑے گا۔"

"آپ نے فہمائش کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔"

"بارہا کہہ چکا ہوں۔ لیکن آپ نے کبھی اپنی عقل و فہم پر زور نہیں دیا اور نہ ہی اپنے طرز معاشرت میں کوئی تبدیلی کی ہے۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔؟"

"اسی بات کا تو رونا ہے کہ جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کھلے الفاظ میں کرنا نہیں چاہتا اور اگر کروں بھی تو آپ اس پر عمل نہ کر سکیں گی۔"

"حکم دے کر تو دیکھئے۔"

"اگر انحراف کیا تو۔؟"

آپ بھی کس طرح دفاع میں حصہ لے سکتے ہیں

زیادہ مال تیار کیجئے

زیادہ کام کیجئے۔ پیداوار بڑھائیے۔ سست روی کے طریقوں کو چھوڑ دیجئے۔ کام کا ہر گھنٹہ باقاعدگی لائیے۔ اوقات کے پابند رہیے۔ یہ اضافی کوشش ہی ہے جس کی بدولت پیداوار اور ہماری دفاعی طاقت بڑھتی ہے۔

پیداوار بڑھائیے

اچھے کھیتوں سے بھرپور فصلیں اگائیے۔ پیداوار کو معقول قیمتوں پر بیچیے۔ سبھی کو خوراک میسر آئے اور کوئی ضائع نہ کرے۔

کم خرچیے

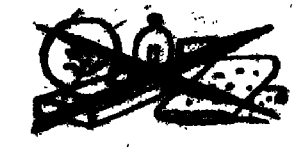

صرف ضرورت کے وقت ہی خریدیے۔ فضول خرچی سے بچیے۔ دعوتوں اور تفریحوں پر روپیہ صرف نہ کیجئے۔

زر زیادہ بچائیے

ہر ممکن بچت کیجئے۔ فالتو روپیہ نیشنل ڈیفنس سیونگز اسکیموں میں لگائیے۔ جتنا زیادہ روپیہ آپ بچائیں گے ملک کی دفاعی طاقت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی۔ جلد فتح ہوگی۔

قیمتوں کو بڑھنے سے روکیے
جانباز جوانوں کی طاقت بڑھائیے

جے ہند

PA 0114

"آپ کو کیا حق ہے جو سزا چاہیں دیں۔ میں خوشی سے برداشت کروں گی۔ میں نے بھی اپنی محبت کی نظر بازی کے متراوف قرار دوں گی۔"

"پھر کیوں شکست میری ہوگی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔؟"

"تو پھر یوں کہوں کہ مجھے اپنا اچھا برا سوچنے اور سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"اگر آپ کہہ دیتیں تو مجھے اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی کہ تمہیں اس منگنی کے لباس میں دیکھ کر ہوتی ہے۔"

"اگر آپ کو یہ لباس پسند نہیں تو بخدا میں اسے ابھی ترک کر دوں گی۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں۔؟"

"نہیں۔ ایک تشنہ محبت۔"

"میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔"

"اور میری۔؟"

"آپ کی قدر تو اسی وقت کر سکتا ہوں جب کہ آپ مغربیت کو منگنی نسائیت کو خیرباد کہہ کر ایک خالص مشرقی بیوی بن جائیں۔"

"تو سمجھ لیجئے کہ میں خالص مشرقی بن گئی۔ آج سے، نہیں بلکہ اسی وقت سے میرا طرز معاشرت مغربیت سے مشرقیت میں بدل گیا۔"

"دل سے کہہ رہی ہیں آپ۔؟"

"خدا جانے آپ کو باور کیوں نہیں آتا؟ اور نہ جانے کیوں آپ میری طبیعت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔"

"اب میں آپ کی صحبت سے بیزاری کبھی نہ برتوں گا۔ نہ آپ سے اجتناب کروں گا۔ بلکہ جس جگہ آپ کا سایہ پڑے گا۔ میں اس جگہ کو اپنا معبد سمجھ کر سجدہ کروں گا۔" حارف جذبات بہہ چکا تھا۔

"اور میں بھی آپ کو اپنا مجازی خدا تسلیم کر کے شب و روز آپ کی پرستش کیا کروں گی جیسے کہ اب تک کرتی چلی آئی ہوں۔" فرطِ جذبات سے ریحانہ کا دل بھر آیا تھا اور ہوش ربا آنکھیں اشکوں سے معمور ہو گئی تھیں۔

"بچہ ۔۔۔ ۹"

"پاگل بچہ ۔۔۔!"

"ریحانہ ۔۔۔۔ ۹" حارف کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن آواز نے ساتھ نہ دیا۔ شدت جذبات سے آواز گلے میں پھنسنے لگی اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے تڑپ کر ریحانہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

ریحانہ کو آج پہلی بار یہ نیک ساعت میسر آئی تھی خوشی سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ حارف کہا کرتے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے تمام دنیا کی دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی گئی ہو۔ آج اسے اس بات کا یقین واثق ہو گیا تھا کہ انسان کی کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ بہت سے کام لے۔ صبر و شکیب کا دامن نہ چھوڑے اور خداوند قدوس کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو۔

بقیہ افسانہ میں مرجھاؤں گا صفحہ ۲۸ سے آگے

میں ایک خوبصورت لفافہ تھا جسے انھوں نے بڑی متانت سے مجھے سونپا۔ اور کہا پڑھ لیجئے۔ یہ ناہید نے بھیجا ہے۔ میں نے خوش خوش لفافہ چاک کیا۔ مگر جوں جوں پڑھتا گیا۔ ویسے ویسے میرے حواس گم ہوتے گئے۔

"میرے پرویز! آداب و سلام

مجھے بے انتہا دکھ ہے اور حد درجہ افسوس! مگر کیا کروں حقیقت پھر حقیقت ہے چاہے کہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ مگر کسی کے اس سے مفر نہیں ۔۔۔ سب سے پہلی بات جو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ سلمہ میری عزیز ترین سہیلی بلکہ آپا ہے۔ سلمہ کے اشارے بھی میں آپ کی طرف بڑھا ہوئی۔ مقصد واضح اور صاف ہے۔ آپ کے ذاتی کردار کی مضبوطی اور پائیداری کا اندازہ و امتحان۔ مگر اس میں آپ بری طرح ناکام ہیں سلمہ کہتی آپ نے پہلے ہی کھو دیا ہے۔ اب مجھے بھی ساتھ ہی رکھئے۔ میں آپ سے ہرگز ہرگز علاج نہیں کرانا چاہتی مجھے قطعی اور صاف انکار ہے

جو شخص سلمیٰ جیسی لڑکی کو منگنی کے بعد بھی ٹھکرا سکتا ہے، کیا وہ ناہید کو شادی کے بعد نہ ٹھکرا دے گا جو سلمہ کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔ ایسا شخص میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔ آپ بات واپس لے جائیں۔"

براتی اسی جوش و خروش سے ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سارا ماحول روشن تھا مگر میرے ذہن پہ تاریکی چھا رہی تھی۔ میں نے چلایا "ناہید ایسا مت کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا" اور اندر زنانہ خانہ کی طرف بھاگا۔ مگر مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید میں کسی دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔

بقیہ افسانہ پتھر کے آنسو صفحہ ۲۶ سے آگے

محبت آپ کا سب کچھ۔" کہتے کہتے وہ پیروں پر گر گئی۔ اور میں نے اسے اٹھا لیا تھا۔ خوشی کی ایک چیخ میرے منہ سے نکل گئی تھی۔

"امی ۔۔۔ تا ۔۔۔!!!

امی صحن کمرے سے آواز دے رہی تھی۔

"آئی بابو جی، ذرا امی کو سلا رہی ہوں!"

اطلاع

اس مرتبہ طرحی کلام کے سلسلہ میں اکثر شعراء نے دس پیسے والے لفافے میں ٹوکن رکھ کر بھیجے اور ایسے تمام لفافے بیرنگ ہو کر ملے یہ لاپرواہی سرکاری چوری بھی ہے اور انتہائی خود غرضی بھی آئندہ ایسے تمام لفافے واپس کر دیئے جائیں گے

(۲) ایک سے زیادہ طرحی غزل کے ساتھ ہر مصرع کی تقطیع کر کے بھی اپنے کلام کی اہمیت ثابت فرمایا کرتے ہیں۔ انھیں کون بتائے کہ جہاں اشعار کی تقطیع بھی ہو سکتی ہے مگر کلام نہیں ہی رہتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کے کمال کا دیوانہ ہی تو ہوں، خواہ مخواہ مرعوب نہ فرمایا کریں۔

ابرار احسنی

محبوب

صرف فلمیں ہی نہیں بناتے
بلکہ وہ پردہ سیمیں پر دعائیں کرتے ہیں
ایسی دعا۔ جس میں مادر وطن کے چرنوں میں
عقیدت کے پھول بھینٹ کئے جاتے ہیں

Date _____

محبوب

کی ہر فلم میں ایک پیغام ہوتا ہے
میرے دیش کی طرف نظریں اٹھانے سے
پہلے اسے سمجھو! اسے جانو!!
"مدر انڈیا" میں انھوں نے ایک ہندوستانی ماں کے دل
اور اس کی آتما کو اجاگر کیا تھا اور اب.....
"سن آف انڈیا" میں
وہ ان شاندار روایات کو پیش کرتے ہیں جنھوں نے
اس سرزمین کے وقار اور عظمت کو بلند بنایا

محبوب پروڈکشنز کا مایہ ناز قومی شاہکار

سن آف انڈیا

گیت اکبر اور سکرین پلے کمار پانڈے ـــــ پرنٹ بائی ٹیکنی کلر
ہدایات:۔ محبوب ـــــ موسیقی:۔ نوشاد
۲۱ دسمبر کو دہلی کے ممتاز سینماؤں کے ساتھ ساتھ
یوپی اور پنجاب بھر میں نمائش ہو رہی ہے
تقسیم کار:۔ محبوب پکچرز ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی دہلی

اپنا اپنا راستہ لیا۔

"تمہارے انٹرویو کا کیا بنا ۔۔؟" سکوت ٹوٹ گیا اور اندھیرے میں آواز بکھر گئی۔

"جی ۔۔۔ انٹرویو!۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا ۔۔۔۔!" وہ ہسٹریائی مریض کی طرح قہقہے لگانے لگی تھی۔ گھریا پچھ پڑ رہا تھا کوئی پاگل ہے۔ آس پاس کے اندھیروں میں اس کے عجیب و غریب قہقہے دیر تک ٹکراتے رہے۔ پھر وہ بکھری ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔

میری بوڑھی ماں نے بھی پوچھا تھا، بیٹا انٹرویو کا کیا ہوا۔ اور تم بھی پوچھتے ہو۔ انٹرویو کا کیا بنا اور اور اسی پوچھنے کا مطلب شاید یہ ہی ہو گا کہ تمہیں ملازمت مل یا نہیں۔ تم اس وقت کما رہی ہو یا نہیں؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھلا کما نے نہ لگوں تو ۔۔۔۔ میری بوڑھی ماں، دو بھائی اور ایک بہن زندہ کیسے رہیں گے۔ آج کل میں ملازم نہ سہی، لیکن میں کماتی ضرور ہوں ۔۔۔۔ ویسے پہلے مجھے بھی انٹرویو کا انتظار رہا کرتا تھا۔ لیکن جب یہ انتظار اس بلڈنگ پر پہنچ کر یکایک بوڑھا ہو گیا اور مفلسی کے دستے نے لہریے بھن نے میرے ایک چھوٹے بھائی کو داری عدم کر دیا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرا شعور جاگ پڑا۔ بھوک جاگ پڑی اور احساس کی ساکت لہریں پھر رواں ہو آیا۔ پھر میں کمانے لگی۔ اب ہم خوشحال ہیں۔" اس کے قدم تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئے اور وہ اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

"کیسے ۔۔۔؟" وہ اس کے پیچھے لپکا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ رکی اور اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

"اب تمہیں کس طرح سمجھاؤں ۔۔۔ پرسوں آٹھ دن کی حقیقت کا نظارہ دیکھ کر تم میرے منہ پر تھوک دو گے، چانٹے لگاؤ گے اور دنیا کی سب سے ذلیل لڑکی کہو گے۔ لیکن مجھے جینا ہے۔ میری بوڑھی ماں اور بھائی بہنوں کو زندہ رہنا ہے۔ اس لئے کہ روٹی کا مسئلہ درپیش ہے۔ یہ رات کے کالے کالے اندھیرے جو تم دیکھ رہے ہو، اس میں میں اپنا نور بھرتی ہوں۔ وہ نور جس میں کسی لڑکی کے پچھتاوں کی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ ہم آنکھ مچولی کھیلنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ زندگی سے پیار اور زندہ رہنے کی جدوجہد کا نام اگر حیات ہے تو میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے سوچا تھا ہر کنواری لڑکی کی طرح میری مانگ میں بھی کہکشاں بھر جائے گی۔ میرے خوابوں کی بھی تعبیر ہو گی۔ لیکن آج میرے ارمانوں کے سپنوں کو معاشیات کی آہنی زنجیروں نے جکڑ کر اس طرح بھینچ دیا ہے کہ ان کے بند بند ریزے ہو گئے۔ یہ رات کے اندھیرے جو تم دیکھ رہے ہو، ان اندھیروں میں مجھے بہت کچھ ملتا ہے۔ میرے اس جوان اور سڈول جسم کی بدولت! جس پر کبھی کسی ایک مرد کا حق ہونے نہ الا تھا لیکن آج میں یہ حق ان سب کو بانٹتی ہوں جو مجھے دو پیسہ پیسہ دیتے ہیں۔ مجھے اپنی عصمت نیلام ہونے کی کوئی فکر نہیں۔ میں مجھے پیسہ چاہتے، ان زندگیوں کے لئے جو آج میرے زیر سایہ پرورش پا رہی ہیں۔ بھی کو دیکھ بھال، پڑھائی لکھائی اور پروان چڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ شاید تم پر بھی یہ ہی ذمہ داریاں عاید ہوں گی۔ آخر تم کب تک ملازمت کا انتظار کرو گے ۔۔۔؟ یہ انٹرویو۔ یہ ایپلائمنٹ ایکسچینج۔ یہ کال لیٹر۔ یہ سرٹیفکیٹ قابلیت سب کچھ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ ہمدردی، تسلی اور امید کے جھوٹے تانے بانے بنے ہوئے ہیں تم بھی اب ملازمت کا انتظار کرنا چھوڑ دو۔ ان اندھیروں میں جہاں جیالا پتا ہے، عورت بکتی ہے شراب بیچو! ایک ایک بوتل کی پچاس پچاس قیمت آئے گی پھر تمہارا سارا دلدر دور ہو جائے گا تم اپنا ان کے لئے دوا لا سکو گے، بھائی اور بہنوں کو پڑھا لکھا سکو گے خوش ہو گے بہت خوش!" وہ ہنستا رہا۔ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ پھر یکایک چونک اٹھا۔ آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ اس نے بکھر کر آگے پیچھے دیکھا ۔۔۔ وہ جا چکی تھی۔!

بہت دیر تک وہ اپنی جگہ پر مبہوت سا کھڑا رہا ۔۔۔ رات دم توڑ رہی تھی۔ نیلے آکاش پر کہکشاں کا حسن ماند پڑ رہا تھا اور دور مشرق کی سمت ایک سفید سی چادر اپنے دامن سے نور کی کرنیں بکھیرتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے قدم بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ جا رہا تھا، اس کے بغل میں گٹھی ہوئی بھرپور تسلی جھول رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں شراب کی کئی ایک بوتلیں بھری ہوئی ہوں ۔۔۔!

ابراحسنی کی اصلاح (صفحہ ۹ سے آگے)

میں محسن صاحب کہہ، دیدہ وغیرہ تمام اسمار ظرف مکانی کے لئے اور یہ بے محل بات ہے۔

(۷) ہم کی تکرار ہر جگہ اور ہر جگہ بے لطف "تو آفرم تو بجز کو ملا کر"، یہ تکرار ہی فضول و بے محل اور بے کیف ہے۔ علیٰ ہذا "راز غم" بھی اسی قبیل کا ہے

(۸) "تو نفس سے رہا نہ کر"۔ یہ تو کون ہے؟ شعر میں فاعل کا اظہار کرنا چاہئے کہ شیاں کو چین سے قوی واسطہ ہے باغ سے نہیں۔ باغ پھل دار کے درختوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں اگرچہ اب آشیانے یا خیاں ہی جلانے لگے ہیں۔ مگر آشیاں جلانے کی ڈیوٹی برق و صیاد سے متعلق ہے۔

۹ رکشش کی تکرار مع نہ تھی "وہ" مشورہ تھا محسن نے رات دن کہا۔ یعنی واؤ عطف فارسی و ہندی الفاظ و ترکیبات کے درمیان لائے ناجائز ہے۔ فارسی عطف یا فارسی اضافت (یا) واؤ فارسی یا واؤ ترکی یا ایک فارسی ایک عربی یا ایک فارسی ایک ترکی یا خالص محل پر واؤ عربی الفاظ کے درمیان ہو سکتی ہے۔ واؤ ہندی یا ایک فارسی ایک ہندی وغیرہ کے درمیان نہیں۔ یہاں رات دن بھی کافی تھا کہ یہاں کی بول چال ہے۔

ابر احسنی گنوری

پنجاب سنیم دہلی

جنوری
۱۹۶۳ء

جلد ۱۴
شمارہ ۱

فہرس

۱	حرف اول	آبر احسنی گنوری	۵
۲	بزم سنگھ طالب	واحد پریمی سجرپالی	۷
۳	دکھی جیدالرزاق رضا مرحوم	آزاد بارانوی	۹
۴	جناب خط	شوق اثری رام پوری	۱۰
۵	اخلاق جہنی سے رشتہ ہے ہر مشر کا فرض	بدگیندر پال صابر ایم۔اے	۱۲
۶	غزل	کمال صدیقی بلیگانوی	۱۳
۷	مشاہدات	فہیم احمد سرور	۶
۸	شاعر اعظم	ساحر عثمانی	۱۴
۹	تظمین بر غزل حضرت عزیز قریشی	حبیب الرحمن راہی	۸
۱۰	فوتیات	شہاب ناگ پوری۔ مسلم ساگری	۱۵
۱۱	"	نشتر امروہی۔ قادری کلیانی بھینی	۸
۱۲	جلال و جمال	اثر راجگیری۔ رہبر جمیدیہ	۱۶
۱۳	"	عادل ادیب۔ سید مشتاق احمد مشہدی	۸
۱۴	"	انجم عثمانی۔ قمری شوکی	۶
۱۵	آڑیچکہ گنز	بدگیندر پال ایم۔اے	۱۸
۱۶	آئینہ	ش مظہرالدین ساز	۲۳
۱۷	بیاض ہائے تمنا	اثر انصاری	۲۶
۱۸	طرحی مشاعرہ نمبر ۴ (مصنف شعر و کلام)	مرتبہ شناگر ایادی ناظم مشاعرہ	۲۷

پلا دے اُن آنکھوں سے شراب خانہ ساقی
کوئی ایسا رنگ بھر جو مے خانہ کہلائے
اہلِ مذہب کی محفل رنگ پہ ہے یہ مے ساقی
چراغِ عشق سے طاق میں روشن ہے اے حافظ
خمیرِ تشنہ لب بیٹھے ہے رندوں میں اے ساقی
گلہ کیا ہے اس کام میں وہ خوب ماہر ہیں
کہیں ایسا نہ ہو بے نوشِ مے ساری عمر جیئں
مری تصویر جب دیکھیں گے میری یاد آئے گی
جھلک جائے مرے ساقی دمِ مخمور بن جائے
تمہارا نام جب لیتے ہیں لوگ اس میں اسے دیکھیں
تصور کر کے جو اس کو دیکھ لے وہ اس کا ہو جائے
مبشر جودھپوری

سرور رکیف و مستی اپنے مستانے میں رکھ دینا
انھیں معلوم تو ہو جائے ان کا کوئی ثانی ہے
دلِ روشن کی تابانی سے منزل تک اجالا ہو
یقیناً تشنہ لب میں پھر لغت بھی آئیں گی ساقی
سراپا گوش ہو کر سن سکیں وہ درد کا قصہ
مجذوب قلندر کے مبشر کس کی قدرت ہے
ہر نبضِ شرین سوکر پیالی

نہ داغِ عشق کو دل کے ہی کاشانے میں رکھ دینا
وہ اک حادثہ آفاقی ہے دورِ محبت کا
بچایا ہے اسی نے عمر بھر آلامِ دنیا سے
تری آنکھوں سے جو پیہم رستی رہتی ہے ساقی
جبیں تو عمر بھر میری نہ پہنچی اُنکے قدموں تک
یہی تحفہ تو ہے لے سوزِ دربارِ محبت کا
دیتا کوثری

شبیہِ بادہ و پیمانہ ویرانے میں رکھ دینا
تجھے میخانہ ہی ایسا بھلا ہے تو اے ساقی
سرِ مژگاں رکھے ہیں چند آنسو کی فرقت میں
جو پہنچے رحم کر دولت ہے حسن کا زینت

بھر کے گلشن پیمانے کی پیمانے میں رکھ دینا
محبت کے شگفتہ پھول بیت خانے میں رکھ دینا
غضب ہوگا قدم نامہ کا میخانے میں رکھ دینا
اٹھا کر یکسے سے دل کے کاشانے میں رکھ دینا
نگاہِ مست کی مے اس کے پیمانے میں رکھ دینا

کہ برگد کا شجر نیچے سے اک دانے میں رکھ دینا
مرے حصے کی ساقی میرے پیمانہ میں رکھ دینا
مری تصویر کو تم اپنے کاشانے میں رکھ دینا
تو ایسی مے کو خم بھر سوا کے میخانے میں رکھ دینا
تم اپنا حسن ہر تصویر کے دانے میں رکھ دینا
تم اپنی خوبیوں کو اپنے دیوانے میں رکھ دینا

ہزاروں اختر شوں کو ایک پیمانے میں رکھ دینا
شبیہِ یار لے کر آئینہ خانہ میں رکھ دینا
جلا کر آپ یہ قندیل ویرانے میں رکھ دینا
مئے گلگوں کے پیمانوں کو مے خانہ میں رکھ دینا
کوئی ایسا بھی مضمون میرے افسانے میں رکھ دینا
ہر اک مضمون کا کھا ہر اک دانے میں رکھ دینا

جلا کر شمع یہ ویرانے کے ویرانے میں رکھ دینا
کسی کا درد میرے دل کے کاشانے میں رکھ دینا
جو مر جاؤں تو تربت میری مے خانہ میں رکھ دینا
بجائے دستی میرے پیمانے میں رکھ دینا
کوئی لے جا کے سجدے میرے بت خانہ میں رکھ دینا
سزا کے سامنے لے جا کے نذرانے میں رکھ دینا

جو ممکن ہو اسے لے جا کے میخانے میں رکھ دینا
مری تصویر مستی اپنے میخانے میں رکھ دینا
یہ گوہر حضرتِ حسن نذرانے میں رکھ دینا
تو میری بھی کہانی اپنے افسانے میں رکھ دینا

تشنہ لب دنیا کا ہے دورِ آخر اے ساقی
ہر زمانہ شہرت میر تقی

مرا دل بجھ رہا ہے بھی ابھی روشنی دے جا
تمہارا نام لیتے لیتے تن سے روح نکلی ہے
ستم کی کوئی حد ہے اٹھے نہ سے میری جیسا کر
چلے آتے ہیں سوئے میکدہ وہ جھومتے دیکھو
تڑپ اٹھیں کلیجہ تھام لیں سنتے ہی وہ شہرت
بدر القریشی

خوشی ہے کام آئیگا کسی کی تشنہ کامی کے
تصور آتی ہے عشرت کی فطرت میں کبھی کلفت
جبیں پر تم جہاں راحت سمجھتے ہو رہو جا کر
جسے پی کر دلوں کی آتشِ نفرت ہی بجھ جائے
چراغِ بدر ہے خاموش، اہلِ بزم کہتے ہیں
کریم آرامش زلفِ پریشاں کے لئے آپ
ستار جودھپوری

نگاہِ ناز نے دل کیسے چھینا کس طرح مارا
پسِ پردہ بھی ہو حاصل نظارہ خوش جمالوں کا
ہی ستار اک معراجِ تسلیم و رضا کی ہے
طالب انصاری جبل پور

جبیں جس پر محبت آئینے کے آئینے سارے
بچے جو رشکوں کی بیکشی سے ساقیا تھوڑی
ایم شفیع عاجز دھارواری

تمہاری دیکھ کر صورت مرا ایمان جائے گا
جہنم اور جنت کا نہیں انکار تم کو مگر
یہ آئینہ سلیمی مایگانوی

نہ تم کچھ جیتی رکھنا اور نہ بت خانے میں رکھ دینا
ہمارا دل آشنا ہیں بھی [redacted]

168823
27.12.95
Date

ناخدا کی شاعری رخصت ہوا

خاص اہمیّت کی باتیں

یہاں جو باتیں درج کی گئی ہیں وہ سوچ بچار کرنے والے ہر بھارتی کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ باتیں آپ کے اور آپ کے کنبے کے لئے بہت اہم ہیں، کیونکہ چینی جارحیتوں سے مُلک کی حفاظت پر ہی ساری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہماری قوم امن پسند اور ہمارے عوام امن دوست ہیں، لیکن ہم کبھی کسی جارحیت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔

چینی خطرہ

حالانکہ لڑائی بند ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ ہماری سرحدوں پر چینی جارحیت اب بھی جاری ہے۔ لداخ میں ... ۱۴ مربع میل بھارتی علاقے پر اب بھی چینیوں کا قبضہ ہے۔ وہ ہماری سرحدوں پر برابر بڑے پیمانے پر فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر چینی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونا ہے۔ آیئے ہم اپنا عہد پھر دوہرائیں کہ جب تک ہم اپنی دھرتی سے حملہ آور کو پوری طرح نکال باہر نہ کریں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

بھرپور تعاون

جب ہمارے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے قومی دفاعی فنڈ میں عطیے دینے کی اپیل کی تو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق عوام نے بڑے شاندار ڈھنگ سے اُن کی اس اپیل کا جواب دیا۔

ہم نے بڑی فراخدلی سے ــــ دِل کھول کر عطیے دیئے کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ آزادی کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی بڑی نہیں۔

پختہ عہد

آیئے ہم پختہ عہد کریں کہ جب تک آزادی کو درپیش خطرہ ختم نہیں ہو جاتا ہم اسی طرح امداد دیتے رہیں گے۔ آیئے اپنا سونا دیں۔ اگر کل ہم سب آہنی زنجیروں میں جکڑے گئے تو پھر یہ طلائی چوڑیاں کس کام آئیں گی۔ ہمیں روپیہ بھی دینا چاہیئے۔ ہماری لگاتار امداد سے ہی ہمارے دفاعی انتظامات مضبوط ہوں گے۔

تین اچھی وجُوہ

۱۔ اپنے اور اپنے بچّوں کے مستقبل کی حفاظت کے لئے دیجئے۔
۲۔ مادرِ وطن کی بھلائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے دیجئے۔
۳۔ بھارت اور دُنیا بھر میں اُمن قائم رکھنے کے لئے دیجئے۔

اِن سوالوں پر بچار کیجئے

کیا ہم اپنے فرض میں کوتاہی برتیں گے اور اپنی آبرو کو خطرے میں ڈالیں گے؟ کیا ہم چاہیں گے کہ ہمارے جوان ہمارے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں اور ہم اُن کے ہاتھ مضبوط نہ کریں؟ کیا ہم آج خود غرضی سے کام لیتے ہوئے اُن سب چیزوں کو خطرے میں ڈال دیں گے جن کی ہم بڑی قدر و قیمت سمجھتے رہے ہیں؟ کیا ہمارے نزدیک ذات مُلک سے، حرص حوصلے اور اشیاء آزادی سے زیادہ اہم ہیں؟

اِن باتوں پر سوچ بچار کیجئے

قوم کی تیاریوں میں ہاتھ بٹایئے

DAGV/14

نظم مع قطعۂ تاریخ برحلت ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مرحوم مغفور

آبر احسنی گنوری

آہ دس اکتوبر آئی کتنی نحس — مرگِ حضرت نوح کی لے کر خبر
آہ اک فن کار اعلیٰ اُٹھ گیا — شاعری کا کیوں نہ ہو چرخِ جگر

سُن بندش کا ہوا اب کھیل ختم — شعر سے جاتی رہی سب دل کشی
شاعرِ رنگیں بیاں سے اُٹھ گیا — ہے پریشاں آج زلفِ شاعری

فائدہ کی فن کے ہو کس سے اُمید — ہند سے اب فیض جاری اٹھ گیا
کون دے گا آدمیت کا سبق — آدمیت کا پجاری اُٹھ گیا

باتوں میں باتوں میں وہ تخلیقِ شعر — شعر سے لطفِ زباں جاتا رہا
کارواں پائے گا منزل کس طرح — آہ میرِ کارواں جاتا رہا

قبل اردو لا رہا ہے اپنا رنگ — ہند سے اب اٹھ رہی ہے شاعری
چھاتے جاتے ہیں گریتے بزم پر — شاعروں کی ہوتی جاتی ہے کمی

ہیں یہی دس بیس فن داں ملک میں — کل رودوں کے منہ میں دینے کو لگام
اُٹھ گئے یہ بھی مقدر سے اگر — ہوگی اس ہنر پر جنگ کی کیا روک تھام ؟

ناروی ناطق کس قدر غم دیدہ ہیں — جوش کا انحطا نہیں زانو سے سر
برق توڑی خاندانِ داغ پر — نوح کا غم الامان و الحذر

صبر ہاں اب صبر شاگردانِ نوح — میرا بھی اس چوٹ سے دل چور ہے
میں بھی ہوں غم میں برابر کا شریک — میرا دل بھی سوزِ غم سے طور ہے

موت سے ہستی میں ہے کس کو مفر — کیا کریں دستورِ دنیا ہے یہی
جا رہے ہیں ہم بھی منزل کی طرف — اپنا بھی انجام ہونا ہے یہی

ہو تماشا ہونا وہ تو ہو کر رہ گیا — التجا یہ ہے انہیں بخشے خدا
اب یہی ہے ان کے حق میں دوستی — مغفرت کی سب کریں مل کر دعا

جو رہے ہیں داغ کے فورِ حزن کم — مرگِ احسن سے تھا سینہ پاش پاش
سال رحلت یوں لکھا منظور میں — ہو گیا اب نوح کا غم دل خراش

۱۹۳۶

بقیہ وکیل احباب ناقدِ مرحوم (صفحہ سے آگے)

صاحب اور گوپی سنگھ کشور صاحب شامل تھے۔ شعرا میں حضرات صاحبان سید محمد رضی، حضیر بارانوی، اختر چاندپوری، سرور بارانوی خستہ بارانوی، خلیل چھپیا بڑودوی، نور بارانوی اور راقم الحروف نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ذیل میں احسن خستہ کا شعری انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

فرد بارانوی :-

قدرت نے دکھایا ہمیں ماتم کا زمانہ
ہم آہ بھی بھرنے کو کریں غم کا فسانہ

سرور بارانوی۔

مطلعِ قوم رہبر ملت — شمعِ بخت ہو گیا رخصت
اہلِ یاراں کو صدمۂ جانکاہ — ہوئی جبرانِ ناق کی رحلت

نشیم بارانوی۔

پھول مرجھائے ہوئے ہیں رو رہی ہیں بلبلیں
گلشنِ یاراں کا ہائے باغباں جاتا رہا
بے سہاروں کا تیموں کا سہارا چل بسا
ہائے بیواؤں کا جو تھا مہرباں جاتا رہا

خستہ بارانوی۔

قوم کا فکر تجھے ہر گھڑی ہر آن رہا
زدِ طوفاں میں بھی کشتی کا نگہبان رہا
اپنے دکھڑوں سے سوا قوم کا دکھڑا سمجھا
غیر کو غیر نہ سمجھا کبھی اپنا سمجھا

راقم الحروف

حضرات اہلِ علم کا مسکن تھا ان کا گھر
ذی جاہ میہمانوں کا ماں تھا انکا گھر
شاعر، ادیب، اہلِ قلم کی قیام گاہ
کھائے جاں نواز کا گلشن تھا ان کا گھر

وہ جوش سے بھری ہوئی تقریر اب کہاں
تقریر بھی اگر ہو تو تاثیر اب کہاں

شعلہ و شبنم دلی　　ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۷۴۵　　رجسٹرڈ ڈی نمبر ۲۵۴

شمالی ہند کا مقبول ترین کثیر الاشاعت علمی و ادبی ماہنامہ

ہفت رنگ

دل چسپ ناول:

اندھیرے	دو روپے
شمیم	چھ روپے آٹھ آنے
انور	سات روپے آٹھ آنے
جلن	دو روپے
شمع	پانچ روپے
تصویر	چار روپے
افشاں	چھ روپے آٹھ آنے
گناہ	دو روپے چار آنے
منصورہ کی راجکماری	سات روپے
انگریس کی آپ بیتی	ایک روپیہ آٹھ آنے
چرٹ	تین روپے
انشاءاللہ	دو روپے بارہ آنے
انوا	تین روپے
نقشہ	ایک روپیہ
آگ	ایک روپیہ بارہ آنے
آنسو	دو روپے بارہ آنے
پھانسی کی کوٹھری سے	تین روپے چار آنے
چوروں کا قاتل	ایک روپیہ آٹھ آنے
ماہ طلعت	تین روپے
نقل بوٹ	ایک روپیہ آٹھ آنے
پراسرار سایہ	دو روپے
آنسو	ایک روپیہ آٹھ آنے
پردہ فروش	ایک روپیہ بارہ آنے
مسکراہٹیں	دو روپے آٹھ آنے
بے غیرت	دو روپے آٹھ آنے
ساقی	ایک روپیہ چار آنے
ڈاک گھر	دس آنے
سسرال	دو روپے
لاجونتی	ایک روپیہ
بیگانے	دو روپے آٹھ آنے
اندلس کے دو چاند	چھ روپے
مونڈی کاٹے	ایک روپیہ آٹھ آنے
شیر دل خاتون مکمل	چھ روپے آٹھ آنے
تازیانہ	ایک روپیہ آٹھ آنے
فرد و نار	دو روپے
پروین	دو روپے چار آنے
گھڑی کا راز	ایک روپیہ آٹھ آنے
بے کس	ایک روپیہ آٹھ آنے
دوشیزہ کابل	چھ روپے
کشمیر کی بیٹی	دو روپے آٹھ آنے

افسانے ہی افسانے:

فریب مسلسل	دو روپے
حجاب	دو روپے
وحشی	دو روپے آٹھ آنے
نہ بھولنے والی بات	دو روپے
ننگی جوانی	دو روپے
جنت و جہنم	دو روپے
کڑوے گھونٹ	دو روپے
اسے لکھ رہی ہوں	دو روپے
جب جوانی آتی ہے	دو روپے آٹھ آنے
علمی پرستان	دو روپے
جھنکاریں	دو روپے
انوکھا سنسار	دو روپے
آخری تحفہ	دو روپے بارہ آنے
سنی سنائی	دو روپے آٹھ آنے
وفا کی دیوی	بارہ آنے
شرماک افسانے	ایک روپیہ آٹھ آنے
شوخ نظارے	ایک روپیہ چار آنے
شوخی و تبسم	ایک روپیہ چار آنے
جیل	بارہ آنے
فلمی پریوں کی داستان ایک روپیہ آٹھ آنے	
گیتا بجلی (نظم)	ایک روپیہ چار آنے
قاتل	بارہ آنے
دلدل	ایک روپیہ آٹھ آنے

کارآمد کتابیں:

زینت کشیدہ کاری	چار روپے
رشیدی کشیدہ کاری	تین روپے آٹھ آنے
شاہی باورچی خانہ	تین روپے
آفتاب عالم (تواریخ)	نو روپے
سیرت فخر العارفین (دو حصے)	پانچ روپے
آسان شارٹ ہینڈ	دو روپے آٹھ آنے

تیرتھ رام فیروزپوری کے ناول

سراب زندگی	تین روپے آٹھ آنے
انجام ہوس	چار روپے
سرفروش	چار روپے
شاہی خزانہ	تین روپے آٹھ آنے
تہہ خانے کا راز	تین روپے آٹھ آنے
کرنی کا پھل	چار روپے
عورتی شیطان	چار روپے آٹھ آنے
ویران محل	تین روپے آٹھ آنے
بھرتنا	چار روپے
دیوتا کی آنکھ	چار روپے آٹھ آنے
وفا کا پتلا	تین روپے
لعل شب چراغ	تین روپے
منزل مقصود	تین روپے
شامت اعمال	چار روپے
سرائے والی	تین روپے آٹھ آنے
آزادی	تین روپے
خنجر بہ آب	چار روپے
خوف ناک جزیرہ	تین روپے آٹھ آنے
مطلبی دنیا	چار روپے
قاتل کی بیٹی	چار روپے
وادی خوف	چار روپے
فرشتہ انتقام	تین روپے آٹھ آنے
مقدس جوتا	تین روپے
کعب فٹ کی واپسی	چار روپے آٹھ آنے
دست قضا	تین روپے آٹھ آنے
تلاش اکسیر	تین روپے آٹھ آنے
سانپ کی چوری	تین روپے آٹھ آنے
انصاف	دو روپے آٹھ آنے
مجرم	تین روپے
میری تقدیر	چار روپے آٹھ آنے
تلافی گناہ	تین روپے آٹھ آنے

(محصول ڈاک علاحدہ ہوگا)

نوٹ

رسالہ کتابیں مندرجہ ذیل پارسل سے بھیجی جاتی ہیں

محصول ڈاک میں کافی کمی ہو جاتی ہے

Please Book your orders

SHOLA-O-SHABNAM

Dariba Kalar, Delhi-6.

ہرنام سنگھ طالب

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سرزمین پنجاب نے بہت سے ایسے قابل قدر ادباء و شعراء کو جنم دیا ہے جن کا نگار اردو کے گیسو سنوارنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ علامہ اقبال کی جنم بھومی سیالکوٹ ہے جو تقسیم سے پہلے پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ علامہ اقبال کا مزار لاہور میں جو مقام ہے وہ روز روشن کی طرح مشہور ہے۔ بھائی مجور نجیب آبادی، حفیظ جالندھری، جوش ملسیانی، میلارام وفا اور اسی قسم کے کچھ نام اور بھی ہیں جن کی جنم بھومی سرزمین پنجاب ہے۔ ان حضرات کی ادبی خدمات اور شاعرانہ عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی یقیناً کچھ ایسی شخصیتیں اور ہوں گی جو کسی نہ کسی وجہ سے گمنام ہیں۔ لیکن منظر عام پر آجائیں تو قارئین سے اپنے فن کا لوہا منوا کر رہیں۔ پنجاب کی نئی پود میں بھی کچھ با صلاحیت ادیب و شاعر تو ابھر چکے ہیں اور کچھ ابھرنے کیلئے بیتاب ہیں۔ لیکن حالات انہیں ابھرنے نہیں دیتے انہیں میں سے ایک ہرنام سنگھ طالب ہیں جو پندرہ بیس برس کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن ان کا وجود آج تک نہ ہونے کے برابر ہے کچھ ماہ قبل تک تو میں خود بھی ان سے قطعی ناواقف تھا۔ مگر ۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ مجھے ایک کارڈ موصول ہوا جس پر پتے میں صرف "واحد پریمی بھوپال" درج تھا۔ مجھے اس پتے پر تو حیرت اس لئے نہیں ہوئی کہ اس سے قبل بھی کچھ خطوط اسی پتہ پر مل چکے تھے۔ مگر میں اس خط کو پڑھ کر ضرور حیرت ہوئی۔ لکھا تھا:

محترمی واحد پریمی صاحب، آداب و تسلیمات فروری میں حضرت شاہ گدا بھوپالی سے آپ کی پتہ کی کتاب حاصل کی تھی اب کے حضرت سے ملا تو آپ کا پتہ نہ ملا۔ آپ کے شعر و سخن سے متاثر ہو کر آپ سے خط و کتابت کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا پتہ مرحمت فرمائیں۔ نیاز مند ہرنام سنگھ طالب

سونپ کر آنکھ کی نظر نے روح نیا نہ مجھے
کر دیا ہے بے نیاز جام و پیاد مجھے

بے حد پسند آیا۔ جناب غضب کا مطلع ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ واحد صاحب اصل میں اپنے حلقۂ احباب میں توسیع چاہتا ہوں اسی لئے آپ کو مخاطب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آپ سے التجا ہے کہ آپ میری طرف ضرور رجوع ہوں اور جناب عشرت قادری صاحب کو بھی ارجوع کریں۔ امید ہے کہ آپ میری اس التجا کو نہیں ٹھکرائیں گے اور جواب ضرور سرفراز فرمائیں گے۔ میرا مقصد صرف آپ حضرات کے نزدیک ہونے کا ہے۔ کوئی تکلیف دینے کا میں ارتکاب نہیں کروں گا۔ یقین رکھئے۔

آپ کا نیاز مند ہرنام سنگھ طالب

اس خط کو پڑھ کر جہاں مجھے حیرت ہوئی وہاں ایک نامعلوم سی خوشی بھی ہوئی۔ اس پُر خلوص خط پر ایمان نہ لانا کفر تھا اور ظاہر ہے کہ میں دانستہ اس کفر کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے بر وقت ہی جواب دے دیا۔ یعنی اپنے آپ کو کافر ہونے سے بچا لیا۔

یہ طالب صاحب کی اور میری پہلی مراسلت تھی۔ اس کے بعد میرے خط طالب صاحب نے لکھے اور جیسوں جواب دیتے رہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور میرا خیال ہے کہ تا حیات جاری رہے گا۔ کیونکہ رشتہ خلوص پائدار ہوتا ہے۔

طالب صاحب کے خطوط سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ جہاں یہ ایک مخلص، شریف النفس اور ملنسار انسان ہیں وہاں ایک اچھے قسم کے شاعر بھی لیکن کیونکہ گمنام ہیں اس لئے ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ یہی سوچ کر میں نے آپ حضرات سے ان کا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔ اسوقت زیادہ تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا۔ طالب صاحب کے خطوط سے میں نے کچھ اشعار اور حالات جو وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں، اخذ کئے ہیں جنہیں ترتیب دے کر پیش کر رہا ہوں۔

طالب صاحب کا نام ہرنام سنگھ ہے طالب تخلص ہے، تاریخ پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۱۹ء ہے والد کا اسم گرامی شری لال سنگھ چوہدری ہے قوم کے راجپوت ہیں۔ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں لیکن تقسیم وطن کے بعد پٹھانکوٹ آگئے۔ آجکل اسسٹنٹ لائبریرین بدھانی خلع گورداسپور میں ہیں اور ہائی اسکول میں معلم اعلیٰ یعنی ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بی اے۔ بی ٹی ہیں۔ عربی و فارسی اور منشی فاضل کے امتحانات بھی پاس کئے ہیں۔ ہندی بھی "پڑھ" لیتے ہیں۔

ذوقِ شعر گوئی زمانہ تعلیم سے ہے جبکو
حضرت حیدر کریم صاحب کریم ڈسکوی کی صحبت
نصیب ہوئی تھی۔ ابتدا میں اسکول کی ادبی
محفلوں اور ہفتہ وار رہنمائے ترقی سیالکوٹ
کے طرحی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ بعد ازاں
"نشاط" لاہور "سویرا" لاہور "ادبی کار" بمبئی
میں آپ کی شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی
رہیں۔ لیکن جب اپنی وطن سیالکوٹ کو خیرباد کہہ
کر بے سروسامانی کی حالت میں پٹھانکوٹ آئے تو سب
سلسلہ منقطع ہو گیا اور یہ جمود ۱۹۵۰ء تک طاری
رہا۔ لیکن جب کچھ حالات سدھرے اور ذہنی سکون
ہوا تو پھر ذوقِ سخن ابھرا اور گنبید داس صاحب
سابق سیالکوٹ کے بذریعہ مراسلت اصلاح لینے
لگے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصہ نہیں چلنے پایا تھا کہ
طالب صاحب کی اہلیہ شدید بیمار ہو گئیں اور طالب
صاحب پھر خانگی الجھنوں اور مالی پریشانیوں میں
الجھ کر رہ گئے۔ ویسے تو انھوں نے اس حال میں بھی
شعر و سخن جاری رکھی مگر باقاعدہ نہیں رہ سکے۔ جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ صاحب صاحب سے مراسلت ختم ہو گئی
اور ان سے استفادہ کرنے کی راہ بند ہو گئی۔

اب کچھ ماہ سے اہلیہ کے روبصحت ہونے پر
پھر باقاعدہ سے نظر آ رہے ہیں اور ملک کے مشہور نقاد
حضرت شفا گوالیاری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر
فکر سخن کر رہے ہیں۔ بقول خود طالب صاحب
"اب یہ سلسلہ لاانتہا ہی ہے۔ دو چار ماہ سے پھینے
کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھارت، نیا بھارت، پٹھانکوٹ
"پردیپ" "جاندھر" "شعلہ و شبنم" "دہلی" "شمع ادب"
لکھنؤ، پھر اودھ رہنمائے تعلیم" دہلی وغیرہ میں چھپ
چکے ہیں۔ بہت زود گو اور پُرگو ہیں جو انکی کہنہ مشقی
اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ اب کچھ نمونۂ کلام
ملاحظہ فرمائیے:۔

غم کے فسانوں میں جاں نثار فرشِ خونیں سے رنگِ محفل ہے
دل ہے معمورۂ الم سے پُر کتنی دولت ہے اس خزانے میں
رازِ الفت عیاں نہ ہو جائے بے زبانی زباں نہ ہو جائے

تجھ سا حسین کوئی نہیں اس جہان میں
چرچے ہیں ہر طرف ترے حسنِ جمال کے

ایک ہم کیا تمام فنا کی ہیں گردشیں جمع و ختم نے ملا
بشر کی زیست میں یوں ہے خوشی کی آمیزش
کہ شب کو جلتے ہوں جیسے چراغ ہم سے
بالائے بام آ گیا یہ کون بے نقاب
عالم تمام نور کے سانچے میں ڈھل گیا
اُپج روشن ہو گئیں کاخ و مکاں کی منزلیں
جن کو دیدارِ رخِ پُرنور حاصل ہو گیا
وہاں تک عقل بھی جاتی نہیں ہے
وہ باہر ہیں حدِ وہم و گماں سے
اُس کی رحمت تو ہے طالب بے حساب
ہم نہیں قابل کسی انعام کے

طالب بیمار کی نگری میں ؎ اپنے کون پرائے کون
درد کو نسبت اُلفت سے تھی ؎ درد ہمیں محبوب ہوا
زلفِ ہر دو الفت میں بچ کر ؎ گو ہر بے بہا ہو گئے ہم
عشق آئینہ دار ہی ہے ؎ یہ فقط مظہرِ شباب نہیں
ساتھ کسی کا کب دیتا ہے ؎ یہ ظالم بے مہر زمانہ

منزلِ دنیا میں تھا گرم سفر ٹھوکر پہ
راہرو کو نیند آغوشِ لحد میں آ گئی
کیا کرے وہ کسی کی دل جوئی
جس کا اپنا مزاج برہم ہے
جذبۂ ایثار ان کی فطرت کا مل میں ہے
اللہ اللہ کس قدر اخلاص اہلِ دل میں ہے
ہو چکیں گو اس کی تفسیریں بہت
زندگی پھر بھی طلسمِ راز ہے

مندرجہ بالا اشعار پڑھنے کے بعد آپ نے خود
محسوس کیا ہو گا کہ طالب صاحب کے کلام میں
وارداتِ قلبی بھی ہے اور کیفیتِ فکر بھی۔ غمِ
جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ یہ فرق ہے کہ غمِ
جاناں کم ہے اور غمِ دوراں زیادہ۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ طالب صاحب بیچارے ہمیشہ کاہ بہ کاہ
کا شکار رہے ہیں اور اس کی تمام تر تلخی فکر کے
سایوں میں گذری ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:۔

اسیرِ رنج و غم ایسے ہوئے ہیں
کبھی دیکھی نہیں صورت خوشی کی

زبان کی سلاست اور بیان کی لطافت طالب صاحب
کے کلام کی بہترین خصوصیات ہیں۔ مگر ان کیلئے
فکر و نظر کو اور بلیغ ہونے کی ضرورت ہے جس کے لئے
وسیع مطالعہ درکار ہے۔ ابھی تو خود طالب صاحب کی
ناسازگار حالات کی بنا پر مطالعہ کے مواقع فراہم
ہی نہیں ہو سکے۔ لیکن کیونکہ اب ان کے حالات
کچھ سازگار ہیں اسلئے میں سمجھتا ہوں یہ یقیناً اس
طرف بھی توجہ دینگے اور اپنی تعلیمی استعداد سے
کام لیتے ہوئے فارسی، ہندی، سنسکرت اور
انگریزی ادب سے پورا پورا استفادہ کرنے کی کوشش
کریں گے۔

ویسے تو انھیں شہرت دلانے کیلئے ان کے کلام
کی یہی دو خصوصیات یعنی زبان کی سلاست اور بیان
کی لطافت ہی کافی ہیں کیونکہ آجکل ایسے کہنہ مشق
شعرا موجود ہیں جن کی شہرت کا تمام تر انحصار انہیں
دو خصوصیات پر ہے۔ مگر در اصل ناقدین اور اہلِ
نظر کی نظر میں وہی شاعر قابلِ توجہ ہے جسکے کلام میں
بیک وقت زبان، بیان اور خیال تینوں چیزوں کا حسن
موجود ہو۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اگر طالب صاحب
کے کلام کو پورے مطالعہ سے اور جدید ذوق کی تربیت
جدید و سنیاسیِ شعر و ادب میں ایک نمایاں مقام
حاصل کر لیں گے۔

وقت کا فرق۔ زیادہ کچھ، زیادہ کچھ نہیں

خاک لحد کے بیچ گروں سے کام بند ہیں
دیدۂ تر زار کیجئے بانے بانگروں

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی باقی نہیں رہتا جو پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن ضرور مرے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا کا کام کسی کے اٹھ جانے سے بند نہیں ہوتا۔ یہ چلتا ہی رہتا ہے۔ سرسید، حالی، شبلی جیسے عالم مدنی، ابوالکلام آزاد۔ رفیع احمد قدوائی، اقبال اور مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ بزرگ ہماری قومی، سیاسی علمی اور ادبی زندگی کی اہم شخصیتیں تھیں۔ اس عمارت کے لئے اہم ستون کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن آج ان کے نہ ہونے کے باوجود بھی یہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ لوگ ایسے مخصوص دل و دماغ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور ایسی مخصوص صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی جگہ پُر نہیں ہوتی۔ گو مذکورہ بالا بزرگوں کے بغیر بھی ہمارا کام چل رہا ہے۔ مگر ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہو گئی ہے اُسے پُر کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔

وکیل عبدالرزاق صاحب رضا مرحوم بارانوی بھی ایسے ہی مخصوص لوگوں میں تھے۔ جن کی جگہ لینے والا اس نا تواں دور میں اب کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کی زندگی یاراں کے غریبوں، مجبوروں، بیواؤں، یتیموں، نوجوان طالب علموں اور علم و ادب کے خدمت گاروں کے لئے کتنی قیمتی تھی اس کا احساس اب ان کی رحلت کے بعد یاراں کے ہر فرد کو ہو رہا ہے۔

پیشہ کے اعتبار سے وہ اتنے کامیاب وکیل تھے کہ ضلع کچہری میں کوئی دوسرا ان کی جوڑ کا نہ تھا۔ اس کا اقتدار سب نے کیا بلکہ اتنی معزز اور متمول شخصیت ہونے کے باوجود سادگی کا یہ عالم تھا کہ یاراں کے دستر خوان پر وکیل و مؤکل خان اور سیٹھ کی محمد جیسا کھانا کھاتے تھے وہاں حضرت خان

آزاد بارانوی

وکیل عبدالرزاق رضا مرحوم

چپراسی بھی نظر آتا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں نیشنلسٹ مسلمان تھے وہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کے دل سے خواہش مند تھے وہ ہندو مسلم میل جول کے زبردست حامی تھے اور اس مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے بھی ہمیشہ تیار تھے۔

انھوں نے خاص طور سے مسلمانان یاراں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا کیونکہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ موجودہ افلاس زدگی اور خاص طور سے مسلمان آج جس پستی میں زندگی گزار رہے ہیں وہ ہندوستان کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ اس داغ کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور پچھڑے ہوئے مسلمانوں کو دوسری ترقی یافتہ اقوام کی صف پر لا کھڑا کر دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے نیشنلسٹ کی حیثیت سے انھوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کی طرف مرکوز کی ہوئی تھی۔

وہ اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسہ انجمن اصلاحیہ یاراں کی بنیاد رکھی جس کی آج پرائمری جماعتوں تک تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد دینی مکتب ان کے دامن عاطفت سے وابستہ رہے۔ مدرسہ کے لئے بارہا روپیہ خود انھوں نے فراہم کیا اور باقی کے لئے عوام کے آگے ہاتھ پھیلانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

یوں تو انھیں شروع سے ہی علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ میں نے جب سے آنکھیں کھولی ہیں ان کے گھر کو اہل علم و ادب کی آماجگاہ پایا ہے۔ لیکن اخیر عمر میں انھوں نے اُردو ادب سے خاص دلچسپی شروع کر دی تھی۔ اور "بزم ادب" کے تحت منعقدہ مشاعروں میں وہ آنے جانے لگے تھے۔

ان کی سب سے بڑی تمنا تھی کہ یاراں کا قیام کیا ہوا مدرسہ "نیشنل اسکول" بن جائے اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ ایک آل انڈیا لیول کو فنڈ کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے دو ہزار روپیہ وہ خود پیش کرنے کو تیار تھے اور باقی کے لئے ان کا ارادہ تھا کہ اسٹیٹ کے دوسرے اضلاع سے ایک ایک ہزار روپیہ اکٹھا کیا جائے۔ دیکھئے ان کی تمنا اب کب بر آتی ہے۔

وکیل عبدالرزاق صاحب کچھ عرصہ سے سال سے فالج کے عارضہ میں مبتلا بستر گیر ہو گئے تھے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آپ کی وفات ہو گئی۔ ۸ کی تعزیت کے لئے "مدرسہ انجمن اصلاحیہ یاراں" کی طرف سے ۱۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک خاص پروگرام رکھا گیا جس میں مقامی حضرات کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں بیرونی معززین نے شرکت کی۔ جناب وکیل ظہیر حسین صاحب کی صدارت میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تقریر میں جناب بیرسٹر وزیر محمد صاحب مسعود، حکیم امین الدین شاہ، ماسٹر محمد احمد صاحب چھپرا بڑود، ماسٹر [illegible]

بقیہ صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیے

شوق اثری لاہور پاکستان

جواب خط

بنام اُستاذی محترم سحاب سخن علامہ آبا حسنی گنوری

خسرو باغ۔ لاہور۔ پاکستان
محترم بالائی۔ بندگی۔

جولائی ۱۹۶۲ء کے مشفقانہ دشنم جو اپنے نام جناب کا جاری کردہ ہدایت نامہ پڑھ کر مسرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ مسرت اس لئے کہ جناب نے میرے خطوط کا تسلسل "حرف اول" کے تحت اسی فراخ دلی سے اداکرنا یا ہے جس کی میں ہمیشہ امید رکھتا ہوں۔ محض قرض ہی ادا نہیں فرمایا۔ بلکہ تاریک راہ میں ایک شمع روشن فرما کر مجھے پیش آنے والے نشیب و فراز سے آگاہ فرمادیا۔ دکھ اس لئے ہوا کہ میں نے حضرت تاجور کلکتوی پر آپ کے تعلقات کا علم نہ ہونے کے باعث اظہار خیال جو میرے لئے باعث ندامت ہوا جناب نے اس خط کو پڑھ کر کیا کیا فہم اجاب نے یہ سمجھا ہے کہ مولانا ابا حسنی، شوق اثری سے سخت ناراض ہیں اس لئے انھوں نے قطع تعلق بتائی ہے اور شوق کو ذلیل کیا ہے۔ بھلا یہ کیا جانیں کہ اس خط نے میری ادبی روح کو کتنا تڑپا کر رکھ دیا ہے اور میرے ذہن کو کس قدر تابندگی بخشی ہے جناب نے میرے لئے خط کے اختتام پر جو دعائے خیر فرمائی ہے "خدا آپ کو خوش رکھے" اس میں کیا جذبہ پوشیدہ ہے اور اس نے خط کا رُخ کہاں سے کہاں موڑ دیا ہے۔ اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ خط کا ایک ایک لفظ میری رہنمائی کر رہا ہے۔ چونکہ جناب نے مجھے شاد و دشنم کے ذریعہ مخاطب فرمایا ہے۔ اس لئے میں بھی اسی کی معرفت جواب پیش کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک پٹھان کو جراحی کا پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ اس لئے کہ جراح کا کام مرض سے متاثرہ حصوں پر نشتر زنی کرنے کے بعد خراب مواد کا نکالنا اور ڈریسنگ کرتے رہنا ہے تاوقتیکہ مریض کو صحت کلی حاصل نہ ہوجائے۔ برخلاف اس کے پٹھان کا کام مریض کی رگ جان کو خنجر یا تیغ سے منقسم کرنا اور مرض و مریض دونوں کو بیک وقت ٹھنڈا کر دینا ہے۔ مگر پٹھان جراح بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی اصلاح کرلی۔ یا اس کے جذبات مردہ ہوگئے اور وہ اپنے مسلک کو چھوڑ بیٹھا۔ میں نے پٹھان ہوتے ہوئے بھی جراحی کا پیشہ پسند کیا تھا۔ مگر جناب کی ہدایت کے مطابق اس پیشے کو مستقلاً ترک کر رہا ہوں۔ اب خدائے تعالےٰ جناب کی دعاؤں کے طفیل مجھے جو کچھ بھی بنادے اسی کو اپنے لئے بہتر خیال کروں گا۔ جن بدنے متعدد رسائل میں ملک کے نامی شعراء کے کلام پر میرا تفقد دیکھنے کے بعد توقعات مجھے فرمائی ہے۔ میرے لئے باعث فخر و قابل عمل ہے انشاء اللہ آئندہ شعراء کے پُر عیوب کلام کی بھی جی کھول کر داد دوں گا۔ تاکہ مجھ سے سب خوش رہیں۔ اور بجائے دشمن دوست بننے کی کوشش کریں۔

"دو رجحانات" بمبئی میں شاد عارفی صاحب کے آخری خط کا میں نے جواب دے دیا تھا۔ مگر چھپنے کے متعلق معلوم نہ ہو سکا۔ پہلے خط پر شاد صاحب نے مجھ سے زبانی گفتگو فرما کر یہ طے کرلیا تھا کہ آئندہ اس قسم کی باتیں تحریر میں نہیں آئیں گی۔ زبانی ہوا کریں گی۔ میں نے ان کی بات پر مطمئن ہو کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا تھا مگر اس کے بعد بھی شاد صاحب کے وہ خطوط شائع ہوئے جن میں سے آخری خط کا جواب مجھے مجبوراً لکھنا پڑا اسی خط میں جناب کے مطلع میں موضع کا "ع" ساقط ہونے کے بچکانہ اعتراض کا جواب بھی دے دیا تھا۔ ظہوری صاحب کا مصرع جس میں واقعی کا مرع گرا ہے۔ شاد صاحب نے غلط تحریر فرمایا تھا۔ مصرعہ دراصل یوں نہیں ہے۔ میں نے ایک پرانی کتاب سے صحیح مصرعہ حاصل کر لیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قطعی طور سے قابل تسلیم نہیں ہے کہ کوئی اُستاد فن یا قواعد کی رو سے غلطی کر گزرے تو اسے غلطی تسلیم نہ کیا جائے اُستاد بھی بشر ہوتا ہے اور خطا اس کی بھی سرشت میں داخل ہے۔ غلطی خواہ وہ اُستاد ہی کیوں نہ کرے غلطی ہی تسلیم کی جائے گی۔ شاد صاحب نے ایک بات یہ بھی تحریر فرمائی تھی کہ شوق صاحب کے علوم مطالعہ کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مطلع کو شعر لکھا ہے گویا جس شعر میں انھوں نے موضع گرایا ہے وہ شعر نہیں ہے مطلع ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا جواب اتنا ہی دے دیا تھا کہ غزل کے پہلے "شعر" ہی کو مطلع کہتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ کا التزام ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کہ شاد صاحب نے کیسی بات سوچ سمجھ کر لکھی تھی یا جذبات کی رو میں بغیر سوچے سمجھے

خط طویل ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے اختصار کی طرف آتے ہوئے، اتنا اور عرض کر دوں کہ اب اگر کوئی صاحب "الف" سے "ی" تک تمام حروف بھی گرا دیں گے۔ تب بھی میری زبان پر یہی الفاظ ہوں گے کہ آپ نے کوئی حرف نہیں گرایا۔ آپ بڑے اچھے اور اچھے

شاعر ہیں۔ فن آپ کے یہاں سے نکلا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ وغیرہ اللہ بس

حضرت مجنوں صاحب کلکتوی سے میں متعارف نہ تھا۔ نہ جناب نے کبھی ان کے بارے میں مجھے کچھ بتایا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ حقانی دحقانی کلکتوی کے تلمیذ رشید ہیں۔ اگر مجھے پہلے ہی یہ معلوم ہو جاتا تو میرے قلم کو سراٹھانے کی کبھی جرأت ہی نہ ہوتی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ مجنوں صاحب ایسے ہی کوئی پروفیسر ہوں گے، جیسے اکثر رسائل میں میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ جناب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ جناب سے کتنے قریب ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں بے خود صاحب کو کلکتہ جا کر یا جب کبھی کلکتہ کے مشاعرہ میں جانا ہو تو معافی نامہ پیش کر دوں۔

جناب کی ہدایت و حکم کے مطابق میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں اور یقین رکھیں کہ میں آئندہ جب بھی کسی پر قلم اٹھاؤں گا تو پہلے جناب سے اجازت حاصل کروں گا یہ غلطی واقعی مجھ سے سرزد ہوئی کہ میں نے تنقید سے قبل جناب سے اجازت حاصل نہیں کی۔ آخر میں قبل از عدم معافی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ جناب میرے ساتھ عفو و درگزر سے کام لیں گے اور مجھے اس قابل بنا دیں گے کہ حتی الامکان ادبی خدمت کرتا رہوں۔

"شعر اور یار" کے عنوان کے تحت جو کچھ تحریر ہے اس قسم کی غلطیاں اکثر مشاعرہ و شعر کے طرحی مشاعرے کی طرحیات میں پاتا ہوں۔ اس سے قبل میں اس سلسلے میں کچھ لکھنا بھی چاہتا تھا۔ مگر وقت کی کمی کے باعث اپنے ارادے کی تکمیل نہیں کر سکا۔ اس قسم کے شعر نکال دینے کے باوجود بھی کچھ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں جن میں ایطا اور قافیوں کا غلط استعمال وغیرہ جیسی چیزیں ہیں

میں امید کرتا ہوں کہ جناب میری تمام غلطیوں کو معاف فرمائیں گے اور بے خود صاحب کو اس سلسلے میں مناسب خط تحریر فرما دیں گے اب اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

خادم شوق اثری

نوٹ:۔ ہم ایسا سمجھنے والے نادان ہیں۔ باپ بیٹے کی ذات نہیں چاہا کہ غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں

بنگامہ سال صاحب ایم اے

اُٹھو کہ چین سے لڑنا ہے ہر بشر کا فرض

وہ ارضِ پاک جسے خلق ہند کہتی ہے
زمانے کی شبِ تاریک میں ستارا ہے

بکھائی عالمِ وحشی کو ہند نے تہذیب
بشر کو پستیٔ اخلاق سے ابھارا ہے

اسی زمیں سے اٹھی امن و آشتی کی صدا
یہیں سے زمانے نے نام اہنسا کا

جب آدمی کا لہو مثلِ آبِ ارزاں تھا
مرے وطن نے دیا تھا پیام اہنسا کا

یہیں سے چین کو پہنچا تھا زندگی کا پیام
اسی زمیں سے اٹھا تھا دماغ گوتم کا

یہیں کے نور سے وہ بت کدہ ہوا روشن
یہیں سے جل کے گیا تھا چراغ گوتم کا

ہم اپنے بیچ غلامی میں بھی رہے ہمدرد
کہ یہ ہمارا پڑوسی نہ غم میں کھو جائے

ہمارا ملک رہا جب بھی ہو غلامی سے
ہمارے ساتھ ہی آزاد چین ہو جائے

چھٹے بھی ہم جو غلامی سے تو زمانے کو
سُنایا چین نے درد و الم کا افسانہ

پیامِ سوزِ دلِ شمع لے گئی ہمراہ
جہاں جہاں بھی گئی اُڑ کے خاک پروانہ

سنا ہے آج وہی چین بے ادب ہو کر
ہماری ارضِ مقدس پہ آنکھ اٹھاتا ہے

ہمیشہ جس سے وفا ہم نے کی وہی گستاخ
ہمارے ذوقِ وفا کی ہنسی اُڑاتا ہے

پھر آج ہند کے سینے سے اٹھ رہا ہے دھواں
پھر آج مادرِ گیتی کی روح مضطر ہے

بکھر گئی ہیں حسیں زلفیں گنگا جمنا کی
پھر آج آنکھ ہمالا کی خون سے تر ہے

اٹھو جوانو کہ پھر وقتِ امتحاں آیا
تمھارے ملک کی غیرت تمھیں بلاتی ہے

پھر آج ہند کی خدمت میں خون پیش کرو
کہ رسمِ کہنۂ اُلفت تمھیں بلاتی ہے

نگر نگر سے اٹھو گاؤں گاؤں سے آؤ
ہمیشہ ایسا بھی موقع ملا نہیں کرتا

ہمیں ہراس ہی کیا چینیوں کے اِس دل سے
کہ آندھیوں سے ہمالا اڑا نہیں کرتا

اٹھو کہ چین سے لڑنا ہے ہر بشر کا فرض
یہ دھرم یدھ بھی ہے اور یہ جہاد بھی ہے

نشانہ اس کا فقط رام ہی کا پیار نہیں
کہ اس کی زد میں رسولِ خدا کی یاد بھی ہے

وطن کی ماؤں اٹھو آج پھر کرو جوہر
تم اپنے بیٹوں کو پھر دودھ کی شپتہ[1] دے دو

چڑھاؤ ہند کے مندر میں جسم کے زیور
کچھ اور پاس نہیں ہے تو اپنی نتھ[1] دے دو

کروڑوں بیٹے ہوں جس ماں کی گود نے پالے
مجال کس کی جو اس سے نظر ملا جائے

نگاہِ غیظ سے دیکھے جو کوئی اس جانب
ہماری تیغوں کی جھنکار اس کو کھا جائے

[1] شپتہ ۔ نتھ ۔ زیوروں میں نتھ سب سے زیادہ قیمتی اس لئے ہوتی ہے کہ وہ سہاگ کا نشان سمجھی جاتی ہے ۔

کاشف صدیقی مانیکانوی

غزل

ذہن میں دوست کے کوچے کا سماں ہے یارو
چاندنی رات کا عالم بھی گراں ہے یارو

ذکر مے خانہ ہو یا ہو رسن و دار کی بات
ہم جہاں ہیں تو ہر اک چیز جواں ہے یارو

ہم سے آوارہ مزاجوں نے اسے سمجھا ہے
راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہے یارو

بندۂ عشق و محبت ہی سمجھتے ہیں اسے
سازِ مے خانہ بھی گلبانگ اذاں ہے یارو

عام کرنا ہے ہمیں فیضِ محبت سب پر
لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنس گراں ہے یارو

اب نہ شاخوں میں نزاکت ہے نہ وہ موجِ نسیم
گلستاں شعلہ فشاں، شعلہ فشاں ہے یارو

اس خرابات میں کوئی نہیں شایانِ نظر
دور تک سلسلۂ وہم و گماں ہے یارو

توڑ کر رکھ دو کھنکتے ہوئے پیمانوں کو
کس قدر تنگ نظر پیرِ مغاں ہے یارو

یاد ان کی ہو کہ عرفانِ محبت کا تاثر
لوگ کہتے ہیں کہ [illegible]

ظہور احمد سرور سلطان پوری

مشاہدات

زعم میں اپنے ترقی کے یہ کیا کرتا ہے
خار راہوں میں ہر انساں کی بچھانے والے
پتا بتا تو نے کبھی غور کیا ہے اس پر
کبھی ابھرے نہیں اوروں کو دبانے والے

کچھ بڑی بات تو نہ تھی سرور
کیا ستاؤں میں وجہ پامالی
اک نظر ہی کسی کی تھی جس نے
دل کی دنیا تباہ کر ڈالی

یہ ہے دنیا کسی کو کیا کہئے
روئیں سب اپنی اپنی بپتے ہیں
رونا تو مجھ کو اُن پہ آتا ہے
ڈاکوؤں کو جو شاہ کہتے ہیں

اس دو روزہ حیات میں سرور
یہ سماں بارہا نظر آیا
مجھ کو جس سے نہ تھا تعلق کچھ
وہ بھی الزام میرے سر آیا

آج بزمِ سخن میں وہ شاعر
پھول کی مثل سر نہیں چڑھتا
داد ہرگز اُسے نہیں ملتی
شعر چندے کے جو نہیں پڑھتا

شاعر عثمانی مہدی بریلوی

شاعرِ اعظم

ہوٹل میں چائے کے ہمیں اک شخص مل گئے
کہنے لگے نگار نے تو آل ورڈ کا
لیکن ہنوز ہم کو بریلی کی فکر ہے
میں نے کہا ادب میں ہے عبرت کا اک مقام
میں نے کہا ضمیر کا ہر شعر ہے حسیں
میں نے کہا کہ شوق تو ہیں واقعی ادیب
میں نے کہا کہ شعر ہیں آذر کے بھی حسیں
میں نے کہا کہ قیصر و منظر کی غزلیات
میں نے کہا کہ زیب کی ثاقب کی شاعری
میں نے کہا سبا بھی ہیں اردو کے قدرداں
میں نے کہا کہ یہ جو ہیں فیاض نکتہ چیں
میں نے کہا ہلال کے شعروں کی دلکشی
میں نے سنائے اُن کو جو شاعر کے چند بند
میں نے کہا فدائی اُردو میں شور بھی
میں نے کہا کہ لائقِ خود ہیں خطا معاف
میں نے کہا یہ حضرت شبنم بریلوی
میں نے کہا کہ شاعرِ اُردو ستار ہیں
میں نے کہا کہ عاصم و انجم کا کچھ جواب
میں نے کہا کہ فطرت و تسنیم کا کلام
شاداں کا ذکر میں نے کیا وہ جمیل ہیں
میں نے کہا کہ ساحر و شمسی کے تذکرے
میں نے کہا کہ بدر کے اشعار بھی سُنے
میں نے کہا حسن کا سمنگلا کا کچھ کلام
میں نے کہا کہ کون وہ آخر جمیل ہیں

دورانِ گفتگو میں دعا کچھ ہم سے مل گئے
ہے کون آج شاعرِ اعظم بتا دیا
وہ کون ہے کہ جس کا زبانوں پہ ذکر ہے
کہنے لگے کہ فہم سے بالا تو ہے کلام
کہنے لگے کہ ان کو تو میں جانتا نہیں
کہنے لگے کہ ان کا ترنم بھی ہے عجیب
کہنے لگے کہ لالہ و گل کے سوا نہیں
کہنے لگے سمجھ میں نہ آئیں تو واہیات
کہنے لگے کہ حضرت غالب کی پیروی
کہنے لگے کہ آپ پہ شاید ہیں مہرباں
کہنے لگے کہ حضرت گاما کے جانشیں
کہنے لگے غریب کی کیا شعر و شاعری
کہنے لگے کہ ان کا ترنم ہے دلپسند
کہنے لگے کہ اور ہیں تھوڑے سے بور بھی
کہنے لگے میں اُن کے ہمیشہ سے ہوں خلاف
کہنے لگے کہ صرف ترنم کی شاعری
کہنے لگے کہ آپ بڑے سادہ کار ہیں
کہنے لگے خدا کی قسم مستحق عذاب
کہنے لگے کہ آپ بھی لیتے ہیں کس کا نام
کہنے لگے جناب وہ بحرِ طویل ہیں
کہنے لگے ادب میں کہاں ایسے مسخرے
کہنے لگے کہ وہ تو ترنم میں کھو گئے
کہنے لگے میاں کسی شاعر کا تم تو نام
کہنے لگے کہ شاعرِ اعظم سہیل ہیں

حبیب الرحمٰن راہی بالاگھاٹی

تضمین بر غزل حضرت طرفہ قریشی

آئینہ ان کے جور و ستم کا دکھا گئے
فرہنگِ انبساط کو حیراں بنا گئے
بن کے ستارے درد کی دُنیا پہ چھا گئے
"آنسو اُمنڈ کے جب مری آنکھوں میں آ گئے
غم کی دہکتی آگ کو پانی بنا گئے"

ہر گام پر فریب ہیں ہر موڑ پر خطر
ہر تنکا ایک شعلہ ہے ہر ذرہ ایک شرر
چلتے ہیں پھر بھی آپ کے دیوانے بے خطر
"کس کو بتائیں منزلِ اُلفت میں راہبر
رستہ بتانے والے تو رستہ بتا گئے"

کیسے سناتا آپ کو حالِ دلِ تباہ
کس طرح ملتی آپ کے زیرِ نظر پناہ
اٹھتی نہیں تھی شرم کے مارے مری نگاہ
"اشکوں نے لاج رکھ لی دمِ پرسشِ غمِ
بیچارے کچھ نہیں تھے مگر کام آ گئے"

یہ خواب ہے ادھورا کہ پانی کا بُلبلہ
یا پھر کوئی مسافر جو منزل ہی نہ ہو سکا
جیسے کوئی بھٹکتے سے راہی کا نقشِ پا
"طرفہ فریبِ ہستیٔ فانی کا ذکر کیا
دھوکے میں ہم کو ناز تھا دھوکے میں آ گئے"

شہاب ناگ پوری

آں قبلۂ خورشید کے آگے ہے قمر کیا
کچھ اور نگاہوں کو مری آئے نظر کیا

محسوس مجھے ہونے لگی درد میں لذت
آہوں نے مری ڈھونڈ لیا باب اثر کیا

کرنا ہے نادان کوئی تدبیر مداوا
باتوں سے بھی بھرتا ہے کہیں زخمِ جگر کیا

کیوں خواب سے بیدار کوئی زہرہ جبیں ہو
ناکام تمنا کی دعاؤں کا اثر کیا

پتھر ہے وہ دل جس میں نہ ہو یاد کسی کی
جو درد کی عظمت کو نہ سمجھے وہ بشر کیا

راحت کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی
بیمار نہ دیکھے گا شبِ غم کی سحر کیا

کیوں کھوئے ہوئے سے نظر آتے ہو شہاب آج
پھر کوئی نظر آیا سرِ راہ گزر کیا

غزلیات

مسلم ساگری

محبت ساز بھی جھنکار بھی ہے
یہ ظالم تیر بھی تلوار بھی ہے

ارے او چومنے والے کلی کے
بتا تو آشنائے خار بھی ہے

وہ جس کے دل میں عظمت ہے فنا کی
زمانے میں وہی سردار بھی ہے

جسے رہزن کہا جاتا تھا کل تک
وہی اب قافلہ سالار بھی ہے

وہ جن کو میکدوں سے نفرتیں ہیں
انھیں بادہ کشی سے پیار بھی ہے

مرے دل میں ہے عکسِ حسنِ جاناں
نگاہوں میں فراز دار بھی ہے

ہے جو دیوانہ گل کی شوخیوں کا
وہ دیوانہ بڑا ہشیار بھی ہے

مغرور جس کو مسلم گردشوں سے
یہاں ایسا کوئی فن کار بھی ہے

نشتر ابڑدی دھولی

تری آنکھوں کے جادو چل جائیں یا تیرا غم بھول جائیں
کون سی ہے جو ان [illegible]
عشق میں بربادِ جنوں تھا میری تقدیر میں
اُن سے کہہ دو میری بربادی کا غم بھول جائیں
سیکھ لینگے قید کے آداب بھی صیاد ہم
پہلے آزادی کا وہ رنگین موسم بھول جائیں
الجھنوں سے کون ڈرتا ہے ترے اے زندگی
شرط یہ ہے پہلے اپنی زلف کے خم بھول جائیں
رحمتوں کے لطف واضح کب میسر آئیں گے
اپنا اندازِ گنہگاری اگر ہم بھول جائیں
ایسی صورت میں کرلاکھوں غم نے میری زندگی
کون سا غم یاد رکھیں کونسا غم بھول جائیں
کاش نشتر بہرِ پرسش آئیں وہ ہنستے ہوئے
تاکہ ان کی بے رخی ہم آخری دم بھول جائیں

قادری پیلی بھیت

دل بھی اب غم سے ہے بیزار خدا خیر کرے
زندگی ہم کو ہے اک بار خدا خیر کرے
آج بدمست ہیں مے خوار خدا خیر کرے
جام کھنکے ہیں لگاتار خدا خیر کرے
لیجئے میری وفاؤں نے بھی دم توڑ دیا
کس قدر ہیں وہ جفاکار خدا خیر کرے
قادری دیکھئے اس وقت ادائیں ان کی
جب وہ کہتے ہیں لگاتار خدا خیر کرے

عبدالحمید اختر راہی

ادھر ہو جاتی ہے رنگیں میرے خوابوں کی بہار
چند لمحے جو تری یاد میں سولیت ہوں
پاسِ غم بخشا ہے مجھے پاسِ ادب بھی غم کا
اشک گرتے نہیں پلکوں کو بھگو لیتا ہوں
صدف چشم سے آجاتا ہے باہر جو گہر
اپنے فرقان کے تاروں میں پرو لیتا ہوں
میری کشتی میں سمٹ آتا ہے ساحل کھنچ کر
میں جو گرداب میں اپنے کو ڈبو لیتا ہوں
دل بیتاب مرا پاتا ہے تسکین اختر
ان کی فرقت میں ذرا اب بھی رو لیتا ہوں

رہبر جدید جموں

انکی الفت میں مجھے ہونے لگی ہے آگہی
خود بخود کھلنے لگے ہیں مجھ پہ اسرار خودی
رحم کھا کر تو نے اپنے در سے اٹھوایا نہیں
خیر سے کام آگئی کچھ تو مری دیوانگی
کتبِ الفت سے درسِ عشق لے کر کیا گئے
ہو گئی اپنے گلے کا ہار یاس و بے خودی
انتہائے یاس و حسرت نے سکونِ دل دیا
اک پیام رنج و غم تھی مجھ کو راحت کی گھڑی
آپ کی کیا بات ہے اے حضرتِ رہبر جدید
آپ کو اک حال میں دیکھا نہیں ہم نے کبھی

مشتاق احمد عادل ادیب۔ کوثار

ہو چلیں کیوں تمہاری آنکھیں نم
یہ تو آخانہ ہے فسانے کا
رنج و غم میں بھی ہم نے تو اکثر
خواب دیکھا ہے مسکرانے کا
لوگ یکسر بدل گئے لیکن
رنگ بدلا نہیں زمانے کا
تم ہو ناشاد یہ نہیں منظور
شوق ہے حالِ دل سنانے کا
یاد ہے کچھ تمہیں بھی اے عادل
اس نے وعدہ کیا تھا آنے کا

جلال و جمال

سید منظور النسا بیگم منظور

بڑھتی رہتی ہے شبِ غم مختصر ہوتی نہیں
بھیڑیے انسانوں کی دنیا میں سحر ہوتی نہیں
تجھ کو بھی ہوتا اگر اندیشۂ سود و زیاں
اُن کی محفل میں جنوں تیری گذر ہوتی نہیں
زندگی کرنی ہے دانستہ گوارا ہر فریب
ورنہ جب تک کسی کی دیدۂ سر ہوتی نہیں
ہے بہت آساں کسی کا ساغرِ دل توڑنا
ترکِ رسم و راہ کی جرأت مگر ہوتی نہیں
آئینہ بن کر نہ آجاتے اگر منظور ہم
اپنے عیبوں کی انھیں ہرگز خبر ہوتی نہیں

انجم علوی کپل

حیات افروز چشمِ یار بھی ہے
سحر انگیز شعلہ بار بھی ہے
یہ ساحل بھی ہے اور منجدھار بھی ہے
محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
کہیں کیا ناصح کو اب تم ہی کہہ دو
نمازی بھی ہے اور میخوار بھی ہے
نہ گھبرا اپنی پامالی پہ انجم
بیاباں میں چھپا گلزار بھی ہے

عبداللہ قوی ٹونکی

یہ نوازش بھی تیری کیا کم ہے
میری جانب کبھی نظر نہ ہوئی
راہِ کردار سے جو بھٹکے رہیں
موت بھی ان کی راہبر نہ ہوئی
کیا بیاں کیجیے شامِ غم کا حال
شامِ غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
اُن کے آنے کا ہوش تو ہے قوی
اُن کے جانے کی کچھ خبر نہ ہوئی

بے شمار قہقہے اور مسکراہٹیں۔ دل گداز رومان، وجد آور نغمے

پدمنی پکچرز مدراس

پیش کرتے ہیں

پروڈیوسر ڈائرکٹر

بی آر پنتلو

موسیقی

شنکر جے کشن

نغمے:۔ شیلندر اور حسرت

مکالمے:۔ اندر راج آنند

شمی کپور • مالا سنہا
محمود • شبا کھوٹے
پران • من موہن کرشن
موہن چوٹی • کمود رندھیر
الیاس • ممتاز بیگم اور
اوم پرکاش

دل تیرا دیوانہ

کامیابی کی نئی تاریخ مرتب کر رہا ہے

گولچہ • ریگل • رٹز • ویسٹ اینڈ • البرٹی

رادھو شاہدہ ۔ موہن چترلوک غازی آباد

اور یوپی کے دیگر گیارہ مقامات پر

جاری کردہ:۔ راج شری پکچرز۔ چاندنی چوک۔ دہلی

بوگندہ پال ایم ۱۰ ۔ (نیروبی)

آٹومیٹک گنز

(ایک یک بابی ڈرامہ)

افراد :۔
کیپٹن براؤن
میجر ہٹ ویل
کرنل یارڈلی
کرنل جونز
سارجنٹ کارپورل ٹومرتی
لیفٹیننٹ گراس
کارپورل جیکل

منظر :۔ ایک عارضی فوجی کیمپ میں لیفٹیننٹ گراس کا کورٹ مارشل ۔ کرنل یارڈلی ۔ کرنل جونز اور میجر ہٹ ویل کیس کی سماعت کر رہے ہیں ۔ کورٹ کی ایک جانب جرم سر جھکائے کرسی پر بیٹھا ہے اور دوسری جانب کیپٹن براؤن اپنا بیان پیش کر رہا ہے ۔ اسی طرف کارپورل ٹومرتی اپنے ایک بازو کو پٹی میں لپیٹے بیٹھا ہے ۔

کیپٹن براؤن ۔ کل صبح میں اور لیفٹیننٹ گراس سفید پہاڑی سے ـــــ

میجر ہٹ ویل :۔ (بیان قلمبند کرتے کرتے رک کر) کل صبح سے تمہاری کیا مراد ہے کیپٹن ؟ ٹھیک ٹھیک ٹائم بتاؤ ۔ ؟ "

کیپٹن براؤن :۔ "ٹائم ؟ یہی کوئی نو ساڑھے نو بجے ہوں گے ۔ "

میجر ہٹ ویل :۔ "ہوں ٹھیک ٹھیک ٹائم ؟ "

کرنل یارڈلی :۔ (نشہ نشہ میں) ٹائم از ناٹ ، اے سول کورٹ ہے ۔ "

میجر ہٹ ویل :۔ "لیکن ریکارڈ کے لئے ٹھیک ٹائم کا ہونا ضروری ہے ۔ "

کرنل یارڈلی :۔ (ساتھ کا کرسی سے سر ٹکا کر) کل ہائٹ ہرسیڈ کیپٹن ! "

کیپٹن براؤن :۔ "میں کہہ رہا تھا سر ۔ "

کرنل یارڈلی :۔ "جو کہنا چاہتے ہو جلدی کہو نا ۔ "

کیپٹن براؤن (سر کو مستعد نظر آتے ہوئے) "میں سر یں اور لیفٹیننٹ گراس سفید پہاڑی سے بڑھتے ہوئے دشمن کو روکنے کا جتن کر رہے تھے ۔

کرنل یارڈلی :۔ "دشمن سفید پہاڑی سے آگے بڑھ رہا تھا یا تم سفید پہاڑی پر تھے اور دشمن تمہاری طرف بڑھ رہا تھا ؟ اپنا بیان پیش کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے صاف فقرے بناؤ کیپٹن ۔ یہ کوئی سول کورٹ نہیں ہے "

کیپٹن براؤن :۔ "یس سر ! آئی ایم سوری سر ! "

کرنل یارڈلی :۔ "پروسیڈ ! "

کیپٹن براؤن :۔ "ہم سفید پہاڑی پر تھے اور دشمن کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ہماری مشین گنوں سے گولیوں کی لکیریں چھوٹ رہی تھیں اور دشمن کے سپاہی ڈھیر ہو رہے تھے ۔ "

میجر ہٹ ویل :۔ "گڈ ! گوآن ! پھر کیا ہوا ؟ (پائپ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتا ہے) "

کرنل جونز :۔ (بیزار) ہونا کیا تھا ولی ـــ آئی مین میجر ہٹ ویل ـــ جو ہوا ، وہ تو ہمیں معلوم ہی ہے ـــ قصہ کوتاہ کرو اور لیفٹیننٹ کو سزا سنا دو "

کرنل یارڈلی :۔ "نو کرنل ، فراٹ از ناٹ ، اے سول کورٹ ۔ یو فوا (کیپٹن براؤن سے) پروسیڈ ! "

(لیفٹیننٹ گراس اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر انکی طرف پشیمان نظروں سے دیکھتا ہے)

کیپٹن براؤن :۔ "پھر یہ ہوا سر کہ عقب سے ہم پر گولیوں کی بوچھار ہونے لگی اور چشم زدن میں میرے چار بہادر سپاہی چت ہو گئے : دیکھئے ، کارپورل ٹومرتی کو بھی بازو میں گہری چوٹ آئی ہے ـــ "

(کارپورل ٹومرتی اپنی پٹی دار بازو کورٹ کی جانب کر کے کھڑا ہو جاتا ہے)

میجر ہٹ ویل :۔ "تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی کارپورل ؟ ـــ "

کارپورل ٹومرتی :۔ (اٹنشن کے پوز میں آکر) نو سر ! کر بازو ہلتا ہے تو آہ کہہ اٹھتا ہے)

کرنل جونز :۔ "تم جاؤ ، تمہیں آرام کی ضرورت ہے تمہاری گواہی بھی کیپٹن ہی پیش کر دے گا ـــ "

(کارپورل ٹومرتی کورٹ کو سیلوٹ کر کے چلا جاتا ہے)

میجر ہٹ ویل :۔ (کارپورل سے مستعلق) ڈیری سمارٹ ان ڈیڈ ! (کیپٹن کی طرف منہ گھما کر) اپنی وائٹ ہل سکرمش رپورٹ میں کارپورل کی شجاعت کا خاص ذکر کرنا ـــ "

کیپٹن براؤن :۔ "یس سر ! کارپورل ٹومرتی میری کمپنی کا ہیرو ہے ۔ وائٹ ہل اٹیک میں اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی ۔ اس کی دھماکہ خیز گولی نے کم از کم دشمن کے پچاس سپاہیوں کے بدن میں چھید کئے ہوں گے ـــ "

میجر ہٹ ویل :۔ "اگر اس بیان کو میں غیر ضروری

تو پھٹ میں دس پندرہ کی تعداد بھی کافی ہوگی ۔"

کرنل یارڈلی:۔ "یہ جانتا ہیں میجر بکیٹن کی کمپنی کا ایک چپڑاسی ہے ۔"

کیپٹن براؤن ۔ (خوش خوش) ٹھیک ہے سر!

(اتفاقی طور پر کورٹ مارشل کی کارروائی کو بھول کر)

دراصل قصہ یہ ہے کہ دشمن بے خبری میں ہی ہم پر چڑھ آیا۔ دیکھا کہا وت ہے، چوروں کے پاؤں نہیں ہوتے۔

کرنل یارڈلی:۔ "جی ہیں، کہاوت یہ ہے کہ چور پاؤں کے ہلکے ہوتے ہیں۔ اگر چور کے پاؤں نہ ہوں تو بے چارہ بھاگ کیسے پائے؟ (اس کے قہقہے گویا بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں پر ہم کی طرح پھٹنے لگے ہوں) نوجوان فوجیوں سے مجھے یہ بڑی شکایت ہے کہ وہ اپنی زبان سے متعلق معمولی احتیاط بھی نہیں برتتے ۔"

کرنل جونز:۔ (بیزار) یو آر اے ڈیم گڈ سکول ماسٹر، او ڈیئر!۔۔۔"

کرنل یارڈلی:۔ (جذبہ) میرے خون میں بھرتی ہونے سے پہلے میرے باپ کی یہی خواہش تھی کہ میں سکول ماسٹر ہی بنوں ۔۔۔"

کرنل جونز:۔ تمہارے باپ کا نیال درست تھا کرنل، تم سکول ماسٹری کے لئے بے حد موزوں رہتے۔"

کرنل یارڈلی:۔ "وائٹ ڈوئر یو! میں فطرتاً ایک سپاہی ہوں۔!"

کرنل جونز:۔ "ہاں، اور عادتاً ایک اسکول ماسٹر تم فطرتاً لڑتے ہو کرنل اور عادتاً باتیں کرتے ہو۔"

کیپٹن براؤن:۔ (ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ۔۔۔"

(میجر ہٹ ویل اسے ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہیں)

کرنل یارڈلی:۔ (میجر کو اشارہ کرتے دیکھ کر) ہیا میجر، ہمیں جلدی جلدی کام نمٹانا چاہئے۔"

(لیفٹیننٹ گراس پھر سر اٹھا کر کھڑکی کھولنا چاہتا ہے)

نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا ہے)

کرنل جونز:۔ (لیفٹیننٹ کی طرف دیکھ کر) کیا کیا؟ بھائی کا قوم سب کو علم ہے ہی۔ غدار کو سزا سنا دو قصہ ختم کرو ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ "نہیں کرنل۔ ہم قانون کی مانگ کو رد نہیں کر سکتے۔ غدار کو بھی باقاعدہ کورٹ مارشل کئے بغیر ۔۔۔"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (گویا اپنے آپ سے) میں غدار نہیں ہوں ۔۔۔ میں ۔۔۔"

کرنل یارڈلی:۔ (گرج کر) شٹ اپ! ابھی تک ہم نے یہ فیصلہ نہیں دیا کہ تم غدار نہیں ہو ۔۔۔"

کیپٹن براؤن:۔ "میں کہہ رہا تھا ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ "ارے بھئی کہہ بھی چکو نا ۔"

کیپٹن براؤن:۔ (جلدی جلدی) میں سر! کل صبح آٹھ بج کر ساڑھے سولہ منٹ پر دشمن دبے پاؤں اچانک ہمارے مورچوں پر آ گھسا ہوا۔

(میجر ہٹ ویل کیپٹن براؤن کا بیان تحریر کرنے لگتا ہے کرنل یارڈلی بھی اپنا قلم تھام لیتا ہے اور کرنل جونز بے صبری سے سگریٹ سلگا لیتا ہے)

کیپٹن براؤن:۔ ہم صرف تین آدمی تھے اور دشمن کی تعداد ہم سے کم از کم سو گنی ہوگی۔ لیکن ہم مقابلہ کے لئے ڈٹ گئے۔ ہمارے اور دشمن کے درمیان صرف دو سو یا ۔۔۔ زیادہ سے زیادہ پونے تین سو گز کا فاصلہ ہوگا ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ (پنسل کاغذ سے سر اٹھا کر) ٹھیک، ٹھیک فاصلہ تو کیپٹن ۔ ۔"

کرنل یارڈلی:۔ "خدا دوسو گز لکھ دے ۔"

کیپٹن براؤن:۔ ہم دونوں کے درمیان آناً فاناً آگ اور دھوئیں کے دریا بہنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے نہ صرف دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا بلکہ خود ان کی طرف بڑھنے لگے ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ (لکھتے لکھتے سر اٹھا کر) بڑھنے لگے ۔۔۔ شاباش! اچھا پھر کیا ہوا؟"

کیپٹن براؤن:۔ "پھر یہ ہوا سر کہ اچانک میری کمپنی میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمارے چار بہادر سپاہی یہ دیکھتے ڈھیر ہو گئے۔ ہمارے عقب سے اچانک مورچہ کا ایک تانتا پھوٹ پڑا تھا۔ گھڑی بھر کے لئے تو میں یہی سمجھا کہ دشمن نے ہمیں پیچھے سے بھی آ لیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہمارے پاؤں اکھڑ جائیں میں یکبارگی ٹھٹک گیا۔ میں اپنی کمپنی کے ایک ایک ہتھیار کو، ایک ایک آدمی کو بخوبی جانتا ہوں۔ آنکھیں بند بھی رکھوں تو مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ کون پر کس جوان کی انگلیاں متحرک ہیں ۔۔۔"

کرنل یارڈلی:۔ "ویری گڈ! مگر پھر کیا ہوا؟"

کیپٹن براؤن:۔ "یس سر! گن کی آواز میں پہچانتا تھی۔ میں ٹھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر مجھے یہ لیفٹیننٹ کہیں نظر نہ آیا ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ بزدل دشمن اور غدار دوست ہمیشہ چھپ کر وار کرتے ہیں ۔۔۔"

کیپٹن براؤن:۔ "نو سر! جب میری گھبرائی ہوئی نظروں نے لیفٹیننٹ گراس کو پا لیا تو ہمارا یہ غدار دوست گھٹنا کھڑا اپنی آٹومیٹک گن کی نالی ہمارے ساتھیوں کی پیٹھ کی طرف کئے ہوئے تھا، وہ سب بیچارے دشمن کی طرف سینہ تان کر کھڑے تھے اور ہمارا یہ دوست ان کی پشت پر آگ برسا رہا تھا ۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ (لیفٹیننٹ کی طرف قہر بھری آنکھوں سے دیکھ کر) قوم فروش! بزدل! کمینہ!

لیفٹیننٹ گراس:۔ (ہاری ہوئی آواز میں) آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں قوم فروش ہوں!"

کرنل یارڈلی (نہایت غضبناک) شٹ اپ! اٹھ منہ میں پستول رکھ کر گولی سے اپنا کام تمام کر لو۔"

لیفٹیننٹ گراس:۔ آپ بے شک مجھے گولی سے اڑا دیں۔ مگر میں قوم فروش نہیں ۔۔۔

میجر ہٹ ویل :۔ خاموش! اپنے بڑوں کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے جرم کا فیصلہ خود سنائے ــــ"

کرنل یارڈلی :۔ تمہارا فیصلہ ہماری کورٹ دیگی ــــ تمہارا اپنا دل (اتنا بھی) کہتا ہے کہ تم پر فردِ جرم کس بنا پر عائد کی گئی ہے۔ بڈھوں کی کرامات ہے۔

کرنل جونز :۔ ملزم کا جرم تو ثابت ہو چکا۔ میرے خیال میں اسے آج شام کو ساری فوج کے سامنے گولی سے اڑا دینا چاہئے۔ سمری ایکشن لو کرنل۔

میجر ہٹ ویل :۔ نہیں کرنل، ابھی کورٹ پروسیڈنگز ختم نہیں ہوئیں ــــ"

کرنل جونز :۔ ڈیم دا کورٹ پروسیڈنگز! (سنبھل کر) سارجی!"

کرنل یارڈلی :۔ (کیپٹن سے) پروسیڈ!"

کیپٹن براؤن :۔ یس سر! ــــ میں نے موقع کی نزاکت پیشِ نظر رکھتے ہوئے فائر کھولا۔ مجھے ڈر تھا کہ فیلڈ چھوڑ کر تباہ دشمن ایک بار پھر جڑ پکڑ لیتا تو ہماری جانیں تلف ہو جاتیں گی۔ اس لئے میں نے اپنے بہادروں کو بدستور آگے بڑھتے رہنے کا حکم دیا اور کارپورل ٹومی کو حکم دیا کہ وہ چار سپاہی لے کر ہمارے اس دوست کو فوراً گرفتار کرے۔ کارپورل بڑی بہادری سے اس پر جھپٹا۔ اسی اثنا میں بے چارہ بری طرح زخمی ہو گیا"

میجر ہٹ ویل :۔ یہ وہی کارپورل تو نہیں جو دشمن کو ڈھونڈ کر کے اس کے میسز میں جا گھستا تھا اور جو کے کیس اٹھوا لایا تھا۔"

کیپٹن براؤن :۔ یس سر! وہی ہے!"

کرنل یارڈلی :۔ وہی گڈ! کیپٹن، تمہارا یہ کارپورل سونے میں تولنے کے قابل ہے ــــ"

کرنل جونز :۔ ڈیم اٹ! یو شٹ اپ کرنل، ہارڈ ورڈ میں تولنے کے قابل ہے: ہم فوجیوں کو سونے سے کیا نسبت!"

کرنل یارڈلی :۔ وہی جو میں اپنا اور تمہارا ہے۔ میں تو اصل سوچ رہا تھا کہ اس بار گھر ولوں گا تو بیوی کو نئے سوٹ کا ایک پیکس بنوا کر لے بخشوں گا ــــ"

(کرنل یارڈلی کوٹ کو بھول کر اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیتا ہے اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی جما کر گویا ایک لمحے کے لئے گھر جا پہنچتا ہے)

کرنل جونز :۔ (دھیمی آواز) کال بیک دا سولجر ان یو! او لیو مائے ــــ"

کرنل یارڈلی :۔ (چونک کر) یس کیپٹن پروسیڈ! ــــ"

کیپٹن براؤن :۔ یس سر! لیفٹیننٹ بہت کوشش کے بعد قابو میں آیا۔ وہ نہ جیتے جی تھا کہ میرے کئی اور جوان دشمن کا مقابلہ کرتے کرتے اس دوست سے پٹ چکے

میجر ہٹ ویل :۔ کیپٹن، کیا تم نے گرفتاری سے پہلے لیفٹیننٹ کو وارننگ بھی دیا؟"

کیپٹن براؤن :۔ یس سر۔ پہلی گھڑی مجھے یہی خیال گزرا کہ شاید یہ بدحواس ہو گیا ہے۔ مگر اس نے میری تنبیہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یار ہمارا دشمن سے ملا ہوا ہے ــــ"

لیفٹیننٹ گراس (تڑپ کر کھڑا ہو کے) اگر یہ بات تھی تو اس وقت میں نے دشمن کی سمت بھاگنے کی کوشش کیوں نہ کی۔؟"

کیپٹن براؤن :۔ تمہارا بھید کھلتے ہی شیطان نے تمہارے حواس سلب کر لئے ــــ"

لیفٹیننٹ گراس :۔ (دردناک اور غصہ کی آواز میں) ہاں شیطان نے میرے حواس سلب کر لئے ــــ"

میجر ہٹ ویل :۔ (ڈپٹ) تو پھر تمہیں اپنے جرم کا اقرار ہے؟"

کرنل جونز :۔ ملزم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے میرا فیصلہ ہے، اسے آج ہی ــــ ابھی گولی سے اڑا دیا جائے ــــ"

کرنل یارڈلی :۔ (لیفٹیننٹ سے گویا اپنے منہ میں بڑبڑانے کے انداز میں) خدا!"

لیفٹیننٹ گراس :۔ نہیں، میں خدا نہیں ہوں میں نے اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔!"

کرنل یارڈلی :۔ تم بزدل ہو۔ تمہیں مرنے سے لگ رہا ہے!"

لیفٹیننٹ گراس :۔ (دھیمے دھیمے، گویا توجہ کا طالب) نہیں مجھے ڈر نہیں لگ رہا، مجھے تو رہا ہے کہ میرا سر یا دھڑ سے اڑا دیا ہے اور میں ادھر میں مر کر بھی زندہ ہوں ــــ"

میجر ہٹ ویل :۔ اطمینان رکھو، تھوڑی میں جب ہم تمہارا سر گولی سے اڑا دیں گے تو اپنے سب احساسات سے نجات پا جائے گے۔

لیفٹیننٹ گراس :۔ ہاں میرے فائر کی اڑا دو۔ شوٹ کرنے کی بجائے مجھے بم سے اڑا دو۔ میرا وجود جھلس کر، راکھ ہو کر فضا میں دھوئیں جائے۔ میں ــــ مجھ سے اب یہ جہنم برداشت ہوتا ــــ میں ــــ"

کرنل جونز :۔ اس کی کھوپڑی میں ایک کیوں اپنا قیمتی وقت ــــ"

لیفٹیننٹ گراس :۔ (آہستہ) ہاں ختم کرو ــــ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے میں زندہ رہنا نہیں چاہتا ــــ"

کرنل یارڈلی :۔ (بلند بانگ طنز میں) اس خواہش کو ضرور پورا کریں گے ــــ"

لیفٹیننٹ گراس :۔ میری ایک اور

کرنل یارڈلی :۔ (وہی لہجہ) بیان کی حکومت کا دل بہت بڑا ہے!"

لیفٹیننٹ گراس :۔ میری موت کی نہ پہنچائی جائے ــــ جنگ کے بعد کی ــــ

کرنل یارڈلی:۔ کیوں؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ اس لئے کہ میں نے اپنی بوڑھی ماں سے جنگ سے لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ وداع کے وقت جب وہ رو رہی تھی تو میں نے خدا کے بیٹے کی قسم کھا کر اسے یقین دلایا تھا کہ میں جنگ میں کام نہیں آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تادمِ آخر اس کا بھرم بنا رہے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ میرے وجود کو ختم کر دیجئے۔ لیکن ماں کے دل میں بیٹھا ہوا میری زندگی کا خیال تو بے ضرر ہے ــــ"

(کرنل یارڈلی کچھ کچھ متاثر دکھائی دیتا ہے)

کرنل جونز:۔ یہ چالاک آدمی ہمیں بے سمجھ کر جذباتیت کا شکار بنانا چاہتا ہے (کرنل یارڈلی سے) فضول باتیں چھوڑو کرنل اور کام شروع کرو۔"

کرنل یارڈلی:۔ (گویا اپنی غیر یقینی سی ہمدردی کے تاثر کو پرے جھٹک کر لیفٹیننٹ سے) سچ سچ بتاؤ کیا تم دشمن سے ملے ہوئے ہو؟"

میجر ہٹ ویل:۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دشمن کا جاسوس ہے اور موقع ملے ہی ــــ"

کرنل یارڈلی:۔ ٹھہرو میجر۔ میں نے اپنا سوال اس سے کیا ہے ــــ"

کرنل جونز:۔ تم واقعی سپاہی سے زیادہ اسکول ماسٹر ہو کرنل۔ جب تمہیں جواب کا علم ہے تو سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

کرنل یارڈلی:۔ (بدستور لیفٹیننٹ سے) میرے سوال کا جواب دو! کیا تم دشمن کے آدمی ہو؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ نہیں۔ میں خدا کا آدمی ہوں

کرنل جونز:۔ (ہنس کر) ہو گئی تسلی؟ خدا کے اس بندے سے اب اپنا اگلا سوال پوچھو ــــ"

کرنل یارڈلی:۔ (لیفٹیننٹ گراس کی آنکھوں میں گھور کر) میرے سوال کا جواب دو! کیا تم دشمن کے جاسوس ہو؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (پہلے سے بھی پست) نہیں"

کرنل یارڈلی:۔ (بچے کو پٹاخہ ڈرا کر) تو پھر تم نے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف کیوں تھا؟ تم نے اپنے ساتھیوں کی جان کیوں لی؟ کیوں لی؟ جواب دو!"

(لیفٹیننٹ گراس گویا کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن کرنل یارڈلی کی طرف بے چین خاموشی سے دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے اور اپنی ہتھیلیاں ملنے لگتا ہے)

کرنل یارڈلی:۔ چپ کیوں ہو؟ تمہاری خاموشی سے پتہ چلتا ہے کہ تم واقعی دشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہو تمہیں مناسب موقع کا انتظار تھا۔ دشمن کے اچانک حملے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی غدار ہمارے کسی اہم راز دشمن تک پہنچا رہا ہے۔ کیا تم چاندی کے چند ٹکڑوں کے لئے اپنی ساری قوم کو بیچ دینا چاہتے تھے؟"

کرنل جونز:۔ سونے کے چند ٹکڑوں کیلئے، کرنل"

کرنل یارڈلی:۔ (اپنے اعتقاد کی سچائی پر کامل یقین کرتے ہوئے نہایت طیش میں) کائر ــــ قوم فروش! ــــ"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (آنکھیں نیاب آنسوؤں سے بھری ہوئی) نہیں! نہیں! نہیں!"

کرنل یارڈلی:۔ تو پھر تم نے اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کی بجائے اپنی کھوپڑی کو کیوں نہ اڑا دیا؟"

میجر ہٹ ویل:۔ ہاں، جواب دو!"

لیفٹیننٹ گراس:۔ آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں۔ لیکن مقدس بائبل کی قسم، میں جھوٹ نہیں بولوں گا ــــ"

کرنل یارڈلی:۔ بولو!"

کرنل جونز:۔ کیوں اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہے ہو؟"

میجر ہٹ ویل:۔ (لیفٹیننٹ گراس) کہنے کا وقت ضائع مت کرو ــــ"

لیفٹیننٹ گراس:۔ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آئے تو آپ مجھے قصوروار نہیں ٹھہرائیں گے ــــ (رک کر شروع کرتا ہے) جب دشمن نے اچانک آدھی رات میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات گیا۔ میری گولیاں بھی موت موت چلاتی ہوئی دشمن کی صفوں میں بے تحاشہ دوڑنے لگیں۔ مارو! مارو! مارنے کے سوا مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا اور میری واحد خواہش ــــ مارنے کی خواہش میری گن سے دھماکے کی بن بن کے برس رہی تھی۔ برس برس کے بے حال ہو رہی تھی۔ (جنونی موت شاید اسی خواہش سے پیدا ہوتی ہے ــــ (رک جاتا ہے)

کرنل یارڈلی:۔ یس، پر سیڈ!"

لیفٹیننٹ گراس:۔ اسی دوران میں مجھے چند گز کے فاصلے پر دشمن کے چار سپاہی نظر آئے۔ جو میری بائیں ڈھلوان سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے جھٹ اپنی گن کا دہانہ ان کی طرف موڑ لیا اور میرے دیکھتے دیکھتے ان کی لاشیں نیچے ڈھلک گئیں۔ ابھی میری گن سے گولیوں کا دھواں خارج ہو رہا تھا کہ اسی مقام پر میری نظر ایک سوکھی ہوئی لرزاں جھاڑی کے پیچھے جم گئی۔ وہاں میرا مرحوم باپ کھڑا تھا! آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن دشمن کی صفوں میں بھی یہ بالکل ایسا ہی ہو بہو میرا مرحوم باپ تھا۔ میں سناٹے میں آ گیا ــــ"

میجر ہٹ ویل:۔ کیا تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو؟ اس بات کی طرف آؤ ــــ"

کرنل یارڈلی:۔ ہاں، جو سوال تم سے پوچھا گیا ہے اس کا جواب دو!"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (اپنی لے میں، مگر اپنی آواز پر کان دھرے ہوئے) میں سناٹے میں آ گیا۔ میں اپنے مرحوم باپ کی شبیہ ہمیشہ اپنے فاکشن میں صاف شناخت کیا ہوں (وردی کے نیچے سے فاکٹ نکال کر) یہاں ــــ اور اس کی شکل میرے مشن میں بڑی واضح حالت میں گڑی ہوئی ہے۔ سر، وہ بوڑھا باپ یقیناً میرا باپ تھا ــــ

کرنل یارڈلی:۔ (یہ سُن کر) سٹف اپ مین سنس! یہ سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ (اور پھر گہرا اطمینان میں لیفٹیننٹ گراس کی ذات سے متعلق سوچ کر) پھر کیا ہوا؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دعا مانگنا شروع کر دی۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو سوکھی ہوئی جھاڑی کی بجائے زندہ معلوم ہو رہی تھی اور اس کے نیچے بوڑھے کی جھریوں بھری بھیانک شکل دکھائی دی۔ میں نے اپنی خندق سے سر اٹھا کر اس کے چہرے پر گولی باندھ دی۔ وہ اصل وہ تھا ہی میرا باپ!"

کرنل جونز:۔ (اپنے تجسس سے مجبور ہو کر چڑچڑے لہجے میں) پھر کیا ہوا؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ پھر سے (اپنی آواز میں کپکپی محسوس کر کے ذرا ٹھہر جاتا ہے)

کرنل یارڈلی:۔ (اچانک اپنا سوال یاد کر کے) تم نے اپنے ساتھیوں کی جان کیوں لی؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (لمبا سانس کھینچتا ہے) جو شخص اتنی بے رحمی سے اپنے باپ کی جان لے سکتا ہے، کیا وہ اپنے ساتھیوں کی جان نہیں لے سکتا؟"

کرنل جونز:۔ (سر جھٹک کر گویا لیفٹیننٹ کے علم سے باہر آنے کی کوشش کر کے) ہمیں تمہارے اس ڈرامے میں دلچسپی نہیں۔ صاف صاف بتاؤ۔ تم نے کیا سوچ کر اپنے آدمیوں پر فائر کیا۔؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (جیسے کوئی اپنا بھیانک خواب یاد کر رہا ہو) ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں پر فائر کرنے سے پہلے میں واقعی کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا۔ میں۔۔۔ میں بدحواس ہو گیا تھا۔ میری آنکھ ٹھیک سے اپنے آپ ہی میرے ساتھیوں کی طرف اٹھ گئی تھی۔۔۔ دیکھا کہ بھلا کر رہے ہیں۔۔۔ کیوں مجھے مار کر رہے ہو؟ مجھے شوٹ کر دو۔ ابھی! اسی وقت! ہاں، مجھے اپنے جرم کا اقبال ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مارا ہے۔"

کرنل یارڈلی:۔ لیکن کیوں؟ تم نے اپنے ساتھیوں کو کیوں مارا؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ کیونکہ مارا کر مجھے یوں لگا کہ میرا کام صرف مارنا ہی ہے۔ اپنے باپ کو۔ ساتھیوں کو دشمنوں کو، جو سے میری کوئی دشمنی نہیں۔۔۔ سب کو!"

کرنل یارڈلی:۔ (لاشعوری طور پر بھدے انداز سے) کیا تم پاگل ہو گئے تھا؟"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (بڑا واضح) پتہ نہیں، مجھے یوں لگا کہ میں انسان نہیں، میں اپنی آٹو میٹک گن ہوں۔ میرے کوئی دل و دماغ نہیں۔ میں۔۔۔ گن کو کیا پتہ کہ اس کے منہ سے کس کی موت برآمد ہو رہی ہے؟"

کرنل جونز:۔ (لیفٹیننٹ کے اعتراف سے متاثر ہو کر اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے) شٹ اپ!"

لیفٹیننٹ گراس:۔ (بدستور اپنی دھن میں کھوئے) میرا کوئی دشمن نہیں، کوئی دوست نہیں۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں، اجل کی ایک فوجی۔۔۔"

کرنل جونز:۔ (بدحواسی میں گرجا کر) آئی سے، شٹ اپ!۔۔۔ کرنل یارڈلی، اسے ایک گولی سے نہیں ثابت گولے سے اڑا دو!"

(اسی اثنا میں کارپورل جیکل تیز تیز داخل ہو کر سیلوٹ کرتا ہے)

کارپورل جیکل:۔ (کرنل یارڈلی کے سامنے ایک کاغذ رکھتے ہوئے) ہیڈ کوارٹر سے ابھی ابھی یہ وائرلیس میسج آیا ہے۔"

(کرنل یارڈلی کاغذ اٹھا کر پڑھتا ہے)

کرنل یارڈلی:۔ (مسرت سے مغلوب آواز میں) تعجب ہے!"

کرنل جونز:۔ کیا پیغام آیا ہے؟"

(میجر ہٹ ویل اور کیپٹن براؤن بھی سوالیہ نظروں سے کرنل یارڈلی کی طرف دیکھتے ہیں)

کرنل یارڈلی:۔ ہیڈ کوارٹر سے فوری سپریم کمانڈر کا حکم آیا ہے۔۔۔"

کرنل جونز:۔ (سراپا سوال) کیوں؟!"

کرنل یارڈلی:۔ (مسرور لہجہ) یوں لگتا ہے کہ دونوں سرکاروں کے درمیان ایک ڈرامائی سمجھوتے پایا ہے۔ اطلاع کے مطابق دشمن اپنے اتحادیوں سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اس کی فوج اب ہماری فوجوں سے مل کر جنگ لڑیں گی۔۔۔"

میجر ہٹ ویل:۔ (خوشی سے اچھل کر) لاکھ لعنت عدم لیشنر۔!"

(کیپٹن براؤن بھی شادمانی میں بے اختیار اپنی کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے)

کرنل جونز:۔ (چہرے پر راحت آگیں ڈھیلا پن) اِٹ از اے ڈیم گڈ نیوز! (میجر ہٹ ویل سے) یو لی۔ یو اولڈ فاکس، تم نے وہ وہسکی کی بوتل کہاں چھپا رکھی ہے؟ (اچانک لیفٹیننٹ گراس کو اپنی طرف اکڑی اکڑی یاس آمیز نظروں سے دیکھتے پا کر، شگفتہ لہجے میں) یو آٹو میٹک گن، کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے کہ ہم تمہیں گولی سے داغ دیں گے؟"

(لیفٹیننٹ گراس سر جھکا کر گشتہ سا دکھائی دیتا ہے)

کرنل جونز:۔ (گویا اس کی خاموشی میں شور محسوس کر کے) شٹ اپ!۔۔۔ میرا مطلب ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟"

کرنل یارڈلی:۔ (کرنل جونز سے) اس کی لیفٹیننٹ گراس سے بات چیت کو نظر انداز کر کے) آئی سے کرنل جونز، ان لوگوں کی دوستی ہمارے لئے بہت مفید ہو گی

کرنل جونز:۔ (بدستور لیفٹیننٹ گراس سے، اب اس کی خاموشی سے بے حد بے تاب ہو کر) بولو، بولو!

لیفٹیننٹ گراس:۔ (بحیثیت سر اٹھا کر، گویا

(باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

مسلمی، نذیر الدین صاحب۔ کیلی

آئینہ

دہلی ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء

ڈیر، تم! نیا سال مبارک

تم حیران ہو گے کہ ۲۰ میں یہ نیا سال کیسا مبارک لیکن یار! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اپنا نیا سال جون سے ہی شروع ہوتا ہے کیونکہ کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد نئے سرے سے جون میں ہی کھلتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کالج کھل گیا ہے اور سب دوست پھر سے مل گئے ہیں مگر تمہاری کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے، تمہیں سب دوست بہت یاد کر رہے ہیں ـــ وہ تمہارا الکیلی سے چھیڑ چھاڑ کرنا۔ انھیں قابو میں کرنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں کرنا سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ یار! تم خواہ مخواہ پڑھائی چھوڑ کر نوکری پر چلے گئے۔ صرف ایک سال کی ہی تو بات تھی۔ ایک سال اور پڑھ لیتے تو تمہارے گھر میں کون سا انقلاب آ جاتا۔؟

اس بار بھی ہمیشہ کی طرح بہت سی حسین لڑکیاں نے داخلہ لیا ہے۔ تم ہوتے تو خوب گزرتی۔ اپنا دل تو ایک حسینہ پر آ گیا ہے۔ ظالم بہت خوبصورت ہے یار! لیکن مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ فی الحال آگ صرف اپنی طرف ہی لگی ہے کوئی ایسی ترکیب بتا دو کہ اُدھر بھی آگ برابر لگے۔ تمہارے خط کا انتظار رہے گا

تمہارا ـــ پرتاپ

دہلی ۔ ۳۰ جون ۱۹۶۳ء

ڈیر پرتاپ!

تمہارا خط ملا۔ ارے یار تم تو ذرا سی بات پر گھبرا گئے۔ ایک لڑکی سے محبت کرنے کی ترکیب مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ یا کیا میرے ساتھ اتنے دن رہنے کے بعد بھی تم کچھ نہیں سیکھ سکے۔ پرتاپ صاحب! اپنے پاس ایک ترکیب کیا ہزاروں ترکیبیں پڑی ہیں۔ کہو تو سب ہی لکھ دوں۔ مگر ان سب کی ضرورت کیا ہے۔ فی الحال ایک ترکیب سے ہی کام چلی جائے گا۔ پہلے تمہیں گفتگو شروع کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں، اس پر عمل شروع کر دو، بھگوان کی دیا سے مواد آتے گی

وہ تمہارا حسینہ لائبریری میں آتی ہی ہو گی تو بس تم چپ کر اس کے لائبریری آنے کا انتظار کرتے رہنا۔ جب وہ آ کر کسی پر اطمینان سے بیٹھ جائے تو تم اپنے اچھے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا کرو، اور اس کے قریب جا کر کہو:۔

"معاف کیجیے گا۔ کیا آپ کو یہاں کوئی پین ملا ہے؟"

ظاہر ہے، جواب نہیں میں ملے گا۔ تم اور پریشان ہو کر لائبریری سے نکل جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنا

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، میری یادداشت ذرا کم زور ہے۔ میں سمجھا تھا کہ میں یہاں اپنا پین بھول کر چلا گیا۔ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔ پین تو میرے دوست کے پاس تھا۔ جیسے خود میں نے ہی دیا تھا۔"

اس پر وہ مسکرائے گی، بس! آگے حالات خود تمہارا ساتھ دیں گے، تمہارے پاس کاپی ہے تم راستے میں اسے نقشہ دیتے رہنا۔ اُدھر بھی آگ برابر لگنے کی اطلاع دینا

تمہارا ـــ دیوندر

بنگلور ۔ ۲ اگست ۱۹۶۳ء

پیاری کمو

تمہارا پتر ملا۔ میں یہاں اچھی ہوں، تم تو بڑی ہی چالاک ہو۔ باتوں باتوں میں میرے دل کا راز معلوم کر لینا چاہتی ہو۔ میں کیا بدھو ہوں جو تمہاری باتوں میں آ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ مگر کمو! تم مجھے کتنی غیر سمجھتی ہو۔ کیا میں نے کبھی تم سے کوئی بات چھپائی ہے؟ سیدھی طرح سے پوچھتیں تو سب کچھ بتا دیتی۔ اس کے لئے اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی، ہاں! میں انھیں دل دے بیٹھی ہوں۔ میرے ہی کالج میں تھرڈ ائیر میں پڑھتے ہیں۔ نام ہے پرتاپ، وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اگر دیکھنا چاہتی ہو تو آنٹی سے اجازت لے کر یہاں آ جاؤ ـــ بس اب اجازت دو، کالج کا وقت ہو رہا ہے اور وہ باہر کار میں بیٹھے ہارن پر ہارن بجائے جا رہے ہیں۔ آنٹی کو میرا پرنام کہنا۔

تمہاری ـــ ٹی۔

راجپور ۔ ۹ اگست ۱۹۶۳ء

بیٹا ٹی! بہ خوش رہو

آج تمہارا خط اور منی آرڈر دونوں موصول ہوئے مجھے تو تمہاری ہی فکر رہتی ہے۔ تم وہاں کتنی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے اس لڑکی کی بہت چنتا لگی رہتی ہے۔ بیٹا لڑکی جب جوان ہو جاتی ہے تو ماں باپ پر ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ کوئی اچھا سا بَر دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔ خواہ مخواہ پڑھاتے رہنے سے کیا فائدہ۔ آج کل زمانہ خراب ہے

تمہاری ـــ ٹی

بمبئی ۔ ۱۱ اگست ۶۲ء

پوجیہ ماتا جی! پرنام

آپ کا پتر ملا۔ آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں۔ زمانہ خراب ہے تو کیا ہم لوگ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زمانہ سے ڈر کر ہم اپنی عورتوں کو تعلیم نہ دیں۔ زمانہ بدل گیا ہے ماتا جی۔ آپ کا زمانہ اب نہیں رہا۔ آپ کوئی چنتا نہ کریں۔ میں اچھے سے بر کی تلاش میں ہوں۔

آپ کا بیٹا ـــ دیوندر

بنگلور ۔ ۱۱ اگست ۶۲ء

ڈیر دیوندر!

آج ہوں یار! تم تو بڑے استاد نکلے۔ ٹرک کیا بتائی کہ میں اپنی زندگی ہی کھو گئی۔ معافی چاہتا ہوں، خط لکھنے میں دیر ہو گئی۔ مگر تم تو جانتے ہی ہو کہ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو کچھ ہوش ہی نہیں رہتا ـــــ

تم سے ایک بات پوچھنی ہے یار، وہ لڑکی ہے نجیب، میں اس سے کہتا ہوں کہ چلو ہم چپکے سے شادی کر لیں تو مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ پہلے میں جا کر اس کی ماتا سے ملوں۔ اب بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہو۔ کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ بس وہ میری بات مان جائے۔

تمہارا ـ پرتاپ

بمبئی ۔ ۱۷ اگست ۶۲ء

پرتاپ ڈیر!

تم تو نرے گاؤدی ہو یار! تمہارے ہاتھ سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ اگر محبت کرنی ہو تو پہلے اس کے داؤ پیچ سیکھ لینا چاہئے۔ تم اسے سمجھاؤ کہ اگر تم اس کی ماتا جی سے ملو گے تو بات بگڑ جائے گی۔ وہ تمہارا کاسٹ آتا جانا بند کر دے گی اور اس کے لئے بہت دقت پیدا ہو گی۔ کیوں نہ چپکے سے سول میرج کر لیں۔ آگے چل کر رفتہ رفتہ سب راضی ہو جائے گا۔ یہاں یہی ہوا تھا تو کیا کرے گا قاضی۔

تمہارے ایک شکایت ہے، تم مجھے صرف اس وقت خط لکھتے ہو جب تمہاری غرض ہوتی ہے۔ آئندہ یہ خیال رہے۔

تمہارا۔ دیوندر

بنگلور ۔ ۱۲۵ اگست ۶۲ء

پیارے دیو!

بہت دن ہو گئے۔ جیسے کا تیسا لکھا ہے، میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا اور تم نے بھی مجھے ایک دم بھلا دیا۔ کیا ہمارا ساتھ صرف کالج تک ہی تھا، ارے یار تمہارے بغیر تو اب کالج تو پھیکا پھیکا سا لگتا ہے تمہاری کمی پروفیسر بھی محسوس کر رہے ہیں ـــ

آج تمہیں ایک مزے دار بات بتاتا ہوں، وہ اپنا پرتاپ ہے نا۔ وہ بھی آج کل محبت کرنے لگا ہے تم سنو گے تو حیرت میں پڑ جاؤ گے۔ لڑکی بھی بہت خوبصورت ہے مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ یہ احمق پرتاپ اس لڑکی کو کیسے بھا گیا۔ دنوں میں بہت گاڑھی چھن رہی ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آج کل میں سول میرج ہو جائے گی

تمہارا ـ جاوید

بنگلور ۔ ۵ ستمبر ۶۲ء

پیاری کمو!

آج تمہیں یہ خط لکھتے ہوئے مجھے بہت مسرت ہو رہی ہے۔ خط پڑھ کر تم بھی خوش ہو جاؤ گی۔ بات یہ ہے کہ میں اور پرتاپ آٹھ دن بعد "ہنی مون" منانے اوٹکمنڈ جا رہے ہیں۔ تم حیرت میں پڑ گئی ہو گی کہ اچانک یہ ہنی مون کیسا۔ ارے بھئی! ہم دونوں نے کل ہی سول میرج کر لی ہے، مجھے سخت افسوس ہے کہ شادی تمہارے بغیر ہو گئی لیکن کیا کروں مجبوری تھی۔

تمہاری ـــ تا۔

راجپور ۔ ۷ ستمبر ۶۲ء

بیٹا دیو!

اس پتر کو تار سمجھو اور جلد چلے آؤ ـــ بیٹا ہماری موت منی میں لکھی گئی۔ اپنی بہن کے کرتوت سنو گے تو سر پکڑ کر رہ جاؤ گے۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ اسے آگے پڑھانا ٹھیک نہیں۔ پتا جی کی بات چلتی تو ٹھیک تھا۔ مگر ایک جوان لڑکی کو دوسرے شہر بھیج کر پڑھانا کہاں کی عقلمندی تھی۔ تار کی سیدھی کملا اس کا خط لے کر آئی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے کسی پرتاپ نامی لڑکے سے سول میرج کر لی ہے اور ہنی مون منانے جا رہی ہے۔ تم جیسی طرح جا سکو جلد چلے آؤ

تمہاری ماتا

پریس ایکٹ

چین کے جارحانہ و جابرانہ حملہ کے پیش نظر اہل بھارت کو آزادی کی حالات کا سامنا ہے۔ اندرونی حالات جشن آبرو منانا قومی غیرت اور ملکی مفاد کے سراسر خلاف ہے۔ جب تک بھارتی سرزمین کا ایک انچ بھی ظالم چینیوں کے قبضہ میں ہے شیرازہ ترک ہم پر حرام ہے، چنانچہ بادل نخواستہ انعقاد جشن ابر فی الحال ملتوی کیا جا رہا ہے۔ صورت حال اصلاح پذیر ہونے کے ساتھ ہی شعلہ و شبنم میں جشن ابر کا مکمل پروگرام شائع کیا جائے گا

آیئے ہم سب حلف لیں کہ غاصب چینیوں کو اپنی پاک سرزمین سے نکالنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ ان شاء اللہ فتح ہماری ہو گی اس لئے کہ ہم حق پر ہیں۔ بدی کی طاقتیں کبھی نیکی پر غالب نہ آ سکیں گی۔

دفتر شعلہ و شبنم میں اکثر و بیشتر مفت پرچہ جاری کرنے کے خطوط آتے رہتے ہیں اور ہم انہیں ان کی مناسب جگہ یعنی ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ کچھ دنوں سے یہ بیماری عام ہو گئی ہے۔ حیرت ہے کہ پان سگریٹ، چائے اور سینما پر تو ہم بے دریغ روپیہ صرف کر سکتے ہیں مگر رسائل کو مفت پڑھنا اپنا حق بنا چکے ہیں۔ ازراہ کرم آئندہ اس قسم کے خطوط روانہ نہ فرمایئے۔ ادارہ ایسی فرمائش کی تعمیل سے معذور ہے

(ادارہ)

اپنا فرض پہچانیئے
ملک کی خدمت کیجئے
سیونگز والینٹر بنئے

آپ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی کام کرتے ہوں آپ سیونگز والینٹر بن کر موجودہ ہنگامی حالات میں ملک کی واقعی بڑی خدمت کر سکتے ہیں ملک کی حفاظت کے لئے پیسوں کی فوری ضرورت ہے۔ لہٰذا جیبوں کو اکٹھا کرنا حملہ آور کو منہ توڑ جواب دینے کے عوام کا واضح ترین اظہار ہے۔
ہر شہر، ہر گاؤں میں لوگ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بچت کرنے اور روپیہ قومی بچت اسکیموں میں لگانے پر آمادہ ہیں۔ باقاعدگی سے بچت کرنے کے کام میں آپ ان کی مدد و رہنمائی کر سکتے ہیں۔

آپ سیونگز والینٹر کیسے بن سکتے ہیں؟

اگر آپ کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ ہے تو سرکار آپ کو قومی بچت اسکیموں میں عوام کا روپیہ جمع کرانے کا اختیار دے گی۔ باقاعدہ یکسوئی کے لئے آپ اپنے علاقے کے تحصیلدار/کلکٹر کو فوراً درخواست دیں۔ رسمیات کی تکمیل پر آپ کو ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوں گے

نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹوں
ڈیفنس ڈیپازٹ سرٹیفکیٹوں
انوئیٹی سرٹیفکیٹوں

میں روپیہ لگانے کے لئے آپ کو اپنے دوستوں، پڑوسیوں، ساتھیوں اور دوسروں سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے رسیدیں دی جائیں گی۔

بیچے گئے سرٹیفکیٹوں پر آپ کو کمیشن ملے گی
نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹوں کی بکری پر ۱½ فی صد اور انوئیٹی سرٹیفکیٹوں،
ڈیفنس ڈیپازٹ سرٹیفکیٹوں کی بکری پر ۱ فی صد

اگر چاہیں تو کمیشن کے طور پر ملنے والا روپیہ آپ قومی دفاعی فنڈ میں جمع کرا سکتے ہیں اگر آپ بنا کمیشن کام کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم کلکٹر کو اس امر سے آگاہ کریں۔

آپ سیونگز والینٹر بن کر تین نیک کام سرانجام دیں گے۔ آپ ملک کی حفاظت اور پلان کے پروجیکٹوں کو پورا کرنے کیلئے نئی بچت لائیں گے، کمیشن کی رقم سے قومی دفاعی فنڈ میں اضافہ ہوگا۔ آپ بچت کی عادت کو بڑھاوا دینے اور قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

بھارت کی دفاعی طاقت کو بڑھایئے
قومی بچت آرگنائزیشن

DAVP/610

محمد رفیق خاں اشرافندری

میں طوائف نہیں تھی

شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ میں نے ناول "مسسز سال" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو چہرہ مشکبار بال پریشان کئے ہوئے سعیدہ کمرہ میں کھڑی تھی۔ وہ میرے بچپن کی ساتھی تھی میری ہم جماعت تھی۔ میری کائنات، میری زندگی تھی۔ عنقریب ہی اس کی شادی میرے ساتھ ہونے والی تھی۔ میں نے سعیدہ سے کہا۔ "کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو"۔ "امی جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے"۔ سعیدہ نے بھرائی آواز میں کہا۔

میں نے جلدی سے جوتے پہنے اور اس کے ساتھ ہولیا اس کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم چند ہی منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے پہنچنے سے پیشتر ہی مختار و بیقرار سرائے رخصت ہو چکی تھیں۔ ان کے بے روح جسم کو دیکھ کر سعیدہ نے زور کی چیخ ماری اور زمین پر گر پڑی۔ اس کی چیخ سن کر اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ سعیدہ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

میں نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ فون کرنے کے بعد محلے کی عورتوں سے کہا کہ آپ سعیدہ کو سنبھالیے۔ میں رشید کو لے کر آتا ہوں۔ رشید سعیدہ کا بھائی تھا۔ مگر غلط سوسائٹی نے اسے غلط راستے پر لگا دیا تھا۔ اسے غلط راستے پر لگانے میں دوستوں کے ساتھ ساتھ میں بھی برابر کا شریک تھا۔

اس کے والد مرحوم کافی جائداد چھوڑ گئے تھے مجھے اس کے کچھ اثاثے معلوم تھے۔ میں اس کی تلاش میں نکل گیا۔ میں جب رشید کی گلی میں پہنچا۔ میری نظر ایک خوبصورت لڑکی پر پڑی جو بیٹھے چلم کا دم لگا رہی تھی۔ وہ رشید کے دوستوں سے تھے۔ میں نے ان سے معلوم کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں اس وقت رشید صاحب کہاں مل جائیں گے؟ وہ حضرت منہ بنا کر بولے ان کی کیا پوچھتے ہو کبھی کبھی جہاں آرا کے کوٹھے کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا یہ جہاں آرا کا کوٹھا کدھر ہے؟ "وہ دیکھو وہ جو بڑی بلڈنگ نظر آرہی ہے، اس کے قریب ہی جہاں آرا کا کوٹھا ہے" ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ میں ان سے رخصت ہو کر بلڈنگ کے قریب ہی کوٹھے پر چڑھ گیا۔ زینہ طے کرنے کے بعد جب میں کوٹھے کے دروازے پر پہنچا۔ کوئی کہہ رہا تھا میں یہاں سے نہیں جاؤں گا" یہ آواز رشید کی تھی ——

میں کوٹھے کے دروازے پر لٹکی ہوئی چلمن کے قریب ٹھہر گیا چلمن بہت ہی حسین تھی۔ میں نے دیکھا ایک نوعمر لڑکی نیلے رنگ کی پوشاک پہنے ہوئے جس پر بناوٹ کا نفیس کام تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ گلے میں ہیروں کا ہار تھا۔ جو آب تاب میں اس کے رنگ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ جو گلاب کی پتیوں کی طرح سرخ اور نازک تھے ایک زاہد فریب تبسم نظر آرہے تھے۔ اس کے ہوش ربا تبسم کی چمک دمک اس بلا کی تھی کہ میری عقل حیران تھی۔ وہ مست نظروں سے رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "میں کہتی ہوں آپ یہاں نہ آیا کیجئے یہ جگہ شریفوں کے قابل نہیں ہے۔ یہاں آکر آپ کیوں اپنی زندگی برباد و تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں"؟

اس کے منہ سے نکلے ہوئے ان نصیحت آمیز جملوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا طوائف اور نصیحت۔ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ تبھی وقت ضائع ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے کہا "میں اندر آسکتا ہوں"؟

"کون صاحب ہیں، تشریف لے آئیں" جواب میں اس لڑکی نے کہا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر رشید کے ہوش اڑ گئے۔ وہ گھبراہٹ میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"بھیا اختر آپ اور یہاں"؟

میں نے رشید کو ایک طرف لے جا کر سارا واقعہ سنایا۔ واقعہ سنتے ہی رشید کوٹھے سے باہر نکل گیا۔

رشید کے اچانک چلے جانے سے جہاں آرا کو حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی کیا بات ہے، یہ رشید میاں یہاں سے کیوں چلے گئے۔ میں نے کہا "یہ میں پھر تمہیں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ جو نصیحت تم رشید کو کر رہی تھیں، کیا کوئی اور طوائف بھی اپنے گاہکوں سے یہی نصیحت کرتی ہے"؟

"جی نہیں!" جہاں آرا نے کہا

"میں نے کہا" پھر آپ کس لئے ....."

میری بات کاٹتے ہوئے جہاں آرا نے کہا "وہ اس لئے کہ میری رگوں میں بھی ایک شریف خاندان کا خون ہے"

میں نے کہا "تم اور شریف؟ یہ کیا معمہ ہے"

جہاں آرا نے کہا "آج سے قریب چار سال پیشتر یہ اس وقت کی بات ہے جب میں میٹرک میں پڑھتی تھی پڑھنے لکھنے میں میری کئی سہیلیاں تھیں مگر میری سب سے عزیز سہیلی رخسانہ نام کی ایک لڑکی تھی

اکثر میں اور رخسانہ اپنا فالتو وقت کسی پارک میں گزارا کرتے تھے کبھی کبھی وہ کسی طرح میں بیٹھ کر دیکھتے رہتے چلے جاتے تھے۔ ایک روز رخسانہ کہنے لگی "چلو کسی ہوٹل میں چائے پئیں گے"

"میں ہوٹل میں نہیں جاؤں گی۔ ایسی واہیات تہذیب کے خلاف ہیں" میں نے کہا۔

رخسانہ کہنے لگی تم یہ باتیں تہذیب کے خلاف سمجھتی ہو تم کون سی دنیا میں ہو تمہیں کچھ ہوش بھی ہے، آج کی تہذیب نے عورت کو مرد کی برابر حقوق دیئے ہیں۔ آج کی سوسائٹی میں ان عورتوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو کہ مرد کے ساتھ شانہ بشانہ چلتی ہیں۔ اور تمہاری طرح پرانے خیالوں کی عورتیں گھر کی چار دیواری میں گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ آج کی سوسائٹی میں مرد بھی اس عورت کی قدر کرتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر قدم ملا کر اس کے ساتھ چلتی ہے۔"

رخسانہ کے زیادہ زور دینے پر میں اس کے ساتھ ہوٹل میں چلی گئی۔

اس کے بعد ایک دن میں اور رخسانہ پارک میں سیر کر رہے تھے قریب شام کے چھ بج چکے تھے، رخسانہ کہنے لگی، چلو پکچر میں چلیں۔ میں نے کہا تو بھی غضب کرتی ہے پکچر دس بجے ختم ہوگا۔ گھر والے پوچھیں گے اس وقت تک کہاں رہی تو کیا جواب دوں گی پھر کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ رخسانہ نے کہا اتنی سی بات، گھر والے پوچھیں تو کہہ دینا رخسانہ کی حال گرو تھی۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ رہا کھانا، تو کسی ہوٹل میں کھا لیں گے۔

رخسانہ کی بات میری سمجھ میں آ گئی، کیونکہ وہ پہلے بھی میرے پرانے خیالوں کو بنیاد اس پہنا چکی تھی۔ رخسانہ مجھے لے کر اسی ہوٹل میں پہنچی جہاں ہم پہلے بھی چائے وغیرہ پی چکے تھے۔

رخسانہ نے لڑکا پر بیٹھتے ہوئے بیرے کو دو پیالی

پر یانی کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر میں بیرے نے پریانی کی دو پیالیاں لا کر ٹیبل پر رکھ دیں۔ پکچر کا ٹائم برق رفتاری سے قریب آ رہا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی پریانی کی بھری ہوئی پیالیاں صاف کرنا شروع کر دیں۔ میں نے ابھی پانچ یا سات ہی گھونٹ لئے ہوں گے کہ مجھے چکر سے آنے لگے رخسانہ نے میرے بازو پکڑے اور مجھے ہوٹل کے ایک کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں بے ہوش ہو گئی — اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی کوٹھے پر تھی مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ میں طوائف کے کوٹھے پر ہوں تو انتہا سے زیادہ پریشان ہوئی۔ پھر تو مجھے اس کا بھی پورا یقین ہو گیا کہ مجھے یہاں تک لانے کے لئے پریانی میں نشہ آور چیز ملا دی گئی تھی اور یہ سازش رخسانہ کی تھی۔ میں نے یہاں سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر ہر قسمت سے کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مجھے ناچنے گانے کے لئے کہا گیا۔ میرے انکار کرنے پر مجھے بری طرح کوڑوں سے پیٹا گیا۔ مجبوراً مجھے یہ ماحول بھی اپنانا پڑا۔ ایک مجبور اور بے بس لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی یہ بھی خیال آیا اگر یہاں سے نکل بھی گئی تو اپنے ناپاک جسم کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے سماج میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ مجھے اپنانے کی طاقت نہیں تھی۔ نئی تہذیب کے نشے نے بنا دیا

جہاں آرا کی دردناک داستان سن کر میری آنکھ نم ہو گئی۔ میں نے جہاں آرا سے کہا مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے تم ابھی یہاں سے نکل سکتی ہو — میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔

جہاں آرا نے کہا "میں پہلے ہی آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میرے سماج میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ مجھے اپنائے" مگر مجھے اپنے سماج پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ مجھے ضرور اپنا لے گا" میں نے جہاں آرا سے کہا

جہاں آرا نے کہا "میں ایک شرط پر یہاں سے نکلنے کے لئے تیار ہوں، وہ شرط یہ ہے کہ جس سماج نے آپ کو پرانا ہے آپ بھی اس سماج کے ایک فرد ہیں مجھے امید ہے آپ مجھے اپنا لیں گے"

جہاں آرا کی اس شرط نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ایک طرف معصوم سعیدہ کی محبت تھی اور دوسری طرف جہاں آرا کی زندگی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں —

آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ سعیدہ پر داغ ہے اسے تو کوئی بھی اپنا لے گا۔ میں نے یہ سوچ کر جہاں آرا سے نکاح کر لیا۔ سعیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے کسی طوائف سے نکاح کر لیا ہے تو وہ مجھے مبارک باد دینے کے لئے آئی۔ میں نے سعیدہ سے کہا "مجھے معاف کر دو سعیدہ، میں مجبور تھا"

"اس میں معافی کی کیا بات ہے" سعیدہ نے کہا "آپ نے تو وہ کام کیا ہے جو کوئی بھی نہیں کر سکتا" اور پھر سعیدہ نے جہاں آرا کو گلے سے لگا لیا —

اور میں صرف اتنا کہہ سکا "سعیدہ آج تم نے اپنی محبت کی قربانی دے کر اپنی بیٹیوں کا سر ہمیشہ کے لئے بلند کر دیا —

بقیہ افسانہ "ٹوٹی ہوئی گھڑی" (صفحہ ۲۷ سے آگے)

اپنے آپ سے ہم کلام ہوئی "میرا کوئی دوست نہیں، میرا کوئی دشمن نہیں۔"

خاموشی کا ایک مؤثر لمحہ۔ اسٹیج پر سب کردار پتھر کے شاہ مائی کو سمیٹ کر، اپنی اپنی جگہوں کی طرف لپکتے ہیں۔ اسی وقت اسٹیج کے پس منظر میں ایک بیٹیسٹ گھڑی کی طرف تیز تیز سی فلیش بیک سے دیکھتے ہیں)

بیٹیسٹ گھڑی اس نامہ میں صرف اپنا فرض ادا کر رہی ہے — میری نگاہیں اس پر ہیں، بار بار دیکھ رہا ہے۔

(جاری ہے)

(صفحہ ۲۵)

طرحی مشاعرہ نمبر ۴۸

مصرع طرح
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

غزل کے ساتھ نوٹس انعامی مشاعرہ یا اس کے متبادل
چار آنہ کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

ممبران ثالثی بورڈ
حضرات
مولانا ابرار احسنی گنوری
شفا گوالیاری

ناظم احسنی سیوک شکوہ آبادی

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — اُن کی مجھ پر کبھی نظر نہ ہوئی
اب کہاں سے میں زندگی لاؤں — وہ اُن کی تو عمر بھر نہ ہوئی
چھوڑ کر مجھ کو ہوگئی رخصت — رُوح اپنی کبھی ہم سفر نہ ہوئی
درد دل ساتھ لے کے جاتا ہوں — یہ کہانی کبھی مختصر نہ ہوئی
میں نظر سے نظر ملا تو لوں — پھر کبھی تشنگی مگر نہ ہوئی
اس تغافل پہ جان جاتی ہے — مرگئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
بات تھا دل سے مشورہ نازک — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

ماسٹر عنایت اللہ عرشی جیل پوری

ہر کی جیسے وہ نظر نہ ہوئی — چین سے دو گھڑی بسر نہ ہوئی
دل میں جس دن سے وہ نظر آئے — جانب غیر پھر نظر نہ ہوئی
میری قسمت ہی جل کے رہ جاتی — وہ نظر تیر کی ادھر نہ ہوئی
اُن کے کوئے حسین کی تنویر — کون سی شے سے جلوہ گر نہ ہوئی
کیوں وہ پردے سے آگئے باہر — کیوں مری آہ بے اثر نہ ہوئی
اُن کا کوچہ مقام جنت ہے — شیخ اب تک تجھے خبر نہ ہوئی
تجھ سے ملنے وہ آ گئے عرشی — ارے ہاں تجھے خبر نہ ہوئی

عارف خانکا پوری

شاخ امید بار ور نہ ہوئی — اُن کی جب تک ادھر نظر نہ ہوئی
زد میں طوفاں کے آگئی کشتی — ناخدا کو مگر خبر نہ ہوئی
چاند تارے کبھی کے ڈوب چکے — شب غم کی مگر سحر نہ ہوئی
خون ہوتا گیا جگر لیکن — کبھی اشکوں سے آنکھ تر نہ ہوئی
بات میں بات ہوگئی پیدا — غم کی روداد مختصر نہ ہوئی
بجلیاں چھا گئیں گلستاں پر — تم کو اہل چمن خبر نہ ہوئی

مئے کے پینے سے فائدہ عارف
تشنگی دور ہی اگر نہ ہوئی

خورشید پوری

تابشیں جلوہ ہی ادھر نہ ہوئی — غم دوراں نے ہم کو گھیر لیا
دن بھی نکلا تو غفلتیں نہ گئیں — رات فرقت کی مختصر نہ ہوا
کیسے گزریں گے زیست کے لمحے — اُن کی چشم کرم اگر نہ ہوا
غم جاناں سے ربط محکم تھا — زندگی عیش میں بسر نہ ہوا
سیکھئے ہم سے ضبط کے آداب — دل ہوا خون آنکھ تر نہ ہوا
غم کا پانی تو سر سے اونچا ہے — اس کو چھوڑو کہ آنکھ تر نہ ہو

ڈاکٹر تحسین بریلوی

آہ جذبت کش اثر نہ ہوئی — شاخ امید بار ور نہ ہو
خون دل سے جو آنکھ تر نہ ہوئی — وہ محبت میں معتبر نہ ہوا
کر دیں لاکھ عشق نے بدلیں — شام غم کی مگر سحر نہ ہوا
آرزو کا مآل کیا ہوگا — آہ دل بھی جو کارگر نہ ہوا
پڑ گئی جس پہ کر دیا برباد — اک قیامت ہوئی نظر نہ ہو
راز دیدار فاش کیوں ہوتا — بے خودی اپنی پردہ در نہ ہوا
عمر روتے ہی کٹ گئی تحسین — زندگی چین سے بسر نہ ہو

حشمت علی ابردی چھتر پوری

زندگی تو ہوئی مگر نہ ہوئی — اُن کے در پہ اگر بسر نہ ہوا
شیخ تنقید ہم پہ کرتا رہا — اپنی لغزش کی کچھ خبر نہ ہوا
کر کے برباد وہ چلے بھی گئے — اور مجھ کو کوئی خبر نہ ہوا
جب سے اُس مہ جبیں کو دیکھا ہے — چاند کی سمت بھی نظر نہ ہو
دل میں اک آگ سی بھڑکتی ہے — ایک آفت ہوئی نظر نہ ہوا
جس نے بھی عشق سے گریز کیا — زندگی اُس کی معتبر نہ ہوا

میں وہ ظلمت کی رات ہوں اے دوست
جس کی کوئی کبھی سحر نہ ہوئی

شہرت میرٹھی

ہائے کم گشتگیٔ عشق نہ ہوئی — یہ روئے عشق مختصر نہ ہوئی
دردِ دل کی انھیں خبر نہ ہوئی — کوئی فریاد کارگر نہ ہوئی
پھول باد خزاں سے مرجھائے — اور کانٹوں کو کچھ خبر نہ ہوئی
آنکھ لڑتا بھی کیا لڑائی تھی — پھر ملاقات عمر بھر نہ ہوئی
اشک بہتے رہے جدائی میں — پھر بھی کم آتشِ جگر نہ ہوئی
عشق سے حسن بچ کے جو نکلا — ایک دونوں کی رہگزر نہ ہوئی
عمر بھر مضطرب رہا شہرت — اک گھڑی چین سے بسر نہ ہوئی

منظر رقمی

جہاں جب تری نظر نہ ہوئی — تو شبِ غم بھی مختصر نہ ہوئی
چین کی جستجو رہی لیکن — چین سے زندگی بسر نہ ہوئی
صدق دل سے جو مانگ لی ہم نے — وہ دعا اپنی بے اثر نہ ہوئی
جس نظر پہ ہمیں بھروسا تھا — وہ نظر بھی تو معتبر نہ ہوئی
کیوں ہے مغرورِ عشرتِ شب پہ — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
کیا بلا ہے یہ عشق اے منظر — دل گیا اور کچھ خبر نہ ہوئی

تسخیر احمد نہی ادجاروی

ہم سے کچھ شرحِ چشمِ تر نہ ہوئی — ضبطِ غم کی انھیں خبر نہ ہوئی
اُن کے غم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا — یہ مسرت بھی معتبر نہ ہوئی
اپنے سینے کھلوں نے چاک کئے — چشمِ گل بیں ذرا بھی تر نہ ہوئی
چاند تاروں کے پد چلنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
انقلاب آئے زندگی میں بہت — شامِ غم کی مگر سحر نہ ہوئی
چونک ڈالا دلوں کے خرمن کو — برقِ سوزاں ہوئی نظر نہ ہوئی
بہر پرسش وہ آ گئے انجیؔ — شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی

شاد علی گوہر کوٹوی

میرے غم کی انھیں خبر نہ ہوئی — لاکھ کی آہ بے اثر نہ ہوئی
کوششِ لاکھ کیں مگر نہ ہوئی — شامِ غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
غم کی چوٹوں سے آنکھ تر نہ ہوئی — یہ خطا اب سے پیشتر نہ ہوئی
دہر میں کیا گزر گئی مجھ پر — دوستوں کو کبھی خبر نہ ہوئی
یہ گلا ہے ترے زمانے میں — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
اے اندھیروں سے بھاگنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
دوستی تو وہ کرتے کیا گوہرؔ — دشمنی کی بھی اک نظر نہ ہوئی

سرشک کاتبِ چین یافتی

شکلِ آرام چارہ گر نہ ہوئی — کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی
تارے اُٹھ اُٹھ کے دیکھنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
اُن کو لیں پہلی بار دیکھا تھا — پھر کبھی دید عمر بھر نہ ہوئی
مجھ کو اس آہ کا سہارا ہے — جو کسی روز کارگر نہ ہوئی
میں نے ایسی بھی رات دیکھی ہے — جس کی برسوں کبھی سحر نہ ہوئی
شب میں ہی دُور کھینچ لاتا ہے — نہیں پیدا سحر اگر نہ ہوئی
خلد کہتے ہیں جس کو سب کاتبؔ — وہ گلی میری رہگزر نہ ہوئی

الطاف انصاری۔ سلطان پوری

جس بشر پہ تری نظر نہ ہوئی — زندگی اُس کی معتبر نہ ہوئی
جینے والے سحر کے ارماں میں — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
جاگ رہے ہو سحر کی حسرت میں — اور اگر یہ بھی معتبر نہ ہوئی
جس میں برسی نہ ہوں مری آنکھیں — رات ایسی کوئی بسر نہ ہوئی
لگ گیا کوئی سامنے تیر سے — اور دُنیا تجھے خبر نہ ہوئی
کیوں نہ لوں اُسرا دُعاؤں کا — جب دوا کوئی کارگر نہ ہوئی
کی تو کوشش بہت مگر الطافؔ — زندگی اپنی معتبر نہ ہوئی

کوثر ابدی اعظمی

منتقت جب تری نظر نہ ہوئی — زندگی اپنی معتبر نہ ہوئی
مجھ کو غم سے ملی کبھی نہ نجات — چین سے زندگی بسر نہ ہوئی
یا تو موسیٰ سا دیدور نہ ہوا — یا تجلی وہ جلوہ گر نہ ہوئی
شامِ غم سے فرار کے طالب — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
مجھ سے روئدادِ بہار نہ پوچھ — سر سے گزری مگر خبر نہ ہوئی
ہم قفس میں رہے کہ گلشن میں — کب ہمیں فکرِ بال و پر نہ ہوئی
یہ محبت کا فیض ہے کوثرؔ — غم سے فرصت جو عمر بھر نہ ہوئی

جدؔ

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — رات کالی مگر سحر نہ ہوئی
کہکشاں میری ہم سفر نہ ہوئی — میری روداد مختصر نہ ہوئی
بھر کی رات منتظر نہ ہوئی — عمر گزری مگر سحر نہ ہوئی
اُن سے کیا دوستی کی ہو اُمید — دشمنی جن کی معتبر نہ ہوئی
وہ بھی تاریک رات بھی تاریک — روشنی میرا ہم سفر نہ ہوئی
شکر ہے جدؔ دل گئی منزل — زندگی صرف رہگزر نہ ہوئی

طالب انصاری جبل پوری

جس جگہ آپ کی نظر نہ ہوئی — درحقیقت وہاں سحر نہ ہوئی
میرے مرنے پہ ڈال کر پردے — کہدو کہدو! ہمیں خبر نہ ہوئی
جب سے تجھ کو بنا لیا اپنا — زندگی پر سکوں بسر نہ ہوئی
تیری موجودگی بھی کیا شے تھی — آدمیت پہ خطر نہ ہوئی
لاکھ چاہا کہ سر رہے در پر — یوں عبادت ہی عمر بھر نہ ہوئی
تم پہ مرکر ہی تم کو پانا ہے — یہ خبر مجھ کو پیشتر نہ ہوئی

صدیق شبنم شکوہ آبادی

جب تک ان کی نظر ادھر نہ ہوئی — جو ہماری طرف نظر نہ ہوئی
ان کی نظروں سے کیا لڑیں نظریں — بڑھ گئی بات مختصر نہ ہوئی
اور باتیں ہوئیں اشاروں میں — گفتگو اصل بات پر نہ ہوئی
ان کے گیسو پہ گھٹائیں بکھری ہیں — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
وادیٔ عشق کا سفر توبہ — کانٹے چبھتے رہے خبر نہ ہوئی
چشم بے گوں کا یہ فسوں شبنم — وہ پلا یا کہ خبر نہ ہوئی

حکیم صبا باقی حکیم پوری

آہ میری جو با اثر نہ ہوئی — دل کی ان کو کوئی خبر نہ ہوئی
ایسی دیوانگی کا کیا حاصل — عقل کی جو کبھی راہبر نہ ہوئی
مضطرب وہ بھی آج ہیں اے دل — شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی
میں بھی امیدوار تھا ساقی — لطف کی مجھ پہ کیوں نظر نہ ہوئی
ہجر کی رات ہے حبیب اے دل — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
جس کے غم میں حکیم ہوں بے چین — دائے قسمت اُسے خبر نہ ہوئی

چھوٹا بھائی حکیم دینلو فریب بھنڈ

چین کو اس نے خطر نہ ہوئی — کہ یہ روباہ شیر نر نہ ہوئی
ان کی فرقت میں مجھ پہ کیا گزری — نہ ہوئی یہ انھیں خبر نہ ہوئی
ایک ان کی نگاہ لطف کبھی — میرے حال تباہ پر نہ ہوئی
وہ بگڑ کر جو ہو گئے خاموش — پھر کوئی بات رات بھر نہ ہوئی
خبر مرگ مرنے والوں کو — کبھی مرنے سے پیشتر نہ ہوئی
مرگئی جاگ جاگ کر میں شمیم — جب شب ہجر مختصر نہ ہوئی

آزاد بارانوی

ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں — جو کبھی چین سے بسر نہ ہوئی
پھر نہ تک آہ کی تھی مجبور — وہ بھی منت کشی اثر نہ ہوئی

وحید شام غم معاذ اللہ — سالہا سال تک سحر نہ ہوئی
ان کا وعدہ تھا معتبر لیکن — زندگی اپنی معتبر نہ ہوئی
سارے عالم سے باخبر تھے ہم — اپنے بارے میں کچھ خبر نہ ہوئی
جس کو عرفان نہ ہو سکا حق کا — وہ نظر عمر بھر نظر نہ ہوئی

نعیم الدین صادق گیادی

لاکھ کوشش کے باوجود اُن سے — نہ ہوئی کوئی بات پر نہ ہوئی
دل میں جب درد اُٹھا تو رو دئے ہم — بے سبب اپنی آنکھ تر نہ ہوئی
مشق جاری رہی تصور کی — شکل جب تک وہ جلوہ گر نہ ہوئی
اس کی رحمت نہ ہو طول کہیں — یہ خطا ہے خطا اگر نہ ہو
عمر رفتہ تھی کیا سبک رفتار — کب گئی مجھ کو یہ خبر نہ ہوئی
حسن تھا اس قدر حسیں صادق — اس کی تعریف مختصر نہ ہوئی

اسماعیل ذبیح مالیگانوی

عمر گزری بہار میں رہ کر — زندگی پھر بھی بارور نہ ہوئی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — تجھ سے ملنے کی آرزو تھی مگر
داستان الم سنی سب نے — آنکھ لیکن کسی کی تر نہ ہوئی
جو نظر لڑ گئی نظر سے تری — آج تک پھر ادھر ادھر نہ ہوئی
عیب دنیا پہ تھی نظر اپنی — اپنے ہی عیب پہ نظر نہ ہوئی
کل جو کرنا ہے آج کر لے ذبیح — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

محمد امین شرر سلطان پوری

ان کا چشم کرم ادھر نہ ہوئی — شام غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
جاگ کر رات کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
کھو گیا وہ رہِ محبت میں — جستجو جس کی راہبر نہ ہوئی
طول تو تھی شب الم لیکن — عمر بھر اپنی مختصر نہ ہوئی
درد انگیز شعر کہتے شرر — بات وہ کیا جو با اثر نہ ہوئی

محمد عباسی ریوڑوی

قسمت مشکل پسند ورنہ ہوئی — داستان غم کی مختصر نہ ہوئی
کاٹ ہی لیں گے غم کی گھڑیاں بھی — بدمزہ زندگی اگر نہ ہوئی
کاٹنا شب کا ہے کوئی آساں — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
رہے بیتاب ہجر کے مارے — لاکھ تڑپے مگر سحر نہ ہوئی
چشم محمد کا ہے تیری کرم — میری نیت ادھر اُدھر نہ ہوئی

شکیل بدایونی

شامِ غم میں اگر سحر نہ ہوتی
صبحِ آرام جلوہ گر نہ ہوتی
وہ بھی دوشِ سکوں مگر نہ ہوتی
خشک کیوں میری چشم تر نہ ہوتی
مطمئن خواہشِ بشر نہ ہوتی

بے خودی تو جو راہبر نہ ہوتی
نہ ہوئی چشمِ ناز ادھر نہ ہوئی
جو کبھی اک طرح بسر نہ ہوئی
دل کی جو بات مشتہر نہ ہوئی
بے خبر ہو کے بھی خبر نہ ہوئی

خود میں کیا ہوں مجھے خبر نہ ہوئی
چار ان سے مگر نظر نہ ہوئی
ماہ میں روشنی اگر نہ ہوئی
بندگی اس کی معتبر نہ ہوئی
تم میں انسانیت اگر نہ ہوئی

شام آئی مگر سحر نہ ہوئی
لے لیا دل مجھے خبر نہ ہوئی
کب مری آنکھ غم سے تر نہ ہوئی
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی

آپ ہی کی نظر ادھر نہ ہوئی
دل گیا اور کچھ خبر نہ ہوئی
تیری صورت جو جلوہ گر نہ ہوئی
شدتِ غم سے آنکھ تر نہ ہوئی

شیخ سلیم صدیقی

جس پہ ساقی تری نظر نہ ہوئی
ظلمتِ شب سے تو پریشاں ہے
ہم سناتے رہے وہ سنتے رہے
روئے انور کے سامنے ان کے
طالبِ بوس ہیں سلیم اب تک

اس کی ہستی تو معتبر نہ ہوئی
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
دل کی روداد مختصر نہ ہوئی
کوئی بھی شمع جلوہ گر نہ ہوئی
کوئی امید جلوہ گر نہ ہوئی

محمد صابر ساحل جبلپوری

ان کے الطاف کی نظر نہ ہوئی
آگئی نیند سننے والے کو
کیوں وہ پردے سے آگئے باہر
خواب میں ایک بار آئے تھے
بحرِ الفت میں اس طرح ڈوبا

میری قسمت ہی اوج پر نہ ہوئی
داستانِ غم کی مختصر نہ ہوئی
جب دعا میری کارگر نہ ہوئی
دید پھر ان کی عمر بھر نہ ہوئی
ناخدا کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی

مشتاق احمد مشتاق جبل پوری

شامِ غم کی مرے سحر نہ ہوئی
فرق ہو جائے گا یہ کشتیٔ زیست
پھول ہنس ہنس کے توڑنے والے
یوں خیالوں میں محو تھا ان کے
کیسے پائے سکون دل مشتاق

جب محبت بھری نظر نہ ہوئی
ناخدائی مری اگر نہ ہوئی
کیا خزاں پر کبھی نظر نہ ہوئی
آگے بھی وہ گئے خبر نہ ہوئی
وہ نگاہِ کرم ادھر نہ ہوئی

کریم اسعدی جمالی پوری

کب فغاں اپنی پُر اثر نہ ہوئی
کون جانے نہاں کیا ہوگا
آشیانہ بنا کے کیا ہوگا
شامِ غم میں تو رابطہ دل کا
دولتِ غم جسے ملی نہ کریم

کب مری چشم تر نہ ہوئی
شامِ غم کی اگر سحر نہ ہوئی
برق تیری اگر نظر نہ ہوئی
غم ہی کیا ہے اگر سحر نہ ہوئی
زندگی اس کی معتبر نہ ہوئی

تاجیز لکھنوی۔

با اثر آہ بے اثر نہ ہوئی
زندگی میں یہ زندگی ہے کوئی
بگڑی تقدیر کے بنانے کو
ضبط اپنا شعار ہے تاجیز
محمد حسین ہمسر پیلی بھیت

میرے دل کی اُسے خبر نہ ہوئی
کبھی آرام سے بسر نہ ہوئی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
کثرتِ غم سے آنکھ تر نہ ہوئی
جھلملاتا رہا چراغِ حیات
رات بڑھتی رہی سحر نہ ہوئی

قومی وفاقی فنڈ میں دو اپنے زیورات ہتھیار ہم خرید کے دیں دشمنوں کو مات

چارہ سازوں کی بے کسی تو یہ
چارہ گر ہے وہ چارہ کرتا ہے
کان بھی آہ نارساں تھی کبھی
تیرے صدقے میں شانِ محشر
نام مشفکر مصر ناز کان پوری ثم جیپور

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
اُن کی آنکھوں میں آگئے آنسو
لے پرستارِ شامِ غم یہ بتا
کوئی چپکے سے آگیا دل میں
ہاتھ آیا نہ گو ہر مقصد
عبدالغفار تاج ناگ پوری

یہ بھی ترکیب کارگر نہ ہوئی
چاند تارے بھی تھے شریکِ غم
جس نے رو رو کے رات کاٹی ہے
کس کے غم کو میں دوں جگہ دل میں
وہ خفا ہنس کے ہو گیا اے تاج
طاق مشیر پور کلاں

میرے مرنے کا علم ہے سب کو
سوچتا ہوں تامل کیا ہوگا
اس طرح اس نے میرا دل توڑا
ان کی تابِ جمال کیا کہنا
گر دلِ چرخ اے معاذ اللہ
بابا فقیر الدین تمنا کانپوری۔

حال ہو جائے گا مریض کا فیصل
پھر تو یہ ہے ترے فقیر لے دوست
زندگی بن گئی سراپا غم
واہ بے چارگیٔ راہِ وفا
اے قمر یہ سیاہ بختی ہے
نامؔ کا کالی مائیگانوی

مجھ پہ جب آپ کی نظر نہ ہوئی
منتظر ہوں نگاہِ سحر کا مگر

کب مری زندگی کی راہوں میں
وہ بہت خوش نصیب ہے جس پہ
کیا کرو گے تم اس گھڑی قاتوس
قال محمد آل نعیمی جبل پور

اس کو تسکین عمر بھر نہ ہوئی
جس کی خاطر تباہ حال رہا
رات ادبے وفا تڑپ کے کٹی
کچھ قفس میں سکوں ملا ایسا
شام سے جو اُداس ہو مائل
حامد صحرائی سکتی

میرے غم کی تمہیں خبر نہ ہوئی
مجھ کو خود بے خودی کے عالم میں
دل میں ان کے سمائی ہوتی
وحشتوں کا وہ جوش تھا حامد
حضر اعظمی

جہاں ان کی جو نظر نہ ہوئی
رات بھی ختم ہو گئی لیکن
بام پر خود وہ جلوہ گر ہو گئے
چھا گئے زندگی پہ وہ میرے
نظر نکلتوی

زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
کیا کہیں تم سے اجڑا دل کا
ہر عمل سے وہ میرے خوش ہوں گے
پاس جو تھا نثار اُن پہ کیا
خلیل احمد مائل جبل پوری

نہ ہوئی آہ با اثر نہ ہوئی
جادۂ عشق اور تنہائی
جب سے ان کا شباب کیا ہے
ہم بھٹکتے رہے اندھیرے میں
جو کی فرقت میں دل لہو نہ ہوا

آپ کی یاد ہم سفر نہ ہوئی
گردشِ وقت کی نظر نہ ہوئی
شامِ غم کی اگر سحر نہ ہوئی

جس پہ سرکار کی نظر نہ ہوئی
آہ اس کو مری خبر نہ ہوئی
تو نہ آیا تو کیا سحر نہ ہوئی
پھر تمنائے بال و پر نہ ہوا
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہو

حالِ دل پہ کبھی نظر نہ ہوئی
دل کے جلنے کی کچھ خبر نہ ہوئی
آہ ہی میری کارگر نہ ہوئی
سخت راہیں بھی پُرسفر نہ ہوئی

زیست آرام سے بسر نہ ہوئی
داستانِ غم کی مختصر نہ ہوئی
چاند کی چاندنی اگر نہ ہوئی
روزِ محشر مجھے خبر نہ ہوئی

شبِ آلام کی سحر نہ ہوئی
مٹ گئے ہم تمہیں خبر نہ ہوئی
مجھ سے نفرت انہیں اگر نہ ہوئی
پھر بھی تسکین دل نظر نہ ہوئی

وہ نگاہِ کرم ادھر نہ ہوئی
گرد بھی آہ ہم سفر نہ ہوئی
پھر نظر جیرد ماہ پر نہ ہوئی
زلف جب تک کسی کی سر نہ ہو
آہ ان کی ہی چشم تر نہ ہو

یہ ہے وقت دھرتی سے سونا اگاؤ جوانوں کی ٹولی کو یہ گیت گا

میں پریشان حال پھرتا ہوں — ان کی مجھ پر کبھی نظر نہ ہوئی
چشم ساقی پھر گئی جب سے — جانبِ جام پھر نظر نہ ہوئی
ہوں وہ آکر گئے تصور سے — میرے دل کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی
وہ خیالوں میں میرے رہتے ہیں — زیست تنہا مری بسر نہ ہوئی
کیسے منزل ملے گی اے راہی — یاد جب ان کی راہبر نہ ہوئی

اس آئی محبت رائے پوری

ہجر کی رات مختصر نہ ہوئی — زندگی کی مری سحر نہ ہوئی
تو بھی تو مائل کرم نہ ہوا — تیری بھی اس طرف نظر نہ ہوئی
تیرے غم کو بھی تو چھپانا تھا — اس لئے میری چشم تر نہ ہوئی
غیر تو غیر ہیں گلہ کیسا — اپنوں میں زندگی بسر نہ ہوئی

وحشی جون پوری

ان کی جب تک نظر ادھر نہ ہوئی — نشہ امید کی سحر نہ ہوئی
میکدے میں بھی وہ رہا تشنہ — جس پہ ساقی تری نظر نہ ہوئی
مجھ پہ کرنا پڑا کرم ان کو — میری فریاد بے اثر نہ ہوئی
میرے صبر و قرار چھن بھی گئے — اور دلتنگی مجھے خبر نہ ہوئی

نسیم بانو رتلامی

ہم تڑپتے رہے شب فرقت — اور کچھ آپ کو خبر نہ ہوئی
میرا دلدار کی طلب تڑپے دل — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
جو کہ عشرت پسند تھے ان سے — غم کی اک رات بھی بسر نہ ہوئی
جس عنایت کی جستجو تھی اسے — وہ عنایت نسیم پر نہ ہوئی

مکث بیداری لال ورد میرٹھ

ہر روز ختم غم بھر نہ ہوئی — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
ہے منظم نظام عالم سب — کیوں مری آہ باثر نہ ہوئی
روک دینا قضا جنازے کو — شاید ان کو ابھی خبر نہ ہوئی
قدر قسمت پہ زور چل نہ سکا — کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

محمد ابراہیم قمر بارہ بنکوی

کوئی مشکل نہ ہو سکی آساں — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
ان کو برگشتہ مجھ سے ہونا تھا — چال غیروں کی کارگر نہ ہوئی
اے شب غم کے کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
[illegible] — [illegible] تری قمر نہ ہوئی

بعید شمسی

مجھ پہ جب آپ کی نظر نہ ہوئی — زیست وہ حالت خوب تر نہ ہوئی
وہ دعا اور طبع اثر نہ ہوئی — جس دعا میں کہ آنکھ تر نہ ہوئی
دیکھ ناداں نہ نعمتوں سے نہ — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
دائے قسمت وحید پر اے دوست — نگہ لطف عمر بھر نہ ہوئی

حزیں ناگ پوری

لطف آپ کی نظر نہ ہوئی — میری تقدیر معتبر نہ ہوئی
طالبان سحر سے یہ کہہ دو — کیا کریں گے اگر سحر نہ ہوئی
غم فرقت سے کھیلتا ہوں میں — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
لے کے اڑ جائیں گے قفس اک دن — طائروں پہ اگر نظر نہ ہوئی

صوفی

جل گئے شمع اور پروانے — داستان غم کی مختصر نہ ہوئی
آشیاں بنتے ہی گری بجلی — کب سے تھی تاک میں خبر نہ ہوئی
جس عبادت پہ ناز ہے صوفی — کیا کرو گے جو معتبر نہ ہوئی

محمد اصغر پیلی بھیت

ہم تو دنیا سے آہ جاتے ہیں — یہ دکھنا ہمیں خبر نہ ہوئی
جام دیتا رہا وہ غیروں کو — اک ہماری طرف نظر نہ ہوئی
جان دی کس کے عشق میں اصغر — یہ انہیں آج تک خبر نہ ہوئی

بابو عبدالغفور رضا بیگ

وہ بھی اپنی جگہ ہیں اور ہیں — ایک کوشش بھی کارگر نہ ہوئی
کیسے گزرے گی یہ شب فرقت — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
لے رہا آہ یوں سر محفل — لٹ گیا دل ہمیں خبر نہ ہوئی

عابد العزیز صدیقی عابد بریلی (ایم پی)

کیا محبت اسی کو کہتے ہیں — مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی
عمر کٹنے کو کٹ گئی لیکن — چین سے ایک دن بسر نہ ہوئی
ہم نے دل جان دی محبت میں — عابد ان کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی

نظام الدین ادیب غازی پوری

شکوہ ان سے ہو کیا عبادت کا — دیکھیں گے بھی خبر نہ ہوئی
تھا وہ لمحہ سکون و راحت کا — جب تری یاد دم بسر نہ ہوئی
ایک میری ہی تشنگی پہ ادیب — ساقیٔ وقت کی نظر نہ ہوئی

افواہیں نہ سنئے — افواہیں نہ پھیلائیے

ارشاد ابر اسکن نسیم جبل پوری

کوئی گھبرا کے دم ہی توڑ چکا — بے خبر کو خبر نہ ہوئی
تو نہ رسوا ہو اس لئے اکثر — بات میں بات کہہ گیا تو نہ ہوئی
تیری رافت میں شک ہے اے دوست — زندگی ہیں سے بسر نہ ہوئی

ماسٹر شمشاد احمد شاد دھنبڈ

جیت جانے کا کر لیا پہ — مجھ سے کوئی خطا اگر نہ ہوئی
مجھ پہ تنقید اس قدر ناصح — اپنے کردار پر نظر نہ ہوئی

منشی نور محمد خان منشی پنجم

تھا منزل جانا دھنم تھا — وہ خوشی تھی جو ہم سفر نہ ہوئی
بہہ گیا اشک بن کے دل میرا — اور ابھی تک انھیں خبر نہ ہوئی

حکیم واقف حاذق۔ برہانپوری۔ ناگ پور

چھپ جائے وہ آنکھ جیتے جی — ان کے غم میں جو آنکھ تر نہ ہوئی
اسوا آپ ہی کی چوکھٹ کے — یہ جبیں اور قلب در نہ ہوئی

تھی بلہاروی

بزم دور، دھیمی شمع شعر فہم استفہار — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

عبدالستار نائل ٹمکوری

ہے جبت تم کو شکوۂ ظلمت — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

سید ذاکر علی عاجز کھرگونوی

شب تہ انتظار میں کاٹی — اور مجھ کو مری خبر نہ ہوئی

کاشی ٹپٹوری

ان سے بیگانے فیض پاتے تھے — اور ہم پہ کبھی نظر نہ ہوئی

ایم شفیع عاجز دھارواڑ

بالیقیں پا ہی جائے گا منزل — پست ہمت تری اگر نہ ہوئی

جمیل احمد۔ احمد آباد

تیری نظروں سے گر کے ٹوٹ گیا — میرے دل کی تجھے خبر نہ ہوئی

نوکِ شعلہ و شبنم انعامی مشاعرہ نمبر ۹

خط وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

مصرعِ طرح۔ عشق خود دار ہے حسن خود بیں ہے۔ مفرد، مجرد قوافی ہے ردیف

ہم ... ...

پھاپھوند ... ...

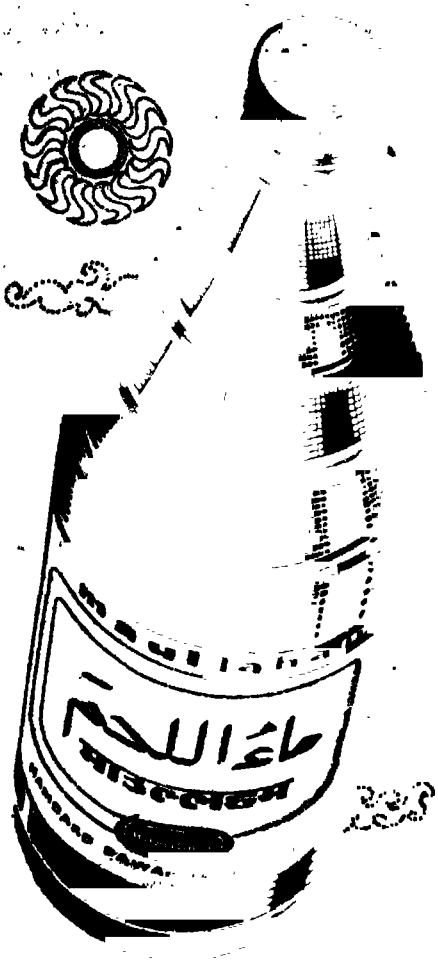

ہمدرد کا مارُ الحکم

بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت اور جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

دہلی
کانپور
پٹنہ

MRA. 1060. 1914

اسلامی تاریخ سے متعلق بہترین کتابیں

شعلۂ وطن دہلی

فروری
۱۹۶۳ء

زرسالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۲

فہرس

۱	بزم ادب کوٹہ	مفتوں کوڑی	۳
۲	اپنا محفل اپنے دوست	مختلف خطوط	۸
۳	شوق اثری رام پوری	بدتہذیبی رام پوری	۹
۴	ارشادات	ناطق گلاوٹھی	۱۱
۵	دو غزلیں	طرفہ قریشی	۱۲
۶	"	مولانا آزاد سبحانی	۱۲
۷	قطعات	آزاد بارہوی	۱۳
۸	"	قیصر اندوری	۱۳
۹	غزل	شہرت میرٹھی	۱۳
۱۰	دو غزلیں	کرشن موہن	۱۴
۱۱	بھارت کے جوانوں سے	الطاف انصاری	۱۵
۱۲	افکار نو	مذاق ابدی - سوریش چندر جین کاتی	۱۵
۱۳	جلال و جمال	سید شرکت جلالی - شفیق بھوپالی	۱۶
	"	مظہر شنائی رتلامی - محمد میاں فکر	۶
	"	محمد علی جوہر کولابی محمد امین شعر	۶
۱۴	ان سے ملئے	مسعود ظفر رام پوری	۱۷
۱۵	ضمیر کی آواز	اسد امینی	۲۱
۱۶	دل سے دل تک	شکیل جاوید امروہوی	۲۲
۱۷	تبصرہ کتب	مظفر حنفی بھوپالی ایم اے	۲۳
۱۸	طرحی مشاعرہ نمبر ۴۶ غزل مشورہ کلام مرتبہ ناظم مشاعرہ حضرت شفا گوالیاری		۲۵

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں دہلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگران حصہ نظم
حضرت مولانا ابر احسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خورد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

ہفتوں کو فوقی

میرا راجستان رشکِ خطۂ کشمیر ہے
(حافظ عبدالرحیم خاں ساکن جنجھنوں)

راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر

بزمِ ادب کوٹہ

رفتہ رفتہ ہم سے پوچھے
نرگس کی آنکھ ہو کب ہی بند میں ہم

پچھلے راجپوتانہ اس وقت کے راجستھان کی ایک تاریخی ریاست کوٹہ کے ادبی شعر و سخن کا سلسلۂ تعارف آج جاری ہے جو جدید راجستھان کی ادبی فضاؤں کا جائزہ ہے تاریخ ادب اردو کے اوراق ہمیشہ سارے یاد کئے گئے۔ ہمارے مورخین مستقبل اردو کی اس اہل اعتبار کی بنا پر کہ اخوں نے اردو کی مخصوص شہروں اور مخصوص ادوار تک محدود کر دیا۔ اور بزم سخن سجانے کا اردو کے لئے مرکز صرف دہلی کی ادبی محفلوں کو قرار دیا۔

راجستھان کے اس ادبی ماحول کے تذکرے سے اردو کی دست و گیرائی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مقامی استعدادوں کے ابھرنے کا بھی۔ سراغ ملتا ہے اردو کی نشاۃ ثانیہ کا بھی۔ رسائی و پذیرائی کا بھی کہ کہاں اس کی آبیاری ہوئی اور پھر بڑھتے بڑھتے کہاں تک اس کے پھل پھول پہنچے۔

اس کی پذیرائی کے لئے وہ جہاں اور کوئی زبان پروان نہ چڑھ سکی۔ وہاں اردو زبان نے اپنی علمی و ادبی حیثیت قائم کی۔ اردو کو جس جگہ سرکاری سرپرستی اور درباری حمایت حاصل ہو گئی۔ اس جگہ اس کا فروغ و ارتقا اتنا اہم نہیں جتنا اس جگہ جہاں یہ عوام کی قبولیت و محبوبیت سے پنپی۔ بڑی اور چھوٹی ہر طرح کی ریاستوں میں اردو کی قدیم و جدید بستیوں میں بھی اضافہ کرتی رہیں بہ نسبت ان قطعوں کے جو صرف درباروں میں پلتے رہے ایسے ہی درباروں، خدمت گزاروں اور پرستاروں کا تذکرہ ان صفحات میں مقصود ہے۔ حالات و اسباب کی نامساعدت یہاں کے اردو نوازوں کو متواتر دم بخود نہ کر سکی۔ ان کی یہ لگن انہیں کبھی دیر تک بیٹھنے نہیں دیتی۔ ان کی تخلیقی و علمی سرگرمیوں کا سلسلہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے غالباً اسی خامی کو محسوس کر کے ۱۹۳۵ء میں جائزہ زبان اردو، شائع کی تھی اگرچہ وہ نقشہ نامکمل ہے لیکن راجپوتانہ کے خدمت گزارانِ اردو کا تھوڑا بہت اندازہ اس سے لگ جاتا ہے۔

اس کتاب میں ریاست کوٹہ کے حالات کے سلسلہ میں بزم ادب کوٹہ کا بھی ذکر ہے۔ ۱۹۳۸ء کی صحبت میں اس بزم ادب کے متعلق تفصیل مدتوں ٹالی جا رہی ہے۔

اس کا ابتدائی نام بزم سخن ہے۔ ساتویں جماعت میں راقم الحروف اور بھی عثمان غنی مالک ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ درجہ ششم سے جو مشق سخن کا سلسلہ جاری ہوا تھا۔ اب بھی قائم تھا۔ عبدالرفاقر ہم سے چھوٹ گئے تھے۔ لیکن ہم دونوں کوئی مصرع طرح مقرر کر کے طبع آزمائی کرتے اور لطف اندوز ہوتے بعد میں چھوٹے خاں خورشید ہمارے ایک تیسرے ہم جماعت بھی اس میں شامل ہو گئے۔ کچھ باہر کے دوستوں کو ان حضرات نشستوں کی اطلاع مل گئی۔ ایک روز وہ بھی ہماری اس نشست میں آ دھمکے۔ لطف سخن سے محظوظ ہوئے۔ یہ اصلاحی تجویز بھی کر دے کہ ہفتہ پیمانہ پر شروع کیا جائے اور شہر میں اس نشست کی اشتہار بھی کر دے چنانچہ ۱۹۳۸ء کے مصرع طرح مقرر کر کے ہفتہ وار نشستیں ہونے لگیں

اس نشست عام میں اس ذوق کے کئی احباب شریک ہوئے "بزم سخن" اس کا نام قرار پایا۔ یہ مشاعرے چلتے رہے۔ شعراء اور سامعین کی تعداد کبھی گھٹتی رہی کبھی بڑھتی رہی۔ ان ہفتہ واری مشاعروں کی روداد میں جو میں سکریٹری کی حیثیت سے مرتب کیا کرتا تھا کبھی جوش مسرت سے لبریز ہو گئی یاس و حسرت رمضان المبارک اور سالانہ امتحان کے موقع پر نشستیں بند ہو جاتیں۔ پھر احباب کا ذوق دیکھ کر اس طرف متوجہ نہ ہوتے اور نشستیں شروع ہوتیں تو بڑی گرما گرمی اور جوش و خروش سے شروع ہوتیں۔ کئی نئے احباب، نئے شاعر اور نئے سامعین اس بزم کو میسر آ جاتے۔ چنانچہ عبدالرشید خاں وحشی اس مشاعرہ کا بڑا سرگرم کارکن تھا۔ راقم الحروف فنا بھی اس زمانہ میں فنا فی الشعر تھا۔ والد مرحوم بھی طالب انہماک میں ان سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے گھر میں سخن سے منع کرتے اور میں چھپ کر دوستانہ کی قول کہتا۔ ہفتہ واری نشستوں کا انتظار بڑا شاق گزرتا تھا۔ ان دنوں شعر کہنا باقاعدگی کے ساتھ تھا۔ کوئی نشست میری شرکت سے خالی نہ جاتی تھی سکریٹری کی حیثیت سے میں [illegible] اس وقت کا جوش [illegible]

ہر ماہ طرحی مشاعرے کے علاوہ نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم خیال" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے اور پہلی انجمن کے مقاصد و طریق کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ صرف یہ فرق تھا کہ یہ انجمن ہر ہفتے کی شام کو ہوتی تھی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۳۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۴۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۵۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۶۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۷۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۸۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۹۹۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۱۹۹۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۰۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۰۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۱۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۱۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۳ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۴ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۵ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۵ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۶ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۶ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۷ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۷ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۸ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۸ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۲۹ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۲۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۳۰ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۳۰ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۳۱ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۳۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۳۲ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے ممبر بھی وہی تھے جو پہلی انجمن کے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور احباب شامل ہو جاتے تھے۔ یہ انجمن بھی ۲۰۳۲ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۲۰۳۳ء میں ایک نئی انجمن "بزم سخن" ک

ہوا مقبول ہوا تھا۔

چمکے دیوانہ ہے انساں کا انساں دیکھ کر
حال کیا ہوگا الٰہی تو مرا داماں دیکھ کر

مقطع مرحوم کا پہلے بھی کسی دوسرے مشاعرہ کی طرح غزل کا ہے جسے اب تک میں بھولا نہیں ہوں ؎

جب مگر بنیاد تری دولت سرا کے پاس
اب بھی کیا جھونپڑا ہی رہے گا تو کے پاس

اور یہ شعر بھی ؎

میں نے کہا بتوں سے رہے اور ہر بشر
کہنے لگے کہ جاؤ سدھارو خدا کے پاس

مذکورہ مشاعروں سے زیادہ یہ مشاعرہ اپنی زندگی برقرار نہ رکھ سکا۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء سے پھر ہفتہ وار نشستیں شروع کیں۔ فروری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں ہم تو دیوار دیکھ کر ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء کے لئے مصرع طرح تراشا۔

مولوی صاحب نے خود شوکت مشاعرہ کا وعدہ فرمایا اور مصرعہ کی سہولت کے پیش نظر وقت کا وقت مقرر کیا گیا۔ مشن فنی ناتھ کے مکان واقع ستی چبوترہ۔ مقام مشاعرہ طے ہوا۔ یہ مشاعرہ بڑی بہاری سے ہوتے رہے سامعین و شعراء کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی۔ اس زمانے کا یہ واقعہ کہی ہوئے جانے والا نہیں کہ ایک شخص بہ آہستگی ان دونوں ان مشاعروں میں شامل ہونے لگے تھے۔ انھوں نے مشاعروں میں میری پذیرائی و قبولیت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کے مشاعرے کے لئے مصرع طرح مقرر تھا۔ روشن

خیال یار سے کاشانہ ہو گیا۔ اس میں میرے دو تین شعر بہت زیادہ مقبول ہوئے تھے۔

شانہ چھوا ہی کرتا ہے گیسوؤں میں زلف کی
کم بخت پر بھی آپ کا دیوانہ ہو گیا

پر کی اڑنے لگ گئی جب چار دل گئے
رشک بہشت یاروں کا میخانہ ہو گیا

اے برشگال جوں ترا تر دیکھ ہو گئی
زنداں میں قیدیوں کا دیوانہ ہو گیا

مقطع میں تخلص کی رعایت خوب تھی ؎

دل میں کبھی، جگر میں کبھی، سر میں ہے کبھی
مجنوں ہمارا دور کا ویرانہ ہو گیا

آپ صاحب فقروں اور شعروں میں جذبات حسد کا اظہار کرتے رہتے۔ انھیں سے متاثر ہو کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے مشاعرہ کی طرح غزل کا میرا یہ مطلع تھا ؎

ہے بس بلال ابد کے حمد لو کا جواب
تو اور خوب رہتی ہے تمہار کا جواب

مقطع یہ تھا ؎

مجنوں زار پہ نہ کر اے ابر ترحمد
یا بن کے آ اے چشم گہربار کا جواب

آپ صاحب کا مقطع یہاں یکسر خلاف انصاف ہوگا ؎

خاموش رہئے آپ کہ نازک زمانہ ہے
ہر گو نہ دیجئے کسی انکار کا جواب

ذکر جو کہ زیادہ طول کھینچتی، لیکن کم ہمتی یا مصلحت وقتی کا مظاہرہ ہوا ہماری جانب سے ہوا اور اس طرح (مشاعرہ) کو جسے اپنا خون جگر دے کر سینچا جا رہا تھا تباہ کن آفت کی یا دسموم سے بچا لیا گیا۔ معاملہ رفت و گزشت پہ ختم ہوا۔

اسی سال مولوی سراج احمد کی تحریک اور مولوی ثابت صاحب کی تائید سے طرحی مصرعے حروف تہجی کے لحاظ سے دیئے جانے لگے۔ ۱۹۳۶ء تک یہ مشاعرہ پہنچ گیا تھا کہ بعد میں بند ہو گیا

منشی ثابت شاد عظیم آبادی کی تشریف آوری کے سلسلہ میں اس سال دو تین مشاعرے منعقد ہوئے۔ انہی مشاعروں سے ایک مشاعرہ کا

کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا نقاب میں

پر جا تھا۔ ثابت مرحوم کا مقطع آج بھی آب و تاب سے کہے جانے کے قابل ہے ؎

کم ظرف سے نہ مانگ کہ ثابت نہ ہو ذلیل
قطرہ کبھی نام کو نہیں جام حباب میں

جناب مقبول احمد مقبول نے داغ کے مصرع کو اپنایا تھا ؎

مقبول یہ مقولہ ہے اپنا بقول داغ
مٹی کی بھی بنے تو رہا ہے شباب میں

انھیں مشاعروں میں سے کسی ایک مشاعرہ کا مصرع طرح تھا ؎ مجھ کو رفعت پیار سے ہے ان کو نفرت پیار سے ہے حافظ حکمت علی مزاح نگار شاعر ہیں مزاحیہ گرہ انھوں نے یہ کہی تھی ؎

میرا قاعدہ نہیں ملتا ہے ان سے اس لئے
مجھ کو رفعت پیار سے ہے ان کو نفرت پیار سے ہے

مولوی ثابت مرحوم کا ایک سہ سرخی طرح کا مبارکباد شعر بھی مجھے اب تک یاد ہے ؎

اٹھتے رہے حسینان ہند مبارک شیخ کو
مولوی فاضل بھی ہے تاضل بھی ہے گھر بار بھی

۱۹۳۵ء کے بزم ادب کے ہفتہ وار مشاعروں کا کچھ انتخاب اس وقت کے اہل ادب کی ترجمانی کر سکے گا۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

وحشی سے کبھی نفرت، نفرت سے کبھی الفت
اک جان پہ کرتے ہیں وہ شوخی ستم کیا کیا

رحمت کو تو یاد بہت کی ضرورت ہے
گنہگار دل کہتا ہے کہ تو ہے کیا

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدقے جو اس کے جلوۂ محفل پہ کیجئے

کرتے ہیں جو اس کے جلوۂ محفل پہ کیجئے

جب سے بیاں اُس کا آبِ حیوان نام کیا
یا رب کسی عالم نے یہ کافر کہا کیا (ثاقب لکھنوی)
بعد مرنے کے ہوا کرتی ہے اس کی قدر
میرے حق میں کچھ کہا ہوتا تو بولا کیا (آبر)
تیرے تجلّی کی نظر میں ہے قیامت کا اثر
جس کسی نے تجھ کو دیکھا وہ بیاباں ہوا (راقم الحروف)
شمشیر بے نیام ہے قاتل کے ہاتھ میں
اک کو دیئے دو لاکھ میں وہ پیار کا جواب (وکیل)
تیرے عشق و محبت کا ثمر ہم جو تھے
بیزار آہ و فاک سے سرکار کا جواب (ثاقب)
بے سے حق ہوئے محبوب خدا کی ذات
نقش طاؤس میں ہے رونق گلزار کی شان (حافظ نور)
گل مشغولی جہالت ہیں شب خود ہے آج
دل نہ عاشق بھی کرے بے سبب مالک دل (عاشق)
اس قدر سیماب سے مجھے بڑھ کے فدا
اس طرح جاؤں میں اس بت کے پہلا پھر آپ (راغب)
ان ذلت بود جفا جو کیا شہید
اعجاز ہے مسیحا کو خوش دم شعار ہے (فیدا)
دل کون سی مئے تند ساقی بھر کے ساغر میں
میں دام سمان مجھ کو نظر آتے ہیں چکر میں (قمر)
اہل کے بھی نہ کبھی چھیڑنا دل والوں کو
دل دشمن میں ڈالتے ہیں دل والوں کو (عاجز)
حق میرا دیکھئے برگشتہ قسمت دیکھئے
طرف ہے کیا جو نہ ہو ہر طرح کہنہ نشا (دلشاد)

مجھ میں تجھ میں دوئی بیاباں ہیں
حجاب ہیں دوئی کے حصے کو دیدہ ور ہیں
نہ اک ہیں نہ دو ہیں یہ سب کا کچھ کو
وہ سر کا تاج ہے جو بن نہیں کرے
ناظرین کرام

ذرہ کی جلوہ تمنا کو جو جانا نہ تھا (راقم الحروف)
مختصر دنیا ہے فرشتوں سے بھی اس
پانچوں چلتے ہیں ہر اک جنس کے پرزے

(باقی آئندہ)

بقیہ ادب سے متعلق (صفحہ ۱۰ سے آگے)

گھبرا دو انتخابی کرنے گا۔ گو اس نے کہا میں کچھ
رحم آگیا۔ اور میں نے اپنا ایک بہتر ہی افسانہ اسے
دیا کہ کر دوں اپنے خوص سے گھر جاؤں اور وہ سرے
کچھ اس سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہے کہ میں وہ
افسانے جو پہلے لکھ چکا ہوں اور پھر فرمائش
میں چھپنے کو بھیجتا ہوں اور اس کے ایڈیٹر ہیں جب یہ
کہہ کر کہ اسے واپس نہ دیتے ہیں کہ وہ تو بڑھیا افسانہ
کرانے سمندی پر چوں میں شائع کرتا آپ کی اور آپ کے
فن کی توہین ہے تو سچ مچ ہے اسے کہ اور انگلینڈ
کے پرچوں میں شائع کرانے کے لئے ہم باشندے انگلش میں
ٹرانسلیٹ کرا لیتا ہوں۔ چونکہ مجھے اس سالی انگلش
زبان سے نفرت ہے اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے
ٹرانسلیٹ کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ اور پھر فرمائیں
گے بھی نہیں آیا جب ان لوگوں میں افسانہ نگار
بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو اچھا افسانہ نگار بننے کی کوشش
ہی کیوں کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو افسانہ نگار بنا پھر رہا
ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں کہ نظر کا ہوں اور کا تاج میں ایک
شخصیت کا نام پا رہے گی۔ وہ ہے محمد حسین۔ ہر محمد حسین
اپنے کو ایک نئی چیز بنانے کی۔ ہر کتاب پڑھ کر یہ سوچ کر کہ
کرنی ضرور ہی کام یاد آجائے یا آپ کی طبیعت
بہانہ بنا کر وہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کریں
لیکن یہ کہنا آپ کا ایک مگر پڑھ نہیں چھوڑ سکتے تب
مجھے چشمکا ہونا نصیب نہ ہوگا اور مگر ہے ہیں کہ یہ
آپ کے قدم مگر یا کسی عہدہ کا کام کو جانے کے بعد
کہنا تو کہ ان کی طرف ہے جو ہیں کہ سب سے

بقیہ اپنی محفل اپنے دوست (صفحہ ۹ سے آگے)

دنیا بخطاب ہے۔ ایک ایسا خط ہے جس کی عزت کرنا ہمارا
قومی فرض ہے۔ اس کا ذاتی اظہار مرزا صاحب
کا ذاتیات پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ ہمیں مجھ کو ان کی
مجھے صرف یہ مشورہ کرنے سے کہنا ہے کہ
کہ تو قصہ آپ ہمارے تو ان بنا کر بھیجیں۔ ناقابل
گیند سے شعبہ طبع کو پاک رکھیں۔ شکریہ ہم ان کی
کسی نظر کا جو شہ ہے ہیں ہوں ہوں اور
پر ہے کہ ان بنا آپ کا نام اور ہمارا فرض ہے۔

مستقل خیالات قائل فقیر ہاشمی

بقیہ آپ ایک سرمایہ دار کی طرح اپنے سرمایہ کو

بڑھا سکیں ——!

بقیہ تار عنکبوت صفحہ ۳۸ سے آگے

گئی ہے۔"

بڑی دیر تک نعیم اختر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔
"اگر حکومت ہند کی جانب سے کچھ ہوا تو
ضرور مشکل کا دن گا۔ فی الحال میں دوسرے
کیسوں میں زیادہ مصروف ہوں۔ پھر ہاں ایک بات
ایک آدمی کے متعلق بتا دیجئے کہ آپ کے ہاں فلاں کے
کہا تھا۔"

نعیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور
سیکرٹری نے کہا کہ صدر نعیم اختر سے
بات کرنا چاہتے ہیں۔

"یہ تمہارا ہی چیک کا نمبر ہے چل رہا تھا۔ جب سے
ہڑتال کا وقت نظر کر رہا تھا ——!"

——(باقی آئندہ)——

اپنی محفل اپنے دوست

مکتوب شبنم دہلی

مشہد بلوچستان کے ۱۰ جون کے شمارے میں مولانا آبرو شاہجہانپوری صاحب کے نام جمیل الشیشہ بانکہ مداس سے سوال نمبر ۱ مولانا کی طرف سے اس کا جواب نظر سے گزرا۔ سوال نمبر ۱ جواب میں مصرع "دل، دل، دل" کی خوبی کا ہوا ہے وہ بجز اس کے کہ تیسرے درجے کا مہمل مذاق کی نمائندگی کرتا ہے بالکل بہت ہے نہ اس مصرع کے شعر کے لئے موزوں اور غیر موزوں کی تحقیق کے لئے کوئی رہنمائی کرتا ہے کیوں کہ اس طرح کے مصرعے جو ہم کہنوں کے مصرعوں کی طرح مختلف امکان رکھتے ہیں کبھی جواب کے نوعی تحقیق کی تائید نہیں ہوتے۔ اور مقصد مولانا کے جواب سے پورا نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ موزوں ہیں ایک زائد اہم پہلو ہے جو تجربہ اور پیرا کرنا چاہئے کہ یہ مصرعے کس حد تک موزوں ہیں اور کس حد تک نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی دوسرے کے غیر شاعرانہ مصرعے پیش کر دیں اور مولانا کہہ دیں کہ موزوں ہیں۔ یہ کیا طریقہ ہوا اور اس نے کس طرح اشعار فہمیہ کے مصرعوں کو مختلف اوزان پر تولا ہے؟

پھر کہنوں کے سامنے مہرتوں کا پیش کرنا اور پھر ان کی رائے کو اس طرح پیش کرنا جس سے یہ دل ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی طرف میں نہ تو وزن کے سمجھنے کی کوئی صلاحیت ہے اور نہ ہی اس کے سمجھانے کی۔ ورنہ وہ ضرور اس کا حل پیش کرتے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کا حل پیش کرتے اور اس نے کس طرح عربی کے مصرع رباعی میں مستفعلن کو مستفعلن اور فارسی کے مصرع ثانی میں مستفعلن کو مفعولن بنا دیا ہے کہ اس تشریح سے ہم اس بھائی کے ساتھ دوسرے طالبان تحقیق کو بھی استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا۔

نیاز کیفی و شہباز صدیقی امروہا

(شہباز صاحب آپ خوب جانتے ہیں کہ تسکین صاحب کا پتہ کیا ہے اور اس کا حل کیا اور کیوں مستفعلن کو مستفعلن سے اور مفتعلن کو مفعولن سے بدل دیا جاتا ہے آپ کو شاید یہ سمجھنے میں کہ نیاز کیفی کے مشورہ ہی سب سے پہلی حالت پر پھر آپ کی گفتگو اس تسکین پر ہوئی تھی اور یہ نے آپ کی معلومات کی داد دی تھی۔ باقیں عام کرنے کی نہیں ہوتیں۔ آبرو شاہجہانپوری)

گرامی قدر جناب بسمل صاحب! تسلیمات

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ شعلہ شبنم ہر ماہ نظر سے گزرتا ہے اور ایک نئی چیز پیش کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اچھے مضامین انشائیہ اور غزلیں ہونے کے باوجود قیمت صرف پچیس نئے پیسے ہے۔

آج کے اس مہنگا شباب دور میں کسی اخبار یا رسالے کا جاری کرنا اور پھر اس کو برقرار رکھنا ایک معجزے سے کم نہیں لیکن میں آپ کی ہمت اور بلند خیالی کی داد دیتا ہوں کہ حسن و خوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں اور ہر ماہ ایک نیا گلدستہ پیش کرتے ہیں۔ صفت تو یہ ہے کہ "شعلہ شبنم" میں زیادہ تر نئے پرانے حصہ لیتے ہیں اور ہر ایک خوب سے خوب تر چیز پیش کرتا ہے۔ ورنہ کوئی کسی کے بہت سے دیوان پڑھ جاتا ہے کہ نئے فنکار کی جب سے کہیں اس کے رسالے پر کوئی کرم فرما جائے۔ لہٰذا وہ اپنا تمام تر کہنہ مشق کی طرف توجہ دیتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ماہ اچھا سے اچھا ہوتا چلا جاتا ہے۔

نیاز خیرآبادی۔ شفق ہاسپٹل۔ کلکتہ

محترمی اہل بسمل صاحب۔ تسلیمات

شعلہ و شبنم دسمبر ۱۹۵۱ء سے نظر سے گزرا۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
پھر ہی طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا (مرتب)

ایک عام فہم شعر ہے جسے پڑھ کر کہ مولانا عبدالماجد نے خواہ مخواہ علامہ نیاز فتحپوری کو مذاق دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاعری میں بہت سے اشعار ایسے بھی کہہ گئے ہیں جو مفہوم سے فی نفسہ۔ ذہنیت اور زمانہ کی بدلتی روش سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ ہر تنقید نگار اپنے انداز سے مطلب بیان کرتا ہے اپنی ایک الگ ذہنیت سے کام کرتا ہے اور انفرادی حیثیت سے اس پر رائے قائم کرتا ہے۔ بہت مشکل ہے شاعر کے نقطۂ نظر سے سوچنا یا اس جذبہ کو جانچنا جس سے متاثر ہو کر اس نے شعر کہے ہیں۔

میں اس بحث پر تضیع وقت نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا نے جس انداز سے مضامین پر کچھ لکھا ہے وہ خود ان کی شان میں زیب نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو علامہ سے کوئی ذاتی بغض ہے۔ ورنہ ایک ادیب دوسرے ادیب پر تنقید کرتے ہوئے ادب ملحوظ رکھتا ہے۔ ادب جو کہ زبان و انداز بیان کا مشترکہ آئینہ دار ہے۔

مولانا کے مضمون کا آخری حصہ جس میں آپ نے [illegible] کی غمازی کرتا ہے۔ [illegible]

(باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

بقلم تسلیمی رام پوری

سلسلہ قدامت جدید

شوق اثری رام پوری

شوق اثری رام پوری کا نام محمد شاہ نواز خاں عرف مکھن میاں تھا اور والد کا نام محمد اکبر خاں صاحب اکبر رام پوری عمر تقریباً تیس سال۔ نعیم انٹر ریٹ ہوٹل والے شیخ خاں صاحب مجذوب پردادا مولوی شاہ نواز خاں صاحب نواز شوق اثری کا سلسلۂ شاعری بالواسطہ طور پر شاہ نصیر سے ملتا ہے۔ یعنی شوق ۔ اکبر ۔ احمد ۔ وفا ۔ ذوق ۔ شاہ نصیر۔ آپ نے درس فارسی اور عربی رام پور کے مدارس کے علاوہ اپنے پدر بزرگوار حضرت اکبر سے پائے تکمیل کو پہنچایا ہندی پرائیویٹ طور پر پڑھی اور انگریزی تعلیم رضا انٹر کالج میں حاصل کی۔ گھر میں شاعرانہ مذاق موجود تھا۔ جس کی وجہ سے شاعری سے میلان طبع ہونا قدرتی طور پر ضروری تھا۔ چنانچہ اوائل عمری سے شعر و سخن کا چسکا لگ گیا اور ساتھ ہی طبیعت نزاکت پسند اور تیز تھی۔ اس لئے حصول علم کے بعد شعر و سخن کی مشق کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور پختہ مشق سخن نے ارتقائے سخن کی اس منزل پر پہنچا دیا جو یقائے دوام کا سچا حق دار ثابت کرتی ہے۔ جیسا کہ حسب قول مشہور سے ہمارے ہونہار شاعر کی ذہانت، جدت ذہنی صلاحیت اور اختراع دماغی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں صرف غزلیات کے متعلق اشعار پر اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔ غزلوں کے علاوہ ہمارا شاعر تمام اصناف سخن میں اپنی آزمائی کرتا رہا ہے۔ قطعہ، رباعیات، نظمیں کہنہ اور غزلیہ دونوں رنگ میں اس کے علاوہ دیہاتی زبان میں ہمارے شاعر کا کلام دلچسپ اور انفرادی شان رکھتا ہے۔ اب ہم اپنے شاعر کے چند ابیات ارباب ذوق نظر کے زیر مطالعہ کر کے حوصلہ افزائی کے طلب نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ خیالات کی روشنی میں اسالیب بیان کا فنی نظر سے جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ ہمارا شاعر صرف محبوب کی زلف گیسو اور کاکل پیچ و خم کے علاوہ محبوبیت پر کائنات نثار کر دینے والا حسن پرست ہے۔ جس کے تخیل میں وسعت ہے

ہوتا ہے تو ان تاثرات کو نہ صرف دل کی گہرائی، جگر کے اتھاہ اور پردۂ چشم اتیار نمک رکھتا ہے۔ بلکہ درد مند دل سے انتہائی ضبط و تحمل کے باوجود ناقابل برداشت تاثرات کے غلبہ پر مجبور ہو جاتا ہے اور شعری شکل میں تخلیق کیفیت سے اپنائے زمانہ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ ایک مفلوک الحال غریب کی زبوں حالی پر مشفقانہ طور پر اہل دولت سے ان کے لمحات عیش میں سے ایک لمحہ نکال کر اس حقیر دل سوز کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کہتا ہے۔

کبھی دل میں سوچیں تو یہ اہل ثروت
غریبوں کے چہرے ہیں کیوں زعفرانی

اسی جذبہ کے تحت ہمارے شاعر نے نوع انسانی کے ان تمام ظریفات اور شگوفہ ہائے ماضی کو حرف غلط ثابت کر دیا۔ اور گرد و پیش کے حالات سے تاثر پذیر ہو کر تجربات سے تھک کر اگر ثابت کر دیا کہ بوڑھی کا شگوفہ غلط اور بے بنیاد الزام تراشی ہے۔ بلکہ فلک کی رفتار کے ہم پلہ ستم ہائے بے شمار ارض حالم کے ہیں۔ یعنی اہل زمین جو آسمان کے شاکی ہیں یہ خود ہی جفا کے بانی ہیں، اور یہ غلط بھی نہیں

آدمی پر کم نہیں جور زمیں
آسمان تو تہمت میں بدنام ہے

ہمارا شاعر عملی گفتار اور صفات عالیہ سے کیا درجہ اتم متصف ہے۔ اپنی نظر شوخ سے اور خود اعتمادی پر ہی قدرداں ہے کہ اگر اپنی ناقدری کا خوب اندازہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چشم محبوب کا الزام سے بری رکھ کر اپنے خیالات سے پیدا ہونے والے تاثرات کو ناکارہ قرار دے کر قوت فیصلہ کے پردہ میں ایسی نشتر زنی کرتا ہے جس کا علاج نا ہے یعنی ؎

فریاد کارگر نہ اثر میری آہ میں
قسمت کا فیصلہ ہے تمہاری نگاہ میں

اب ہمارا شاعر تشبیہات کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور اس سبک انداز سے کہ شب وصل کی تاریکی اور روشنی دونوں کو احساس تک نہیں ہوتا۔ دست تخیل سے چشم زدن میں دو کیفیات اور ماحول کو دن کر دیتا ہے شاعر کہتا ہے۔

عارضوں پر گیسوؤں کے نام سے
صبح کو بدنام کیا ہے شام سے

معلوم کہ اس مفہوم کو پہلے کسی شاعر نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ مگر ہمارے شاعر نے زیر نظر خیال کو معنوی جدت سے پیش کیا ہے اس کا مستحق قرار دے دیا ہے۔

شاعر کا کمال تخیل آفرینی کی حدود میں ہے۔ نہ تو شعر کہتا ہے نہ شعر کہنے کا تصور دل میں جاگزیں ہے۔ بلکہ شوق اثری نے شاعری کا فطری جذبہ پیدا کر کے اس ترقی کا دوسرا نام جدت ہے۔ جدت

کسی بھی قسم کی تک بندی کو سکتے ہیں یہ اساتذہ شاعر کہتے ہیں ؎

ذرا تم چونکے کچھ بھولے تو فوراً بڑھ گئے
جس قدر سوچا چھپا اتنا ہی بڑھتا چھپا

اس شعر کو بھی معمولی خیال کا بلند پر کہا ہے۔ تمام لفظیات شعری کو فکر و ناز کرنے کے بعد بھی موقع کے چھپتے وقت "اتنا ہی بڑھتا چھپا" ہی کہا جواب نہیں۔ مگر جہاں دیدہ اور تجربہ کار کسی نازک خیال نے سورج کے غروب ہوتے وقت کبھی سایۂ انسانی کو اپنے سایہ کو جو ہر لمحے کا مشرق کی طرف بڑھتے دیکھا ہوگا تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جب سورج نصف النہار سے ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو ہر لمحے کا سایہ کس قدر تغیر یا تبدیلی ہو نا شروع ہو جاتا ہے تب نظر اس کے کہ مفہوم شعر میں ایک تمام جا دیکھا ہا دے اور اس عالم کو دیکھا ہا کہ کا تھا ہا ہو سکتا ہے جو وقت کے ساتھ دن کی صبح سے شام پر کل روز فزوں ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اشاء اللہ کیا ہی خوب کہا ہے۔ اس شعر کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

شوق اثری کا خیال دوم شعر گوئی کسی نئی چیز کی تلاش میں شاعرانہ غرض تصور کرتا ہے شعر

کلام قافلے والو پتا منزل کی دوری کا
مری سانسوں کی آہیں ہے مرے ہونٹوں کی دھڑکن ہے

یہ شعر کسی حاذق الملک اور نبض داں طبا کی شروع کا لکھا ہوا ہے۔ جس کو یہ اعتراض ہوگا کہ سانسوں کی آہیں سے کیا مراد ہے اور ہونٹوں کی دھڑکن کیا شے ہے۔ جب کہ دل کی دھڑکن ہوتا ہے اور رات آہیں بھرتے ہے۔ جواب یہ ہے کہ دل کی دھڑکن اور نبض کی دھڑکن میں کیا فرق ہے اور انتقال ہے اور یہ ترجمہ سانس کے جھٹکے سے پتہ کرنا آہیں کہا ہے۔ یہ اس شعر خصوصاً ہے اور لفظیات ہے۔ واہ کیا خوب نازک اور لطیف خیال ہے۔ واہ

اور جو ہے جزیں ان کے لئے قطعاً حرام ہے کہ حرام مطلق غیر شعر کی ندرت، لطافت، بیساختگی، شاعرانہ پن اس آئین قصیدہ کو موجود کی قابلیت نہیں رکھتی ہے۔ خوب کہا ہے۔ یہ ہے ہمارے شاعر کی مشق سخن اور کاوش فکر کا کارنامہ۔

اب اس قسم کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو جس کے لفظوں میں پیکر حسن و جمال کو دلفریب مسکراہٹوں کا جواب اتی منظر سامنے آجاتا ہے۔

عرض نگاہ و شوق پہ صرف نہ مسکرا دیئے
کہہ گئے ایک داستاں کچھ بھی مگر کہا نہیں
گزار ہے ہیں وہ بجلی دلوں پہ ہنس ہنس کر
کرم کی شان تو یہ ہے شتاب کیا ہوگا

جب بھی کسی کے خرمن ہستی پر کرے گی ترحم کستر کر دے گی۔ لیکن جلوہ گاہ محبوب میں برق اعظمی شان کرم ہے، جہاں شعلۂ برق کو کرم کا درجہ حاصل ہے ایسی بارگاہ حسن و جمال میں شان عتاب کا کیا عالم ہوگا۔ اللہ اللہ کیا تلوش اور طرز فکر کا کس قدر بلند مقام ہے۔ ایسا شعر وہی قادر الکلام شاعر کہہ سکتا ہے جو نظر عاشق اور مرتبہ حسن محبوب کی حقیقت سے کما حقہ آگاہ ہو۔ شاعر وہم فکر سخن فضائے عالم کی ہر منزل سے گزر کر بستہ بلند، پست، وشمال کی وستعا کو اپنے خیال کی آغوش میں لیتا اور دل کی گہرائیوں میں ضم کر دیتا کہیں سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر شے، اس کو فقط مرجع معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر ایک طرف عشق مجاز کا صحیفہ اپنی سرگزشت سمجھتا ہے تو دوسری طرف عرفان حقیقت کا صحیفہ ہو اپنا فانی منزل سمجھ کر عالم اخروی شریک حال تصور کرتا ہے۔ اگر ایک طرف رنگین محفل مجاز سے متاثر شاعر اہل بزم مجاز کو تاڑ اور اس کے غمزوں پر مجبور کرتا ہے تو دوسری طرف خود شناسی کی منزل میں پہنچ کر عارف خدا کو تڑپا کا تا اور اناالحق اور انا الغیور و لگانے

کا دعویٰ بھی کرتا ہے یعنی قابل کو اپنے کمال کا اعتراف کرنا ہے۔ اس حال کی تصویر پیش کرتا ہے کہ ایک سرمایہ ناز کی ترک و استغنا کی برتری سے تصویر محبوبیت بنا دیتا ہے تو دوسری جانب ایک بیچارہ و مفلس کے شکستہ دل کی دعا انگیز صدا سن کر عالم انسانی کو تڑپا دینا بھی کر سکتا ہے۔ ہمارے شاعر میں یہ ہر قسم کی قدرت موجود ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے کلام کو مختلف رنگ میں پیش کیا ہے۔ غریب کی سرگزشت، حسن جہاں کی رنگینیاں، حسن حقیقت کی جلوہ آرائیاں اور ساتھ ہی ظرافت بھی اس کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ سادگی ہے اور شوخی بھی، لطافت بھی ہے اور نزاکت بھی۔ غرضکہ ایک جوان شاعر کے کلام میں جتنی خوبیاں ہونی ضروری ہے وہ سب ہمارے شاعر شوق اثری کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ سچی مشق سخن کا نتیجہ ہے کہ اتنی کم عمر میں وہ پچاس سال سے زائد شاعروں کو مشق کرا رہا ہے۔ ان کی صحیح رہنمائی کر رہا ہے اور انھیں درس فن شاعری دے کر اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کر رہا ہے۔ ہم اپنے شاعر کے چند شعر بطور نمونہ اور پیش کر رہے ہیں۔

نقاب رخ اٹھا دی اس نے لیکن دیکھ کر حالت
بڑے موقعے سے کام آئی ہے مشقی بے خودی اپنی

وہ دل کو دیکھتے ہیں، ہم ان کی نگاہ کو
کیسا کہیں کہ ہے مذاق نظر کہیں
جس نے بھی تیرے در کا اٹھایا ہے
سجدے ہوئے ہونٹوں سے مرا نام لیا ہے
میری بگڑی ہوئی قسمت کے بنانے والے
ان کو مائل بہ عنایات بنانے والے
یہاں سے بھی انھیں کاندھا دے کر کیوں نہ لے چلیں؟
قبل کا دل کہ ہے کہ ہے ہے ہے ہے ہے ہے
چمک رہے ہیں [illegible]

ارشادات

صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

دو دن کی زندگی کے لئے گھر کہاں نہیں؟
ہم گھر سے بھاگتے ہیں کہ رہنا یہاں نہیں

ہمت فزا ہیں شوق کی ناکامیاں ہنوز
اے غم مجھے تو فرصتِ آہ و فغاں نہیں

ہے اضطرابِ زیست پتے راحتِ اجل
تو آشنائے لذتِ خواب گراں نہیں

وہ جاں نثار دوست کہاں وہ کہاں عزیز
دھوکا نہ دے وطن یہ ہمارا مکاں نہیں

رہتے ہیں دورِ زندگیٔ مستعار سے
ہے کس کی جستجو میں فنا ہم جہاں نہیں

دنیا ہی دوسری ہے دیارِ حبیب کی
ایسی وہاں زمیں نہیں یہ آسماں نہیں

اے سانس آہِ گرم غلط، شعلہ بار ہو
میں تجھ سے آگ مانگ رہا ہوں، دھواں نہیں

ہوتا ہے سنگ و خشت پہ سودا جنون کا
پھیری میں لے گھوم رہا ہوں، دکاں نہیں

بگڑا ہوا ہے اب تو کچھ ایسا جہاں کا راگ
کیسے بھی لے اٹھایئے بندھتا سماں نہیں

ہے طول و عرضِ ملک پہ چھائی ہوئی یہی
ناطق کہیں کی خاص اب اردو زباں نہیں

(مولانا) صوفی آنند سیمابی ناگپوری

دو غزلیں

ہوش کی بات نہیں، اے مرے غم کوش نہیں
ہوش ہی کب مجھے آیا تھا کہ اب ہوش نہیں

اُس کی دیوانگیٔ عشق وفا کوش نہیں
جس کو عرفانِ غمِ زندگیٔ ہوش نہیں

نالہ پابندِ الم، نغمہ بقیدِ فریاد
کوئی بھی محفلِ ہستی میں سکوں دوش نہیں

ہوگیا ہے غمِ دل تکیہ پہلوئے نشاط
اب کسی وقت بھی خالی مرا آغوش نہیں

کوئی تو عرضِ نیاز اپنی سنے گا اے دل
محفلِ ناز کا ہر فرد گراں گوش نہیں

مجمعِ حشر میں یارب مرے جرموں کا حساب
کیا تری رحمتِ مخصوص خطا پوش نہیں

بات ہے عام حقیقت کو چھپاؤں کیسے
میرے افسانے کی سرخی لبِ خاموش نہیں

پیشِ امروز میں رہتا ہے وہی بیخود و مست
انتہائے غمِ فردا کا جسے ہوش نہیں

اب کس کس کا یہاں شکوہ کریں گے طرفہ
کون اس دہر میں احسان فراموش نہیں

زینتِ قلب و نظر جلوۂ آغوش نہیں
ہوش آتا تو نہ کہتا کہ مجھے ہوش نہیں

پھونک دے جامۂ دل اتنا ابھی جوش نہیں
سوزِ جذبات کوئی آتشِ خاموش نہیں

روح بیدار نہیں دل ہمہ تن گوش نہیں
ہر نفس زمزمہ پرداز ہے خاموش نہیں

یاد آئی ہے کہ میں جلوہ گہِ ناز میں ہوں
کوئی منظر، کوئی عالم بھی فراموش نہیں

کیا اٹھائے گی نظر جذبۂ دیدار کا بوجھ
ابھی دل بارِ تمنا سے سبک دوش نہیں

اس کا عنوان جنونِ غمِ ہستی ہو
جس فسانے کی حقیقت کا مجھے ہوش نہیں

عشق کو یاد ہے بے پردہ تجلی کا سماں
دیدۂ حسن طلب جلوہ فراموش نہیں

میں نے تارے تو چمکتے ہوئے دیکھے لیکن
ان کے انوارِ تبسم کا مجھے ہوش نہیں

عدم آثار ہوا نطق و سماعت کا وہ
آج ہنگامۂ ارباب لب و گوش نہیں

اور گونجے گی صدا نالۂ دل کی آنند
سوز نے سازدہ چھیڑا ہے جو خاموش نہیں

قطعات

ہمیشہ سے جہاں میں شانتی کے ہم پجاری ہیں
مگر کچھ بات ایسی ہے کہ اب چپ رہ نہیں سکتے
وہ آزادی جسے ہم نے بڑی مشکل سے پایا ہے
اُس آزادی کے دشمن کو کبھی ہم سہہ نہیں سکتے

رہا ہے آج تک مانا اصول اپنا "اہنسا" کا
مگر خود اپنی "سرحد" کی حفاظت بھی ضروری ہے
کچھ ایسے "ناگ" جن سے ڈس لیے جانے کا خطرہ ہو
بلاشک و شبہ اُن کی ہلاکت بھی ضروری ہے

بہت ہم لڑ چکے "صوبائی" اور "بھاشائی" باتوں پر
مگر اب وقت ہے یہ سارے فتنے سرد ہو جائیں
یہ پنجابی، یہ بنگالی، یہ مدراسی، یہ گجراتی
ضرورت ہے وطن کے نام پر سب ایک ہو جائیں

وطن والو! تمہاری آزمائش کا زمانہ ہے
وطن کے واسطے گر بار دے دو مال و زر دے دو
اگر چاہے وطن کی حاجتیں پوری نہ ہوں پھر بھی
تو جا کر اس کو اپنی جان دے دو، اپنا سر دے دو

وطن کے نوجوانو! آج سب کو ناز ہے تم پر
یقیں جانو یہ قربانی کبھی ضائع نہ جائے گی
بڑھے گے تو وطن کے تاج دار تم ہو گے
مرو گے تو شہادت کی سعادت ہاتھ آئے گی

مجھ کو اندیشہ ہے پانی سر سے اونچا ہو نہ جائے
بڑھتی جاتی ہے روانی ظلم کے امواج کی
جان کی بازی لگا کر شاطرانِ چین سے
آبرو رکھنی پڑے گی تم کو قیصر تاج کی

اے مرے ہند کے جاں باز جوانو ہشیار
حامیِ امن کو للکار رہے ہیں غدار
وقت کا یہ ہے تقاضہ کہ بدل کر تیور
شیواجی اور ہمایوں کی اُٹھا لو تلوار

تم وفادارِ وطن ہو تو اُٹھاؤ تلوار
جا کے دکھلاؤ ہمالہ پہ کرشما اپنا
چیرتے پھاڑتے انگار کے ٹھنڈی دل کو
سرحدِ چین پہ لہراؤ ترنگا اپنا

کتنے سینوں پہ ابھی اور چلے گی گولی
فائدہ کتنا اُٹھائیں گے شریروں سے رذیل
باغیِ جور پہ کب تک نہ اُٹھے گی تلوار
تا کہ امن کے احکام کی ہو گی تعمیل

دو غزلیں

آرزوئے وصال میں یارب — زندگی ہے وبال میں یارب
ایک عالم ہوا ہے دشمنِ جاں — کیا دھرا ہے کمال میں یارب
کیا کوئی ابتدا بھی پنہاں ہے — زندگی کے مآل میں یارب
کیوں جلالِ خرد ہے سرگرداں — جستجوئے جمال میں یارب
اک انوکھا مذاق ہے دراصل — زیست میرے خیال میں یارب

کرشن موہن تو آج کل اکثر
رہتا ہے وجد و حال میں یارب

اہلِ سوز و ساز میں سے ہم بھی ہیں — قلتِ جاں باز میں سے ہم بھی ہیں
محرمانِ راز میں سے ہم بھی ہیں — گرچہ ہیں وابستۂ عشقِ مجاز
کشتگانِ ناز میں سے ہم بھی ہیں — اک نظر ہم پر بھی ہو اے چشمِ ناز
محفلِ ممتاز میں سے ہم بھی ہیں — گرچہ اب اس میں نہیں ہیں باریاب

کیوں نہ ارفع ہو ہمارا بھی مقام
تارکانِ آز میں سے ہم بھی ہیں

شہرت میرٹھی۔

غزل

نہ جانے کیوں توجہ اس طرف کم ہوتی جاتی ہے
نگاہِ یار اپنے آپ برہم ہوتی جاتی ہے
اثر لیتا ہے اب نیرنگیٔ عالم سے دل اتنا
جہاں کی ہر خوشی میرے لئے غم ہوتی جاتی ہے
ندامت سے مری جتنے حشر میں آنسو بہا تا ہو
سیاہی فردِ عصیاں کی مرے کم ہوتی جاتی ہے
سحر کو رنگ پھیکا پڑ رہا ہے بزمِ گردوں کا
ستارے چھپتے جاتے ہیں چمک کم ہوتی جاتی ہے
دمِ آخر ہمیں اُمیدِ ہمدردی ہو اب کس سے
مخالف جب ہوائے باغ عالم ہوتی جاتی ہے
ہمیں غافل نہ ہونا چاہئے یادِ الٰہی سے
ہماری زندگی ہر سانس پر کم ہوتی جاتی ہے
سحر ہونے کو ہے مٹنے کو ہیں ہم بزمِ عالم سے
چراغِ زندگی کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے
نہ جانے کون سی شے کھینچ رہی ہے جسم سے شہرت
دمِ آخر نظر کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

مذاق ابروی چکھادوی

افکار نو

ادھر تو شیخ عصیاں کار بھی ہے — ادھر جنت کا ٹھیکیدار بھی ہے
مریضِ عشق کچھ مکار بھی ہے — بھلا چنگا بھی ہے بیمار بھی ہے
"بھگت" ہے میرا نیتا — اہنسائی بھی مچھلی مار بھی ہے
بڑا مال کیوں سمجھیں نہ اپنا — ہماری اجکل سرکار بھی ہے
پتہ چوری کا اب کیسے لگے گا — کہ اب تو چور چوکیدار بھی ہے
یہاں ہے "شدھ گھی" کا بورڈ چسپاں — وہیں تو ڈالڈا بھنڈار بھی ہے

مذاق ایسا نہ ہو چالان ہو جائے
غزل میں طنز کی بوچھار بھی ہے

سرشی چند جین کاتل بانپتی

ب آ خدا کے لئے بن کے پاسباں دل کا — ترے بغیر بیاباں ہے گلستاں دل کا
ہ چاہئے تھا تمہیں بن کے باغباں دل کا — جلا کے خاک کیا تم نے آشیاں دل کا
ھیں پہ سجدے کئے جا جو رفعتیں چاہے — بہت بلند ہے اے دوست آستاں دل کا
ا اداس ہیں سمٹ آئی ساری دنیا کی — تمہارا درد بنا جب سے میہماں دل کا
ٹی ہے دل پہ کسی کی نگاہ بہر قیام — جواب سارے زمانے میں اب کہاں دل کا
ہا سکون میسر نہ دل کے ارماں کو — رواں دواں ہی رہا آہ کارواں دل کا

مگل رہے ہیں شرر دل کے داغ اے کاتل
بھی بہار میں جلتا ہے آشیاں دل کا

الطاف انصاری سلطان پوری

بھارت کے جوانوں سے

بھارت کے جوانو اٹھو اب ہوش میں آؤ
یہ وقت عمل کا ہے نہ تم وقت گنواؤ
سرحد پہ ہیں جو آ کے ڈٹے چینی درندے
تم آگے بڑھو اور انھیں مار بھگاؤ
تسلیم کہ دشمن کی ہے تعداد زیادہ
لیکن بخدا اس کی نہ تعداد پہ جاؤ
تا عمر دلاتی رہے جو یاد تمہاری
ہاں سینۂ دشمن پہ وہی ضرب لگاؤ
تاریخ زمانہ جسے سینے سے لگائے
شیدائے وطن تم وہ عمل کر کے دکھاؤ
ہے بھنور حوادث میں پھنسی ہند کی کشتی
پتوار سنبھالو اسے تم پار لگاؤ
مر جائیں گے لیکن کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے
یہ عزم لئے دل میں، قدم اپنے بڑھاؤ
جینے کی تمنا ہے جو عزت سے وطن میں
ہنستے ہوئے پھر موت سے تم آنکھ ملاؤ
چلتے رہو چلتے رہو تم راہِ وفا میں
مشکل کوئی پیش آئے تو خاطر میں نہ لاؤ
جو ہمتیں ہارے ہوئے بیٹھے ہیں ابھی تک
الطاف پڑھو اور انھیں میدان میں لاؤ

شفق سہسرامی

تصورات کی محفل میں سوز جاں بن کر
وہ آگئے ہیں مگر کس کا میہماں بن کر
ہمیں نے بجھا دیے صحرا میں منزلوں کے چراغ
سیاہ رات میں چمکے ہیں کہکشاں بن کر
نگاہِ لطف و نگاہِ کرم تری ہمدم
غمِ دوراں کی نہ رہ جائے داستاں بن کر
ہر اک کی بھول فسردہ، ہر اک کی آہیں چپ
اجاڑ دیا تم نے باغباں بن کر
یہ ہوش بھی نہ ہو جن کو کہ ہے کہاں منزل
وہ کیا کریں گے بھلا میرِ کارواں بن کر
نہ اس پہ بس کی میرے عزائم دل پہ
ہزار بار شاسیرا آشیاں بن کر
دیکھے کوئی یہاں جب ہماری بات شفق
تو پھر جبیں بھی بھلا کیسے بے زباں بن کر

مظہر شفائی رتلامی

مسرت دل کو ہوتی ہے تو پیدا غم بھی ہوتا ہے
بچھڑے جو ہمدم اس سے دم بھی ہوتا ہے
یہ غم خود سری کہہ تو گئے ہیں مجھ سے آنے کی
بھلا وعدہ کسی کا ایسا مستحکم بھی ہوتا ہے
مجھے کوتاہیِ دامن کا شکوہ ہے زمانے سے
تہی دستِ سخاوت کیا کسی سے کم بھی ہوتا ہے
فسانہ لغزشِ آدم کا افسانہ بنا ڈالا
کبھی دنیا میں ذکرِ عظمتِ آدم بھی ہوتا ہے
وہ مظہر کسی کی راہ جاتے نہیں دیکھی
سرِ تختِ تکبر اعجزی سے خم بھی ہوتا ہے

محمد علی شرافت تاجر کوٹلوی

بدلیے کم ظرف سے ہر دم کنارا کیجئے
اپنا گھر اپنا ہے اس کے دل میں پیدا کیجئے
ہو نہ جائے دامنِ عزت عبارِ اعتبار
اس جہاں میں خاکساری سے گزارا کیجئے
دوستانی، خودنمائی، خودستائی بھی نہیں
کائناتِ دہر میں ان سے کنارا کیجئے
خواہشِ دنیا میں کیا رکھا ہے ذلت کے سوا
دل کو اپنے نورِ ایماں سے منورا کیجئے
شعر میں جوہر کے لعل بے بہا زیرِ فلک
دیکھنے کی آنکھ سے بس آنکھ دیکھا کیجئے

جلال و جمال

محمد امین شرر سلطان پوری

میرے سینے میں یہ زخموں کا نمایاں ہونا
موجبِ فخر ہے صد رشکِ گلستاں ہونا
شمعِ ایماں کا اگر دل میں اجالا ہی نہیں
کام کیا آئے گا مسجد میں چراغاں ہونا
جلوۂ یار تو ہر شے میں نظر آتا ہے
شرط ہے حسنِ بصیرت کا نمایاں ہونا
مادہ و جسم میں پہنچا کوئی دشوار نہیں
بس کہ دشوار ہے انسان کا عرفاں ہونا
جس نے دیکھا ہے کوئی میری نظر سے پوچھے
آئینہ دیکھ کے اس شوخ کا حیراں ہونا
کیوں زمانے کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے شرر
یہ مرا بزمِ سخنداں میں غزل خواں ہونا

شوکت جلالی

ساری دنیا کہہ رہی ہے گریہ ویرانہ ہے
آپ سمجھے جا رہے ہیں پھر بھی فرزانہ ہے
محفلِ بادہ حسیں، ساقی حسیں، سافر حسیں
رونقِ خلد بریں ہے میرا کاشانہ ہے
بے خطا میں نے بھر دیں تیرے غم کی سرخیاں
کوئی بے عنواں نظر آیا جو افسانہ ہے
گردشِ دور و حرم سے بھی نہ جب بچ سکا
تب کہیں تیرا نظر آیا ہے کاشانہ ہے
جس کو سن کر ان کی پلکیں رشکِ شبنم ہو گئیں
یاد ہے وہ اک حسیں رنگین افسانہ ہے
کیا تماشہ ہے یہ شوکت باغباں ہے
گلستاں لیکن نظر آتا ہے ویرانہ ہے

مسعود مفتی لاہور

(مفتی مزاج)

ان سے ملئے

ادب لطیف: یہ بھی بہت خوب رہی۔ آپ نے ہمیں ڈانٹ دیا۔ ہم نے آپ سے ملنے کا وقت مانگا تھا۔ آپ کا انٹرویو تو نہیں مانگا تھا۔ ہم تو آپ کو ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ کی شاعری کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سنا اور پڑھا ہے۔ ہم آپ کو بتانا بھول گئے کہ ہم آپ کے بہت بڑے مداح ہیں۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی شاعری کے بارے میں بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ آپ کی شاعری میں ایک نئی آواز ہے۔ ایک نیا لہجہ ہے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے نظریات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے تاثرات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے احساسات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے جذبات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے رجحانات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے میلانات جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے رویے جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز فکر جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز احساس جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز عمل جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز زندگی جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تکلم جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تحریر جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تخاطب جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تعلق جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تعلیم جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تربیت جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تدریس جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تنقید جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تبصرہ جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تجزیہ جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تحلیل جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تجسس جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تفکر جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تدبر جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تعقل جاننا چاہتے تھے۔ ہم آپ کی شاعری کے بارے میں آپ کے طرز تفہم

ایک بار میں نادرن بھی تو جا چکے ہیں لیکن نادرن سے میرا مراد انگلینڈ یا جرمنی نہیں، بلکہ پاکستان کے لیکن یہ داغی جدکمارت سرکے کسٹم اسٹیشن سے ہی واپس لوٹ آئے تھے کیونکہ کسٹم والوں نے ان کے شایان شان استقبال نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ آپ کو پاکستان کے تمام شہروں کا حال بتا سکتے ہیں اور کراچی کے بارے میں تو انتہائی تفصیل سے بتائیں گے۔ لیکن آپ ان سے یہ کبھی مت معلوم کیجئے گا کہ کراچی کا اسٹیشن کس طرح کا بنا ہوا ہے اور شہر کی کس سمت میں واقع ہے، ورنہ ہو سکتا ہے یہ جھٹ کر آپ کو جواب دے بیٹھیں کہ میں کراچی گیا تھا اس کا اسٹیشن دیکھے نہیں۔

ان کے بارے میں پچھلے سے ایک خاص بات اور بتا دوں کہ آپ کبھی ان سے جلنے اور سگریٹ مت مانگیے گا، ورنہ پھر شہر کے تمام لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ انھوں نے آپ کو جلا اور سگریٹ پلائی ہے۔

اگر آپ بدقسمتی سے کوئی افسانہ نگار ہیں اور بیکار ہیں اور آپ کی کبھی بھائی محمود جمیل صاحب سے ملاقات ہو گئی تو پہلے یہ آپ کو دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگائیں گے "ہا" کیا حال ہے" اور پھر فوراً ہی دوسرا سوال کریں گے کہ "آج کل کچھ لکھ لکھا رہے ہو؟" تاکہ آپ بھی جواب میں ان سے یہی سوال کر سکیں۔ لیکن جب آپ ان کو اپنی بے کاری کا رونا روتے ہوئے بتائیں گے کہ بھائی میرے EMPLOY MENT EXCHANGE کے چکر لگاتے لگاتے تنگ آ گیا ہوں۔ سو پچاس جوتیاں کہیں سائٹ سٹریٹ پر ہی گر گئی ہوں گی تو یہ سن کر نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے فرمائیں گے۔ یار تم نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا، اپنے آفس پی، ڈبلیو، ڈی میں اپنے چچا CHAIR MAN کو تو یہی۔ ان سے کہہ کر چند ہی دن میں نوکر رکھوا دوں گا اب تک ظہر کے دس بے کار نوجوانوں کو نوکر رکھوا چکا ہوں

تمہارا یہ دوست تمہارے کس کام آئے گا۔ ان کی اس دعا پر کہ کے نظاہر ہے آپ انتہائی شکر گزار ہو جائیں لیکن خالی شکریے سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے تو آپ ان کو ایک کپ چائے پلائیں گے اور پھر ان کے چند تازہ ترین افسانوں کو دل پر جبر کر کے سنیں گے اور داد دیں گے اور پھر آپ نوکری حاصل کرنے کی غرض سے روزانہ ان کے دفتر کے چکر لگائیں گے اور یہ گھنٹوں من گھڑت واقعات سنا سنا کر آپ کو بور کریں گے اور آپ کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان لغویات کو سننا پڑے گا۔ ورنہ پھر اس کلرکی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو بھائی محمود جمیل صاحب آپ کو دلوانے والے ہوں گے۔ آپ روزانہ ان کے ساتھ گھنٹوں مغز ماری کریں لیکن اس سے مطمئن، بچنے کی نوکری آپ کو کسی حال میں نہیں ملے گی۔ چونکہ خاص طور سے ان کے چچا ان ہی دنوں بمبئی گئے ہوئے ہیں گے۔

یہ آپ کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ سینما دکھانے لے جائیں گے اور فرمائیں گے سالے فیئر اپنے ملازم ہیں، وہ مجھے دیکھتے ہی پاس اشو کر دیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کی بدقسمتی سے پاس اس روز ختم ہو چکے ہوں گے۔ یا سینما کا منیجر کہیں چلا گیا ہوگا۔

اگر آپ ان کو اپنا کوئی افسانہ بغرض اصلاح دیں تو اسے واپس کرنے کے بعد یہ آپ کو نہایت پُرخلوص مشورہ دیں گے "بھائی یہ افسانہ نگاری تمہارے بس کی نہیں اس لئے کہ تم میں افسانہ نگار بننے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ اس طرح تم ادب کو اور خود کو دھوکا دے رہے ہو تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ اس افسانہ نگاری کے چکر میں مت پڑو، بلکہ بمبئی چلے جاؤ۔ وہاں فلم انڈسٹری میں میرے ماموں ہیں، بہت بڑے ادیب اور فلم اشٹار ہیں۔ میں ان کے نام تمہارے لئے ایک سفارشی خط لکھ دوں گا۔ وہ تمہیں میری سفارش پر اکسٹرا کا یا کوئی چھوٹا موٹا رول ضرور دلوا دیں گے۔

اور پھر یہ آپ کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے کے لئے آپ کو بتائیں گے کہ جب پہلی بار میں اپنا زیر تصنیف ناول "سماج کی پیپ" کے سلسلہ میں بمبئی کی ان علم افزوں سے ملنے گیا جو فلم اشارہ بننے کے چکر میں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں (چونکہ یہ بغیر مشاہدہ کے کچھ لکھنا پسند نہیں کرتے) تو وہاں کے پریس سے PRODUCERS نے مجھ سے فلم کے لئے کہانیاں لکھنے کو کہا اور چند ایک نے تو میری شخصیت سے متاثر ہو کر اپنی فلموں کے لئے ہیرو کا رول بھی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ان سب کی اشتہاؤں کو ٹھکرا دیا۔ اس لئے کہ بھارت کی فلم میں کام کرنا یا بھارت کے PRODUCERS کو کہانیاں دینا میری شخصیت اور فن کی توہین ہے۔ اگر بالی وڈ کے PRODUCERS اس قسم کی درخواست کرتے تو میں شاید اس پر کچھ غور بھی کرتا۔

اگر آپ بھائی محمود جمیل صاحب سے ایم۔ پاشا کے بارے میں کوئی تذکرہ چھیڑیں گے تو وہ پہلے تو کئی زاویوں سے منہ کو بنائیں گے اور پھر نہایت بیزاری سے فرمائیں گے۔ یار! میں تو اس ایم۔ پاشا سے تنگ آ گیا ہوں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی افسانہ لئے سر پر موجود ہے کہ اسے اصلاح کر دو تاکہ اگلے روز اسے اخبار میں شائع ہو جائے۔ بھلا بتاؤ کہ میں ادیب نہ ہوا بھی بڑے کا ٹوٹ ہو گیا کہ ہر ایک کے افسانوں پر اصلاح کرتا پھروں۔ ایک بار تو حد ہی ہو گئی۔ ایک افسانوی ہورہا تھا کہ دیکھو تو ایم پاشا گھر پر موجود ہے۔ میں نے معلوم کیا بھائی آپ کیسے تشریف لائے ہیں تو کہنے لگے یار افسانوی مقابلہ میں افسانہ دینے کی تاریخ گزر گئی ہے اور میں کوئی تازہ افسانہ نہیں لکھ سکا اس لئے تم ہی کوئی گھسا پٹا افسانہ دے دو تاکہ میں اسے اپنے نام سے مقابلہ میں دے دوں۔ بس کیا بتاؤں میں کر ہا ہو گئی۔ دل میں تہیہ کیا کہ اس کو اس [illegible]

باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ کیجئے

بلاک شکیل:-	ایک آدمی
فرش:-	شکیل کا بیڈ روم
ضمیر قدوائی:-	بلاک بیک بیڈ وائٹ پیشانی ہاؤس
شاہدہ:-	ایک پبلشر

(پردہ اٹھتا ہے)

شکیل:- ایک شکستہ مکان کا ایک بوسیدہ سا کمرہ۔ کمرے میں ایک چارپائی۔ ایک میز اور تین بے ترتیب کرسیاں بکھری ہوئی ہیں۔ میز پر کچھ کتابیں اور چند کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو سامنے سڑک کی طرف کھلتا ہے۔ سامنے دیوار میں ایک کھڑکی جس سے ریل کی پٹری اور اس سے آگے سنسان میدان اور ویران پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پہاڑیوں سے کسی گیدڑ کی خوفناک آواز ابھرتی ہے اور باقی ہوئی فضا میں دفن ہو جاتی ہے۔

شکیل کھاٹ پر نیم دراز حالت میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنی پیشانی کا بار بار پسینہ ہوئی لمبی پونچھ کر رہا ہے۔ اور دو خلاؤں کو گھورتی ہوئی آنکھیں پھر واپس آجاتی ہیں اور وہ پھر جلدی جلدی کچھ لکھنے لگتا ہے۔ یکایک دروازے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

شکیل:- (دروازہ کھولتے ہوئے) کون ہے کمبخت! اوہ تم ہو فرحی تم، کہو یاد کیسے آیا ہوا؟

فرحی:- (اندر آتے ہوئے) سوچا تھا نہ آؤں گی مگر نہ آ سکی۔ کہو آج کل کیسی گزر رہی ہے؟ کوئی نئی چیز لکھی ہے یا ہے؟

شکیل:- (دروازہ بند کرتے ہوئے) "اوہ مائی گاڈ" (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بیٹھو۔

فرحی:- (بیٹھتے ہوئے) ہاں تم نے کچھ کہا نہیں ابھی کہ کیسے ہو..... بھئی تمہارا یہ نئے نئے انجوم "شاہدہ" کا کیا حال ہے اور ایک چیز تو تم نے بتائی ہی نہیں کہ تم نے اس کے ساتھ کتنی

کتنی کی تھی؟

شکیل:- (انکساری سے) تم خواہ مخواہ میری کہانیوں کی تعریف کر رہی ہو۔ یہ مجموعہ (قدوائی صاحب کو پسند ہی نہیں تھا اور وہ کوڑیوں کے دام بھی لینے پر رضامند نہیں ہو رہے تھے ــــ مگر مجھے.....!"

(فلش بیک شروع)

بلیک رنڈ وہائٹ پبلشنگ ہاؤس ــــ آفس کا خوبصورت، سلیقے سے آراستہ کمرہ۔ مشرقی دیوار پر گاندھی جی کی ایک قدآور تصویر اور اس کے اوپر ایک پژمردہ پھولوں کا ہار۔ ایک خوبصورت میز۔ اس کے پیچھے ایک ایگزیکٹو کرسی۔ سامنے چند اور کرسیاں۔ ایگزیکٹو والی کرسی پر بیٹھے قدوائی صاحب۔ (شکیل آفس میں داخل ہوتا ہے)

شکیل:- (دروازہ داخل ہو کر) آداب عرض قدوائی صاحب!

قدوائی:- (شکیل صاحب آپ، آیئے آیئے تشریف رکھئے، کہئے کیسے تکلیف کی (کھنچی جاتے ہوئے چہرا سکیڑ جانے کے لہجے میں) ہاں! کہئے آج کل کیا مشغلہ ہے؟ بہت دنوں سے نظر نہیں آئے!

شکیل:- (جھجکتے ہوئے) "آپ نے میرا مسودہ ملاحظہ سر حاضر ہے (ایک پلندہ بڑھاتے ہوئے) اس کتابچہ کے سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ میں نے اپنے کا فلسفہ اور گہرے مطالعے کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اگر آپ کے مشورے سے

بہت (کھانسی) ہے۔

قدوائی:- (مسودہ لے کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے، چشمہ کے شیشوں والی عینک سے دو چار صفحے پڑھتے ہوئے) (خاموشی)۔ کچھ دیر بعد میز پر مسودہ رکھ کے ناک پونچھتے ہوئے) یعنی کتاب تو بہت ہی خشک ہے۔ زبان بھی کھردری ہے کتاب چلنا تو ذرا مشکل ہے۔ آپ کوئی چٹپٹی سی کتاب کیوں نہیں لکھتے ــــ؟

شکیل:- (ذرا جھجکتے ہوئے) "قدوائی صاحب! پہلے آپ اسے ختم کر لیں، پھر اپنی رائے دیجئے گا! میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کتاب ویسی ہرگز نہیں ہے جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ رہا سوال زبان اور چٹخارے کا، تو آپ اسے ختم کر کے مجھے رائے دیں..... مگر..... وقفہ.....!

قدوائی:- (دیکھتے) شکیل صاحب! میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ کتاب کیسی ہے۔ آپ میرے دوست ہیں اس لئے اچھا چاپ تو دوں گا۔ مگر چھپنے زیادہ نہیں دے سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ زیادہ "سیل" نہیں ہو سکتی"

شکیل:- (ڈرا سہمے لہجے میں) "شکریہ قدوائی صاحب! آپ چاہیں گے جتنے سے خوشی قبول کر لوں گا (ذرا ٹھہر کر) میری بہن بیمار ہے، کئی دنوں سے چارپائی پر پڑی ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے سنگاپور لے جانا ہوگا۔ میں نے اپنی کوئی چیز بیچنا نہیں چاہی۔ مجھے یہ بھی نہیں پڑتا۔ میں اپنے فن کو سینے سے چمٹائے رکھوں اور میری بہن بلک بلک کر گھٹ گھٹ کر دم توڑ دے۔ (ذرا رکتے ہوئے) ہیں..... میں سوچتا ہوں کہ

روپے کی بھی نہ بچا سکے ؟ آپ کی قیمت دیں گے ہیں لاکھوں گا ۔۔۔!! "

درانی :۔ (لہجے کو نرم کر کے) " مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے ۔۔ آپ ۔۔۔۔ آپ کو کوئی چھپتی ہوئی کتاب کبھی نہیں لکھنے ۔۔ اس میں جیسے بھی زیادہ سے گلاد شہرت بھی ۔"

شکیل :۔ (حیرت سے) " چھپی کتاب کیا درانی صاحب ! میں نے کوئی بھی کتاب نہیں لکھی ۔ یہ کتاب ہمارے ملک کی پسماندگی کرتی ہے "

درانی :۔ (لہجے کو اور نرم کر کے) " وہ کتابیں جسے لوگ چند کرتے ہیں ۔ آپ کی کتاب تو معدودے چند ہی لوگ خریدتے ہیں ۔ اور جب عوامی ہوگا ۔ زبان جتنی جنت سے قریب ہوگی اتنی ہی ترقی کرے گی ۔ اپنی زبان میں ناول لکھ پیدا کیجئے ۔ دراصل زبان میں پھولوں کی شگفتگی ۔ کلیوں کا حسن ۔ کنول کی گداز نیت ۔ شفق کی سی رنگینی اور ریشم کی سی ملائیت ہونی چاہئے ۔ "

شکیل :۔ معاف کیجئے گا درانی صاحب میں پھر کہوں گا کہ آپ پوری کتاب پڑھ لیجئے ۔ پھر مجھے رائے دیجئے گا ۔ میں نے اس کتاب میں جنت کے دکھ ۔ درد اور غم کو سمویا ہے عوام کے ناز کی اور پیچیدہ مسائل کے حل تلاش کئے ہیں ۔ متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے ! "

درانی :۔ " ہیں ہیں آپ تو چوک گئے ۔ ناراض ہو گئے ۔ (مسکراتے ہوئے) دیکھئے میں ایک پلاٹ بتاتا ہوں ۔ آپ اسی پر ایک ناول لکھیں ۔ سچ کہتا ہوں اگر آپ نے ویسا ہی لکھا تو میں ایک ہزار روپیہ تک دے سکتا ہوں ۔۔! "

شکیل :۔ (رک رک کر) وہ ۔۔۔۔ پ ۔۔۔ پلاٹ کیا ہے درانی صاحب !

درانی :۔ (خوش ہو کر) " پلاٹ کیا ہے کچھ بھی نہیں بس ایک حسین لڑکی کو لیجئے ۔ جس کی آنکھیں سرمگیں ہوں ۔ اور اس کا چہرہ ساون بھیگی میں پڑا ہوا ایک شاداب کنول کا پھول سا دکھائی دیتا ہو ۔ اور سینہ کا ابھار کچھ اس طرح ہو جس کے لمس سے انسان بے خود ہو جاتا ہے اور اس کے سینے کے اندر ایک تلاطم لہریں مار رہا ہو جو کسی اجنبی کو ہم آغوش کرنے کے لئے بے چین اور بے تاب نظر آ رہا ہو ۔ اس کا کمر نازک اور پتلی ہو ۔ جس پر ہاتھ ڈالتے ہی تو تو بل پڑ جائیں (ذرا رک کر) ریشم میں لپٹی ہوئی گداز ۔ لمبی اور حسین رانیں ہوں ۔ جس کے سامنے ویرتا بھی اپنا سر عقیدت سے جھکا دے ۔ پھر ایسے کسی ایسے مرد سے ملایئے جو کالج میں پڑھتا ہو ۔ ہیرو ۔ ہیروئن کو بھی کالج کی تعلیم دلایئے ۔ پھر محبت کی پینگیں آہستہ آہستہ یوں بڑھایئے کہ دونوں کی آتما ایک ہو جائے ۔ کسی روز اسے سیر کے بہانے سنسان پارک یا دریا کی سیر کرایئے ۔ ہیرو اور ہیروئن ذرا ماڈرن قسم کے ہونے چاہئیں ۔ ہیرو اس کی نازک کمر کے گرد بازو حمائل کر کے آگے بڑھتا ہے اور پھر وہ ہیروئن کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے ۔ پھر اس کا ہاتھ ہیروئن کی پسلی سے ٹکراتا ہوا اس کے گداز آتشیں سینے سے مس کرتا ہے ۔ وہ اسے اور قریب لا کر اس کے رخسار لبوں پر ایک طویل بوسہ ثبت کر دیتا ہے ۔ دراصل یہیں پر ناول اپنے پورے عروج پر آتا ہے ۔ پھر ۔۔۔۔

شکیل :۔ (جھلا کر) بس ہو چکی نا بکواس یا اور بھی کچھ کہنا باقی ہے ۔ یہ آپ کا پلاٹ تھا (طنزیہ لہجے میں) خوب ۔۔۔ بہت خوب ہے آپ کا پلاٹ !

درانی :۔ (طنز کو نہیں سمجھتے ہوئے خوش ہو کر) " ہے نا بالکل انوکھا اور اچھوتا پلاٹ ۔ سچ کہتا ہوں یہی اگر آپ یہ ناول لکھ لیں تو ہزاروں میں کھیلیں گے ۔!

شکیل :۔ (اور بھی جھلا کر) " بس اب بند کیجئے ۔ بہت ہو چکی ۔ ایسی کہانی تو مجھ سے بہتر آپ خود ہی لکھ سکتے ہیں ۔ آپ تو اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کم از کم میں ایسی واہیات کتابیں نہیں لکھتا ۔۔! "

درانی :۔ " ناراض کیوں ہوتے ہیں بھائی میں تو تمہارے ہی فائدے کی کہتا ہوں ۔ نہ کچھ نقصان تمہارا ہی ہے (دراز سے چیک بک نکال کے اور اس پر کچھ لکھ کر آگے بڑھا دیتا ہے)

شکیل :۔ (کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چیک لے کر) " صرف پانچ سو روپے ! نہیں نہیں یہ تو زیادتی ہے ظلم ہے ۔ کم از کم میری بیچاری بیوی کا کچھ تو خیال کیجئے (گڑگڑا کر) میری بیوی مر جائے گی درانی صاحب ۔۔۔!

درانی :۔ (روٹھتے ہوئے) اگر منظور ہو تو اسے قبول کیجئے ۔ نہیں تو (مسودہ اٹھا کر) لے جایئے ۔!"

(چپراسی چائے رکھ کر چلا جاتا ہے)

شکیل :۔ (چائے پیتے ہوئے افسردہ) تو بہت ہی کم ہے ۔!"

درانی :۔ " تو پھر میں نے جیسا پلاٹ ویسی کتاب کہہ کر لیجئے ۔ میں ایک ہزار روپیہ کی ضرورت ہے تو ویسی ہی کتاب لکھئے ۔ نہیں تو ۔۔۔۔۔ وقفہ ۔۔۔ خاموشی ۔ ایک

فلش بیک ختم

فرزی :۔ (اداس لہجے میں) اور پھر تم نے کیا کہانی لکھ رہے ہو ! "

شکیل :۔ (افسردہ لہجے میں رک رک کر) ۔۔۔۔ اب ۔۔۔۔ م ۔۔۔۔ میں ویسی ہی کہانی لکھ رہا ہوں گا جیسی عوام چاہتے ہیں ۔ جیسی درانی صاحب چاہتے ہیں (کاغذوں کے چند قطرے چھوٹی چھوٹی لگتے ہیں)

فرزی :۔ (گھبرا کر) " یہ کیا ؟ تمہارا آنسو ۔ تمہاری سانس اکھڑی ہوئی کیوں ہے تم ۔" (ایک گہرا سکوت)

شکیل :۔ میں آج اپنے فن کو رسوا کر عورت کی رعنائیوں کا گلا گھونٹ دوں گا ۔ اور پیار کو کھنکتے ہوئے چند سکوں کی آواز اس کا وقار ۔ اس کے تقدس کو غیر ضروری (جذباتی ہو کر) " یہ ۔۔۔۔ میں ہی سے سارے کیپٹلسٹ کے اسے ہاتھ ۔ اور اسے ننگی حالت میں بازار کے سامنے

بقیہ صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ

شکیل جاوید امروہوی

دل سے پوچھو!

اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے ملے جلے نقوش گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بیٹھا ہوا سگریٹ پیتے ہوئے سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں کھویا ہوا تھا۔

"زندگی خواب ہے۔" خواب میں جھوٹ کیا
اور سچا سچ ہے کیا۔!
زندگی خواب ہے۔!

اس کے دماغ کی گہرائیوں میں تناؤ پیدا ہو گیا جیسے وہ کسی بات کے سمجھنے کی سعی کر رہا ہو۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ۔ پیشانی پر بکھرے ہوئے بال۔ چہرے پر فکر اور ذہن کی گہرائیوں میں گم۔ جس کی پریشانی کی قدر بیگانگت اس کو ماضی کی ان سرسبز و شاداب شاہراہوں پر لے جا رہا تھا جہاں اب صرف یادوں کے نقوش اور نقوش باقی رہ گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد کرے۔ لیکن یادوں پر کس کا بس ہے۔ ماضی کسی زخمی پرندے کی طرح تھا جسے قید کر دیا ہو۔ وہ غم و مصیبتوں کو اپنے ماضی کے بیکراں سمندر میں ڈبو دینا چاہتا تھا جس سے اسے اب تک تلخیاں ہی ملی تھیں۔ یادوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے وہ کبھی کبھی اٹھتا اور اسے گلاس میں انڈیل کر ایک ہی سانس سے نیچے اتار گیا اور پھر اسے اپنے گلے میں جلن سی محسوس ہوئی۔ اس کا خیال تھا شاید اسے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا وہم تھا۔ اور پھر اس نے ایک پیگ اور بنا لیا۔ اسے دوبارہ اپنے سینے پر جلن کا احساس ہوا۔ یہ خلش اس کے اپنے ماضی سے زیادہ نہیں تھی۔ اب میڈیو بند ہو چکا تھا لیکن اس کے بدن پر گلنے کے نقوش کچھ اس طرح چپک گئے تھے کہ وہ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔ زندگی ایک خواب کا قصہ ہے۔"

اس کی اپنی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کے ذہن کے خواب کی طرح ہی تھے، جس کی تعبیر بھی تلخ ہے اور وہ اپنی اس نامکمل زندگی کا اس شعر سے تجزیہ کرنے لگا۔

شاعر جیسے اس کی زندگی سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔ یہ شعر اسے اپنی زندگی کے لئے وقت معلوم ہونے لگا پھر اس کی سطح خیال پر اس کی محبوبہ رجنی نے اپنی یادوں کے پنکھ پھیلا دیئے ——

رجنی! تم چلی گئی ہو۔ یہ سب دنیا والے کہتے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ تم چلی گئی ہو۔ میں کیسے اور کس طرح یقین کر لوں جب کہ تمہارے میرے دل کی گہرائیوں میں میرنگ دیپ میں سمائی ہوئی ہو اور جب میں تمہیں پکارتا ہوں اپنے دل اور احساسات کے قریب پاتا ہوں، تو پھر میں کیوں کر دنیا والوں کی باتوں کو باور کر لوں؟ اور اس نے ایک بار پھر وقت کو گلاس سے ہم کنار کیا۔ جیسے اسے اس کے دل و دماغ کو اس کے اس عمل سے تقویت مل رہی ہو۔ اور اسے تمام کمرہ رقص کرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پسینے سے اس کا چہرہ شرابور تھا جیسے وہ ابھی غسل کر کے باتھ روم سے نکلا ہو۔ اس نے آئینہ کی شفاف سطح پر اپنا عکس ٹٹولا جو بتدریج دھندلا ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر —— اچانک ہی کمرے کی لائٹ آف ہو گئی اور تمام کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اور اس نے گھبراہٹ میں آواز دی۔

"رجنی! —— رجنی —— تم کہاں ہو ——؟"

اسے آئینہ کی سطح پر یادوں کی اسکرین سے پرچھائیاں دکھائی دیا۔ اس نے گھبرائے لہجہ میں کہا۔

"تم کون ہو ——"

"پہچانو تو جانیں ——!" فضا میں جواب ملا

اس نے اپنے ذہن کے گوشے گوشے کو تلاش کیا۔ لیکن وہاں عمیق اندھیرا تھا، پھر اس نے پہچانتے ہوئے کہا ——" رجنی! "

"بہت دیر میں پہچانا ——!"

مگر وہ سوال اس کے سطح خیال پر ابھرا

"رجنی! تم یہاں کب اور کس طرح آئیں ——؟"

جواب میں گہری خموشی تھی۔

پھر وہ سوچتے ہوئے خود ہی بڑبڑایا:۔

یہ کھڑکی تو میں نے پہلے ہی بند کر دی تھی، اور دروازہ؟ وہ تو پہلے سے ہی بولٹ تھا۔" اور اس کا ذہن گھوم گیا اور اس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"رجنی! تم اتنے دن کہاں رہیں ——؟" میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا، لیکن تم نہ ملیں —— رجنی! یہ سب دنیا والے کہتے ہیں کہ تم مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ میرا دل تو نہیں مانتا۔ آخر تم ہی بتاؤ رجنی! کہ اتنے دن تم کہاں رہیں ——؟"

"اپنے دل سے پوچھو ——!"

اور اب یہ ایک دوسری آواز تھی جو اس کے ذہن کے تاریک گوشوں میں دوسرے سوالوں کی طرح چھپ کر رہ گئی۔

میرے رجنی! وہ بولا تھا سچ ——

"بجتے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں ۔۔۔ ؟"

اور وہ سوچوں میں ڈوب گیا ۔ ماضی کے بیکراں سمندر میں پھنس گیا جہاں سے رہائی مشکل تھی ۔

"آؤ دیپ میں تمہیں اپنے ساتھ لینے آئی ہوں ۔ بابو جی کا ٹرانسفر ہو گیا ہے ۔ تم میرے ساتھ چلو میں نے بابو جی سے سب کچھ کہہ دیا ہے اپنے بارے میں ، تمہارے بارے میں ۔ میں تمہیں غم ، درد اور آنسوؤں کی دنیا سے دور لے جاؤں گی ۔ جہاں چاروں طرف بہاروں کا راج ہو ۔ پیار ہو ، خلوص ہو ۔ تم اور میں اس پیار بھری دنیا کو سجائیں ۔ اور سپنوں کی سندر وادیوں میں گم ہو جائیں ۔ میں تمہیں اس حسین دنیا میں لے جانا چاہتی ہوں جہاں تمہاری قسمت کی رنگینیاں ہماری منتظر ہیں ۔ جہاں کامیابی ہماری راہ میں سر جھکا رہی ہے ۔ میں تمہیں اس قید و بند سے رہائی دلانے آئی ہوں ۔ جہاں تمہارا ذہن پریشان ہے ۔ تم پریشان ہو ۔ اچھے دیپ مان جاؤ ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر ان حسین وادیوں میں گم ہو جاؤں گی جہاں ایک سنہرا اور شاندار مستقبل ہماری راہ دیکھ رہا ہے ۔ چلو دیپ ، میرے ساتھ چلو ، ضد نہ کرو ۔ تمہاری یہ ضد اچھی نہیں ۔ تم ضدی ہو یہ میں جانتی ہوں ۔ لیکن تم میری درخواست کو نہیں ٹھکراؤ گے ۔ میرے دل کو نہ توڑو گے ۔ میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ ضرور چلو گے ۔۔۔ !"

اور رجنی اس کو اپنی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی اور دیپ کا چہرہ سوچوں اور فکروں کا آماجگاہ بن گیا

"چلو دیپ ! اچھے دیپ چلو ۔۔۔ !"

وہ اصرار کرتی رہی ۔ اور وہ سوچتا رہا ۔ اور پھر وہ جیسے یکلخت خواب سے بیدار ہو گیا ہو ۔ !

"نہیں ، نہیں ، تم رجنی نہیں ہو ، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا ۔ میری زندگی کسی اور کی امانت ہے ۔۔۔ !"

"دیپ ! کیوں بہک رہے ہو ۔۔۔ زندگی سسک کر تمہیں پیغام محبت سنانے کے لئے بے قرار ہے ، میری باہیں تمہاری زیست کی اس گرتی ہوئی شکست دیوار کو سہارا دینے کے لئے بے چین ہیں ، مضطرب ہیں ۔ چلو دیپ چلو ۔۔۔ !"

"نہیں ۔ نہیں ، تم رجنی نہیں ہو" اور یکلخت وہ پیچھے ہٹ گیا ، لیکن کب تک ؟ رجنی اس کے قریب آتی جا رہی تھی ۔

اس نے میز سے بوتل اٹھائی اور اپنی پوری قوت سے رجنی پر دے ماری

کمرے میں زوردار چھناکا ہوا ۔۔۔ !

اب وہ تنہا واپس آ چکا تھا ، اور آئینہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا ۔ آئینہ کے ٹوٹے ہوئے بے شمار ٹکڑوں میں ہزاروں کٹے پھٹے دیپ اس کا منہ چڑھا رہے تھے ۔ کمرہ بے پناہ روشنی کے سیلاب سے غسل کر رہا تھا ۔۔۔ !

بقیہ ضمیر کی آواز (صفحہ ۳۰ سے آگے)

چیخ چیخ کر کہو گی کہ تو اس سے اپنی ہوس کی آگ سرد کر لو ! مجھے اب آرٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے ، پیسہ کی اور ظالم سکوں کی ۔۔۔ !"

(دوسرے کمرے سے کرنے کی غیظ آلود آواز ابھرتی ہے)

فزی :۔ (چونک کر) "یہ کیا ؟؟"

شکیل :۔ "گھبراؤ نہیں ، اب یہ نہیں مرے گی ، چونکہ میں نے ورمانی صاحب کے پلاٹ پر ایک کتاب لکھ لی ہے ۔۔۔ اور اب ایک ہزار روپیہ ملنے کی امید ہے ۔ اس کا نام سنو گے ، اس کا نام ہے "آنکھ کا نشہ" کیوں پسند ہے نا عنوان ! "

فزی :۔ (چیخ کر) "یہ کیا کر رہے ہو تم شکیل ! کیا تمہارا ضمیر بالکل مر گیا ہے ؟ کیا تمہارے احساسات بالکل سو چکے ہیں ؟ "

شکیل :۔ "چیخئے کیوں رہی ہو ؟ یہ تو کچھ کر رہا ہے ۔۔۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں ، اس میں بہت کچھ مرچکا ہے ۔ میں نے اسے قتل کر دیا ہے ۔ جانتے ہو آج دونوں سے میری انتظار میں بیٹھا ہوں ۔۔۔ مگر اب ۔۔۔۔۔۔ اب ! "

زور دھماکے کی آواز سے دونوں چونک پڑتے ہیں ۔ شکیل آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے ۔ شاہدی اندر داخل ہوتا ہے ۔

شاہدی :۔ "آداب عرض ! "

شکیل :۔ (دھیرے سے) تسلیم ! "

شاہدی :۔ "آپ کی کتاب "سنگ دیپ" پڑھ بہت لطف آیا ۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مارکیٹ اچھا رہے گا ۔ بھئی میں خود ایک مرتبہ پبلشر ہوں (شیروانی کی جیب سے ایک پرزہ نکال کر) مجھ سے بھی ہو سکتا ! "

شکیل :۔ (لرزتے ہاتھوں سے پرزہ تھام کے) "یہ کیا ؟ پانچ سو روپیہ (حیرت سے) پانچ سو روپیہ کا چیک ! "

شاہدی :۔ "دراصل یہ اس کی قیمت تو نہیں مگر قبول فرمائیے "

(وہ دروازے سے واپس چلا جاتا ہے)

فزی :۔ (مسکراتے ہوئے) اب کیا کہو گے خیال ۔

شکیل :۔ (زور سے جوش میں آکر) "میں ۔۔۔ میں اپنے فن کو رسوا نہیں کروں گا ۔۔۔۔ میں اپنے کی آواز کو کچل نہیں سکتا ۔۔۔ ! "

(پردہ)

لوکن شعلہ و شبنم انعامی مشاعرہ غیر
قبول موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ مئی
مصرع طرح ، جانے کب تک ہمیں یہ ہوش
ہوش ، ہوش کا نشانی ۔ پتا
نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
پورا پتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تارِ عنکبوت

پہلا باب

مظفر حنفی ہوشنگ۔ بی۔ اے

زبدان میں اس کمپنی کا نام نظروں سے گزرا تھا شاید
سلیم ..... " وہ سلیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا
ہاں سلیم ! تم کو اس کمپنی کے بارے میں کچھ علم ہے ؟"
" میں نے ان سائیکلوں کو دیکھا ہے ، البتہ
استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ " سلیم نے جواب دیا
" خیر ۔ " ہاشمی نے کہا ۔ " اس بات کو میں
تسلیم کرتا ہوں کہ ان سائیکلوں میں کوئی خامی
نہیں ہے "
" تو پھر ۔ میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا ۔"
سلیم اختر نے استفسار کیا ۔
" سنئے تو ! " ہاشمی نے جواب دیا ۔ " اس نئی
کمپنی کا منتظم ایک تجربہ کار شخص ہے ۔ اس نے بہت
قلیل عرصہ میں پچاس ہزار سائیکلیں تیار کر کے مارکیٹ
میں اتار دی ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی بڑی فرم جو مکمل
طور پر اس قسم کی تیاری کے لیے معلوم ہوتا ہے صرف ایک
سال کے عرصے میں وجود میں آ گئی ہے "
" ہاں اس کی تو مجھے بھی حیرت ہے ۔ "
سلیم اختر نے ۔
" میں نے اس کمپنی کا اشتہار دیکھتے ہی اس کے
سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا ۔ "
ہاشمی نے سگار کا طویل کش لے کر کہا ۔ " کیوں کہ اس کے
وجود میں آنے سے ہماری تجارت کی ساکھ کو کافی دھکا
پہنچا ہے ۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ کمپنی ہماری
سائیکلوں سے زیادہ پائیدار اور بہتر مشین نسبتاً کم
قیمت پر فروخت کر رہی ہے ۔ مردانہ سائیکلوں کے لئے
اسی روپے اور زنانہ مشین کے لئے پچاسی ! ہماری
کمپنی کا نرخ مردانہ اور زنانہ سائیکلوں کے لئے بالترتیب
پچانوے روپے اور ایک سو پانچ روپیہ ہے ۔ طرہ دیکھئے
کہ شوبھا کمپنی کی جانب سے عام اعلان ہے کہ سائیکلوں
میں کوئی خامی ثابت کرنے والے کو پانچ ہزار روپیہ
انعام دیا جائے گا ۔ "

" جی ہاں ! مجھے یاد ہے ۔ " شمیم اختر
نے تائید کی
" میں نے پیشہ طبہ پر شوبھا کمپنی کی ایک درجن
سائیکلیں خریدیں ۔ " ہاشمی نے تقریر جاری رکھتے ہوئے
کہا ۔ " اپنی کمپنی کے ماہر انجینیروں سے میں نے ان کے ہر
حصے کی جانچ کروائی ۔ معلوم ہوا کہ ان میں کسی قسم کی
خامی نہیں ہے "
" کیا یہ ممکن نہیں ۔ " شمیم اختر نے پوچھا " کہ یہ لوگ
پہلے نقصان اٹھا کر اپنے مارکیٹ ہموار کرنا چاہتے ہوں "
" پہلے میں نے بھی یہی خیال کیا تھا ۔ " سعید
ہاشمی نے جواب دیا ۔ " اسی لئے میں اب تک انتظار کرتا رہا
کہ ایک نہ ایک دن ان لوگوں کو قیمت بڑھانی ہوگی ۔ لیکن
یہ میرا خیال خام تھا ۔ اب تک شوبھا کمپنی کا مال دھڑا دھڑ
کے ساتھ سابقہ قیمت پر فروخت ہو رہا ہے ۔ میں نے دوسرے
ممالک کو سپلائی ہونے والی سائیکلوں میں سے چند منگوا کر
ان کی بھی جانچ کروائی تھی ۔ لیکن ان میں بھی کوئی خامی نہ تھی
تخمینہ لگا کر میں نے دیکھا ہے کہ شوبھا کمپنی کو ہر سائیکل
پر کم از کم پانچ روپیہ نقصان ہوتا ہے ۔ علاوہ ازیں اس
کمپنی کے کارکنوں کی تنخواہیں بھی ہمارے کارکنوں سے
زیادہ ہیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ممکن ہے ؟
یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی راز ہے ۔ یہی حال مارکیٹ کا رہا تو
وہ دن جلد آنے والا ہے جب ہمارا دیوالہ نکل جائے گا "
" آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں ۔ ؟ " شمیم اختر نے
دریافت کیا ۔
" یہی میں آپ سے کہنے جا رہا تھا ۔ " سائیکل کے
تاجر نے کہا ۔ " میں نے اپنے طور پر تین معتمد آدمیوں کو خفیہ
طور پر شوبھا کمپنی کے سلسلے میں تفتیش کرنے کے لئے بھیجا تھا
لیکن وہ لوگ کوئی کارآمد بات نہیں معلوم کر سکے ۔ میں قبل
ازیں آپ کو بتلا چکا ہوں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان
دنوں ہر ایسی سائیکل کسی حالت میں تیار نہیں کی جا سکتی ،
اس کی پشت پر ضرور کوئی فریب ہے ۔ ۔ ۔ میں آپ سے التجا
کرتا ہوں کہ آپ اس معاملہ کی تحقیقات کریں ، میں منہ مانگی
اجرت ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوں "
شمیم اختر کچھ دیر سوچتا رہا ۔ سعید ہاشمی سے چھپانے کی کوئی
بات اس سے چھپائی نہیں تھی ۔ واقعی یہ بات بہت عجیب تھی
کہ شوبھا سائیکل کمپنی اتنے عظیم نقصان کے باوجود اب تک
مارکیٹ پر چھائی ہوئی تھی ۔ یہ کیس اس کے دائرہ عمل میں
نہیں آتا تھا ۔ قبل ازیں وہ تاجروں کی امداد کئی بار کر چکا
تھا ۔ لیکن وہ معاملات کچھ دوسرے قسم کے تھے ۔ لیکن
اس کیس کی نوعیت ہی عجیب تھی ۔ اس نے ایک بار پھر غور
سے سعید ہاشمی کی جانب دیکھا اور دریافت کیا
" آپ کہتے تھے کہ تین آدمیوں کو خفیہ طور پر آپ نے
کمپنی کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ
کیا تھا ۔ ؟ "
" جی ہاں ۔ " ہاشمی بولا ۔ " لیکن وہ لوگ تجربہ کار
سراغرساں نہیں تھے ، ہماری فرم کے کارکن تھے "
" آپ اس تجارت کے سلسلے میں کچھ اور روشنی
ڈالیں گے ؟ " شمیم اختر نے کہا ۔ " کیا آپ کے یہاں
سائیکلوں کے تمام حصے بنتے ہیں ۔ ؟ "
" ہماری فرم اپنے یہاں بہترین فولاد کے فریم ،
سپنڈل اور دوسرے خاص حصے تیار کرتی ہے باقی
حصے دوسرے تاجروں سے ٹھیکے پر خریدے جاتے ہیں "
" کیا وہ تمام حصے جو آپ دوسروں سے خریدتے ہیں
ہندوستان ہی میں تیار ہوتے ہیں ؟ "
" جی نہیں ! " ہاشمی بولا ۔ " کچھ حصے باکسن
اور لکا سے آتے ہیں ۔ کچھ انگلینڈ سے ! "
" اور شوبھا کمپنی والے ۔ ؟ " شمیم اختر نے
دریافت کیا ۔
" صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن خیال ہے
کہ وہ لوگ تقریباً تمام حصے باہر سے منگواتے ہیں ۔ بنگلور
میں یہ تمام پارٹس محض جوڑے جاتے ہیں ۔ "
" کیا وہ لوگ اپنے کارخانے کے لئے سائیکل کے تمام

ہندوستانی ٹیکنیشن سے حاصل کرتے ہیں۔"

"جی نہیں۔" ہاشمی نے سگار سے راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ ایک آدمی نے بتایا تھا کہ یہ لوگ فریم پاکستان سے منگواتے ہیں، دوسرا کہہ رہا تھا کہ نہیں سے۔ بہر طور طے شدہ بات ہے کہ فریم باہر ہی سے آتے ہیں۔"

شمیم اختر نے سگریٹ سلگایا اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگا۔ یکایک ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں جگمگا گیا۔ لیکن وہ موجودہ کیس سے اتنا غیر متعلق تھا کہ شمیم اختر نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ آخر کار اس نے کہا:۔

"اچھا بات ہے مسٹر سعید! میں اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ اس سلسلے میں میرے کچھ اور سوالات کا جواب دیجئے۔ سلیم! تم ان جوابات کو نوٹ کرتے جاؤ۔"

تینوں آدمی کام میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت کسی کو گمان تک نہ تھا کہ اتنی معمولی بات کا تعلق ہندوستان میں گزشتہ چند سالوں میں ہونے والی ایک عظیم ترین سازش سے ہوگا ——!

بین الاقوامی لٹیرے

خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ سعید ہاشمی کا یہ شک کہ منصوبہ ساز کمپنی کی پشت پر ضرور کوئی غریب ہے، صحیح تھا، یا غلط لیکن یہ کہا جا سکتا تھا کہ بنا ہر تو وہ ایک اتفاقیہ قسم کی فیکٹری تھی۔ قصبہ بیگم پور میں ایسٹرن ریوے لائن کے نزدیک ہی بڑی بڑی عظیم الدوش عمارتوں میں وہ کارخانہ واقع تھا۔ ایک بڑے سے مضبوط پھاٹک پر شوبھا سائیکل کمپنی کا بہت بڑا سائن بورڈ لٹک رہا تھا۔

کارخانے کے قریب ہی مزدوروں کے لئے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ مگر بہت سے مزدور شہر سے آکر یہاں کام کرتے تھے کیونکہ ابھی تمام مزدوروں کے لئے کوارٹر نہیں تیار ہو چکے تھے۔ مزدوروں کی حالت بھی خراب نہ تھی دوسرے کارخانوں کے مزدوروں کی بہ نسبت ان لوگوں کو یہاں دو روپیہ فی ہفتہ زائد آمدنی ہوتی تھی۔ ان کے کارڈوں کے ساتھ پارک ریفریجریٹر بھی جانے لگے تھے۔ قریب پورے اسٹیشن کمپنی کی بجی ریوے لائن بچھ گئی تھی۔ جس کے کارڈ گاڑیاں بڑے بڑے گودام بنے ہوئے تھے۔ جن میں سائیکلوں کے فریم وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ فیکٹری کے دوسری جانب دفاتر تھے اور وہیں کمپنی کے صدر دفاتر جنرل منیجر شری بھاما مائنڈن کا آفس بھی تھا۔

شوبھا سائیکل کمپنی نے ثابت کر دکھایا تھا کہ واقعی اشاعت ہی تجارت کی کامیابی کی کلید ہے۔ کمپنی کے منصوبہ اشاعت کا منیجر ایک نوجوان تھا جس نے پبلسٹی کی ایک خاص تعلیم حاصل کی تھی اور اسے اپنے کام میں کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی یہ بات کمپنی کے رجسٹری بتلا سکتے تھے اور ثبوت کے طور پر ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کی فرموں کے آرڈر بھی دفتر میں موجود تھے۔

مختلف حصے باہر سے منگوائے جاتے تھے اور اس فیکٹری میں انھیں فٹ کر کے سائیکلیں تیار کی جاتی تھیں۔ اس لئے اس فیکٹری میں زیادہ تر ریپیئر فٹر ملازم تھے جو پرزے جوڑنے میں ماہر تھے۔ دوسرے کارخانوں کے مزدور بھی اس فیکٹری کی سہولتوں اور زیادہ تنخواہ کے لالچ میں یہاں آنا چاہتے تھے اور دفتر میں ملازمت کی درخواستوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ملازموں کی بھرتی بھی کافی کی جا رہی تھی کیونکہ کمپنی کا کاروبار چمک گیا تھا اور کافی مال بکتا تھا ایک دن ایک نوجوان ملازمت کی درخواست لے کر آیا۔ ڈائرکٹر نے غور سے اسے دیکھا۔

"کیا تم فٹنگ کا تجربہ رکھتے ہو——؟"

"ہاں صاحب میں پہلے بھی ایک کارخانہ میں فٹر رہ چکا ہوں۔"

"پہلے کہاں نوکر تھے——؟"

"ایک پارچیٹ کارخانہ میں——"

"کہاں——؟"

"جمنا روڈ کے قریب ہی ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی سفارشی خط ہے——؟"

"جی ہاں —— یہ دیکھئے ——" اس نے جیب سے ایک شکستہ لفافہ نکال کر آگے بڑھا دیا۔ ڈائرکٹر نے اس میں سے رقعہ نکال کر پڑھا۔

"تصدیق کی جاتی ہے کہ اندر جیت سائیکل ورکس اور سائیکلوں اور سائیکلوں کے بارے میں مہارت حاصل کر چکا ہے۔"

یہ رقعہ نیشنل گیریج، جمنا روڈ کے منیجر کا تھا۔ تصدیق واپس دیتے ہوئے ڈائرکٹر نے نوجوان کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور پھر فون سے نیشنل گیریج کے منیجر سے گفتگو کرنے لگا۔ اور پھر تمام گفتگو سنتا رہا۔ وہ رقعہ جعلی نہ تھا۔ واقعہ اس کا نام ضرور جعلی تھا۔ ہندوستان اور قریب و جوار کے تمام ممالک کے فنگ سلیم کو شمیم اختر کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن ایسا قانون نہیں تھا جو کسی شخص کو کوئی فرضی نام رکھنے سے باز رکھ سکے۔

کہیں کوئی خامی نہیں تھی۔ نیشنل گیریج کے منیجر نے ڈائرکٹر کو بتایا کہ انھوں نے یہاں کام کرنے سے قبل نو لس وائیس کمپنی میں بھی کام کر چکا تھا۔ ڈائرکٹر نے رسیور سیٹ پر رکھ دیا اور نئے ملازم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں ملازم رکھا جاتا ہے۔ کب سے کام پر آ سکتے ہو؟"

"فوراً حاضر ہو سکتا ہوں صاحب۔" جواب ملا "میں ہر طرح تیار ہوں۔"

"بہتر ہے——" ڈائرکٹر صاحب نے حکم دیا "آج دوپہر سے کام پر حاضر ہو جاؤ۔ میں تمہارے کام اور برتاؤ کے کاغذات کی تکمیل کرا دوں گا اور مستقل شیڈ کے نمبر وغیرہ سے تمہارا تقرر بھی کرا دیا جائے گا۔ جاؤ۔"

سلیم نے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اسٹینو سے اپنا سامان لے لیا۔ اسے جو کرائے دیا گیا تھا صاف ستھرا تھا اور اس میں تمام ضروری چیزوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ اپنا سامان کمرے میں جما کر وہ پوسٹ آفس

کیا۔ سلیم نے فوراً کہ بندرگاہ کی نوعیت اپنے نئے پتے سے مطلع کیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر کی پرانی ڈیوٹی پر واپس جانے کی طرف توجہ دینے لگا کیونکہ ابھی کام پڑا ہوا تھا جس کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی چھوٹی چھوٹی دستیں فائلوں پر کاغذ شیں اور کاغذ کی بھاری بھاری صندوق اس سے باہر نکلے جا رہے تھے۔ فائلوں میں سائیکلوں کے پرزے تھے۔ ایک صندوق میں تقریباً چھ فریم پیک کئے جا سکتے تھے۔ کسی نے وہاں ٹھہر کر اسے منع نہیں کیا تھا جو کچھ صندوقوں کی روانگی سے سلیم نے کوام میں اسی قسم کے صندوق ایک قطار میں رکھے ہوئے دیکھے اور اس نے اندازہ لگایا کہ کمپنی کا کام دن بدن ترقی کر رہا تھا۔

وہ پیکنگ کی دوسری طرف گیا۔ وہاں تیار شدہ سائیکلیں بڑی بڑی پیٹیوں میں اوندھی کی جا رہی تھیں انہیں پیک کرنے میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ سلیم نے بغور ان کا معائنہ کیا۔ بیرونی ممالک کے بیت سے شہروں کے نام اس نے صندوقوں پر لکھے دیکھے لیکن کسی صندوق پر ہندوستان کے کسی شہر کا نام صاف نہیں تھا۔ سلیم نے سوچا شاید کچھ کا کام بیرونی ممالک کو مال برآمد کرنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

وہ ابھی سائیکلوں کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اسی دن سعید باجی کی رخصت ہونے کے بعد شمیم اختر نے ہدایت سے باجی اور شہر بھائی کمپنیز کی ایک ایک سائیکل منگوا لی تھی۔ اس نے سلیم کو ہدایت کر دی تھی کہ فیکٹری سے جانے سے قبل ان سائیکلوں کے بارے میں ہر طرح معلومات حاصل کرے اور اگر کوئی دقت ہو تو کسی ماہر کار یگر سے کام لے لے۔ اس طرح شمیم اختر نے اس راز کی عقدہ کشائی کے لئے پہلا قدم اٹھایا۔ یہ سائیکلوں کا کسی طرح سمگل کرنے کے بارے تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر بھائی کی مالی حالت بہت اچھی ہے اور وہ حال ہی میں بینکوں میں اس کا کافی روپیہ جمع ہے اور ان کی مختلف بینکوں کے کھاتوں کی فہرست بھی

ہو گئی ہے۔

شمیم اختر کو یہ شک بھی تھا کہ ممکن ہے سائیکلوں کے ذریعے شیشوں کے ٹکڑے چوری چھپے ملک سے باہر بھیجے جاتے ہوں لیکن اس کی تائید یا تردید تو مستقبل ہی کر سکتا تھا۔ بہرحال شمیم اختر نے یہی مناسب سمجھا کہ سلیم شہر بھائی کمپنی میں ملازمت کرنے کے بعد جو رپورٹ پیش کرے گا۔ اسی کے مطابق اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔ اسی زمانے میں سیکریٹریٹ سروس کے انسپکٹر دین نے اس کی توجہ کچھ بڑے بڑے ڈاکہ زنی کے واقعات کی طرف مبذول کرائی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈاکے کسی بین الاقوامی گروہ کے ذریعے عمل میں آئے ہیں۔ دین ڈاکہ زنی کے واقعات کا تعلق خاص طور پر بینکوں کے نوٹوں سے تھا۔ پاکستان، برما، انگلستان، انڈونیشیا اور ترکی جیسے بیت سے ممالک میں بینکوں پر ڈاکے ڈالے گئے تھے اور کرنسی نوٹوں کی تعداد میں لوٹ لئے گئے تھے۔ ہر ملک کی پولیس سرگرمی سے تفتیش میں مشغول تھی لیکن بنجام بیدا کرلیبہ کے سنٹرل بینک میں جو ڈکیتی ہوئی تھی۔ اس کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ بینک نے ایک مشہور تاجر کے نام ایک ڈرافٹ جاری کیا تھا۔ وہ تاجر اس وقت پاکستان کی سیاحت پر تھا اور وہ ڈرافٹ اس کے پاس موجود تھا۔ بدمعاش اس کی عدم موجودگی میں جعلی ڈرافٹ کے ذریعے سات لاکھ روپے کی رقم بینک سے نکال لے گئے۔ تاجر بہت مشہور تھا۔ اس لئے اس کی آمد و رفت کی خبریں اخبارات میں آجاتی تھیں۔ انھیں کے ذریعے اس جعل سازی کا علم ہوا تو انگلستان اور پاکستان کی پولیس کے کان کھڑے ہوئے سیکریٹریٹ سروس میں بھی اطلاع پہنچ گئی۔

اس کے بعد روپیہ بھانے پر ڈاکے پڑنے شروع ہوئے انڈونیشیا میں ایک مشہور جوہری کے ساڑھے چار لاکھ روپے لوٹ لئے گئے اور برما میں دن دہاڑے مسلح ڈاکوؤں نے بہتدل دکھا کر "مین بینک" سے گیارہ لاکھ کا پیتر لوٹ لئے

بینک کے سیف توڑنے کے لئے جدید سائنٹفک

آلات استعمال میں لائے جاتے تھے۔ بہت تھوڑے عرصے میں مختلف ممالک میں پے در پے ڈاکے پڑنے سے پولیس کے حکام باہم دوست نے اندازہ لگایا کہ سب ڈاکے ایک دوسرے سے متعلق رکھتے ہیں یعنی کسی مختلف مقامات ڈاکہ زنی کے لئے جانے والے طریقے استعمال میں لائے گئے تھے

انسپکٹر دین اکثر شمیم اختر سے دقیق معاملات پر مشورہ لیتے اور اس کے بہترین سگریٹ سے لطف اندوز ہونے کے لئے جب وہ دفتر میں اس کے ہاں آتے تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس دن وہ آئے تو دیکھ کر شمیم اختر نے سگریٹ کا ڈبہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں آجاؤ انسپکٹر! وہاں دروازے پر کیوں رک گئے؟"

انسپکٹر دین نے جھجکتے سے کمرے میں داخل ہو کر اپنی ٹانگ کیپ اتار کر ٹیبل پر پھینک دی اور جب شمیم اختر کا سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ منہ سے لگا چار پانچ اپنی جیب کے حوالے کیں اور بے پروائی سے کرسی کھینچنے لگا۔

شمیم اختر مسکراتا ہوا بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اس بار تو لمبا ہاتھ مارا ہے"

"کیا مطلب؟" شمیم اختر نے چونک کر پوچھا۔

انسپکٹر نے جیب سے اپنا منی بیگ نکالا کھولا اس میں سے تین روپے کا ایک نوٹ شمیم اختر کی طرف بڑھا دیا۔ "اسے غور سے دیکھئے!"

وہ نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے شمیم نے کہا۔ "یہ تو پرانا جانا پہچانا نوٹ ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ یہ تو بینک کا کاغذ چرایا گیا ہے۔ تحریر تک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بڑے بڑے ماہر کار بھی دھوکا کھا سکتے ہیں۔"

"اس میں کسی بات کی ہے" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"آخری حد تک (ہ) سرکاری نوٹوں کی نسبت سے کچھ فرق ہوگا اور ہونا چاہیے۔ اگر کوئی سرکاری نوٹ سامنے ہو تو فرق بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔" شمیم اختر نے جواب دیا۔ "شاید نیچے داہنی جانب گلابی رنگ میں کچھ خفیف سا فرق نکلے گا۔ لیکن اس کا پکا یقین کیسے نہیں ہے"

"معلوم نہیں آپ نے کیسے معلوم کر لیا۔" مدن موہن بچے میں بولا۔ "میں نے اصل نوٹ سے اس کا مقابلہ کیا تھا اور واقعی یہ دونوں نشان اس میں ہیں۔ یہ لیجئے اصل نوٹ اور اب موازنہ کیجئے۔"

سلیم نے سرکاری نوٹ لے کر جعلی نوٹ کے ساتھ میز پر پھیلایا اور غور سے ان دونوں کا موازنہ کیا۔ اپنے قیاس کو پکا پا کر دل ہی دل میں سکون کا احساس کیا۔ اس نے کئی سال اس کام کی واقفیت حاصل کرنے میں منائع کئے تھے۔ کاغذ کی بناوٹ، مونا نشان، رنگ جذب کرنے کی صلاحیت اور اسی قسم کی دیگر متعلقہ باتوں کی وہ اتنی ہی اچھی طرح واقفیت رکھتی تھی جتنا کوئی ماہر فن جانتا تھا۔ اور اس مضمون پر اس کی تحریر کردہ کئی کتابیں مستند مانی جاتی تھیں۔ اپنی اس بے پناہ واقفیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر اس نے جعل سازی کے لاتعداد مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔

"تمہیں یہ نوٹ کہاں ملا تھا؟" اس نے انسپکٹر مدن سے دریافت کیا۔

"بینک آف برما کے منیجر نے مجھے دیا تھا۔" انسپکٹر مدن نے جواب دیا۔ "کیشیر اب تک اس قسم کے بارہ نوٹ پکڑ چکا ہے جنہیں تیار کر کے لوگوں نے بینک میں جمع کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح بینک کو بارہ لاکھ روپیہ کا نقصان ہوا ہے۔"

"کافی بڑی رقم ہے۔" شمیم اختر نے کہا۔ "یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"[illegible]"

"[illegible]"

"جی نہیں۔" انسپکٹر مدن بولا۔ "دو آدمی نوٹوں سے بھرا بیگ لے کر آئے۔ اس کے پاس پہنچے اور کہا کہ انہیں سو سو کے نوٹوں میں تبدیل کر دو۔ کیشیر کے پاس اتنے نوٹ نہیں تھے۔ اس نے دونوں سے دو گھنٹے کے بعد آنے کو کہا۔ اور دونوں پر کیشیر کو کوئی شبہ نہیں ہوا کیونکہ ان کے پاس برما کے ایک مشہور تاجر کا تعارفی رقعہ تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ لوگ پھر آئے اور نوٹ تبدیل کرا کے بارہ لاکھ روپے لے گئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ تمام نوٹ جعلی ہیں۔ اتنی بڑی سازش گزشتہ کسی سال سے نہیں کی گئی تھی۔ البتہ کلبوں میں کچھ دنوں قبل اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ دونوں کیس ایک ہی گروہ نے کئے ہیں؟" شمیم اختر نے پوچھا

"جی ہاں خیال تو کچھ ایسا ہی ہے!" اس نے کہا

"واقعہ تو واقعی سنگین ہے۔" شمیم اختر نے کہا "کیا تم اس وقت میری رائے لینے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ میں یہ کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ بینک آف برما کا منیجر اس سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کرنے کے لئے عنقریب آنے والا ہے۔"

"اوہ۔" شمیم اختر نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تو فی الحال ایک دوسرے کیس میں....."

"میں خود بھی منیجر سے آپ کی مصروفیات بیان کر چکا ہوں۔ لیکن وہ آپ کے پاس آنے پر مصر تھا لہٰذا میں نے آپ کو قبل از وقت مطلع کر دینا ہی مناسب خیال کیا۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"بہت ممکن ہے یہ فون بینک کے منیجر ہی کی جانب سے ہو۔" مدن نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" شمیم اختر نے رسیور اٹھا کر اس کے کان سے لگایا۔ لیکن دوسری طرف سے بولنے والا شخص بینک کا منیجر نہیں تھا۔

طریق کار

دوسرے سرے پر سلیم بول رہا تھا۔ اس نے شمیم اختر کو مطلع کیا کہ وہ دوپہر سے کام پر جائے گا اور اس نے اپنا نیا پتہ بھی شمیم اختر کو بتایا۔ پیغام موصول کر کے شمیم اختر نے انسپکٹر مدن موہن سے کہا۔

یہ سلیم بول رہا تھا۔" اتنا کہہ کر اس نے گفتگو کا رُخ دوسری جانب موڑ دیا۔ بزار کوشش کے باوجود انسپکٹر اس سے یہ نہیں معلوم کر سکا کہ سلیم کہاں سے بول رہا تھا اور اس نے فون پر اس سے کیا گفتگو کی۔ شمیم اختر نے اس کی بحث سے اکتا کر انسپکٹر کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی۔

"انسپکٹر صاحب! یہ تو بتائیے اس برن گروہ والے کیس میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی؟"

"نہیں!" انسپکٹر مدن غرا کر بولا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ گزشتہ دس دنوں سے برن گروہ کے اس واقعہ کے متعلق تفتیش کر رہا تھا۔ لیکن اسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ برن گروہ نے دو ہفتہ قبل ایک سنسنی خیز ڈاکہ ڈالا تھا۔ وہاں کے فوجی کارخانے میں ایک دن دو نقاب پوش پستول لئے ہوئے داخل گھس آئے۔ ایک نے پستول سے دھمکا کر تمام کارکنوں کو اپنے مقام پر بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا اور دوسرا خزانچی کے پاس پہنچا۔ ایک ریکارڈ کیپر کیشیر کی مدد کو اٹھا۔ لیکن نقاب پوش کی گولی نے اگلے دم اس کو موت کی نیند سلا دیا۔ ڈاکوؤں نے ڈیڑھ لاکھ روپیوں کے نوٹ اکٹھے کئے اور دوسرے لمحے ان کی جیپ کارخانے کی سرحد سے باہر ہو گئی۔

اس ڈاکے کی تفتیش کا بار انسپکٹر مدن کے کاندھے پر ڈالا گیا اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہنوز وہ ناکام تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا

"اگر یہ نہیں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا تو اس کو ملازمت سے کیا خاک حاصل ہے۔ مقامی پولیس

کو چاہئے تھا کہ مجھے فوراً مطلع کرتی ۔۔۔!"

"شمیم اختر نے پوچھا: "کام بھی تو یہ معاشروں کے اس گروہ کا نہیں رہے جس کا تم ذکر کر رہے تھے۔"

"میں سوچ تو یہی رہا ہوں۔" انسپکٹر مدن بولا۔ "لیکن یہ دیکھتی بہت جھوٹی ہے۔"

"یہ گروہ اس قسم کی کئی چھوٹی موٹی وارداتیں کر چکا ہے۔" شمیم اختر نے کہا۔ "دو تین ملکوں کی پولیس کی متفقہ رائے ہے کہ یہ سب کارنامے ایک ہی گروہ کے ہیں۔ میرا تو اندازہ یہ ہے کہ یہ معاشروں کا یہ گروہ جنوبی ایشیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے اور بہت منظم پیمانے پر کام کرتا ہے۔"

انسپکٹر مدن حیرت سے شمیم اختر کا منہ تکنے لگا۔

"شاباش کے طور پر کچھ بڑی رقم کر دو۔" شمیم اختر نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ "ششہ سنگھ بہادر اس ہی کو کہتے ہو۔ یہ مشہور چیانی کہاوت ہے۔ بیٹھا رہے تو جہاز بنا سکتا ہے ہاتھ تو ہوٹ اڑا دیں گی۔ پل اور ٹرین بھی۔ غرض کہ یہ تم کو سینکڑوں قسم کے کاموں میں امداد دینے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرزے تھامے اور ڈرپر جہاز کرے گی تو جہاز سے تعلق رکھنے والا ہر کام یہ کر سکتی ہے۔ کیا تمہیں مطلب سمجھے ۔۔۔؟"

"غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کہ ڈاکوؤں کا وہ گروہ بھی ایسے ہی منظم طریقے پر اپنا کام چلاتا ہے۔"

"ہاں یہی بات میں سمجھانا چاہتا ہوں۔" شمیم اختر نے کہا۔ "وہ گروہ بھی بہت منظم ہوگا۔ اس کی شاخیں جنوب ایشیا کے بہت سے ملکوں میں ہیں۔ ہر قسم کے چھوٹے بڑے ڈاکے، جعل سازی، چوری، نقب زنی اور قتل وغیرہ کے ارتکاب کے لئے اس ادارے کے پاس ماہر فن لوگ ملازم ہوں گے۔ اگر ان کا انتظام اچھا ہے تو انھوں نے ایک مربوط رفتہ بھی رکھا ہوگا۔ تاکہ اگر کوئی مجرم گرفتار ہو جائے تو اس نقطے سے اس کے واقعیتوں کا تار و نقطہ چلتا رہے۔ مجھے اس سلسلہ میں پاکستان کی خفیہ پولیس کے بھیجے ہوئے فوجداری کرائم و فنگر پرنٹس فورس سے ایک مفصل خط ملا ہے اور اس وقت سے میں ان مجرموں کے طریقۂ کار کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے قیاس کی سچائی پر یقین ہوتا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں ایک خیال بھی میرے دماغ میں پیدا ہوا ہے جو بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا ۔۔۔؟" منہ پھیلا کر انسپکٹر مدن نے دریافت کیا۔

شمیم اختر نے میز کی دراز کھول کر ایک فل اسکیپ کاغذ نکالا۔ جس میں سلیم نے ان تمام ڈکیتی کی وارداتوں کا مفصل حال بمعہ تاریخ و طریقۂ کار درج کیا تھا جو کہ پولیس کے خیال میں ایک ہی گروہ کے ممبروں سے سرزد ہوئی تھیں۔

انسپکٹر نے اس فہرست کو سرسری نظر سے پڑھ کر پوچھا۔ "ہاں تو پھر ۔۔۔؟"

شمیم اختر نے دراز میں کاغذ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ مختصر یادداشت دیکھ لی۔ اس میں مختلف قسم کے جرائم شامل ہیں۔ جیسے چیک بکوں کی نوٹ۔ بینکوں کا مال مسروقہ، جواہرات کی چوریاں وغیرہ ۔۔۔ ہمارے یہاں کی سکیورٹیز سروس اور دیگر ممالک کی پولیس ان واقعات کی جانفشانی کے ساتھ تفتیش کر رہی ہے۔ یقیناً اس سلسلے میں مختلف ممالک کی خفیہ پولیس سے سیکرٹ سروس کی خط و کتابت ہوگی ۔۔۔؟"

"جی ہاں آپ درست کہتے ہیں۔" مدن بولا۔ "خط و کتابت جاری ہے۔"

"خوب ۔۔۔ لیکن تم بتاؤ مدن۔" شمیم اختر نے پوچھا۔ "تم لوگوں نے کبھی یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ تمام مال مسروقہ جاتا کہاں ہے۔؟"

انسپکٹر مدن نے چونک کر شمیم اختر کو دیکھا اور اپنی صفائی پیش کی۔ "جہاں تک میرا خیال ہے مال مسروقہ کا اب تک کہیں پتہ نہیں چل سکا۔ ہم سیکرٹ سروس والوں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ہندوستان جیسا تو اس گروہ کی سرگرمیاں ابھی حال ہی میں شروع ہوئی ہیں لیکن دوسرے ممالک میں جہاں یہ اچھی طرح پھیلے ہوئے ہیں پولیس کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"

"جعلی نوٹوں اور دستاویزات کو مسروقہ جانے دو۔" شمیم اختر نے کہا۔ "ہیرے جواہرات اور سونا چاندی وغیرہ کا بھی تو کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ تمہیں پتا ہے تو بتاؤ نا ۔۔۔؟"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" مدن نے الجھ کر پوچھا۔

"کہنا یہ چاہتا ہوں۔" شمیم اختر نے کہا۔ "کہ اس گروہ کا نظم و نسق بھی اتنی ہی باقاعدگی کے ساتھ ہو جتنا کسی کامیاب ترین فرم کا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نوٹ مار کا تمام مال ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا دیا جاتا ہے اور وہاں وہ مال دوسری شکل میں تبدیل کر کے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا کہیں ہندوستان کے نوٹ بھی پائے گئے ہیں ۔۔۔؟"

"ہمارے یہاں تو نہیں ۔۔۔" انسپکٹر مدن نے کہا۔ "لیکن سیلون اور انڈونیشیا کے ملکوں سے رپورٹیں آئی ہیں کہ وہاں جعلی ہندوستانی نوٹ مقامی نوٹوں سے تبدیل کئے گئے ہیں۔"

"ہوں ۔۔۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔" شمیم اختر نے کہا۔ "اندازہ کہتا ہے کہ اس گروہ میں ہر قسم کے ماہر بنانے کے لئے نوکر ہیں۔ اس کی تہہ تک پہنچنے کی محض ترکیب ہے۔ یہ معلوم کرو کہ یہ گروہ مال مسروقہ کیسے کیا کرتا ہے؟ کس ذریعے سے یہ لوگ مال مسروقہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے ہیں؟ اس گروہ کا مرکزی دفتر کہاں ہے؟ اگر اس راہ پر عمل کیا گیا تو سو فیصدی یقین ہے کہ بدمعاشوں کا یہ عظیم ترین گروہ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"تو آپ بات خود کیوں نہیں کرتے۔" انسپکٹر مدن نے کہا۔ "ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ کرائم و فنگر پرنٹس فورس کی جانب سے آپ کو ایک

باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ کیجئے

طرحی مشاعرہ نمبر ۴۹

مصرع طرح

عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

غزل کے ساتھ قرعہ انعامی مشاعرہ یا اس کے متعلق چار آنہ کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

ممبران شاعری بورڈ
حضرات
مولانا آبی حسنی گنوری
شفا گوالیاری

ے۔ ایں اقلیم اودے پوری

عشق پابندیوں سے بہت دور ہے
حسن پہ حدود رسم و دستور ہے

شکہ کی راہ جو تیر دل کا لگا
کل وہی زخم تھا آج ناسور ہے

م میں وہ مجھے دیکھتے بھی نہیں
کیا عجب محبت کا دستور ہے

بس میں آپ محبت نہ رنگ وفا
وہ خدا کی قسم آنکھ ہے نور ہے

ل وہ اچھا ہے خوشیوں بھرے راگ سے
جو ترے غم کے نغموں سے بھرپور ہے

ن کی شکوہ شکایت سے کیا فائدہ
جس کی بے وفائی تو مشہور ہے

نیت کہکشاں کا شاعر بنے
دل میں ارمان یہ کب سے مستور ہے

مرلیش چندر کامل ابروی پانیتی

ہ فسانہ زمانہ میں مشہور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

پہ پہ حقیقت نہیں منکشف
چہرۂ حسن پر عشق کا نور ہے

ہر جگہ ہیں عیاں میرے نقش قدم
دہر میرے فسانوں سے معمور ہے

م کو معلوم کیا سینۂ عشق میں
درد ساری خدائی کا مستور ہے

و محبت کرے وہ مصیبت بھرے
آہ کیا زمانے کا دستور ہے

ن سے ملنے کا امکان کوئی نہیں
کیا گلہ فطرتاً عشق مجبور ہے

اس کو تیری جفاؤں کی پروا نہیں
کامل اپنی وفاؤں پہ مغرور ہے

دد میرٹھی

جستجو کی لگن ہے تو کب دور ہے
تذہ ذرہ تجلی سے معمور ہے

دل میں رہ کر نگاہوں سے مستور ہے
کس قدر پاس ہے کس قدر دور ہے

یرے اشک رواں رکنے والے کہاں
زخم دل اب تو ایک ایک ناسور ہے

کیا وفا کا صلہ مل گیا ہے جفا
اُڑانے پہ کیا تیرا دستور ہے

اعث عیش ہے اب فریب وفا
داستاں پہ کوئی تو مقہور ہے

شکوں سے نکھر بڑھا چل ذرا
حوصلہ ہے تو منزل کہاں دور ہے

کیا مسیحا ہو کیسے مسیحا ہو تم
میرا دل میرا اب تک پہ مستور ہے

علامہ حیاک نگینوی

ساری دنیا میں یہ بات مشہور ہے
ظلم ڈھانا حسینوں کا دستور ہے

بمبئی کا محلہ جو چمبور ہے
سارے بھارت میں کہتے ہیں مشہور ہے

عشق سے روکتا ہے ہمیں کس لئے
جیکہ واعظ تو خود طالب حور ہے

رفتہ رفتہ کرتا ہوں میں خواب میں
لوگ کہتے ہیں دلی بہت دور ہے

تجھ سا دیکھا نہیں آج تک تو حسیں
کون کہتا ہے تو مثل لنگور ہے

کیا کروں عیب زمانہ نہیں مانتا
میں تو کہتا ہوں تو حاتمی حور ہے

یہ الگ بات ہے تم نہیں جانتے
ورنہ دنیا میں حیاک مشہور ہے

عارف غازی پوری

تیرا جلوہ نظاروں میں مستور ہے
گو نظر سے مری تو بہت دور ہے

جلوۂ حور کی مجھ کو حاجت نہیں
ہر تجلی تری جلوۂ طور ہے

اس کی الفت کا ادنیٰ کرشمہ ہے یہ
خود کو کھو کر بھی دیوانہ مسرور ہے

تو مکر راہ طلب میں مٹا ڈال ان
درحقیقت محبت کا دستور ہے

ہمت نہ رہا پے قدم تیز کر
تیری منزل ابھی تو بہت دور ہے

ساقیٔ میکدہ تیرے احسان کا
میں بھی کیا سارا میخانہ مشکور ہے

میری نظروں میں کوئی بھی جچتا نہیں
جب سے عارف کوئی دل میں مستور ہے

بندہ اعلیٰ پوری ثم ۵ بوری

عشق اب یہ سمجھنے سے معذور ہے
آدمی آدمیت سے کیوں دور ہے

کیوں نخوت سے ہر شخص مسرور ہے
جیسے یہ بھی زمانے کا دستور ہے

راہ الفت میں پہلا قدم ہے جنوں
منزل عشق اے دل بہت دور ہے

کون تازہ کرے رسم دار و رسن
کوئی دنیا میں موجود منصور ہے؟

سارے عالم کو بھولے جو پہنچے وہاں
ان کی محفل کا ایسا ہی دستور ہے

لطف تیرا بھی ہے خوب اے خوبی
پاس آکر بھی کوئی بہت دور ہے

بندہ کو بھی ہوگی بفیض خسیر
تیری گردش زمانے میں مشہور ہے

خار بنتے ہیں گلشن کے ماحول پر
پھول کا دل بہاروں میں رنجور ہے

ایک ہے بت شکن ایک ہے حق پرست
کوئی محمود ہے، کوئی منصور ہے

عبدالقادر احمد سوئی مختار اندوری

دیکھ چشم حقیقت سے اُن کو ذرا
جو بھی زندہ ہے اپنی جگہ طور ہے

بڑھ کے زنداں سے پہنچا ہے جو دار تک
بس وہی وقت کا اپنے منصور ہے

ہم نے الزام عشق اپنے سر لے لیا
جو مزاجِ زمانہ وہ منظور ہے

ہیں وفا آشنا ، تو جفا آشنا
میں بھی مشہور ہوں تو بھی مشہور ہے

آشنا قلب غم سے جو دل نہیں
پتا تو یہ ہے حقیقت سے وہ دور ہے

اس چمن میں بتا دے تو ہی باغباں
کون مختار ہے، کون مجبور ہے

رام شنکر مصر راز کان پوری

میکدہ میری ہستی کا مامور ہے
دل شرابِ محبت سے مخمور ہے

ہر خوشی جھیل کر رنج و غم بخشتا
یہ خدائے محبت کا دستور ہے

یوں تو جینے کو میں جی رہا ہوں مگر
زندگی زندگی سے بہت دور ہے

ظلم ڈھاتے ہو کیوں زہر دیدہ مجھے
یہ عنایت مجھے دل سے منظور ہے

جان لینا اگر تم کو منظور ہے
خود شناسی سے انساں بہت دور ہے

جو نگاہوں سے مائل بہت دلکش ہے
اس کرشمہ رگ کے نزدیک پاتا ہوں میں

محمود نشتری اندور

کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے
یہ تو دنیائے فانی کا دستور ہے

آج تک دل کا ہر زخم نامور ہے
تیرا اُلفت کو کھائے زمانہ ہوا

ظلمتِ غم مٹی قلب پُر نور ہے
جب سے ہم آشنائے وفا ہو گئے

کیسے کہہ دوں کہ منزل مری دور ہے
ان کے نقشِ قدم پر ہوں جبہ گزں

تیری منزل جو تجھ سے ابھی دور ہے
یہ بھی محمود اک امتحاں ہے ترا

عبدالجبار تاج ناگ پوری

اپنی فطرت پہ ہر کوئی مجبور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

جا کے آواز بہرِ خدا دیجئے
ڈوبنے والا ساحل سے کچھ دور ہے

آپ کو رو برو دیکھ سکتا ہے کون
آپ کا حسن تو شعلۂ طور ہے

کیوں یہ دار و رسن لے رہے ہیں صدا
اس زمانے میں اب کون منصور ہے

بات قسمت کی ہے ورنہ تاجِ عزیز
کعبہ کیا دور ہے طیبہ کیا دور ہے

جمال الدین خاں وجد عظیم آبادی

دل مرا تیرے آنے سے مسرور ہے
آج مجھ سے شبِ تیرگی دور ہے

ساقیٔ بزم کیا تیرا دستور ہے
کوئی محروم ہے کوئی مخمور ہے

یہ جوانی ہے دو روز کی چاندنی
کیوں جوانی پہ اے دوست مغرور ہے

سنگِ فرقت سے تیرے بتِ دلربا
شیشۂ دل مرا چور چور ہے

میں اسیرِ شبِ تیرگی جاں سہی
یادِ رخ سے ترے دل تو معمور ہے

شمس الدین شمس جبلپوری

یہ جہانِ محبت کا دستور ہے
کوئی ناشاد ہے کوئی مسرور ہے

اس کے جلووں کی کثرت کا عالم ہے یہ
خانۂ دل مرا حاری طور ہے

دونوں ہیں مستقل اپنی اپنی جگہ
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

جو کلی مسکرائی دبی توڑ لی
باغبانِ چمن کا یہ دستور ہے

میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فائدہ
حسن کی بے نیازی تو مشہور ہے

پھر بھی اے شمس جلتا ہی رہتا ہوں میں
گو کہ غم سے مرے دل میں ناسور ہے

ثاں محمد ثانی ثمنی جبلپوری

اُس کے بندے کا دل رنج سے چور ہے
بندہ پرور جو دنیا میں مشہور ہے

کوئی مسرور و خرسند تو ہو آج بھی
تختۂ دار ہے جلوۂ طور ہے

کیا سمجھ پائے کوئی نظامِ جہاں
کوئی مختار ہے کوئی مجبور ہے

ظلم ڈھاتے ہو کیوں زہر دیدہ مجھے
جان لینا اگر تم کو منظور ہے

اُس کرشمہ رگ کے نزدیک پاتا ہوں میں
جو نگاہوں سے مائل بہت دلکش ہے

محمود نشتری اندور

یہ تو دنیائے فانی کا دستور ہے
کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے

تیرا اُلفت کو کھائے زمانہ ہوا
آج تک دل کا ہر زخم نامور ہے

جب سے ہم آشنائے وفا ہو گئے
ظلمتِ غم مٹی قلب پُر نور ہے

ان کے نقشِ قدم پر ہوں جبہ گزں
کیسے کہہ دوں کہ منزل مری دور ہے

یہ بھی محمود اک امتحاں ہے ترا
تیری منزل جو تجھ سے ابھی دور ہے

عبدالجبار تاج ناگ پوری

اپنی فطرت پہ ہر کوئی مجبور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

جا کے آواز بہرِ خدا دیجئے
ڈوبنے والا ساحل سے کچھ دور ہے

آپ کو رو برو دیکھ سکتا ہے کون
آپ کا حسن تو شعلۂ طور ہے

کیوں یہ دار و رسن لے رہے ہیں صدا
اس زمانے میں اب کون منصور ہے

بات قسمت کی ہے ورنہ تاجِ عزیز
کعبہ کیا دور ہے طیبہ کیا دور ہے

جمال الدین خاں وجد عظیم آبادی

دل مرا تیرے آنے سے مسرور ہے
آج مجھ سے شبِ تیرگی دور ہے

ساقیٔ بزم کیا تیرا دستور ہے
کوئی محروم ہے کوئی مخمور ہے

یہ جوانی ہے دو روز کی چاندنی
کیوں جوانی پہ اے دوست مغرور ہے

سنگِ فرقت سے تیرے بتِ دلربا
شیشۂ دل مرا چور چور ہے

میں اسیرِ شبِ تیرگی جاں سہی
یادِ رخ سے ترے دل تو معمور ہے

تنویر احمد خاں اعجاز ریوی (دیوبند)

یہ بے ثباتی یہ کیا تیرا دستور ہے
یہ بیاہے کہ نظروں سے تو دُور ہے
اپنا ہوا دیوں کا نگلا کیا کروں
ایک ان کے ستم ہیں کہ بدنام ہیں
حسن کو ضد تقاضا ہو دیدار کا
جبر فطرت سے دونوں ہی مجبور ہیں
دوسروں کے ستم کا گلہ شکایت ہی کیا
تیرا رصدیقی ایروی بدایونی

بادۂ عشق تلخی سے بھرپور ہے
ظلم ڈھانے میں مانا کہ کیتا ہیں وہ
حسن ناآشنائے کرم ہے ابھی
کوئی قدر ہی نہیں شوق کی جبیاں
تیری دُوری کا اے دوست کیوں رنج ہو
کم نگاہی کے سکے ہیں ہر سو رواں
شہرت میرٹھی بی۔ اے

دل ازل سے جہاں کا یہ دستور ہے
اب مری چشم ہر وقت رہتی ہے تر
اب تصور کے بھی خشق دھندلے سے ہیں
حق جلتی تھے نظرتِ حسن و عشق
اس کی تحریر پختہ ہے مٹتی نہیں
کون ہے وہ جو شہرت سے واقف نہیں
خان رسوا پیلی بھیت

اس کو کیا کوئی برباد و مجبور ہے
عشق کی راہ میں عقل کو چھوڑ دے
دوکنارے ہیں جو آ کے ملتے نہیں
دے دیا دل جو اس کو تو کیا ہو گیا
کس کو فرصت بتاؤں میں آغوش کی
تم تو آتے نہیں دل بہلتا نہیں
شاہ نگر کی آہ سرد

عشق ہر گام کا آزمانے پہ ہے

وہ اگر برق و رو ہیں تو یہ طور ہے
پاس وہ کر بھی تم سے بہت دُور ہے
بادۂ غم سے دل میرا مخمور ہے
کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے
عیش و راحت سے گو ہر بہت دُور ہے
الطاف انصاری سلطان پوری

گردشِ وقت کا وار بھرپور ہے
دھڑکنِ بزم میں آج کیا آ گئے
رائگاں جائے گا زہد و تقویٰ ترا
کوئی موسیٰ نہیں دیکھنے کے لئے
مجھ کو پاسِ ادب اس کو پاسِ حیا
آج تہذیبِ نو زور پر ہے مگر
ماسٹر عنایت اللہ عرشی جبل پوری

اس قدر ان کے جلوے سے پُر نور ہے
جب سے بے پردہ وہ روئے پُر نور ہے
جب سے دیکھا ہے میں نے جمالِ حسیں
بزمِ ماتم ہو، یا ہو وہ بزمِ خوشی
اب رہا ہو کے زنداں سے جائیں کہاں
اُن کے کوچے میں ہے جا کے خود دیکھ لو
طالب انصاری جبل پوری

میری میت پہ آنے کا وعدہ کریں
کیوں بھٹکتے ہو لے رہبرِ راہِ جنوں
اب زمانہ ہی دار و رسن کا نہیں
اس کشاکش میں کیا دھن کی ہو آمید
جب سے تیری اداؤں کی زینت بنا
مشغلہ ہے جنوں کا جو طالب کوئی
سید محمود ایروی

اپنی عالم یہ کیا تیرا دستور ہے
قابلِ فخر ہیں، دونوں اپنی جگہ
تابشِ تیز گاہی دکھاتے رہیں
جن کے قدموں پہ جھکتے ہے سارا جہاں

میرا دل ان کے جلووں میں مستور ہے
دل ہمارا امیر طور مجبور ہے
اور سارا جہاں شاد و مسرور ہے
اس زمانے کا ایسا ہی دستور ہے
خانۂ دل مراقم ہے معمور ہے

جس کو بھی دیکھئے آج رنجور ہے
جس طرف دیکھئے تو ہی تو طور ہے
دل میں زاہد اگر خواہشِ حور ہے
درد اب بھی وہی جلوۂ طور ہے
جس کی جو ہیں وہ بھی مجبور ہیں
ظلم اپنی جگہ حسب دستور ہے

دل مرا ہے کہ یا سینۂ طور ہے
میرے پیشِ نظر جلوۂ طور ہے
دیکھتا ہوں جدھر تو ہی تو نور ہے
ہر جگہ شمع جلنے پہ مجبور ہے
پر بھی ٹوٹے ہیں، گلزار بھی قید ہے
کون کہتا ہے جنت بہت دُور ہے

ہر ستم آپ کا مجھ کو منظور ہے
منزلِ وصلِ جاناں بہت دُور ہے
جو انا الحق کہے بس وہ منصور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے
شیشۂ دل اسی وقت سے چور ہے
سر کو ٹکرا کے یہ بھی جبل پوری

زندگی، زندگی سے بہت دُور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے
کون کہتا ہے منزل بہت دُور ہے
وہ جنہیں کہہ دیا دل میں مستور ہے

نازک آصفی شکوہ آبادی

دیدۂ اس کی اگر آج منظور رہے
کل وہ اتنا ہی محترم رہیگا یہاں
اب انا الحق کے نعرے لگانے سے کیا
جو قدم بڑھ گیا وہ نہ پیچھے ہٹے
دیکھ نازک تا لیِ محبت ہو کیا

مظہر رتنا گری

یا خدا کیوں یہ گلشن کا دستور ہے
صبر نے بڑھ کے ڈھارس بندھا دی مری
جب ستم کا مرے حق میں امکان نہیں
پھر پریشان کوئی، کوئی شادماں

انور علی آذر دارثی

کلفتِ رنج و غم سے بہت دُور ہے
اہلِ دنیا سے کوئی غرض اب نہیں
ساغرِ وصل دے یا کہ جامِ فراق
آج آئے چلے ساتھ آذر کے وہ

جعفری جون پوری

دیکھئے میں نگاہوں سے وہ دُور ہے
یا غم آپڑا ہے تو کچھ غم نہیں
اک نہ اک دن پہنچ کر ہی دم لوں گا میں
کس لئے دیر ہے دار پر کھینچئے

صبا اجمن شرر سلطان پوری

ہوں کے چلنے سے ماحول رومان ہوا
آنکھ ہو تو نظر آتا ہے ہر طرف
چشمِ ساقی کا اعجاز تو دیکھئے
اے شرر وہ محبت بھرے دل کہاں

نسیم یاور رتنا گری

عشقِ اللہ سے دل جو معمور ہے
تیرِ بدعہد سے تو اس کی عظمت بڑھی
درحقیقت تقاضائے فطرت ہے یہ
کوئی خواہش نہیں دل میں اب اے نسیم

(انعام سے مستثنیٰ)

اب بھی جلوے وہی ہیں وہی طُور ہے
جس قدر آدمی آج مجبور ہے
دار پر چڑھ گیا جو وہ منصور ہے
یہ محبت کا پہلا ہی دستور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

خار گلچیں ہے پھول مسرور ہے
میں تو سمجھا تھا منزل ابھی دُور ہے
پھر کرم کی نظر مجھ سے کیوں دور ہے
کون سا یہ زمانہ کا دستور ہے

چوٹ کھا کر بھی دیوانہ مسرور ہے
صرف تیری خوشی مجھ کو منظور ہے
تیرا ہر فیصلہ مجھ کو منظور ہے
جس کو طوفاں سے ٹکرانا منظور ہے

ورنہ ہر وقت ہی دل میں مسطور ہے
بار اٹھانے میں دل میرا مسرور ہے
میری منزل اگرچہ بہت دُور ہے
آپ کا فیصلہ ہم کو منظور ہے

دل مرا واقعی بیشِ طُور ہے
جلوۂ یار ہر شے میں مستور ہے
بے پئے بزم کی بزم مخمور ہے
اب عداوت زمانے کا دستور ہے

فی الحقیقت وہ نورٌ علیٰ نور ہے
اے جنوں عشق تیرا ہی مشکور ہے
عشق خوددار ہے حسن مغرور ہے
اپنا دامن مرادوں سے بھر پور ہے

عبدالسعید سعید رتنا گری

ہر دہ اہلِ خرد چاہے اہلِ جنوں
کیا کروگے مرے دل کو لے کر بھلا
دفعتاً بام پر آپ کیا آگئے
ہے وہ چشمِ تصور سے اتنا قریں
ضیا رالا نجم پرتاپ گڑھی

کون سی راہ الفت کو منظور ہے
گیسوئے وقت سلجھا رہا ہے کوئی
اس زمانے میں ظرفِ نظر ہے کہاں
اے ضیا رخ کس کو ہے دیکھیں ذرا

وحید شمسی

جس کے جلووں سے دل اپنا معمور ہے
زخمِ دل داد دے دستِ قاتل کی تو
آتشِ عشق نے یوں جلایا مجھے
تم وحیدِ حزیں کو نہ جانو تو کیا

اقبال حسین اقبال - سورتی

چشمِ دل ان کے جلووں سے معمور ہے
رسم دار و رسن عام ہے یا نہیں
اس سے رستی ہیں کتنی ہی نیرنگیاں
فیضِ شعر و سخن کا ہے اقبال یہ

حکیم عبدالباقی حکیم پورنی

کیوں نہ کہنہ فسانے کو تازہ کروں
آپ کا ہر اشارہ مری آرزو
ہر گلی سے تجلّی عیاں آپ کی
جب حکیم آپ کے سامنے آگیا
نعت اللہ نعت پھیلی جیتی

میری مژگاں پہ ہیں آنسوؤں کے دیئے
کیا بتاؤں تری یاد میں دل مرا
حسن محوِ خوشی اور دل غم زدہ
غم کی نعمت جو نعمت کو حاصل نہیں

دل سراپا مرا غم سے معمور ہے
دیکھتا ہوں جدھر نُور ہی نُور ہے
جتنا میری نگاہوں سے وہ دور ہے

اک طرف بانکپن ہے اک طرف نُور ہے
آدمی وقت کے ہاتھ مجبور ہے
تیرے جلوے جہاں میں ہیں طُور ہے
عشق خوددار ہے حسن مغرور ہے

وہ مری دسترس سے بہت دُور ہے
دار جو بھی ہے گہرا ہے بھرپور ہے
میری ہستی بھی اب شعلۂ طُور ہے
ویسے شعر و سخن میں وہ مشہور ہے

تا بحدِ نظر نُور ہی نُور ہے
وجد میں آج پھر خود منصور ہے
عاشقوں کی جبیں بھی ناصبور ہے
کوئی بدنام ہے کوئی مشہور ہے

آج نامید ایثارِ منصور ہے
جو بھی فرمائیں مجھ کو وہ منظور ہے
ہر گلی تر میں میں آپ کا نُور ہے
اس میں حیرت ہی کیا جو وہ مغرور ہے

شمع غم سے میرا قلب معمور ہے
کتنا بے چین ہے کتنا مجبور ہے
آپ تھامیں کوئی بھی مجبور ہے
دل تری اس عنایت سے مسرور ہے

ماہیل ذبیح الیگانوی

حقیقت کہنے سے جو دُور ہے
ہم ہم ہے جس کا خدا کی قسم
وفا کہ بھی کہتا ہے وہ بے وفا
وہ انجم کی خواہش وہ پھر کیوں کریں

آدیبارانوی

جلوہ نگاہوں میں مستور ہے
ناقتیں ہے کتنا رنجور ہے
کو زیبا نہیں دعوائے قرب حق
لیتے ہیں اُفتاد ہیں ہم مگر
صور نشتر کا اندر

رِ رنگ و نم سے ہے آراستہ
ازش ہے سب انقلابات کی
نے گلشن پہ سب کچھ نچھاور کیا
سے بڑھ کے دنیا میں کوئی نہیں
علی کپل

کی دل ستانی تو مشہور ہے
س گیا دل مرا گیسوئے یار میں
ن کی مرے دل سے جلے گی کبھی
کر پھینک دیتا ہے انجم اسے
ن گور کھ پوری

تاروں سے اب بات بنتی نہیں
نے کے لئے تم کو بے تاب تھا
فائی کا رونق تو شکوہ سنج
نی گرم کنڈولی

سے ملنے کی شاید گھڑی آگئی
نہ ہے تھی کوششوں کی طرف
ل بجھا گئی ہے مگر
یب

دلربا

ہ

ہلے دل پر گرا کر وہ برقِ نظر
مخمور عباسی ریواڑوی

کچھ عجب بزم ساقی کا دستور ہے
ٹوٹتے ہی نہیں پاتا شکوں کا تار
جیت دونوں میں اپنے یکیں کس کی ہے
دل رکابی

میں جلوں آتش ہجر میں عمر بھر
ڈھاتے رہتے ہیں اہل وفا پر ستم
اپنے دل کو یہ سمجھا دے ساقی ذرا
جمیل جلیپوری (احمد آباد)

عرش اعلیٰ ہے زد رس سے طور ہے
ہر بوس ہے چاند ہے سر نگوں
برقِ حسن جمالِ جہاں کی قسم
فانوس کا لی مالیگانوی

کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے
مجھ کو گرداب و طوفاں سے کیا ہو گلہ
کس کے جلووں کی فانوس ہے روشنی
صدیق شبنم شکوہ آبادی

اُن کا بیمار غم اتنا معذور ہے
دوست بن کر کسی دوست کو لوٹنا
گامزن رہ ابھی جادۂ حسن پر
ظفر کلکتوی

اب مسرت کی دولت نہیں چاہئے
حوصلے اور یقیں تو مرے ساتھ ہیں
اے نظر کس طرح اُن سے نفرت کروں
کریم اسعدی بھاگلپوری

موجِ غم سے گزرتا چلا جا ابھی
ناز جو اس اسیری پہ اس کو نہ کیوں
محمد اصغر پیلی بھیت

عشق کی حسن کی ہے صفت ایک ہی
دل پھرا ہے زباں سے پھرے گا کبھی

دیکھ دیکھ یہی منظرِ طور ہے

جو ہے پیاسا وہی جام سے دُور ہے
زمہ تر ہے یا کوئی ناسور ہے
عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے

کیا یہی بے وفائی کو منظور ہے
اہل دنیا کا کیا خوب دستور ہے
کیوں ہر اک بادہ کش آج رنجور ہے

اُن کی منزل بظاہر بہت دُور ہے
آپ ہیں جس جگہ نور ہی نور ہے
ذرہ ذرہ ترے بزم کا طور ہے

ہم نشیں یہ زمانے کا دستور ہے
ہوگا جو میری قسمت کو منظور ہے
خانۂ دل مرا نور ہی نور ہے

لبِ ہانے سے بھی آج مجبور ہے
اس زمانے کا اچھا یہ دستور ہے
منزلِ عشق تیری بہت دُور ہے

دل مرا دولتِ غم سے معمور ہے
مانتا ہوں کہ منزل بہت دور ہے
پیار کرنا ہی جب میرا دستور ہے

ساحل زندگانی بہت دُور ہے
جو تری زلفِ پیچاں میں مصروف ہے

عشق خود دار ہے حسن مغرور ہے
میری قسمت کو کچھ بھی منظور ہے

تلفت ہارونی مالیگاؤں

اُف یہ کیسا زمانے کا دستور ہے — عشق آنسو بہانے پہ مجبور ہے
آگ ہے کل جلی جائے گی ہاتھ سے — آدمی پھر بھی دولت پہ مغرور ہے

ناہید صدیقی دھولیوی

یہ جہانِ محبت کا دستور ہے — عشق خوددار ہے حسن مغرور ہے
یوں تو جنت میں حوریں بہت ہیں مگر — میری جنت کی بس ایک تو حور ہے

مظہر سلطان پوری (احمد آباد)

مجھ کو دونوں جہاں کا کوئی غم نہیں — اک تری یاد میں دل مرا چور ہے
دکھ دیا تے رہنگ اپنا بدلا مگر — میرا منظر وہی پہلا دستور ہے

ایم۔ فاروقی پیلی بھیت

عہد و پیماں کسی سے نہ کر قادری — بے رُخی زندگی کا بھی دستور ہے

رہبر دہلوی کلکتہ

تازہ کلیوں میں شوخی گھٹا میں کہاں — جتنے تڑپے نظر تجھ میں وہ نور ہے

شمی بانو۔ جودھپور

منزلِ عشق کی رہگزر ہے عجب — جو بھی نزدیک ہے وہ بہت دور ہے

عبدالستار آلی نگری

مان جا کہ دل مرا سراسر ہے — ہمان فوادی جس کی مشہور ہے

سالنامہ شعلہ و شبنم دہلی

سالنامہ شعلہ و شبنم دہلی زیر ترتیب ہے جس میں اُردو کے مشاہیر قلمکار شرکت فرما رہے ہیں۔ براہ کرم اپنے معیاری مضامین نظم و نثر جلد تر مرحمت فرمائیے کہ بعد از وقت موصول ہونے کی وجہ سے عدم اشاعت کی شکایت نہ رہے۔ نیز اگر آپ اپنا بلاک بھی شائع کرانا چاہتے ہیں تو فوراً لکھئے ——— "منیجر"

اطلاع

کچھ کرم فرما اپنے کلام کے انتخاب کے سلسلہ میں یا دیگر امور کی بابتہ مجھ سے دفتر شعلہ و شبنم کے ذریعہ سوالات کیا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں میرا قیام دہلی میں ہوتا ہے، مگر میں دہلی نہیں گنوڑ ضلع بدایوں رہتا ہوں ایسے دوستوں کو چاہئے کہ جوابی لفافے کے ساتھ ابر احسنی گنوڑ ضلع بدایوں یو۔پی کے پتہ پر خط لکھا کریں، جواب مل جایا کرے گا ——— ابر احسنی

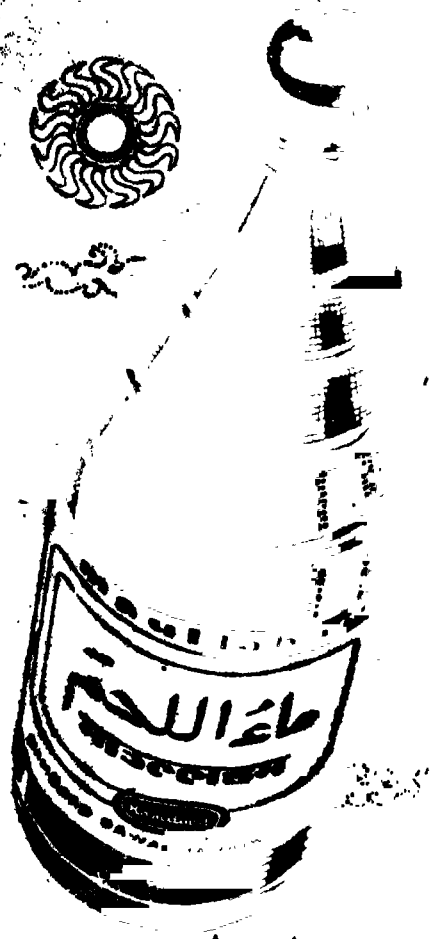

ہمدرد کا ماء اللحم

بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

دہلی
کانپور
پٹنہ

REG. NO. 1554 B

اس انجمن کل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی

شعلہ و شبنم

زرِ سالانہ
چار روپے
شش ماہی
دو روپے

مارچ
سنہ ۱۹۶۳ء

جلد ۱۴
شمارہ ۳

ہیڈ آفس
ریسہ کلاں دتی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصۂ نظم
حضرت مولانا ابر احسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد خوش پوری

قیمت
۲۷ نئے پیسے

فہرس

۱	حرف اول	ابر احسنی گنوری	۳
۲	مولانا ناطق گلاوٹھوی اور ان کا فن	محمد یونس ابراہیم	۵
۳	اپنی غضب اپنے دوست	مختلف خطوط	۱۰
۴	آتش گل	سیفی پریمی	۱۱
۵	دو غزلیں	نسیم شاہجہانپوری	۱۳
	״	رحمت کلکتوی	״
۶	غزلیات	صادق نیمابی	۱۴
	״	عنایت اللہ وحشی	״
	״	ولی پیلی بھیتی	״
۸	انکار نو	آمر سنوری - شباب الہ آبادی ایم۔اے	۱۵
	״	ہدا القریشی	״
۹	جلال و جمال	نذیر احمد نذر نظامی - شفق جونپوری	۱۶
	״	اختر قادری - غافل بریلوی	״
	״	عزیز کاشوی - آزاد شہبازنگری	״
۱۰	تاریخ لکھنؤ	مظفر حنفی بھوپالی	۱۷
۱۱	پیاسی روحیں	مترجمہ روشن چیاوی	۲۵
۱۲	زلف شانے پہ بکھری	ظہیر کنجاہی امروہوی	۲۷
۱۳	طرحی مشاعرہ منعقدہ	مرتبہ شفا گوالیاری ناظم مشاعرہ	۳۱

باہتمام شری بمل جین شاہدین پرنٹرز جلسہ ۱۱ ۔ ۱۲ ۔ ۱۳ ۔ ۱۴ ۔ ۱۵ ۔ ۱۶ ۔ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ ۔ ۲۱ ۔ ۲۲ ۔ ۲۳ ۔ ۲۴ ۔ ۲۵ ۔ ۲۶ ۔ ۲۷ ۔ ۲۸ ۔ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ ۳۱ ۔ ۳۲ ۔ ۳۳ ۔ ۳۴ ۔ ۳۵ ۔ ۳۶ ۔ ۳۷ ۔ ۳۸ ۔ ۳۹ ۔ ۴۰ ۔ ۴۱ ۔ ۴۲ ۔ ۴۳ ۔ ۴۴ ۔ ۴۵ ۔ ۴۶ ۔ ۴۷ ۔ ۴۸ ۔ ۴۹ ۔ ۵۰ ۔ ۵۱ ۔ ۵۲ ۔ ۵۳ ۔ ۵۴ ۔ ۵۵ ۔ ۵۶ ۔ ۵۷ ۔ ۵۸ ۔ ۵۹ ۔ ۶۰ ۔ ۶۱ ۔ ۶۲ ۔ ۶۳ ۔ ۶۴ ۔ ۶۵ ۔ ۶۶ ۔ ۶۷ ۔ ۶۸ ۔ ۶۹ ۔ ۷۰ ۔ ۷۱ ۔ ۷۲ ۔ ۷۳ ۔ ۷۴ ۔ ۷۵ ۔ ۷۶ ۔ ۷۷ ۔ ۷۸ ۔ ۷۹ ۔ ۸۰ ۔ ۸۱ ۔ ۸۲ ۔ ۸۳ ۔ ۸۴ ۔ ۸۵ ۔ ۸۶ ۔ ۸۷ ۔ ۸۸ ۔ ۸۹ ۔ ۹۰ ۔ ۹۱ ۔ ۹۲ ۔ ۹۳ ۔ ۹۴ ۔ ۹۵ ۔ ۹۶ ۔ ۹۷ ۔ ۹۸ ۔ ۹۹ ۔ ۱۰۰ ۔ ۱۰۱ ۔ ۱۰۲ ۔ ۱۰۳ ۔ ۱۰۴ ۔ ۱۰۵ ۔ ۱۰۶ ۔ ۱۰۷ ۔ ۱۰۸ ۔ ۱۰۹ ۔ ۱۱۰ ۔ ۱۱۱ ۔ ۱۱۲ ۔ ۱۱۳ ۔ ۱۱۴ ۔ ۱۱۵ ۔ ۱۱۶ ۔ ۱۱۷ ۔ ۱۱۸ ۔ ۱۱۹ ۔ ۱۲۰ ۔ ۱۲۱ ۔ ۱۲۲ ۔ ۱۲۳ ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۵ ۔ ۱۲۶ ۔ ۱۲۷ ۔ ۱۲۸ ۔ ۱۲۹ ۔ ۱۳۰ ۔ ۱۳۱ ۔ ۱۳۲ ۔ ۱۳۳ ۔ ۱۳۴ ۔ ۱۳۵ ۔ ۱۳۶ ۔ ۱۳۷ ۔ ۱۳۸ ۔ ۱۳۹ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۱ ۔ ۱۴۲ ۔ ۱۴۳ ۔ ۱۴۴ ۔ ۱۴۵ ۔ ۱۴۶ ۔ ۱۴۷ ۔ ۱۴۸ ۔ ۱۴۹ ۔ ۱۵۰ ۔ ۱۵۱ ۔ ۱۵۲ ۔ ۱۵۳ ۔ ۱۵۴ ۔ ۱۵۵ ۔ ۱۵۶ ۔ ۱۵۷ ۔ ۱۵۸ ۔ ۱۵۹ ۔ ۱۶۰ ۔ ۱۶۱ ۔ ۱۶۲ ۔ ۱۶۳ ۔ ۱۶۴ ۔ ۱۶۵ ۔ ۱۶۶ ۔ ۱۶۷ ۔ ۱۶۸ ۔ ۱۶۹ ۔ ۱۷۰ ۔ ۱۷۱ ۔ ۱۷۲ ۔ ۱۷۳ ۔ ۱۷۴ ۔ ۱۷۵ ۔ ۱۷۶ ۔ ۱۷۷ ۔ ۱۷۸ ۔ ۱۷۹ ۔ ۱۸۰ ۔ ۱۸۱ ۔ ۱۸۲ ۔ ۱۸۳ ۔ ۱۸۴ ۔ ۱۸۵ ۔ ۱۸۶ ۔ ۱۸۷ ۔ ۱۸۸ ۔ ۱۸۹ ۔ ۱۹۰ ۔ ۱۹۱ ۔ ۱۹۲ ۔ ۱۹۳ ۔ ۱۹۴ ۔ ۱۹۵ ۔ ۱۹۶ ۔ ۱۹۷ ۔ ۱۹۸ ۔ ۱۹۹ ۔ ۲۰۰ ۔ ۲۰۱ ۔ ۲۰۲ ۔ ۲۰۳ ۔ ۲۰۴ ۔ ۲۰۵ ۔ ۲۰۶ ۔ ۲۰۷ ۔ ۲۰۸ ۔ ۲۰۹ ۔ ۲۱۰ ۔ ۲۱۱ ۔ ۲۱۲ ۔ ۲۱۳ ۔ ۲۱۴ ۔ ۲۱۵ ۔ ۲۱۶ ۔ ۲۱۷ ۔ ۲۱۸ ۔ ۲۱۹ ۔ ۲۲۰ ۔ ۲۲۱ ۔ ۲۲۲ ۔ ۲۲۳ ۔ ۲۲۴ ۔ ۲۲۵ ۔ ۲۲۶ ۔ ۲۲۷ ۔ ۲۲۸ ۔ ۲۲۹ ۔ ۲۳۰ ۔ ۲۳۱ ۔ ۲۳۲ ۔ ۲۳۳ ۔ ۲۳۴ ۔ ۲۳۵ ۔ ۲۳۶ ۔ ۲۳۷ ۔ ۲۳۸ ۔ ۲۳۹ ۔ ۲۴۰ ۔ ۲۴۱ ۔ ۲۴۲ ۔ ۲۴۳ ۔ ۲۴۴ ۔ ۲۴۵ ۔ ۲۴۶ ۔ ۲۴۷ ۔ ۲۴۸ ۔ ۲۴۹ ۔ ۲۵۰ ۔ ۲۵۱ ۔ ۲۵۲ ۔ ۲۵۳ ۔ ۲۵۴ ۔ ۲۵۵ ۔ ۲۵۶ ۔ ۲۵۷ ۔ ۲۵۸ ۔ ۲۵۹ ۔ ۲۶۰ ۔ ۲۶۱ ۔ ۲۶۲ ۔ ۲۶۳ ۔ ۲۶۴ ۔ ۲۶۵ ۔ ۲۶۶ ۔ ۲۶۷ ۔ ۲۶۸ ۔ ۲۶۹ ۔ ۲۷۰ ۔ ۲۷۱ ۔ ۲۷۲ ۔ ۲۷۳ ۔ ۲۷۴ ۔ ۲۷۵ ۔ ۲۷۶ ۔ ۲۷۷ ۔ ۲۷۸ ۔ ۲۷۹ ۔ ۲۸۰ ۔ ۲۸۱ ۔ ۲۸۲ ۔ ۲۸۳ ۔ ۲۸۴ ۔ ۲۸۵ ۔ ۲۸۶ ۔ ۲۸۷ ۔ ۲۸۸ ۔ ۲۸۹ ۔ ۲۹۰ ۔ ۲۹۱ ۔ ۲۹۲ ۔ ۲۹۳ ۔ ۲۹۴ ۔ ۲۹۵ ۔ ۲۹۶ ۔ ۲۹۷ ۔ ۲۹۸ ۔ ۲۹۹ ۔ ۳۰۰ ۔ ۳۰۱ ۔ ۳۰۲ ۔ ۳۰۳ ۔ ۳۰۴ ۔ ۳۰۵ ۔ ۳۰۶ ۔ ۳۰۷ ۔ ۳۰۸ ۔ ۳۰۹ ۔ ۳۱۰ ۔ ۳۱۱ ۔ ۳۱۲ ۔ ۳۱۳ ۔ ۳۱۴ ۔ ۳۱۵ ۔ ۳۱۶ ۔ ۳۱۷ ۔ ۳۱۸ ۔ ۳۱۹ ۔ ۳۲۰ ۔ ۳۲۱ ۔ ۳۲۲ ۔ ۳۲۳ ۔ ۳۲۴ ۔ ۳۲۵ ۔ ۳۲۶ ۔ ۳۲۷ ۔ ۳۲۸ ۔ ۳۲۹ ۔ ۳۳۰ ۔ ۳۳۱ ۔ ۳۳۲ ۔ ۳۳۳ ۔ ۳۳۴ ۔ ۳۳۵ ۔ ۳۳۶ ۔ ۳۳۷ ۔ ۳۳۸ ۔ ۳۳۹ ۔ ۳۴۰ ۔ ۳۴۱ ۔ ۳۴۲ ۔ ۳۴۳ ۔ ۳۴۴ ۔ ۳۴۵ ۔ ۳۴۶ ۔ ۳۴۷ ۔ ۳۴۸ ۔ ۳۴۹ ۔ ۳۵۰ ۔ ۳۵۱ ۔ ۳۵۲ ۔ ۳۵۳ ۔ ۳۵۴ ۔ ۳۵۵ ۔ ۳۵۶ ۔ ۳۵۷ ۔ ۳۵۸ ۔ ۳۵۹ ۔ ۳۶۰ ۔ ۳۶۱ ۔ ۳۶۲ ۔ ۳۶۳ ۔ ۳۶۴ ۔ ۳۶۵ ۔ ۳۶۶ ۔ ۳۶۷ ۔ ۳۶۸ ۔ ۳۶۹ ۔ ۳۷۰ ۔ ۳۷۱ ۔ ۳۷۲ ۔ ۳۷۳ ۔ ۳۷۴ ۔ ۳۷۵ ۔ ۳۷۶ ۔ ۳۷۷ ۔ ۳۷۸ ۔ ۳۷۹ ۔ ۳۸۰ ۔ ۳۸۱ ۔ ۳۸۲ ۔ ۳۸۳ ۔ ۳۸۴ ۔ ۳۸۵ ۔ ۳۸۶ ۔ ۳۸۷ ۔ ۳۸۸ ۔ ۳۸۹ ۔ ۳۹۰ ۔ ۳۹۱ ۔ ۳۹۲ ۔ ۳۹۳ ۔ ۳۹۴ ۔ ۳۹۵ ۔ ۳۹۶ ۔ ۳۹۷ ۔ ۳۹۸ ۔ ۳۹۹ ۔ ۴۰۰ ۔ ۴۰۱ ۔ ۴۰۲ ۔ ۴۰۳ ۔ ۴۰۴ ۔ ۴۰۵ ۔ ۴۰۶ ۔ ۴۰۷ ۔ ۴۰۸ ۔ ۴۰۹ ۔ ۴۱۰ ۔ ۴۱۱ ۔ ۴۱۲ ۔ ۴۱۳ ۔ ۴۱۴ ۔ ۴۱۵ ۔ ۴۱۶ ۔ ۴۱۷ ۔ ۴۱۸ ۔ ۴۱۹ ۔ ۴۲۰ ۔ ۴۲۱ ۔ ۴۲۲ ۔ ۴۲۳ ۔ ۴۲۴ ۔ ۴۲۵ ۔ ۴۲۶ ۔ ۴۲۷ ۔ ۴۲۸ ۔ ۴۲۹ ۔ ۴۳۰ ۔ ۴۳۱ ۔ ۴۳۲ ۔ ۴۳۳ ۔ ۴۳۴ ۔ ۴۳۵ ۔ ۴۳۶ ۔ ۴۳۷ ۔ ۴۳۸ ۔ ۴۳۹ ۔ ۴۴۰ ۔ ۴۴۱ ۔ ۴۴۲ ۔ ۴۴۳ ۔ ۴۴۴ ۔ ۴۴۵ ۔ ۴۴۶ ۔ ۴۴۷ ۔ ۴۴۸ ۔ ۴۴۹ ۔ ۴۵۰ ۔ ۴۵۱ ۔ ۴۵۲ ۔ ۴۵۳ ۔ ۴۵۴ ۔ ۴۵۵ ۔ ۴۵۶ ۔ ۴۵۷ ۔ ۴۵۸ ۔ ۴۵۹ ۔ ۴۶۰ ۔ ۴۶۱ ۔ ۴۶۲ ۔ ۴۶۳ ۔ ۴۶۴ ۔ ۴۶۵ ۔ ۴۶۶ ۔ ۴۶۷ ۔ ۴۶۸ ۔ ۴۶۹ ۔ ۴۷۰ ۔ ۴۷۱ ۔ ۴۷۲ ۔ ۴۷۳ ۔ ۴۷۴ ۔ ۴۷۵ ۔ ۴۷۶ ۔ ۴۷۷ ۔ ۴۷۸ ۔ ۴۷۹ ۔ ۴۸۰ ۔ ۴۸۱ ۔ ۴۸۲ ۔ ۴۸۳ ۔ ۴۸۴ ۔ ۴۸۵ ۔ ۴۸۶ ۔ ۴۸۷ ۔ ۴۸۸ ۔ ۴۸۹ ۔ ۴۹۰ ۔ ۴۹۱ ۔ ۴۹۲ ۔ ۴۹۳ ۔ ۴۹۴ ۔ ۴۹۵ ۔ ۴۹۶ ۔ ۴۹۷ ۔ ۴۹۸ ۔ ۴۹۹ ۔ ۵۰۰ ۔ ۵۰۱ ۔ ۵۰۲ ۔ ۵۰۳ ۔ ۵۰۴ ۔ ۵۰۵ ۔ ۵۰۶ ۔ ۵۰۷ ۔ ۵۰۸ ۔ ۵۰۹ ۔ ۵۱۰ ۔ ۵۱۱ ۔ ۵۱۲ ۔ ۵۱۳ ۔ ۵۱۴ ۔ ۵۱۵ ۔ ۵۱۶ ۔ ۵۱۷ ۔ ۵۱۸ ۔ ۵۱۹ ۔ ۵۲۰ ۔ ۵۲۱ ۔ ۵۲۲ ۔ ۵۲۳ ۔ ۵۲۴ ۔ ۵۲۵ ۔ ۵۲۶ ۔ ۵۲۷ ۔ ۵۲۸ ۔ ۵۲۹ ۔ ۵۳۰ ۔ ۵۳۱ ۔ ۵۳۲ ۔ ۵۳۳ ۔ ۵۳۴ ۔ ۵۳۵ ۔ ۵۳۶ ۔ ۵۳۷ ۔ ۵۳۸ ۔ ۵۳۹ ۔ ۵۴۰ ۔ ۵۴۱ ۔ ۵۴۲ ۔ ۵۴۳ ۔ ۵۴۴ ۔ ۵۴۵ ۔ ۵۴۶ ۔ ۵۴۷ ۔ ۵۴۸ ۔ ۵۴۹ ۔ ۵۵۰ ۔ ۵۵۱ ۔ ۵۵۲ ۔ ۵۵۳ ۔ ۵۵۴ ۔ ۵۵۵ ۔ ۵۵۶ ۔ ۵۵۷ ۔ ۵۵۸ ۔ ۵۵۹ ۔ ۵۶۰ ۔ ۵۶۱ ۔ ۵۶۲ ۔ ۵۶۳ ۔ ۵۶۴ ۔ ۵۶۵ ۔ ۵۶۶ ۔ ۵۶۷ ۔ ۵۶۸ ۔ ۵۶۹ ۔ ۵۷۰ ۔ ۵۷۱ ۔ ۵۷۲ ۔ ۵۷۳ ۔ ۵۷۴ ۔ ۵۷۵ ۔ ۵۷۶ ۔ ۵۷۷ ۔ ۵۷۸ ۔ ۵۷۹ ۔ ۵۸۰ ۔ ۵۸۱ ۔ ۵۸۲ ۔ ۵۸۳ ۔ ۵۸۴ ۔ ۵۸۵ ۔ ۵۸۶ ۔ ۵۸۷ ۔ ۵۸۸ ۔ ۵۸۹ ۔ ۵۹۰ ۔ ۵۹۱ ۔ ۵۹۲ ۔ ۵۹۳ ۔ ۵۹۴ ۔ ۵۹۵ ۔ ۵۹۶ ۔ ۵۹۷ ۔ ۵۹۸ ۔ ۵۹۹ ۔ ۶۰۰ ۔ ۶۰۱ ۔ ۶۰۲ ۔ ۶۰۳ ۔ ۶۰۴ ۔ ۶۰۵ ۔ ۶۰۶ ۔ ۶۰۷ ۔ ۶۰۸ ۔ ۶۰۹ ۔ ۶۱۰ ۔ ۶۱۱ ۔ ۶۱۲ ۔ ۶۱۳ ۔ ۶۱۴ ۔ ۶۱۵ ۔ ۶۱۶ ۔ ۶۱۷ ۔ ۶۱۸ ۔ ۶۱۹ ۔ ۶۲۰ ۔ ۶۲۱ ۔ ۶۲۲ ۔ ۶۲۳ ۔ ۶۲۴ ۔ ۶۲۵ ۔ ۶۲۶ ۔ ۶۲۷ ۔ ۶۲۸ ۔ ۶۲۹ ۔ ۶۳۰ ۔ ۶۳۱ ۔ ۶۳۲ ۔ ۶۳۳ ۔ ۶۳۴ ۔ ۶۳۵ ۔ ۶۳۶ ۔ ۶۳۷ ۔ ۶۳۸ ۔ ۶۳۹ ۔ ۶۴۰ ۔ ۶۴۱ ۔ ۶۴۲ ۔ ۶۴۳ ۔ ۶۴۴ ۔ ۶۴۵ ۔ ۶۴۶ ۔ ۶۴۷ ۔ ۶۴۸ ۔ ۶۴۹ ۔ ۶۵۰ ۔ ۶۵۱ ۔ ۶۵۲ ۔ ۶۵۳ ۔ ۶۵۴ ۔ ۶۵۵ ۔ ۶۵۶ ۔ ۶۵۷ ۔ ۶۵۸ ۔ ۶۵۹ ۔ ۶۶۰ ۔ ۶۶۱ ۔ ۶۶۲ ۔ ۶۶۳ ۔ ۶۶۴ ۔ ۶۶۵ ۔ ۶۶۶ ۔ ۶۶۷ ۔ ۶۶۸ ۔ ۶۶۹ ۔ ۶۷۰ ۔ ۶۷۱ ۔ ۶۷۲ ۔ ۶۷۳ ۔ ۶۷۴ ۔ ۶۷۵ ۔ ۶۷۶ ۔ ۶۷۷ ۔ ۶۷۸ ۔ ۶۷۹ ۔ ۶۸۰ ۔ ۶۸۱ ۔ ۶۸۲ ۔ ۶۸۳ ۔ ۶۸۴ ۔ ۶۸۵ ۔ ۶۸۶ ۔ ۶۸۷ ۔ ۶۸۸ ۔ ۶۸۹ ۔ ۶۹۰ ۔ ۶۹۱ ۔ ۶۹۲ ۔ ۶۹۳ ۔ ۶۹۴ ۔ ۶۹۵ ۔ ۶۹۶ ۔ ۶۹۷ ۔ ۶۹۸ ۔ ۶۹۹ ۔ ۷۰۰ ۔ ۷۰۱ ۔ ۷۰۲ ۔ ۷۰۳ ۔ ۷۰۴ ۔ ۷۰۵ ۔ ۷۰۶ ۔ ۷۰۷ ۔ ۷۰۸ ۔ ۷۰۹ ۔ ۷۱۰ ۔ ۷۱۱ ۔ ۷۱۲ ۔ ۷۱۳ ۔ ۷۱۴ ۔ ۷۱۵ ۔ ۷۱۶ ۔ ۷۱۷ ۔ ۷۱۸ ۔ ۷۱۹ ۔ ۷۲۰ ۔ ۷۲۱ ۔ ۷۲۲ ۔ ۷۲۳ ۔ ۷۲۴ ۔ ۷۲۵ ۔ ۷۲۶ ۔ ۷۲۷ ۔ ۷۲۸ ۔ ۷۲۹ ۔ ۷۳۰ ۔ ۷۳۱ ۔ ۷۳۲ ۔ ۷۳۳ ۔ ۷۳۴ ۔ ۷۳۵ ۔ ۷۳۶ ۔ ۷۳۷ ۔ ۷۳۸ ۔ ۷۳۹ ۔ ۷۴۰ ۔ ۷۴۱ ۔ ۷۴۲ ۔ ۷۴۳ ۔ ۷۴۴ ۔ ۷۴۵ ۔ ۷۴۶ ۔ ۷۴۷ ۔ ۷۴۸ ۔ ۷۴۹ ۔ ۷۵۰ ۔ ۷۵۱ ۔ ۷۵۲ ۔ ۷۵۳ ۔ ۷۵۴ ۔ ۷۵۵ ۔ ۷۵۶ ۔ ۷۵۷ ۔ ۷۵۸ ۔ ۷۵۹ ۔ ۷۶۰ ۔ ۷۶۱ ۔ ۷۶۲ ۔ ۷۶۳ ۔ ۷۶۴ ۔ ۷۶۵ ۔ ۷۶۶ ۔ ۷۶۷ ۔ ۷۶۸ ۔ ۷۶۹ ۔ ۷۷۰ ۔ ۷۷۱ ۔ ۷۷۲ ۔ ۷۷۳ ۔ ۷۷۴ ۔ ۷۷۵ ۔ ۷۷۶ ۔ ۷۷۷ ۔ ۷۷۸ ۔ ۷۷۹ ۔ ۷۸۰ ۔ ۷۸۱ ۔ ۷۸۲ ۔ ۷۸۳ ۔ ۷۸۴ ۔ ۷۸۵ ۔ ۷۸۶ ۔ ۷۸۷ ۔ ۷۸۸ ۔ ۷۸۹ ۔ ۷۹۰ ۔ ۷۹۱ ۔ ۷۹۲ ۔ ۷۹۳ ۔ ۷۹۴ ۔ ۷۹۵ ۔ ۷۹۶ ۔ ۷۹۷ ۔ ۷۹۸ ۔ ۷۹۹ ۔ ۸۰۰ ۔ ۸۰۱ ۔ ۸۰۲ ۔ ۸۰۳ ۔ ۸۰۴ ۔ ۸۰۵ ۔ ۸۰۶ ۔ ۸۰۷ ۔ ۸۰۸ ۔ ۸۰۹ ۔ ۸۱۰ ۔ ۸۱۱ ۔ ۸۱۲ ۔ ۸۱۳ ۔ ۸۱۴ ۔ ۸۱۵ ۔ ۸۱۶ ۔ ۸۱۷ ۔ ۸۱۸ ۔ ۸۱۹ ۔ ۸۲۰ ۔ ۸۲۱ ۔ ۸۲۲ ۔ ۸۲۳ ۔ ۸۲۴ ۔ ۸۲۵ ۔ ۸۲۶ ۔ ۸۲۷ ۔ ۸۲۸ ۔ ۸۲۹ ۔ ۸۳۰ ۔ ۸۳۱ ۔ ۸۳۲ ۔ ۸۳۳ ۔ ۸۳۴ ۔ ۸۳۵ ۔ ۸۳۶ ۔ ۸۳۷ ۔ ۸۳۸ ۔ ۸۳۹ ۔ ۸۴۰ ۔ ۸۴۱ ۔ ۸۴۲ ۔ ۸۴۳ ۔ ۸۴۴ ۔ ۸۴۵ ۔ ۸۴۶ ۔ ۸۴۷ ۔ ۸۴۸ ۔ ۸۴۹ ۔ ۸۵۰ ۔ ۸۵۱ ۔ ۸۵۲ ۔ ۸۵۳ ۔ ۸۵۴ ۔ ۸۵۵ ۔ ۸۵۶ ۔ ۸۵۷ ۔ ۸۵۸ ۔ ۸۵۹ ۔ ۸۶۰ ۔ ۸۶۱ ۔ ۸۶۲ ۔ ۸۶۳ ۔ ۸۶۴ ۔ ۸۶۵ ۔ ۸۶۶ ۔ ۸۶۷ ۔ ۸۶۸ ۔ ۸۶۹ ۔ ۸۷۰ ۔ ۸۷۱ ۔ ۸۷۲ ۔ ۸۷۳ ۔ ۸۷۴ ۔ ۸۷۵ ۔ ۸۷۶ ۔ ۸۷۷ ۔ ۸۷۸ ۔ ۸۷۹ ۔ ۸۸۰ ۔ ۸۸۱ ۔ ۸۸۲ ۔ ۸۸۳ ۔ ۸۸۴ ۔ ۸۸۵ ۔ ۸۸۶ ۔ ۸۸۷ ۔ ۸۸۸ ۔ ۸۸۹ ۔ ۸۹۰ ۔ ۸۹۱ ۔ ۸۹۲ ۔ ۸۹۳ ۔ ۸۹۴ ۔ ۸۹۵ ۔ ۸۹۶ ۔ ۸۹۷ ۔ ۸۹۸ ۔ ۸۹۹ ۔ ۹۰۰ ۔ ۹۰۱ ۔ ۹۰۲ ۔ ۹۰۳ ۔ ۹۰۴ ۔ ۹۰۵ ۔ ۹۰۶ ۔ ۹۰۷ ۔ ۹۰۸ ۔ ۹۰۹ ۔ ۹۱۰ ۔ ۹۱۱ ۔ ۹۱۲ ۔ ۹۱۳ ۔ ۹۱۴ ۔ ۹۱۵ ۔ ۹۱۶ ۔ ۹۱۷ ۔ ۹۱۸ ۔ ۹۱۹ ۔ ۹۲۰ ۔ ۹۲۱ ۔ ۹۲۲ ۔ ۹۲۳ ۔ ۹۲۴ ۔ ۹۲۵ ۔ ۹۲۶ ۔ ۹۲۷ ۔ ۹۲۸ ۔ ۹۲۹ ۔ ۹۳۰ ۔ ۹۳۱ ۔ ۹۳۲ ۔ ۹۳۳ ۔ ۹۳۴ ۔ ۹۳۵ ۔ ۹۳۶ ۔ ۹۳۷ ۔ ۹۳۸ ۔ ۹۳۹ ۔ ۹۴۰ ۔ ۹۴۱ ۔ ۹۴۲ ۔ ۹۴۳ ۔ ۹۴۴ ۔ ۹۴۵ ۔ ۹۴۶ ۔ ۹۴۷ ۔ ۹۴۸ ۔ ۹۴۹ ۔ ۹۵۰ ۔ ۹۵۱ ۔ ۹۵۲ ۔ ۹۵۳ ۔ ۹۵۴ ۔ ۹۵۵ ۔ ۹۵۶ ۔ ۹۵۷ ۔ ۹۵۸ ۔ ۹۵۹ ۔ ۹۶۰ ۔ ۹۶۱ ۔ ۹۶۲ ۔ ۹۶۳ ۔ ۹۶۴ ۔ ۹۶۵ ۔ ۹۶۶ ۔ ۹۶۷ ۔ ۹۶۸ ۔ ۹۶۹ ۔ ۹۷۰ ۔ ۹۷۱ ۔ ۹۷۲ ۔ ۹۷۳ ۔ ۹۷۴ ۔ ۹۷۵ ۔ ۹۷۶ ۔ ۹۷۷ ۔ ۹۷۸ ۔ ۹۷۹ ۔ ۹۸۰ ۔ ۹۸۱ ۔ ۹۸۲ ۔ ۹۸۳ ۔ ۹۸۴ ۔ ۹۸۵ ۔ ۹۸۶ ۔ ۹۸۷ ۔ ۹۸۸ ۔ ۹۸۹ ۔ ۹۹۰ ۔ ۹۹۱ ۔ ۹۹۲ ۔ ۹۹۳ ۔ ۹۹۴ ۔ ۹۹۵ ۔ ۹۹۶ ۔ ۹۹۷ ۔ ۹۹۸ ۔ ۹۹۹ ۔ ۱۰۰۰

شعلہ و شبنم کے دسمبر ۲۶ء نمبر میں مولانا ناطق صاحب نے ایک شعر

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

پر اظہار خیال فرمایا۔ اس شعر کے معنی نیاز صاحب فتح پوری بہ نگاہ سے دریافت کئے گئے تھے اور انھوں نے جو معنی لکھے اس سے غمزۂ غماز کے معنی ہر صورت "محبوب" کے نہ نکلتے تھے اور ظاہر ہے کہ غمزۂ غماز کے معنی محبوب کے نہیں ہیں۔ خطاب غمزہ سے ہے۔ محبوب سے نہیں۔ نیاز صاحب نے بہت سے قاعدہ زبان کا داؤں پیچ استعمال کرکے خیالات سائل کو منتشر کرنا چاہا ہے۔ مگر بات دبتی نکلی ہے کہ غمزۂ غماز کے معنی محبوب کے ہو جاتے ہیں۔

مولانا ناطق صاحب نے ان معانی کی بڑی دلیلوں سے تردید کی ہے اور آخر میں اس شعر کے صحیح معنی بتائے ہیں جس میں غمزہ ہی مخاطب رہتا ہے اور مطلب میں وضاحت صفائی پیدا ہو کر بات قریب قیاس ہو جاتی ہے اور شعر کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مولانا حضرت نیاز کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

میں اخیر میں حضرت نیاز سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اب تو آپ کو ہندوستان کا "پوم بھوشن" کا گراں مایہ خطاب عطا فرما دیا ہے جس کے معنی تو میرے پتے نہیں پڑے۔ لیکن ایسا خیال ضرور کرتا ہوں کہ یہ "بحر العلوم" یا "قیما ساگر" کا ہم معنی خطاب ہوگا۔ تو میرے خیال کے مطابق اب آپ گورنمنٹ برائے ہندوستان یا ساگر ہو گئے ہیں۔ اب تو ذرا اپنی حیثیت کا خیال کیجئے۔

اس مضمون کو پڑھ کر جناب ظفر ہاشمی نے مدیر کو خط لکھا ہے جناب ان کی فرمائش پر یا خود عوبنی بن جین نے فروری ۲۷ء کے شعلہ و شبنم میں چھاپ دیا ہے جو میرے خیال سے نہ چھاپنا چاہئے تھا۔ ایڈیٹر ہزاروں انسانوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مختلف الخیال لوگ مختلف اور متضاد خیالات کا

حرفِ اول

قمر احسنی گھنوری

اظہار کرتے ہیں کیا ضروری ہے کہ ہر خیال کی اشاعت کرکے فساد کھڑا کیا جائے اور اس طرح رسالہ کے صفحات کو میدان جنگ بنا دیا جائے۔

ظفر صاحب مولانا پر آزادانہ دلائے زنی فرماتے ہوئے اور نیاز صاحب کی حمایت کے جذبات کو عیاں کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

مولانا کے مضمون کا آخری جملہ نہایت پست ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ پوم بھوشن ہمارے ملک کا نایاب[1] خطاب ہے۔ ایک ایسا خطاب جس کی عزت کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے اس کا مذاق اڑا کر مولانا نے صرف علامہ (نیاز) کی ذاتیات پر حملہ نہیں کیا، بلکہ پورے ملک کی توہین کی ہے اور آخر میں ادارہ کو بھی برا بتایا ہے۔

ہمارے ظفر صاحب، نیاز صاحب سے بے حد متاثر ہیں۔ مگر حضرت ناطق نے بھی نیاز صاحب کی قابلیت کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ یہ میری کم نظری کہہ لیجئے کہ مجھے کہیں نیاز صاحب کی ذات پر پورے مضمون میں کوئی حملہ نظر نہیں آیا، سوا اس کے کہ وہ قابل ہوتے ہوئے پروفیسر کی حمایت کرتے ہیں تو یہ ساغر کی بات کہہ دینا ذاتیات پر حملہ کرنے کا تو مرادف نہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ نیاز صاحب ایک تیز فہم انسان ضرور ہیں اور زمانہ سے نرالی بات کہنے کی انھیں خوب مشق ہے۔ تاکہ دنیا ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ان کی معلومات بھی بری نہیں، مگر یہ کہ وہ فرشتہ ہیں، نہ خدائے کلام ہیں، خدائے سخن ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوتی۔ تو جی ظفر صاحب کو بتانا ہوں کہ وہ فرشتہ نہیں، نہ خدائے کلام ہیں نہ خدائے سخن ہیں ان سے ہزاروں غلطیاں ہوئی ہیں زمانہ کی بے جا قدر دانی نے انھیں بے حد مغرور کر دیا ہے۔ ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔

ظفر صاحب نے پست ذہنیت کا الزام لگا کر مولانا ناطق کا کچھ نہیں بگاڑا، کچھ اپنے الفاظ و کلام پر ضرور لوگوں کو متوجہ کر لیا۔ سلیقہ سے بات کرنا، بڑے چھوٹے کے آداب کو ملحوظ رکھنا شریفوں کا دستور ہے اس کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔

ظفر صاحب نے پدم بھوشن کی توہین کرکے ادارے کو نایاب بتا کر مولانا پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے خطاب کا مذاق اڑایا اور یہ کڑی بھی جوڑ دی ہے کہ انھوں نے پورے ملک کی توہین کی ہے۔

سبحان اللہ ظفر صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں۔ آپ نے فی البدیہہ بات اڑا دی کہ قومی خطاب کا مذاق اڑانے والا پورے ملک کی توہین کرنے والا ملک کا دشمن اور حکومت کا غدار ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو اسے فوراً ملک سے نکال دیا جائے یا گولی سے اڑا دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور اس سزا کو دیکھ کر کوئی ملک دشمنی اور حکومت سے بغاوت کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

میں ظفر صاحب سے دیانت کرتا ہوں کہ وہ پدم بھوشن کی توہین یا مذاق اڑانا ناطق کے مضمون میں ثابت کریں۔ کیا یہ کہنا کہ میں پدم بھوشن کے معنی نہیں جانتا مگر قیاس یہ ہے کہ یہ بحر العلوم یا قیما ساگر کے جوڑ کا خطاب ہے پدم بھوشن کی توہین ہو گئی؟ ایسی افسانہ طرازی سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ناطق کو تو نیاز صاحب سے دشمنی نہیں وہ ہم عصری اور استادی سے ایک دوسرے پر تنقید کا حق رکھتے ہیں۔ مگر ظفر صاحب کو ناطق صاحب

باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمائیے

[1] شاید ظفر صاحب نایاب کے معنی قیمتی سمجھتے ہیں۔ قمر احسنی

محمد یونس ابراہیم

مولانا ناطق گلاوٹھی اور ان کا فن

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ پوچھا ہے
بندہ پرور ہی تم نے نہیں جانی مری

آپ کا نام ابوالحسن اور تخلص ناطق ہے۔ والد صاحب امام گرامی نجم الدین حسن تھا۔ وطن مالوف قصبہ گلاوٹھی ضلع میرٹھ ہے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو شہر سکاسٹی میں جو ناگپور سے ۹ میل ہے پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کو بھی ذوق سخن تھا۔ شعر و نظم کہہ کر جمع کرنے کے عادی نہ تھے۔ زمانۂ تعلیم وطن مالوف میں گزرا۔ اور دار العلوم دیوبند سے علوم درسیہ کی سند حاصل کی۔ آپ کے زمانہ کے اساتذہ شیخ الہند مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حسن الرسول بلند شہری اور مولانا ماجد علی صاحب جون پوری تھے اور اس وقت کے طلبہ میں مولانا انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ انگریزی کہیں پڑھی نہیں۔ مگر ضرورت زمانہ نے یہ زبان بھی سکھائی۔ آپ اس زبان میں بھی اچھی طرح مقصد پر روشنی ڈال لیتے ہیں۔

آپ نے بہت ہی کم عمری میں حضرت اظہر بارہ بنکوی جو کہ آپ کی زوجہ محترمہ کے خالہ زاد بھائی ہیں اور بہت بڑے صاحب تحقیق اور اہل فن شاعر ہیں اور جن کو آپ بڑی عزت کرتے ہیں کی تحریک پر شاعری کی ابتدا کی۔ اول اول آپ نے حضرت بیان میرٹھی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو قصبۂ جاورچہ کے رہنے والے تھے اور اس زمانہ کے بہترین مکمل ہمہ گیر فاضل اور اہل فن شاعر اور استاد سمجھے جاتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے کچھ استفادہ نہ کر سکے کہ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا آپ نے خود ہی مشق سخن کرنی شروع کی۔ اس سلسلہ میں آپ نے منیر شکوہ آبادی کو خوب دیکھا۔ داغ دہلوی کی طرف نظر اٹھی کہ اس زمانہ میں ان کا طوطی بول رہا تھا اور ان کی شخصیت اہل دلی اور داغ دہلی کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ آپ کو پہلے ان کے دواوین دیکھنے کا خیال ہوا۔ یادگار سے دو دیوان "گلزار داغ" "آفتاب داغ" مہر بکٹ جس میں بکمال خوبی بیان و صفائی و صرفگی عبارت بلکہ "آفتاب داغ" اس قدر پر۔

آپ کا کہنا ہے اسے بغور پڑھا۔ بار بار پڑھا، بہت غور سے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ اس وقت آپ کو پورا دیوان حفظ ہو گیا تھا۔ اس نے آپ کی شاعری پر اتنا اثر کیا کہ آپ کی شاعری اسی طرز بیان پر چل پڑی۔ آپ نے ۱۹۰۹ء میں اپنے والد صاحب کے مشورہ سے بذریعہ خط و کتابت داغ کا تلمذ اختیار کیا۔ مگر تین چار سے زیادہ غزلوں پر اصلاح نہیں لی۔ کیوں کہ ان اصلاحوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کو اصلاح سے زیادہ اپنے کلام پر خود کہتے وقت اور کہنے کے بعد غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بس یہی ہے آپ کی شاعری کا سارا سرمایہ۔ لیکن آپ نے اپنے آپ کو داغ کا شاگرد کہنا وجۂ ناز سمجھا کہ دہلی کے قدیم خانوادۂ سخن سے نسبت ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کا بلا واسطہ استاد "آفتاب داغ" ہے اور بالواسطہ داغ دہلوی۔

ابتدائے شاعری میں آپکا ماحول بہت نہ سخن تھا۔ کبھی کبھار شعر سننے کی چوری تھی کہ زہد و علم فضل اجداد اقربا آپ کے ہر اس شعر کا جو وہ سن پاتے تھے ذاق اڑاتے اس ثقاہت فضل ماحول سے ڈرتے ہوئے آپ نے ہمیشہ سوقیت وغیرہ سے اجتناب کیا۔ وصل فراق اور ہر قسم بازی کی شاعری سے آپ شروع ہی سے مجتنب رہے۔ تفرق رقیب کی بے جا ئی، حرم وغیرہ کے مضامین کو اپنی شاعری میں سب سے پہلے آپ ہی نے ترک کیا۔ گل و بلبل، پروانہ شمع و بیان زلف وغیرہ سے آپ نے ہمیشہ احتیاط کی ہے

رکھا ہے۔ جس وحشی کا بیان بھی عرصہ دراز سے آپ کی شاعری میں بہت کم ہے۔ آپ نے کوئی مضمون بغیر کسی خاص جدت کے کبھی نظم نہیں کیا۔ آپ کلام کہتے وقت خوب دیکھ بھال کر کہتے ہیں۔ تکمیل مضمون کے وقت جس شعر کو ذرا بھی کسی چول میں ڈھیلا بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں اسے نکال دیتے ہیں۔ بعض لوگ آپ کو مقاصد پسند شاعر کہتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ مقاصد کی ایسی بات ہے جس کا نام جدید شاعروں نے اوقافانہ شاعری رکھ چھوڑا ہے اور آپ کے تغزل میں نہیں۔ میں تو یہ بات بیانگ دہل کہوں گا۔ کہ کوئی گل پھینکا نہیں کلام حاضر ہے صاحب ذوق خود ہی اندازہ لگا لیں گے اور میری تائید کریں گے کہ آپ اس دور میں صحیح معنوں میں شہنشاہ تغزل ہیں۔ آج آپ کا ہم پایہ شاعر اردو زبان میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ "آپ نے اردو شاعری میں صنعات کو سب سے زیادہ نظم کیا کہ اس میں استاد ذوق کے سوا اور کوئی آپ کا ہم پایہ تھا، نہیں اور صفائی روانی بیان کے آپ تنہا ملک میں کسا، دور زبان اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ آپ نے غائب کا مشکل رنگ بھی لکھا ہے۔ موقعہ کا بھی اور ہر قسم کا بھی اصاب اپنے رنگ میں بھی زبان و فن کی پابندی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آپ نے اپنی پسند اور طبیعت سے ہمیشہ استفادہ کیا اور جنہیں آپ نے کیا انہیں چھوڑ دیا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے اور ہر اچھا گھسنے والے پر حرف رکھتے ہیں۔ بالکل غلط اور بے بنیاد الزام ہے کہ آپ کبھی کسی پر بے جا یا خواہ مخواہ تنقید نہیں کی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر کسی نے آپ کے اُستاد پر یا: ساتذۂ دہلی کا مذاق اُڑایا تو اس کے خلاف آپ نے ضرور قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہوا کہ جب امیر مینائی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب اپنے اُستاد کی مدح سرائی پر آتے تو داغ کے کلام کو ان کے اشعار سے تقابل کرتے اور داغ میں خود ساختہ عیب بتا کر امیر کا تفوق جتاتے اور داغ کو بازاری شاعر اور ان کے کلام کو مخرب اخلاق کہتے جو کہ دنیا سے خلاف واقعہ استدلال ہے۔ لیکن اہل داغ ان کے مضامین کا بھی جواب نہ دیتے کہ اس سے کیا حاصل۔ اسی سلسلہ میں ثاقب تھا نے جو امیر کے سربرآوردہ شاگردوں میں تھے اُستاد کے مناقب کو جو شائع کیا تو اس کتابچہ کے موضوع سے باہر نکل کر امیر نے داغ کا تقابل کر ڈالا۔ جس میں جی بھر کر داغ کی تنقیص کی۔ لہٰذا آپ نے اہل داغ کے بار بار اصرار کرنے پر قلم اٹھایا اور جواب لکھا کہ اہل امیر کا پچیس سال سے چڑھا ہوا بھوت اُتار دیا اور امیر کی تحسین اور داغ کی تنقیص کی قسم کھا کر پیدا ہونے والے منہ ہی بدل ڈالے۔ یہ بہت ہی طویل سرصفحے کا مضمون ہے جس کو آپ نے "جواب ثاقب" کے نام سے شائع کرایا۔ جس میں امیر کی شاعری پر سرسری سے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ پھر اس کے بعد کسی اہل امیر کو جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسرا واقعہ بیگانہ چنگیزی کا ہے جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں جب بیگانہ نے خواجہ آتش کی اتنا تعریف کی کہ اس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا اور "خدائے سخن" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُردو کی بایہ ناز ہستیوں کے ساتھ تقابل کر کے اس کا تفوق جتایا اور یہاں تک لکھ بیٹھے کہ جس بات کی شاعری میں ضرورت ہے وہ آتش اور میر کے برابر کسی کو حاصل نہیں ہوئی" آگے چل کر لکھتے ہیں "آتش کے کلام میں جو پاکیزگی ہے وہ میر کے یہاں نہیں۔ اُردو میں عرفان و حقیقت کے رنگ کو پرورۂ مجاز میں آتش نے جس خوبی سے دکھایا ہے آمیزش کے یہاں بھی اس خوبی کے ساتھ دکھائی نہیں دیتا" پھر اس کے بعد اسد اللہ غالب کا بھی قرب مذاق اُڑایا۔ غالب پر اعتراضات کئے اور ان کے خود ساختہ و مشکل مضامین پر حرف رکھا اور ان کے مقابلہ میں خواجہ آتش کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ آتش کے کچھ ایسے شعر بھی لکھے تھے جو بیگانہ کے نزدیک بہت بلند پایہ تھے۔ چنانچہ آپ نے حکیم ابوالحاسن صاحب مدیر "خیال" پاپوڑ کے بار بار لکھنے پر بیگانہ چنگیزی کے خلاف قلم اٹھایا۔ جو اعتراضات خالی کئے گئے تھے ان کے دندان شکن نہ صرف جواب دیئے۔ بلکہ آتش کے ان اشعار پر جو بیگانہ کے نزدیک بہت بلند تھے اعتراض بھی کئے اور اصلاحیں بھی دیں اور مضامین کو بہتر کر کے دکھایا۔ اس طرح ظاہر کر دکھایا کہ بیگانہ کے پسندیدہ اشعار اصلاح کے محتاج تھے۔ یہیں آپ کی آتش کے کلام پر چند اصلاحیں پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے اور عش عش کیجئے کہ اس پر آشوب دور میں بھی ایسی اصلاحیں دینے والی ہستی بقید حیات ہے۔ خدا ایسی مغتنمات روزگار ہستیوں کو تا قیامت اور سب کے سر پر سایہ فگن رکھے۔

خواجہ آتش۔

سا تیرے کسی کا دھیان آتا ہو تو کافر ہوں
دوئی جس دل میں ہے وہ دل نہیں ہے چشم احول ہے

مولانا ناطق۔ مصرع ثانی میں خیال ہے اور مصرع اولیٰ اس کی امداد کے لئے لایا گیا ہے۔ لیکن "دوئی جس دل میں ہے وہ دل نہیں ہے چشم احول ہے" اس مضمون کے لئے جو غیروں کی ضرورت تھی۔ ان سب کو اپنی کم یا قتی کی وجہ سے شاعر پہلے مصرع میں بھر نہ کر سکا اور مصرع

"سا تیرے کسی کا دھیان آتا ہو تو کافر ہوں"

دوسرے مصرعے سے بالکل الگ رہ گیا۔ کیونکہ کافر اور چشم احول میں کوئی قابل لحاظ مناسبت نہیں ہے اس کے علاوہ مصرع ثانی میں "ہے ہے ہے" کی تکرار بھی نہایت سبک معلوم ہوتی ہے۔ اگر شعر یوں لکھ جاتا تو خیال بن جاتا "

اصلاح

کجی ہے فہم کی۔ تیرے سوا جو کچھ نظر آئے
دوئی جس دل میں ہو وہ دل نہیں ہے چشم احول ہے

اب آتش کے شعر سے مقابلہ فرمایئے اور دیکھئے کہ کچھ فرق پیدا ہوا یا نہیں۔ مصرع ثانی صحیح معنوں میں اس مصرع کا محتاج تھا۔

سا خواجہ آتش۔

یہ مجھ دیوانے کی زنجیر سے آواز آتی ہے
وہ کچھڑی میں پھنسے ہے جو ہے آب گل کے زنداں میں

مولانا ناطق۔ اس شعر کا مطلب ظاہر ہے۔ یعنی میری پابزنجیری کا باعث قید حیات ہے۔ اگر یہی نہ ہو تو وہ دیوانہ دار و گیر کہاں سے آتے۔ اب دھل کا زنداں اور کچھڑی میں پھنسنا اچھی مناسبت ہے لیکن اب بھی یہ مصرع اولیٰ کی صرف زنجیر کو قبول کرتا ہے۔ اس کی آواز نہیں بن سکتا آتش کو دوسرا مصرع اور اس کے الفاظ بہت اچھے مل گئے تھے۔ مگر عدم قابلیت کی بدولت اس کے ساتھ انصاف نہ جوڑ اچھا نہ لا۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا۔

اصلاح

سبب پابندیٔ رخ خال کا قید ہستی ہیں
وہ کچھڑی میں پھنسے ہے جو ہے آب گل کے زنداں میں

اب خیال کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں اور شعر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا۔

سا خواجہ آتش

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

مولانا ناطق ــــ "نہ پوچھ حال مرا" ایک محاورہ ہے جو وسط یا آخر کلام میں آتا تو حشو کی جگہ کو بھی بھر تا اور خوبی بھی پیدا کرتا لیکن ابتدائے کلام میں یہ فقرہ اکھڑ رکھا ہوا ہے۔ جس سے شعر بھدا معلوم ہوتا ہے۔ بے شک مصرع ثانی میں ایک خوبی ہے۔ لیکن شاعر وجہ اپنی کم استعدادی کے نباہ نہ سکا۔ یہاں یوں اصلاح کی جا سکتی ہے۔

اصلاح ؎

میں بخت سوختہ وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگے نہ آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اس کو کہتے ہیں اصلاح۔

۲ خواجہ آتش

قید عفت میں ہے وہ معشوق، عاشق جاں بلب
ترجمہ میں ہیں عیسیٰ دامن مریم میں ہے

دوسرا مصرع نہایت اچھا ہے اور پہلا مصرع شاعر نے اپنی بساط سے اچھا کہنے کی کوشش کی ہے۔ عیسیٰ، قید عفت۔ دامن مریم اور بیمار اچھی مناسبتیں ہیں۔ لیکن "معشوق، عاشق جاں بلب" نہایت بھونڈا مصرع معلوم ہوتا ہے۔ شاعر اتنی ہی لیاقت بھی رکھتا ہے کیا کہے۔ ورنہ اگر یوں ہوتا تو نہایت اچھا معلوم ہوتا۔

اصلاح ؎

وہ ادھر بند عفت اور ادھر ہیں جاں بلب
ترجمہ میں ہیں عیسیٰ دامن مریم میں ہے

اب شعر زمین سے آسمان پر پہنچ گیا۔ اصلاح نہیں اجتہاد ہے۔

اب کیا ہوتا۔ لکھنؤ کے قیام میں یگانہ آپ سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "حضرت قبلہ غالب کو میں کب نہیں مانتا۔ مگر یہ معاملہ غالب کا نہیں۔ مجھے تو قتیل اور حزیں سے نسبت ہے، جو بہت چڑ کر بھی چڑھی باتیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ غالب کے بہت دنوں سے دشمن ہیں اور ان پر شیطان غالب ہے تو میں ان کا بھوت اتار رہا ہوں۔ اس معاملہ میں کچھ نہ کہئے۔"

اب ناظرین خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت ناطق نے جواب دے کر کون سا ظلم کیا، جس کی پاداش میں آپ پر کسی کو خاطر میں نہ لانے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ جگر مراد آبادی نے اپنی کسی تصنیف میں یہ لکھا ہے

"ناطق میں اگر بے رحمی کے ساتھ تنقید کرنے کی عادت نہ ہوتی تو ان کی سبھی بہت مقبول ہوتی۔" غور طلب ہے ایک یہ کہ جگر صاحب آپ کی ادبی و فنی صلاحیت کے معترف ہیں اور ساتھ ساتھ آپ کی تنقیدی صلاحیت کے بھی کہ اس بے رحمی کے ساتھ تنقید کرنے والے کے قلم میں اس حضب کی قوت تحریر ہے کہ جگر صاحب بھی فکر لینے کے بعد مندرجہ بالا عبارت لکھ کر سپرد ڈال دی

تو آیئے جگر صاحب کا واقعہ سنائیں۔ ہوا یہ کہ جب رئیس المتغزلین جگر مراد آبادی صاحب کا مجموعہ غزلیات "شعلۂ طور" کے نام سے شائع ہوا تو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کو اپنے مقدس نام کے ساتھ خرافات مجاز پر مقدمہ لکھنا آپ کو ناگوار ہوا۔ مگر اس پر لکھنے کا خیال نہیں آ سکتا تھا کہ مولانا کی طرف سے رسالہ آ گیا، جس میں اس مجموعہ والی ایک غزل "خدا بھی ہے اور یوں بھی" کے معنی دریافت کئے تو جگر صاحب کے اشعار پر تو تمسخرانہ ہی جواب دیا۔ مگر مولانا سلیمان کے متعلق آپ نے لکھا کہ "آپ نے کتاب کے نام کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں لغویت کا ذرہ بھر حامی شاعر نہیں ہو سکتا۔ عالم مقدمہ نگار ہی ہو گا کہ مولانا ندوی کے فتوے سے ایک بدوی کی خرافاتی کتاب کا نام "شعلۂ طور" رکھا گیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور بحمد اللہ آپ بھی اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ندوی بھی مسلمان ہیں تو پوچھنا یہ ہے کہ عقائد اسلام کے مطابق شعلۂ طور کیا ہے اور یہ نام کس شاعر مجاز کے دیوان کار کھا جا سکتا ہے کیا؟ شعلۂ طور ہے جلوۂ نور یا تجلی والے جس کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا۔ اور جب شعلۂ طور تجلی ذات ہے تو میں آپ سے اور مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ میرے کلمات میں اپنی ہستی کا مدعا اللہ پیٹ کر یوں کہنے اور یوں بھی ہے بتایا گیا ہے اس کا نام تجلی ذات باری رکھنا جائز ہو گا کیا؟ اور اس میں اگر ترجیح ہو سکتی ہے تو مولانا ندوی ضرور روشنی ڈالیں اور اگر یہ راستہ نکل ہی جائے تو تو بھر "رب ارنی" وغیرہ نام رکھنے میں بھی کیا ہرج ہو گا ــــ چلتے چلتے جگر صاحب کی غزل "یوں بھی ہے اور یوں بھی" کا ایک شعر سنا جائیں ؎

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں ایک مقصد میری ہستی کا
بتا دیں کیا کہ میرا مدعا یوں بھی ہے اور یوں بھی

اب اسی قافیہ پر مولانا کا ایک مطلع سنئے ؎

مصیبت دے کہ راحت دے یہ ایسا بھی ہے اور ویسا بھی
بُت کافر ہمارا مدعا یوں بھی ہے اور یوں بھی

اسی زمین میں حضرت سائل دہلوی کا ایک شعر سنئے، اور لطف اٹھائیے ؎

ادھر مسجد ادھر بت خانہ کہئے اس کو کیا سمجھیں
جناب شیخ کے نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہاں ایک واقعہ یاد آیا جس کو لکھ دینا ایک ادبی بات ہو گی وہ یہ کہ جب حضرت فانی بدایونی نے یہ غزل لکھی اور بہت مشہور ہوئی ؎

نالِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
یہ شرک اچھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

تو اس پر لکھنؤ کا بڑے بڑے شعراء کو بھی خیال ہوا چنانچہ حضرت ریاض خیرآبادی نے بھی غزل لکھی جو رسالہ "ادبی دنیا" گورکھپور میں شائع ہوئی۔ آپ حضرت ریاض کے معترف کمال ہیں اور ان کی جو غزل نظر آئی۔ آپ نے ہمیشہ فرد سے پڑھا ہے۔ اس لئے اسے بھی دیکھا تو بعض ردیفوں کا استعمال خلط نظر آیا۔ اس کے بعد فانی کے اشعار پر غور کیا تو وہاں بھی یہی بات تھا۔ اسی وقت آپ کے پاس ایک شاگرد صاحب بیٹھے تھے۔ ان سے کہا کہ "دیکھتے جاؤ"

لا دیکھو، یا "دیکھ لو" کے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتا اس کے لیے یا تو فضل بعد فضل کی ضرورت ہے یا اقترانی فضل کی۔ اس لئے جس شعر کے بیان میں ان دونوں میں سے کوئی بات نہ ہوگی وہاں ردیف غلط ہو جائے گی" اور ریاض دفانی کے ایسے اشعار انھیں بتا دیئے۔ یہ صاحب تھے ہوشیار رسالے اور ایک مضمون لکھ کر رسالہ ایوان اگور کھپور میں شائع کرا دیا۔ جسے حضرت ریاض مرحوم نے پڑھا اور وہ رسالہ لے کر مولانا آکاہ مرحوم کے پاس پہنچے۔ بڑی کی بات یہ ہے کہ غلطی کا اعتراف کیا اور مولانا آکاہ سے فرمایا کہ "مولانا ناطق کے سوا سارے ملک میں یہ اعتراض کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر انھیں چاہیے تھا کہ مجھے یا آپ کو نجی طور پر لکھ دیتے۔" اب اس زمین میں مولانا ناطق غلطنہ کے دو اشعار سنیئے۔

صدر ہر سے اے رہروان منزل پیری
کہیں شاید نظر آئے جوانی دیکھتے جاؤ
ہمارے بعد جو دنیا کہے گی وہ بھی سن لینا
ابھی تو تم ہماری یاد دانی دیکھتے جاؤ

ایک ادبی و لسانی تنقید کے علاوہ نہایت پُر از معلومات علمی و تاریخی واقعہ لکھتا ہوں۔ جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری نے غالب کا دیوان اور مقدس وید کو الہامی کتابوں کے نام سے یاد کیا تو آپ نے اس کی تردید اس طرح کی "ڈاکٹر بجنوری صاحب نے تو غالب کے دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہہ دیا۔ خدا جانے الہام کے معنی وہ کیا لیتے ہیں۔ دوسری جہاں کی الہامی کتاب انھوں نے وید مقدس کو بتایا ہے جو ویدک مذہب والے عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ ویدیا سی طرح ہندوستان میں لائے جس طرح قرآن مجید۔ انھیں آریوں نے وہیں جمع کر لیا تھا جہاں سے ہندوستان میں آئے ہیں۔ بلکہ ان کے عقیدے کے مطابق وید ان کی تخلیق و تدوین آفرینش کے ساتھ ہے۔ ہندوستان کی الہامی کتاب یہ کیوں کر ہو جائے گی۔ اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ ہندوستان میں جو کتابیں ہیں ان میں الہامی صرف وید ہیں تو قرآن مجید سے انکار ہو گیا۔ حقیقت میں غالب غالب ہے اور اس کا کلام بہت زیادہ قابل وقعت ہے۔ مگر شعر کو شعر کی طرح دیکھئے آسمانی کتاب مان کر کسی کا کلام نہ ملاحظہ کیجئے۔"

میں انہی چند واقعات کو لکھ کر مضمون ختم کر تا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے تبحر علمی کے مقابلہ میں یہ مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہے۔

مولانا ناطق کی شعری قابلیت پر میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کہ سورج کو چراغ دکھانا ہوگا۔ آپ کے کلام پر تبصرہ کرنا بھی نہیں چاہتا کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ میں صرف آپ کے کچھ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔ ان جواہر پاروں میں جسے جو پسند آئے اپنے دل کے خانے میں نصب کر لے۔ کہوں کہ میں اس کا قائل ہوں کہ شعر وہ ہے جو خود خیال کو اپنی طرف رجوع کر لے نہ کہ کہا جائے کہ شعر اچھا ہے۔ آپ اس کو پسند کریں۔ ان میں آپ کو غالب کا رنگ، مومن کا تغزل، میر تقی میر کا سوز و گداز سب ہی ملے گا۔ پھر خود آپ کا اپنا رنگ زبان و بیان کی پابندی کے ساتھ نمایاں ملے گا۔

ان شعروں کو دیکھئے، سمجھئے، پرکھئے۔ پھر اگر پسند آئیں تو ذہن میں بٹھا لیجئے، جو یقیناً اس قابل ہیں۔

پست ہمت نہ کہیں دیدۂ گریاں ہونا
اب بہت دور نہیں گھر سے بیاباں ہونا
تر تو جا مونس غم۔ فکر دل زار نہ کر
میرے اللہ کو آتا ہے نگہباں ہونا
مجھ پہ اتنا تو کرم گردش دوراں ہوتا
یہ تو ہوتا کہ کہیں بیٹھ کے گریاں ہوتا
جس کی حسرت تھی اُسے پا لیا پھر کھو بھی چکے
اب کسی چیز کا ہم کو نہیں ارماں ہوتا

اس کی دین ہے فریاد نہ افغاں کرنا
قبول ہو کہ نہ ہو اب دعا نہیں کرتا
مے مراد ہماری مگر ملے بھی کہیں
خدا کرے مگر ایسا خدا نہیں کرتا
میں کہوں کیا، کوئی کہنے نہیں دیتا مجھ کو
آپ سن لیجئے کیا کہتی ہے دنیا مجھ کو
جو تھی ادھر ہو تھی ادھر تو کہاں ہیں سب مرے ہم نفس
دم بھر میں نے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے
یہ مے پرستی کی آخریں بھی تو گزر ہی جائے گی
دو دن کے لئے میں کس سے کہوں آسان مرا مشکل کرے
نظر آتا ہے کیا، میں کیا کہوں اشکال ہستی میں
کوئی دیکھی ہوئی صورت ہے پہچانی نہیں جاتی
یا دنیا ہم پہ ہنستی تھی یا ہم ہنستے تھے دنیا پہ
جب ہم رو بیٹھے دنیا کو تو دنیا ہم کو روتی ہے
یہ زندگی ہی ناطق آزار زندگی ہے
میں خار پیرہن ہوں خود اپنے پیرہن میں
یاد کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق
پہلے وہ بھول تو جاؤں جو فراموش نہیں
فردوس کو احباب کی محفل تو بنا دو
پہلی سی کھوئی ہوئی دنیا مجھے لا دو
اے بادہ کش گئی ہے مئے عیش کس کے ساتھ
ہر اک نے لے کے جام کو آگے بڑھا دیا
ناز اُدھر دل کو آنا لینے کی گھاتوں میں رہا
میں اِدھر چشم سخن گو تری باتوں میں رہا
کچھ دلے وہ، سنتے تھا میں
ایک بھی آتا دوسرا نہ ہوا
اب کہاں گفتگو محبت کی
ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا
غم کی دنیا ہے خاطبہ ناطق
داد دے کیسی خدا دخدا

(باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

شاردا ، چھوٹی بہن اور سسرال بنانے والے

پرساد پروڈکشنز مدراس کا ایک اور عظیم گھریلو شاہکار

ہمراہی

پروڈیوسر
پرشاد

ڈائرکشن
ٹی۔ پرکاش راؤ

موسیقی
شنکر جے کشن

گیت
شیلندر۔ حسرت

راجندر کمار، جمنا، محمود

شوبھا کھوٹے۔ ششی کلا۔ آغا۔ للتا پوار۔ نذیر حسین، دھمل، راجندر ناتھ وغیرہ

عظیم الشان افتتاح

شکر وار ۲۲ فروری

ویسٹ اینڈ

ایراس

ناولٹی

ریگل

راج شری پکچرز پرائیویٹ لمیٹڈ ریلیز

اپنی محفل اپنے دوست

مجلہ ہذا

گرامی بل بھین صاحب آداب نیاز

زیر نظر شمارہ میں "اپنی محفل اپنے دوست" کے تحت ظفر بانی صاحب کا خط بنام ایڈیٹر شعلہ و شبنم نظر سے گزرا۔ ظفر بانی صاحب نے مومن کے شعر کو ایک عام فہم شعر کہہ کر اس پر اپنی دانست میں تنقید کی ہے۔ جب کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ ہر تنقید نگار اپنے انداز سے مطلب بیان کرتا ہے تو حضرت مولانا ناطق گلاوٹھوی نے اپنے انداز سے مطلب بیان کر کے کون سا گناہ کیا۔ اور اگر مولانا کی تنقید میں نقائص تھے تو اس کی صفائی کرتے ہوئے ظفر بانی صاحب نے شعر بھیجنے کی فرمائش کیوں نہیں فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظفر صاحب کو مولانا ناطق صاحب سے ذاتی عناد ہے ورنہ وہ ایسی تنقید کرتے ہوئے ادب کو ملحوظ رکھتے۔

میری دانست میں حضرت مولانا نے نہ تو "پدم بھوشن" خطاب کا مذاق اڑایا ہے اور نہ ہی ذاتیات پر حملہ کیا ہے بلکہ علامہ نیاز صاحب کی ایک انسانی کمزوری کی طرف اشارا کیا ہے۔ جس کی صفائی مضمون کے شروع میں ہی کر دی گئی ہے شاید قوی دفاع کا خیال صرف ظفر صاحب کو ہی ہے کہ آپ پر الزام عائد کر دیا کہ آپ نے ذاتی حسد و کینہ والی باتوں کو ہم میں جگہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر بانی صاحب کو مولانا ناطق صاحب سے ذاتی حسد و کینہ ہے اس لئے انھوں نے بلا وجہ مولانا کے خلاف کیچڑ اچھالا ہے

علامہ نیاز نے ہندوستانی اعزازی خطاب کی جس طرح توہین کی ہے وہ ایک کھلا راز ہے۔

ضمناً — رؤف پرویز

بھوپال

بل بھائی! اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے نوجوان فن کاروں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے اور انھیں ادب و ادب سے روشناس کرایا ہے یہ آپ اچھے معیاری رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ کچھ کا تو خاص مقام کہ ادب میں بن گیا ہے۔ مثال کے لئے صابر شاہ آبادی کو ہی لے لیجئے۔ یہ وہی صابر شاہ آبادی ہیں جو آج سے تین چار سال پیشتر "جلال و جمال" کے کالم میں چھپتے تھے۔ لیکن کتنا ایک اچھے معیاری رسائل نگار سمجھے جاتے ہیں اور "نگار" "شاعر" اور "آج کل" جیسے معیاری رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ یہ سب آپ کی فراخدلی نہیں ہے تو کیا ہے؟

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خلوص کار — شفق بھوپالی

بھوپال۔

بل بھائی! آداب خلوص

میرے مضمون "ہزار سنگھ طالب" کی اشاعت کا بہت بہت شکریہ! میں دراصل کچھ ماہ سے سخت بیمار میں تھا۔ اس لئے آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ پھر بھی معذرت خواہ ہوں۔ آپ تو مجھے بالکل ہی بھول گئے ہیں۔ اب تو شفا صاحب کے خطوط تک میں میرا تذکرہ نہیں ہوتا خیر آپ بھول جائیے۔ مگر میں آپ کو اور اس مشاعرہ و شبنم کو جس نے مجھے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا اور اس قابل بنایا کہ میں ہندو پاک کے تیس پینتیس پرچے اعزازی حاصل کر سکوں۔ زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

آپ کا — واحد پریمی

شکوہ آباد

مکرم بندہ ایڈیٹر صاحب ماہنامہ شعلہ و شبنم

آپکا ارسال کردہ شمارہ ملا۔ ہند کے اکثر پرچے میری نظر سے گزرتے ہیں۔ جو جانشی اس پرچہ میں پایا ہوں وہ دوسرے میں نہیں۔ چاہے لوگ اسے یک طرفہ ڈگری ہی سمجھیں لیکن مجھے ان کا منہ نہیں دیکھنا ہے۔ کیوں کہ میری آنکھ حقیقت سے آشنا ہے۔

مہربانی فرما کر ٹوکن کی بچی جگہ مقرر فرمائی جائے کہ توہین نوازش ہو۔

صدیق شبنم

(بقیہ حرف اول صفحہ ۳ سے آگے)

سے ضرور کوئی گہری شکایت ہے جہاں پہلی قسم کے الزام عائد کئے گئے جب کہ مولانا ناطق خود اس خطاب کی مضحکہ کا یوں اعتراف کر رہے ہیں کہ اے علامہ نیاز صاحب جب آپ اتنا موثر خطاب پا چکے تو اس کا اور اس کی مضحکہ کا کچھ لحاظ بھی کیجئے۔ کیا ایسے جملوں سے ثابت نہیں ہوتا کہ ناطق صاحب کی نگاہ میں خطاب کی حرمت ہے۔

میں ظفر صاحب کو بتاؤں کہ خطاب کی سب سے بڑی توہین خود نیاز صاحب نے کی۔ پورے ملک کو کمتر و ذلیل نیاز صاحب نے سمجھا اور مسلمانوں جیسا نام رکھ کر جو ہندو اور نیاز نے مسلمانان ہند کو ۱۵ ہاتھ گہرے گڑھے میں گاڑ دیا۔ ۷ کروڑ مسلمانوں کو بے اعتبار اور ملک و حکومت کا غیر وفادار نگاہ و حکومت میں ظاہر کیا۔ یعنی ہماری حکومت کی اتنی بڑی مہربانیوں اور عزت افزائی کے باوجود یہ دونوں ڈاکو، لٹیرے، غدار، احسان فراموش ملک دشمن، اعدائے قوم ہر عزت ہر قدر دانی اور پدم بھوشن جیسے معزز خطاب پھلانگ کر پاکستان بھاگ گئے۔ ناطق صاحب نے مذاق نہیں اڑایا خود انھوں نے خطاب کا مذاق اڑایا جن کی حمایت میں آپ مولانا ناطق سے گستاخیاں کر رہے ہیں۔ امید ہے ظفر صاحب میرے الفاظ کی گہرائی پر جائیں گے جو بے جا بات پر قلم سے نکل گئے بلکہ ان کی روح کو سمجھ کر میرے اس پر خلوص اور دوستانہ

سیفی پریہاری ایم اے

آتش گل

"داغ جگر، شعلہ طور اور آتش گل" کے مجموعہ فن کار جگر مراد آبادی کی شخصیت اور آرٹ پر تنقید و پسندیدہ تنقیدیں نکل چکی ہیں اور ان سے ایک شاعر کی دو تصویریں بن گئی ہیں۔ یعنی "رند اور تائب"۔

ایک گروہ جو جگر کی رندی و سرمستی کا فدائی ہے اس کا خیال ہے کہ جگر کی غزل کا حسن و جمال اور کیف و نشاط "دور جام" تک تھا۔ اس کے بعد وہ رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ مہک اڑ چلی ہے وہ تب و تاب باقی نہیں ہے — دوسرا گروہ جگر کی زندگی میں پیغمبرانہ اخلاق کی شان دکھانا پسند کرتا ہے اور ایک نقاد نے اس سے ذرا ہٹ کر "مجذوب رندی" کا حکم لگایا ہے۔ لیکن اس قسم کی کوشش اصلاً قومی کمزوری کی علامت ہے۔ نپولین۔ برنارڈ شا۔ روسو کمال اتاترک اور بائرن وغیرہ کسی کے بھی حالات زندگی دیکھئے۔ انسانی کمزوریاں سب میں ملتی ہیں۔ لکھنے والوں نے ان کی خامیوں پر پردہ نہیں ڈالا ہے۔ عظمت کا راز انسان ہونا ہے۔ فرشتہ اور دیوتا بن جانا نہیں ہے

جگر کے متعلق سچائی یہ ہے کہ انھوں نے دل کھول کر محبت کی ہے اور جی بھر کر جام لنڈھائے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ تمام واقعات پیش آئے ہیں جو عام زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔ ایک دور تھا کہ ناکامی کے لئے شراب ہی زیست تھی۔ اور اس عہد کی نظمیں بڑی حسین نغمہ ریز ہوئی ہیں۔

یہ ان کی کتاب زندگی کا دل آویز باب ہے، اس کے اوراق حوادث و غم کی بوقلمونیوں سے پوری اور خصوصاً ثانوی سے یکجا جانچے جا سکتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے مجاز کے نام "پند نامہ" میں واضح طور پر جگر کا ذکر کیا ہے اسلامیہ کالج لاہور میں سید الطاف حسین بی۔ اے (سابق ہیڈ ماسٹر) کا دولت کدہ، یاس عظیم آبادی فانی بدایونی۔ جگر مراد آبادی۔ جوش ملیح آبادی استرخانی اور احمق پھپھوندی وغیرہ متاع شعر و ادب کی زندگی کے گہرے، رنگین اور بھڑکیلے نقوش کا راز دار رہا ہے اسی زمانے میں معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر جگر صاحب کو شیعیت سے سخت بیزاری ہو گئی تھی اور عالم سرمستی میں سر راہ ان کا ہاتھ بے تکلف کسی معروف شیعہ صاحب کی داڑھی کی طرف اٹھ جاتا تھا۔

جگر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھیں اپنے ماضی پر شرمندگی نہیں ہے زندگی کے تجربوں کی آگ سے ان کا کردار نکھرا ہے۔ ان کی شخصیت میں محبت اور عظمت کے بے پناہ جلوے ہیں۔ خمار کی رندی اور مجازی محبت نے ہی ان کو انسان دوستی تک پہنچایا ہے۔ ان کو خیال و عمل کی بلندی دی ہے۔ انھیں اس کا خود بھی احساس ہے "اب زیست ہے شراب" کا یہی مفہوم ہے۔ اس نے عشق میں زندگی تباہ کر کے سماج کی اچھی قدروں کو اپنی زندگی میں داخل کر لیا تھا۔ معاصرین سے ان کے تعلقات خوش گوار تھے۔ ان میں بڑا ضبط پیدا ہو گیا تھا معاصرانہ چشمک سے مجبور ہو کر جوش ملیح آبادی نے جگر کے ساتھ نامناسب سلوک کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جگر نے تمام باتوں کا جواب مسکراہٹ کی صورت میں صرف ایک شعر میں دے دیا جس کا مصرع ثانی یہ ہے

"دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے"

جگر کی زندگی میں رکھ رکھاؤ اور لطافت کی شان اصغر گونڈوی کی صحبت اور سادات منگلور کے فیضان سے پیدا ہوئی۔ جگر کی سیرت میں دو نقش بہت نمایاں ہیں جس کی مثال دوسرے شعراء میں کمیاب نہیں ہے یعنی بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت" اس کی دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

جگر نے اپنے آخری مجموعہ کلام "آتش گل" کی ایک جلد ۱۶ مئی ۱۹۵۸ء کو ایک بزرگ کی خدمت میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کی ہے

"نذر عقیدت و ارادت بخدمت گرامی
بنظر فیضان نظر حضرت اقدس شہزادہ
الحاج سید عبدالوہاب شاہ صاحب مدظلہ
منگلوری۔ خادم
جگر مراد آبادی

جگر نے متعدد نوجوان شاعروں کی زندگی سنوار دیا ہے۔ شکیل بدایونی اور آذر مراد آبادی خصوصی مثالیں ہیں۔ یہ دونوں شاعر علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ اسی زمانے سے جگر کی سرپرستی حاصل ہوئی شکیل بدایونی کا فلم انڈسٹری کی دنیا تک پہنچنا بھی جگر کی توجہ اور سفارش کا نتیجہ ہے

جگر خالص غزل گو ہیں، اور غزل کی آبرو کے محافظ آپ کو ان کے کلام میں شراب سے پہلے اور شراب کے بعد ہر جگہ تغزل کی مسحور فضا ملے گی اور سوز محبت کا خزینہ — "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

وہ کسی پیکر جمیل کو تمثال کچھ بنا نہ سکے

محبت میں انتقام کا جذبہ ان کے دل سے دور ہو گیا تھا۔ انھوں نے محبوبہ سے محبت کی ہے۔ ان کا محبوب خیال و خواب کی دنیا کا پریزاد نہیں ہے بلکہ وہ "سحر البیان" کی ایسی ہیروئن ہے جس کے جسم کو انھوں نے اگر سے اور عنبر کی سرزمین پر جا دوڑتے دیکھا ہے وہ احتیاط شرم و ضرورت وہ احتیاط آداب پھر نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو صبا ہا صبا ساغر ہا ساغر اس محبت میں خلوص ہے، دردمندی ہے اور دل پر وہ کچھ گزرا ہے جس نے جگر کو عشق کی نفسیات سے آگہی دی ہے۔ محبت کی تلاش نے حسین اور پرشوق جذبات کی شکار کے سانچے میں ڈھالنے کی تحریک کی ہے۔

مجھے یہ وہم رہا دنوں کہ جرأت شوق
کہیں نہ خاطر معصوم پر گراں گزرے
یہ حسن خاطر بھی حسن فطرت کے
نہ جانے آج محبت پہ کیوں گراں گزرے
جب کوئی حسین ہوتا ہے سرگرم نیاز عشق
اس وقت وہ کچھ اللہ بھی آتے ہیں مجھ یاد
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں
تیرے بغیر رونق دیدار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں
عرصہ ہوا کہ رسم محبت بدل گئی
دامن سے اب علاقۂ چشم تر کہاں

جگر کے یہاں جذبات کا یہ عالم اور اسلوب کی یہ فنکاری دیکھ کر کسی کو یہ جوش کہاں رہتا ہے کہ وہ غزل میں احساس فکر کی کمی کا شکوہ سنج رہے۔ عشق کے اس خلوص اور دردمندی نے جگر کی زندگی میں وہ رچاؤ پیدا کر دیا ہے کہ انھیں اس زمین اور زمین پر بسنے والوں سے بھرپور محبت ہے۔ انھوں نے "غم جاناں" میں "غم دوراں" کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ملک کے اہم سیاسی تقاضوں اور مطالبات کے موقعوں پر ان کی تحریک میں دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ مثلاً قحط بنگال

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

یا گاندھی جی کی یاد میں ؎

"پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن"

اعلان جمہوریت کے ذریعہ

"کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ جو نکھار آئے"

اور وہ گیت "میرے چمن سے" جس کو آزادئ وطن کے بعد کی تاریخ کا ایک معنی خیز ورق کہہ لیجئے۔ جگر کی شاعری میں نہ مایوسی کی پرچھائیں ہے، نہ فرار کا سایہ۔ نہ نفرت و بغض کی تاریکی ہے، نہ تنگ نظری و رجعت پسندی کی گھٹن۔ بلکہ جگر نے زندگی سے پیار کرنا سکھایا ہے اور حیات و کائنات کو دھنک پر ناچتی ہوئی سورج کی کرنوں اور پانی کی لہروں میں آئینہ دکھاتی ہوئی چاندنی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ شاعر کے یہاں محبت کا نرمی اور خلوص کی گرمی ہمارے حوصلوں کو توانائی بخشتی ہے مثلاً "اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر"

جگر کی غزل موجودہ نسل کے لئے ایک آئینہ ہے اور آنے والی نسل کے لئے ایک صحت مند پیغام

جگر کے مجموعوں کے نام یعنی داغ جگر، شعلۂ طور اور آتش گل ان کی زندگی سے قریبی نسبت رکھتے ہیں یہ اصلاً ان کی داستان عشق کی تلمیحات یا تمثیلات ہیں

مولانا ناطق گلاؤٹھوی اور اسکا فی صفحہ ۸ سے آگے

زندگی کا ثبوت، نالۂ زار
وہ بھی کیا اک مری ہوئی آواز
نہیں کچھ کام پینے کا اگر بازار دنیا میں
تو اچھا لاؤ دے دو ہم دل ناکام لیتے ہیں
فراہم کر رہا ہوں اپنی بربادی کا افسانہ
جو گلیاں میں نے فرقت میں وہ گلیاں دیکھتا ہوں میں
خیال خواب راحت حسرت سامان دلچسپی
نہیں ہوتا مگر خواب پریشاں دیکھتا ہوں میں
نوح چل عمر رواں بڑھ کے سنبھالیتے ہیں
ابھی گزرے ہوئے ایام گئے وہ نہیں
نوائے ساز ہستی نالۂ پیہم سے پیدا ہے
ابھی تار نفس پر چل رہی ہیں انگلیاں میری
مشکل رو عدم کو ہم آسان نہ کر سکے
جلدی میں چل دیئے کوئی سامان نہ کر سکے
شرط انسانی جبیں تھی نہ پایا نہیں سجدہ
یہ تو نہیں ہوا کہ ہم ایماں نہ کر سکے
کیا اعلیٰ ہیں وحشتیں دل کے
کس سے منائے خاک میں مل کے
اے دل شکوہ سنج کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کے
ٹھنتے جاتے ہیں ماہ و سال میں دوست
مل رہے ہیں نشان منزل کے
چھوڑ تا تو نہ دامنۂ بزم نکہت
اٹھ کے مگر سے سنبھال لے دل کے

عاق نامہ

حیرت بن حامد علی گڑھی بہت مدت سے خود کو میرا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ انھوں نے نافلی اور فتنہ انگیزی کے سوا دنیا سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ میں نے سخت محنت کرنے اور شاگرد سے بھرپور محنت لینے کا عادی ہوں۔ حیرت نے کبھی شعر گوئی پر محنت نہیں کی۔ وہ صرف اپنے گانے کے بھروسے پر لوگوں میں خود کو شاعر ظاہر کرتے رہے اور اپنی چند شاعرانہ باتوں سے انھیں بتائی گئی تھیں لوگوں کو مرعوب کرتے رہے۔ چونکہ یہ بات میں اپنے لئے باعث توہین سمجھتا ہوں کہ میرا شاگرد شاعری اور انسانیت کے لحاظ سے اچھا نہ ہو، اس لئے سدھرنے کی امید ہی باقی نہ رہی ہو اس لئے میں ایسے لوگوں کو اپنے نام سے منسوب رکھنا نہیں چاہتا۔ پس اس ذریعہ سے میں حیرت بن حامد علی گڑھی کو عاق کرتا ہوں۔ وہ اپنے افعال کے خود ذمہ دار ہیں۔ آبرو حسنی گنوری

نسیم شاہجہان پوری

کس رند پہ ساقی کا کرم عام نہیں ہے
مے خانے میں اک میرے لئے جام نہیں ہے

کس طرح کہیں درد میں آرام نہیں ہے
یہ آپ کا ہے غیر کا انعام نہیں ہے

کیوں درد میں لوں بادہ و ساغر کا سہارا
مے خانہ میں کیا گردشِ ایام نہیں ہے

نظروں کے تصادم کو زمانہ ہوا لیکن
اب تک دلِ بے تاب کو آرام نہیں ہے

پروانہ ہو یا شمع ہو، بلبل ہو کہ گل ہو
وہ کون ہے جس پر کوئی الزام نہیں ہے

جب سے وہ خیالوں پہ مرے چھائے ہوئے ہیں
مائل بہ کرم گردشِ ایام نہیں ہے

اے دوست تری یاد فراواں کے تصدق
اب کوئی نفس عشق میں ناکام نہیں ہے

احساس دلاتی ہے مجھے تازہ سفر کا
بے سود مری لغزشِ ہر گام نہیں ہے

دل والوں کو ملتی ہے نسیم ان کی محبت
ہر شخص کی قسمت میں یہ انعام نہیں ہے

دو غزلیں

رحمت کلکتوی

اُس کا کیا کہنا ہے جو حاضر تری محفل میں ہے
وہ سفینہ ہی سلامت ہے کہ جو ساحل میں ہے

اے حریفِ موجِ غم اتنا تو سمجھا دے مجھے
عافیت دریا میں ہے یا عافیت ساحل میں ہے

تُو مرے نالوں کو سن کر انجمن آرا نہ اُٹھ
دل شکستہ ساز ہے جس کی صدا محفل میں ہے

بڑھ رہا ہے ہر قدم پر زندگی کا حوصلہ
غم نہیں اس کا کوئی خستہ رہِ منزل میں ہے

ہو جو تشہیرِ محبت میں نہیں دیوانہ وہ
شکر ہے یہ دل کی میری بات میرے دل میں ہے

تھیں کبھی امواج پیہم میری کشتی کی حریف
آج وہ طوفان پنہاں دامنِ ساحل میں ہے

آپ کو احساس کیا ہو آپ کیوں پروا کریں
دل اسی کا جانتا ہے درد جس کے دل میں ہے

پھول گلشن سے جدا ہو جب تو کیا اس کی حیات
وہ مقدر کا دھنی ہے جو تری محفل میں ہے

دیکھ کر صورت سمجھ لے مدعا ہر ایک کا
لب کشائی کی کسے جرأت تری محفل میں ہے

پاسبانِ دیر و کعبہ سے مجھے ہے پوچھنا
کون ہے دیر و حرم میں کون میرے دل میں ہے

شیخِ فن پیرِ ادب، آقائے اُردو آبرؔ ہیں
ہے غلام آبرؔ جو رحمت تری محفل میں ہے

غزلیات

صادق قادری سیمابی جنڈ

محبت میں فراقِ جسم و جاں تک بات آپہنچی
ہنسی کا نام لیتے ہی فغاں تک بات آپہنچی
مسافر اجنت ہندوستاں تک بات آپہنچی
نشیمن تو نشیمن گلستاں تک بات آپہنچی
زہے قسمت گلستاں میں کچھ ایسا انقلاب آیا
اسیری میں بھی شاخِ آشیاں تک بات آپہنچی
سنائی جب کسی نے داستاں اپنی محبت کی
تو ہر پھر کر ہماری داستاں تک بات آپہنچی
نہ تھا آگاہ کوئی بھی ہمارے دردِ پنہاں سے
مگر پھر بھی زمانے کی زباں تک بات آپہنچی
دھواں دینے لگا میرے نشیمن کا ہر اک تنکا
چمن کی خیر یارب آشیاں تک بات آپہنچی
بہاروں میں چمن والوں کی غفلت پوچھنا کیا ہے
یہ سوتے ہی رہے دورِ خزاں تک بات آپہنچی
محبت کا عمل بے کار ہو جائے گا اے صادق
اگر اندیشۂ سود و زیاں تک بات آپہنچی

ماسٹر عنایت اللہ عرشی جبل پوری

وفا کی جب زبانِ قصہ خواں تک بات آپہنچی
تمہارے ظلم میرے امتحاں تک بات آپہنچی
مرے غم کی مرے اشکِ رواں تک بات آپہنچی
جو پنہاں تھی وہ اب اہلِ جہاں تک بات آپہنچی
جلایا تو نے پروانوں کو شمعِ انجمن بن کر
تری محفل میں قتلِ عاشقاں تک بات آپہنچی
چھپاؤ گے کہاں تک خونِ ناحق اپنے دامن سے
تمہارے ظلم کی اہلِ جہاں تک بات آپہنچی
ہوا ہوئی حرص کی کچھ اس قدر ہے گرم بازاری
محبت میں بھی اب سود و زیاں تک بات آپہنچی
بعد ہے چاند تاروں کے سفر تک عزمِ انسانی
زمیں سے اڑتے اڑتے آسماں تک بات آپہنچی
یہ نیرنگی نگہبانوں کی نااہلی کی شاہد ہے
گلستاں میں بہاروں سے خزاں تک بات آپہنچی
ستاروں سے قمر سے، مہر سے غنچوں سے پھولوں سے
چلی جب بھی حسینانِ جہاں تک بات آپہنچی
خدا کا شکر ہے عرشی سخن دانوں کی محفل میں
ترے اشعار کی اہلِ زباں تک بات آپہنچی

وفی جبل پوری

یوں ہی ہوتی رہی ہم پہ مشقِ ستم
مسکراتے رہے ہم خدا کی قسم
میری آہوں کا دیکھا اثر آپ نے
مسکراتے ہوئے ہو گئی آنکھ نم
خوب قسمت نے یہ دن دکھایا ہمیں
آ کے منزل کے نزدیک بھٹکے قدم
خونِ دل کو کوئی گل کھلانے تو دو
سرخیِ عشق پھر میں کروں گا رقم
اے اسیرو! نہ گھبراؤ وقت آگیا
پھر نظامِ گلستاں بدلتے ہیں ہم
آنسوؤ! ضبط سے کام لینا ذرا
ان کی محفل میں رہ جائے اپنا بھرم
آ کے منزل پہ جو لٹ گیا کارواں
درحقیقت تھا یہ رہبروں کا کرم
پھر گھٹائیں اٹھیں آج توبہ شکن
کس طرح سے بچے گی ہماری قسم

یہ الم بھی وفی ان کی ہی دین ہے
اس لئے اس کو دل میں چھپائے ہیں ہم

تگ سورتی

یوں حائلِ نظارہ ہے پردا کہیں جسے
وہ اصطلاحِ عشق تمنا کہیں جسے

ہے کیسے ناز سے مری جانب نظر طلب
جلووں کی وہ ادا کہ تقاضا کہیں جسے

اٹھی تو ہے ہماری طرف کاش اس ادا سے
وہ اک نظر کہ حوصلہ افزا کہیں جسے

لینے لگا ہے دل میں محبت سے چٹکیاں
وہ ایک غم نزاکتِ دنیا کہیں جسے

تیری نگاہِ لطف سے ڈرتا ہے کس قدر
وہ بدنصیب وقت کا مارا کہیں جسے

کوئی نہ کوئی رہتا ہے وہ غم ہو یا خوشی
دل ایسا گھر نہیں ہے کہ سونا کہیں جسے

دامانِ دوست کی ہے ہوا وہ حیات بخش
مایوسیِ زندگی دمِ عیسیٰ کہیں جسے

اب ہوگی کب تری نگہِ لطف اس طرف
وہ تو ہوا نصیب کا لکھا کہیں جسے

کیا قہر ہے کہ دعویٰ الفت کے باوجود
آمر نہیں ہے کوئی کہ اپنا کہیں جسے

انوکار نو

شباب للت ایم۔ اے

جلوۂ حسن میں روپوش ہوئے جاتے ہیں
ہم زمانہ سے سبک دوش ہوئے جاتے ہیں

کان دھر کر جو مری بات سنا کرتے تھے
آج کیوں اتنے گراں گوش ہوئے جاتے ہیں

دلِ مرحوم! یہ تاریک مناظر شب کے
تیرے ماتم میں سیہ پوش ہوئے جاتے ہیں

ہم بھی ڈھونڈیں گے کوئی اور سہارا دل کا
آپ اگر دوست فراموش ہوئے جاتے ہیں

غیر تو غیر ہیں غیروں کا گلہ ہی کیوں ہو
اب تو اپنے بھی جفا کوش ہوئے جاتے ہیں

چشمِ خیرہ کی قسم! تابشِ جلوہ کی قسم
آپ جلووں ہی میں روپوش ہوئے جاتے ہیں

ہوتے جاتے ہیں وہ کچھ اپنی حقیقت کے قریب
تیرے جلووں میں جو مدہوش ہوئے جاتے ہیں

ناز تھا جن کو مری دوست نوازی پہ شباب
اب وہی دوست فراموش ہوئے جاتے ہیں

بدر القریشی دُرگ

جنبشِ لب بھی اب محال ہوئی
لاغری جان کا وبال ہوئی

عشق گرمِ عمل ہوا تو عقل
وقفِ اندیشۂ مآل ہوئی

سامنے ان کے غنچہ و گل کو
لب کشائی کی کب مجال ہوئی

رنگ لایا ہے میرا خونِ جگر
آنکھ رو رو کے ان کی لال ہوئی

محوِ گلگشت دیکھ کر ان کو
میری وارفتگی بحال ہوئی

شمع اک اور اتنے پروانے
شعلہ روئی بھی اک وبال ہوئی

اب ہیں آزاد اُردو و ہندی
کشتِ انگریز پائمال ہوئی

آہ غالب نہ نالۂ اقبال
بدر کی نظم بے مثال ہوئی

فیاض عزیز نذر نظامی جلیسری

درد بخشا ہے ایسا کسی نے
موت کے آرہے ہیں پسینے
ہم تو پیتے ہیں ان کی نظر سے
لوگ میخانے جاتے ہیں پینے
ان سے کی جب بھی عرضِ تمنا
ہو گئے وہ پسینے پسینے
بزم میں ڈر سے رسوائیوں کی
کیں اشاروں سے باتیں کسی نے
مجھ کو اے نذر وہ مل گئے کیا
مل گئے دو جہاں کے خزینے

شفق جون پوری (کلکتہ)

جیسے ہی مجھے تیری تصویر نظر آئی
اک ہوک سی اٹھی دل میں پھر یاد تری آئی
غیروں سے وہ ملتے ہیں کیا ہرج ہے ملنے دو
میری ہی نہیں اس میں ان کی بھی ہے رسوائی
مائل بہ کرم کیجیا اللہ رے غلط فہمی
رونے پہ مرے ان کو جس وقت ہنسی آئی
جو کچھ بھی کہے کوئی میں تو یہ سمجھتا ہوں
ہنگامۂ دنیا کا انساں ہے تماشائی
یہ کیسے سمجھ لوں میں وہ ساتھ مرا دیں گے
ہر گام پہ ہم کو ہے اندیشۂ رسوائی
ہے عشق میں رسوائی یہ یاد شفق رکھنا
ہاتھوں سے نہ چھٹ جائے دامانِ شکیبائی

آثر قادری بیتاگیری

جو مشکلوں کو عزم سے آساں نہ کر سکے
وہ زندگی کو اپنی درخشاں نہ کر سکے
اشکوں سے کوئی کارِ نمایاں نہ کر سکے
ہم ظلمتوں میں شمعیں فروزاں نہ کر سکے
عریانیٔ جمالِ نظارہ کے باوجود
تسکینِ ذوقِ دیدۂ حیراں نہ کر سکے
جس کا کوئی جہاں میں سہارا نہ بن سکا
تم بھی تو اس غریب پہ احساں نہ کر سکے
وہ اہتمامِ صبحِ گلستاں کریں گے کیا
جو داغِ دل سے جشنِ بہاراں نہ کر سکے
جلتی رہی نگاہ بھٹکتا رہا خیال
دل کے لیے بھی سکون کا ساماں نہ کر سکے

جلال و جمال

فاضل بریلوی

سلامت وہ نظر جب سے ملی ہے
جہاں میں روشنی ہی روشنی ہے
نہ چھپتے ہیں نہ آتے ہیں مقابل
بہت دلچسپ ان کی دل لگی ہے
چھپا ہے جب سے تو اے ماہِ تاباں
جہاں میں تیرگی ہی تیرگی ہے
غمِ جاناں، غمِ دوراں غمِ زیست
ہزاروں غم ہیں اور اک زندگی ہے
جہاں مطلب پرستی درمیاں ہو
وہ فاضل دوستی کیا دوستی ہے

عزیز کابل ناگپوری

گردش تھمی نے گئی جو تری انجمن سے دور
لوٹا مجھے نصیب نے میرے وطن سے دور
وہ گل ہوں جس سے رونقِ فصلِ بہار ہے
میں زینتِ چمن ہوں مگر ہوں چمن سے دور
ناداں سمجھ کے مجھ کو نہ دامن بچایئے
پروازِ فکر ہے مری چرخِ کہن سے دور
ناکام حسرتوں کا جنازہ لئے ہوئے
افسوس جا چکا ہوں تری انجمن سے دور
لو گفتگوئے غیر نہ کر میرے سامنے
رہتا ہوں میں عزیز ہر اک مکر و فن سے دور

آزاد شہباز نگری

محبت میں جو اس کی نیم جاں ہے
اسے حاصلِ سکونِ دل کہاں ہے
کہوں کیا کب مجھے تابِ بیاں ہے
عجب پُر درد میری داستاں ہے
فنا لازم ہے بہرِ زندگانی
کسے حاصل حیاتِ جاوداں ہے
چھپے ہیں اس میں لاکھوں تیرِ مژگاں
محبت میں سلامت دل کہاں ہے
دلِ مُردہ کا ہے ہر وقت ماتم
مجھے آرام کی فرصت کہاں ہے
عجب کچھ رنگ ہے دنیا کا آزاد
کہ ہر اک حیراں، ناحیراں ہے

مسلسل جاسوسی ناول

مظفر حنفی ہسوی بی۔ اے

تارِ عنکبوت

دوسرا باب

بینک کا منیجر

بینک آف برلکہ کا منیجر مسٹر وینو اوسط قد کا آدمی تھا۔ گفتگو کا لہجہ شریفانہ اور لباس کی تراش و خراش میں سادگی تھی۔ ان کے والد اس بینک کے بڑے حصہ دار تھے۔ اس لئے وینو کا نام اپنے طبقے اور دولت مند سوسائٹی میں عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

شمیم اختر ان کے پرائیویٹ دفتر میں پہنچا تو مسٹر وینو نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد خادم کو حکم کیا کہ اب کوئی شخص اس کمرے میں داخل نہ ہونے پائے۔

"مسٹر اختر!" اس نے سراغرساں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نے آپ کو اس لئے زحمت نہیں دی کہ مجھے سیکریٹ سروس پر اعتماد نہیں ہے۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ جیسا قابل جاسوس ذاتی طور پر بھی ہماری طرف سے اس معاملے کی تفتیش کرے۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ کس طرح دلیرانہ ہمارے بینک کو دھوکا دے کر لوٹا گیا ہے"

شمیم اختر خاموش رہا۔ اس نے یہ ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا کہ اسے اس واقعہ کا علم پہلے ہی ہو چکا ہے

"ہمارے بینک سے بارہ لاکھ روپے ہتھیائے گئے ہیں ——" منیجر رعونت کے ساتھ بولا۔ "ہمارے بینک کا دیوالہ کم نہیں ہے پھر بھی یہ رقم بہت ہوتی ہے۔ میں پورا واقعہ تفصیل سے بیان کروں؟"

"مجھے خوشی ہوگی ——!" شمیم اختر نے مختصر سا جواب دیا۔

مسٹر وینو نے وہی کہانی جو شمیم اختر قبل ازیں انسپکٹر دن کی زبانی سن چکا تھا تفصیل کے ساتھ بیان کی کہ کس طرح دو آدمی بارہ لاکھ کے جعلی بڑی نوٹ ہندوستانی سے تبدیل کروا کے لے گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ شہرہ آفاق برقی سود آگر کا جو افراط دولت کی وجہ سے برما کا نظام کہلاتا ہے تعارفی رقعہ بھی لائے۔ اس رقعہ پر اس سوداگر دستخط بالکل ویسے ہی دستخط بھی موجود تھے جیسے کہ بینک کے رجسٹر میں —— اگر ان لوگوں کے پاس وہ تعارفی خط نہ ہوتا تو غالباً خزانچی اتنی بڑی لمبی رقم کے نوٹ نہ تبدیل کرتا۔ بہرطور وہ لوگ جعلی نوٹوں سے بارہ لاکھ روپے لے گئے۔ دوسرے روز جب ان میں سے کچھ نوٹ بینک آف انڈیا میں گئے تو معلوم ہوا کہ وہ جعلی ہیں دیکھئے میں ایک نوٹ آپ کو دیتا ہوں ——"

شمیم نے اب بھی یہ نہیں کہا کہ وہ قبل ہی ان نوٹوں کو دیکھ چکا ہے۔ ایک جعلی نوٹ شمیم کو دے کر وینو نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس واقعہ کی اطلاع سیکریٹ سروس میں بھیج دی گئی ہے اور وہاں سے انسپکٹر دن کو واقعے کی تفتیش کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اس سلسلے میں میں آپ کی امداد بھی حاصل کروں گا۔ یقین کیجئے کہ آپ کی خدمات کے سلسلے میں ہمارا بینک آپ کو خوش کر دے گا ——"

شمیم اختر نے بڑی بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بتایا کہ وہ اجرت یا معاوضہ جیسی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

"مسٹر وینو!" اس نے منیجر سے دریافت کیا "آپ کہتے ہیں کہ نوٹ تبدیل کرنے کے لئے دو آدمی بینک میں آئے تھے۔ کیا آپ ان کا حلیہ بیان کر سکتے ہیں ——؟"

"مجھے آپ سے اس سوال کی امید تھی" منیجر نے فوراً کہا۔ "کیشیر نے ان کا حلیہ لکھ کر سیکریٹ سروس والوں کو دے دیا ہے۔ اس کی ایک نقل آپ کے لئے میں نے لی ہے ——"

شمیم اختر نے نقل لے کر دیکھی۔ لکھا تھا۔

"پہلا شخص جس نے تعارفی رقعہ پیش کیا —— تقریباً پانچ فیٹ دس انچ لانبا۔ عمر تقریباً ۴۵ سال وضع قطع، سیاہ آنکھیں لمبی تیکھی ناک، کال پچکے ہوئے اگلے دانت بڑے بڑے اور ریت چکیلے ——

دوسرا آدمی —— تقریباً ساڑھے پانچ فیٹ اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں"

شمیم اختر نے کہا۔ "یہ نقل میں اپنے ہمراہ رکھنا چاہتا ہوں ——"

"کیا آپ میری درخواست منظور کر رہے ہیں؟" منیجر نے مسرور ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں مسٹر وینو!" شمیم اختر نے جواب دیا۔ "میں اس کیس کو سلجھانے کا بار اپنے شانوں پر لیتا ہوں"

"میں آپ کا احسان مند ہوں اختر صاحب!" وینو بولا۔ "مزید وضاحت کے لئے میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ کیشیر ہمارا خاص آدمی ہے اور شبہ سے بالاتر ہے۔ بینک میں اس کے بھی کافی شیئر ہیں۔ اس کی مالی حالت کافی مضبوط ہے اور میں اسے بچپن سے جانتا ہوں"

"پھر تو وہ واقعی شبہ سے بالاتر ہے" شمیم اختر نے مطمئن ہو کر کہا اور پوچھا۔ "کیا آپ نے بوگا سیر دکانی روشن سے اس سلسلہ میں دریافت کیا جس کا تعارفی

واقعہ مجرم نے کرائے تھے ــــ ؟"

"جی ہاں ــــ" دینو نے کہا "وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے کسی شخص کو وہ نہیں جانتے اور نہ انھوں نے کسی کو تعارفی رقعہ ہی دیا ہے۔ وہ پی روشن صاحب بارکیٹ میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے ہیں اور بہت مشہور آدمی ہیں۔ اس بیان کے دستخط کی نقل آسانی سے کی جا سکتی ہے کیوں کہ ان کے دستخطی چیک حاصل کرنا مشکل نہیں ہے کیا آپ کوئی اور سوال دریافت کرنا چاہتے ہیں ــــ ؟"

"اس واقعہ کے بعد کیا وہ دونوں آدمی کہیں اور دیکھے گئے ؟"

"جی نہیں ــــ"

"اس واقعہ کی رپورٹ سیکریٹریٹ سروس کو دی جا چکی ہے ــــ" شمیم اختر بولا "اس لئے انسپکٹر مدن نے ان کی تلاش کے لئے انکوائری جاری کر دیئے ہوں گے ــــ"

"ہاں مسٹر اختر! کیا آپ کو یاد ہے ابھی کچھ دن ہوئے کہ لبرٹی سینٹرل بینک سے تین ڈرافٹ کے ذریعے سات لاکھ روپے نکالے گئے تھے ــــ ؟"

"جی اچھی طرح ــــ" منیجر نے جواب دیا۔ "ان لوگوں نے بینک سے ہمیں بھی واپس خط بھیج دی تھی ــــ"

"کیا آپ کو ان دونوں کیسوں میں مشابہت نظر آتی ہے ــــ ؟"

منیجر کچھ دیر غور سے سوچتا رہا پھر بولا: "کیا آپ نے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے مسٹر شمیم ؟"

شمیم اختر نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور کہا "آپ فی الحال اپنے بینک کے ذریعہ سینٹرل بینک کو لبرٹی تار دے کر دریافت کیجئے کہ کیا ان لوگوں کا حلیہ ان دو آدمیوں سے ملتا ہے جنھوں نے جعلی ڈرافٹ کے ذریعہ وہاں سے رقم وصول کی تھی ؟ ــ جواب ملنے پر مجھے فوراً مطلع کیجئے گا ــــ"

منیجر نے فوراً اپنی سیکریٹری روزی کو بلا کر تار کا مضمون لکھایا اور ہدایت کی کہ اسے فوراً بھیج دیا جائے اور جواب آنے پر بلا تاخیر اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ سکریٹری کے رخصت ہو جانے پر دینو نے کہا:

"اختر صاحب! کیا اس طرح مطلب براری کی اُمید کی جا سکتی ہے ــــ ؟"

شمیم اختر نے اعتماد کے ساتھ اس دوران میں مختلف ممالک میں پڑنے والے ڈاکوں اور جعل سازیوں کی روداد منیجر سے بیان کی۔ طریق کار کی مشابہت پر روشنی ڈالی اور پھر اپنے قائم کردہ نظریے سے اسے آگاہ کیا۔

"اب کی سکریٹریٹ سروس کے حکام بالا دست نے اس معاملے پر مجھ سے رائے طلب نہیں کی۔ اس لئے میں خاموش تھا ــــ" شمیم اختر نے وضاحت کی۔ "اب آپ نے اس کام کا بار میرے سر پر ڈال دیا ہے اور انشاء اللہ میں بہت جلد ثابت کر دوں گا کہ مختلف ممالک میں ہونے والی یہ لوٹ کھسوٹ ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہے"

"مجھے ایسی ہی اُمید ہے آپ سے" منیجر نے کہا۔

"لیکن ہمارا اصل مقصد تو اپنے بارہ لاکھ روپے واپس حاصل کرنا ہے۔ اس کا خاص لحاظ رکھئے گا ــــ"

"جی ہاں آپ مطمئن رہیے" شمیم اختر نے تسلی دی "میں اپنی کوشش اٹھا نہیں رکھوں گا۔ کہ لبرٹی سینٹرل بینک سے جواب آتے ہی مجھے باخبر کیجئے گا۔ آج میں دن بھر جناردن پیلس میں رہوں گا ــــ خدا حافظ"

آفس سے نکل کر وہ باہر آ گیا۔ ایک چھلتی ہوئی نگاہ احتیاطاً اس نے کیشیر پر بھی ڈالی اور علم نفسیات میں کافی دخل ہونے کی وجہ سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ خزانچی اس سازش میں شریک نہیں ہے

اپنے فلیٹ پر واپس آ کر شمیم اختر نے انسپکٹر مدن اور منیجر سے معلوم ہونے والے تمام واقعات نوٹ بک میں درج کر لئے۔ تیسرے پہر منیجر کا فون آیا

"ہلو اختر صاحب! پہلے آدمی کا حلیہ ملتا ہے۔ کو لبرداروں نے تصدیق کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"اس سے میرے نظریے کو تقویت پہنچتی ہے" شمیم اختر بولا۔

"اُمید ہے کہ آپ تفتیش میں کامیاب ہوں گے۔"

"دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔ میں آپ کو مطلع کرتا رہوں گا ــــ"

کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی پھر بجی۔ سلیم بول رہا تھا "اختر صاحب! سنتے ہیں آپ ــ؟ اس سائیکل کمپنی کا مالک ہے پنڈت شو بھاناتھ جوشی!"

لائن ڈسکنکٹ ہو گئی۔

خود اور چنڈی

تاریک کمرے میں سرگوشی ہوئی

"دروازہ بند کر دو!"

ایک شخص آہستگی کے ساتھ آگے بڑھا اور اس شکستہ دروازے کو بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور ایک میز سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ــــ پھر وہی پہلا آواز آہستہ لیکن تھکی تھکی سنائی دی۔

"ارے احمق! اتنی آواز کیوں کرتے ہو؟ کیا کسی نے تمہارا تعاقب کیا ہے؟"

"جی نہیں ــــ" آہستگی کے ساتھ جواب ملا "میں نے تین بار مختلف مقامات پر مڑ کر اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ کوئی تعاقب میں نہیں ہے"

"عزیز کہاں ہے ــــ ؟"

"پہرا دے رہا ہے ــــ"

"تم نے دروازہ بند کر دیا تھا نا ــــ ؟"

"ہاں، خوب اچھی طرح"

"پھر عزیز کیسے آئے گا ــــ ؟"

"وہ اشارہ دے گا تو دروازہ کھول دیا جائے گا"

"ٹھیک ہے۔ اب اگر تمہیں واقعی یقین ہے کہ کسی نے تمہارا تعاقب نہیں کیا، تو روشنی کر دو۔ اس کے

اگر کوئی خاتون خلاف توقع ٹھوں پڑے پر ہو تو کچھ لینا دینا تمہاری غیرت نہیں ہے۔"

دوسرے لمحے کمرے میں لیمپ روشن ہونے پر معلوم ہوا کہ ان دو نفوس میں ایک عورت ہے اور دوسرا مرد۔ اس قدر شہر میں ان دونوں کی ٹکر کا بدمعاش جوڑا ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ عورت کے بال لڑکوں کی طرح اگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا ان میں سالوں سے کنگھی نہیں کی گئی اس کا لباس بھی بہت پراگندہ حالت میں تھا۔ آنکھیں گہری اور شعلے کی مانند چمک دار تھیں۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال ہوگی۔ مرد بھی بہت گندہ اور گھناؤنی حالت میں تھا۔ اپنی لمبی جیبوں میں سے اس نے شراب کی ایک بوتل اور نمکین سنبوسوں کی ٹینڈلی نکال کر میز پر رکھ دیا چند سنبوسے وہ اس عورت کے سامنے رکھ کر دو گلاس اٹھا لایا۔ اس کے بعد عورت کا حکم پاکر وہ بھی میز کے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

سنبوسے کی پلیٹ خالی کر کے اور شراب کی پوری بوتل چڑھا کر دونوں نے سکون سے ڈکار لی۔ عورت نے جیب سے ایک پتلی سگار نکال کر اور اسے سلگا کر کش لیتے ہوئے دھوئیں کے نیلے مرغولوں کو گھورنے لگی۔

"کیا بجا ہوگا ——؟" تھوڑی دیر بعد اس نے مرد سے دریافت کیا۔

مرد کے جواب دینے سے قبل ہی ایک ہلکی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ مرد نے فوراً سگریٹ پھینک کر لیمپ بجھا دیا اور دروازے کی طرف لپکا۔

مرد کی اتنی بوکھلاہٹ سے بے تعلق عورت اطمینان سے بیٹھی ہوئی اپنے سگار سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

پردہ اسے دوار دی آمد کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے بیٹی کوٹ کے اندر سے ایک چھوٹا سا آٹو میٹک پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ نیچے کے کمرے سے ہلکی سی آواز آئی ——

"دروازہ بند کردو!"

دروازہ بند ہونے کی آواز، پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیا سلائی کی روشنی میں اس نے ایک شخص کی صورت آگے بڑھتی ہوئی دیکھی جو قبل اس کے کہ کچھ کرے میں تھا۔ لیکن عورت نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی وہ اس دوسرے شخص کی طرف متوجہ تھی جو دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بہت جھک کر عورت کو سلام کرنے کے بعد ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اس کا لباس کافی بھڑک دار اور قیمتی تھا۔ اس نے عورت پر ایک غور میں نگاہ ڈالی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔

"کیا خبر لائے ہو ——؟" عورت نے دریافت کیا۔ لیکن اس بار اس کی آواز کا لہجہ تبدیل ہو چکی تھی معلوم ہوتا تھا کوئی نوجوان لڑکی بول رہی ہے۔

نووارد جو شکل و صورت سے چھٹا ہوا غنڈہ معلوم ہوتا تھا بولا:۔

"کام ہوگیا۔ میں نے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی اور بینک کے باہر بیٹھا رہا اور بالآخر ہمارا دوست باہر باہر نکلا۔ ایک ہفتہ متواتر انتظار کرنے کے بعد یہ سنہرا موقع ہاتھ آیا۔"

"بے کار بکواس مت کرو۔" عورت گرج کر بولی "تمہیں تنخواہ اور کس لئے دی جاتی ہے؟" پھر کیا ہوا بولو ——؟"

وہ چھپے بینک سے باہر نکلا تھا" اس نے بیان کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بیگ تھا۔ اس وقت بازار میں چہل پہل زیادہ تھی۔ وہ نہیں بیگ دیں ہاتھ سے جھپٹ لیتا۔ وہ اپنی بیوک میں بیٹھے کر کلب گیا۔ میں نے ٹیکسی پر اس کا تعاقب کیا۔ آدھا گھنٹہ کلب میں ٹھہر کر وہ واپس باہر آیا۔ بیگ اب بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہاں سے روانہ ہو کر وہ سرکل اسٹریٹ گیا۔ ایک عورت کی دوسری منزل پر ایک گھنٹہ ٹھہرا۔ واپسی پر بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اب اس طرح ہلکا تھا جیسے وہ بہت ہلکا ہو گیا ہوگا۔ غالباً اس کے اندر کی چیزیں وہ وہیں دوسری منزل پر ہی چھوڑ آیا تھا"

"ہاں ہاں آگے کہو۔" عورت نے حکم دیا۔

خنزیرہ نگاہ لہجے کو اپنے لئے باعث ہتک سمجھ کر عورت کی طرف نفرت اور حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا لیکن آٹومیٹک پستول اس کے ہاتھ میں دیکھ کر اپنے جذبات کو دبانے پر مجبور ہو گیا۔ عورت کی اس کے جذبات سے آگاہ ہو چکی تھی تیکھے لہجے میں بولی۔

"ہوشیار رہنا عزیز! میں تم جیسے کتوں کو چٹکیوں میں مسل دیا کرتی ہوں۔ اگر کوئی شرارت کی تو گولی سینے کے پار ہوگی ——!"

"اس کے بعد ——" عزیز نے سر جھکا کر کہا۔ وہ سرکل اسٹریٹ کے عقب میں واقع اپنے بنگلے میں چلا گیا اور اندر کمرے تک باہر نہیں آیا۔ میں نے بنگلے کے ساتھی سوئپر سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی باہر نہیں جائے گا اس کے بعد میں یہاں چلا آیا ——"

"سوئپر بہادر کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے کیا کہنا ہے ——؟" عورت نے پوچھا۔

"جی ہاں ——" عزیز نے جواب دیا۔

"کیا دروازہ رات کو بند رہتا ہے؟"

"سوئپر بہادر نے یقین دلایا ہے کہ وہ رات کو دروازہ کھول دے گا۔" عزیز نے جواب دیا "گیارہ بجے رات کو وہ اپنے بنگلے کے لئے دودھ لینے کو اپنے چپڑاسی کو بھیجے گا"

"گیارہ بجے ——" عورت نے کہا۔ "ٹھیک ہے ابھی دس بجا رہے ہیں —— جانی ——! تم جا کر کار نکالو میں سرکل اسٹریٹ کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ عزیز! تم عقب میں پہرا دو گے۔ جانی میرے ساتھ اندر جائے گا۔ تم بہت عجلت کے ساتھ کیا جانا کہ کیا کرنا ہے ——؟"

"جی ہاں ——!" ٹیکسی ڈرائیور جو اب جانی بن چکا تھا جواب دیا۔

"جاؤ!"

سر چکرانے لگے۔ پانی باہر چلا گیا۔ اغوا کی بقیہ ساری ذمہ داری اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ عورت نے ایک لمحہ گنوائے بغیر سلنڈر اٹھا لیا۔ اسی وقت باہر سے کچھ ملکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنا آٹو میٹک پستول اٹھایا اور تیزی سے دروازے کی طرف گئی۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا اس تبدیل کیا۔ خوبصورت قیمتی پوشاک زیب تن کی۔ چہرے پر سیاہ ریشمی نقاب ڈالا اور ایک بار آئینے میں نگاہ ڈالی۔ اس وقت وہ ایک خوبصورت خوبصورت دوشیزہ میں تبدیل ہو گئی تھی اور اصلیت کچھ بھی تھی کہ وہ زیادہ عمر کی نہ تھی۔ اس نے جھک کر لیمپ گل کر دیا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس وقت اس میں غضب کا بانکپن تھا اور دیکھنے والے ہزار جان سے اس پر تصدق ہو سکتے تھے۔ اب وہ پہلے والی ادھیڑ عمر خیانت عورت نہیں۔ بلکہ رنگون کی ملکہ حسن تھی جسے ہر کی اور اپنی سوسائٹی تو کے نام سے اچھی طرح جانتی تھی۔

باہر گلی کے موڑ پر کار اس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ کوئی معمولی کار نہیں بلکہ روس ساخت لیکن سوار ہونے والی بھی تو معمولی عورت نہیں، تو تھی۔۔۔۔

تو کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور عزیز و جانی اگلی نشستوں پر بیٹھے۔ جسینہ اس وقت اپنے خیالات میں غرق تھی۔ اس وقت اسے بار بار جوشی کی یاد ستا رہی تھی۔ جنوب ایشیا کا سب سے بڑا مجرم جوشی، جو ایک بین الاقوامی تنظیم کا منتظم تھا اور ساتھ ہی ساتھ تو کا عاشق جاں نثار۔۔۔ ہزاروں مجرموں، قاتلوں، قتب زنوں اور غنڈوں کا مطلق العنان بادشاہ، اس کے ادنیٰ اشاروں پر رقص کرتا تھا۔

سیلون جس کا نام پہلے راوانہ تھا یعنی راون راجاؤں کا بادشاہ۔ پاکستان کے مجرم حلقے اسے کلب بار کے نام سے پکارتے تھے۔ تو نے اس کی اولین ملاقات دنیا کے حسین ترین خطہ کشمیر میں ہوئی تھی اور جرائم کی دنیا کی ان مذ اول کی دو ہستیوں نے ایک دوسرے میں ناقابل بیان کشش محسوس کی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں نے ساتھ ساتھ ساتھ دیتے کتنی بار دنیا کے مختلف حصوں کی سیاحت کی اور تب تو پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ ہزاروں مجرموں کی قسمت کی باگ ڈور اس فرد واحد جوشی کے اکیلے ہاتھ میں ہے جو اس وقت اس پر شاں پر دانہ تصدق ہوتا ہے۔ تو نے اپنے آپ کو جوشی جیسی مقتدر ہستی کی معیت میں قطعاً محفوظ سمجھتی تھی۔ بس اگر کچھ تھوڑا سا خدشہ تھا تو وہ ہندوستان کے شہرۂ آفاق پائیونیٹ سراغ رساں شمیم اختر کی جانب سے!

اس اولین ملاقات کے بعد جوشی اور تو ایک دوسرے کے نزدیک تر آ گئے تھے۔ اس وقت وہ دونوں اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی کھیل رہے تھے۔ اگر وہ کامیاب رہے تو تمام ایشیا دانتوں تلے انگلی دبائے گا۔

"یقیناً ہم کامیاب ہوں گے۔۔۔" تو مسکرا کر آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

مسٹر چڈی رنگون کے مشہور بینکر تھے۔ کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا کہ انھوں نے اچانک اتنی دولت کیسے کما لی۔ کہ آج دنیا کے ہر گوشے میں ان کے بینک کا شہرہ پھیل گیا چند سال پہلے وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ مسٹر چڈی نے کئی بعید ترین ایجادوں کا استعمال کیا۔ ان کے بینک میں مذہبی داروں کو دوسرے بینکوں کی بہ نسبت زیادہ سود ملتا تھا اور ہر ماہ انعامات کی لاٹریاں الگ نکلتی تھیں۔ اس قسم کی ترکیبوں سے ان کا کام خوب چمک گیا تھا لیکن اس طرح کام کب تک چل سکتا تھا۔ معاملی حلقے کے اصل دماغ کی باگ ڈور انگلینڈ اور امریکہ کے دوسرے بڑے بینکروں کے ہاتھ میں تھی اور ہزار بڑھ جانے کے بعد بھی مسٹر چڈی ان عظیم اداروں سے ٹکرانے کی جرأت نہ تھی۔ انھوں نے دوسرا ہی پروگرام مرتب کر رکھا تھا۔ معاقبت اندیشی کے طور پر ایک چھوٹا سا تیز رفتار جہاز بندرگاہ پر ہر وقت تیار رہتا تھا ان کا خیال تھا کہ چند لاکھ روپے اور جمع ہو جائیں تو وہ چپ چاپ کسی طرف کھسک جائیں اور اپنی نئی زندگی کی ابتدا

بیل رکھیں۔ اس وقت تک وہ پچاس لاکھ کے قریب پہنچ کر چکے تھے۔

مسٹر چڈی نے جوشی کا نام سنا جیسا نہ سنا ہو لیکن تو، سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ تو کی مسٹر چڈی کے ارادوں سے آگاہ تھی۔ تو یا جوشی کا کیونکہ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ مخبر صیغہ جنوب ایشیا میں ہر چہار طرف پھیلا ہوا تھا۔ تو نے جوشی کو مسٹر چڈی کے ارادوں سے تو باخبر کر دیا تھا۔ لیکن ابتدے بڑے بینکر کو گرفت میں کر لینا کچھ تو آسان کام نہ تھا۔

جوشی کی صلاح پر عمل کرتے ہوئے چند تحتوں کے ساتھ تو مسٹر چڈی کی سخت نگرانی کرنے لگی۔ ہفتے دن کے طویل انتظار کے بعد آخر وہ ساعت آئی۔ تو کو کامیابی کا پورا پورا یقین تھا۔ باہری خبریں مہیا کرنے کے لئے جانی تھیں تھا اور اندرونی انتظام مکمل رکھنے کے لئے سورج بہادر کا تقرر کیا گیا تھا۔ جو فی الحال مسٹر چڈی کا معتمد خاص بنا ہوا تھا۔ اگر اس کی مہیا کردہ اطلاع درست تھی تو مسٹر چڈی آج رات کو رنگون سے رخصت ہونے والے تھے۔

لیکن ایک چھوٹی سی خامی ان لوگوں کے انتظام میں رہ گئی تھی۔ مسٹر چڈی نوٹوں سے پر ہینڈ بیگ لے کر اپنے بنگلے پر آنے سے قبل ایک دوسری عمارت میں بھی گئے تھے کیا اس نے ہینڈ بیگ وہاں خالی کر دیا۔۔۔ یا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہینڈ بیگ اپنے کمرے پر لایا۔۔۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ لیکن تو کو اب تک کی نوٹ چڈی کے بنگلے میں ہی ہوں گے۔ بہر حال۔۔۔۔۔

دودھ کی اوٹ

سورج بہادر کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ تھی اور تو کے ہاتھ میں آٹو میٹک پستول۔ سورج بہادر نے آہستہ سے جانی کے کان میں کچھ کہا اور اس کے سر دروازہ بند کر دیا وہ آگے بڑھا۔ تو نے عزیز کے شانے کو تھپک کر سورج بہادر کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ تو ان دونوں کے عقب میں تھی۔ وہ ایک دوسرے کمرے میں پہنچے۔

"رانی صاحبہ! "سورج بہادر نے خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ کو کچھ دیر صبر نا ہوگا"

"ابھی کتنی دیر ہے ــــ؟" خود نے دریافت کیا

جواب ملا "کہہ نہیں سکتا۔ وقت آگیا ہے چڈی صاحب کسی لمحے میں بھی مجھے پکار سکتے ہیں"

"کیا اس کے ہمراہ اور کوئی بھی ہے ــــ؟"

"نہیں ــــ"

"دوسرے نوکر کہاں ہیں ــــ؟"

مسٹر چڈی نے انھیں خود ہی آرام کرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ کہا تھا کہ مجھے آج ایک کام کرنا ہے ــــ"

"کیا اس نے اپنا سامان بھی پیک کر لیا ہے ــــ؟" خود نے پوچھا۔

"ان کے کمرے میں دو بیگ ہیں ــــ" سورج بہادر نے جواب دیا۔ "ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں ــــ"

"یہ تم نے کیسے معلوم کر لیا ــــ" خود نے تنک کر کہا۔ "محض دو بیگوں کی موجودگی اس کی روانگی کا مکمل ثبوت نہیں ہے کہ اس نے کسی سے فون پر گفتگو کی تھی؟"

"جی نہیں ــــ میں زیادہ تر فون کے قریب ہی موجود رہا ــــ"

"خیر ــــ" خود نے کہا ــــ "جب مسٹر چڈی تم سے دودھ طلب کریں تو دروازہ کچھ کھلا چھوڑ دینا ــــ سمجھے ــــ؟"

"جی ہاں سمجھ گیا، دروازہ کچھ کھلا چھوڑ دوں گا" سورج بہادر نے کہا۔

"عزیز ــــ!" خود نے دوسرے دہشت کو قریب بلایا ــــ "تم کو جانی نے تمام باتیں سمجھا دی ہیں نا ــــ یا ابھی کچھ اور پوچھنا ہے ــــ؟"

"جی نہیں، مجھے اپنا کام سمجھا دیا گیا ہے"

"اچھی طرح سمجھ گئے ہو نا ــــ؟"

"جی ہاں حرف بحرف!"

خود نے بدستور اسی کے ہاتھ میں تھما دیا اور اپنی حسین مخروطی انگلیوں سے اس کی کنپٹی چھو کر کہا ــــ "ٹھیک اسی جگہ پر گولی پڑنی چاہئے ــــ سمجھے ــــ؟"

"بہت اچھا ــــ"

"صرف ایک فائر میں کام ہو جانا چاہئے ــــ"

"آپ مطمئن رہئے رانی صاحبہ! عزیز کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا ــــ"

"شاباش!" خود نے کہا ــــ "مجھے تم سے یہی امید ہے۔ بالکل نزدیک کھڑے رہنا اور لگن ہو تو پاؤڈر سے تمام نشانات مٹا دینا ــــ"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی رانی صاحبہ!"

ان لوگوں کو کام سمجھا کر خود ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت گھنٹی بجی۔ سورج بہادر نے دبے پاؤں قریب آکر کہا ــــ "تیار ہو جاؤ ــــ؟"

خود فوراً کھڑی ہو گئی اور عزیز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی ــــ "جاؤ گھبراؤ نہیں، خود اور جوشی تمہاری پشت پر ہیں ــــ"

تینوں باورچی خانہ میں چلے گئے وہاں سورج بہادر نے پلیٹ میں دودھ کا گلاس رکھا۔ آگے آگے سورج بہادر ہو لیا اور اس کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں عزیز چلنے لگا خود وہیں سے دیکھتی رہی۔ مسٹر چڈی کی خواب گاہ کا دروازہ اس وقت بھی مقفل نہ ہوا تھا۔

غالباً چڈی نے اسے سورج بہادر کے انتظار میں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ سورج بہادر بھڑ سے ہوئے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندر چلا گیا۔ مسٹر چڈی پیٹھ پر جھکے ہوئے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ خود اپنے خیالات کے آئینے میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ سورج بہادر اور آگے بڑھے گا، چڈی بھر کے اشارے پر اسے اور آگے بلائیں گے۔ عزیز اس کے قریب پہنچے گا اور پھر ..... !

"سپٹ!" ایک ہلکی سی آواز آئی، اتنی خفیف کہ دور کے کمروں میں کھڑے ہوئے لوگ اسے بخوبی سن سکتے تھے۔ خود نے عزیز کو جو پستول دیا تھا اس میں سائلنسر لگا ہوا تھا۔

عزیز نے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی تھی ــــ!

مسٹر ٹوٹو!

دو دن بعد سلیم خود شمیم اختر کے پاس جانے کا خیال کر رہا تھا۔ لیکن جب جمنا روڈ پر سے خادم نے فون سے اسے مطلع کیا کہ شمیم اختر اس وقت رنگون میں ہے تو اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔

خادم نے کہا "سرکار جاتے ہوئے ہدایت کر گئے ہیں کہ آپ اپنی جگہ کام کرتے رہیں ــــ"

"انھوں نے کب واپس آنے کو کہا ہے؟" سلیم نے دریافت کیا۔

"اس بارے میں انھوں نے کچھ نہیں کہا"

خادم دوسرے سرے سے بولا "آپ وقتاً فوقتاً فون پر دریافت کر لیا کیجئے"

"خیر!" سلیم بولا "اگر اختر صاحب واپس آجائیں تو ان سے کہہ دینا کہ سلیم آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے ــــ"

معلوم نہیں کیا بات ہے کہ شمیم اختر صاحب اچانک رنگون چلے گئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ شمیم اختر کی رنگون کو روانگی کا تعلق اسی پنڈت سوبھاتا جوشی سے ہے ــــ!

سلیم کے ذہن شمیم اختر نے جو فرض عائد کیا تھا وہ اس کی تکمیل کر چکا تھا۔ شوبھا سائیکل کمپنی کا کاروبار باقاعدگی کے ساتھ کسی رجسٹرڈ کمپنی کے مطابق ہی چل رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر حصے میں گورنمنٹ دیہند کے سائیکلوں کا آرڈر کیا جاتا اور دوسرے ممالک سے گورنمنٹ میں بھر کر سائیکلوں کے فریم اور دوسرے پرزوں کی تعداد مسلسل جاری تھی۔ اسے کہیں کسی فریب یا سازش کا

شانہ بہ شانہ نظر آیا۔ کبھی کا کاروبار ترقی پر تھا اور مزدور اپنی جگہ مطمئن تھے۔ سلیم نے آغوش پیچھے لے کیا تھا کہ باآخر چوری جیسا عظیم ترین جرم بھی جرائم سے ننگ و اکراہ تائب ہو چکا ہے اور شریفانہ زندگی گزارنے کے لئے سائیکلوں کی تجارت کر رہا ہے۔

اسی اثنا میں ٹک دوڑ کرنے پر سلیم کو چوری کی تمام گتھی سلجھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ شوجھا چیس نام کی ایک خوبصورت اور عظیم عمارت میں رہتا تھا جو سائکل انڈسٹری سے تقریباً دو میل دور تھی۔

آج سلیم اس عمارت کے اندرونی حصوں کی دیکھ بھال کی غرض سے روانہ ہوا۔ کارخانہ بند ہو چکا تھا مگر شمیم اختر نے اس کے سپرد اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ لیکن سلیم نے سوچا ممکن ہے اس طرح کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے ——

رنگون کے تمام بینکوں میں مسٹر چنڈی کی خودکشی کا چرچا تھا۔ وہ تمام بینک جن سے چنڈی کے بینک کے خاص تعلقات رہ چکے تھے بند ہو گئے۔ جن بینکوں کو اس حادثہ سے نقصان پہنچا تھا انھوں نے ایشیا کے عظیم ترین سراغ رساں شمیم اختر کو معاملات کی تفتیش کرنے کے لئے رنگون بلوایا کہ شاید اس طرح ضائع ہونے والی رقموں کا کچھ حصہ محفوظ کیا جا سکے۔

شمیم اختر کے رنگون پہنچنے تک چنڈی کے سلسلے کی خفیہ باتیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ عوام کو معلوم ہو چکا تھا کہ کس طرح مسٹر چنڈی بینک کا روپیہ نکال کر جمع کر رہے تھے۔ اس راز کو کھولنے والا چنڈی کے پرائیویٹ جہاز کا کپتان تھا۔ اخبارات میں طول طویل مضامین شائع ہوئے کہ بینکوں کے لئے بہت سخت قوانین بنائے جائیں اور ان پر سرکاری بندشیں عائد کی جائیں تاکہ عوام کی دولت محفوظ رہ سکے۔ لوگوں نے مشتعل ہو کر چنڈی کے بینک اور اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے کئی بینکوں کو لوٹ کر جلا ڈالا۔ رنگون کی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ نے اس سلسلہ میں شمیم اختر سے گفتگو کی۔

"میں اس سلسلہ میں نجی طور پر تفتیش کر رہا ہوں" شمیم اختر نے انھیں بتایا "آپ کو یاد ہوگا ابھی کچھ دن قبل ہمارے یہاں بینک آف برما کی ایک شاخ سے بارہ لاکھ روپیہ دغابازی سے وصول کیا گیا ہے۔"

"جی ہاں مجھے یاد ہے" افسر اعلیٰ نے کہا "اس سلسلے میں ہم لوگ مشہور بری تاجر دی پی روشن سے بھی مل چکے ہیں۔"

"بدمعاشوں نے ان کے دستخط بڑی صفائی سے نقل کئے تھے۔" شمیم اختر بولا۔

"تو کیا آپ محض اسی سلسلے میں ہندوستان سے رنگون تشریف لائے ہیں۔؟" افسر اعلیٰ نے شمیم اختر سے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" شمیم اختر بولا۔ "مجھے چند بینکوں نے خاص طور پر اس معاملے کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا ہے کہ میں یہ دیکھوں کہ آیا چنڈی کی خودکشی کے بعد بھی ان کو کچھ رقم واپس مل سکتی ہے یا نہیں؟"

"اوہ ——" افسر اعلیٰ مایوسانہ لہجے میں گویا ہوئے "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسٹر شمیم! کہ چنڈی سے تعلق رکھنے والا ایک پیسہ بھی محفوظ نہیں ہے!"

"خیر دیکھا جائے گا" شمیم اختر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چنڈی نے تقریباً ۶۵ لاکھ روپیہ اڑا دیا تھا اس کے بینک کی شاخیں مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ گزشتہ کئی سال سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہر شاخ سے تھوڑا تھوڑا روپیہ اکٹھا کر رہا تھا ——" افسر اعلیٰ برمی پولیس نے شمیم اختر کو سمجھایا۔

"تو کیا حصہ داروں کو قطعاً مایوس ہو جانا چاہئے؟" شمیم اختر نے پوچھا۔

"میرا تو یہی خیال ہے" جواب ملا۔

"اور کیا آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ" شمیم اختر نے ان سے دریافت کیا "کہ جب چنڈی بینک کو دیوالیہ کر واپس کرنے میں ناکام رہا تو اس نے خودکشی کر لی۔؟"

"اخبارات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے ——" انھوں نے جواب دیا۔ "بہرحال ہمارے محکمہ کی جانب سے مسٹر ٹوٹو اس کیس کی تفتیش کر رہے ہیں ——"

ٹوٹو کا نام سن کر شمیم اختر کا انتخاب اور ترقی کر گیا۔ مسٹر ٹوٹو برما کی خفیہ پولیس کے بڑے ذہین افسر تھے۔ بلکہ لوگ انھیں کو برمی خفیہ پولیس کی جان سمجھتے تھے۔ برما کے ہزاروں بدمعاش محض اسی فرد واحد کی بدولت کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے۔

بذات خود شمیم اختر کئی بار مسٹر ٹوٹو کے ساتھ مل کر کام کر چکا تھا اور ٹوٹو کی مہارت کا قائل تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ محض چنڈی کی خودکشی کا معمولی واقعہ نہیں ہے، ضرور اس کے پس پردہ کوئی عظیم سازش ہو گی ورنہ ٹوٹو جیسی ہستی ایسے معمولی واقعات میں دلچسپی نہ لیتی۔ شمیم اختر کی خاموشی دیکھ کر پولیس کے افسر اعلیٰ نے اندازہ لگایا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے، انھوں نے کہا:

"غالباً آپ سوچ رہے ہیں کہ مسٹر ٹوٹو اس کیس میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس بینک میں ان کا کافی ذاتی روپیہ بھی ڈوب گیا ہے، لیکن آپ خود ہی مسٹر ٹوٹو سے مل لیجئے گا —— آج شام کو آپ میرے غریب خانہ پر چائے پیجئے۔ میں مسٹر ٹوٹو کو بھی دعوت نامہ بھجوا دوں گا ——"

"شکریہ!" شمیم اختر نے کہا "میں ان دوسرے معاملات پر بھی مسٹر ٹوٹو سے گفتگو کر سکتا ہوں ——؟"

"کیوں نہیں ——!" اعلیٰ پولیس افسر نے جواب دیا۔

اسی شام کو چائے پیتے ہوئے مسٹر ٹوٹو اور شمیم اختر سرگرم گفتگو تھے۔

ٹوڈ صاحب! "شمیم اختر نے کہا" آپ کو یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ چنڈی نے خودکشی نہیں کی ہے؟"

"کون کہتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے۔" ٹوڈ نے دریافت کیا۔

"اگر یہ محض خودکشی کا معاملہ ہوتا۔" شمیم اختر مسکرا کر بولا "تو آپ جیسا مصروف آدمی اس میں کبھی دلچسپی نہ لیتا۔"

"اوہو!" ٹوڈ نے کہا۔ "غالباً کمشنر صاحب نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں نے اس معاملہ کی تفتیش کا بار اپنے سر لے لیا ہے کیا انھوں نے آپ سے یہ بیان نہیں کیا کہ میرا بہت سا ذاتی روپیہ اس بینک میں جمع تھا؟"

شمیم اختر نے مسکرا کر تائید میں سر ہلا دیا۔

"کیا پھر بھی میری دلچسپی کا سبب صاف نہیں ہوا؟"

"نہیں میرے دوست!" شمیم اختر نے اس کا دایاں ہاتھ تھپک کر کہا "میری تسلی ان باتوں سے نہیں ہو سکتی، آپ سچ سچ بتلائیے کہ کیوں اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں۔" مسٹر ٹوڈ نے کہا۔

شمیم اختر نے اپنے رنگون آنے کا سبب اسے بتلا دیا "کیا آپ میرے ہمراہ چنڈی کے بنگلے پر چلنا پسند کریں گے؟" ٹوڈ بولا۔

"بخوشی۔" شمیم اختر نے جواب دیا۔ "بشرطیکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔"

"مجھے مسرت ہوگی۔" ٹوڈ نے کہا۔ "کیا آپ نے اخبارات میں اس سلسلے کی خبریں دیکھی ہیں؟"

"جی ہاں۔" شمیم اختر نے جواب میں کہا "میں ہندوستانی اور برمی اخبارات میں تمام خبریں پڑھ چکا ہوں۔"

"میں نے دو ایک نتائج اخذ کئے ہیں۔" ٹوڈ نے بتلایا "اور یقیناً آپ بھی تفتیش کے بعد انھیں نتیجوں پر پہنچیں گے۔ چنڈی نے کئی لاکھ روپے جمع کر لئے تھے دی ہلی روشن صاحب سے بھی مجھے چنڈی کے ارادوں کا حال معلوم ہوا ہے۔"

"خوب!" شمیم اختر نے کہا "میں بینک آف برما کی ہندوستانی شاخ کی جانب سے بھی کام کر رہا ہوں۔ یہ نام اس سلسلے میں بھی آیا تھا۔"

"خیر۔" ٹوڈ نے کہا۔ "فی الحال تو سوال یہ ہے کہ جب چنڈی نے کئی لاکھ روپے بینک سے نکال کر جمع کر لئے تھے تو پھر اسے خودکشی کی حاجت کیوں درپیش ہوئی ہے؟"

"بہت ممکن ہے اس نے یہ رقم جوئے یا سٹے میں تلف کر دی ہو۔" شمیم اختر نے جواب میں دلیل پیش کی۔

"جی نہیں۔" ٹوڈ نے کہا "میں نے اس پہلو سے بھی معاملے پر غور کیا ہے۔ رقم کا ضائع ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل چنڈی اپنی محبوبہ کے ہمراہ رنگون بلکہ برما ہی سے فرار ہونے کی فکر میں تھا۔"

"اگر آپ کی معلومات واقعی درست ہیں۔" شمیم اختر نے کہا۔ "تو ایسی حالت میں کوئی شخص بھی خودکشی کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"جی ہاں جناب! اسی بات نے تو مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔" ٹوڈ نے کہا۔ "جب مسٹر چنڈی اپنے بینک سے باہر آئے تو ان کے پاس کافی رقم تھی اس دن انھوں نے اپنے گھر جا کر لائبریری روم میں کافی دیر تک کام کیا اور اس کے بعد انھوں نے اپنے نوکر کو دودھ لانے کا حکم دیا۔ نوکر پلیٹ میں گلاس رکھ کر کمرے میں پہنچا۔"

"خوب خوب!" شمیم اختر نے کہا۔ "اس کیس میں میری دلچسپی بتدریج بڑھتی جا رہی ہے!"

"نوکر نے دروازے پر دستک دی۔" مسٹر ٹوڈ نے تقریر کو آگے بڑھاتے ہوئے بیان کیا "کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی نوکر کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ چنڈی زمین پر لڑھکا پڑا ہے۔ اس کی پیشانی میں سوراخ تھا۔ اور اس سے خون رس رس کر باہر بہہ رہا تھا۔ ٹوڈ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ اس کے بیان پر کارونر نے خودکشی کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ اور اخبارات میں بھی یہی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد چنڈی کے بینک کی جانچ پڑتال کے لئے کمیشن بیٹھا اور تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ بینک سے تقریباً ۵ لاکھ روپے کی رقم غائب ہے۔"

"اچھا تو آپ کا خیال ہے کہ یہ واقعہ خودکشی کا نہیں ہے؟" شمیم اختر نے پوچھا۔

ٹوڈ خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک رقعہ شمیم اختر کی طرف بڑھا دیا، جس پر لکھا ہوا تھا۔ "سورج بہادر" اور اس کے نیچے اس نام کے مجرم کے جرائم کی روداد اور حالات زندگی درج تھے۔

شمیم اختر نے پڑھ کر کہا۔ "یہ نام تو مجھے یاد ہے۔ غالباً یہ کسی زمانے میں فوبا ناتھ جوشی کا ساتھی تھا"

"جی ہاں۔" مسٹر ٹوڈ نے مختصر سا جواب دیا۔ "اور یہی شخص مسٹر چنڈی کا وہ ملازم ہے جو واردات کی شب کو ان کے پاس دودھ لے کر گیا تھا۔"

خودکشی یا قتل؟

"سورج بہادر۔ شوبھا ناتھ جوشی کا ہمراہی" شمیم اختر نے ایک بار پھر وہ رقعہ پڑھا۔ "برمی جاسوس

ٹوٹو اس وقت بڑے اطمینان سے اپنے سگریٹ کے ساتھ مشغول تھا۔ شمیم اختر نے دیکھا کہ وہ رپورٹ دراصل سلیم کی تیار کردہ تھی۔ اور کسی طرح ٹوٹو کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس رپورٹ میں آخری نوٹ تھا۔

"سورج بہادر فی الحال مسٹر چڈی کا معتمد خاص ہے۔"

"کیا اسی شخص کی موجودگی سے آپ خودکشی سے مشکوک ہو گئے ہیں۔؟" شمیم اختر نے بری سراغ رساں سے دریافت کیا۔

"یہ بھی ایک وجہ ہے۔" اس نے جواب دیا "ایک دوسری وجہ اور بھی ہے" اس نے دراز کھول کر پستول نکالا اور شمیم اختر کے ہاتھ میں دے کر بولا "آپ تو ایسے اسلحہ کے ماہر ہیں۔ ذرا اسے دیکھئے تو؟"

شمیم اختر نے الٹ پلٹ کر غور سے پستول کو دیکھا اور ٹوٹو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا:۔

"اس میں دس گولیاں آ سکتی ہیں اور فی الحال آٹھ بھری ہیں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ چڈی پر محض ایک گولی چلائی گئی تھی۔ کیا خالی کارتوسوں کے کیس بھی ہے؟"

"جی ہاں۔" ٹوٹو نے جواب دیا "یہ ایک کیس ملا تھا۔ لیکن پاؤڈر کی وجہ سے ہاتھ کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے۔"

شمیم اختر نے جیب سے محدب شیشہ نکال کر اس کی مدد سے ایک بار پھر پستول کا بغور معائنہ کیا پھر وہ اسے کھڑکی کے قریب روشنی میں لے جا کر تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا اور آخر واپس آ کر اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا:۔

"اس کی نالی میں سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ وہ ملا یا نہیں۔؟"

"آخر آپ نے یہ بات معلوم کر ہی لی۔" ٹوٹو اسے تحسین بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا "ماہرین اسلحہ کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن کوئی سائیلنسر جائے واردات پر نہیں پایا گیا۔"

"سورج بہادر کا بیان کیا ہے۔؟" شمیم اختر نے دریافت کیا "وہ چڈی کے بلانے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔؟"

"جی ہاں، وہ یہی بیان کرتا ہے۔" ٹوٹو نے جواب دیا۔

"لیکن وہ جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے۔؟"

"یہ بھی ممکن ہے۔" بری سراغ رساں نے کہا۔

"جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ سورج بہادر کا بیان سراسر غلط ہے۔" شمیم اختر نے کہا۔

"اگر وہ چڈی کے بلانے کی گھنٹی بجتے ہی دوڑ کا خود کشی کرنے میں پہنچ گیا تھا تو اتنی دیر میں چڈی کے لئے خودکشی کر لینا ناممکن تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے پستول چلنے کی آواز نہ سنی ہو کیونکہ سائیلنسر کی وجہ سے آواز بہت ہی مدھم ہو گئی ہو گی۔ لیکن یہ ٹیڑھی قسم کی بات ہے کہ سورج بہادر کے اندر پہنچتے ہی چڈی نے خودکشی کر لی ہو اور اس اثنا میں کہ اس نے پستول سے سائیلنسر چھپا دیا ہو۔"

"آپ کی دلیل درست ہے۔" ٹوٹو نے تسلیم کیا "تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے" شمیم اختر بولا "کہ سائیلنسر کس نے نکالا؟ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس پر بھی غور کیا ہو گا۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔؟"

"وہ بھی خودکشی کی ہی رائے دیتا ہے۔"

"تو پھر سائیلنسر والا قصہ نہیں سمجھ سکتا۔" شمیم اختر نے کہا۔

مسٹر ٹوٹو نے کہا "سورج بہادر ہی سے اس معاملے پر روشنی پڑ سکتی ہے۔"

"کیا آپ کا خیال ہے۔" شمیم اختر نے کہا "کہ سورج بہادر کو اس بات کا علم کس طرح ہو گیا تھا کہ چڈی کا ایک گراں قدر رقعہ کہ نواب دیا ہے، اپنے چڈی کو قتل کر دیا۔؟"

"میں نے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی لیکن اس کیس سے میری دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔"

"مسٹر ٹوٹو!" شمیم اختر بولا "میرا خیال ہے کہ قتل سورج بہادر نے نہیں کیا۔ بلاشبہ اس نے اس کے لئے بہت آسان کام ہے۔ حاصل کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں ہو سکتا ہے۔ ہماری رپورٹ کہتی ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا یقیناً اس سازش میں کوئی زبردست ہاتھ ہے۔"

لیکن شمیم اختر نے صاف صاف نہیں بتایا جس سے ٹوٹو کو شبہ ہوا کہ شمیم اختر کو کسی پر شک ہو گیا ہے۔

"کیا آپ چڈی کے بھتیجے پر بھی شک کریں گے؟" ٹوٹو نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، ایسی صورت میں ایک دفعہ اس کو دیکھنا پسند کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس بات چڈی نے کپتان کو بھی ہدایت دے رکھی تھی۔ لیکن اس کے بیگ سے ایک پیسہ بھی نہیں نکلا۔"

"یہ بات تو اور بھی حیرت ناک ہے۔"

"اس کی میز کی دراز میں سے محض ہیں۔" ٹوٹو نے کہا۔

اپنے تعجب کا اظہار کرنے کے بعد شمیم "اچھا صاحب اب مجھے رخصت کیجئے۔ میرے موکل منتظر ہوں گے۔ ہاں آپ کہہ چڈی کی مجبوبہ سے ملے تھے۔ کیا اس سے بات معلوم ہو سکتی ہے۔؟"

"اس سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب اس سے معلوم ہونے کی امید نہیں۔"

"چڈی کی لاش کہاں ہے۔"

(باقی صفحہ ۴۶ پر ملاحظہ

مترجمہ روشن پنیالوی

پیاسی روحیں

موپاساں کا ایک شاہکار

ہر شکر وار کو بڑی پابندی سے صبح گیارہ بجے کے قریب صحن میں آتا۔ بانی ڈم لینسکیپ اپنی بانہوں پر رکھ کر اپنے ستار کے تاروں کو چھیڑتا۔ اور اونچی اور مؤثر آواز میں کوئی دھن الاپنے لگتا۔ بارکوں جیسی اس عمارت کے چاروں طرف ہر کھڑکی سے لڑکیاں اس کی طرف جھانکنے لگتیں۔ ان میں سے کوئی نفیس گاؤن اور کوئی چھوٹی واسکٹ یا محض انگیا ہی پہنے ہوتی۔ ان میں سے زیادہ تر لڑکیوں کے سینے ادھ کھلے اور بازو عریاں ہوتے تھے۔ وہ تقریباً اسی وقت نیند سے بیدار ہوتی تھیں۔ جلدی میں بالوں کے جوڑے باندھ کر دھوپ کی چمک میں اپنی آنکھوں کو مسکاتے ہوئے اڑے اڑے سے چہروں اور نیند کی کمی سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ کھڑکیوں میں آجاتی تھیں۔ وہ اس مغنی کے شیریں نغمے سن کر مستی میں جھومنے لگتی تھیں اور مسرور ہو جاتی تھیں۔ تانبے اور چاندی کے سکے خوبصورت مغنی کی ٹوپی میں دھڑا دھڑ گرنے لگتے تھے۔ اور ان میں سے بہت سی لڑکیاں شاید خود بھی سکوں کے ساتھ مغنی کے قریب پہنچنے کے لئے بے تاب ہوتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ فرار ہو جانا چاہتی تھیں۔ جس کی آواز میں جادو تھا۔ اور وہ گویا ان جوان دوشیزہ لڑکیوں کو یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ "آؤ۔ میری آرام گاہ میں چلو۔ جہاں تمہیں تمنا اور طغیانی نہ ہوگی۔ پھولوں کے ہار کبھی خشک نہیں ہوتے اور محبت و مسرت جو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، ہمیں ملے گی۔

جب وہ مغنی پرانی رومانی داستانوں سے دلچسپ گیت چھیڑتا تو انھیں گویا مندرجہ بالا قسم کے الفاظ سنائی دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ کسی دیگر شخص کو اس مغنی کی موسیقی کے تاثر کا یہ ثبوت کافی تھا کہ ان لڑکیوں کے رخساروں سے گلاب کے پھولوں سا رنگ اور آنکھوں سے کسی شب بیدار صوفی کی طرح نور و جلال کی جھلک نمایاں تھی۔ جو کہ گویا ایک لمحہ کے لئے معصوم فرحات لڑکیوں کی آنکھوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور تانبے اور چاندی کے سکے مسکراہٹوں کے درمیان برسائے جاتے جب کہ راہگیر انھیں دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے۔ اس جہل پہل سے جیل کے احاطے کا سایہ صحن ایک ایسا پنجرہ نظر آنے لگتا جس میں لاتعداد پرندے چہچہا رہے ہوں۔ ان میں سے بعض لڑکیاں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکتی تھیں اور بے ساختہ کہہ اٹھتی تھیں "یہ مغنی کتنا خوبصورت ہے؟" "جذبۂ عشق سے سرشار آنکھوں کو مسکاتے ہوئے وہ پکار اٹھتیں "ہائے! خدا کی پناہ۔ یہ کتنا دلفریب اور پرکشش ہے!"

وہ واقعی خوبصورت تھا۔ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بادام جیسی تھیں منہ کمان کی طرح تھا جو لمبے سیاہ، گھنگھریالے بالوں اور گھنی مونچھوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا سر کسی بال سنوارنے والے کی دوکان کی زینت بننے کے لائق تھا جو چیز اس سے سب سے زیادہ جاذب توجہ بنی تھی وہ اس کی خود مغنی میں بے نیازی کی جھلک تھی۔ کیونکہ اس کی مسکراہٹوں اور تیز نظروں کا جواب نہ دینے سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ گانا بند کر کے وہ اپنے کندھوں کو ہلاتا اور شرارت آمیز طریقے سے آنکھیں مٹکاتا اور ہونٹوں کو نفرت آمیز انداز میں ہلایا کرتا تھا۔ ان حرکات و سکنات کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ یہ سب ان لڑکیوں کے لئے نہیں کر رہا تھا۔

یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ طور پر نفرت کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ رسیا لڑکیاں اسے فیر شاطر اور رومان سے عاری سمجھ کر اس سے محبت کرنے کا خیال ترک کر دیں۔ کیونکہ گانے کے بعد وہ اکثر غائشی نفرت آمیز انداز میں اپنے گلے کو صاف کرنے کا بہانہ کرتے ہوئے کھانسا کرتا تھا۔ گویا وہ نفرت کی وجہ سے ان لڑکیوں پر تھوک دینا چاہتا تھا۔ مگر ان تمام حرکتوں سے بھی ان لڑکیوں کو اس سے نفرت نہ ہوتی۔ ان میں کئی جو اس پر فریفتہ تھیں یہاں تک کہہ دیا کرتی تھیں کہ وہ ایک بلند مرتبہ انسان کی طرح حرکتیں کرتا ہے جس لڑکی نے جذبۂ عشق سے مغلوب ہو کر سب سے پہلے یہ الفاظ کہے تھے اور جس نے چاندی کا ایک چھوٹا سا سکہ گرانے کے بعد جس فرانک کا ایک طلائی سکہ اس کی طرف گرایا تھا، اس نے یہ دعوہ کیا کہ مغنی کے بے نیازانہ دیتے کی وجہ معلوم کی جائے۔ ایک جمعہ اس نے دیگر سب لڑکیوں کی موجودگی میں جرأت آمیز انداز میں اس سے کہا:

"او مغنی نہیں جانتے۔ میں سب سے حسین ہوں۔ اے خوبصورت مغنی کیا تم میرے پاس نہیں آنا چاہتے۔!"

باقی تمام لڑکیاں خاموش رہیں۔ شروع میں تو وہ اس کی بیباکی کو دیکھ کر انگشت بدنداں سی ہو گئیں لیکن

اور پھر سب کے رخساروں پر جیا کی سُرخی دوڑ گئی اور آنکھوں سے شدت جذبات کی آگ برسنے لگی۔ ہر کسی سے ان آوازوں کی بوچھاڑ ہوئی ــــ "ہاں ہاں ادھر آؤ ــــ میرے پاس آؤ ــــ اس کے پاس نہ جاؤ ــــ"

اسی دوران نصف پنس، فرانک، طلائی سکے، سگار اور سگریٹوں کی بارش جاری رہی۔ اور رومال سکی ٹکٹیاں، دستانے ہوا میں لہراتے رہے اور مختلف رنگ کی تتلیوں کی طرح اڑتے ہوئے مغنّی کے قریب آ گرے۔

اُس نے عجیب شانِ بے نیازی سے یہ تمام سامان اٹھا لیا۔ سکے اپنی جیب میں ڈالے اور سامان کو باندھ کر اپنی طشت کیپ سر پر رکھی اور بولا:۔

"آپ کا شکریہ! لڑکیو ــــ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا لڑکیو!"

انھوں نے یہ سمجھا کہ شاید ایک ہی وقت میں اس قدر عطایات کو برداشت کرنے کا ڈھنگ اُسے معلوم نہیں اس لئے ان میں سے ایک لڑکی بولی "اس کو انتخاب کر لینے دو ــــ!"

"ہاں ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے ــــ" وہ سب ایک دم پکار اٹھیں۔

مگر مغنّی نے اپنی بات دُہرائی "میں تم سے پھر کہتا ہوں ــــ لڑکیو ــــ! میں ایسا کرنے سے معذور ہوں"

انھوں نے یہ سمجھا کہ شاید وہ اپنی عجیب و دانہ فطرت کے اظہار کے لئے یہ بہانہ بنا رہا ہے۔ ان لڑکیوں میں سے بہت سی شدت جذبات کے زیر اثر اشک آلود نگاہوں سے بولیں "ہم تو میں سر بسر دل ہوتی ہیں مغنّی ــــ!" اور اسی لڑکی نے جس نے اس کی طرف متوجہ ہونے کی پہل کی تھی سہارے کا بازو تھنیف کرنے کے خیال سے کہا "جس پر چیاں ڈال لینی چاہئیں"

"ہاں، ہاں، یہ ٹھیک ہے" وہ سب بولیں

اور پھر سب خاموش ہو گئیں، جیسے کسی دھماکے جیسے میں بجلی ہوں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش تھیں کیونکہ اس وقت طرح طرح کے وسوسے اور فکر تھیں گھیرے ہوئے تھے۔ خاموشی اس قدر گہری تھی کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تک سنی جا سکتی تھیں۔

مغنّی نے ان کی گفتگو سے حوصلہ پا کر کہا "مجھے یہ بھی منظور نہیں۔ نہ ہی میں تم سے بیک وقت اور نہ ہی یکے بعد دیگرے اظہار محبت کر سکتا ہوں۔ میں پھر دُہراتا ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا ــــ"

"کیوں، کیوں ــــ!" اور اب گویا وہ چلانے لگی تھیں۔ کیوں کہ وہ بیک وقت غصّے اور افسوس کے جذبات کے زیر اثر سخت پریشان تھیں۔ ان کے سُرخ رخسار نیلے پڑ گئے اور آنکھوں سے چنگاریاں سی برسنے لگیں۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں مٹھیاں بند کر کے دھمکی آمیز انداز میں اُسے گھورنے لگیں۔

جس لڑکی نے پہل کی تھی وہ پھر بولی "چپ رہو۔ خاموش ہو جاؤ۔ اُسے ایسا نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ تو بتانے دو ــــ اپنی پوزیشن کو واضح تو کرنے دو ــــ"

"ہاں، ہاں۔ ہمیں خاموش رہنا چاہئے۔ خدا کے لئے اُسے ایسا کرنے کا موقع دو ــــ"

خونخوار خاموشی میں مغنّی نے اپنے بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے اپنی مایوسانہ مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم کیا چاہتی ہو ــــ یہ ایک عجیب مذاق ہے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میرے گھر پہلے ہی دو لڑکیاں موجود ہیں ــــ!"

بقیہ افسانہ "تاریکیوں" صفحہ ۲۴ سے آگے

نے دریافت کیا

"وہ کل دفن کی جا چکی ــــ" ٹوٹو نے جواب دیا

تھوڑی دیر بعد شمیم اختر ہوٹل میں اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔ اس کا وکیل سیٹھ فضل ترمذی جو استقبال کرتا ہوا بھاگتا آتا تھا اُسے دیکھ کر بولا:۔

"اختر صاحب! مجھے اب ایک پائی بھی واپس ہونے کی امید نہیں ہے۔ لیکن ایک اور قابل ذکر بات معلوم ہوئی ہے ــــ"

"فرمایئے ــــ؟" شمیم اختر نے کہا۔

"چنڈی کے بینک کے کلرک نے مجھے ایک حیرت کی بات بتائی ہے!"

"اس نے آپ سے جو کچھ کہا ہوگا، وہ قیاس کی بنا پر ہی آپ کو بتا سکتا ہوں ــــ" شمیم اختر نے مسکرا کر کہا۔

سیٹھ ترمذی حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا اس نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ چنڈی لاکھوں روپیہ جمع کر کے فرار ہونے کی گھات میں تھا؟"

"کیا آپ بھی اس کلرک سے مل چکے ہیں؟" ترمذی نے سوال کیا۔

"جی نہیں ــــ" شمیم اختر نے ہنس کر کہا۔ "میرے پاس خبریں حاصل کرنے کے اور بہت سے دوسرے ذرائع بھی ہیں، اور اصل میری سمجھ میں یہ نہیں آتا ترمذی صاحب! کہ اتنی بڑی رقم تحویل میں رکھتے ہوئے، جو چنڈی نے فرار ہونے کے لئے جمع کی تھی اس نے خودکشی کیوں کی ــــ؟"

اس کے بعد ترمذی نے شمیم اختر کو اور کریدنا چاہا لیکن وہ ایک ہی گھاگ تھا۔ خاموشی سادھ کر بیٹھ گیا اور مجبوراً ترمذی رخصت ہو گیا۔

ــــــ باقی آئندہ ــــــ

معرکہ طرح انسانی مشاعرہ نمبر ۵۲
محبت فراموش آدم نہیں ہے
آدم، غم قرآنی نہیں ہے ردیف
غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء

ظہیر کیفی امروہوی

زلف شانے پہ گری

[illegible] کے تھکے قدموں سے وہ اجنبی شاہراہ پر جا رہا تھا [illegible] بوٹ کی ٹھوکر پہ بچاتے ہوئے اس نے سوچا [illegible] شاہینہ کو کوئی منزل پہ پائے گا؟ اب تو [illegible] کو کھو چکا ہے..... ؟" سوچتے سوچتے اس [illegible] جا رہا تھا۔ وہ کیا کرے..... ؟ کاش اُس [illegible] شاہینہ کے خاندان کے درمیان پرانی دشمنی کی [illegible] گئی ہوتی۔ تاکہ وہ یوں اس کو نہ کھوتا ؟ سوچتے اس کا ذہن بھی بوجھل ہو گیا اور اس [illegible] کے سامنے بیت سے سوالیہ نشان ناچنے [illegible] اس کا ذہن بھوکی پیاس کی شدت سے کھول [illegible] شاہینہ کو پانے کی جستجو میں وہ یہ تمام صعوبتیں [illegible] کر رہا تھا۔ اس کو معلوم ہوا تھا کہ شاہینہ [illegible] میں مقیم ہے۔ کہاں ۔۔۔ ؟ اس کا پتہ بسیار [illegible] پر بھی نہ چل سکا تھا۔ لیکن وہ ایک آس اور [illegible] منزل کی جانب قدم بڑھائے جا رہا تھا اور اس [illegible] کے ساتھ کہ ایک دن وہ شاہینہ کو پالے گا۔!!

"اُف میرے خدا۔ کیا اسی کا نام زندگی ہے [illegible] بن اور تڑپ سے لبریز اس کی اپنی زندگی ۔ [illegible] اشکوں پر رو اٹھا۔ اور اس نے تیزی سے [illegible] نے کی کوشش کی۔ لیکن ۔ اور عین اپنے [illegible] جانب سے ایک سائیکل سوار تیزی سے بڑھا [illegible] میں جانب سے ایک بیوک پھسلتی اس کی جانب [illegible] اور اب وہ بیچ میں تھا۔ اس کی آنکھوں کے [illegible] اندھیرا چھا گیا ۔۔۔ اب وہ اس کار اور [illegible] کے ایکسی ڈینٹ کے بالکل بیچ میں آ گیا اور [illegible] طرح زخمی ہو چکا تھا۔ سائیکل سوار گرتے [illegible] گر پڑا۔ ایک چیخ سے جاگ اٹھا۔ اور [illegible] ہوا میں فراٹے بھرتی ہوئی گم ہو گئی۔!!

لیکن یہ کیا..... ؟ سائیکل سوار نوجوان نے اس [illegible] کو پہچان لیا وہ خون میں شرابور ہو چکا [illegible] جاگا اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات ابھر آئے تھے اور وہ اوندھے منہ زمین پر گرا پڑا تھا۔ سینکڑوں تماشائی راستے میں اس کو اس حالت میں پڑا دیکھتے ۔ اور کچھ دیر یہ ادھر ادھر کی بہت سی باتیں پوچھتے اور چلے جاتے۔ لیکن ایک ہی اور فرد تھا جس کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات ابھرے تھے اور احساسات کی شاہراہ پر چلتی ہوئی اس نے اور اس کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر ہسپتال لے آیا۔ ہسپتال میں اس کا معائنہ ہو چکنے کے بعد وہ اس کے کمرے میں منتظر رہا۔ اس کا مرہم پٹی ہو چکی تھی اور وہ اب کچھ ہوش میں آ چکا تھا اس کے چہرے پہ جا بجا پٹیاں لپٹ گئی تھیں ۔!

وہ زخموں کی ٹیس سے کراہ رہا تھا اور اجنبی سائیکل سوار نوجوان ۔۔۔ اس کی تکلیف کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا کہ آخر خوب رو نوجوان کیوں زندگی سے بیزار ہو گیا ؟ ایک منٹ کے لئے وہ نوجوان متجسس ہو گیا۔ اس نے پوچھا ۔

"میرے دوست! میں یہاں موجود ہوں ۔ تم کیوں اس جانے کے آرزومند ہو ؟"

"نہیں، مجھے مرجانا چاہئے !" اس نے پلکیں موندے موندے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر کرب کی کیفیت تھی جیسے وہ زخموں کے درد کو برداشت نہ کر رہا ہو۔

"تم زندگی ایسی نعمت سے کیوں بیزار ہو میرے دوست ؟" اس نے پوری توجہ سے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا ۔

"میں اب ایسی زندگی کا کروں گا جس نے مجھے سدا کے لئے غم اور حزن میں مبتلا کر دیا۔ جب دنیا ہی لٹ گئی، تو اب جینے کا کیا حاصل ؟" اس نے درد بھرے لہجے میں کہا اور زخموں کی ٹیس سے چیخ اٹھا۔

"گھبراؤ نہیں میرے دوست! تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے !" نوجوان نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

"نہیں ۔۔۔ اُف میرے خدا۔ مجھے مرجانا چاہئے !" وہ پھر بڑبڑایا اور اب کی بار وہ پلکیں موندے درد کی شدت کو ضبط کئے لیٹا رہا۔

اور وہ سائیکل سوار، نوجوان کو اس حالت میں چھوڑ کر اپنے کام پر چلا گیا۔ لیکن اس کے ذہن پر اور روح اور ضمیر میں اس نوجوان کی چیخیں اور فریادیں نشتر بن کر کھٹکتی رہیں۔ اس کی روشن پیشانی اور کھلتے ہوئے رنگ پہ چھائی ہوئی افسردگی اس کو کسی پرانے حادثہ کا پتہ دیتی رہی۔ اس کے حواس پر اس دراز قد اور خوب رو نوجوان کا عکس منڈلاتا رہا اور وہ باوجود کوششوں کے اس کو نہ بھلا سکا۔ جانے کیوں ؟ اس کو رہ رہ کر اس نوجوان کی تکلیف کا احساس ستا رہا تھا اور اس کی زندگی میں ایک جانی پہچانی کمی آنے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کا تجسس ہر لمحہ بڑھتا رہا۔ اور وہ سوچتا رہا۔ اس نوجوان کی زندگی کس واقعے کے المیہ سے متاثر ہے۔ اور وہ اس طرح موت کو گلے لگانے کی کوشش نہ کرتا۔ اس نوجوان کا چہرہ اس کے اپنے احساسات پر پرچھائیاں بن بن کر ابھرتا۔

اور وہ سوچتا رہا، زندگی کی حسین راہوں میں ایسے موڑ آجاتے ہیں انسان بہک کیوں جاتا ہے اور زندگی سے فرار حاصل کر کے سکون کا متلاشی کیوں رہتا ہے۔؟ کیا غموں سے نجات کا راستہ موت سے ہم کنار ہونے میں ہے۔ نہیں..... ؟ پھر ضرور وہ نوجوان بھی زندگی کے کسی حسین موڑ پر اپنے دل کو زخمی کر بیٹھا ہے اور یہی سوچ ــــ اسے قسمت کے بھیانک تھپڑ پر دل سے متوجہ کر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس طرح کیوں مرجانا چاہتا ہے۔!!

"اتنی رات گئے گھر میں کہاں واپس آرہے ہو...؟" اس کی بیوی نے اس کے غمگین اور اداس چہرے پر غم کی پرچھائیاں دیکھ کر خوف زدہ لہجہ میں پوچھا

"یوں ہی ــــ آج عجیب سی بات ہوگئی جس کی وجہ سے دیر ہوگئی ــــ!" وہ اداسی میں ڈوبا ہوا تھا

"کیا ہوگیا..... ؟ خدا نہ کرے دفتر میں تو کچھ نہیں ہوا...؟" اس نے شک بھرے لہجے میں پوچھا

"نہیں بیگم ــــ آج ایک ٹریجڈی ہوگئی ــــ!" اس نے بات ٹالنا چاہی۔

"کچھ بولو گے بھی ــــ یا یونہی مجھے جلاؤ گے!" وہ فکر مند ہوگئی۔

"آج میں مرگیا ہوتا، اگر ایک نوجوان بیچ میں آجاتا"

"کیا ہوا۔ خدا نہ کرے کچھ راستہ میں ہوگیا؟" وہ گھبرا کر اس کے چہرے کو تکنے لگی۔

"میں دفتر جارہا تھا، ایک نوجوان ــــ میری سائیکل ــــ اور کار کے بیچ میں آگیا۔ لیکن میں نہ کسی طرح بچ گیا۔ مگر وہ نوجوان بری طرح زخمی ہوگیا" وہ کپڑے تبدیل کرنے کمرے میں چلا گیا۔

"پوری بات نہ بتاؤ گے ــــ؟" وہ پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی اور بولی "ہمیشہ مجھے یوں ہی بھول بھلیاں میں گم کرتے ہو؟"

"اوہ ہو کیا بتاؤں بیگم، زندگی میں کم بخت نے کسی سے عشق کیا ہوگا یہ بری طرح ناکام ہوا اور اب مرنا چاہتا تھا خودکشی کی صورت"، اس نے مذاق کا لہجہ اپنایا۔

"اچھا ــــ!" وہ پھر فکر میں ڈوب گئی اور بولی "اور تم اس کی تیمارداری کرتے رہے اب تک؟"

"تمہارا خیال درست ہے ــــ!" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجہ میں بولا "ڈارلنگ ایک بات بتاؤ گی تم؟"

"کیا ــــ؟" وہ حیرت زدہ تھی

"تم نے کسی سے عشق کیا ہے ــــ؟" اس نے چھیڑنے کے موڈ میں کہا۔

"ہائے ــــ!" وہ بوکھلا گئی

"کس سے ــــ؟" وہ سراپا سوال تھا

"آپ سے ــــ اس گھر سے ــــ جس میں میں بیاہ کر لائی گئی ہوں ــــ!" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے عجیب ادا سے جواب دیا۔

"نہیں ــــ میرا مطلب ہے اور کسی سے ــــ کسی نوجوان سے ــــ کنوارپنے میں ــــ؟" وہ بری طرح کریدرہا تھا۔

"اور آپ نے بھی کسی لڑکی کو چاہا تھا مجھ سے پہلے ــــ؟" اس نے بھی سوال کے جواب میں سوال کر ڈالا۔

"میری چھوڑو ڈارلنگ ــــ میں تو صرف تمہاری بات کر رہا ہوں ــــ" وہ اپنی بات کترا گیا۔

"عورت جوانی میں ایک پیغمبر ہوتی ہے" وہ جذباتی بن کر بولی ــــ "اور اس ندی کی آوارہ لہروں میں کئی ایسے پتھر آجاتے ہیں جو ڈوب سہہ کر پھر کبھی واپس نہیں آتے، اور پھر یہ لہر ایک ایسے پتھر سے ٹکرا جاتی ہے کہ اس سے آگے اس کا گذر ممکن ہی نہیں ہوتا!" اس نے کھانا میز پر سجاتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

"آج تو پوری شاعرہ بن بیٹھیں تم ــــ؟" وہ مسکرایا اور پھر بولا "کھانا کھانے کا ارادہ ہے کہ نہیں گھومنے چلو گی؟"

"نہیں ــــ نہ جانے کیوں میرا دل ان دونوں گھومنے پھرنے کو نہیں چاہتا ــــ" اس کے چہرے پر اداسی کی سرخی پھیل گئی۔

"نہیں، کل میں تمہیں ضرور لے چلوں گا، اور اس زخمی جوان کو بھی دکھاؤں گا، بے چارہ کافی بھلا اور معصوم نظر آتا ہے ــــ!" اس نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی"، وہ آنکھ کر بولی "ویسے میرا دل گھر میں ہی آسودگی پاتا ہے ــــ!" دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بستر پر دراز ہوگئے۔

تمام رات دونوں اپنے اپنے ماضی میں جھانکتے رہے۔ کئی بار اسے شدت سے محسوس ہوا کہ وہ زخمی نوجوان بے حد دکھی ہے اور کسی کی بدانتظامی کا شکار ہوگیا ہے وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے تھرا اٹھی۔ کیونکہ خود اس کا اپنا ماضی اسی قسم کے واقعات کی آماجگاہ رہا تھا جہاں اس کے سپنے بکھر گئے تھے اور وہ تمام عہد و پیمان ختم ہوگئے تھے جو اس نے اپنے پیارنام کے جذبے کے تحت ایک دوسرے سے کئے تھے اور جن کو بھول وہ اپنا نا گھر بسانے کے لئے مجبور تھی۔!

وہ ہر صورت میں اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی کیونکہ اس کا مستقبل، اور اس کی شادی شدہ زندگی کا ایک ایک لمحہ شان دار اور آسودہ تھا۔ لیکن بھی کسی رومانی لمحے میں وہ جب اپنے ماضی میں جھانکتی وہاں کسی بے گور و کفن انسان کی بے چھایاں تڑپتی، بھڑکتی اس کو نظر آتی۔ اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی، اور ضبط کے آنسو پی جانے کی سعی کیا کرتی۔ مگر آج پھر اس کے منہ سے نکل کر یہ ڈالا تھا۔ وہ اندر ہی تڑپ اٹھی تھی۔ لیکن اس نے اپنے جذبات دبائے رکھے تمام رات وہ ان ہی خیالات میں اور اپنے ماضی کے میں بھٹکتی رہی تھی۔

اگلی صبح اتوار کو وہ دونوں اس نوجوان ہسپتال کے احاطہ میں داخل ہوگئے۔ مگر

کہ اس کی بیوی کی ایک دن نیند اتنی اور بہت ہی عزیز سہیلی فوت ہو گئی۔ بہت دنوں کی بچھڑی سہیلیاں جب ملیں، تو ایک دوسرے کے گلے اور شکوے کی بھرمار تھی جو نہ اس کو کچھ بولنے دیتا تھا۔ اور وہ اپنی بیوی کو اس دوڑ کا پتہ بتا کر چلا گیا، جہاں وہ زخمی نوجوان زیرِ علاج تھا۔ وہ جلدی جلدی اس روم میں پہنچ گیا جہاں وہ نوجوان درد اور دکھوں کی تکلیف کے باعث کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن جب وہ پہنچا تو اس کے چہرے پہ سکون اور طمانیت چھا گئی تھی۔

"دوست! اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے مشفقانہ اور ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

"آپ کی نوازش۔ اور زندگی کی آخری عنایت سے جی رہا ہوں۔" نوجوان کرب ناک انداز میں بولا۔

"اجنبی دوست! کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں۔؟" وہ اس کے چہرے پر تبدیلی کرنا کیوں کہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے اس کے لئے مجبور نہ کیجئے، سکون سے رہنے دیجئے۔" اور یہ کہہ کر وہ پھر کراہ اٹھا۔ اور اب کی بار اس کی کراہ میں بڑا درد اور سوز تھا، اور یہ سوز اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ تمام رات اسی حالت میں رہ کر جاگتا ہوا ہے۔"

"لیکن کیا تم اس کی وجہات بھی نہ بتاؤ گے جس کے لئے یہ خوفناک قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو!"

"کیا کیجئے گا یہ سب کچھ جان کر کے، جس زندگی کی خوشبو۔ اور رنگ و نور ختم ہو گیا ہو وہ زندگی بے کار ہے وہ انسان ایک بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں" وہ کروٹ بدلنے لگا۔

"ٹھہر جاؤ۔ تمہارے زخم کچے اندھیرے ہیں اس لئے زیادہ حرکت مت کرو!" وہ ہمدردانہ لہجہ میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم اپنا حال بیان کر دو شاید میں تمہارے کچھ کام آ سکوں، اور اس تکلیف کے دور کرنے کے لئے بھی ہو سکوں!"

"زخم گہرے ہیں۔ اندھیرے ہیں، ڈاکٹر کا کہنا ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس کی آنکھوں سے بے شمار آنسو امڈ پڑے... اور وہ پھر بولا "یہ نرس بھی یہی کہتی ہے کہ اگر زخم کے ٹانکے کھل گئے تو پھر زخم پر مرہم نہ کام کر پائے گا۔"

"میں پھر تم سے یہی کہتا ہوں، اگر تم مجھے اپنی داستان سنانے کی زحمت گوارا کرو، تو میں تمہارے لئے اپنی آخری پونجی بھی داؤ پر لگا کر تم کو بچا لوں گا۔" وہ شدت جذبات میں بولا۔ اس کے دل میں یہ ہمدردی نہ معلوم کہاں سے عود کر آئی، حالانکہ یہ نوجوان اجنبی اور نہ معلوم کس جگہ کا ہے..... اور پھر جانے کس جرم کا مرتکب ہے۔

"سچ۔؟ کیا آپ میرے دکھی دل کی داستان سنیں گے۔!" اور یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکے اور سفید پٹیوں میں جذب ہو گئے جو اس کے چہرے پر جا بجا بندھی تھیں۔ وہ ندامت کے اپنی تمام تر قوت گویائی اکٹھا کرنے۔ اور اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگ گیا اور پھر اسٹیل بیڈ کے تکیے سے اپنی پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب میں اس کے لئے ایک ایسا سدا بہار پھول تھا جس سے اس کی زندگی کا چمن ہرا بھرا۔ اور خوشی نما تھا۔ میں اس کے لئے جیتا تھا۔ اور وہ میرے لئے اس کی سانسیں میرے خوابوں کی جنتوں میں سمائی تھیں اور میرے سامنے بیٹھے اس کے۔ اور اس کی چاہت کے لئے دقت تھے۔ میری اس سے ملاقات کسی اچانک ہونے یا سامنا ہونے پر نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ میری پڑھنے کی ساکرٹ و بیش تر میرا اس کا سامنا ہوتا تھا اور وہ مسکرا کر چھپ جایا کرتی تھی اور آخر کار ایک دن یہ دوری ختم ہو گئی۔ اور میری اس سے ملاقات ایک دیران مکان میں ہو گئی جو میرے اور اس کے مکان کے وسط میں واقع تھا۔ وہ اس دن اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ اس مکان سے انگور اور نا سپاتی توڑنے آئی تھی۔ میں دروازے پہ کھٹکھٹایا اور یہ سمجھا کہ وہ بھاگ گئی ہو گی کہ کوئی ادھر آ رہا ہے۔ میں دروازہ کو عبور کر کے صحن میں چلا گیا اور یہ کہتے کہتے وہ درد اور زخموں کی جلن سے کراہ کر بولا "اور پھر.....؟"

"گستاخی معاف میرے دوست! لیکن تم اس لڑکی کا نام کیوں نہیں بتاتے۔؟"

"یہ نہ پوچھو۔ اگر آپ اس کا نام جاننے کے لئے اصرار کریں گے۔ تو شاید میں اپنا داستان بیان نہ کر سکوں گا۔!" وہ پھر کراہتے ہوئے بولا "کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس کا استقبال۔ اس کی شادی شدہ زندگی۔ میری خاطر تباہ ہو اور وہ بدنام ہو جائے میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو درد میرے دل میں اس کے بچھڑنے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اس کو کسی کے آگے دہراؤں۔ لیکن یہ آپ کے خلوص کی کشش ہے جو میں اپنی زخمی آرزوؤں اور مجروح جذبوں کو دہراؤں!" وہ اتنا کہہ کر تھوڑا اوپر اٹھا اور اس دوران میں وہ چیخ اٹھا۔

"اُف میرے خدا۔!" وہ بڑبڑایا "کاش! میری زندگی اس کے بغیر ختم ہو سکتی!"

"دوست گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہاں پھر کیا ہوا۔؟" اس نے تجسس اور تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور جب میں صحن میں پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ اس کا دوپٹہ ہوا سے کانٹوں کے الجھا ہے میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اور وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اس سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ میں نے اس کا دوپٹہ مزید الجھا دیا۔" ایک لمحہ رکنے سے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ رینگ گئی اور پھر کہنے لگا "میں نے کہا چوری

کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو تو مجھے پہلے اسے چھوڑنا ہوگا۔ اس کے بعد اس ویران مکان کے کھل کھڑے ہوں گے۔" اس پر وہ کچھ تھوڑا سا شرمائی۔ اور پھر بولی "دیکھئے خان کا دعوت نہیں ہے آپ میرا دماغ چاٹ لیں ۔۔۔!"

اور میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کا دماغ ان تاروں سے نکال دیا۔ اس نے ممنونیت بھرے انداز میں میری جانب دیکھا اور بولی "آپ ادھر کیوں چلے گئے اور بھی تو لڑکیاں تھیں ۔۔۔"

"صرف تمہیں دیکھنے کے لئے ۔۔۔ اور تمہارے ان بے باک ہمسایوں کو دیکھنے کے لئے جن کے دل پتھر ہیں، جو کسی کے لئے دھڑکنا نہیں جانتے ۔۔!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

"دیکھئے مکان میں کوئی اور آ رہا ہے ....." اس نے شک ظاہر کیا۔ اور آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی ۔۔۔ اور واقعی اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے اس ویران مکان میں آنے لگی۔ اور ہم دونوں ساری دنیا سے بیخبر پیار و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کو گھورتے رہتے ۔۔۔ طائرِ وقت اپنے پر پھڑپھڑاتا رہا۔ مگر ہماری ملاقاتوں میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ ہماری محبت میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو چلا۔ وہ کچھ سے ملنے پابندی سے آتی رہی۔ کبھی دن کے اجالے میں۔ کبھی رات کے اس سرمئی اندھیرے میں، جب سب سو جاتے تھے اور حتیٰ کہ آسمان پر روشن چاند، ستارے بھی اونگھنے لگتے تھے۔ مگر آخر ایک دن ۔۔۔!

"اُف میرے خدا ۔۔۔!" اس کی کراہ نے اس کی رومانی داستان کا تسلسل توڑ دیا۔ مگر کچھ وقفہ کے بعد وہ پھر بولا۔ "تھوڑا پانی لاؤ ۔۔۔"

اور جب میں اُس نے قریب رکھے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کے پیاسے لبوں سے لگا دیا۔ گلاس خالی کرنے کے درمیان وہ پھر کہنے لگا۔ "اور پھر اچانک ایک دن وہ مجھ سے ملنے نہ آئی۔ ابتدا میں مجھے تعجب نہ ہوا لیکن جب مسلسل کئی دن تک نہ آئی اور میں تمام تمام رات جاگ جاگ کر اس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ احساس تنہائی شدت کا مجھے اس پر غصہ آیا کہ تجربہ کیا کیسی جدائی ہے مجھ سے کیوں روٹھ گئی ہے۔ لیکن میں اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ مگر وہ ایک دن اچانک مجھ سے ملنے چل آئی اور کہنے لگی بولی:۔ "میری قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے، اگر تم چاہو تو مجھے ایک خوش گوار زندگی دے سکتے ہو، ورنہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے دور ۔۔۔ ایک اندھے کنوئیں میں دھکیل دی جاؤں گی!" مجھے اس کے پیشگوئی اس لمحے نہ بھائے۔ اور یہ رات بھی ہم نے یونہی ادھر ادھر کی غیر ضروری باتوں میں گزار دی۔ اور پھر میں کئی دن تک اس سے دیدار نہ کر سکا۔ مجھے اس کے جسم کی چاہت نہ تھی بلکہ محبت اور قربت کا جمالیاتی ذوق مدکار رہتا تھا۔ سو وہ مجھے مل رہا تھا۔ لیکن اب یہ تلاش میری محبت کے لئے سوہان روح بن چکی تھی ۔۔۔ میں سخت الجھن میں تھا کہ کیا کروں مگر ایک دن اس نے مجھے لکھ بھیجا کہ وہ جلد ایسی رسمی زنجیروں میں جکڑ دی جائے گی جس کے باعث نہ صرف ملاقات ناممکن ہے، بلکہ ہمیشہ کے لئے ہمارا ملاپ پھر نہ ہو سکے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر رک گیا۔ کیونکہ غموں کی ٹیس اسے چین سے نہ بیٹھنے دے رہی تھی، وہ کروٹیں بدل بدل کر بقیہ تمام یہ سب کچھ بیان کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رات بھر نہ سونے کا عندیہ پیش کر رہی تھیں۔ جن میں نیند کی جھلک نہ تھی، بلکہ اضطراری کیفیات تھیں اور سرخ انگارہ جیسی آنکھیں اس کے زخموں اور جراحت کو اور زیادہ مشتعل کر رہی تھیں۔ اور وہ مبہوت بنا اس کے چہرے کو تک رہا تھا، جو نئے حادثوں کی چمک سے تمتما رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا خیال اپنی بیوی کی طرف گیا جو اس کے بتائے پتہ پر ابھی تک نہ لوٹی تھی۔ شاید وہ ابھی تک اپنی بچھڑی سہیلی سے گفت گو کر رہی تھی ۔۔۔!

پھر کیا ہوا میرے دوست ..... ؟" وہ پھر اس کی جانب مخاطب ہوا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باقی حکایت سننے کو بے قرار تھا ۔۔۔

"اور پھر یوں ہوا ۔۔۔ جیسا کہ ہر لڑکی کا دل اور آنکھیں ہوتے ہیں!" وہ پھر شدت غم سے لرز گیا۔ "اس نے مجھے اس رات بتایا تھا اس دن اس کی شادی کی بات طے پا رہی تھی کہ اب وہ کبھی نہ اس سے مل سکے گی اور نہ ہی میں ملنے کی کوشش کروں۔ کیونکہ اس طرح اس کا مستقبل ۔ اور اس کی عزت کے تباہ ہونے کے امکانات ہیں ۔۔۔ میں چونکہ اس کو نہ پا سکتا تھا، محض خاندانی رقابتوں کی وجہ سے، اس لئے وہ زیادہ مجھ سے دور رہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس کو فراموش نہ کر سکتا تھا اس کی یاد کا ہر نقش جمیل ۔ میرے دل کے اندر اس طرح جم چکا ہے، جیسے کہ وہ آج بھی میرے آئینۂ دل میں مسکرا رہی ہے۔ اس کا سراپا۔ میرے وجود کو محیط کئے رہتا ہے وہی دلآویز سیاہ زلفیں ۔۔۔ وہی چشم غزال، وہی پتلے پتلے نازک پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ ۔ وہی گلابی رخسار۔ وہی میانہ قد ۔۔۔ اور ان کے مقابلے ۔ لیکن یہ سب کچھ آج تصورات اور تخیلات کے نقوش ہیں اور اس کی یادیں۔ اور عہد وفا میں آج بھی نہ بھولا ہوں۔ کاش! کہ میں اس کو پا سکتا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور میرے تمام خواب بکھر گئے اور آرزوئیں مردہ ہو گئیں۔ اور میرے تمام ارادے مذبذب ادھورے ہو کر رہ گئے۔ اور آخر وہ صبح ہوئی۔ جب میں نے اپنی شادی کا پیغام اس کے گھر بھیجا لیکن، وہ مسترد کر دیا گیا۔ کیوں کہ میں ایسا نہ تھا، میرا کوئی مستقبل نہ تھا۔ اچھی ملازمت نہ تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے میرے دوست! کہ میرے اور اس کے خاندان میں برسوں پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ نیلگوں نہ ہو سکی جو دونوں خاندانوں کے مابین خوفناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اور یہ خلا آج تک میرے دل میں باقی ہے ۔۔۔ اور اس کے پُر ہونے کے امکانات خ

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۰

مصرع طرح

چاند جب تک رہا دریا میں بیت جوش رہا

غزل کے ساتھ ڈاک / فاکس مشاعرہ یا اس کے متبادل چار آنہ کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

ممبران ثالثی بورڈ
حضرات
مولانا ابرار حسنی گنوری
شفا گوالیاری

ناز کی آسی میرٹھی / نشور آبادی

عرصۂ حشر کا دنیا میں کسے ہوش رہا — میں خطا کوش رہا کوئی خطا پوش رہا
لب کشائی گلہ کبھی کی کبھی خاموش رہا — چند شعروں کے سنانے کا فقط ہوش رہا
یوں تو نے محفل میں بیت سے تیرے میخانے میں — جس نے نظروں سے تری پی وہی مدہوش رہا
لاکھ دیوانہ سہی پاسِ ادب تھا لازم — اُن کی محفل تھی اسی واسطے خاموش رہا
تھی عبادت ہی عبادت یہ جوانی کیا تھی — ہوش ان کو نہ دیا اور نہ مجھے ہوش دیا
اک نظر پڑتے ہی دنیا نے اسے بھانپ لیا — ایک وہ تھا تری نظروں میں جو مدہوش رہا

ڈوبنا تھا کہ دھیں تھم گئیں ناز کی لہریں
چاند جب تک رہا دریا میں بیت جوش رہا

شمشاد علی گوہر کوثری

اظہار میں تری نرمی میں خاموش رہا — دعوٰی دریائے محبت میں نہ کیا جوش رہا
اللہ اللہ یہ تجلی یہ عارض تاباں کی ضیا — کوئی جلوہ نہ نظر سے مری روپوش رہا
تیری صورت سے نگاہیں تو نہ ہٹنے پائیں — تیرے دیوانے کو محفل میں تری ہوش رہا
فتنۂ حشر کے آغاز نمایاں ہوں گے — تشنہ لب ساقی اگر بزم میں اے نوش رہا
جان دینی پڑی بچ کر کے بیماروں کو — پاس وعدہ نہ تجھے وعدہ فراموش رہا
میرا کیا میں تو ازل ہی سے ہوں اک دیوانہ — تم کو کیا عہد جوانی میں کہاں ہوش رہا
عیش و آرام سے محروم ہے تیرا گوہر — ہائے وہ دور کہ تو زینتِ آغوش رہا

حشمت چترپوری

جو بھی اے دوست ترے غم سے ہم آغوش رہا — وہ زمانے کے مصائب سے سبکدوش رہا
جنس و نفرت کے تلاطم میں بھی ڈوبے نہ گئے — پاسِ الفت کا زمانے میں کسے ہوش رہا
تیری مے خانہ نگاہی کے تصدق ساقی — پیتے پیتے بھی تری بزم میں مدہوش رہا
کون تھا شامِ الم جس سے کہ جی بہلاتا — میرا دل اپنے ہی نالوں سے ہم آغوش رہا
کس لیے جنتا ہے ناکامیِ ناداں پر — مایۂ الفت میں تنہائی کا کسے ہوش رہا
لاکھ طوفان اٹھے لاکھ ہوئے جور و ستم — میرا دل پھر بھی زمانے پہ وفا کوش رہا
دل کا گھر ڈھا کے حشمت مجھے چلا میں نے — وہ مرے حق میں ہمیشہ ہی جفا کوش رہا

جمال الدین خاں وجد عظیم آبادی

انجمن گرم تھی، لیکن یہ کسے ہوش رہا — رات بھر شمع سے پروانہ ہم آغوش رہا
نشۂ عشق میں اس درجہ میں مدہوش رہا — ظلم کرتے رہے وہ اور میں خاموش رہا
پی کے مے خانہ میں ہر ایک بلانوش رہا — چاند جب تک رہا دریا میں بیت جوش رہا
دیدۂ حسن کا اس وجہ تھا غالب دل پر — روبرو بیٹھے تھے وہ اور میں خاموش رہا
وہ تھا موجود ہمیشہ مری شہ رگ کے قریب — یوں بظاہر مری آنکھوں سے وہ روپوش رہا
لاکھ اور دیا شکر ہے اس نے مجھ کو — چارہ گر میں ترے احساں سے سبک دوش رہا
جس پہ اٹھی تھی نظر وجد مہ ساقی کی — انجمن میں وہی مست مے سرجوش رہا

اسماعیل ذبیح / ایگانوی

کب نگاہوں سے بھلا تو مری روپوش رہا — یہ حقیقت ہے کہ میں خود ہی فراموش رہا
وہ خطا وار ہے للہ بیب نگاہوں میں مری — اس کی رحمت سے جو انسان فراموش رہا
باتیں اس پہ تھی اے وحدت خدا کی رحمت — غم طوفاں سے جو انسان ہم آغوش رہا
بزم میں جب بھی چلا ذکر مئے و نغمت کا — ناصحا بھی یہ دل و جان بہ تن گوش رہا
جام پہ جام دیا ہے مجھے ساقی نے ذیم — لطف یہ ہے کہ میں ہر جام پہ بیہوش رہا
بے خودی ہے یہ مری جا کے کہ پردہ تیرا — سامنے ہو کے بھی نظروں سے تو روپوش رہا
کیوں نہ تسلیم کروں میں یہ حقیقت ہے ذبیح — چاند جب تک رہا دریا میں بیت جوش رہا

شہرت میرٹھی

اُف ستم آہ بھی خالی مرا آغوش رہا — پہلوئے غیر میں وہ وعدہ فراموش رہا
کیسے طوفان اٹھے کیسے تلاطم آئے — چاند جب تک رہا دریا میں بیت جوش رہا
ضبط کرنے پہ بھی رہ رہ کے ابلتا آنسو — عمر بھر بحرِ محبت میں بیت جوش رہا
سامنے اُس کے کبھی تاب تکلم نہ رہی — حال دل اُس نے جو پوچھا بھی تو خاموش رہا
رہ رہ آواز پہ آتی رہی شہ رگ سے برابر مجھ کو — میں تو آواز پہ تیری ہمہ تن گوش رہا
ایک نالے سے پیا حشر نہیں کر سکتا تھا — جانے کیا سوچ کے اس بزم میں خاموش رہا

ایک دن سامنے آیا نہ کبھی اے شہرت
وہ تھے دل میں مری نظروں سے وہ روپوش رہا

بیباک تنک بندی

وصبت ناز کریں وہ جب تک لئے پا بوس رہا — شعلۂ دشت کے میں ہمہار ہا خاموش رہا
جان من دیکھ کے تجھ رنگ ہوں کو تری — مدتوں تیری قسم دل مرا مدہوش رہا
چاہئے پینے کے لئے ایک اکتی ساقی — بس اسی بات پہ جم کو بہت جوش رہا
دیکھ کر حسن کو حیران نہیں چپک جاتی تھیں — اب وہ پہلا سا کہاں تیرا تن و توش رہا
جذبۂ غیر جنازہ ہی نکل جائے گا — چند دن اور جو نظروں سے تو روپوش رہا
بن پڑیں ہم کے بہت ناز اٹھائے لیکن — پھر بھی کہتی ہیں کہ احسان فراموش رہا
پانی کے بدمست نظر سے تری ایسا بہکا — وقت آخر بھی نہ توبہ کا مجھے ہوش رہا
ہائے اس بت کی محبت میں ہمیشہ بیباک — خود سے بے خود رہا دنیا سے فراموش رہا

الطاف انصاری سلطان پوری - (مانیکا ئوں)

یاد میں تیری جو کھو یا رہا خاموش رہا — اہل محفل اسے سمجھے کہ وہ مدہوش رہا
یہ الگ بات ہے تم اس کو نہ مانو لیکن — چاند جب تک رہا دریا میں بہت جوش رہا
رفعت دیکھ کے اس نور مجسم کی جھجک — ہوش جاتا رہا مطلق نہ مجھے ہوش رہا
ذکر ہوتا رہا جب تک مری مظلومی کا — ہر محفل وہ ستم گر ہمہ تن گوش رہا
وہ بدیہیں کو میں کرتا رہا دن رات تلاش — کیا غضب ہے کہ وہ دل میں مرے روپوش رہا
شاید آ جائے انھیں میری وفا کا خیال — اس لئے ان کی جفاؤں پہ میں خاموش رہا
مدتوں اپنے عزائم کا سہارا لے کر — موج طوفان حوادث سے ہم آغوش رہا

فروغ اچھنیروی

بچہ بچہ نشۂ جنگ میں مدہوش رہا — مادر ہند پہ مٹنے کا بہت جوش رہا
اے جہاد تری عظمت کو میں اب سمجھا ہوں — توپ گنوں کے ستم سہہ کے بھی خاموش رہا
دہر میں کون وفا کی بھی کبھی جیت ہوئی؟ — چین کس نشۂ پندار میں مدہوش رہا
کب ہلا سکتی ہے انھیں کوئی طاقت تم سے — ہندیو! حب وطن کا جو تمھیں جوش رہا
لاکھ ہم نشۂ غفلت میں رہے ہوں مدہوش — عزت ملک کا ہر وقت مگر ہوش رہا
جنگ گھر اور وطن کا نہ پڑے گا پھیکا — خون دینے کا وطن میں جو یہی جوش رہا
اب تو پیمانگ پہ ہیں جائیں گے خود بڑھ کے فروغ — چین کچھ روز نہ پیاروں میں جو روپوش رہا

ناصر عنایت اللہ عرشی جبل پوری

گو رہ کو بھی میں اکثر ترے ہمدوش رہا — تیری تصویر خیالی سے ہم آغوش رہا
قابل دید تھا ماجوں کا تماشائے جنوں — چاند جب تک رہا دریا میں بہت جوش رہا
کون ہوں کیا ہوں کہاں آیا ہوں کیا کرتا ہے — آپ کی بزم میں اتنا بھی کسے ہوش رہا
بے خودی میں بھی رہا نام تو اللہ ہی زباں — واہ غافل تھا مگر اتنا مجھے ہوش رہا
کی گریباں ہی نظر آتے تھے — اہل خرد کو بہاروں میں بہت جوش رہا

بخش دیں داور محشر نے خطائیں ساری — وقت پرسش جو مگن ہوں پہ میں خاموش رہا
تو رہا نغمہ تو موسیقی سے خوشی دور رہی — زندگی بھر وہ ترے غم سے آغوش رہا

عجب جو ٹوٹی

عمر بھر اس طرح رحمت سے ہم آغوش رہا — میں خطا کوش رہا اور وہ خطا پوش رہا
نام جب آیا زباں پر تو انھیں کا آیا — نزع کے وقت بھی اتنا تو مجھے ہوش رہا
میں ادھر محو الم تھا وہ ادھر محو ستم — کچھ مجھے ہوش رہا اور خدا سے ہوش رہا
زندگی بھر رہی تصویر مرا پیش نظر — ہر وقت ان کے تصور سے ہم آغوش رہا
مختصر ہے مرا قصۂ غم اے ہمدم — میں وفا کوش رہا اور وہ جفا کوش رہا
دیکھ مے خانہ کی تاریخ پہ آ جائے گا درخ — بھولے ساقی اگر کوئی بھی مے نوش رہا
حوصلہ مند نہ ہوگا کوئی مجھ سا عجوب — چوٹ کھا کر بھی مرے دل میں وہی جوش رہا

قدر۔ میرٹھی

بے خودی میں نہیں معلوم کہا کیا میں نے — وہ نظر آ گئے تو اپنا کہے ہوش رہا
نام تیرا میں بتا دوں یہ گوارا نہ ہوا — دے کے خط ہاتھ میں قاصد کے خاموش رہا
جوش وحشت میں کر آیا ترے کوچہ کا طواف — بے خودی میں بھی یہاں تک تو مجھے ہوش رہا
اس کے چہرہ کے تصور سے اٹا رہا دل — چاند جب تک رہا دریا میں بہت جوش رہا
عشق میں پھنس کے ہوئی دل کی عجب کیفیت — جوش میں آیا کبھی تو کبھی خاموش رہا
حالت زار پہ کیا رحم اسے آتا قدر — جو مرا حال بھی سننے سے گراں گوش رہا

مقصود دشتری اندور

الفت دوست میں ہر دم ہمہ تن جوش رہا — غم نے تسکین دی اور دم بہ دم آغوش رہا
ایسے انسان کی کہیں بھی نہیں ہوگی موت — اپنے محسن سے جو احسان فراموش رہا
طور پر حضرت موسیٰ نے جھلک دیکھی تھی — وقت کی بات ہے پہروں نہ انھیں ہوش رہا
نذر طوفاں ہوئی کشتیٔ محبت اپنی — ناخدا شان خدا دیکھیے خاموش رہا
میرے اظہار محبت پہ وہ بولے مقصود — قابل داد ہے یہ ضبط جو خاموش رہا

محمود عباسی ریوا ڑوی

مجھ سے جب تک وہ مخاطب ہیں ہم آغوش رہا — دل میں بپا عجب ہنگامہ پر جوش رہا
دل سا ہوگا نہ کوئی ظرف کا حامل اے دوست — یہ جو ٹوٹا بھی سر بزم تو خاموش رہا
رحمت حق تو رہی مجھ پہ عطا پاش مگر — میں خطا کوش رہا سود فراموش رہا
عشق پر حسن کا احسان بجا ہے لیکن — حسن کب عشق کے احسان سے بیہوش رہا
اس سے کیا کیجئے محمود وفا کی امید — جو ہمہ وقت جفا کار و ستم کوش رہا

عبدالجبار تاج ۔ ناگ پوری

قصۂ غم پہ مرے کون توجہ دیتا — آپ کی بزم کا ہر فرد گراں گوش رہا

یاد ہیں یار و رسن اور فسانہ اپنا
وہ گئے اٹھ کے مگر چھوڑ گئے غم اپنا
عالمِ نزع میں دھیان اس مرے کیا آیا ہے
صفحۂ دل میں نہ رہے گی کبھی تحریر تیری
دلِ حسین دہلوی

وہ بھی بے کس ہے کہ جو پی کے بھی مدہوش رہا
دید کو تیری رہا چشمِ سراپا بن کر
دفعتاً اس نے جو الٹی رخِ روشن سے نقاب
جانِ رخصت ہوا دریا پہ بھی طاری تھا سکوت
آج وہ رند ہے میخانے میں محرومِ شراب
محمد علی عاجز ہیگن گھاٹی۔

جب تصور ترا تصویر در آغوش رہا
آپ جب آگئے اٹھتے ہوئے پہرے سے نقاب
جب کبھی بھری آنکھوں کا فسوں دیکھ لیا
چاک کر دے گی بہار آ کے قفس کا دامن
میری بات اور زمانے کی زباں تک آتی؟
مظہر نظامی

اس طرح جلوہ ترا زینتِ آغوش رہا
طالبِ دید ہوں دیدار کی جرأت ہے مجھے
بعد میں کیا ہوا اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں
میرے معبودِ حقیقی تری رحمت کے نثار
وجہِ رسوائی بنی میری خموشی مظہر
شمسی چک نوابادی

اس سے انداز تغافل کا گلہ کیسے کروں
مجھ پہ دنیائے وفا میں یہ انہی کا تھا کرم
ان کی یادوں کا تصور رہا مجھ پر طاری
میرے ساقی کی نگاہوں کا یہ دیکھو اعجاز
ان کی رخصت کا سماں پوچھ نہ مجھ سے شمسی
مائل نسیمی جیل پوری

وہ الفت میں اک ایسی بھی گھڑی آئی تھی
آنکھوں آنکھوں میں میرے کسی ظالم سے

کون سا جلوہ تمنا ہوں سے فراموش رہا
کون کہتا ہے کہ خالی مرا آغوش رہا
ہوش بھی جاتا رہا اور مجھے ہوش رہا
سازِ ہستی کا کوئی تار جو خاموش رہا

میں وہ بے نوش ہوں جو پی کے بھی مدہوش رہا
تیری آواز کو بھی میں ہمہ تن گوش رہا
جس نے بھی دیکھا نہ ہستی کا اسے ہوش رہا
چاند جب تک رہا دریا میں بڑا جوش رہا
جو کبھی رندوں میں مشہور بلا نوش رہا

دلِ غم زیست کے صدموں سے سبک دوش رہا
دل کو پھر شکوۂ شکایت کا کہاں ہوش رہا
پھر مجھے گردشِ دوراں کا نہ کچھ ہوش رہا
اگر اے یاس و حسرت کہ مری ہوش رہا
آپ کا ذکر تھا میں اس لئے خاموش رہا

دل میں موجود رہا آنکھ سے روپوش رہا
ہوش کھو کر بھی کہوں گا کہ مجھے ہوش رہا
ان کے صرف ایک تبسم کا مجھے ہوش رہا
میں خطا کوش رہا اور تو خطا پوش رہا
بات اتنی ہی بڑھی جتنا میں خاموش رہا

دل میں آ کر مری نظروں سے جو روپوش رہا
بارِ غم دوش پہ تھا اور سبک دوش رہا
درد جب تک رہا پہلو میں بہت جوش رہا
نے نبی اور میں مے نوش کا مے نوش رہا
ان کے جانے پہ عجب دل میں مرے جوش رہا

نہ انھیں ہوش رہا اور نہ مجھے ہوش رہا
رازِ دل کہہ بھی دیا اور میں خاموش رہا

تشنگی کا نہیں احساس یہ غم ہے ساقی
صبح کو آیا ہے تسکین کا سامان کرنے
ہجر کی شب شبِ تاریک نہیں تھی مائل
کریما سعدی۔ بھاگلپوری

ہو کے بے ہوش بھی، تا تو مجھے ہوش رہا
آپ کرتے رہے سو طرح جفائیں مجھ پر
پھر بھی بڑھتی گئی کشتی مری سو سو حال
مانتا ہوں غمِ دوراں کو بھی اپنایا مگر
ظرف یہ رندِ بلا نوش کا دیکھیں تو کریم
شیخ سلیم سہسوانی

سارے خانہ تری یاد میں غم کوش رہا
یہ بھی انداز ہے اک تیری خدائی کا خدا
آتشِ عشق نے دونوں کو جلایا لیکن
اشک بہتے رہے آنکھوں سے مری تم تھم کر
ہوش کفنوں کے سیر دیم تھکانے آئے
صدیقی شبنم۔ شکوہ آبادی

کوئی بدمستِ محبت کوئی بے نوش رہا
ہوش آیا بھی تو کب پی کے محبت کی شراب
حشر میں ہو گیا اندازۂ رحمت سب کو
نیچی نظروں کے اشارے بھی مچل جاتے ہیں
ضبطِ گریہ نے بھرم رکھ لیا میرا شبنم
قمر احمد کرم کنڈوی

ان کا نام آتا رہا میری زباں پر پیہم
جذبۂ شوق میں یہ بھی نہ رہی مجھ کو خبر
اپنا اپنا یہ مقدر ہے جہاں میں اے دوست
یہ قمر راز سمجھ ہی میں نہ آیا اب تک
رہبر اچھینسوی

مجھ کو اظہارِ تمنا کی نہ توفیق ہوئی
بے کسی اس کی ہے جام اس کا ہے مینا اس کا
اتنی ہے آنکھوں سے برسا کہ نہا جاؤں میں
اس نے کیا سمجھا مجھے اس کی خبر کیا تاجور

تیرہ ہوتے ہوئے پیاسا ترا مے نوش رہا
رات بھر تو کہاں اے دورِ فراموش رہا
سارا عالم مرے ماتم میں سیہ پوش رہا

اٹھے جامِ مئے مست کا مے نوش رہا
اور میں تھا کہ بہر حال وفا کوش رہا
لاکھ طوفانِ حوادث مرے ہمدوش رہا
آپ کے غم سے بھی دل میرا ہم آغوش رہا
تشنہ لب رہ کے بھی میخانے میں خاموش رہا

تو نہیں آیا تو محفل میں کہاں جوش رہا
ساتھ ہوتے ہوئے سب تیرہ و پوش رہا
شمع خاموش تھی پروانہ بھی خاموش رہا
جذبۂ عشق میں ہنگامۂ خاموش رہا
تم نے جب ہوش سنبھالا تو کسے ہوش رہا

ان کی محفل میں خوشی کے بہت جوش رہا
جب نہ وہ بات رہی اور نہ وہ جوش رہا
ہر بیاں کنندہ بندوں پہ خطا پوش رہا
تھا سبب اس میں کوئی آج جو خاموش رہا
پھر وہ تا صبح تک رہا دریا میں بہت جوشاں رہا

دمِ آخر تھا مگر اتنا مجھے ہوش رہا
ہم نفس کون رہا، کون ہم آغوش رہا
تو سبک دوش رہا اور میں گراں دوش رہا
وہ رہا دل میں مگر آنکھوں سے روپوش رہا

گو کہ تخلیت کا مرے دل میں بہت جوش رہا
چشمِ ساقی کے تصور میں جو مدہوش رہا
تیری تو بن ہے ساقی جو مجھے ہوش رہا
آنکھ ملتے ہی مری مجھ کو کہاں ہوش رہا

نشتر کرانوی

پھر وہ نازیں جب تک کہ وہ بے پرسش رہا
بجلیوں کا مرے سر میں بہت جوش رہا

پھر انھوں میں وہ مجھ کو تکتے رہے
صبح نازیں جب تک کہ میں بے ہوش رہا

اس کی شانِ کرم و عفو کا واہ کیا کہنا
ہم خطا کوش رہے اور وہ خطا پوش رہا

آصفر

وہ بھی مسرت رہا میں بھی نشے میں سرشار
چاند جب تک رہا دریا میں بہت جوش رہا

لے اڑیں گے یہ قفس کو بھی پروں پر اک دن
ہم اسیروں کا جو کچھ دن رہا جوش رہا

قادری ہاردوئی ۔ ایڈیٹر قادری

تیرا پردہ بھی عجب پردہ ہے اے پردہ نشین
نہ تو تو سے عیاں ہو کے بھی روپوش رہا

میں نہیں ظلمتِ دنیا سے پریشاں قادری
میں جہاں بھی رہا خورشید در آغوش رہا

رضا یادوی رائے پوری

بزمِ ساقی کا یہ عالم ارے توبہ توبہ
کوئی بے ہوش رہا اور کوئی مدہوش رہا

نشہ میں بڑھ کے قدم چومیں گی اک عمر رضا
ہاں اگر سعی مسلسل کا یہی جوش رہا

طالب انصاری جمیل پوری

بزمِ ساقی میں تو کہنے کو رہے ہوش رہا
ہوش کی کون کہے کس کو وہاں ہوش رہا

لے کے میکش ہی وہاں طورِ قیامت اٹھے
میکدہ ساز کہاں میکدہ بردوش رہا

وہ نہ آئے تو سحر بھی نہ ہوئی ہجراں کی
پرستارِ شبِ فرقت میں سیہ پوش رہا

فخر ناگپوری

پیتا ناگہ ہے جلوہ ترا ہر قدح سے میں
یہ نہ سمجھا کہ وہ کیوں آنکھ سے روپوش رہا

اس کے بجھ جانے سے طوفان کی گھٹا آئی نہیں
چاند جب تک رہا دریا میں بہت جوش رہا

خوشتر کرانوی

میرے ہر سانس میں مستور رہے تم جب تک
کیا بتاؤں کہ مرے تن میں کیا جوش رہا

خضر محمد خضر ناگپوری

مجھ پہ اپنا نہ ہوئی آپکی توجہ کی نظر
میں تو نشے میں ہمیشہ بہ ترنگوش رہا

محمد رضا مضطر سلطان پوری

میں نہ آتا تھا کہ وہ آئے تھے سرِ بزم مگر
ان کا میں کرتا تھا کیا یہ کہاں ہوش رہا

نوکن شعلۂ دشنیم انعامی مشاعرہ نمبر ۵۱

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء

مصرع طرح ۔ دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں ۔

طلب گار، خریدار، ثنا خواں ۔ نہیں ہوں رویف

نام ... ...

پورا پتہ ... ...

بقیہ: افسانے پر گری صفحہ ۔ سے آگے

جو چکے ہیں ۔

احباب مجھے دو سال بعد ۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ دبئی میں اپنے شوہر کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہے ۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا لیکن ..... ؛ " یہ کہہ کر وہ کہنیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور بڑے یاسیت کے لہجہ میں بولا ۔

" میرے عزیز دوست ! میں اب اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا ۔ اللہ اس کا قریب ۔ ناممکن ہے اس لئے میں مرجانا چاہتا ہوں ۔ ! " وہ بری طرح سسک اٹھا ۔

" لعنت نہیں میرے اجنبی دوست ! میں تمہاری مدد کروں گا ! " اس نے بڑی بیچینی سے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا ۔

وہ اپنی بیوی کو تلاش کرنے فٹ پاتھ اور ڈوں میں گھوم رہا تھا ۔ لیکن وہ وہاں نہ تھی ۔ بلکہ اب وہ خود اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس وارڈ میں آگئی تھی جس میں وہ زخمی نوجوان زیرِ علاج تھا ۔ چند لمحے بعد وہ اس کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی ۔ مگر زخمی نوجوان آنکھیں موندے ماضی کی دیران اور اجاڑ دنیا میں گم تھا ۔ اور اس نسوں کا سمندر اس کی آنکھوں سے رواں تھا جس پر جا بجا سفید پٹیاں بندھی تھیں ۔ اس کا تمام وجود زخمی تھا اور زخموں کی ٹیسیں تھیں ۔ یہ ٹیسیں اس کو کسی پہلو قرار نہ لینے دے رہی تھیں اور اب وہ زندگی سے چھٹکارا چاہ رہا تھا ۔ لیکن زندگی سے مفر اس کے بس میں نہ تھا ۔

ناگہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ اس کے سامنے ایک جوان عورت کھڑی تھی ۔ دونوں کی نگاہوں میں کچھ دیر تک تصادم رہا اور پھر پہچاننے کی کوشش ہوئی ۔ اور جب یہ لمحے پر نمی ضائع ہوگئے اور وہ عورت بھی ٹکٹکی اس کو دیکھتی رہی ۔ اس کے لب بڑی شدت سے کچھ کہنے کو پھڑپھڑائے ۔ وہ عورت بدستور اس کو بہوت ہو کر دیکھ رہی تھی ۔ اگلے ہی لمحہ وہ پوری قوت سے چیخا ۔

" شاہینہ ۔ ! "

" اختر ۔ ! " شاہینہ دفعہ جذبات میں بہہ کر اس کے بیڈ کی طرف لپکی اور اس کے زخمی وجود کو اپنی گداز باہوں کے حلقے میں لے لیا ۔ دونوں بری طرح سسک اٹھے ۔ دونوں دنیا و مافیہا سے دور ۔ ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے ، ایک نئے جذبے سے ہم آغوش تھے ۔ وہ پھر سسک اٹھا اور بولا ؛

" شاہینہ مجھے یقین تھا کہ تم ایک بار مجھ سے ضرور ملو گی ۔ اب میں نہیں مروں گا ۔ ! " اس کے لہجے میں عدم اللہ یقین کی شمعیں فروزاں تھیں

مگر جواب میں شاہینہ بری طرح کانپ اٹھی کیونکہ

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

اس باغِ گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی

شعلہ و شبنم دہلی

اپریل
۱۹۶۳ء

زرِ سالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۴

فہرس

۱	طرفہ قریشی بھنڈاروی نظموں کی روشنی میں	آبر احسنی	۴
۲	اپنی محفل اپنے دوست	مختلف خطوط	۹
۳	ان سے ملئے	تماشائی	۱۰
۴	شامِ غزل	صمد حمیدی	۱۲
۵	ارشادات	نوح ناروی	۱۴
۶	رباعیات	راز احسنی	۱۵
۷	قطعات نازک	نازک احسنی شکوہ آبادی	۱۵
۸	انکار تو	دیوانِ آغا غازی جبل پوری	۱۶
	〃	ارشد صدیقی	۱۱
	〃	فرحت القادری	۶
۹	غزلیات	ڈاکٹر حسین بریلوی،	۱۷
	〃	محمد حسین شاغل ناگ پوری	۶
	〃	جودت رائے پوری	۶
۱۰	جلال و جمال	رام شنکر مصرا آزاد کانپوری۔ شاداں کنگل	۱۸
	〃	الطاف انصاری۔ منیر احمد قمر	۶
	〃	شرر سلطان پوری۔ شاغل قادری	۶
۱۱	تلی کے دانے	کرشن چندر	۱۹
۱۲	سقما	مترجمہ روشن چٹیالوی	۲۳
۱۳	تکمیلِ تمنا	نسیم کرناٹکی	۲۴
۱۴	تارِ عنکبوت	نظر حنفی جبوی	۲۷
۱۵	طرحی مشاعرہ (مختلف شعراء کرام)	مرتبہ شفا گوالیاری ناظم مشاعرہ	۲۲

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں دہلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصہ نظم
حضرت مولانا آبر احسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونینِ خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

باہتمام شری بمل پرشاد جین پرنٹر و پبلشر دیال پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی سے شائع ہوا

آبا حسنی گنوری

طرفہ بھنڈاروی نظموں کی روشنی میں

میں جب کسی ایسے خوش گو، صاحب فکر و پختہ کلام اور اکمال شاعر کا کلام دیکھتا ہوں جو کہ اہالی کی نسبت یا اہل وطن کی ناقدردانی نے شہرت و مقبولیت کے اس مقام سے محروم رکھا ہو جس کا وہ حقدار ہے تو پہروں سوچتا ہوں کہ اگر اس شاعر کے پاکیزہ و لطیف خیالات پر مشتمل یہ ٹھوس مضامین۔ جذبات قوم و وطن دوستی نرالے انداز بیان، حسین تشابیہ و استعارات۔ دل میں اتر جانے والی خوبصورت ہندشیں عوام و خواص اور بالخصوص جدتی اور درمیانی سٹیج کے شعراء تک پہنچیں تو قوم کے خیالات و اعمال کی کتنی اصلاح ہو۔ تہذیب اور معاشرہ کو کتنی مدد ملے اور ہمارا ادب کتنی ترقی کر جائے۔

کون نہیں جانتا کہ اچھا شاعر اور اچھا شعر دم زدن میں انقلاب لے آتا ہے۔ حالات میں انقلاب خیالات میں انقلاب اور اعمال میں انقلاب۔ دماغ کی بالیدگی، اچھے دلچسپ اور مفید شعر سے جس قدر جلد ممکن ہے دوسری چیز سے ممکن نہیں۔ معاشرہ کی برائیوں کو اور جرائم کو فراوانی کو پولیس درست نہیں کر سکتی۔ البتہ اچھا شاعر اور اچھا شعر درست کر سکتا ہے۔ طاقتور اور صالح شعر پستیوں کو اٹھا کر بلندی پر پہنچانے کا کتنا کامیاب ذریعہ ہے، دنیا نے اس کا بار بار امتحان کیا ہے۔

مگر ملک و قوم کی بے حسی کا ماتم کیجئے کہ آج بھی شعر اس کی ضروریات زندگی میں شامل نہیں ہے۔ نیز اس کے اس کی گزر نہیں ہوتی۔ مگر وہ کیسے شعر پسند کرتے ہیں؟ جن میں لذت نفسانی اور خواہشات شیطانی کا مواد ہوتا ہے جو ہمارے جنسی جذبات میں ہل چل پیدا کر دیں آوارہ اور بدچلن بنا دیں، اور جن کو کرنی شاعر مگر آج کل سیسہ استاد سے مانگ لایا ہو، سازندہ اسٹیج پر جھوم جھوم کر، تھرک تھرک کر، سیٹی کے تمام تار چھڑا دے کے ساتھ سریلی آواز دے گا دے۔ اس وقت ان محفل کی دجرانی کیفیت اور فقرہ بازی کا نشانہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ معتبر شعراء ان چیخنے اور داد دینے والوں کے منہ تکتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ شعر و ادب کی لاش کا کیا عالم ہوگا۔۔۔ اور نہ گویا شاعر کا دپ بھر کر اسٹیج پر تھرک رہا ہے خوش ہے کہ میں ہی شاعر اعظم ہوں اور میرے مقابلے میں یہ تمام شاعر ہیچ اور پوچ ہیں۔ اگر وہ جاہل مطلق ایسا سمجھ رہا ہے تو کیا غلط سمجھ رہا ہے؟۔ عوام کو چھوڑیئے جب کہ خود ہمارے متقلین شاعر اور پڑھے لکھے لوگ چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی گویوں کو بلاتے ہیں اور ناقص، سستے اور بازاری شعر سنوا کر لوگوں کے مذاق سخن فہمی کو ہلاک کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ معزز و معتبر شعراء قوم کا مرثیہ اپنے گھر میں بیٹھے لکھتے رہیں اور اپنے اشعار کا قیمتی خزانہ اپنے ساتھ قبر میں رکھ دینے کی احباب کو وصیت کر جائیں۔

ممکن ہے کہ طرفہ قریشی بھی ایسے ہی شاعروں میں ہوں جن کو خدا نے شاعرانہ کمالات قوافراط سے دیئے مگر شاید گلے کا ساز نہیں بخشا، جس کی وجہ سے ان کی شہرت اس بلندی پر نہ پہنچ سکی جس کے وہ بجا طور پر حق دار تھے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ خود کوئی مولوی قسم کے "ارک الدنیا لوگوں میں ہوں اور اپنے کلام کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کو فعل عبث یا مخل عبادت سمجھتے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ ناقدر شناسی مدیران رسائل نے ان سے بے نیازی کا سلوک کیا ہو اور پھر ان کی خودداری ایسے ایڈیٹروں کو آواز دینی اپنی توہین سمجھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ کوئی ایڈیٹر ہم سے کلام طلب کرے تو ہم بھیجیں۔

میں طرفہ صاحب کو یہ بات بتا دوں کہ اگر ان کی جانب سے کوتاہی ہے تو یہ ان کی ایسی غلطی ہے بلکہ گناہ ہے جس کا جواب انہیں خدا کو دینا ہوگا۔ خدا نے یہ شاعرانہ صلاحیتوں کا خزانہ انہیں اس لئے دیا ہے کہ وہ اس کا فائدہ خدا کے دوسرے بندوں تک پہنچائیں اور اگر ایڈیٹروں کا مقصد ہے کہ وہ کمزور قسم کا کلام اپنی مصلحتوں کے تحت شائع کرتے ہیں۔ مگر طرفہ جیسے باکمال شاعر کی خدمات حاصل نہیں کرتے تو ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے تمام ایڈیٹر بھائیوں کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میں طرفہ صاحب کو مستقل دعوت دیتا ہوں کہ وہ رسالہ "شعلہ و شبنم" دہلی، "ادب لطیف" لاہور اور "رہنمائے تعلیم" بمبئی کو اپنا کلام مستقل بھیجتے رہیں۔ میں بڑے فخر سے ہر رسالہ میں ان کی چھ غزلیں یا نظمیں ہر سال شائع کر کے ان رسائل کی عزت بڑھاؤں گا جو میری نگرانی اور ادارت میں نکلتے ہیں یہ دونوں رسالے پرانے ہیں۔ کثیر الاشاعت ہیں ان کے علاوہ چند اچھے اور رسائل میں کلام بھیجنے کی سفارش کروں گا جو طرفہ صاحب کے کلام کے شایان شان ہوں۔

یوں تو کہا ہے گا ہے مخمور صاحب کا کلام کسی کسی رسالے میں نظر آتا ہے۔ مگر ایک دوست کے یہاں ــــ "پہلی کرن" نامی دیوان مصنفہ طرفہ قریشی نظر آگیا۔ خوبصورت جلد، مصنف اور مرتبین ان کے جواب کی تصویریں۔ حضرت آزاد چاندپوری کا مقدمہ اور متعدد بہتر لوگوں کی آرا، ۱۰۰ صفحات تک مختلف موضوعات پر معیاری نظمیں۔ پھر ۱۰۱ سے ۲۰۰ صفحہ تک بلند پایہ غزلیں اور قیمت صرف ۲ روپے پچاس پیسے جو طرفہ صاحب ہی سے "معصوم شاہ کا کیہ مومن پورہ ناگ پور ۱" سے مل سکتا ہے۔

اس دیوان کو دیکھ کر میں کتنا محظوظ اور خوش ہوا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اپنی الجھی ہوئی بے حد مصروف زندگی کے باوجود اظہار خیال پر مجبور ہو گیا ارادہ ہے کہ نظموں کے بعد غزلیات پر بھی قلم اٹھاؤں۔

طرفہ کی نظموں میں مجھے سب سے بڑی اور پہلی خصوصیت جو نظر آئی وہ یہ ہے کہ ان میں عام شعراء اور بالخصوص ان شعراء کی طرح جو صرف نظم ہی کو شاعری جانتے ہیں اور غزل کو نیم وحشی صنف بتاتے ہیں، معاشقہ اور بازاری قسم کی ایک بھی نظم نہیں ہے۔ میں خود اسی بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ نظموں کو قوم و ملک کی بھلائی کے لئے مخلص کرنا چاہئے۔ معاشقہ کے لئے غزل اور صرف غزل ہے اور جو لوگ غزل سے نفرت کر کے نظم کو غزل بناتے ہیں شاید ان کے پاس اس اعتراض کا جواب نہ ہو کہ جب غزل کہنی ہی ہے تو نظم کو غزل کیوں بناتے ہو۔

طرفہ قریشی کی ایک نظم کا عنوان ہے "دو شیزۂ سیاست"۔ اس میں عالمی سیاست کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور بڑی بے باکی سے لطیف انداز میں ــــ اس سیاست کا اندازہ یوں کیا ہے ــــ کبھی جانتے ہیں کہ شاعر نے ملک و قوم کا دیوانہ اور فدائی ہوتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ ملک و قوم کے کرتا دھرتا غلط راہوں پر چل کر ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے اور بغیر انجام پر نظر کئے ہوئے حالات ان کے محبوب کو ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اس میں طنز کے تیر و نشتر اپنے خون میں ڈبو کر ان پر چلاتا ہے جو اس تباہی کے ذمہ دار ہیں چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

دنیا یہ میری دنیا ہے زندگی کا دامن
ہر قطرہ اک جنازہ ہر ذرہ ایک دفن
فریاد قوم کی اپنے انسان نے بدل دی
اک شور نالہ گھر گھر، اک آہ آنگن آنگن
دہقاں کی زندگی کی خوش حالیاں نہ پوچھ
خشکے ہوئے ہیں دھنسا پھوٹا ہوا ہے خرمن
اللہ رے فصل نو کا انجام بے نہایت
گلشن بھی چاک دامن، صحرا بھی چاک دامن
احساس اک خلا ہے ادراک الجھا الجھا
شاید دماغ و دل میں کچھ ہو گئی ہے ان بن
دوشیزۂ سیاست آوارہ ہو نہ جائے
بھٹکا ہوا ہے آنچل بہکا ہوا ہے جوبن

میں نے نظم سے صرف چھ شعر پیش کئے ہیں۔ اب آپ ہر شعر کو غور سے پڑھئے اور سوچئے کہ طرفہ نے جس چیز کو بھی لیا ہے۔ کس خوبی سے اس کی تصویر کھینچی ہے اگر آپ کسی کی بے جا حمایت کے قائل نہیں ہیں تو آپ کو کہنا پڑے گا کہ جو بات کہی ہے اس پر مبالغہ کا دور سا شعر دیکھئے اور سوچئے کہ انداز بدل کر بھی زیادہ نہیں ہو رہی ہیں جا بے سے پہلے تھیں؟ کیا ہر شخص نالہ لیب اور شاکی روزگار نہیں ہے؟ ــــ اسی طرح شعر ۳ دیکھئے کہ اگر کسان کو کچھ سہولتیں دی گئی ہیں تو دوسرے قسم کے بار اور الجھنوں سے اسے دوچار نہیں کر دیا گیا ہے؟ ــــ چھٹا شعر تمام شاعرانہ محاسن کے ساتھ کتنی تصویر پر طنز ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

"صلۂ وفا" بھی اسی قبیل کی ایک شکایت آمیز نظم ہے اور یہ اس طبقہ کی حالت کا نقشہ کھینچ رہی ہے جو انتہائی وفاداری کے باوجود بے وفائی، غداری، ضمنی کا لم اور اس قسم کے دل شکن، دماغ سوز اور ذلت آمیز خطابات سے نوازے جاتے ہیں نوازا جاتا ہے نہ صرف نوازا جاتا ہے بلکہ عملی طور سے اس کی حیثیت کو کتنے خطروں سے ہم آغوش کر دیا جاتا ہے۔ اس سے سبھی واقف ہیں۔ سنئے ؎

اس خرد کی انجمن کو دور سے اپنا سلام
مسکرانا بھی جہاں ممنوع رونا بھی حرام
اب کہاں وہ دن کہ بجلے وہ شریکا اہتمام
اپنے ہمراہ لا کھڑی بجلی ہماری صبح و شام
کیوں نہ ہو جمعیت خاطر میں پیدا انتشار
ہے جنوں کے ہاتھ میں فرزانگی کا انتظام
کیوں ہماری جدیت پر ہے زمانہ طعنہ زن
ہر دور ہا ہے یہ کہ دنیا میں نظام
یہ زمیں بھی آسماں کی طرح ہے خیمہ فشاں
آدمی پہچان لے جو آدمیت کا مقام

دیکھئے اور سوچئے کہ کوئی بات ان اشعار میں غلط تو نہیں ہے؟ ــــ پھر حسن ادا اتنا پیارا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں سے تلخی کا احساس تک نہیں ہوتا حالانکہ شاعر نے خون کے آنسوؤں سے زمین لال کر دی ہے۔ بجز اس کے اس نے جذبات کی گرمی کو جذب کر لیا ہے میں اگر ان شعروں کی تشریح کرنے بیٹھ جاؤں تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی فریاد بن جائے گی اور شاعر نے جو انداز اختیار کیا ہے اور پردہ پوشی کا اہتمام کیا ہے اس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ غرضیکہ ہر شعر ایک دلدوز افسانہ لئے ہوئے ہے اور حالات کا مرثیہ ہیں۔ ان کو شاعر اول ان حالات سے گزرے ہیں۔ اگر ہر شعر پر شاعر فخر انسان کو انسان بننے کی طرف توجہ دلا کر اپنا فرض شاعرانہ ادا کر لیتا ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کا عنوان ہے تحریر ہے ــــ اور دیکھئے کہ کس خلوص سے [illegible]

یہ کیا تجزیہ کیا ہے ؎

لوگ کہتے ہیں بصد فخر مباہات اکثر
ملک تقسیم ہوا دیش سے بچتا بھاگی
اڑ دیے بھاگ گئے دیش کے بندھن سے
منہ پہ ناگن جو لگے ہنسنے بھارت دھن سے
ملک آزاد ہوا دیش کی قسمت جاگی
اب تو ہے راگنی نہیں کوئی بھی سب میں راگی

میں یہ کہتا ہوں تمدن کا جنازہ نکلا

بے شک غلامی بڑی لعنت تھی جو کروڑوں انسانوں کو خونی کفن پہنا کر ہمارے ملک سے دور تھوکی گئی۔ اور لاکھوں کے گھروں کو برباد و تباہ کر کے کالا منہ کر گئی۔ اور بیشک آزادی بڑی نعمت ہے۔ بشرطیکہ انسان آزادی کا صحیح استعمال کرے۔ مگر جب یہی آزادی مطلق العنانی اور شاہی اور بھینس کا جنگل والا قانون بن جائے تو طرفہ اس کو تمدن کا جنازہ نکلنے سے کیونکر تعبیر کرتے ہیں تو کیا غلط ہے؟ مگر شاعر تو برابر چیخ چیخ کر اپنے تجربہ کا مستقل کر رہا ہے۔ وہ ایک منٹ کو بھی اپنے فرض سے غافل نہیں۔ مگر اس گراں گوشی کا کیا علاج؟ کہ کسی کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

ہمارے ملک میں ۲۶ جنوری ہر سال جشن جمہور منانے کا مژدہ لے کر آتی ہے اور تمام ارباب وطن مل کر اس روز خوشی مناتے ہیں۔ چراغاں ہوتا ہے جلسے ہوتے ہیں۔ مشاعرے منعقد کئے جاتے ہیں اور شاعر بکثرت ملک کے ذمہ دار ارکان کے سر پر کفن لیتے ہیں۔ خوب دل کھول کر مدحیہ قصیدے پڑھتے ہیں اور انھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ سب امن چین اور راحت کے جھولے میں جھول رہے ہیں۔ تم بڑے اچھے منتظم ہو۔ عادل و رحم دل ہو، رعایا پر مہربان ہو۔ ہمیں ایسے ہی پھولے پھلتے جاؤ۔ ہم خوش، ہمارا خدا خوش۔ مگر ایک دقیق النظر حق نواز ملک و قوم کا سچا ہمدرد شاعر طرفہ قریشی یوں نعرہ لگاتا ہے ؎

اٹھاؤ دار و رسن کا نہ خلق سے دستور
ابھی ہیں ذہن میں فطرت کے سینکڑوں منصور
دکھائی دیں گے نہ محلوں میں خوشۂ انگور
پھر گئی جو کسی دن خلاف جمہور
کچھ ایسے ڈھنگ سے پروان چڑھ رہا ہے فرد
ملک رہی ہے متاعت سسک رہا ہے شعور
جہاں دکھائی نہ دیتا تھا دن کو سورج تک
اُجالے بانٹ رہی ہے وہاں شب دیجور

ہے شرمسے سر جھکیں، خیریت نہیں ان کی
کہ موڑ موڑ پہ ہے آج شیطنت کا ظہور
ہر اختیار ہے اک جبر ناتمام لئے
الٰہی آدمی مجبور! اور اس قدر مجبور

طرفہ نے جو حقیقت بیان کی ہے اس سے تو کسی کو گنجائش انکار نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پروان چڑھتا ہوا فرد اپنے عیبوں کی پردہ دری ہوتے دیکھ کر طرفہ کو دار پر کھینچ دے۔ مگر میں تو آپ کی اس طرف توجہ دلاؤں گا کہ کس حسن سے شاعر نے تمام حسین زیورات پہنا کر طرفہ نے شعروں کو نظم کیا ہے۔ کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں خصوصاً پہلا مطلع کتنا وسیع المعانی ہے۔ جس میں طنز بھی ہے، ہدایت بھی ہے۔ نکتہ چینی بھی ہے، سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کاش اس شاعر کے لطیف خیالات حسین بندشیں دلکش انتخاب لفظی، سلیس انداز بیان اور متین لیکن پُرجوش جذبات ملک کے ہر شاعر کو مل جاتے ہیں۔ اس کے خلوص کا کوئی اندازہ کرے کہ یہ اپنے ملک کو کتنا اونچا دیکھنے کا خواہش مند ہے اور کس بے باکی سے تنقید کر رہا ہے۔ اُسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اپنی صداقت اپنی دلیر کا مل اعتماد ہے۔ اس قبیل کی دیوان میں مقدد اور بھی اچھی نظمیں ہیں جن کو ناظرین کے ذوق مطالعہ پر چھوڑتا ہوں۔

کوئی جماعت یا قوم اس وقت بے وقار اور تباہ ہو جاتی ہے جب وہ آرام طلب ہو جائے۔ رفتہ رفتہ کاہلی بے عملی اس کا جزو طبیعت بن جاتی ہے اور چونکہ بے عملی کا نتیجہ ہمیشہ تباہی نکلتا ہے اس لئے یہی بے عملی اس کو مختلف قسم کی ذلتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ طرفہ قریشی اپنے گرد و نواح میں اس مہلک بیماری کو پھیلتا ہوا دیکھتے ہیں اور موجودہ پستی کا سبب اسی بے عملی کو سمجھ کر قوم کو "نغمۂ عمل" سنا کر عمل کے خواہاں بڑے پرکشش انداز سے سناتے ہیں۔ اس میں سے کچھ آپ بھی سن لیجئے۔ نظم تین تین مصرعوں کے بند پر ساخت کی گئی ہے ؎

وقت کے ساز پہ چھڑتا جو عمل کا نغمہ
اور فروزاں مہ و خورشید کے ہو جاتے چراغ
عرش پر اڑتا گل و لالہ و نسریں کا دماغ
گھٹ کے مر جاتے اُجالے میں اندھیرے شب کے
مطلع دل پہ چمک جاتی مسرت کی کرن
مسکرا اُٹھتا ہر اک سمت امیدوں کا چمن
نہ چتائیں نظر آتیں نہ شہیدوں کے مزار
اس قدر ہوتی نہ دنیا میں کہیں لوٹ کھسوٹ
نظر آتا نہ زمانے میں کہیں کوئی بھوت

اور اسی طریقہ سے مختلف زاویہائے عمل پر موتی ٹانکتے چلے گئے ہیں کھل کر ملامت نہیں کی ہے۔ بے عملی کو ہدف کار نہیں بنایا ہے۔ بلکہ سریلی آواز میں بتاتے چلے گئے ہیں کہ اگر قوم با عمل ہوتے تو یہ تاریکیاں جو تمہارے سروں پر مسلط ہیں اجل کی روشنی ان کا گلا گھونٹ دیتی اور تمہارا دل خوشی کا گہوارہ بن جاتا اور ہر طرف تمہاری امیدوں کے چمن پر بہار آ جاتی۔ غرض طرفہ کے دل کی تڑپ اہل وطن کی کمزوریوں پر بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہر رُخ سے قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کہیں ان کی برائیاں ان کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ کہیں اچھے کاموں کے بہتر نتائج کا لالچ دے رہے ہیں اور ایک سچے قوم پرست شاعر

یہ عالم ہوا کرتا ہے۔

ایک لمبی اور بہترین نظم "نظام فطرت" کے عنوان سے دیوان میں ہے۔ اس میں ایسے نظام کو مرتب کرنے کی خواہش کی گئی ہے جس کا تصور ہی انسان کو فردوسی فضا میں لے جاتا ہے۔ نظم کی ترتیب چھ چھ اشعار کے بند پر ہے جس کا آخری مصرع ہے۔

"اک ایسا نظام نو بزم عالم میں مرتب کرنا ہے"

اس کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے اندازہ ہو جائے گا۔

اندھیرے اور اندھیرا دیئے کے پرتو سے خانے میں
ہر کرہ کو پوجا جاتا ہے ہر کاہ کو روندا جاتا ہے
بربات پہ کھاتا ہے قا ایمان کی قسمیں جھک جھک کر
مومن کی جگہ قرآں میں ابلیس کو سونپا جاتا ہے
بیدہ پہ بیتابی پہ طنز و تشنیع کی ہوتی ہے بارش
جب مرتے نہیں یہ فاقوں سے باتوں سے مارا جاتا ہے

یہ جبر و تشدد کچھ نہ رہے یہ ظلم و ستم سب مٹ جائیں
اک ایسا نظام نو بزم عالم میں مرتب کرنا ہے

اس حقیقت کو ماننے میں کسے تامل ہوگا کہ یہ دور دور مذہب کے مراکز جہاں سے انسانیت، نیکی، صلح، خیر اور خوشی کا پیغام ملنا چاہئے وہاں سے حیوانیت، بدی، شر فساد اور ظلم و آلام انسانی کے پروگرام مرتب ہو کر عملی جامہ پہنتے ہیں۔ یہ مولوی، یہ پنڈت، یہ مذہبی پیشوا جن کے ہاتھوں میں صرف جہلا کی لگام رہ گئی ہے کس کس طرح انہیں نچاتے ہیں اور ان کو غارت کرتے ہیں۔ تو کیا ایسے نظام کی ضرورت نہیں ہے جس میں صرف انسانوں کو دخل ہو۔ ان درندوں کا نہ ہو۔ نظم بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اور بہت اثر و کشش رکھتی ہے

طرفہ صاحب نے ایک سخت عنوان پر نظم لکھ کر کیا ہے میں پھول اگائے ہیں۔ عنوان ہے "مرد اور عورت" اگر عنوان صرف مرد یا صرف عورت ہوتا تو شاعر کو کسی ایک اظہار خیال کی آسانی ہوتی اور وہ روانی سے کسی ایک صنف پر کہتا چلا جاتا۔ مگر طرفہ کو اپنے فن پر اپنی وقت پسند طبیعت پر اعتماد ہے۔ اپنی مشق پر بھروسہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک مصرع میں "مرد" اور دوسرے مصرع میں "عورت" پر مسلسل تبصرہ کرتے ہوئے چلے جائیں گے اور نہ ربط میں فرق آئے گا نہ ترتیب میں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مرد کی ہر آرزو گل پوش، جنت در کنار
اور عورت حسرت و ارمان کا اک خار زار

مرد کی فطرت مزاج حالی کبھی یا
اور عورت کو نہیں فریاد کا بھی اختیار

مرد جب چاہے کرے عورت سے اظہار ہوس
اور عورت ضبط و ذوق و شوق سے سینہ فگار

مرد جب چاہے لگائے قہقہے پر قہقہہ
اور عورت آنسوؤں سے بھی نہ کھیلے ایکبار

مرد کی خامیاں داد عمل کی مستحق
اور عورت پارسا رہ کر بھی ہے عصیاں شعار

آہ یہ اندھیر یہ بیداد، یہ حق تلفیاں
آسمان دیکھا زمیں کا ہے کوئی پروردگار

پوری نظم اسی شان کی ہے۔ زور بیان بڑھتا ہوا چلا گیا ہے۔ حقیقت کے چہرے سے جبر و تعدی اور بلاوٹ کی نقابیں اٹھتی چلی گئی ہیں حقیقت بیانی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ پورا پورا انصاف کیا گیا ہے۔ عورت کی اتنی کھلی حمایت مرد شعراء نے کم کی ہے اور یہی اصلی نقلی شاعر کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنی جنس کی سچی کوتاہیاں جس میں وہ خود بھی شامل ہے کھول کر رکھ دے۔

ایک نظم ہے "دوشیزۂ جنگ"، اس کے چار پانچ شعر دیکھئے اور جنگ کے انداز ظاہری پر خوش نما اظہار خیال کیا ہے۔ لفظوں کی حلاوت میں حقیقت کی تلخی کو کس فن کارانہ انداز میں ظاہر کیا ہے۔

مغرب سے بڑا شور مچاتی ہوئی آئی
جنبش میں ہر اک ذرے کو لاتی ہوئی آئی

چہرے سے عیاں شعلۂ جذبات کی حدت
آگ اور پسینے میں نہاتی ہوئی آئی

ہونٹوں کے تبسم میں دمکتی ہوئی آتش
مشرق کی طرف آگ لگاتی ہوئی آئی

دوشیزۂ جنگ آفت پیدی مست جوانی
پتھر بھی جسے دیکھ کے ہو جاتا ہے پانی

مغربی ہوس کاروں نے آتش جنگ کو دنیا میں بھڑکا کر ہم اہل مشرق کو کن تباہیوں میں مبتلا کیا اس کا ہمیں واقف نہیں۔ ۱۹۳۹ء میں سولہ سیر کے گیہوں، ڈھائی سیر کا گھی بکتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی یہ برکت ہے کہ ڈھائی دو سیر کے گیہوں کھاتے ہوئے ۲۰ سال گزر گئے زر چیز گرانی کی آگ میں جلس کر رہ گئی اور انسانوں پر عافیت ہنوز تنگ تر ہے۔ بیرو شما پر ایٹم بم نے کیا ستم توڑا اس کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ دہلتا ہے وہ دیوانے جو آج بھی جنگ کی باتیں کرتے ہیں، تمہاری آتش انتقام اور ہوس اقتدار نے اگر جنگ بھڑکا دی تو دنیا میں سوائے ویرانی کے کیا رہ جائے گا؟ جب کہ "ہائیڈروجن" بموں کا استعمال عام ہوگا، اور جو ایٹم بم کے باپ ہی نہیں، بابا آدم ہوں گے۔

طرفہ کی بڑی پُرخلوص نظم "میرے ساقی" ہے ذرا اس کے دو بند پڑھئے اور طرفہ کی وطن دوستی کا انداز لگایئے۔

تیری نظریں مرے تقوے کی نگہباں لیکن
تیرے ماتھے کی لکیریں مرا قرآں لیکن
تیرا گھنگھار تبسم مرا ایماں لیکن
ملک کو خواب غفلت جگا لوں تو کہیوں

میرے ساقی تو ہے قرباں ابھی مجبور نہ کر
علم حریت حق اٹھانا ہے مجھے
خون پانی کی طرح اپنا بہانا ہے مجھے
ہند کو عزت فردوس بنانا ہے مجھے
جو ہر تیغ و قفس کو دکھانا ہے تجھے

میرے ساتی ترے قرباں اجلی مسجد نہ کر

ایک بڑی اہم بڑی گہری نظم ہے۔ "لیڈر" لیڈر لیڈر کا کردار کیا ہے۔ لیڈروں کے کردوت کیا ہیں۔ لیڈر کیا کرتے ہیں ماں کے کیا کارنامے ہیں۔ ان سے آج ملک کا بچہ بچہ آگاہ ہو چکا ہے۔ مگر سبھی لیڈر کیساں ذہنیت کے نہیں ان میں کچھ انسان بھی ہیں جو اپنے فرض کی ادائیگی کا بھرپور احساس رکھتے ہیں اور اپنے فرض کو کامل ایمان داری سے ادا کرتے ہیں۔ مگر اکثریت !!۔۔۔

طرفہ لیڈر سے مخاطب ہیں ؎

تیرے ہر قہقہے میں روشن ہے سیاست کا چراغ
تجھ کو قدرت نے دیا ہے اہلِ یورپ کا دماغ
تیرے ہر فقرے میں پنہاں ہیں ہزاروں انقلاب
توڑ سکتا ہے آزادی کے چہرے سے نقاب
ہوں فلاحِ قوم کی راہیں اگر پیشِ نظر
تو نکل سکتا ہے باطل کی صفوں کو چیر کر
تیری تقریروں میں پہلو ہو اگر تعمیر کا
آج بھی محبوب ہے تو ہر جوان و پیر کا
خدمتِ خلقِ خدا میں اٹھے گر تیرا قلم
اپنے نقشِ پا پہ رکھ سکتا ہے منبر و حرم
قوم کی قسمت تری لقت پہ ہونی چاہئے
پہلے تیرے ہاتھ میں شمشیر ہونی چاہئے
تو نے جس آئین پر رکھی تھی بنیادِ یقیں
کھو گیا ہے اب وہ تیرا اعتماد و آستیں
تیری تقریروں میں بھر دیں تیرا خطبہ خام ہے
مشتعل لوگوں کو کرنا صرف تیرا کام ہے

لیڈر کی وہ طاقت بھی پہلے بند میں دکھائی گئی ہے جس پر اگر وہ کاربند ہو اور اپنی روش کو بدل دے تو کیا صورتِ حالات پیدا ہو سکتی ہے اور دوسرے بند میں وہ اضافی قیمت بھی بیان کر دیئے ہیں جن کا وہ روزِ شب مرتکب ہوتا رہتا ہے۔

گاندھی جی کی موت پر طرفہ نے ایک بہت عمدہ گیت لکھا ہے "گورا پنچھی" ۔۔ کے عنوان سے انگریزوں کے ہندوستان سے انخلاء پر بہتر نظم ہے اور مستعد نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ مگر میرے پیشِ نظر رسالہ کی کوتاہ دامنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو طرفہ کی بہت سی نظمیں میرے قلم کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ طرفہ کی آخری نظم "سیماب" اپنے محترم اُستاد کے حضور میں نذرانۂ عقیدت ہی نہیں اظہارِ حقیقت بھی ہے۔ جس میں جذبات کا دریا موجیں مار رہا ہے ؎

رونقِ محفلِ فن تھا سیماب
نورِ مصباحِ سخن تھا سیماب
شاعری اس کی تھی وجہِ نازش
نازِ اربابِ سخن تھا سیماب
جس کو دنیائے سخن کی آنکھوں کا سرور
دل سے استاد کا من تھا سیماب
کہہ دو صرصر سے جھکا کر طرفہ
شاہِ اقلیمِ سخن تھا سیماب

یہ نظم ایک صفحہ پر پھیلی ہوئی ہے اور مختلف زاویوں سے حضرت مولانا سیماب جنت مکانی کے کمالات کا اظہار کیا ہے۔

حق یہ ہے کہ طرفہ کی نظموں پر اظہارِ خیال میں میں نے تغزل سے کام لیا ہے۔ ورنہ ضرورت تھی کہ اس فن کار پر بہت کچھ لکھا جاتا۔ طرفہ بہت صاحبِ کمال شاعر ہے۔ اس کو خدا نے شاعری کی بڑی خوبیوں سے مرحمت فرمائی ہیں۔ اور مجھے پھر بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے باکمال شاعر کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کر کے اسے گوشہ خانہ سے باہر لانا چاہئے تھا۔ اور طرفہ کو بھی غفلت چھوڑ کر ملک کے ادبی کاروان سے ہم آہنگ ہونے کے لئے باہر آنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں رسائل کے مدیران سے یہ کہہ دینا ضروری تصور کرتا ہوں کہ اس شاعر کے کلام سے اہلِ ذوق کو متعارف کرانا ان کے رسائل کے حق میں بہت مفید ہوگا۔ آج ہمارا ادب کتنی پستی کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا ماتم سبھی کر رہے ہیں۔ اردو دشمنی اس کا سبب خاص ہے ایسے عالم میں اچھا شعر بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ اگر طرفہ جیسے اور دوسرے بہتر خوش گو شعراء کو جھنجھوڑا جائے تو تو پبلک بھی اچھے اشعار سے لطف اندوز ہو سکے اور رسائل کی وقعت اور مانگ میں اضافہ ہو۔

مجھے کہیں کہیں طرفہ کی باتوں سے اختلاف بھی ہے جن کو وہ روا رکھتے ہیں۔ مگر وہ ایسی ہیں کہ ان کے قیمتی اشعار کے مقابلہ میں گوارا کر لینے کے قابل ہیں میں اپنے تلامذہ کو خصوصیت سے یہ دعوت دیتا ہوں کہ طرفہ کے دیوان کو ضرور مطالعہ میں رکھیں۔ اس کا مطالعہ ان کی قابلیت میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

ذیل میں نامزد معاونین و ایجنٹ حضرات کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ دیگر معاصرین ان نام نہاد اردو دوستوں کے فریب سے محفوظ رہ سکیں

۱۔ تصدق حسین نظر ہیڈ ماسٹر اردو پرائمری اسکول دا
۲۔ محمد محی الدین عارف مدراسی۔ مدراس
۳۔ پیام واصف نیم چوک۔ مندسور
۴۔ جاوید انصاری خیراتی محلہ، برہان پور
۵۔ سید رشید ارشد شیرپوری۔ سکریٹری بزم ادب شیرپور
۶۔ عبدالمتین نیاز۔ سرچشمۂ ادب۔ ابراہیم پورہ بھوپال
۷۔ اقبال بک ہاؤس۔ ایس۔ کے۔ آر مارکیٹ۔ بنگلور ۲
۸۔ اخلاق سہسوانی۔ محلہ شہباز پور سہسوان
۹۔ نشاط کتب خانہ مبارک پور
۱۰۔ فضل احمد نیو پیپر ایجنٹ لشکر۔ گوالیار
۱۱۔ اشرف قادری مینا نگری۔ مالیگاؤں
۱۲۔ مہتہ بک اسٹال۔ گول بازار۔ جگدل پور
۱۳۔ قمر پرنٹنگ سرکل۔ قاضی پورہ ناسک
۱۴۔ حامد گلشن آبادی رتلام

اپنی محفل اپنے دوست

پیل بھیت

گرامی قدر! خلوص و نیاز

حسب معمول اس ماہ کا "شعلہ و شبنم" نظر سے گزرا۔ پسند آیا اور کافی پسند آیا۔ خدا نظر بد سے بچائے "شعلہ و شبنم" ایک سلجھے ہوئے ادب کے ساتھ ساتھ ذہنی تفریح کا خاصا مواد دیتا ہے۔ ہاں تکلف برطرف کافی عرصے سے ایک بات ذہن میں ہے جو آج تحریر کر رہا ہوں۔ کیونکہ ہماری شعلہ و شبنم سے کافی خوش شکر امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ یہ کہ آپ غزلوں کے انتخاب میں کچھ کم محتاط نظر آتے ہیں۔ میری نظر سے زیادہ تر ایسی بھی غزلیں گزری ہیں جو نہ صرف عامیانہ تخیل و فکر کی رہین ہوں بلکہ عروض کی قید سے بھی آزاد تھیں۔

یقین ہے آپ کی کوششیں "شعلہ و شبنم" کے سائبان کو شعلے کی طرح بیباک اور شبنم کی طرح لطیف بنانے میں کامیاب رہیں گی۔

طالب جواب نیاز آگیں۔ بیدار فاقی جعفری پیل بھیتی

آنولہ۔ یوپی

محترمی بسمل صاحب آداب و نیاز

مزاج گرامی

برادرم رشید جعفری کے ہمراہ استاد محترم حضرت مختار الہاشمی صاحب (جو سچا سخن قبلہ ابا حسنی صاحب گنوری کے ارشد تلامذہ میں ہیں) کے پاس ملی گڑھ گیا تو موصوف نے ماہ رچ کا شعلہ و شبنم عنایت فرمایا۔

پرچہ کی خوبیوں کے متعلق اتنا ہی کہوں گا کہ جس پرچہ کے نگراں قبلہ ابا حسنی گنوری اور ناظم حضرت شفا گوالیاری ہوں اس پرچہ کی مدح سرائی سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے بہرکیف ..... دعاگو ہوں کہ خدا خاندان دآغ کی اس شمع فروزاں کو تا بد قائم و دائم رکھے۔ والسلام

خلوص کیش عارف

ٹونک (راجستھان)

گرامی بسمل صاحب! سلام مسنون

عزیزی راشد صاحب کے بیان شعلہ و شبنم نظر آیا سرورق اتنا جاذب نظر تھا کہ بس ہی خوش ہو گیا چنانچہ بصد اشتیاق ورق گردانی پر مجبور ہو گیا۔ چشم بد دور شعلہ و شبنم واقعی شعلہ و شبنم کا سنگم ہے۔ اس بے حسی کے دور میں آپ کی کوششیں قابل داد ہیں

میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں کارِ لائق سے یاد فرمائے رہا کیجئے

کمترین ـــــ محمد اسلم

بمبئی۔

گرامی ایڈیٹر صاحب! تسلیم و نیاز

ایک مدت سے شعلہ و شبنم دیکھ رہا ہوں۔ اس پارٹی بازی کے زمانے میں خالص ادبی رسالہ کا زندہ رکھنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مگر آپ کی اُردو سے والہانہ وارفتگی بلکہ جنون اسے منزل کامرانی کی طرف لے جا رہا ہے۔ آج نام بنا و بڑے بڑے مدیروں نے مشہور ادیبوں کی نگارشات کی اشاعت تک خود کو محدود کر لیا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ اس کے خلاف نو آموز ادیب اور شعرا کو تشویق دے رہے ہیں اور لطف تو یہ ہے کہ انتخاب کو کوئی حاسد کوتاہ بیں بھی خورد بینی چھپ کھنے کی جرأت کرے تو کر سکے۔ ایک صاحب نظر ہرگز نہیں کہہ سکتا۔

بہرحال آپ کی روش قابل داد ہے۔ ذرا کتابت کی صحت پر توجہ کی ضرورت ہے۔ والسلام

آپ کا ـــ محمد امین

چائیبا سہ

محترمی۔ نسلے

شعلہ و شبنم میں جاسوسی ناول اور خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر کے آپ نے خریداروں کی اہم ضرورت پوری کی ہے۔ شعلہ و شبنم ہر لحاظ سے صف اول کا ماہنامہ بن گیا ہے۔ میری جانب سے جناب مظفر حنفی صاحب کو اس کامیاب ناول پر مبارک باد پہنچا دیجئے۔ امید ہے مظفر بھائی باقاعدگی سے شعلہ و شبنم میں یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ کوئی خدمت؟

آپ کا اپنا ـــ نریش کمار

باراں۔

گرامی بسمل صاحب! آداب و نیاز

آپ کا خط ملا۔ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے۔ شعلہ و شبنم کے خریدار بنانا اور توسیع اشاعت کرنا ہر شیدائی دوست کا فرض ہے۔ انشاء اللہ شعلہ و شبنم کو اور بھی خریدار دوں گا۔ کاش ہم لوگ دیگر ضروریات زندگی میں رسائل کی خریداری بھی شامل کر سکیں تو اردو کبھی ختم ہو۔ میری نظر

شہ براہ کرم ایسی غزلوں کی نشاندہی کیجئے۔ (ایڈیٹر)

تماشائی

قسط نمبر

آپ سے ملئے

آپ ایک ایسے شہر کی پیداوار ہیں آپ کا اہم گرامی گھریلو طور پر خواہ کچھ ہو مگر آپ کے شہر کے لوگ آپ کے کمالات سے واقف ہو کر آپ کو خناس کہتے ہیں۔ خناس یعنی شیطان کے مترادف خبیث سفید۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ دنیائے عدم سے عالم وجود میں تشریف لانے کو تھے تو مادر مشفقہ کے طبق میں ۲ ماہ پیشتر لاتیں مارنی شروع کر دی تھیں اور دھنیک خاتون درد کی شدت سے تڑپ تڑپ جاتی تھیں اور جب آپ کا جسد مشرز مین پر آیا تو رونے کی جگہ حاضرین حدود کا منہ چڑایا۔ پھر اس زور سے چیخ ماری کہ وہ بدحواس ڈر کر ادھر اُدھر بھاگنے لگیں کہ یہ کیا بلائے ناگہانی ہے۔

جب آپ کے روحانی پدر حضرت معلم الملکوت عزازیل کو جن کو عرف عام میں لوگ شیطان کہتے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر ملی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور فوراً تمام دنیا میں اپنی ذریات کو خبر بھیجی کہ سنیچر کے دن میر جعفر کے مزار پر جو ہمارا سعادت مند شاگرد تھا حاضر ہوں تاکہ ایک اہم خوشخبری سنائی جائے۔ چنانچہ تعیین کلم میں مقام مقررہ پر ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں حضرت ابلیس کے پرستار حاضر ہو گئے اور منتظر رہے کہ بارگاہ شیطنت سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

حضرت ابلیس بھیس بدلے ہوئے پنڈال میں ڈائس پر آکر کھڑے ہو گئے اور مسکرا کر فرمایا شاباش اے میرے مشن کو کامیابی سے چلانے والے میرے مخلص دوستو! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ نہایت ایمانداری، نہایت محنت اور انتہائی خلوص سے تم نے ان ہمارے ازلی دشمن انسان کو گمراہ اور پریشان کر کے میرے نام کے جھنڈے بلند کئے اور دنیا کو بتا دیا کہ اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت شیطانی طاقت ہے۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ ان انسانوں کو خدا کی بہبودی حاصل ہے اور یہ میں بھی مانتا ہوں کہ خدائی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے ——— مگر جب ذرا بھی طاقتور ہو تو اہل ہمت اس کے سامنے سپر ڈالنا اپنی توہین سمجھتے ہیں تم نے کسی کی پروا نہ کرتے ہوئے مقابلہ جاری رکھا اور تمہاری ہمت دیکھ کر کروڑوں انسان خدا سے منحرف ہو کر تمہاری اطاعت پر آمادہ ہو گئے۔ تمہیں اس نیک کام اور اخلاقی فتح کے حصول میں ہزاروں دکھ اٹھانے پڑے۔ میرے دل پر تمہاری اس شرافت، محنت اور لگن کا بڑا اثر ہے

مگر اب تم کو مژدہ ہو کہ ہماری محنت اور پریشانی کے دن ختم ہو گئے۔ ہمیں ہمارے بلند مقدر نے ایک ایسا فرزند سعادت مند مرحمت فرمایا ہے جو ہم سب کو بستروں پر آرام سے لیٹے رہنے کی اجازت دے گا اور تن تنہا سب کی ڈیوٹی خود انجام دے گا۔ یہ وہ بلند اقبال فرزند ہے کہ انسانوں کی بستی یا ان کے گروہ میں جدھر ہو کر نکل جایا کرے گا۔ فتنے خود بخود زمین سے اُبلیں گے اور آسمان سے برسیں گے۔ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہو گا کہ جہاں چلے تلوار چلوا دے۔ میں نے اس کے پیدا ہونے پر اس کو اپنا خطاب دہن چٹایا ہے۔ اس کا یہ اثر ہو گا کہ جس وقت یہ شر پھیلانے کے لئے اپنی زبان کھولے گا تو جھوٹ خود بخود سچ ثابت ہوتا چلا جائے گا۔ بڑے بڑے منطقی اور بیرسٹر اس کی کسی بات کی تردید نہ کر سکیں گے یہ جس پر الزام لگائے گا تو اس کی دلیلیں، مثالیں اور زور بیان سن کر اور دیکھ کر وہ خود گواہی دینے پر مجبور ہو گا اور اعلان کرے گا کہ ہاں واقعی یہ الزام مجھ پر صحیح ہے اور سچ میں نے یہ گناہ کیا ہے جو حضرت خناس مجھ سے منسوب کر رہے ہیں اور اگر زبان سے نہ بھی اقرار کرے تو حیرت اور شبہ میں ضرور پڑ جائے گا کہ کیا واقعی مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے؟ یہ جس سے بھی کھل کر باتیں کرے گا وہ اس کا مرید ہو جائے گا اور اس کے پیچھے پیچھے پھرے گا اور اس کو نہایت سچا، نہایت پرخلوص بہت ہمدرد اور دوست سمجھنے پر مجبور ہو گا۔ مگر دوسری تیسری ملاقات میں اس کے مکر کا پول بھی کھل جایا کرے گا۔ بس اتنی ہی کسر رہ گئی ہے۔ بڑے سے بڑے عقلمند، بڑے سے بڑے عالم دانا اور بڑے سے بڑے معزز لوگوں پر کھڑے کھڑے اپنا سکہ جما لیا کرے گا اس کے دوست اس سے پناہ مانگیں گے۔ اس کے نام سے تھرائیں گے۔ مگر اس کے جال سے نہ نکل سکیں گے دوستوں کو لوٹنا، دھوکا دینا۔ انہیں وقتاً فوقتاً رسوائی اور بربادی کے دروازے پر پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہو گا۔ یہ جس کا دوست بنے گا اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور جب اُسے خبر ہو گی کہ میرے سینے کا تمام مال مسالہ نکل گیا تو یہ اس کی مجبوری پر ہنسے گا قہقہے لگائے گا اور وہ بالکل اس کے شکنجے میں ہو گا۔ اس کے رحم و کرم پر ہو گا۔ دوستوں کا مال لوٹنے میں اسے یدطولیٰ حاصل ہو گا یہ جس کا بھی دوست بن جائے گا پھر اس کو کسی دشمن کی ضرورت نہ رہے گی۔

تم جانتے ہو کہ انسان اگر جسمانی طاقت کے مالک ہوں تو وہ اپنا دین اور دنیا دونوں سنوار سکتے ہیں یہ خوبصورت قد ہے ہی۔ شیریں کلام بھی ہوگا۔ اور ان سے کام لے کر دور دور تک جوان اور طاقتور لوگوں کو کنڈکٹ کرکے قبر کے کنارے پہنچا دے گا۔ یہ پیشہ ایسا اختیار کرے گا کہ ملک بھر کے شہروں میں گشت لگا سکے اور اس طرح اس کا عمل تباہی و بربادی، دھوکا، فریب، مکاری و عیاری۔ اقتدار پردازی و فتنہ انگیزی جھوٹ، دغا، الزام، بداعمالی وغیرہ وغیرہ پورے ملک کو متاثر کرے گا۔ اس کی آواز میں کشش ہوگی۔ بڑی بے لاگ تقریر جھاڑے گا۔ اور طبقۂ شعراء میں تو اس کا طوطی بولے گا حالاں کہ شاعری و علمیت سے اسے اور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔

یہ انسانوں کو دوست بن کر اس ڈھب سے دغا دے گا کہ بڑے بڑے ہوشمند اس کا منہ تکتے رہ جائیں گے۔ جذبۂ انتقام اس شدت اور کثرت سے اس کی رگوں میں حلول کئے ہوئے ہے کہ اگر اس کا مادی باپ بھی اس سے یہ کہدے گا کہ تمہارا منہ میلا ہو رہا ہے اسے دھو لو تو یہ جب تک سوتے جاگتے باپ کے منہ پر تو کے کی سیاہی نہ مل دے گا۔ اسے کھانا، پینا حرام ہو جائے گا۔ اگر کوئی دوست اس سے ہنسی ہنسی میں بازار جاتے ہوئے کوئی ایسی بات کہدے گا، جو معمولی ہو۔ مثلاً میاں خاں آج چائے پلاؤ، تو یہ چائے تو نہیں پلائے گا۔ مگر دوسرے تیسرے دن دھوکا دے کر ۱۰۔ ۲۰ معزز آدمیوں کے پاس اس دوست کی طرف سے ایک آدمی بھیجے گا کہ آج رات کا کھانا جبرً غریب خانہ پر کھائیں۔ میرے یہاں نیا بنے اور اس طرح آدمی اس کے گھر پر چڑھا کر بھیج دے گا اور خوب ذلیل کرائے گا۔

غرض اپنے زمانے کا یہ میرا فرزند اور ہمہ وضع اسعید و بلند شخصیت ہوگا، جس سے دنیا پناہ مانگے گی اور کہیں دور دور اس کا جواب نظر نہ آئے گا۔ حتیٰ کہ میں اور میری شرارتیں اس کے سامنے ہیچ ہو جائیں گی۔ جیسی اہم مسئلہ میں میرا دماغ کام نہ کرے گا، تو مجھے اپنے اسی لائق بیٹے سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ اور یہ سیکنڈوں میں اس پیچیدگی کو سلجھا دیا کرے گا۔ بتاؤ پھر میں اور میری پوری جماعت کیوں اس کی ذات ستودہ صفات پر فخر نہ کرے۔ اور ہم سب کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم میں اس جیسا سردار پیدا ہو گیا۔

پس دوستو چلو باری باری سے اس پر ہاتھ پھیرو اور سب تھوڑا تھوڑا لعاب دہن اسے چٹاؤ۔ تاکہ سب کی شیطنیت کے اثرات اس کی فطرت میں اور شامل ہو جائیں اور میری اس ہدایت کو گرہ باندھ لو کہ یہ جس علاقے میں جائے۔ اس علاقہ کے سب شیاطین زادے اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے سر پر سب کا سایہ رہے۔ اور ہر ہر قدم پر اس کی حفاظت کی جائے اور ہر قسم کی مدد اسے ہمیشہ پہنچائی جاتی رہے۔ اور پھر باری باری ہر شیطان زادے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سینے سے سینہ ملایا تاکہ ان کے تمام رموز شیطنت اس کے سینہ میں منتقل ہو جائیں۔ اور لعاب دہن چٹایا۔ اور ہر طرح زندگی بھر اس کی سرپرستی کا وعدہ کرکے ہر شیطان گروہ کا لیڈر اس خوشی میں گیت گاتا ہوا رخصت ہو گیا

(باقی آئندہ)

سحاب سخن حضرت مولانا ابر احسنی گنوری کے
مجموعۂ کلام
نگینے قیمت ۳/۵۰
سفینے قیمت ۲/۵۰
آج ہی طلب فرمائیے
شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی نمبر ۶

بحکم گورنمنٹ آف انڈیا

آفس آف دی رجسٹرار نیوز پیپرز آف انڈیا
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ نئی دہلی

سالانہ بیان مطابق رول ۸ آف دی رجسٹریشن آف دی نیوز پیپرز سنٹرل رول ۱۹۵۶ء بابت مکیت و اشاعت اور دیگر تفصیلات ماہوار میگزین شعلہ و شبنم دہلی (جو ۱۹۴۹ء سے پابندی کے ساتھ مسلسل برابر شائع ہو رہا ہے)

۱	مقام اشاعت	دریبہ کلاں دہلی ۶
۲	وقفہ اور فاصلہ اشاعت	ایک ماہ میں ایک بار
۳	پرنٹر اور پبلشر	بل پرشاد جین
	قومیت	ہندوستانی
۴	ایڈیٹر	بل پرشاد جین
۴	قومیت	ہندوستانی
۵	پتہ	دریبہ کلاں
۶	مالک	بل پرشاد جین
۶	قومیت	ہندوستانی
۶	پتہ	دریبہ کلاں

۷ پوسٹل ڈپارٹمنٹ کا نمبر رجسٹرڈ 254
۸ منظور شدہ ڈکلریشن از دفتر ڈپٹی کمشنر دہلی
۹ نام پریس ویال پرنٹنگ پریس دہلی
۱۰ پریس رجسٹرار آف نیوز پیپر گورنمنٹ آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر
۱۱ میں بل پرشاد جین اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا بیان اور اعلام اور دیگر تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔

دستخط بل پرشاد جین دریبہ کلاں دہلی
یکم مارچ ۱۹۶۳ء

آج ادبی نشست ہے

صمد حمیدی

شامِ غزل

مینم سخن بھاگلپور (قدیم) کے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے رہائشی کمرے واقع قاضی دلی چک میں آج ایک نجی مشاعرہ منعقد ہے آیئے آپ بھی اس میں شریک ہوجیئے اس وقت رات کے ساڑھے سات بجے ہیں سب سے پہلے میں آپ کو بھاگل پور شہر سے متعارف کرادوں۔

بھاگل پور۔ ایک صنعتی اور مشینی شہر ہے۔ یہاں کے سلک اور شہر کے کپڑے دُور دُور تک مشہور ہیں یہاں کا سنٹرل جیل۔ سلور اینڈ گولڈ کا کام مشہور بزرگ مولانا شہباز رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ یہ سب بہت مشہور ہیں ان کی کرامات سے ٹوٹے دل جڑتے۔ لوگ پریشان حال آتے اور خوش خوش لوٹتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیبؒ کو جب بھی کوئی دینی سخت مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے۔ تو ایسی بھاگلپور میں آج اختلافات کی حدیں اس درجہ نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھیں کہ ایک بزم والے دوسری بزم کے لوگوں کو اپنے یہاں بلانا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ لیکن خدا بھلا کرے بھائی شاغل قادری کا کہ جن کی کوششوں سے آج اختلافات کی حدیں ٹوٹ رہی ہیں اور ٹوٹے دل جڑ رہے ہیں۔ اچھے لوگوں کی یہاں کمی نہیں کام کرنے والوں کے لئے یہاں بڑا اچھا میدان ہے چاہیں تو ناسید و فرید تک جا پہنچیں۔ نچا ہیں تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا بنا کے اپنی ڈفلی بجاتے رہیں۔

کبھی یہاں پر مسٹر ابوالحسن صاحب نے نکہت باد بہاری کو آواز دی تھی کہ کبھی یہ مقبول احمد صاحب سابق وائس چانسلر بھاگلپور یونیورسٹی نے ادبی اداروں کی سرپرستی کو اپنا فرض گردانا تھا۔ آج بھی یہاں مولانا فخر عالم صاحب قاسمی بھاگلپوری۔ ڈاکٹر احمد حسین۔ ڈاکٹر محمد یونس۔ شاغل قادری۔ شوق بھاگلپوری۔ کریم الصمدی۔ ناصر رضا صاحب ابو محمد ذکریا صاحب۔ خیالات آفرینی میں بھاگلپوری۔ نسیم کوہ صمد۔ سرور الصمدی۔ گرچہ بھاگلپور کی فضا

بھی ادریس غنی۔ الیسع فاروقی صاحب۔ حسن مقصود۔ حاشر حسین حامد غازی پوری۔ رازِ بارہ بنکوی وغیرہ کی ادب دوستی اور روشن خیالی کی داد نہیں دی جاسکتی۔

صدارت کے لئے بھائی شاغل قادری نے مولانا جمال الرحمٰن صاحب کا نام تجویز کیا ہے۔ جس کی تائید بھی ادریس غنی نے کی ہے۔ مولانا مسند صدارت پر متمکن ہیں سب سے پہلے شمع نسیم آروی کے سامنے لائی گئی ہے۔ انھوں نے سالِ نو کی مناسبت سے ایک نظم پڑھی ہے آپ بھی ایک مصرع سن لیجئے۔

سالِ نو نے کے صدا امید آیا۔

اور یہ غزل کے شعر ہیں

فتنہ اٹھا چکا ہے یہ چرخ کہن کئی
جس نے جلادیئے ہیں چمن کے چمن کئی
پھر وقتِ امتحانِ محبت ہے ہم دمو
ہیں اپنے انتظار میں دار و رسن کئی
اہلِ جنوں بھی کرنے لگے ہیں خرد کی بات
دامن کو سی رہے ہیں گئی، پیرہن کئی
اس نے اگرچہ ترک تعلق کیا نسیم
پھر بھی دعا کے کرتے رہے ہم جتن کئی

نسیم کے بعد شاغل قادری نے اپنی نظم "اے مردِ مجاہد" سنائی۔ نظم بڑی خوبصورت تھی سبھوں نے بڑھا چڑھ کر داد دی آخری بند سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

ہے زلفِ پریشاں محوِ فغاں اٹھ دیکھ ذرا ایوانِ وطن
یہ عفت و عصمت کی دیوی یہ جان وفا سامانِ وطن
آواز ہے دیتا فرض تجھے میداں میں آ شیدائے وطن
اے مردِ مجاہد جوش میں آ۔ ایماں کے جوہر آج دکھا

اور اب مولانا ترسانی پانی پتی سے ان کی غزل سنئے مولانا فن کے ماہر اور ان کے اشعار قافیہ کے رنگ تغزل کا اچھا نمونہ ہیں۔

دل کی جھلک جو دیکھیں گھبرا کے رنگ فق ہو
حالت زبوں ہے جیسی ان کو بھی خود قلق ہو
کچھ اس کے دل سے پوچھو کیا شے ہے نامرادی
خط کا جواب جس کے سادہ سا اک ورق ہو
کی دید کی ہوس نے مٹی خراب اپنی
وہ منظروں سے نکلے جو جان اک رمق ہو
جاری رہے گی تا حشر بحث اُلفت
ہاں سلسلے سے یوں ہی اس کا اگر سبق ہو

اب آپ واجد علی قمر کو سنئے۔ مشاعرہ دیر سے بہت بھاگ رہے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کس جذبے کے تحت اس بارِ محفل مشعر میں شرکت کی۔ سالم میں ایک ہی مصرع فوٹ کرسکا۔ اس لئے آپ اُسے ہی سنئے۔

جستجو میں اور بھی جوشِ جنوں بڑھ سا گیا

یہ رہے کریم الصمدی۔ مال دار کریم الصمدی، بہت اچھا شعری ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پابندِ وفا ہو کے بھی برباد جیسا ہوں

پھر بھی نہیں معلوم نظر میں کیا ہیں
اٹھتے کر تو اٹھ جاؤں تری بزم سے لیکن
جاؤں تو کہاں جاؤں یہی سوچ رہا ہوں

اب آپ جمروح عظیم آبادی سے ان کا کلام سنئے لیکن افسوس ہے میں کوئی مکمل مصرع مکمل نہ کر سکا۔ لہٰذا آپ کو سناؤں تو کیا سناؤں۔

لیجئے خود بندۂ جمال احمد جمال کر سنئے جو پہلے فراق سلطانپوری کے نام سے لکھتے تھے۔ غزل کے اشعار ہیں۔

جیتا ہے دل میں جو غم جاناں لئے ہوئے
وہ ہے صلاح گرد شِ دوراں لئے ہوئے
تاکید یہ صبا کی ہے ہونٹوں کو سی رکھیں
اور گل ہیں مشرقی جشنِ بہاراں لئے ہوئے
وہ کہہ رہے ہیں ہم ہیں لگے جان سے قریب
ہم ان کی کھوج میں ہیں لگے جان لئے ہوئے
وہ اک خلش لطیف سی یعنی کہ آرزو
ہے اپنے ساتھ رونقِ امکان لئے ہوئے
اس حرفِ ناتمام محبت کو کیا کہوں
جو ہے جمال کا ہشِ پنہاں لئے ہوئے

یہ ہیں شاہین غازی پوری۔ نوجوان اُبھرتا ہوا ذہین فن کار۔ چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑے بڑے خیالات کو پیش کرنا ان کا ہی حصہ ہے۔ عمر کے لحاظ سے کافی شہرت پا چکے ہیں اور ادبی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔ آج وہ نظم نہیں غزل سنا رہے ہیں۔ دو تین شعر آپ بھی سنئے اور داد دیجئے۔

تھی کچھ نہ خطا پھر بھی پشیمان رہے ہیں
کیا کیا ستمِ حالات کے عنوان رہے ہیں
خود جن کو یہ عرفان تھا قاتل ہیں جنوں کا
وہ بھی مری ہستی کے نگہبان رہے ہیں
ہم لوگ جو معتوب ہیں ساقی کی نظر میں
پوچھ لیجئے تو مے خانے کا عنوان رہے ہیں

اب حافظ کاظمی حکیم عبدالباقی حکیم پوری سے ان کا کلام سنئے۔ ضیافت طبع کے لئے ایک شعر پیش خدمت ہے۔

کٹ گئی ظلمت شب ہجر ستم کوشی رہا
تا رکِ کش میں رہا اور وہ گریباں کوشی رہا

یہ رہے راز بادہ نوشی۔

دجلیاں پاک کے بھی دامن جو لرزاں نہ ہوا
ہائے اس ہاتھ میں یوسف کا گریباں نہ ہوا

ترنم اچھا تھا اس لئے کافی داد ملی

اب آپ کلیم الدین شمس کو سنئے، ان کی کٹیا آج کل ہم فقیروں کے لئے جائے پناہ کا مقام رکھتی ہے۔ روز شام کو محفل جمتی اور چائے پان و سگریٹ سے تواضع کر کے وہ سبھوں کو بے دام غلام بنا لیتے ہیں۔ شعری جپکہ زیادہ دنوں کا نہیں۔ پھر بھی ان کی ترقی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے آپ بھی سنئے اور حظ اٹھائیے۔

نہ سمجھ سکے گی دنیا یہ رموز زندگانی
تری ہر نظر ہے عنواں مری ہر نظر کہانی
ترے حسن کی بہاریں مرے عشق کی جوانی
تری یاد کی تجلی شب تاب زندگانی
ترے گیسوؤں کے سائے مری شام کا فسانہ
ترے عارضوں کا پرتو مری صبح کی کہانی
مرے حوصلوں کے عنواں یہ بہار لالہ و گل
مرے عزم کی تجلی یہ سحر کی ضو فشانی

فن باغبانی سے کہدو کہ فیض اشک خونی ہے
جو بہار کر رہی ہے یہ چمن میں گل فشانی

اب آپ مہجور آروی نیم سرور آروی اور سرور السعدی سے ان کا کلام سنئے۔ بہت کم کہتے ہیں۔ دوسروں کے اشعار کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ملاحظہ ہو غزل کے اشعار ہیں۔

ملاتے ہیں آنکھیں وہ ہر دیدہ ور سے
مگر بچ کے دامانِ حدِ نظر سے
اٹھاتا رہے ہر کوئی اپنے در سے
کہیں کھیل جائے نہ دیوانہ سر سے
کہیں کی تبسم سے گلشن بنایا
کہیں کی تکلم سے گلشن بنایا
کہیں میکدے کے لئے کیف نظر سے
صباحت پہ اس گل کی دھبہ نہ آئے
صبا کہہ رہی ہے خود محسر سے

اس کے بعد شاعرہ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے درمیان میں ناشتہ چائے سے تواضع ہوتی رہتی ہے ڈاکٹر محمود نصر صدر انجمن ترقی اردو تشریف لاتے ہیں۔ مشاعرہ جاری رہتا ہے۔ لیجئے اسی وقت اس کا پکچر بھی اب مشاعرہ کا اختتام عمل میں آتا ہے۔ شاعر قادری، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی مہمان نوازی اور صدارت کے لئے شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ وہ بھی شکریہ کیلئے شکریہ سمیٹ رہے ہیں۔

مصرع طرح انعامی مشاعرہ نمبر ۵۳
آہ کہ ہوں کوسی منزل ہے دل لگی نہیں
لگی ہنسی قوافی ـــــ نہیں ردیف
غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر قلیس سنبھلی

"وطن خطرے میں ہے"

وطن خطرے میں ہے اے دوستو ہشیار ہو جاؤ
ہمارے امتحاں کا وقت ہے تیار ہو جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو ہم میں کوئی دشمن چلا آئے
جو آجائے تو پھر ایسا نہ زندہ چلا جائے
غرض یہ ہے نکلنے کا کوئی رستہ نہ مل جائے
مخالف کے لئے اب قاہر و جبار ہو جاؤ
ابھی واقف نہیں ظالم ہمارے جاں نثاروں سے
کہیں بہتر ہیں یہ دو چار سو سے کیا ہزاروں سے
پہاڑوں کو الٹ دیتے ہیں جو اک آن اشاروں سے
اگر کچھ عقل ہے تو چینیو! چوکس چلے جاؤ

ارشادات

دل دے کر اُن کو اس لئے پچھتا رہا ہوں میں
ہوں بے قصور پھر بھی سزا پا رہا ہوں میں

عشق و وفا کا راز انھیں سمجھا رہا ہوں میں
یوں رفتہ رفتہ راہ پر اب لا رہا ہوں میں

شوقِ حیات و زیست کو ٹھکرا رہا ہوں میں
آیا تھا میں جہاں سے وہیں جا رہا ہوں میں

راہِ طلب میں منزلِ مقصد کی آرزو
لے جا رہا ہے شوق چلا جا رہا ہوں میں

وہ بے رُخی گئی وہ تغافل تو مٹ گیا
ظلم و ستم پر آپ کے اترا رہا ہوں میں

ساقی پلا دے اور کہ بے ہوش ہی رہوں
ہوشیار باش ہوش میں اب آ رہا ہوں میں

مانا کہ خوفِ پرسشِ اعمال ہے مگر
دل کو امیدِ عفو سے بہلا رہا ہوں میں

بڑھتی نہیں حیات یہ گھٹتی ہے دم بدم
ہستی سے نیستی کی طرف جا رہا ہوں میں

صحرا کا قصد کوچۂ جاناں کو چھوڑ کر
رہنا مجھے کہاں تھا کہاں جا رہا ہوں میں

دے اور کوئی داد محشر جگہ مجھے
اتنے بڑے ہجوم میں گھبرا رہا ہوں میں

اس کا یقیں مجھے نہیں آتا کسی طرح
تم کہہ رہے ہو اپنے ہی گھر جا رہا ہوں میں

کیوں اُن کو دیکھ کر دلِ مضطر نے آہ کی
افشائے رازِ عشق سے پچھتا رہا ہوں میں

مٹ جائے کیا عجب مری جانب سے بدظنی
اُلجھے ہوئے مزاج کو سلجھا رہا ہوں میں

اے نوحؔ شاعری کو ضرورت اسی کی تھی
بزمِ سخن میں دادِ سخن پا رہا ہوں میں

رازؔ حسنی سہسوانی

رُباعیات

نغمے ہیں خوشی کے، تو کہیں غم کے ہیں
ہے سازِ طرب کہیں، کہیں شور و شین
ہے چین کسی کو، تو کسی کو تکلیف
گویا دُنیا ہے اجتماعِ ضدّین

بے شبہ ہر اک پیر و جواں ہے فانی
لاریب کہ ہر نام و نشاں ہے فانی
پر مختصر احوالِ فنا ہے اے رازؔ
باقی ہے وہی اور جہاں ہے فانی

ہر ہم کیا کاروبار سارا تُو نے
عریاں کیا سب راز ہمارا تُو نے
تھی غایتِ دستِ بُرد تیری یہ اجل
پیرا ہنِ ہستی کو اُتارا تُو نے

صد چھوڑ کے انصاف کا دستور کرد
بہتر ہو جو اس بحث کو یوں دُور کرد
تم حسن کو معشوق کہو عشق کو ہم
دُنیا جو کرے طے اسے منظور کرد

وہ لطف کی ہر بات کہاں سے لاؤں
وہ عشق کے اوقات کہاں سے لاؤں
دل راحتِ ماضی کا تمنّائی ہے
گزرے ہوئے دن رات کہاں سے لاؤں

نازکؔ احسنی سیوک شکوہ آبادی

قطعاتِ نازک

اے چینیو! ہیں تم مصری نشان سمجھو
راجہ جنک کی ہم کو بھاری کمان سمجھو
آساں نہیں مٹانا، آساں نہیں جھکانا
بچہ ہر اک یہاں کا فوجی جوان سمجھو

افیون کی قسم ہے سر پر وبال لیں گے
آنکھیں دکھائیں ہم سے آنکھیں نکال لیں گے
اُترے گی چینیو! یہ اُس وقت تک نہ سوگند
جب تک نہ ہم تمھاری پگڑی اُچھال لیں گے

کیا سوچ کر یہ تم نے اپنا قدم بڑھایا
وہ دودھ ہم کو بھارت ماتا نے ہے پلایا
اے چینیو! صفیں تم کتنی ہی لے کر آؤ
ہندی ہیں ہم بھی آخر کر دیں گے ہم صفایا

تم ناز کر رہے ہو لاکھوں ہے فوج چینی
کرتے ہو ہندیوں پر بڑھ بڑھ کے تم تبینی
ہم کو وطن کی اُلفت سرشار کر چکی ہے
افیون یہ تمھاری کھانی نہ ہم کو پینی

بیٹھے بٹھائے تم نے جو چھیڑ دی لڑائی
دیکھو تو ایک دُنیا کرنے لگی برائی
اے چینیو! جبر سے طاقت ہے کیا ہماری
اخلاق کی لڑائی کر دے گی سب صفائی

ریاض آفاقی بمبئی

کوئی کب تک کہے حسن مغرور ہے
ان کی ہر ہے پہ پردے جھکتے رہے
بات کیسے بنے عشق خوددار ہے

ہم سے سادہ نظر سادگی میں لٹے
رزم گاہِ ادب اس قدر دب گئی
اک گھٹا سا اندھیرا بدستور ہے

ابر اٹھے تھے برسات ہوتی مگر
ہو چکا بند بازارِ فکر و نظر
جامِ شبنم میں شعلے ڈھلیں تو ڈھلیں

مے بھی ہے ابر بھی مطربہ بھی مگر
کب تک آخر ریاض ان کو چھیڑا کریں

خود پرکھ لیجئے حسن مغرور ہے
کون اپنی سنے حسن مغرور ہے
کیوں نہ ہوں حادثے حسن مغرور ہے

لوگ کہتے رہے حسن مغرور ہے
کون غازی بنے حسن مغرور ہے
روشنی کیجئے حسن مغرور ہے

وہ بھی لو دے اٹھے حسن مغرور ہے
صبر ہی کیجئے حسن مغرور ہے
کس طرح رد کیے حسن مغرور ہے

کون کھل کر پیے حسن مغرور ہے
ختم بھی کیجئے حسن مغرور ہے

افکارِ نو

ارشد صدیقی

ایک مدت سے کوئی دل میں تمنا بھی نہیں
عشق مایوس ہوا ہو مگر ایسا بھی نہیں
ان کی الفت میں اٹھائے ہیں ہزاروں الزام
آج تک آنکھ اٹھا کر جنہیں دیکھا بھی نہیں
راہِ ہستی میں نگاہیں تو بھٹک سکتی ہیں
دل بھٹک جائیں مگر اتنا اندھیرا بھی نہیں
بڑھ کے آئے تھے کئی غم پئے تسکیں لیکن
غمِ جاناں کے مقابل کوئی ٹھہرا بھی نہیں
شرم اے بادہ گسارو کہ بھری محفل میں
بڑھ کے خود جام اٹھالے کوئی اتنا بھی نہیں
کیا تماشا ہے کہ آئے ہیں تسلی دینے
وہ جنہیں دردشناسی کا سلیقہ بھی نہیں
ہر نظر سطحِ تبسم پہ ٹھہر جاتی ہے
کیا زمانے میں کوئی غم کا شناسا بھی نہیں
حادثے ہو چکے ارقامِ غمِ ہستی کے تمام
اب تو شاید دلِ مایوس تڑپتا بھی نہیں

فرحت القادری

اُف یہ انداز مسکرانے کا
دل دھڑکنے لگا زمانے کا
آسماں نے تمہیں سے سیکھا ہے
فن جو ہے بجلیاں گرانے کا
اور مشکوک ہو گئی دنیا
یہ صلہ ہے نظر چرانے کا
میں تمہاری ہی اک کہانی ہوں
تم ہو عنواں مرے فسانے کا
دوست ملنا تو دور کی ہے بات
کوئی دشمن نہیں ٹھکانے کا
میں کو کہتے ہیں زندگی کا غم
نام ہے تیرے روٹھ جانے کا
دل نے پایا ہے عشق سے فرحت
حوصلہ ان کے ناز اٹھانے کا

غزلیات

میں بریلوی

شامِ الم جو ہم غمِ ہجراں سے کھیلتے
دستِ جنوں بھی جیب و گریباں سے کھیلتے

غم سے کھیلتے مہِ تاباں سے کھیلتے
دیوانے اس طرح شبِ ہجراں سے کھیلتے

پ تک نہیں گئی ہیں مقدر کی سختیاں
مدت ہوئی ہے گردشِ دوراں سے کھیلتے

ہرائیوں کا عشق کی چلتا ہیں پتہ
نشتر چبھو کے تم جو رگِ جاں سے کھیلتے

وزِ فراقِ دوست کا عالم نہ پوچھئے
گزری ہے عمر سوزشِ پنہاں سے کھیلتے

ل میں لگی تھی آگ محبت کی ہم نوا
پروانے کیوں نہ شمعِ فروزاں سے کھیلتے

نے لے دل کو ہجر میں جھوٹی تسلیاں
گزری ہے رات حسرتِ داماں سے کھیلتے

ں بارآبلوں سے بنا کر نیا چمن
صحرا میں جا کے خارِ بیاباں سے کھیلتے

بڑھتیں جنونِ عشق کی جولانیاں اگر
تحسین ہم بھی جیب و گریباں سے کھیلتے

دت رائے پوری

ئی سوزِ نہاں ان پر عیاں ہونے تو دو
دل مچل جائے گا خود انکا فغاں ہونے تو دو

رتِ واعظ کا پھر کیا رنگ ہوگا دیکھنا
بادہ خوار و ابر آلود آسماں ہونے تو دو

شن آرائی سے واقف خود بخود ہو جائے گا
ایک دن صیاد کو بھی باغباں ہونے تو دو

ہم کو خود وہ فرمائیں گے آکر سامنے
دل میں شوقِ دید کا دریا رواں ہونے تو دو

یناہے کس طرح پھر چین سے سوتے ہو تم
اپنے دل کو میرے دل کا رازداں ہونے تو دو

رقِ تعمیرِ نشیمن دیکھ لینا پھر مرا
ہر قدم پر برق کو آتش فشاں ہونے تو دو

ار تو گل کانٹے بھی اڑ کر آئینگے گلزار سے
بلبلِ مجبوس کو محوِ فغاں ہونے تو دو

طور کے انداز جو دت خود عیاں ہو جائینگے
سامنا ان کا ہمارا ناگہاں ہونے تو دو

محمد حسین شاغل ناگپوری

وسعتِ دل

ان کے جلوے سمٹ کے آئے ہیں
داغ سینے کے جگمگائے ہیں

نیم وا سے لبوں کا عکس پڑا
یک بیک گل جو مسکرائے ہیں

زندگانی کی شاہ راہوں میں
ہم نے دھوکے حسین کھائے ہیں

ان کو آسودہ کون سمجھے گا
روتے روتے جو مسکرائے ہیں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے تجھے اے دوست
فرش تک عرش سے ہم آئے ہیں

لالہ و گل ہوں یا مہ و انجم
حسن کا نور اڑا کے لائے ہیں

زندگی میں وہ مسکرائیں کیا
جن کی خوشیوں پہ غم کے سائے ہیں

صبر کی ہے یہ کون سی منزل
ضبط کے پاؤں لڑکھڑائے ہیں

وسعتِ دل پہ غور کر شاغل
اس میں دونوں جہاں سمائے ہیں

رام شنکر مصرمانہ کانپوری، جبلپور

کچھ اس طرح مرے ساقی نے پیش جام کیا
کہ ہوش رفتہ نے بڑھ کر اسے سلام کیا
بنا خلد یہ مری چشم تر نے کام کیا
بہا کے اشک نے سوز دل کو عام کیا
یہی تو ایک دل مضطرب نے کام کیا
تمام عمر نہ غم کا احترام کیا
صلوٰۃ دیر میں کعبہ میں رام رام کیا
رحیم و رام کے بندوں نے کو عام کیا
ترے جمال کو مجبور رسم عام کیا
جنون شوق نے جینا مرا حرام کیا
شب الم میں تقاضائے یہ رآز کام کیا
مریض غم کے فسانہ کا اختتام کیا

عبدالجبار شادان کشمی

پیا کیا کر چکا ہے اور کیا کیا کر نہیں سکتا
جو آہر ساجہاں پھر سے پیدا کر نہیں سکتا
خدا رکھے جواہر لال جی کا دم غنیمت ہے
منظم دیس کو پھر کوئی ایسا کر نہیں سکتا
نفاق اک زخم ایسا شہ رگ انسانیت پر ہے
زمانہ دل کے بھی جس کا مداوا کر نہیں سکتا
رہیں گے متفق آپس میں جب تک ہند کے باشی
جہاں میں کوئی انکا بال بیکا کر نہیں سکتا
مٹا دیتا ہے خود ان کو زمانہ جو کہ باغی ہیں
ہم ایسے بن نہیں سکتے وہ ایسا کر نہیں سکتا
فقط ہے قافیہ پیما نہیں شادان وہ شاعر
اثر اشعار میں جو اپنے پیدا کر نہیں سکتا

الطاف انصاری سلطان پوری

دیکھ کر ان کا عارض تابناں
کھویا کھویا سا ماہ کامل ہے
کل وہ پائیں گے لذت عشرت
درد غم آج جن کو حاصل ہے
تھک کے بیٹھو نہ فاصلے طے ہو
دو قدم ہی تمہاری منزل ہے
کیف عشرت سے کیا ہے یہ پوچھ کر
لذت غم جو مجھ کو حاصل ہے
جب سے وہ روٹھ کر گئے مجھ سے
سونا سونا سا خانۂ دل ہے
میرے استاد ہیں وہی الطاف
نام جن کا جناب کامل ہے

جلال و جمال

تسنیم احمد فہمی اوجھاروی

خوابیدہ آرزو کو جگانے سے فائدہ
عہد گزشتہ یاد دلانے سے فائدہ ؟
قسمت میں تھا فراق وہی پیش آگیا
جانِ بہار رونے رلانے سے فائدہ ؟
تم کو مرا خیال تھا بے شک خیال تھا
چھوڑو بھی اس کو اس کے سنانے سے فائدہ ؟
ہم جانتے ہیں لذت درد فراق کو
یہ راز ہے کسی کو بتانے سے فائدہ ؟
مرنے کے بعد فخش پہ اے فہمی حزیں
وہ آئے بھی تو خاک اڑانے سے فائدہ ؟

محمد امین شرر سلطان پوری

یہ شبنم بھی ہے شعلہ زار بھی ہے
محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
جسے عزت سے جینا ہے جہاں میں
وہ مرنے کے لئے تیار بھی ہے
سکوں کے ساتھ ہیں بے چینیاں بھی
عجب دلچسپ یاد یار بھی ہے
میں کیوں پوچھوں کہ تم بیزار کیوں ہو
مرا دل عشق میں خود دار بھی ہے
شرر یوں تو سخن ور ہیں ہزاروں
مگر تجھ سا کوئی فن کار بھی ہے

شاغل قادری

کچھ مجھے طالع ناساز پہ رونا آیا
دل ناداں کی تگ و تاز پہ رونا آیا
آج صیاد کو بھی اپنے گرفتاروں کی
جانے کیوں کوشش پرواز پہ رونا آیا
ان کی پرسش پہ جو دیکھا تبسم مجھ کو
رازداں کو مرے انجام پہ رونا آیا
آگیا سامنے انجام تڑپ اٹھا دل
اپنے افسانے کے آغاز پہ رونا آیا
منحصر اشک کی اک بوند پہ تھا جس کا جواب
قادری مجھ کو اسی راز پہ رونا آیا

کرشن چندر

مکئی کے دانے

وہ دونوں پیڑوں کی طرح اکٹھے بڑھے تھے۔ قریب قریب۔ گویا جڑیں ایک دوسرے میں جڑی ہوں اور شاخیں ٹہنیوں کی انگلیاں بڑھا کر ایک دوسرے کو چھو لیں اور ہنسے ہرے پتوں سمیت قہقہے لگائیں۔ ان کی محبت ان کی جوانی کی طرح سرسبز، خام، ناپختہ کار تھی۔

مگر یہ اُسے پسند تھی۔ اُسے اپنے خاندان کا وہ ڈگرا نوجوان پسند تھا۔ جو ہمالیہ پہاڑ کی طرح تیکھا اور سلونا دکھائی دیتا ہے اور نہ کشمیر کی طرح گدا اور نرم کی مانند نرم دم رہتا ہے۔ نہ پنجاب کی طرح دھن دار رہتا ہے۔ ایک فوجی بھرتی کی حیثیت سے اُس نے بھارت کے مختلف علاقوں کی فوجی چوکیوں پر انواع و اقسام کا حسن دیکھا تھا۔ مگر وہ ٹھاکران کو کبھی نہیں بھول سکا ــــ وہ لٹو کی طرح رس دار اور اُلھڑ بلکہ بے وقوف ــــ پنا پتنگا کر کے باوجود سر پہ چار گھڑے اُٹھا کر تین میل کے فاصلے سے ڈوبی کے چشمے سے پانی لانے والی اور نیتی دوپہریوں میں گھاٹی گھاٹی گیت گانے والی ٹھاکران کی آواز چیل کی طرح اُڑتی تھی۔ اور وہ دو میل دور سے اُسے سن سکتا تھا۔ بچپن سے وہ اس کی عادت تھی اور کوئی کہیں کتنے ہی برس کے لئے چلا کیوں نہ جائے اپنے بچپن کی عادت کیسے بھول سکتا ہے ــــ؟

ٹھاکران نے اُسے اپنے مکئی کے بھٹے سے پندرہ دانے بھون کر دیئے اور بولی ــــ "گن لو پورے پندرہ ہیں"

ٹھاکر سنگھ نے اپنی ہتھیلی آگے سرکائی تو ٹھاکران نے بڑے فخر سے اپنا گردن اُونچی کی اور خیرات دیتے ہوئے کسی شاہزادی کی طرح اپنی ہتھیلی نیچے سرکائی اور دانے ٹھاکر سنگھ کی ہتھیلی پر ڈال دیئے ــــ ایک لمحہ کے لئے ٹھاکران کی ہتھیلی ٹھاکر سنگھ کی ہتھیلی سے چھو گئی اور ایسا لگا کہ بادل دور تک شاخیں پتوں سے بھر گئیں۔

ٹھاکر سنگھ نے گن کر کہا ــــ "پندرہ نہیں بارہ ہیں"

"نہیں پورے پندرہ ہیں۔ گن کر دیکھ لو"

"دیکھ پندرہ ہیں ــــ پورے بارہ ہیں۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ سمجھ لو ــــ" ٹھاکر سنگھ نے ہتھیلی دکھاتے ہوئے بولا۔

ٹھاکران نے اُس کی ہتھیلی پر پھر خوبصورت اُنگلی رکھ دی۔ اور ٹھاکر سنگھ کو ایسا لگا۔ گویا کوئی تری شاخ پر بیٹھ گئی۔ پھر ٹھاکران شرارت سے اُس کی ہتھیلی پر گن گن کے دانے دبا دبا کر گننے لگی "ایک ــ دو ــ تین ــ چار پانچ ــ چھ ــ سات ــ آٹھ ــ نو ــ دس ــ گیارہ ــ بارہ ــ" اور پھر تین جگہ خالی چٹکی بھرتے ہوئے بولی "تیرہ ــ چودہ ــ پندرہ ــ ہو گئے نا پورے پندرہ؟" وہ اپنی کالی کالی چمکیلی آنکھیں جلدی جلدی جھپکتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں ہو گئے ــــ" ٹھاکر سنگھ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور ہتھیلی کو نچا کر مکئی کے بارہ دانوں کی پھنکی ماری۔ مکئی کے سنہرے سکھے ہوئے کرکرے دانے اس کے منہ میں کڑکڑ کرتے ہوئے ٹوٹنے لگے اور ٹھاکر سنگھ کو خیال آیا ٹھاکران کا حسن بھی بالکل ایسا ہی ہوگا۔

جلدی جلدی مکئی کے بھٹے سے دانے بھرتے ہوئے ٹھاکران نے اپنی ہتھیلی بھر لی۔ پچیس تیس دانے ہو گئے وہ جلدی سے پھنکی مار کر انہیں کھا گئی۔ ٹھاکر سنگھ نے فوراً اُس کی کلائی پکڑ کر کہا ــــ "تم نے زیادہ کھائے ــــ؟"

"نہیں! " ٹھاکران ہنسی ــــ "پورے پندرہ تھے ــــ!"

"نہیں زیادہ کھائے" ٹھاکر سنگھ نے اصرار کیا ــــ"

جواب میں ٹھاکران نے دوسری مرتبہ اتنے ہی دانے مکئی کے بھٹے سے بھر کر کھا لئے اور بولی "ہاں کھائے پھر ــــ؟"

جواب میں ٹھاکر سنگھ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا ــــ

"ایک ہاتھ دوں گی!" ٹھاکران نے فوراً اپنا ہاتھ اٹھا کر غصے سے کہا اور ٹھاکر سنگھ نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ "تم پاپو سے بات کیوں نہیں کرتے ہو ــــ؟"

"کی کہا تو نے بابو؟" ٹھاکر سنگھ نے پوچھا

"بابو کہتا ہے میں ٹھاکران کی شادی ٹھاکر سنگھ سے نہیں کروں گا ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"کیونکہ دونوں کا نام ایک سا ہے ــــ"

"تو کیا ہوا" ٹھاکر سنگھ غصے سے بولا "دو بار ایک جیسا نام ساتھ ساتھ پڑھیں تو لوگ دونوں کو بیری ہی کہیں گے، پیلی تو کہیں گے نہیں"

"اچھا جب! میں بابو جی سے جا کر کہوں؟" ٹھاکران ہنس کر بولی۔

"تو خط بھیجی ہے"

"خط نہیں کہوں گی تو اور کیا کروں گی تمہارے سے بات کبھی نہیں کرتے ہو ــــ؟" ٹھاکران رونہاسی ہو گئی ــــ

ٹھاکراں کے کانوں پر ٹھوں پر کی چوٹ کی کہ بچہ بچہ اچھے اچھے نچھے دیکھ کر ٹھاکر سنگھ باگوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً ٹھاکراں نے پیچھے سے کہا "ہاتھ چھاتی پر اٹھا لیے۔

"ایک ہاتھ دوں گی۔ پہلے باپ سے بات کر۔!"

شام کو ٹھاکر سنگھ نے بے تحاشہ شراب پی، اور اپنے باپ کی بندوق لے کر چلا۔ ٹھاکراں کے گھر جا کر اس نے بندوق کی نالی ٹھاکراں کے باپ کے سینے پر رکھ دی۔ اور بولا "بول شادی کرتا ہے کہ نہیں"

"کس کی شادی؟ کس سے؟"

"ٹھاکراں کی شادی مجھ سے! تیس برس کا ہو گیا ہوں، حوالدار کبھی ہو گیا ہوں فوج میں۔ ابھی تک ٹھاکراں کے لئے گھوڑا ہوں۔ پورے اڑتالیس روپے ماہوار لاتا ہوں، اس لئے کل شادی ہو گی۔ نہیں تو کھڑے کھڑے یہ بندوق داغ دوں گا تیرے سینے میں۔ بول ——"

ٹھاکراں کا باپ اندر سے ہنسا۔ سینے پر رکھی ہوئی بندوق کی پروا نہ کرتے ہوئے مڑا اور اپنی بیوی سے بولا "ٹھاکرا یاد ہے تجھ کو! میں بھی تیرے باپ سے اسی طرح پشتہ لگوانے گیا تھا۔"

پھر وہ زور زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور وہ سے ہاتھ مار کر اس نے ٹھاکر سنگھ کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا ——

کوئی دس مہینے اور اڑتالیس کی ایک چوکی پر میجر ہزارہ سنگھ نے اس سے کہا "اٹینشن ——"

حوالدار ٹھاکر سنگھ "اٹینشن" ہو گیا۔

"سیلوٹ" میجر ہزارہ سنگھ گرج کر بولا۔

میجر کے لہجے سے ٹھاکر سنگھ ایک دم چوکنا ہو گیا اور سوچنے لگا۔ معلوم آج اس نے کونسی غلطی کی ہے؟ میجر بہت گرم ہو رہا ہے۔

میجر ہزارہ سنگھ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ پھر ایک نیلا سا کاغذ ہاتھ میں اٹھایا اور کڑکتی ہوئی آواز میں بولا "حوالدار ٹھاکر سنگھ، تمہاری رخصت پندرہ دن کے لئے منظور کی گئی ہے اور تمہاری بیوی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور تم آج اسی وقت جا سکتے ہو۔ ڈسمس۔"

حوالدار ٹھاکر سنگھ "اٹینشن" ہو گیا۔

میجر ہزارہ سنگھ نے نیلے کاغذ پر ایک کونے سے دستخط کر کے حوالدار کے ہاتھ میں دیا جو اس نے آگے بڑھ کر لے لیا۔ اور اس سے پیچھے کہ حوالدار ٹھاکر سنگھ میجر ہزارہ سنگھ کا شکریہ ادا کرے میجر ہزارہ سنگھ کڑک کر بولا "آنریبل ایاؤٹ ٹرن"!

حوالدار ٹھاکر سنگھ نے بڑی پھرتی اور مشاقانہ انداز میں "ایاؤٹ ٹرن" مارا۔

"ڈسمس!"

میجر ہزارہ سنگھ سے رخصت ہو کر ٹھاکر سنگھ چوکی کے سب سے بلند اڈے کی طرف بھاگا، جہاں اس کی مشین گن کا کھونسلہ تھا۔ وہ یہ خبر فوراً اپنے ساتھیوں کو سنانا چاہتا تھا۔ جو مارے جبن اور حیرت کے خاک ہو جائیں گے۔ سکھ چین سنگھ اور آسا رام اور بچہ پارا شیر خاں تو فخر میں منہ چھپا کر روئے گا کیونکہ اس کی رخصت ابھی منظور نہیں ہوئی تھی۔ بڑا فرق آئے گا۔ ان لوگوں کا چہرہ دیکھ کر ——

تیز تیز قدموں سے چڑھتا ہوا وہ چوکی کے سب سے بلند اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں شیر خاں اور آسا رام اپنی مارٹر ٹھیک کر رہے تھے اور سکھ چین سنگھ اور اس کا ساتھی مشین گن کا گولا بارود دیکھ رہا تھا۔ حوالدار ٹھاکر سنگھ ان کے قریب جا کر چلایا۔ اور اپنی ایک جیب سے اپنی بیوی کا خط نکال کر دکھاتے ہوئے بولا "میرے گھر لڑکا ہوا ہے"

شیر خاں اور آسا رام نے پٹ کر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ ایسی نفرت بھری نظر جیسے وہ اپنے سامنے ایک خارش زدہ کتے کو دیکھ رہے ہوں۔ دوسرے لمحے وہ پٹ کر اپنی مارٹر کے کام میں لگ گئے۔

"اور مجھے پندرہ دن کی رخصت ملی ہے" ٹھاکر سنگھ نے دوسری جیب سے دوسرا کاغذ نکال کر چلا میں لہرایا۔

میلا میلا نیلا سا کاغذ جس پر میجر کے دستخط تھے۔

سکھ چین سنگھ نے اپنے ساتھی کی طرف ایک خاموشی سے دیکھا۔ پھر دور بین اٹھا کر اپنی آنکھ سے لگا لی اور سامنے جھیل کے پار آن کی آن میں پہاڑوں کو غور سے دیکھنے لگا، جہاں چینیوں نے اڈے جمائے تھے۔ مگر وہ بھی کچھ نہیں بولا۔

اپنے ساتھیوں کی یہ بے رخی دیکھ کر ٹھاکر کھسیانا ہو گیا اور رخصت کا کاغذ اور بیوی کا خط دونوں اپنی جیب میں ڈال کر ان سب کی طرف پیٹھ کر کے اپنی مشین گن پر بیٹھ گیا اور بولا "تو مرد!"

یہ سنتے ہی وہ تینوں اس کی طرف دوڑے۔ اس سے پہلے کہ ٹھاکر سنگھ اپنے آپ کو بچا لے وہ اس پر حملہ آور ہو گئے اور اس کی پیٹھ، پسلیوں، کندھوں پر مکے مار مار کر کہنے لگے "ایسے موقعے پر لڑکے کی پیدائش کا ذکر اس فخر سے کرتا ہے نیفا کا مورچہ سر کر کے آ رہا ہے؟ سور کی اولاد، تو گھر جائے گا۔ اپنی بیوی کو گلے سے لگائے گا اور ہم یہاں تیری مشین گن کا چرخا سنبھالیں گے"

وہ لوگ اسے کوس کوس کر گالیاں دے رہے تھے اور وہ ان سب کے درمیان فٹ بال بنا ہوا اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا خوشی سے ہنستا جا رہا تھا۔ اپنے دوستوں کے گھونسے اور مکے اُسے اس وقت سے بھی نرم اور پیارے معلوم ہو رہے تھے۔

ایک رات کے لئے انہوں نے اسے گھر جانے کی رخصت دے دی۔ سکھ چین سنگھ اس کے کندھے کا تھیلا اور گھر والوں کے لئے کچھ تحفے بھیجنا چاہتا تھا اور

بات تو نہیں لیکن ٹھاکر شیر خاں کا بھی گاؤں تھا اور شیر خاں کا اصرار تھا کہ ٹھاکر سنگھ اس کے گھر پر ہی جائے اور اس کی بیوی کی خیر خبر لے کے آئے۔ پھر وہ لوگ اسے رخصت کرنے سے پہلے اس کی دعوت کرنا چاہتے تھے اس نے رات بھر کے لئے ٹھاکر سے صرف دری ہو گیا۔

رات کا کھانا کھا کر وہ لوگ چوکی کے اوٹ پر بیٹھے گئے دن کے بعد آسمان صاف دکھائی دیا تھا اور اکا دکا پیپل کے پہاڑوں پر چاند میجر کے گولی دستخطوں کی طرح چمک رہا تھا۔ نیچے جھیل کی سطح پر گلیشیر کا ایک ٹکڑا تیر رہا تھا اور اس کے اردگرد چاندنی ایک ہالے کی طرح کھنچی ہوئی تھی۔

ایک سال سے وہ اس فوجی چوکی پر تھے۔ مگر ابھی تک کبھی دشمن سے لڑائی کا موقع نہیں آیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جھیل کے اس پار پہاڑوں پر چینی فوج کے اڈے ہیں۔ مگر چینی فوجیوں سے آج تک ان کی ڈیڑھ نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے کھانا کھا کر سب کے دل میں الوداع تھا۔ ٹھاکر سنگھ کی رخصت کی خبر سے ان سب کے ذہن اپنے گھروں میں تھے۔ جیسے اس کی آنکھوں سے اگلی چین کے برف سے ڈھکے پہاڑ غائب ہو گئے تھے اور دور نیچے ہری بھری گھاٹیوں اور وادیوں میں بسے ہوئے گاؤں جیسے کسی شیر خوار بچے کی طرح دھرتی کے سینے سے لگے چین معصوم اور خوبصورت نظر آنے لگے۔

شیر خاں بولا۔ "اس لڑکی کی آنکھیں تاریخ کو ہمارے گاؤں کے باہر وادی الذامہ خواجہ کے مزار پر میلہ لگتا ہے۔ میری بیوی کو بولنا کہ وہ اس موقع پر میری جان کی سلامتی کے لئے نیاز دینا نہ بھولے جا"

"بول دوں گا۔۔۔!"

پھر کوئی کچھ نہیں بولا۔ اچانک سکھ چین سنگھ کو ہچکی آنے لگی

"کوئی تمہیں یاد کر رہا ہے!" شیر خاں نے سکھ چین سنگھ کو بتایا۔ "جب کسی کو پتا چلتا ہے کہ ہچکی اس وقت آتی ہے جب کوئی تمہیں کر یاد کرتا ہے۔

"کون ہے تمہاری وہ یاد کرنے والی ۔۔۔!" شیر خاں نے سکھ چین سنگھ سے پوچھا۔

سکھ چین سنگھ نے بڑی حسرت سے کہا: "اس دنیا میں میری بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں"!

اور پھر اس نے ایکدم ہچکی لی۔

ہچکی سے ٹھاکر سنگھ کو اپنی شادی کی رات یاد آ گئی۔ لوگوں نے ٹھاکر ان اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر سنگھ کو واپس لوٹنا تھا۔ اور سہرا جڑا پہنے ہوئے بھندی بھرے ہاتھوں والی ٹھاکرائن کو اچانک ہچکی لگ گئی تھی۔ اور کسی طرح بند نہ ہوتی تھی۔ اور صرف یہی ایک رات ان دونوں کو ملی تھی۔ اور وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہچکی تھی کہ کسی طرح بند نہ ہوتی تھی۔ ٹھاکر سنگھ نے کمرے میں رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کو ٹھاکرائن کے منہ سے لگا دیا۔ مگر دودھ پی کر بھی ٹھاکرائن کی ہچکی بند نہ ہوئی۔ پھر اس نے نمک کی ڈلی مٹھی میں بھر کر ٹھاکرائن کا منہ بند کر دیا۔ پھر بھی ٹھاکرائن کی ہچکی بند نہ ہوئی۔ پھر ٹھاکر سنگھ نے اخروٹ کھلایا اور بادام اور پھر کا جو میسر تھا کی ایک بڑی ڈلی اس کے منہ میں رکھ دی۔ لیکن ٹھاکرائن کی ہچکی کسی طرح بند نہ ہوئی تو ٹھاکر سنگھ نے ٹھاکرائن کے لبوں پر اپنے لب پیوست کر دیئے ۔۔۔

اور ٹھاکرائن کی ہچکی بند ہو گئی۔

اس واقعہ کو یاد کر کے ٹھاکر سنگھ دل ہی دل میں مسکرایا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے اپنی بیوی کا خط نکال کر جس پر اس کے بچے کی تصویر تھی۔ کل گرگھٹا سا۔ پیارا پیارا سا بچہ ہنستا ہوا۔ اس کی چمک دار آنکھوں کے چاروں طرف کاجل پھیل گیا تھا اس کی کالی گھنی اور گھنیری پلکیں بار بار گر رہی تھیں اور اس کی ٹھوڑی تو بالکل باپ کی طرح تھی اور ہاں ناک بھی۔ اپنے چہرے کو اپنے بیٹے کے چہرے میں دیکھ کر ٹھاکر سنگھ بے اندازہ مسرت سے مسکرا دیا۔ پھر اس نے جیب سے ایک ٹیلی گرام نکالا جو اس خط سے پیشتر آیا تھا جس میں اس کی بیوی کی بیماری کا ذکر تھا جس کی وجہ سے اس نے رخصت کی درخواست دی تھی۔ اور اب یہ خط اور یہ تصویر۔۔۔ ننھے مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ٹھاکر سنگھ کا جی اسے گود میں لے کر چومنے کو چاہنے لگا ۔۔۔

اچانک ایک دم بہت سی گولیوں کے چلنے کی آواز آئی۔ شیر خاں اس وقت اپنی مارٹر کے پاس کھڑا انگڑائی لے رہا تھا۔ گولی نے اس کا سینہ چھید دیا اور وہ ٹھاہ کھا تا ہوا زمین پر جا گرا۔ اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

پھر مقابل کے پہاڑوں سے بہت سی چنگاریاں روشن ہوئیں اور تو پ کے دھماکے سے پہاڑوں کا سینہ کانپ اٹھا اور ٹی فون پر اسلام کر میجر ہزارہ سنگھ کی آواز سنائی دی "چین کا حملہ شروع ہو گیا ہے" اس خبر کے ساتھ ساتھ اور بہت سی ہدایات تھیں۔

احکام سنتے ہی۔۔۔ وہ لوگ اپنی اپنی مارٹروں اور مشین گنوں میں لگ گئے۔ گولیوں کی تڑاخ کی نہ ختم ہونے والی آواز سے گویا رات کے سناٹے میں مسلسل سور لگ ہوتے جا رہے تھے۔ پھر دیر یا ں میں تھوڑی دیر کے لئے یہ تڑاخ رکی اور اس دوران میں اسلام نے ٹھاکر سنگھ سے کہا "میجر کو معلوم نہیں کہ تم ابھی تک یہاں پر ہو۔ اس لئے تم چپ چاپ نکل جاؤ۔ اپنی رخصت بے کار نہ جانے دو!"

"ہاں! تم تو رخصت پر ہو" سکھ چین سنگھ بولا "کل چلا جانا۔" ٹھاکر سنگھ بولا۔ "ابھی تو چلنے دو۔" مگر پھر یکایک اس نے بولا "ہاں ابھی تو چلنے دو۔" تاکہ کہ وہ شیر خاں کے سینے پر بیٹھ گیا۔

دو گھنٹے کی تڑاخ تڑاخ کے بعد جب ایک گولی

نے سکھ چین سنگھ کی جان لے لی تو آسارام نے میجر سے پوچھا۔

"کیپٹن کہاں ہے۔۔۔؟" میجر ٹیلیفون پر بولا "دشمن نے آگے پیچھے اور دائیں تین طرف سے حملہ کیا ہے۔ چوکی نمبر پانچ اور چھ پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔۔۔"

شب کے تیسرے پہر کے قریب میجر نے بتایا کہ چوکی نمبر تین اور چار بھی ہاتھ سے گئیں۔

پھر ٹیلیفون بھی بجنا بند ہو گیا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔۔۔!" آسارام نے بار بار پکارا "میجر صاحب؟ میجر صاحب؟" مگر ٹیلی فون مُردہ ہو چکا تھا۔ چوکی نمبر دو سے بھی اب کوئی نہیں بول رہا تھا اور ان کی اپنی چوکی کا نمبر ایک تھا۔

کوئی بیس منٹ کے بعد میجر ہزارہ سنگھ یکایک فون میں لات پت ایک مشین گن کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہانپتا ہوا اُن کی چوکی پر پہنچا۔ اس کا چہرہ غم و غصے سے لال تھا۔ اُس نے چوکی پر کسی سے بات نہیں کی وہ جس طرف سے آیا تھا ادھر ہی کی طرف اُس نے اپنی مشین گن کا منہ نیچے کی طرف پھیر دیا۔ اور مشین گن کی طرف ہی دیکھتے ہوئے حکم دیتے ہوئے چلا کر بولا۔۔۔ "دشمن میرے پیچھے پیچھے چڑھائی چڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ اپنی مارٹروں کا منہ بھی اُسی طرف نیچے کو کھول دو اور سب کو بھون دو۔ دشمن تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے راستہ مت دو۔ چلاتے جاؤ۔ چلاتے جاؤ۔ اُس وقت تک چلاتے جاؤ جب تک گولہ بارود ختم نہ ہو جائے۔ چوکی نمبر ایک کبھی فتح نہ ہو گی۔۔۔!"

میجر کے دفعتاً چیخ کر گولیوں کی باڑھ بند ہو گئی اور چاروں طرف دور تک سناٹا چھا گیا

کچھ لمحوں کے لئے اس قیامت میں ٹھاکر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چوکی کی نبرائی کی حفاظت کرنے والے سب فوجی مرے پڑے تھے۔ مشین گنیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ مارٹر خاموش۔ شیر خاں کا سر ایک گڑھے میں اور ٹانگیں کھائی کے کنارے گھسٹتے ہوئے باہر کو تھا۔ اور اس کے کالے گھنگھریالے بال آہستہ آہستہ ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ آسارام کا ایک ہاتھ مارٹر پر تھا۔ دوسرا ٹیلیفون پر اور اس کے پیٹ سے خون بہہ بہہ کر زمین پر جم گیا تھا۔ سکھ چین سنگھ کا منہ پوری طرح کھلا تھا جیسے اُسے ہچکی آنے والی ہو۔ شاید مرتے وقت اس نے اپنی ماں کو یاد کیا تھا۔ گولی اس کی کنپٹی کو چھید کر دماغ کے دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اور وہ نہایت اطمینان سے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے کھلے آسمان کو تک رہا تھا۔

حولدار ٹھاکر سنگھ نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈال کر دیکھا اور چاروں طرف سے اپنے ساتھیوں کی نعشیں گھورتی ہوئی ملیں۔ اس چوکی پر وہ اکیلا حیات تھا۔ اور رخصت پر تھا۔

اچانک ٹھاکر سنگھ میجر ہزارہ سنگھ کی نعش کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔۔۔ "حولدار ٹھاکر سنگھ اٹینشن" اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر خود ہی اٹینشن ہو گیا۔ "سیلوٹ" اس نے اپنے آپ کو حکم دیا۔ اور میجر کی نعش کو سیلوٹ کیا۔ پھر وہ جیت مکانی میجر کی طرح کڑک کر بولا "حولدار ٹھاکر سنگھ آج سے تمہاری رخصت منسوخ کی جاتی ہے اور تم کو اس چوکی کا آفیسر کمانڈنگ مقرر کیا جاتا ہے۔ آج سے اس چوکی کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اباؤٹ ٹرن" "ڈمس!" حولدار ٹھاکر سنگھ نے اتنا کہہ کر سیلوٹ مارا۔ اباؤٹ ٹرن کیا اور پھر واپس اپنی مشین گن پر بیٹھ گیا۔

اپنی جیب سے اپنے بچے کی تصویر نکال کر دائیں طرف رکھ لی۔ اس پر ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیا۔ تاکہ تصویر بھی نظر آتی رہے اور ہوا کے جھونکے سے اڑ بھی نہ سکے۔ پھر اس نے اپنی مشین گن کا رخ موڑتے ہوئے نیچے گھاٹیوں کی سمت دیکھا۔ جہاں سینکڑوں چینی سپاہی ہاتھوں میں بندوقیں لئے اس کی چوکی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور اس کے پاس گولہ بارود بہت کم رہ گیا تھا۔ "آنے دو ان کو پاس آنے دو حولدار ٹھاکر سنگھ گولہ بارود برباد نہ کرو۔" ٹھاکر سنگھ نے خود سے کہا اور مشین گن کو مضبوطی سے تھام کر انتظار کرنے لگا۔

پہلی بار اپنے حملہ میں ناکام ہونے کے بعد اور کئی درجن سپاہیوں کو کھونے کے بعد جب چینی سپاہی چوکی نمبر ایک پر پہنچے تو انہوں نے اپنے چاروں طرف مُردہ ہی مُردے پائے۔ گورکھوں کا آخری راؤنڈ بھی چل چکا تھا اور حولدار ٹھاکر سنگھ اپنی مشین گن پر مُردہ پڑا ہوا تھا اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ چھلنی ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ حملہ آوروں کا افسر دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ مگر وہ مسکراہٹ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ کوئی بھی آدمی مرتے وقت کیسے مسکرا سکتا ہے؟ اور پھر وہ مسکراہٹ تو کچھ عجیب قسم کی تھی۔ شیرینی بھی اس میں تھی۔ غم بھی تھا۔ غم گین بھی اور پُر حوصلہ بھی۔ یوں جوں وہ مسکراہٹ کو دیکھتا جاتا تھا اُسے محسوس ہوتا جاتا تھا، گویا یہ مسکراہٹ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے غصہ میں آ کر ٹھاکر سنگھ کی لاش میں زور سے ایک لات ماری۔

حولدار ٹھاکر سنگھ اپنے بچے کی تصویر پر جا گرا جیسے اس نے اپنے بچے کی تصویر کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہو۔ مگر اس کا چہرہ اب بھی چینی افسر کے سامنے تھا اور بدستور مسکرا رہا تھا۔ ٹھاکر سنگھ مردہ تھا۔ مگر اس کی مسکراہٹ زندہ تھی اور ہوا میں ایک جھنڈے کی مانند لہرا رہی تھی۔

چینی افسر نے جھک کر جیب سے پستول نکالا اور مسلسل کئی گولیاں ٹھاکر سنگھ کے سینے میں داغ دیں۔ بہت سے چینی سپاہی منہ اٹھا کر حیرت سے اپنے افسر کو دیکھنے لگے۔ پھر اس کی لاش پلٹ کر مُردہ ہندوستانی

مترجمہ روشن چٹیا لوی

معمہ

موپاساں کا ایک شاہکار

پہلے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک مقدمے کا ذکر ہے۔ روزلی جو ناشیز کے نوجوان جوڑے کی نوکر تھی حاملہ ہوگئی۔ اس نے بالاخانے میں ایک بچے کو جنم دیا۔ اور اسے خود ہی مار کر باغ میں دفن کر دیا۔

ایک طرح سے یہ گھریلو ملازمین کے ہاتھوں چھوٹے بچوں کے قتل کی عام سی ایک واردات تھی۔ مگر ایک بات جو سب سے زیادہ تعجب انگیز اور حیران کن تھی وہ یہ تھی کہ نرس نے پیدا ہونے والے چھوٹے بچے کے تمام کپڑے اور دیگر سامان جو وہ رات کے وقت شرق سے تیار کیا کرتی تھی سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دوسری دایہ نے جسے بطور گواہ عدالت میں پیش کیا گیا تھا بیان دیتے ہوئے کہا کہ روزلی بچے کی پیدائش کے لئے باقاعدہ تیاریاں کر رہی تھی اور اس نے اپنے تجربہ کی بنا پر اسے ضروری مشورے بھی دیئے تھے۔

نرس کے مالک اور مالکن جو اخلاقی اعتبار سے بہت سخت اور تنگ دل واقع ہوئے تھے عدالت میں حاضر ہوئے نرس کے خلاف یا حق میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہ تھی ان کے خیال میں صرف تختہ دار ہی اس کے لئے مناسب جگہ تھی۔ مگر حالات یہ ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ اس نے گھناؤنا فعل ہسٹیریا یا جذبۂ یاس کے تحت کیا۔ انھوں نے اسے یہ کہہ کر کہ وہ اس پر ظلم نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کے برعکس رحم کے متمنی ہیں۔ اس سے صحیح حالات معلوم کرنے کی کوشش کی: "اپنے بچے کے باپ کا نام بتاؤ۔ لڑکی!" مالک نے کہا۔

اس وقت تک روزلی نے کسی کو بھی یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ بچے کا باپ کون ہے۔ مگر مالک کے ہمدردانہ رویہ نے اسے اس کا نام بتانے کے لئے مجبور کر دیا: "یہ اس کے مالک ریمبوٹ کا بھتیجا جوزف ہے!"

مالک اور مالکن غصے سے بڑبڑانے لگے۔ اور بولے "یہ شرمناک جھوٹ ہے۔" ریمبوٹ نے کہا "اس کی بات پر کسی طرح یقین نہ کیا جائے۔"

"سنو!" مالک نے کہا: "اگر آپ کے خیال میں یہ جھوٹ کہہ رہی ہے تو آپ کو اس کی تردید کا پورا موقع دیا جائے گا درمیان میں غل غپاڑہ درست نہیں۔" "ہاں! بولو — میری لڑکی۔"

روزلی نے اپنے دبے ہوئے غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کہانی طوعاً و کرہاً شروع کی۔ "یوزف چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں آیا۔ وہ توپ خانہ میں سب لیفٹیننٹ تھا۔ وہ گرمیوں میں دو ماہ یہاں مقیم رہا..... چند دن بعد ہی وہ میری طرف بُری طرح رجوع ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ موقع میری تعریف اور خوشامد کرنے لگا۔ مگر میں شروع میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ مگر وہ میری طرف جھکتا ہی چلا گیا۔ وہ کتنا خوبصورت تھا — اور میں اکیلی تھی۔ ناتجربہ کار — نہ ہی مجھے کوئی مشورہ دینے والا تھا، اور نہ ہی مدد۔ نہ ہی کوئی ہمراز اور رہبر تھا۔ میں بھی رفتہ رفتہ اس کی طرف جھکنے لگی۔

آخر میں میری حیثیت ایک بھیڑ کی سی تھی۔ میں بہت مسرور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے اپنا بڑا بھائی مل گیا ہے۔ اور اس کے بعد ایک شام اس نے مجھے دریا کے کنارے سیر کے لئے چلنے کی دعوت دی۔ میں رضامند ہوگئی۔ اس نے میری کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کئے مجھے پیار تم تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

مگر میوں کی حسین چاندنی رات تھی — اور میں مزاحمت نہ کر سکی..... یا"

تین ہفتے اسی طرح گزر گئے — میں اس سے کبھی بھی علیحدہ نہ ہونا چاہتی تھی۔ مگر وہ بے وفا ثابت ہوا میں تمام دنیا میں ہر حالت میں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار تھی۔ مگر وہ مجھے بے یار و مددگار میرے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں اگلے ماہ مجھے اس کا علم ہوا۔ اور یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ زار و قطار رونے لگی۔

مگ نے بڑی مشقت سے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اور چند لمحات کے بعد اس نے اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے اپنی کہانی کو پھر جاری کیا: "اور جیسے جیسے اپنی اس حالت کا احساس ہوا میں میڈم بوتان دایہ کے پاس گئی، جو اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ میں نے اس سے مشورہ کیا کہ اگر وفتہ پیچ ہو جائے تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اور میں پیدا ہونے والے بچے کے لئے روزانہ رات کے وقت کپڑے سینے لگی اور ساتھ ہی کسی ملازمت کی تلاش بھی کرنے لگی۔ کیونکہ میں نے یہ بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ میرے موجودہ مالک بچے کی پیدائش کے بعد مجھے ملازمت سے علیحدہ کر دیں گے —"

"تب بچے کے مارنے کا تو تمہارا خیال نہ تھا؟"

"نہیں جناب!"

"تب تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ ایسے ہو جناب کہ وقت سے پہلے پیدا

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

تکمیلِ تمنا

ہدیٰ نعیم زیدی اپنے ہنر میں سے فیشن کے ڈیزائنر دوم ہیں۔ یہ اپنے خصوصی شائقین مسعود سے وہ حالات بیان کر رہے تھے جنہوں نے ان کی زندگی کی دھارا کو بدل دیا تھا۔

"..... اور جب میں ایم۔اے میں تھا تو سلمیٰ بی۔اے کے آخری سال میں تھی۔ مرزا دلاور بیگ اور میرے والد میں معمولی سی شناسائی تھی۔ نہ معلوم کالج میں میری شہرت کا نتیجہ تھا یا والد صاحب ہی نے ان سے میرا تذکرہ کیا تھا۔ مجھے ان کی جانب سے بلاوا آگیا۔ اس عظیم الشان کوٹھی کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ جوں ہی میں اندر داخل ہوا۔ ایک نسوانی آواز نے میرا استقبال کیا۔ وہ سلمیٰ ہی تھی ــــ سلمیٰ کالج میں اپنی عجیب و غریب طبیعت اور فطرت کے لئے مشہور تھی۔ دوسری لڑکیاں گھبرائی گھبرائی، جھینپی جھینپی مذاق کرتیں۔ لڑکوں کے ساتھ فلرٹ کرتیں مگر سلمیٰ ان سب سے قطعی مختلف کالج کے کامن روم میں خاموش بیٹھی رہتی۔ اور جب آخری پیریڈ ختم ہو جاتا، تو یہ بھی گھر چلی جاتی۔ کبھی اس کی کالج کی زندگی تھی۔ میں بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا تھا۔ ویسے مجھے ہر لڑکی کے بارے میں رپورٹ ملا ہی کرتی تھی اور اپنی رپورٹوں کی روشنی میں ہی سلمیٰ سے ملنے کا مشتاق ہو گیا تھا۔ فیرتو میرا استقبال کرنے والی سلمیٰ ہی تھی "آیئے، اندر آیئے۔ والد صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں ــــ" میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

ڈرائنگ روم میں ایک بارعب شخصیت میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ اور انھوں نے دعا دے کر مجھے قریب بلایا۔ میں ان کے نزدیک کی ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "بیٹا رحمٰن! میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور خاص کر سلمیٰ کی زبانی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ٹیوشن دیا کرو۔ اس کی انگریزی بہت کمزور ہے تم دونوں اپنی اپنی سہولت کے مطابق وقت کا تعین کر لو۔ میں نے تمہارے والد سے بھی کہہ دیا ہے اور انھوں نے یہ بتا تم ہی پر چھوڑ دی ہے۔"

میں نے خاموشی سے ان کے اس حکم کو سنا مجھے خوشی بھی تھی اور نا خوشی بھی۔ بہر حال اسی کش مکش میں انھیں ہم سا جواب دے کر چلا آیا۔

دوسرے دن جب کہ میں کامن روم کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اچانک اسی نقرئی آواز نے میرے قدم روک لئے "سنئے! آج شام سات بجے میں آپ کا گھر پر انتظار کروں گی ــ" اور میں آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد میں اسے باقاعدہ ٹیوشن دینے لگا میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کر رہا تھا امتحان میں صرف دو ماہ باقی تھے۔ سلمیٰ کے امتحان میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں میرے دل میں اس کے لئے وہ جذبہ جیسے تم جیسے منچلے نوجوان محبت کہتے ہیں بیدار نہیں ہو سکا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ میں اس وقت تک کسی لڑکی کے قریب سے قطعی ناواقف تھا۔ میں نے اسے صرف ۶ ماہ کے مختصر سے عرصے میں ہی فرسٹ ڈویژن کے قابل بنا دیا تھا۔ سلمیٰ کا ایک چھوٹا بھائی ساجد بھی تھا جو ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار ہم میں ہنسی مذاق ہو جایا کرتا تھا۔ امتحانات ہو گئے۔ سلمیٰ کے سبھی پرچے خوب ہوئے تھے۔ میرا امتحان بھی ہو گیا۔ نتیجہ بھی نکلا۔ سلمیٰ نے اول درجہ میں کامیابی حاصل کی تھی اور اب مجھے اپنے نتیجے کا بے چینی سے انتظار تھا۔

سلمیٰ کے نتیجے کے دوسرے دن مرزا دلاور بیگ نے کالج کے سبھی پروفیسروں اور اپنے دیگر احباب کی اس خوشی میں پارٹی دی تھی اور مجھے اس پارٹی میں خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ اس دن دلاور بیگ نے سبھوں کے سامنے میرا تعارف کراتے ہوئے اپنی لڑکی کی کامیابی کا سہرا میرے سر باندھا۔ پھر مجھے بھی مبارک باد دی گئی فرض پارٹیاں کتنیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں

ادھر اپنے گھر میں جو گزر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر بھی میں انجان بن رہا تھا۔ وجہ ــ وہی لاچاری، مجبوری۔ میری ایک بہن ہے۔ ایک چھوٹی کنواری بہن جس کی شادی رُکی ہوئی تھی۔ محض مالی دشواریوں کے باعث دو چھوٹے بھائی۔ گھر میں افلاس ہی افلاس تھا ــــ والد صاحب نے میرے آئی۔سی۔ایس بننے کی اُمید پر اپنی زندگی کی ساری پونجی میری پڑھائی کے دہانے پر لگا دی تھی۔ اور اب منتظر تھے نتیجے کے ــ مجھ سے گھر کی یہ بدحالی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ گھر میں اپنے غباروں کے قصر کو منہدم ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بی۔اے ہونے کے بعد ایک دفعہ خیال بھی آیا کہ کہیں کلرکی کر کے والد صاحب کا کفیل بنوں۔ مگر پھر میری دلی خواہش نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔

ایم۔اے کا نتیجہ نکلا۔ اور میں نے صوبے بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اخبار نے کریسنٹ سے پہلے والد صاحب کے پاس پہنچا اور انھیں یہ خوش خبری سنائی

انھوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ فرطِ مسرت سے اور انھوں نے کہا: "بیٹا جمن! میں اس دن کو دیکھنے کے لئے برسوں اپنی زندگی کا اثاثہ سمجھ کر بچا رہا تھا آج وہ دن آ ہی گیا۔ جگ جگ جیو بیٹا۔" اور پھر میں ماں کی دعا لینے اس کے پاس چلا گیا۔ اور انھیں خوشخبری سنائی۔ اور ماں نے مجھے گلے سے لگا کر کہا: "جمن! اب صرف ایک چیز کی اور خواہش ہے۔ جلدی سے بہن رضیہ سے تیرا کی شادی کے بارے میں ذکر کروں گی۔ تاکہ وہ تاریخ پکی کر دیں۔" اور میں نے اسی روایتی انداز میں روٹھتے ہوئے کہا تھا: "ہٹو ماں تمھیں تو ہر وقت میری شادی ہی کی فکر رہتی ہے۔"

اُس رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ مجھے لندن یونیورسٹی سے اسکالرشپ ملی ہے اور میں لندت جا رہا ہوں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر وہاں کی عظیم الشان عمارتیں..... وہ عظیم یونیورسٹی جہاں بائرن اور شیکسپیئر نے تعلیم حاصل کی ان سب عظیم اور مقدس مقام کو میں نے خواب میں دیکھا۔ میں وہاں پر تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ سیکی انگریز بار میری عزت کر رہے ہیں اور میں ان کے بچوں بیچ بیٹھا کسی ادبی معاملے پر زور و شور سے پُرجوش انداز میں بحث کر رہا ہوں۔ دفعتہً میری آنکھ کھل گئی ماں۔ والد صاحب میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر ان کے پاس آیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک ٹیلی گرام تھما دیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اتنی صبح بھلا کس کا تار آیا ہے۔

تار ہمارے پرنسپل کی طرف سے تھا۔ پڑھنے کے بعد میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حقیقت تھی یا خواب۔ والد صاحب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے دوبارہ پوچھنے پر میں نے اُن سے کہا:۔

"ابا جان..... مجھے ایک خاص اسکالرشپ کا آفر آیا ہے اور پرنسپل نے مجھے خصوصی طور پر لکھا ہے کہ میں اس سے ضرور فائدہ اُٹھاؤں اور لندن یونیورسٹی چلا جاؤں۔"

یہ سنتے ہی والد صاحب کے لبوں پر بھی ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر نجانے کیوں ان کی مسکراہٹ کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ میں اس وقت وہاں ٹھہرا نہیں۔ خوشی نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ میں دوڑا دوڑا پھر رہا تھا جب دوپہر کا وقت ہوا، تو والد صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔

"بیٹا جمن! تم جانتے ہی ہو ہم کس قدر امیر ہیں۔ لے دے کر ایک مکان تھا سو وہ بھی رہن ہے۔ اب اگر میں تمھیں ولایت بھیجنے کے خواب دیکھوں، تو یہ تمھارے ساتھ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم خود سوچو۔ کیا ہم میں اتنی اہلیت ہے، اتنی استطاعت ہے جو ہم یہ کر سکیں۔۔۔؟"

اور پھر میری اکلی رات دیکھا ہوا خواب اور آج کی حقیقتوں کے سہارے تیار شدہ محل منہدم ہوتا ہوا نظر آیا۔ اور میں نے سوچا۔ والد صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ غلط تھوڑے ہی کہہ رہے ہیں! انھوں نے میری پڑھائی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ کتنے رکھ اور کتنے ستم اٹھائے انھوں نے۔ اب میں مزید ان کو زیر بار نہیں کر سکتا۔ اپنی اس دلی خواہش کو ختم کرنا ہی ہوگا۔ ختم کرنا ہی ہوگا۔ یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہوگی اور پھر میں نے والد صاحب سے کہا تھا کہ وہ مطمئن رہیں میں انھیں کوئی مزید زحمت نہیں دوں گا۔ مگر والد صاحب پانچ منٹ سوچنے کے بعد اچانک خوشی سے اچھل پڑے انھیں مرزا دلاور بیگ کا خیال آیا۔ نیچے کے بعد وہ ان سے ایک بار بھی نہیں ملے تھے۔ یوں تو اُن سے سرسری جان پہچان تھی۔ اب وہ اس سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے تھے۔ جب یہ بات انھوں نے مجھ سے کہی تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ دراصل مجھے بہت خوشی ہوئی اس بات کو سن کر۔ اسی شام ہم ان کے گھر گئے انھوں نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ آخر میں والد صاحب نے مدعا زبان پر لائے۔ "بیٹا جمن ذرا وہ تار تو دکھانا مرزا صاحب کو جو تمھیں آج ہی تمھارے پرنسپل صاحب کی طرف سے ملا ہے۔"

میں نے وہ تار مرزا صاحب کو دیا۔ انھوں نے اسے پڑھا۔ اور بے ساختہ کہا: "مبارک ہو بہت اچھی بات ہے اقبال مند لوگ ایسے ہی مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے اس معاملے میں۔"

والد صاحب نے کہا: "اس سلسلہ میں ہم آپ کو زحمت دینے آئے ہیں۔ شاید آپ نہیں جانتے ہم ہندوستان کے ان کمبخت باسیوں سے ہیں جن کے بچے محض اپنی غربت کی وجہ سے قابلیت رکھنے کے باوجود بھی تعلیم سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ جمن کے پاس کیا کچھ نہیں ہے! مگر اس کے پاس وہ شے نہیں جس سے دنیا کے جملہ کاروبار چلتے ہیں اور اسی امداد کے لئے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔"

مرزا صاحب معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر خاموش ہو گئے۔ جیسا سانپ سونگھ گیا ہو۔ اپنے مقام پر بیٹھے بیٹھے ہلنے لگے۔ پھر انھوں نے مجھے باہر چلے جانے کو کہا۔ اس کے بعد انھوں نے والد صاحب سے کچھ کہا جسے سن کر والد صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور پھر مرزا صاحب نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی، مگر والد صاحب شدید غصے میں تھے۔ انھوں نے مجھے آواز دی میں فوراً اندر چلا گیا۔ والد صاحب نے کہا: "مرزا صاحب ہمیں خریدنا چاہتے ہیں۔ وہ محض ایک شرط پر تمھیں وظیفہ بھیجنے کو تیار ہیں اور وہ شرط ...."

"ہاں ہاں کہہ دو نا۔" جمن بھی سمجھ دار لڑکے ہے تمھیں اپنے بچے کی زندگی اور مستقبل کا خیال کر کے کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔" مرزا نے کہا۔

والد صاحب کا غیض و غضب بڑھتا گیا اور ان کے چہرے پر عجیب سی بے بسی اور تھکن کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ انھوں نے کہا: "بیٹا جمن! تمھیں اپنی خواہش پر عمل کرنے کا موقع حاصل ہے۔ تم اپنے خاندان کی تقدیر بنا سکتے ہو۔ مگر تمھیں اس کی قیمت اپنی انا کی بلی چڑھا کر چکانی

اور مجھے ایک نکمّی اور اپاہج لڑکی کو اپنی بہو بنانا پڑیگا بیٹا..... تم ہی سمجھ کر فیصلہ کرو۔ میرا تو دماغ کام ہی نہیں کر رہا ہے اس وقت ۔"

میں اس انوکھی شرط کو سن کر سُن ہو کر رہ گیا۔ اُف کیسی دنیا ہے جہاں ہر چیز کی تجارت ہے! تجارت ہی تجارت ..... میں نے والد صاحب سے کہا "ابا جان مجھے ہر حالت میں آپ کی خوشی مقصود ہے ۔" اور والد صاحب نے کسی اندرونی جوش کے تاثر میں آکر کہا "مرزا صاحب مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے ۔"

پھر اس کے بعد تقریریں ہوئیں۔ دستخط ہوئے۔ سب کچھ ہوا اور میرا خواب حقیقت میں بدل بھی گیا۔

لندن یونیورسٹی میں جب ڈیڑھ سال تعلیم حاصل کر کے انگریزی ادب میں ایم۔ اے ڈی لیٹ کے بعد بمبئی کی بندرگاہ پر اترا تو "تاج محل" کی بلی سرخیاں میری توجہ اپنی جانب منعطف کرائے بغیر نہیں رہ سکیں۔ مرزا دلاور بیگ کا خون کل رات میں ان کی کوٹھی پر کسی حیدر خان نامی شخص نے کیا۔ پولیس نے مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اب مجرم حوالات میں ہے۔ پولیس وجہ قتل معلوم کرنے میں سرگرم ہے ۔"

یہ خبر پڑھ کر میں وہیں چکرا کر بیٹھ گیا۔ میرے ہوش و حواس گم ہو کر رہ گئے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ والد صاحب ایسا خوفناک اقدام کر بیٹھیں گے۔ شاید اسی جوش نے انھیں مرزا دلاور بیگ کی شرط ماننے پر اُکسایا تھا۔ میں تھکے تھکے مضمحل قدموں سے گھر کی راہ لی۔ گھر ایک عجیب ماتم کدہ بنا ہوا تھا میرے گھر میں داخل ہوتے ہی والدہ صاحبہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ میرا ضبط صبر بھی تار تار ہو چکا تھا۔ میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا مگر امید بھی تھیں دل میں..... کتنی خواہشات کو لے میں بندرگاہ پر اترا تھا۔ اور خدا نے مجھے اپنے والد صاحب کی خدمت کا یہ موقع بھی نہ دیا۔ میں پیدائشی بدقسمت ہوں ماں، پیدائشی بدقسمت۔ میرے ابا جان ..... اُف میں کیا کروں ۔"

خوش ماں نے ہی اس وقت مجھے تسلی دی اور کہا "بیٹا غم کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ صبر کرو..... اب تو ہی سب کچھ ہے ہمارے لئے ۔" اور پھر میں خاموش ہو گیا تھا۔ ماں نے والد صاحب کی لکھی ہوئی چٹھی جو میرے نام تھی، لا کر دی۔

"بیٹا رحمٰن۔ خوش رہو۔

آج تم لوٹ رہے ہو۔ اور میں آج اپنی عزت کو لیئے جا رہا ہوں جو تمہیں اور مجھے اسیر بنائے ہوئے ہیں اور اس کے حصول کے لئے اگر مجھے مرزا کا خون بھی کرنا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے خاندان میں دلاور بیگ جیسے خاندان سے کوئی بہو آئے۔ میں اپنی آن کے لئے جان پر کھیل رہا ہوں۔ اور میں ہر قیمت پر بھی تمہارے مستقبل کو تابندہ و درخشندہ دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ احساس بھی مجھے مرزا ہی نے دلایا تھا۔ بہرحال تمہیں رکاوٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آج مجھ سے ضرور کسی کا خون ہو جائے گا۔ میں۔ تمہاری ماں، تمہاری بیوہ بہن اور سگی بچوں کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ آمین۔

تمہارا شفیق باپ ..... حیدر خان

مسعود! تم جانتے ہو اس چٹھی کو پڑھ کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اگر ماں نے اور میرے چند ساتھیوں نے مجھے تسلی دے کر روک نہ لیا ہوتا تو میں نے خود کشی کر لی ہوتی اور آج میں اس کالج میں نو سال سے بحیثیت پرنسپل کے کام کر رہا ہوں۔ اور والد صاحب کی رہائی میں صرف ایک سال باقی ہے۔ والد صاحب کی رہائی کے بعد ہی میں اپنی زندگی کے نئے موڑ کے متعلق سوچ سکتا ہوں ۔

میرے بدنصیب دوست تمنا کی تکمیل اسکی رہائی ہی میں مضمر ہے

بقیہ افسانہ صفحہ ۲۳ سے آگے

پیدا ہونے والا ہو گیا۔ میں رحمٰن کی الجھنیں صاف کر رہی تھی اور ناک اور آنکھ سوز رہے تھے میں سہارا لیتی ہوئی اوپر پہنچ گئی اور فرش پر لیٹ گئی تاکہ بستر خراب نہ ہو۔

اور مجھے یاد نہیں کہ بچے کے پیدا ہونے میں کتنا وقت لگا۔ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ اور تب میں نے جلد از جلد بچہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ اور جب بچہ پیدا ہو گیا تو میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے ان تمام تدابیر پر عمل کیا جن کا بوڑھی دایہ نے مشورہ دیا تھا۔

میں نے بچے کو بستر پر ڈال دیا۔ لیکن چند لمحات کے بعد پھر سخت درد شروع ہوا۔ اس سے میں بے ہوش ہو گئی اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کے سہارے لیٹ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک میں درد سے کراہتی رہی اور تب ایک اور بچہ پیدا ہوا۔ چھوٹا سا۔ اب ایک سے دو چھوٹے بچے پیدا ہو چکے تھے۔ مجھے ایک پونڈ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ بڑی مصیبت اور قربانی سے ہی ایک بچے کی پرورش ممکن تھی۔ اور دو بچوں کی ۔

میں پاگل ہو گئی۔ میرا دماغی توازن بگڑ گیا۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ میں نے ایک بچے کو سرہانے کے نیچے رکھ کر کچل دیا اور پھر میں بیہوش ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں بچے کے جسم پر اوندھی پڑی ہوں۔ دوسرا بچہ بھی اسی طرح مر گیا۔ تب میرا دماغ بالکل خراب ہو گیا۔ میں نیچے اتری اور باغ میں دونوں بچوں کی لاشوں کو دبا دیا۔ اس کے بعد میں ایسی سخت بیمار ہوئی کہ اس واقعہ کو چھپانا مشکل ہو گیا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اور سب راز فاش ہو گیا اور پھر پھانسی کی سزا ہو گئی۔ اور اب میں جناب! میں مجرم ہوں۔ آپ چاہیں مجھے سزا دیں۔ میں اعتراف گناہ کرتی ہوں۔ (رونا

ابریل ۱۹۵۲ء

مظفر حنفی ہسوی

مسلسل ناول

تارِ عنکبوت

تیسرا باب

لاش پر لاش

جانی نے جھک کے کہا "اس جانور کو ہلاک کرنا ضروری ہے۔ یہ خنجر اس کے ساتھ اسی کا پیٹ پھاڑ دیجئے۔ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ غریب سہم کر جانی کا پتا بتانے لگا۔ کسی انجانے خوف کی وجہ سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا آپ ہیں..... اس وقت کیسے تشریف لائے؟"

"چپ رہو۔" جانی نے اس کے جملے کو قطع کرتے ہوئے ڈانٹا۔ اس کی آواز اتنی سخت تھی کہ غریب لڑکے کے الفاظ منہ سے باہر نہ نکل سکے۔ راستے بھر ان دونوں میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ لڑکے نے ایک بار جانی کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ کسی بھیانک درندے سے زیادہ خوفناک نظر آرہا تھا۔ اس لئے بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

کار دھیرے دھیرے شہر کے باہر ویران مقامات کو پار کرتی ہوئی ایک بالکل سنسان جگہ پر ٹھہر گئی۔

"باہر نکلو۔" جانی نے حکم دیا۔

لڑکے نے پوچھا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔؟"

جواب میں ایک چمکدار چھوری جانی نے نکال کر دکھائی۔ لڑکے کی پشت میں چبھوتا ہوا ڈانٹ کر کہا۔ "باہر نکلو!"

لڑکا کانپتا ہوا باہر نکلا۔ فرار ہونے کی کوشش بے سود تھی۔ کیونکہ جانی نے اپنے فولادی ہاتھوں میں اس کی کلائیاں جکڑ رکھی تھیں۔

"چلو آگے۔" اس نے فرار کرنے سے آگے دھکیلا۔

وہ ایک گھنٹیا درجے کے ہوٹل میں پہنچے جہاں بہت سے آگ بگولہ قسم کے لوگ چائے پی رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی شخص ان لوگوں کی طرف توجہ نہ دیتا۔ جیسے اس قسم کے واقعات ان لوگوں کے لئے قطعاً اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ایک تاریک گوشہ کو پار کر کے دونوں ایک زینہ پر چڑھنے لگے۔ آخری سیڑھی طے کرنے کے بعد انہیں ایک اور زینہ نظر آیا۔ جانی نے لڑکے کو دھکا دے کر آگے بڑھا دیا۔

اندھیرے میں سے ایک دبی ہوئی گھگھیاتی آواز نے دریافت کیا "کیا تم اسے لے آئے ہو؟"

"جی ہاں صاحب!"

"پھر دیر کیا ہے؟" کرخت والے نے ڈپٹ کر کہا۔

لڑکا کچھ سمجھ نہ سکا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ تاریکی میں خوف سے دبکا ہوا کھڑا تھا۔ دوسرے لمحے جانی کا چاقو اس کے سینے کے پار ہو گیا اور وہ ایک جگر خراش چیخ مار کر فرش زمین پر لڑھک گیا۔

جانی جو لڑکے کے بے جان جسم پر جھک گیا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں اس تاریکی میں بھی کسی خونخوار جانور کی طرح چمک رہی تھیں۔ لیکن ایسی وہ کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ پیٹ پھاڑ کر پھر اس کی پیٹھ کو چیرتا ہوا سینے کے پار ہو گیا اور جانی بھی لڑکے کی لاش پر ڈھیر ہو گیا۔!

تاریکی میں ایک آواز نے دریافت کیا "کام ہو گیا عزیز؟"

"جی ہاں صاحب۔!"

"تمہیں معلوم ہے جواب کیا کرنا ہے۔؟"

"جی ہاں۔!"

اسی وقت ٹارچ کی روشنی اس لڑکے اور جانی کی لاش پر پڑی۔ ساتھ ہی ٹارچ والے کی کے ہاتھ کا سایہ بھی نظر آرہا تھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی کھردرے چہرے پر پڑی جو اس وقت حد درجہ بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔

"عزیز بٹا ٹارچ سنبھالو۔"

عزیز نے بڑھ کر ٹارچ لے لی۔ دوسرے آدمی نے جھک کر جانی کی لاش پر کچھ رکھ دیا۔ پھر اس نے لڑکے کے کپڑوں کے اندر بھی کوئی چیز رکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی کم و معدوم ہوتی ہوئی اور ایک تیسرے آدمی کا چہرہ اس تاریک کمرے میں ایک لمحہ کے لئے نظر آیا۔

——— وہ اور کوئی نہیں مشہور جرمی سراغ رساں ڈوڈو تھا ———

جرمی جاسوس کی نرغیل

جرمنی کے جاسوس ڈوڈو نے شمیم احمد سے کہا ہوا وعدہ وفا کیا۔ دونوں سراغ رساں پولیس کار میں بیٹھ کر سرکل اسٹریٹ پہنچے۔ ایک بڑے خوبصورت بنگلے کے پورٹیکو میں پہنچ کر کار رکی گئی۔ اترتے ہوئے ڈوڈو نے کہا۔

"تمہارا چڈی کا بٹلہ ہے مسٹر شمیم!"

تیسری منزل کے جھروکے میں جنہیں پڑی ہوئی تھیں شمیم نے دریافت کیا "کیا چڈی کی مجرد بھی ہیں؟"

——— (جاری ہے) ———

"اچھا ہاں!"

"کیا اس عورت سے اور کوئی کام کی بات نہیں معلوم کی جا سکتی —؟" شمیم اختر نے پوچھا

"نہیں —" ٹونٹو نے کہا — "وہ بے حد خوف زدہ معلوم ہوتی ہے چڑی کی موت سے اُسے سخت صدمہ پہنچا ہے —"

صامتے خفیہ پولیس کا ایک کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا شمیم اختر نے دریافت کیا — "کیا یہ آدمی آپ کا ہے —؟"

"جی ہاں —!" ٹونٹو بولا "سورج بہادر کی بیٹھ سے ہمیں اس مقام کی نگرانی کرنی پڑے گی — نمبر گیارہ!" وہ خفیہ پولیس کے اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا — "جا کر سورج بہادر کو تو بلا لا ذرا —"

"سورج بہادر!" وہ نمبر گیارہ ہکا بکا ہو کر بولا — "وہ تو صاحب! ابھی کچھ دیر قبل آپ ہی کے ہمراہ گیا تھا —!"

ٹونٹو کا چہرہ سخت ہو گیا — "کیا کہتے ہو احمق آدمی!" وہ غرا کر بولا — "میں تو کل سے اس مقام کے نزدیک نہیں آیا —"

نمبر گیارہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا — "صاف صاف بیان کرو واقعہ کیا ہے —؟" ٹونٹو پھر غرایا۔

"صاحب میں گیا عرض کروں —" غریب آدمی بولا "سورج بہادر ابھی نصف گھنٹہ پیشتر آپ کے ہمراہ ہی تو گیا ہے —!"

ٹونٹو کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ لیکن شمیم اختر نے اُسے روکا۔ "ناراض ہونے کی بات نہیں — ظاہر کوئی شخص آپ کے بھیس میں آ کر اُسے نکال لے گیا —"

"کیا تمہیں اس آدمی پر کوئی شک نہیں ہوا —؟" ٹونٹو نے نمبر گیارہ سے پوچھا۔

"نہیں صاحب!" وہ آدمی بولا — "اگر ایسا ہوتا تو میں آپ سے ضرور عرض کرتا۔ وہ بالکل آپ ہی تھے۔ تو پھر وہ شخص تبدیل ہیئت کے فن کا بادشاہ رہا ہوگا —"

سر ٹونٹو نے فوراً صاحب کمشنر پولیس کے نوٹ پر گھنٹی بجا کر کے تمام واقعہ سے انہیں مطلع کیا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ رنگون اور اطراف رنگون میں اس کی گرفتاری کے احکامات ابھی جاری کئے جا رہے ہیں۔

شمیم اختر اور ٹونٹو، چڑی کے بھنکا معائنہ کرنے لگے۔ بڑی سراغ رساں نے شمیم اختر کو وہ کمرہ دکھلایا جہاں چڑی کی لاش پائی گئی تھی۔ یہ بھی بتلایا کہ وہ کس حالت میں تھی۔ میزوں کی درازیں وغیرہ دیکھی گئیں لیکن سب خالی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں کی راہ سے کسی کی آمد کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ مکمل ڈیڑھ گھنٹہ تک وہاں معزز بچی کرنے کے بعد بھی وہ لوگ کوئی سراغ نہیں تلاش کر سکے جو اس راز پر روشنی ڈال سکے اور تب شمیم اختر کو سورج بہادر اور رشو بھانا تھیٹی کے تعلق کی بات یاد آئی۔

جوشی کا محیر صیغہ کافی مستعد تھا۔ ایک اور سوال تھا کہ آخر خفیہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سورج بہادر کو کون نکال لے گیا۔ جوشی جیسے نامی اور ذہین بدمعاش کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ لیکن سلیم کی رپورٹ تھی کہ وہ اس وقت قصبہ سنگم پور میں موجود ہے۔ ایک ہی شخص کا خواہ وہ جوشی ہی کیوں نہ ہو بیک وقت ہندوستان اور برما کے دو مختلف مقامات پر موجود ہونا ناممکن تھا۔

شام کو واپسی پر سیٹھ ترنڈی اس کے موکل نے کہا — "اختر صاحب! اب تو ہمیں کوئی امید نہیں ہے۔ ساری رقم ہم لوگوں کی مٹی میں مل گئی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کمبخت چڑی نے خودکشی کیوں کر لی۔ جب کہ اتنی لمبی رقم اس کے پاس موجود تھی —"

شمیم اختر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن سیٹھ کو سورج بہادر کے فرار کا حال نہیں بتایا۔ سیٹھ ترنڈی کے ساتھ شمیم اختر جب پلیٹ فارم پر آیا تو اسے ٹونٹو مل گیا اس نے اور اس روز دن بھر بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس نے شمیم اختر کو بتایا کہ آج دوپہر کے بعد شہر میں سے دو لاشیں برآمد کی گئیں اور دونوں کو پہچان لیا گیا۔ ایک تو چڑی بیک کا کلرک تھا اور دوسرا رنگون کا مشہور بدمعاش جانی —!

"کیا ان دونوں کی موت کا سبب بھی معلوم ہوا؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا —" ٹونٹو نے جواب دیا — "کلرک کی جیب میں سو سو روپے کے دس نوٹ پائے گئے ہیں۔ ایک یہ دیکھئے —"

اس نے شمیم اختر کے ہاتھ میں سو روپے کا ایک نوٹ تھما دیا جسے اس نے غور سے دیکھا اور پھر ٹونٹو کو واپس کر دیا اور پوچھا — "کیا یہ بھی خودکشی کی وجہ معلوم ہوتی ہے —؟"

"جی نہیں!" ٹونٹو نے کہا — "اس کی پیٹھ چھرا بھونک دیا گیا تھا اور عین چھرے سے اسے کیا گیا وہ زخم میں گھسا ہوا پایا گیا ہے۔ وہ جا چھرا تھا —"

"خیر —" شمیم اختر نے کہا — "اتنا تو معلوم ہوا کہ اس غریب کلرک کا قاتل جانی تھا۔ لیکن اسے کس نے قتل کیا —؟ میرا تو خیال ہے کہ جس شخص نے یہ سو سو روپے کے نوٹ کلرک کی جیب میں رکھے ہیں نے جانی کو قتل کیا ہے —!"

ٹونٹو خاموش مسکراتا رہا۔

اور اس کے مسکرانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ آج پہلی بار شمیم اختر کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک پُراسرار انداز پر مسکرانے کے بعد وہ بولا

"اگر میں آپ کو ایک ایسی چیز بھی دکھاؤں جو جانی کے پاس تھی تو —"

اس نے کوئی چیز اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھائی —

"تو ۔۔۔ شمیم اختر نے کہا "یہ تو سائنسر ہے کیا یہ آپ کو جاتی کی جیب سے ملا ہے ۔۔۔؟"

"بالکل میرے دوست!" ٹونو فاخرانہ بولا۔ "اور یہ سائنسر اس پستول میں فٹ بھی ہوتا ہے جو چنڈی کی لاش کے قریب پایا گیا تھا ۔۔۔!"

شمیم اختر نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کی ذہین اگر اور کوئی کرامانی شے ہے تو میں اسی ہیں رکنے کو تیار ہوں ۔۔۔"

"آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے ۔۔۔" سراغرساں ٹونو نے جواب دیا "اگر اور کوئی نئی بات علم میں آئی تو میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔ ازراہ کرم آپ بھی مجھے اپنی تفتیش کے انجام سے مطلع کیجئے گا۔"

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے

اس دن بڑی رات گزرنے پر شمیم اختر اپنے سفر سے لوٹ کر جمنا روڈ پر واقع اپنے فلیٹ میں پہنچا۔ وہاں اسے سلیم کا مختصر سا رقعہ ملا جس میں اس نے مطلع کیا تھا کہ جوشی کل سہ پہر گھنٹے اپنی قیام گاہ سے غیر حاضر رہا اس کی موجودہ قیام گاہ کا نام "شوبھا پیلس" ہے اس کے علاوہ سلیم نے دو چار سطروں میں اس مکان اور شوبھا سائیکل کمپنی کے بارے میں چند باتیں بھی لکھی تھیں۔

کئی قسم کے خیالات شمیم اختر کے دماغ میں آئے لیکن سوچا پھر کبھی سوچ لیں گے۔

سائیکلوں کا جاتی کے پاس پایا جانا۔

سوبھ بہادر کا چنڈی کے چنگل سے غائب ہو جانا

مین پلیس کی آنکھوں کے سامنے سے ۔۔۔۔۔

سوبھ بہادر ۔۔۔ جوشی ۔۔۔۔ جوشی کل چھ بجے گھنٹے اپنا قیام گاہ سے غیر حاضر رہا۔ کیا یہی ٹونو کے بھیس میں آکر سوبھ بہادر کو نکال لے گیا۔ پھر تو چنڈی کا قتل اس نے نہیں کیا کیونکہ سلیم کی رپورٹ کے مطابق اس دن وہ ہندوستان، بلکہ دہلی میں تھا ۔۔۔

اور ۔۔۔ جوشی کی بھی یہ ۔۔۔ اس کے لئے بھی کوئی کام ناممکن نہیں ہے ۔۔۔ سائیکلوں کے فریم ۔۔۔ سلیم نے لکھا تھا کہ فریم برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور پاکستان کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکیدار سپلائی کرتے ہیں۔ شوبھا کمپنی کے لئے ۔۔۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے پیرونی ممالک کی نسبت ہندوستان میں تو ان پرزوں کے تیار کرنے والے بڑے بڑے کارخانے اور ٹھیکیدار موجود ہیں جو بڑے سے فریم آسانی سے اور وہاں کئی بیک لئے اور پہیے سے ڈالے پیڈل ۔۔۔ تک سے فریم آسانی سے اور وہاں بھی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا ۔۔۔ دوسرے وہ تمام ممالک جہاں سے فریم شوبھا کمپنی کے لئے بھیجے گئے ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کا شکار ہو چکے ہیں ۔۔۔ لیکن چنڈی کے چنگل سے ان کا کیا تعلق ہے۔ کیا جوشی اب جرائم سے تائب ہو کر ایمان داری سے سائیکلوں کا کارخانہ چلا رہا ہے ۔۔۔؟ کیا آخر اس نے اپنا پرانا پیشہ ترک کر دیا ۔۔۔ عقل تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ سائیکلوں کے پرزے مختلف ممالک کے مختلف شہروں سے آتے ہیں۔ کوئی معمولی تاجر بھی پتا سکتا ہے کہ اس طرح سائیکلیں بنانے میں منافع نہیں ہو سکتا۔

شمیم اختر نے اپنے یہ بے ترتیب خیالات ایک کاغذ پر درج کر لئے اور پھر اسے سامنے رکھ کر یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے نیند آگئی۔ اگر اسے اس وقت اس بات کا ذرا سا علم ہو جاتا کہ سلیم اس وقت کس حالت میں ہے تو اس کی نیند حرام ہو جاتی ۔۔۔

بلیل و صیاد

جب دوسری بار فون کرنے پر بھی سلیم کو معلوم ہوا کہ ابھی شمیم اختر نگون سے واپس نہیں لوٹا تو اسے کچھ جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا دماغ سکون پر آگیا۔ اس نے سوچا کہ شمیم اختر کو ضرور کوئی ایسا اہم کام درپیش ہوا ہوگا جس نے اسے نگون میں رکنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جوشی کہاں تھا کسی کو پتہ نہیں۔ وہ کل سے غائب تھا۔ اور یہی اطلاع وہ شمیم اختر تک پہنچانے کے لئے بے چین تھا۔ اس نے سوچا کہ شمیم اختر یقیناً کل تک رنگون سے لوٹ آئے گا۔ اس وقت اس سے جوشی کی قیام گاہ تک پہنچنا چاہئے۔ اپنے پکڑے تبدیل کر کے وہ شوبھا پیلس کی طرف چل دیا۔ نصف گھنٹے کی چہل قدمی کے بعد وہ خوبصورت پیلس کی چہار دیواری تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک چکر لگایا۔ ہر طرف دیوار بارہ فیٹ بلند تھی جسے پار کرنا آسان کام نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی میں تاریکی کے سرمئی مرغولے ابھرنے لگے اور ستارے دکھائی دینے شروع ہوئے۔ دیوار کے چاروں طرف فاصلہ کم از کم ایک ایک میل ہوتا تھا۔ ایک خوفناک سناٹا طاری نظر آیا۔ لیکن وہ بند تھا۔ تالی میں انگلیوں سے ٹٹولی کہ اس نے ایک سوراخ کا پتہ چلایا اور اس پر کان لگا کر آہٹ لینے لگا۔ کچھ دور پر کسی ٹرین کی گڑگڑاہٹ کی سی آواز سنائی دی۔ شوبھا پیلس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور بارہ فیٹ بلند دیوار شوبھا پیلس کی حفاظت کر رہی تھی۔

سلیم کو یقین تھا کہ تاریکی رات میں اس کی حرکتوں کو دیکھنے والا کوئی متنفس وہاں موجود نہیں ہے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی سے اپنے ۔۔۔ کا جائزہ لیا اور پھر جیب سے کچھ نکال کر ایک سوراخ میں لگائی۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد وہ ۔۔۔ کھل گیا۔ لیکن سلیم کو پھر بھی مایوسی ہوئی کیونکہ ۔۔۔ میں اندھیرے زنجیر گھنی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے پر ایک ہلکا سا دھکا دیا۔ لیکن کواڑ ایک انچ سے زیادہ نہ کھل سکے۔ اس دروازے کی رکاوٹ کے جو دروازے کے تھوڑا سا کھلنے کی وجہ سے ہو گئی تھی، اس نے ٹارچ کی

روشنی اندر ڈالی۔ لیکن روشن دان سے کمرہ اندر سے کچھ
نظر نہ آتا تھا۔ اس نے کئی بار دستک دی۔ لیکن کوئی
جواب نہ ملا۔ اس کے پیر بھاری ہو چکے تھے۔ وہ
چپل کو پہنا نہ چاہتا تھا۔ اس کے بجائے وہ کمرہ کے
دروازے پر بیٹھ گیا۔ اسے کچھ شبہ ہوا اور اس نے اطمینان کے
لئے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اس سے بھی کوئی
نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب اس جانب سے اطمینان
ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھنے والا یہاں موجود نہیں۔

پھر اگلا قدم اٹھانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت
تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک اور بیکار چانس لینے کی کوشش
کرنے کے بعد کیوں نہ کام شروع کر دیا جائے۔ اس سے کوئی نہ کوئی
نتیجہ برآمد ہو گا۔ اس بار قسمت یاور تھی۔ اس کے
پیر کسی طرح دروازے پر جم گئے اور دوسرے لمحے سلیم
چھت کے اوپر پہنچ گیا۔ نیچے اترنے کی کوشش بات نہ تھی۔
صحن ایک طرف اور دوسری طرف کھڈ میں نیچے تھا۔ ہر طرف
ہر طرف سناٹا اور سناٹا طاری تھا۔ دور سے کچھ روشنی
نظر آئی۔ سلیم اس طرف بڑھا۔ لیکن ابھی اس نے پہلا
ہی قدم اس جانب اٹھایا تھا کہ کسی کے فولادی ہاتھوں نے
اسے تاریکی میں جکڑ لیا۔ سلیم کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اسے
گرفت میں لینے والے بڑی طاقت کے مالک ہیں۔

"تم اندر آنا چاہتے تھے دوست!" پیچھے سے
پکڑنے والے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کوئی بات نہیں
تمہیں مایوسی نہ ہو گی۔"

اس شخص نے سلیم کو بچوں کی طرح اوپر اٹھا کر
اپنی تمام تر طاقت سے زمین پر پٹک دیا اور سلیم کو ایسا محسوس
ہوا کہ اس کے اعضا ٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ
گئے ہیں اور وہ مر رہا ہے۔ اس شخص نے سلیم کو بے ہوشی
کے عالم میں اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور ایک طرف
چلا گیا۔

بدمعاش چور!

دوسرے دن جب سلیم اپنے کام پر نہیں آیا تو اس
کے ساتھی کام کرنے والوں کو تعجب ہوا۔ فرید جو سلیم کی نگرانی کرنے کے لئے آیا تھا۔ سلیم کو غیر حاضر پا کر
اس کے کام کی نگرانی کرنے لگا۔ سلیم کے ساتھی کاریگروں سے دریافت کیا۔

"وہ آج کہاں ہے — ؟"

"معلوم نہیں صاحب!" ایک کاریگر بولا۔ "آج
دکھائی نہیں دیا۔"

"کیا وہ اپنے کوارٹر میں بھی نہیں ہے — ؟"
فرید نے پوچھا۔

"وہ کل شام کو کہیں باہر گیا تھا۔ پھر واپس
نہیں آیا —"

"ہوں —!" فرید نے گردن ہلا کر کہا۔
"وہ واپس آئے تو مجھے دینا کہ حاضری سے متعلق
کر دیا گیا —"

فرید مڑا۔ تانگہ جا چکا تھا اور فرید جھنجلا کر اپنے
کام میں مشغول ہو گیا۔ چند ہی دنوں میں سلیم بھی فرید
سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔

کارخانہ بند ہو گیا۔ اس دن مالک کمپنی کسی کو نظر
نہیں آیا۔ شو بھا پیس جا کر کسی نے دریافت بھی نہیں کیا۔
کیونکہ وہاں داخلہ سخت ممنوع تھا۔

رات کو ایک بند گاڑی شو بھا پیس کے سامنے آ کر
رکی۔ اس میں کارخانے کے مالک شو بھا رام ٹھنڈے بیٹھا ہوا
تھا۔ اس کے ہمراہ ایک پر کشش حسینہ تھی۔ رات کی
تاریکی میں پرتی سائن بورڈ پر شو بھا سائیکل کمپنی کا کارخانہ
بڑے بھیانک پر جگمگا رہا تھا۔ مالک کارخانہ نے حسینہ
کے شانے پر ملائمت سے تھپکی دے کر اس طرف متوجہ کیا۔
حسینہ نے اسے پڑھ کر زیر لب تبسم ہو کر کہا۔

"جوشی ڈیر! ایک تم اس طرح کے ٹٹ پونجئے کارخانے
چلا کر بھی مطمئن ہو سکتے ہو۔ میں تو ایک دن سے زیادہ ایسے
غیر دلچسپ مقام پر ٹھہر نہیں سکتی —"

"میری پیاری جور —!" مالک کارخانہ نے جو
واقعی جوشی تھا۔ بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "کیا تم
جانتی ہو کہ میں نے سائیکل بیچا روپیہ خالص
سے کما رہا ہوں۔ مگر پانچ روپیہ فی سائیکل قیمت میں
بھی کر دوں تو امریکہ میں کوئی اس سے سستی سائیکل نہ
دے سکتا۔ آٹھ دنیا کے بڑے سے بڑے تاجر حیرت میں
ہیں۔ پہلے مجھے بھی علم نہ تھا کہ جاپان میں آٹھ آنا کا یہ
پاشیدہ ہے۔ آٹھ دنیا کے بہت سے ملکوں میں بہار
سائیکلوں کی مانگ ہے اور جب ایشیا کے ممالک میں
تو ان کے مقابلے میں کوئی دوسری سائیکل چل ہی نہیں سکتی
لیکن ہمارا اصل بیوپار نہیں ہے تم کو کیا اس بات
بخوبی علم ہے۔ ہم لوگ اپنی زندگی میں [illegible]
کر چکے ہیں کہ اب پیچھے لوٹ کر ایمانداری سے تجارت
کرنا ہماری فطرت کے بالکل خلاف ہے —"

"اگر واقعی اتنا نفع اس کارخانے سے متعلق
ہے تو سوچتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اسے بند کر دینا
مناسب نہیں ہے —"

"میں نے سوچ لکھا ہے" جوشی نے
پروگرام بتلایا۔ "کہ چند روز میں اس کارخانے
کے بہت سے شیئر بیچ ڈالوں گا۔ اس سے کروڑوں
کا منافع ہو گا۔ اور جس دن میں یہ کارخانہ بند کر دوں
اس دن کم از کم ایک آدمی کی صورت تو دیکھنے کے قابل
ہو گی —"

"وہ کون شخص ہے — ؟" عورت نے متعجب ہو
دریافت کیا

"جاسوس شمیم اختر —!"

"شمیم اختر!" عورت نے چونک کر کہا۔ "
ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گئی۔ کیا تم جانتے ہو
پرسوں شمیم اختر، نگوں میں ٹوکرے کے ہمراہ دکھائی دیا؟

جوشی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ہونے دو
سو یا ہزار کسی طرح اس کی تدبیروں کے سامنے ہیچ
ہو گیا۔ اے شمیم اختر کے فرشتے بھی نہیں معلوم کر سکے
"لیکن خوبصورت!" عورت نے کہا۔ "اس شخص

اتنا مجھے بھی نہ سمجھو۔"

"محمود میرا جان!" جوشی نے کہا۔ "تم کو شکر پر شفی کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس بار شمیم اختر خود فریفتہ ہو گیا ہے۔ لو تم آ پہنچے۔ اب مقابلے اور آزمائش ایک قسم شراب کی بوتل سے ہوگی۔"

اس کی بات کو شہ بھا پیس کی باؤ شنڈی میں حائل کرنے کے لئے جس شخص نے دروازہ کھولا۔ اسے اگر سیکریٹ سروس کا انسپکٹر مدن دیکھتا تو فوراً شناخت کر لیتا کہ یہ مشہور فتنہ پرداز منور ہے۔ سیکریٹ سروس کے دفتر میں اس کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

اُس رات شراب کی نئی قسم پی کر سونے سے قبل جوشی کی تمام مسرت پر پانی پھر گیا۔ اندر آ کر اس نے منور سے کہا۔ "ڈارلنگ! تمہارا کام کر دینے میں ذرا بھی آزاں۔ میرا عدم وجود ہی کوئی خاص بات ثابت نہیں ہوئی۔ منور! ہم شراب کی بوتل اور گلاس لا کر میز پر رکھو۔ کچھ میرے متعلق اور سنو۔"

تعظیم میں سر جھکا کر منور تعمیل حکم کے لئے رخصت ہو گیا۔ جوشی نے منور کی جانب گھورتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "تم اس کے بارے میں غور کر رہی ہو مورا! تقریباً دس بارہ سال کی ہوا کھائی ہے اور میرے ہاتھ میں ایسے ثبوت اب بھی موجود ہیں کہ جب چاہوں اسے بڑے گھر بھجوا سکتا ہوں۔ لہٰذا تم بے فکر رہو۔ آرام سے کوچ پر لیٹ جاؤ اور شراب سے لطف اندوز ہو۔ تمہاری نئی خواہش بھی یہی ہے۔"

پیار بھری نظروں سے حور کی جانب دیکھ کر مسرور اور گنگناتا ہوا وہ اپنے دفتر کی طرف چلا گیا اور ایک میز کے پاس بیٹھ کر منور کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آخر الذکر کمرے میں آ گیا۔

"ہاں منور!" جوشی نے کہا۔ "کوئی تازہ خبر ہے؟"

"یس باس۔"

"ہیں!" جوشی نے چونک کر کہا۔ "کیا بات ہے؟"

موہن سنگھ نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"وہ رات کو دیوار پھاند کر اندر آ رہا تھا۔"

"کس لئے۔۔۔؟"

"یہ ابھی معلوم کر سکتے ہیں۔ وہ کارخانے کا ایک کاریگر ہے۔ نام ہے اوتار علی۔"

"اور کچھ۔۔۔؟"

"اس کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا۔ ٹارچ اور پستول ملا ہے۔۔۔"

جوشی کا چہرہ کرخت ہو گیا۔

"چلو میں دیکھتا ہوں کس کی موت نے آواز دی ہے۔" وہ دونوں کمرے سے باہر کے اور ہال کو پار کر کے ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ جہاں موہن سنگھ بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہا تھا۔

"دروازہ کھولو موہن!" جوشی نے حکم دیا۔ "اس آدمی سے کچھ معلوم ہوا۔؟"

"جی نہیں۔" موہن نے جواب دیا۔ "اس نے تو جیسے بولنے کی قسم کھائی ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک بہت تنگ اور حبس کمرہ تھا۔ اندر چارپائی پر ایک آدمی پڑا تھا جس کے ہاتھ پیر رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور منہ پر کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ جوشی کا اشارہ پا کر موہن نے اس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔ جوشی اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا اور آخر اُسے یاد آ ہی گیا کہ وہ اس آدمی کو اس سے پہلے کہاں دیکھ چکا ہے۔ اس کا چہرہ کرخت ہو گیا اور آنکھیں شعلہ جوالہ کی طرح سرخ ہو کر چمکنے لگیں۔

"اچھا یہ تم ہو۔۔۔" اس نے گرج کر کہا۔ "مجھے بھی اکثر تم لوگوں کی یاد آتی رہتی تھی۔"

منور اور موہن سنگھ کے چہرے کھل گئے۔ کیوں کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ جسے وہ گرفتار کر کے لائے ہیں وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔

جوشی نے منور سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کارڈ میں اس کا کیا نام درج ہے۔۔۔؟"

"اوتار علی۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ یہ ہمارے کارخانے میں کتنے دن سے کام کر رہا تھا۔۔۔؟" موہن سنگھ میں تمہاری اس کارگزاری سے بہت خوش ہوں۔ تم جانتے ہو یہ کون پر معاش ہے۔ یہ ذرا قریب آ کر غور سے اس کا چہرہ دیکھو۔ شمیم اختر کے اور کچھ سمجھ میں آتا ہے۔۔۔"

جوشی نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔۔۔!

عادل رشید نمبر

ہند و پاکستان کے مقبول ترین اور عظیم ترین ادیب جناب عادل رشید صاحب کی ادبی خدمات اور فنکارانہ کو خراج عقیدت کے طور پر ماہنامہ الماس، لکھنؤ پیش کرتا ہے مارچ ۱۹۶۳ء کے اختتام پر جلوہ فگن ہو رہا ہے۔ جس میں ہند و پاک کے مشاہیر قابل قدر فن کار حصہ لے رہے ہیں ——— اپنی کاپی آج ہی مخصوص کرا لیجئے۔

منیجر ماہنامہ الماس۔ لکھنؤ

طرحی مشاعرہ نمبر ۱۵

مصرع طرح

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

غزل کے ساتھ قوی کی انعامی مشاعرہ یا اس کے متبادل چار آنہ کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں۔

مہمان شاعر اعظم

حضرات

مولانا ابر احسنی گنوری

شفا گوالیاری

مقصود نشتری۔ اندور

باغی محبت ہوں خطاکار نہیں ہوں
ہاں ان کی نگاہوں میں گنہگار نہیں ہوں

اپنوں سے ہے جو کچھ گلا ہے یوں کہتے ہیں ہنس کر
غیروں سے تو آمادۂ پیکار نہیں ہوں

ہے میری نگاہوں میں نہاں حسن کا جلوہ
میں بندۂ الفت ہوں طلبگار نہیں ہوں

ہر چند کہ کچھ راز محبت سے ہے قربت
ہوں واقف فن واقف اسرار نہیں ہوں

اے اہل چمن مجھ کو حقارت سے نہ دیکھو
میں زینت گلشن ہوں کوئی خار نہیں ہوں

یا فیض خدا ہے کہ بندوں میں ہے عزت
فن کاروں کا خادم ہوں میں فن کار نہیں ہوں

تعظیم نہیں کیسے گنہگار ہو گیا سرزد
دانستہ تو مقصود گنہگار نہیں ہوں

شریف گوالیاری (بھوپال)

مانا ہی تھے میں بندوں کا حقدار نہیں ہوں
کیا آپ کا میں طالب دیدار نہیں ہوں

ہنگام ہے اک تازہ ستم تازہ مصیبت
کچھ بھی ابھی میں جان سے بیزار نہیں ہوں

ساقی تو مری سمت نظر کر کچھ ابھی نہیں ہے
میں پی کے بہک جاؤں وہ میخوار نہیں ہوں

قربان کئے ایک اشارے پہ دل و جاں
پھر بھی یہی کہتے ہو وفادار نہیں ہوں

ہے ان کے دو نازک کا ہر لحظہ تصور
بت خانے کا کعبہ کا طلبگار نہیں ہوں

تحریر حقیقت پہ یقیں رکھتا ہوں ہمدم
تصویر خیالی کا پرستار نہیں ہوں

ساقی نے پلائی ہے شریف ایسی ادا سے
ہشیار بھی ہوں اور میں ہشیار نہیں ہوں

محمود نشتری۔ اندور

حالات سے ہمدست ہوں بیزار نہیں ہوں
میں عارضی خوشیوں کا طلب گار نہیں ہوں

دیکھا بھی کہاں تم نے ابھی عزم محبت
جذبات میں کچھ ہو وفادار نہیں ہوں

یہ میری ہی دل ہے جو طرف دار ہے سب کا
اور میں ہوں کہ اس دل کا طرفدار نہیں ہوں

دنیا کی نگاہوں میں میں پابند وفا ہوں
گو آپ کی نظروں میں وفادار نہیں ہوں

دشمن بھی تباہی سے مری شاد نہ ہوں گے
میں اتنا زمانہ پہ ابھی بار نہیں ہوں

میں دل کا غنی ہوں مجھے مفلس نہ سمجھنا
زر سے مجھے نسبت نہیں زردار نہیں ہوں

محمود محبت میں یہ عرفان ہے حاصل
دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

شہرت میرٹھی۔

دنیا سے محبت ہے میں ہشیار نہیں ہوں
اک خواب کے عالم میں ہوں بیدار نہیں ہوں

نظریں تری رحمت پہ ہیں او بخشنے والے
میں یہ نہیں کہتا کہ گنہگار نہیں ہوں

میں کام کی شے ہوں مجھے کچھ کام میں لاؤ
ہر سانس یہ کہتے ہیں بے کار نہیں ہوں

عقبیٰ کی مجھے فکر ہے عقبیٰ سے غرض ہے
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

مجھ سے نہ کچھ مجھ سے نہ دامن کو بچاؤ
میں چاہنے والا ہوں کوئی خار نہیں ہوں

یہ رنگ زمانہ ہے یہ تقدیر کی خوبی
میں خود کو مٹا کر بھی وفادار نہیں ہوں

وہ دیکھ لیتے ہیں نگاہوں کو اٹھا کر
صد شکر کہ نظروں پہ ابھی بار نہیں ہوں

علامہ بیباک ٹکمگڈھی

الفت میں کسی کی جو گرفتار نہیں ہوں
بے موت بھی مرنے کو میں تیار نہیں ہوں

رہتے ہوئے محفل میں پریشان نہیں ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

سو بار کہا تم مری صورت پہ نہ جاؤ
شاعر ہوں میں شاعر جو پرستار نہیں ہوں

جو کچھ کہ زباں پر ہے وہی دل ہے میرے
اے دوست تمہاری طرح مکار نہیں ہوں

یہ چاہتا ہوں شب و روز ترقی کی دعائیں
لیکن یہ غلط ہے کہ طلبگار نہیں ہوں

ملت سے ہوں بیباک میں بیمار محبت
گو "شعلۂ بیتاب" کا طرفدار نہیں ہوں

نازک احسنی شکوہ آبادی

دنیا یہ سمجھتی ہے میں بیمار نہیں ہوں
منصور کا قائل ہوں سردار نہیں ہوں

میں گوشۂ بیچاں کا طرفدار نہیں ہوں
ہر چند کہ اس در کا خطاکار نہیں ہوں

نظروں میں ہے تعمیر کا تخریب کا منظر
میں فتنہ و نگار در و دیوار نہیں ہوں

ہوں زیر فلک رشک وجود سر و اختر
صد شکر کہ دنیا پہ گراں بار نہیں ہوں

ہر چند کہ نظروں میں مری یار ہے دنیا
رہتا ہوں نگاہوں میں تری خار نہیں ہوں

رشک و گل و غنچہ ہے چمن میں مری ہستی
جو اتنا سمجھ لے کہ میں بے کار نہیں ہوں

دنیا کے لئے ہستی ناکارہ ہے اس کی

گلشن میں بھی نازک نہیں گلشن کی تمنا
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

کیا ہم سے بھی کہیں گے کہ غیر وفادار

کیا ہجر میں اب اور دل افگار نہیں ہوں
کیا اس کی نہیں مجھ کو خبر تحفہ نہ ہو گا
دیتا نہیں تو مجھ کو نہ دے زہر ہی دیدے
اس سے کہ دل میں ترک تعلق ادا سے تو یہ
بیگانہ ہوں کیا میں غم شام و سحر سے
بہتر وہ طوفان حوادث ہوں میں ہم
عنا ہے کہ غم اس میں بھی اک کیف مسرت
حامد صحرائی سکیچ ۔ ایم پی

یہ کس نے کہا ہے کہ وفادار نہیں ہوں
جچتی ہی نظر میں نہیں دنیا کی کوئی شے
بیدار بھی آخر یہ کسی روز تو ہو گی
مجھ کو تو خدا ہی کے کرم پر ہے بھروسا
دنیا کی ستائش سے میں رہتا ہوں گریزاں
آغاز تو الفت کا ہے اے دل بہت اچھا
راضی بہ رضا بیٹھا ہوں اک گوشہ میں حامد
تسخیر احمد بھی ادا جعفری (دیوبند)

صد شکر کہ محزون غم یار نہیں ہوں
کیا طرفہ تماشا ہے طبیعت مری ہمدم
ممکن ہے فرشتہ ہو وہ انسان نہیں ہے
اٹھاتی مجھے آنکھوں سے پلائے تو پلا دے
کرتی ہے کشش اپنے ہی نظارہ میں پیدا
فرماتے ہیں وہ مجھ کو مٹا کر یہ مجھی سے
رائی سلطان پوری۔ احمد آباد

یہ راز بتانے پہ میں تیار نہیں ہوں
ساقی مری جانب نہیں کیوں اٹھتی نگاہیں
غم پا کے ترا دوست میں محزون بہت ہوں
کیوں مجھ سے وہ دامن کو بچاتے ہیں صنم گر
جیسا ہو کوئی وہ نہ سمجھ لے سکے دانی
نظام الدین ضیغم سلطان پوری
میں طالب دیدار ہوں بیمار نہیں ہوں

اس پر بھی وہ کہتے ہیں وفادار نہیں ہوں
تیرے لئے رسوا سر بازار نہیں ہوں
اٹھ جائوں ترے در سے وہ بیچارہ نہیں ہوں
اس کے لئے اے دل کبھی تیار نہیں ہوں
کب جام محبت سے میں سرشار نہیں ہوں
سچا یہ ہے کہ ساحل کا طلبگار نہیں ہوں
غم ہائے زمانہ سے میں بیزار نہیں ہوں

ہرگز میں ترے جور سے بیزار نہیں ہوں
دنیا کی کسی شے کا خریدار نہیں ہوں
سوتی ہوئی قسمت سے میں بیزار نہیں ہوں
بندے سے کسی شے کا طلبگار نہیں ہوں
دنیا کی ستائش کا طلب گار نہیں ہوں
انجام سے لیکن میں خبردار نہیں ہوں
میں عشق و محبت میں ہوس کار نہیں ہوں

لبخند غم دوراں سے سبک بار نہیں ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
دعویٰ مجھے یہ ہے میں گنہ گار نہیں ہوں
میں جام و سبو کا تو طلب گار نہیں ہوں
اب آپ سے میں طالب دیدار نہیں ہوں
دیکھو میاں تم بھی میں جفا کار نہیں ہوں

کیوں عیش و طرب تیرا طلبگار نہیں ہوں
کیا میں ترے میخانے کا میخوار نہیں ہوں
اب اور کسی غم کا طلب گار نہیں ہوں
میں اس کی نگاہوں میں اگر خوار نہیں ہوں
میں نے بھی سمجھا کہ میں حقدار نہیں ہوں

سائل وہ دعاؤں کا طلب گار نہیں ہوں

دم بھرتے تھے جو لوگ کبھی میری وفا کا

دیکھو تو مری جرأت رندانہ کو حسرت
خدا چھپتے رہتے ہیں غریبوں کے جو انسان
اس شوخ کی نظروں کا جو پیغام سمجھ لوں
محمد امین شرر سلطان پوری

ہر حال میں انسان سے ہوتی ہیں خطائیں
اظہار محبت پہ خفا ہوتے ہو ناحق
اس نور مجسم کی ضیا چاہئے مجھ کو
الفت میں روا رکھتے مجھے عذر نہیں ہے
ہر وقت رہا کرتا ہوں مشتاق زیارت
فروغ اچھنیروی۔

یہ کس نے کہا تیرا طلب گار نہیں ہوں
احساس تو ہوتا ہے ستم کا مجھے لیکن
اے موت یہ ممکن ہے چلے آئیں وہ اب بھی
کیا ان کی گلی بھی نہیں تقدیر میں میری
مشکل ہے فروغ اب تو غم دل کا ادا دا
الطاف انصاری سلطان پوری

نا ترى الفت میں گرفتار نہیں ہوں
اندازہ مرے ظرف کا تم اس سے لگا لو
یا آپ کے انداز توجہ میں کمی ہے
اچھا مجھے سمجھو کہ برا آپ کی مرضی
طالب ہوں اے الطاف فقط ان کے کرم کا
صدیق شبنم شکوہ آبادی

مانا کہ بظاہر میں طلب گار نہیں ہوں
نظروں میں کبھی کی میں خطاوار نہیں ہوں
اب آپ ذرا چہرے پہ زلفیں تو گرا دیں
بکھری ہوئی زلفوں میں کشش پاتا ہوں لیکن
شبنم یہ کہتی ہے مرے قلب کی دھڑکن
شیخ سلیم سوزنی

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
یعنی مجھ کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو

اب اس کی نگاہوں میں وفادار نہیں ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
انسان انہیں کہنے کو میں تیار نہیں ہوں
ضیغم ابھی اتنا میں سمجھدار نہیں ہوں

کس منہ سے کہوں میں کہ گنہگار نہیں ہوں
دانستہ میں آمادۂ تکرار نہیں ہوں
خورشید و قمر کا میں طلب گار نہیں ہوں
میں ظلم و ستم سے کبھی بیزار نہیں ہوں
کہہ کر کہوں میں طالب دیدار نہیں ہوں

جینے سے تری یاد میں بیزار نہیں ہوں
شکووں کے لئے آپ سے تیار نہیں ہوں
چلنے کو ترے ساتھ میں تیار نہیں ہوں
جنت کا تو یارب میں طلبگار نہیں ہوں
خود کہہ گئے وہ میں ترا غم خوار نہیں ہوں

لیکن غم الفت سے بھی بیزار نہیں ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
یا آپ سے میں قابل گفتار نہیں ہوں
میں آپ کے دل کا کوئی مختار نہیں ہوں
میں اور کسی شے کا طلبگار نہیں ہوں

یہ کس نے کہا ان کا خریدار نہیں ہوں
یہ وہ بھی سمجھتے ہیں گنہ گار نہیں ہوں
پھر دیکھئے میکش ہوں کہ میخوار نہیں ہوں
ہر زلف پریشاں کا خریدار نہیں ہوں
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

میں جھوٹی مسرت کا طرفدار نہیں ہوں
گو زیست ناچیز ہوں بیکار نہیں ہوں

ہوں تیری عطا کی ہوئی نعمت کے سہارے
میں جور و ستم سے کبھی بیزار نہیں ہوں

نادار ہوں مفلس ہوں مگر خوار نہیں ہوں
میں ان کی نظر پہ تو کبھی بار نہیں ہوں

پھر مجھ کو سلیم ان کی نگاہوں نے پکارا
میں جن کی نگاہوں کا طلبگار نہیں ہوں

اسماعیل ذبیح مالیگانوی

میں یہ نہیں کہتا کہ خطاوار نہیں ہوں
رحمت کی نگاہوں میں گنہگار نہیں ہوں

جب کہتا رہتا ہوں شب و روز تقاضے
پھر کیسے کہوں اس سے طلبگار نہیں ہوں

جب مجھ پہ ترا لطف و توجہ کی نظر ہے
بیکار بھی ہوتے ہوئے بیکار نہیں ہوں

پیدا مجھے اپنے ہی کہیے میں جگہ دے
واللہ میں جنت کا طلبگار نہیں ہوں

ساقی جو پلا دے تو آنکھوں سے پیوں گا
پیمانہ سے پینے کو میں تیار نہیں ہوں

محمد علی شرافت جوہر کوٹاری

تقدیر پہ تو مجھ کو بھروسہ ہے الٰہی
کرتا ہوں گنہ پھر بھی گنہگار نہیں ہوں

قربان ہوا جاتا ہوں دن رات وطن پر
میں دیس کے دشمن کا طرفدار نہیں ہوں

سو جان سے ہو جاؤں فدا دیس پہ اپنے
جعفر کی طرح دیس کا غدار نہیں ہوں

روتا ہے لہو دل مرا دنیا کی روش پر
دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

دیکھا ہوں میں احساس جگر بیچنے میں اپنے
انسان ہوں کوئی اینٹ کی دیوار نہیں ہوں

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
گلشن میں ہوں گلشن کا روادار نہیں ہوں

کیوں ہو کے رہوں منت حاتم کشی دنیا
اچھا ہوں اگر میں تو وہ بیمار نہیں ہوں

ہوں خندہ بہ نوش مرا ظرف ہے عالی
جلتی کہ بھڑک اٹھے وہ انگار نہیں ہوں

دنیا کی سمجھتی ہے وہی مجھ کو ازل سے
مے کش نہیں میں رند قدح خوار نہیں ہوں

رہبر اجنیوری

دنیا نہ ہے نہ کسی کے کس کا سہارا
در اصل میں اپنا بھی مددگار نہیں ہوں

مرنا ہی جب ان پر ہو مرا مقصد ہستی
پھر کس نے کہا ان کا طلبگار نہیں ہوں

اپنی ہی خوشی سے نہیں یہ مجھ کو فرصت
میں حسن جہاں تیرا خریدار نہیں ہوں

یہ مان لیا میں نے گنہگار ہوں تیرا
پر اتنی سزا کا بھی سزاوار نہیں ہوں

نوٹ شعلہ و شبنم انعامی مشاعرہ نمبر ۵۲
غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء
مصرعہ طرح ہے مفہوم آدم نہیں ہے۔ آدم، غم قوافی۔ نہیں ہے ردیف
نام ... ...
پتا ... ...

ادب میں اعلیٰ و مستند قدروں کا ضامن

شعلہ و شبنم

اپنی انفرادی رعنائیوں، سحر طرازیوں اور روایات کے ساتھ پیش کرتا ہے

سالنامہ

شعلہ و شبنم کے اس خصوصی ضخیم نمبر میں اردو کے شہرۂ آفاق و مستند قلمکار شرکت فرما رہے ہیں۔
سالانہ خریداروں کی خدمت میں یہ ضخیم نمبر گرانی شمارہ مفت پیش کیا جائے گا۔ اگر آپ بھی سالانہ خریداری قبول فرمائیے تو یہ عدیم المثال نمبر مفت پیش کیا جائے گا نیز قلم کاروں کے فوٹو بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ آپ بھی اپنا فوٹو شائع کرانا چاہتے ہیں تو اولین فرصت میں مطلع فرمائیے

آج ہی اپنی کاپی مخصوص کرا لیجئے۔ ایجنٹ صاحبان اپنا آرڈر بواپسی ڈاک بھجوائیں۔

منیجر ماہنامہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی ۶

ہر انجمن کل ہند مشاعرہ بھی

شاعر دہلی

زرسالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

مئی
۱۹۶۳ء

جلد ۱۴
شمارہ ۵

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں دلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصۂ نظم
حضرت مولانا ابر احسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر:-
بمل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	نذر رضا مرحوم	مفتوں کوٹوی	۴
۲	اپنی محفل اپنے دوست	مختلف خطوط	۱۰
۳	نذر عقیدت بخدمت ابر احسنی	حسن ریاضی	۱۱
۴	دو غزلیں	طرفہ قریشی ناگ پور	۱۲
۴	"	فخر مرزا ناگ پوری	۱۲
۵	انکار	کوثر بدری اعظمی	۱۳
"	"	میکش ناگ پوری	۱۳
۶	انتباہ	شباب ملت ایم۔اے	۱۳
۷	جلال و جمال	مظہر رتلامی - پیرزادہ اقبال بیجاپوری	۱۳
"	"	کاوش مہدی بھاگلپوری - ماہر منگن گھاٹی	۱۴
۷	"	سید عبدالحنان نسیم جلیلپوری - معین طالب جوہریاں	۱۴
۸	دل کی آواز	عادل رشید	۱۵
۹	خاموش چہرے (رباعیاں)	مترجمہ روشن بیاوی	۱۶
۱۰	تار عنکبوت	مظفر حنفی بھوپی	۱۹
۱۱	طرحی مشاعرہ نمبر ۲۰ (مختلف شعراء کرام)	مرتبہ ناظم مشاعرہ حضرت شفا گوالیاری	۲۹
۱۲	قطعات	خرد غوث پوری -	

مطبع: ہمدرد پریس دریبہ کلاں دہلی سے چھپ کر دفتر شاعر دہلی سے شائع ہوا

راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر

نذیر رضا مرحوم

مشہ شبنم کے شمارہ ماہ جنوری ۱۹۶۲ء میں مورخ آنند باراوی کا مضمون بہ عنوان "وکیل صاحب" بتنا مرحوم پر نظر سے گزرا۔ مورخ محترم نے اپنے تاثرات کا اظہار اپنے انداز میں کیا ہے مرحوم واقعی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کی عام قبولیت و ہر دلعزیزی اس امر سے واضح ہے کہ وہ وکیل کے لقب سے کم اور "بھیا" کے لقب سے زیادہ مشہور رہتے۔ ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ کسی قضیہ کو حل کرنا ہو تو وکیل صاحب سے مشورہ کرو۔ ان کے آباؤ اجداد کوٹہ ہی کے باشندے تھے۔ ان کے موروثی مکانات اب بھی کوٹہ ہی میں ہیں۔ سلسلۂ مساعی یعنی وکالت انھوں نے باراں میں شروع کی اور یہیں کے ہو رہے۔

ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے وہ اطراف و اکناف میں اچھی شہرت کے مالک تھے۔ ذہانت و شہرت کے باعث ہی انھیں اوائل عمری سے جانتا تھا لیکن ان کی انسانی، اسلامی، اخلاقی اور ادبی حیثیت سے میں برابر متاثر ہوا۔ ان متفرق کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید کچھ یاد رہ سکے۔

۱۹۳۸ء-۳۹ء کا واقعہ ہے۔ میں سلسلۂ حضرت امیر قیلولت تھا۔ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں باراں سے وہاں پہنچے۔ غریب خانہ پر کھانا کھانے لگے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھا۔ دوسری مرتبہ جب پیشی پر پہنچے، ساتھ میں بہت سے بسکٹ، بچوں کی مٹھائیاں وغیرہ لیتے گئے۔ مجھے علم نہ ہو پایا اور انھوں نے یہ سب سامان گھر پہنچوا دیا۔ شام کو واپس باراں چلے گئے۔ دوسرے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ باراں کے وکیل صاحب کے نام سے ایک شخص یہ چیزیں بچوں کو دے گیا ہے۔

اسی زمانہ میں "بھیا" کے زیر اہتمام باراں میں سیرۃ النبی کا جلسہ بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ بہت سے موری صاحبان باہر سے بھی مدعو تھے۔ میں بھی اڑد سے باراں اس جلسہ میں شریک ہوا تھا۔ کافی بھاری اور گرم جوشی سے اس جلسہ کا اہتمام و انتظام کیا گیا تھا۔ ایک دو مولوی صاحبان نے اپنی تقریروں میں نیک اعمالیوں اور خوش گوار دلیلوں پر عطائے جنت کا دعوہ اور پھر جہنم کی آماجگاہ و نار بائیکاٹ کا تذکرہ چھیڑا تھا۔ اگلے مولوی صاحب کو مدعو کئے جانے سے پیشتر بتایا گیا اور کہا گیا کہ ایسے موضوع اکثر و بیشتر سنتے ہی رہتے ہیں۔ مناسب رہے گا کہ اس موقع پر سیرت پاک کے وہ نقوش و نگار پیش کئے جائیں، جو ہماری معاشرت کی اصلاح و فلاح اور عمل و حرکت و توانائی میں مشعل راہ بنیں۔ بالخصوص حصول علم کی ترغیبات پر ہماری توجہات مرکوز کی جائیں۔ ہمیں سے فاضل مقرر نے انداز گفتگو نے پسند کیا اور انھیں موضوعات و عنوانات پر روشنی ڈالی جانے لگی۔

سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

معاشرتی زندگی میں وہ تعلیم تربیت کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنے تجربات کو اس خوبی سے پیش کرتے رہے۔ جدید اسلامیہ باراں انھیں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اس مدرسہ کا نظم و نسق سر سید مرحوم کے مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی نظم و نسق سے مستعار ہے۔ جس میں تمام مصارفوں کو ذمہ دار اصحاب کا عاملہ بنایا گیا تھا۔ مدرسہ کا بیت المال ہے۔ خزانچی علیحدہ، ہر بیٹ کے ممتحن علیحدہ ہیں۔ ہر سب کمیٹیاں ہیں تقسیم کار کا یہ انداز معاشرہ کی صلاحیتوں سے مستفیض ہونے کا بھی پہلو لئے رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ہر فرد کو احساس ذمہ داری سے بھی گراں بار کرتا ہے اس مدرسہ سے ملحقہ ایک بڑی لائبریری ہے، جس میں ہر شعبۂ علم کی کتابیں ہیں اور ہر سال تازہ بتازہ کتابیں خرید کی جاتی ہیں۔ اسی مدرسہ کے وقت جامعہ اردو کے امتحانات کا سینٹر بھی قائم ہے۔ مرحوم کو باراں کا کہنا کچھ ہے جانتے ہیں۔

صاحب اولاد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے کئی مستحق طلبہ کو مروجہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا۔ ماسوا اس شبیر باراں کے قنوطی قطعہ کا یہ شعر ہے ؎

ہے سہاروں کا، بیتیوں کا سہارا اجمل با
پائے بیواؤں پہ جو تھا مہرباں، جاتا رہا

حقیقت پر مبنی ہے۔ تقریباً ۱۵ طلبہ کا خرچہ

اس نے کچھ نہیں کہا۔

وکیل احمد علی خاں شاد اور بھیا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک سائل آیا۔ احمد علی خاں شاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ ہاتھ جیب ہی میں رہ گیا۔ بھیا نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ۱۰۰ روپے کا نوٹ ہاتھ میں آیا۔ وہ انھوں نے دے دیا۔ سائل چلا گیا۔ وکیل احمد علی خاں نے کہا بھیا دو روپے کا بھی نوٹ میرے پاس تھا۔ بھیا نے کہا پھر وہ کیوں نہیں مرا؟ کہنے لگے آپ کا سا دل کہاں سے لاؤں؟ میں صرف چونی دیا چاہتا تھا وہ میرے ہاتھ نہیں لگی۔ اس لئے ہاتھ جیب ہی میں رہ گیا۔ بھیا ہنس پڑے۔

۱۹۵۲ء میں مدرسہ اصلاح میں باراں کا سالانہ جلسہ تھا۔ بچوں سے زبانی تقریریں اور نظمیں سنائی جا رہی تھیں۔ تقسیم انعام کے بعد حبیب بھیا تقریر کرنے اٹھے تو تقریباً پون گھنٹہ گرامی تقریر کی تین پرجوش کو لوگوں کے اصلاحی و تعلیمی جذبات کافی ابھر گئے۔ جب چندہ کے لئے انھوں نے دامن پھیلایا تو دیکھتے ہی دیکھتے کافی روپیہ اکٹھا ہو گئے۔ دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ خدا اس ناخدائے قوم کو تا دیر سلامت رکھے۔ یہ واقعہ آزاد باغبانی کے اس تعزیتی قطعے پر مجھے یاد آیا ؎

وہ جوش سے بھری ہوئی تقریر اب کہاں
تقریر بھی اگر ہو تو تاثیر اب کہاں
وہ دیکھتے ہی دیکھتے گنتے روپوں کا ڈھیر
اے دوست وہ دماغ وہ تدبیر اب کہاں

ایک مرتبہ اسی مدرسہ اصلاح میں کی جنرل میٹنگ تھی۔ صدر کا انتخاب بغیر خود تھا۔ نظریں بھیا پر مرکوز تھیں وہ سمجھتے تھے کہ اب کبھی اور کو صدارت کا موقع دیا جائے لوگ مصر تھے کہ صدر آپ ہی کو رہنا ہے۔ بھیا نے کہا نہ ذمہ داری اور جدید دور کی مستعد شخصیتوں میں تقسیم ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی یہ شعر بھی پڑھا ؎

قم مقاعدت دہر ہنوز بر سمن
میرا کیا ہے رہا نہ رہا

یہ شعر سن کر دل ہل ہی گیا کہ خدا نہ کرے یہ پیشین گوئی صحیح ہو۔ ورنہ اس قومی ادارہ کا کیا بنے گا؟

۱۹۵۱ء میں ماہنامہ دل قیمتات تھا۔ ...

... سوز زیادہ نہیں پایا تھا۔ نہ شاید انھیں میری ادبی وابستگی کا علم تھا۔ نہ میں احمد علی خاں شاد بھیا کے پسندیدہ اشخاص اور خصوصی احباب میں سے ہیں یہ مقدمات کی پیروی کے سلسلہ میں ماہنامہ دل تشریف لے جایا کرتے تھے۔ میری ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں شعر و سخن کی ہم ذوقی نے قدرے بے تکلفی بھی پیدا کر دی تھی۔ میرے متعلق بھیا کی صحبتوں میں یہ کیا کچھ کہتے ہوں گے کہ انھیں کی زبانی کئی مرتبہ بھیا کی جانب سے میرے پاس اشتیاق ملاقات کا پیغام پہنچا۔ اس انداز پر کہ یا تو بطور خاص رخصت لے کر باراں آؤں یا جب چھٹیوں میں گھر جاؤں تو ایک دو روز کے لئے باراں ٹھہر جاؤں لیکن کبھی اس طور پر مجھے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔ حافظ عطاء اللہ بھی بھیا کی محبت کے خاص انسان ہیں۔ انھوں نے ایک کتابچہ تحریر فرمایا ہے "اسلام کا پہلا سبق" اس کی اشاعت بھیا کی امداد سے ہوئی۔ میرے پاس بھی ایک نسخہ دیکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وکیل احمد علی خاں شاد نے مجھے اس کے مطالعہ سے قبل ہی بطور شکریہ ۱۲۷ اشعار کا ایک قطعہ لکھ کر بھیجا۔ جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

کریں منظور میرا شکریہ حافظ عطاء اللہ
ملا ہے جس سے آج "اسلام کا پہلا سبق" مجھ کو

بقول جناب شاد یہ قطعہ بھیا کی محبت میں سنایا گیا۔ حافظ عطاء اللہ تا حیات ہیں انھیں شاد صاحب نے یہ قطعہ سنایا۔ بروقت ملاقات ماہنامہ دل میں شاد صاحب نے کچھ اشعار پڑھ کر فرمایا کہ ان اشعار پر بھیا نے بے حد داد دی۔ ان میں سے یہ شعر بھی تھے

عطا ہے عطاء اللہ کی خود کی عطاء اللہ
نہ حق کی ہے ہوتی کب ہیں اسرار حق مجھ کو
کتاب دل کی یہ وسعت نہیں تو اور پھر کیا ہے
کہ پڑھ لیا ہے جو اب تک یہی پہلا سبق مجھ کو
بظاہر چشم ظاہر بیں جو دل تو کچھ نہیں کچھ تم
نہ زیبا کچھ تعلق تجھ کو نہ زیبا کچھ تعلق مجھ کو
خدا کی جو عطا ہے کہ دل روشن عطا کر دی ہے
یہ تحفہ ہو گیا ہے کاشف اسرار حق مجھ کو
مبلغ آج خود محتاج تبلیغ و ہدایت ہیں
کتاب دل نظر آئی ہے اب سادہ ورق مجھ کو
یہ دور جہل و نادانی یہ عہد غفلت و فراموشی
عنایت ہو گیا اسلام کا پہلا سبق مجھ کو
یہ درس آدمیت ہے بعد اس کے درس شاد نے
خدا اس تیرے گلشن کو بہار جاودانی دے

وکیل احمد علی خاں شاد میرے گرم فرماؤں اور قدر دانوں میں سے ہیں، مجھ سے "تازہ چیزیں" سنتے رہتے، نقیصیں لے جاتے اور بھیا کی محفل میں سناتے رہتے۔ انھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ نقیصیں پیشہ ورانہ کارانہ یا عقیدت مندانہ طور پر لی جاتی تھیں اور اب ضرورت مندانہ طور پر لی جاتی ہیں کہ بھیا ہر دفعہ پوچھتے ہیں ماہنامہ دل سے تازہ کلام لائے؟ انکار کرتا ہوں تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں اس موقع پر خاص بات یہ بیان کرنی ہے کہ ایک دفعہ بھیا کی تعریف اشعار میں انھوں نے یہ پیغام مجھ پہنچایا کہ صلاحیت سخن گوئی قوم و ملت کی اصلاح اور معاشرہ کی فلاح میں بھی صرف ہونی چاہئے۔ ہیجانی دنیا تک کا رنگیلانہ چیترے بازی کے پرزے پھینکے نہیں۔

ماہنامہ دل کے اس تعزیتی واقعہ کے بیان سے مجھے بھیا کے اس اصلاح پسندانہ دماغ کی

نشان دہی کرتا ہے جو ان کے اس دماغ میں کارفرما تھا۔ ان کی بڑی خوبی تھی کہ ہر صلاحیت و استعداد کے آدمی کو پرکھتے اور اس پر وہ کو عہدوں میں مناسب موقع پر سپورٹ کرتے رہتے تھے۔ یہی تو اعلیٰ منتظم کی پہچان ہے۔ میرے یاراں کے دوران قیام کمیٹی کی تعلیمی کمیٹی کا صدر اور کمیٹی فائر بریگیڈ کمیٹی کا صدر بنایا۔ افراد قوت کی صلاحیتوں کو پہچان کر ٹھیک مرکز کی طرف موڑ دینا بڑی بات ہے۔ ایک عمل انسان اور حقیقت پسند دماغ کی یہ تجویز میرے دل کو لگی۔ یہ دونوں بیم ایب کو ڈرکے مشاورے بڑے زور شور سے چل رہے تھے۔ میرے پاس ان نشستوں کا معمول طرح طرح پر دعوتیں ہیں۔ گھروں پر بھی جایا کرتا تھا میں نے اپنے کلام کو اصلاح دلانے کی جاودں کی طرف موڑا اور غزل کے مصرعوں پر اس قسم کی نظیں لکھ لکھ کر بھیجیں جن میں بھیا کی رہنمائی کی تکمیل ہوتی تھی۔ چنانچہ میرے مجموعہ کی مشمولات میں ۱۰۱ نصیحت و نصیحت ۱۰۱ آزاد (یا رب ہو برق مرا ہر لفظ ہر کلام) اس سایہاب اردو کے لئے پیام عمل ۱۹۰۱ مشاعرہ کمیٹی کوٹہ کے نام، اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ یہ زمانہ آواخر ۱۹۰۰ء اور اوائل ۱۹۰۱ء کا ہے۔ ۱۹۰۱ء سخن بزم ادب کی طرف تھا۔ لیکن خطائے سخن میں بھیا کی تجویزوں پر عمل پیرا تھی۔ وکیل احمد علی خاں شاد الہ آبادی پر بھیا کی خوشنودی مجھ تک پہنچاتے رہے

دسمبر ۱۹۰۱ء میں یاراں میں ایک عام مشاعرہ ہوا جس میں دونوں چیف تعینات تھا۔ سید محمد مہدی۔ رضی جیسے مشاعرہ تھے۔ ان کی محبت و کشش نے مجھے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کا موقع دیا۔ مشاعرہ کے دوسرے روز دن میں رضی صاحب کے مکان پر ایک نشست کا انتظام ہوا۔ بیرونی و مقامی شعراء کے علاوہ مقامی معززین بھی اس نشست میں شامل تھے۔ بھیا بھی شریک ہوئے۔ انھیں مجھے بالمشافہ سننے کا خاصا شوق تھا۔ غزل نے حاضرین سے جیسی کچھ داد پائی۔ لیکن اس شعر پر بھیا نے بہت داد دی جس کی مسرت سے اب بھی میرا دل جھوم رہے ؎

کرامت زاہد و رُخ سلامت جاری دنیا میں تم ہی تم ہو جو کچھ چاہو تو تم ہی کر دو۔ جو شام چاہو تو شام کر دو

یہ مقطع بھی انھیں پسند آیا۔

میں بلتا آزاد کی بدولت نیسی میں جینا سکا تو مفتون ہوا یہ تمت کا حکم جاری کہ نام ہی کا ظلام کر دو

غائبانہ بندگی کی یہ بھی وجہ ہو کہ وہ میرے بچپن کی عرفیت "غلام" سے واقف تھے جو میرے نام کا ہیولا تھا۔

جولائی ۱۹۰۲ء میں میرا تبادلہ یاراں ہوا۔ تو اپنے کرم فرما جناب حکیم الدین شاہ کے یہاں ٹھہرا۔ افطار مرحوم سے بھی ملنے گیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں تبدیل ہو کر یاراں آیا ہوں تو بڑے خوش ہوئے اور قریب ہی اپنا ایک الگ مکان بتا دیا کہ یہاں رہو سہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک اکیلے رہو کھانا یہیں کھانا۔ اپنے مخصوص احباب سے بھی ذکر کیا کہ اپنے حلقہ میں اب مفتون صاحب کی نشست و برخاست سے اچھا لطف رہے گا۔ اس کے بعد میں دو تین روز وہاں نہیں گیا۔ دراصل میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کسی پر بار بن کر رہوں۔ بھیا کا تقاضا پھر بھیجا کہ دہلی سے اٹھ کر یہاں چلے آؤ۔ میں نے حیلہ تراشا کہ سلسلۂ ملازمت مجھے جلد کھانا کھا کر جانا پڑے گا۔ آپ ایسی زحمت نہ اٹھائیں۔ انھوں نے پھر جواب میں کہلا بھیجا کہ میرے یہاں بھی عدالت میں جانے والے لوگ ہیں۔ کوئی زحمت نہ ہوگی۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ میں دو تین روز اور خاموش رہا۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ کیسے مفر حاصل ہو؟ سوچ بچار کا یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس طرح کہ بھیا نے اپنے آدمیوں کو بھیج کر زبردستی میرا سامان وہاں اٹھوا منگایا۔ خانگی حالات کی بنا پر میں وہاں تنہا رہتا تھا۔ بچوں کو نہیں لے جا سکتا تھا۔ کافی دنوں تک مجھے انھوں نے شریک آب و طعام بھی رکھا۔ خورد و نوش کا علیحدہ انتظام میں نے بارہا کرنا چاہا۔ لیکن میری کوششوں کو انھوں نے رد کر دیا۔ آخر تقریباً دو سال ہی ہے، ۱۸ ماہ بعد میں اس میں کامیاب ہو سکا۔ وہ بھی اس طور پر کہ وہ خود ہی کی زد میں آ گئے۔ میں اسی مکان میں رہا اور ان کے علم میں یہ بھی رہا کہ میں بدستور کھانا وہیں کھا رہا ہوں۔ اس مروت، محبت اور خلوص کے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں!

یہی زمانہ تھا کہ مجھے ان کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے کے اکثر مواقع حاصل ہوئے اور قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ تاثرات تھے جو میرے مضمون جناب عبدالرزاق رضا (ڈپٹی کمشنر یاراں) کی شکل میں قلمبند ہوئے۔ یہ مضمون اگست ۱۹۰۲ء کے شذرہ دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ یاراں سے جب میرا تبادلہ ہوا تو جن لوگوں کے خلوص نے مجھے متاثر کیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ اس رخصت میں میں نے ایک نظم کہی تھی۔ ان کے متعلق اس میں یہ کہا تھا ؎

وہ رضا۔ عبدالرزاق، انسان خوش خلق
کم ہوا کرتے ہیں پیدا ایسے مردانِ خلیق
قوم کا خدمت گزار، احباب کا سچا رفیق
اہلِ دل، اہلِ نگاہ و صاحبِ فکرِ عمیق

یاد کر کے جن کو مجھ کو بہت رونا ہوں میں

رخصت اے یاراں کہ اب مجھ سے جدا ہوتا ہوں میں

بھیا کا دسترخوان ہمیشہ کشادہ رہا ہے۔ مکان کی کامیابیوں نے انھیں فارغ البال اور کشادہ دست بھی رکھا تھا۔ فطری طور پر خوش خلق اور احباب پر اقربا نواز تھے۔ دوستوں کے بڑے وفادار، قوم و ملت کے بڑے پرستار۔ اس لئے ان کا حلقۂ تعارف ہمیشہ وسیع رہا اور ان کا مکان اہل علم و فضل کی قیام گاہ بنا رہا۔ قدردانی و فطرت شناسی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ میں ان کے گھر میں بہت چھوٹا تھا لیکن

بیٹھتے تھے وہ مفتی صاحب کہہ کر پکارتے یہ بھی عجیب بات نوٹ کی کہ اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی وہ بہت زیادہ اور بیشتر بہت زیادہ تعریف کیا کرتے تھے۔ اس امر کا مقابلہ کیجئے ان لوگوں کی اس خوشامد سے کہ وہ بہت تعریفیں کرتے ہیں اور عقب میں غیبتیں۔ مرشام ہی احباب کا مجمع شروع ہو جاتا۔ اول تو کئی اصحاب ہم طعام ہوتے، جمعہ کی اور تعطیل کی۔ اس کے بعد فضل حق۔ یاران خوش طبع ہوتے مزاح فکر و فہم کی اس صحبت میں طنز و مزاح کی چٹکیاں بھی چلتیں، اور سنجیدہ موضوعات پر موشگافیاں بھی ہوتیں لوگ آتے بھی جاتے، اٹھتے بھی جاتے۔ دس گیارہ بجے رات تک یہ مجلسیں گرم رہتیں۔

میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے، جب مجھ سے پیرانہ سری اور کثرت امراض کی وجہ سے وکالت ترک کر دی تھی کبھی کبھار شغل بے شغلی کے طور پر عدالت چلے جاتے تھے ورنہ نہیں۔ گھر ہی رہتے۔ دن میں بھی احباب اور اوقاتی انہیں تنہا نہ چھوڑتے تھے۔ اپنے متاثرین کو ہمیشہ نیک مشوروں سے نوازتے ان کی ترقی سے خوش ہوتے۔ شان ہندلی میں میرے مجموعہ کلام "ماہ نو" کا استقبال دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ میری قیام گاہ پر آکر دیر مسرت کا اظہار کرتے رہے یہی وسیع القلبی قدردانی اور خوش مزاجی تھی کہ ان کے مکان کا ماحول یہ تھا جیسا کہ آزاد بارانوی نے ان اشعار میں ظاہر کیا ہے ؎

حضرت اہل علم کا مسکن تھا ان کا گھر
ذی جاہ میہمانوں کا ماں تھا ان کا گھر
شاعر ادیب اہل قلم کی قیام گاہ
گہوارۂ جہاں نوازی تھا ان کا گھر

اور کفر و ضلالت کے لئے تاثرات کی آرزشیں باقاعدہ ترک وکالت کے بعد سے شروع ہو گئی تھیں۔ یہاں کی شاعرانہ نشستوں

باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ کیجئے

کچھ شامل ہوتے رہتے تھے۔ اشعار نئے افکار کے حامل ہوتے تھے۔ خیالات چونکا دینے والے تھے۔ حقیقت پسندانہ و بلیغ یہاں بھی عمل ترغیبات اور اصلاحی تعلیمات کی جانب متوجہ تھا۔ خستہ بارانوی نے یہ شعر یہاں سوچے سمجھے نہیں کہا ہے ؎

اپنے دکھڑے سے سوا قوم کا دکھڑا سمجھا
غیر کو غیر نہ سمجھا کبھی، اپنا سمجھا

ان کی ادبی صلاحیتوں اور حیات افروز خیالوں سے روشناسی مکمل نہ ہو سکے گی اس لئے یہ چند اشعار ضمنی طور پر ملاحظہ کر لیجئے ؎

زندگی اس طرح گزار اپنی
کوئی نفرت پسِ فنا نہ کرے
اس کا جینا بھی خاک جینا ہے
جو کہ ایثار اختیار نہ کرے
اس کو توقیر مل نہیں سکتی
جو کہ توقیر بے روا نہ کرے
ابن آدم کی شان صبر جمیل
غم کو سہ جائے اور بکا نہ کرے

ہاں زندگی وہی ہے جس میں عمل ہو پیہم
محدود جب عمل ہو، ہے موت زندگی میں
دشوار ہے جو ہر دم خالق کی بندگی میں
اس کی ہی زندگی ہے حدود کی تنگ دیں

ارباب وطن کی طرف مخاطب ہیں ؎

کیا وطن کو آگے لے جانے کی صورت ہے یہی
ہر بشر کا قلب ہے اب فتنہ ساماں دیکھئے
خانہ و دل کی چمن میں اب مصیبت آ گئی
بن گئے گل خار یہی، جو تھے گلستاں دیکھئے
خون دے کے اس چمن کو تھا بنایا لالہ زار
اپنے ہی مرادیں نزہت نہ باس
ہم قوموں سے تخاطب ہو خطاب کیجئے ؎

خزاں آتی ہے گلشن میں یہی کچھ غیبت تھا
نہ زوال آیا مگر قسمت سے وہ بھی فی الفور آیا
کبھی شمشیر زن آتا تھا جو زینت سمجھتے تھے
انھیں ہاتھوں میں اب مہندی لگانے کا خیال آیا

سخنور کی طوائف کا مجھے احساس ہے لیکن
کیا کروں یہ فریب جور کھا بیت دراز تر گفتم۔

۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء کو مرحوم پر فالج کا حملہ ہوا اس کی خبر سے یہ شہر شہر میں پھیل گئی اور احباب کے تار، لوگ جوق در جوق کے لئے آتے رہے، دوسرے روز سے بیرونی حضرات عیادت کے لئے آنے لگے۔ مہینے دو مہینے یہ تانتا بندھا رہا۔ بیحد تعلیم تھا۔ کافی علاج کرایا گیا، لیکن وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بہ عمر تقریباً ستر سال اس عارضی میں انتقال کر گئے۔ چونکہ مرجع خاص و عام تھے۔ قریب و بعید میں کافی اجتماع بتایا جاتا ہے۔ ان کی صاحبزادی ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کی فرمائش پر لوح مزار کے لئے نصب ذیل قطعۂ تاریخ کہا گیا ہے۔

لہ

کتبۂ لوح مزار

یا سمیع المهیمن ذوالجلال والاکرام

۸۲ - ہجری ۱۳

بلند نگاہ، اخلاق فواز عبدالرزاق وکیل بار ایٹ لا

۱۹ ۶ ۶۲

آہ وہ عالی نژاد و پاک باز و پاک ذات
صاحب اخلاق اعلیٰ، صاحب عقل سلیم
خوش مقال و خوش خصال و اہل دل اہل نظر
مرد میداں، مرد ہمت، مرد دانائے فہیم
قوم کا یادگار بھی، خدمت گار بھی محترم بھی
حلقۂ احباب میں فیض کمر مرجع نسیم
تھا کشادہ وہ جبیں کا دل تر خوش دل کہ تھا ساتھ
جس کی نظروں میں تھی حرکت جس کی فطرت میں

ناردرن ریلوے

نوٹ

ٹائم ٹیبل میں مندرجہ ذیل اہم تبدیلیاں مورخہ یکم اپریل ۶۳ء سے عمل میں لائی جارہی ہیں۔

۱۔ نئے کنکشن مہیا کئے گئے

(i) ۲۔ ایل۔ ایف فیروزپور۔ لدھیانہ پسنجر کا ۱ ۷، ۱۔ ایل جے امرتسر لدھیانہ جاکھل پسنجر کے ساتھ لدھیانہ میں

(ii) ۲۔ ایس۔ ایف شکوہ آباد فرخ آباد پسنجر کا ۱۷ اپ کان پور سینٹرل۔ کاشگنج پسنجر (ایس۔ ای ریلوے) کے ساتھ فرخ آباد میں

(iii) ۲ ایس۔ ایف شکوہ آباد۔ فرخ آباد پسنجر کا ۱۶ ڈاؤن آگرہ فورٹ کان پور سنٹرل پسنجر (ایس۔ ای ریلوے) کے ساتھ فرخ آباد میں

(iv) ۱۔ ۷۔ بی۔ ایل الہ آباد۔ آگرہ پسنجر کا ۲ ۷، ٹی۔ ایف آگرہ۔ شنڈلہ فرخ آباد کے ساتھ شکوہ آباد میں

(v) ۳۔ ایس۔ ایس شاہجہان پور سیتاپور پسنجر کا ۳۷۵ اپ الہ آباد۔ دہلی پسنجر کے ساتھ روزنہ میں

۲۔ نئی ٹرینوں کا اجراء۔

۱۔ کے۔ ایس بی ڈیزل ریل کار دہلی کنٹ کنج اور شکور بستی کے درمیان

۳۔ ٹرینوں میں توسیع

۱۔ بی۔ کے۔ ایچ / ۲ بی۔ کے۔ ایچ ریواڑی اور حصار کے درمیان چلتی ہیں اب سرسہ تک بڑھادی گئی ہیں اور ان کا نمبر ۱ بی۔ کے۔ ایس / ۲ بی۔ کے۔ ایس کر دیا گیا ہے۔

۴۔ ٹرینوں کے اوقات میں تبدیلی

(i) نمبر ۱۲ ڈاؤن دہلی جوڑہ ایکسپریس دہلی سے ۲۱/۴۰ بجے کی بجائے ۱۰/۱۰ پر چلے گی

(ii) نمبر ۱۴/۲۱۴ ڈاؤن اجمیر دہلی پسنجر کی دہلی میں آمد ۶/۳۵ بجے کی بجائے ۷/۲۵ بجے ہوگی۔

(iii) نمبر ۳۲/۲۳۲ ڈاؤن احمد آباد۔ دہلی جنتا ایکسپریس کی دہلی میں آمد ۴/۴۵ بجے کی بجائے ۶/۵ بجے ہوگی۔

(iv) نمبر ۱/۲۰۱ اپ دہلی احمد آباد میل دہلی سے ۲۲/۵ بجے کی بجائے ۲۲/۲۰ بجے روانہ ہوگی۔

(v) نمبر ۹۱ اپ دہلی بیکانیر میل کی بیکانیر میں آمد ۹/۳۰ کی بجائے ۹/۵ پر ہوگی۔

(vi) نمبر ۹۵ اپ بیکانیر۔ ادے پور میل بیکانیر سے ۲۰/۵ بجے کی بجائے ۲۰/۲۰ بجے چلے گی

(vii) نمبر ۹۶ ڈاؤن ادے پور بیکانیر میل کی آمد بیکانیر میں ۷/۵ بجے کی بجائے ۷/۴۵ بجے ہوگی۔

(viii) نمبر ۱ بے۔ ایم بیکانیر۔ مارواڑ پسنجر بیکانیر سے ۳ بجے کی بجائے ۳/۴۵ پر چلے گی۔

(ix) نمبر ۳ بے۔ بی۔ ایل بیکانیر۔ جودھپور پسنجر بیکانیر سے ۲۲/۴۰ کی بجائے ۲۲/۳۵ پر چلے گی اور جودھپور پر ۴ بجے کی بجائے ۳/۵۰ بجے پہنچے گی۔

۵۔ الف۔ ٹرینوں میں ایرکنڈیشنڈ جگہ

(i) اسامپ/۲ ڈاؤن میل گاڑیوں (دہلی کالکا) پر جنوری ایرکنڈیشنڈ کوچ ہفتہ میں تین بار کی بجائے روزانہ چلایا کرے گی۔

(ii) ۱۴ اپ/۴۳ ڈاؤن مسودی ایکسپریس گاڑیوں پر دہلی اور دیرہ دون کے درمیان مکمل ایرکنڈیشنڈ کوچ روزانہ مورخہ یکم جنوری سے چلے گی

(iii) ۹۱ اپ/۹۲ ڈاؤن بیکانیر میل گاڑیوں پر دہلی اور بیکانیر کے درمیان ایک جنوری ایرکنڈیشنڈ کوچ ہفتہ میں تین بار بطریق ذیل چلے گی

از دہلی :- پیر۔ جمعرات اور ہفتہ

از بیکانیر :- بدھ۔ ہفتہ۔ منگل اور جمعہ

(ب) تھرو سکشنل کوچوں کا اجرار

	اسٹیشن مابین	ٹرین نمبر	درجہ	بوگیوں کی تعداد
(i)	بمبئی سنٹرل - پٹھان کوٹ	۳۳/۳۴ اور ۴/۳۴	اے، بی، سی	ایک
		ریل گاڑیاں	I	ایک
			II	ایک
			III	
			سلیپر تھری ٹائر	ایک
(ii)	دہلی - بریلی	۳۷۵/۳۷۶ پسنجر گاڑیاں	II اور III	ایک
(iii)	دہلی - کوٹ مدارہ	۳/۵۲ اپ کے این اور	کمپوزٹ I، III	
		۴۲/۵۱ ۶ کے این	دائس III	ایک

(ج) تھرو سکشنل کوچیں منسوخ کی گئیں

	اسٹیشن مابین	ٹرین نمبر	درجہ	بوگیوں کی تعداد
(i)	دہلی - گاندھی دھام	۲۳۱/۶۱ اور ۶۲/۲۳۲	III	۱

تفصیلی واقفیت متعلقہ گاڑیوں کے اوقات، تھرو کوچوں کا اجرار، اور منسوخی گاڑیوں میں جگہ کے درجوں کی ہم آہنگی وغیرہ کے لئے اپریل ۱۹۷۳ء سے جاری کیا گیا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیں جو ریلوے بکنگ، ریزرویشن اور انکوائری دفاتر اور مشہور اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں پر دستیاب ہو سکتا ہے۔

چیف اوپرٹنگ سپرنٹنڈنٹ

R.O No-46

اپنی محفل اپنے دوست

کرن۔ حسیم

شعلہ و شبنم کے بہت سے شمارے نظر سے گزرے اور بنظر غائر دیکھے۔ یہ واقعی ایک معیاری رسالہ ہے بعض حضرات نظر میں آپ کہیں کہیں اس کا خیال نہیں رکھتے نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ نظر فراز بھی ضروری ہے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ کچھ ارسال کروں لیکن وقت نے کبھی اتنا موقع نہیں دیا۔ اس بار ایک غزل آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں شامل کریں گے۔ زیادہ آداب

خواہش کیش۔ ذکی پیلی بھیتی

بھائی نیل جیسی۔ آداب و نیاز

آپ سے ایک مدت سے خط کتابت بند سی ہے میں تو کبھی کبھار لکھ ہی کرتا ہوں لیکن آپ خاموشی اختیار کر رہے ہیں اس بات پر بھی محمول سمجھتا ہوں کہ ان دنوں آپ بڑا معروف ہیں

بیاض خط پچھلے مہینے کے پرچہ میں شائع ہوا جس کا میں تہ دل سے شکریہ ہوں۔ آپ نے حضرت ناطق کے معاملہ میں انصاف سے کام لیا ہے

شعلہ و شبنم ترقی کی راہ پر ہے اس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کیا ہی اچھا ہو کہ کچھ خدمت پیشہ ادبی امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے

فقط۔ رضوان پرویز۔ رحمانی پور

محترمی آداب!

شعلہ و شبنم کا تازہ شمارہ طبیعت پر پسند آیا۔ خاص طور سے ٹائٹل کا شعر کافی اچھا لگا۔ واقعی شعر ٹائٹل پیج کے قصر حسن کا کتبہ ہے آج کل کے نازک دور میں آپ کی کوششیں واقعی قابل داد ہیں۔ ہم تو یہ ہے کہ شعلہ و شبنم کے بارے میں کچھ کہنا سننا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ دیگر کارہائے نمایاں پر مبارکباد

خادم ہر وقت حاضر ہے

نیاز مند۔ آزاد رشید شہباز نگری۔

کرم ایڈیٹر صاحب۔ آداب و نیاز

آپ کے شعلہ و شبنم کو دیکھتے ہوئے ایک سال سے زائد ہو چکا ہے، حالاں کہ دیگر رسائل سے مجھے کوئی لگاؤ اب تک نہیں پیدا ہو سکا۔ کیونکہ وہ میرے ذوق کی میری نگاہ کے برعکس اس کے شعلہ و شبنم کو میں نے اپنی دلچسپیوں کے مطابق ایک معیاری رسالہ پایا۔ لیکن اپریل ۷۳ء کے شعلہ و شبنم میں آپ کی محفل اپنے دوست کے عنوان میں سید افاق جعفری پیلی بھیتی کے مراسلہ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ساتھ ہی آپ کا نوٹ بھی دیکھا جو قطعاً درست ہے۔ نشان دہی ہونے ہی پر جواب دیا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس معاملہ میں آپ کچھ خدمات میری بھی قبول فرمائیں گے۔ فقط

نیاز آگین۔ ڈاکٹر تحسین بریلوی

بقیہ رضا مرحوم (صفحہ ۷ سے آگے)

نویش پدر، یار پدر، قوم پدر، ملک دوست
مرجع ہندو و مسلم، ضیغم نیستی میم

تھا لقب "جیا" کا وہ ہر لحاظ سے ثبوت
اصل میں تھے بھی وہ یار مشفق و یار کریم

تھے ذکات میں صف اول کے بھی وہ سربراہ
شاعری میں وہ رضا، حق فکر کا، فرزند قلم

گرچہ خاک سے ہے لوح جنسی پانچ سال

ترتیب حل تھے وہ بانی نتائج سلیم
سنہ تاریخ ہجرت ہے یہ مکتوں دل کش

آفتاب نیک منزل، ساکن قصبہ نعیم

۸۳ ۱۳ ھ

آزادگی آثار مفتوں کو فی

۶۲ ۱۹ ع

یقیناً بیتا ہوا یہ نیک اعمالوں اور اچھائیوں کے گلزاروں میں ہمیشہ تابندہ و پائندہ رہیں گے انشاء اللہ جنت الفردوس عطا کرے۔ بلکہ جس کی نیکی دنیا سے زیادہ سے زیادہ فروغ پذیر ہو اس سے مستفید فرمائے ــــ آمین۔

بقیہ خاموش چہرے صفحہ ۱۰ سے آگے

ایک لڑکا دوسری لڑکی کو کمر کے گرد باندھا ہوا لئے جا رہا تھا۔ لڑکے نے سفید ساٹن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر کی ٹوپی ہیروں کی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی نے زرد پاؤں لگا رکھا تھا۔ گھیر دار چوڑی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے رخسار دہکتے ہوئے کی طرح تھے۔ دفعتاً وہ دونوں کے درمیان ٹھہر گئے۔ ایک لمحہ سوچنے کا نیا فیصلہ نا فرحام کیا اور تب میں نے پہچان لیا یہ دونوں میڈم دیوین کے نوکر تھے

میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس وقت ہنسنا واجب یا رونا۔ یہ تمام فعل کس قدر افسانہ انگیز اور دلچسپ تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ رونا مناسب ہوگا..... میں اس نظارہ کو دیکھتا رہا جب تک کہ وہ باغ میں سے نکل کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے ــــ

اور تب مجھ پر تمام دنیا منحوس اور اداس معلوم ہونے لگی۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت تھا کیونکہ میں اس عورت کی نرمی کو فت کو محسوس کر رہی تھا جو کبھی بام و در پر بسی تھی جس نے کبھی یہ پیاری بات کہی تھی اور جب اس رات میں اپنے کمرے کی طرف لوٹی تو میرے کانوں میں گونج رہے تھے ــــ

نذرِ عقیدت بخدمت آبر احسنی

حسن ریاضی، ایم اے (انگ) یس ٹی

روحِ روانِ انجمنِ فن کا واسطہ
قاب، فراق و تیر کے دامن کا واسطہ
چاسر کا فن کا، پوپ کا مشن کا واسطہ
استادِ داغ، حضرتِ احسن کا واسطہ
اب تک مشورِ خام ہے ذوقِ سلیم دے
مجھ ناسمجھ کو عقلِ خدائے کریم دے

چپ اے زبانِ خموش مرا آج ساتھ دے
ذہنِ سیاہ پوش مرا آج ساتھ دے
دنیائے عقل و ہوش مرا آج ساتھ دے
طرزِ بیانِ جوش مرا آج ساتھ دے
یہ عزم فہم ہے ماہرِ فن آبر کے لئے
کھنڈا ہے کچھ سحابِ سخن آبر کے لئے

جو روحِ انکسار ہیں وہ آبر احسنی
فن کے جو تاجدار ہیں وہ آبر احسنی
احسن کا جو نکھار ہیں وہ آبر احسنی
جو داغ کی بہار ہیں وہ آبر احسنی
وہ آبر جن کے دم سے غزل سرفراز ہے
ہم سب کو ان کی ذات گرامی پہ ناز ہے

ندرت کلام میں ہے تناسب کلام میں
روشن ہے نور دیدۂ فطرت کلام میں
استاد داغ کی ہے سلاست کلام میں
بالکل انیس سی ہے فصاحت کلام میں
ہے فکرِ آبر، کاشفِ اسرارِ زندگی
ہر لفظ میں ہے گرمیٔ رفتارِ زندگی

فن کار دل سے کیوں نہ کریں احترام آبر
کچھ کھیل تو نہیں ہے سخن معتام آبر
بچپن سے نذرِ فن ہوئی ہر صبح و شام آبر
مشاطۂ عروسِ غزل ہے کلام آبر
ہر زاویے سے اکمل و افضل کہیں جسے
وہ ہے کلامِ آبر کمل کہیں جسے

اشعار سے چھلکتی ہے صہبائے زندگی
ان کی غزل ہے انجمنِ آرائے زندگی
سمجھا ہے ہم نے شاعرِ دنیائے زندگی
مل کر چکے ہیں عقدۂ غم ہائے زندگی
اپنے لئے ہی آبر کے اشکِ رواں نہیں
دل میں غمِ چمن ہے غمِ آشیاں نہیں

رنگِ قلم بتائیں ہمیں کیا نہیں ہیں آبر
فن کار و فن پرست کے دل میں کہیں ہیں آبر
بزمِ تصورات میں مسند نشیں ہیں آبر
ہم ہیں جو ایک ذرہ تو ماہِ مبیں ہیں آبر
یہ بات کوئی راز نہیں آفتاب ہے
پیری جنابِ آبر کی فن کا شباب ہے

اشعار میں وہ شوخیٔ مضمون کا نکھار
رقصاں ہو جیسے باغ میں رقاصۂ بہار
غزلوں سے رنگِ حافظِ شیراز آشکار
بندش بھی چست ایسی کہ فن کار ہوں نثار
ہر ایک لفظ سینہ بہ سینہ جڑا ہوا
گویا انگوٹھی میں ہو نگینہ جڑا ہوا

ذاتِ جنابِ آبر ہے مجموعۂ صفات
ڈوبی ہوئی ہے رنگِ تصوف میں دکھی بات
طرزِ بیاں ہے صورتِ آئینۂ حیات
شاداب آپ ہی سے ہے باغِ تصورات
ہیں واقعی سحابِ سخن آبر احسنی
کہنے نہیں ہیں حسن آبر احسنی

ظفر مرزا ناگپوری
طرفہ قریشی ناگپور

دو غزلیں

کچھ ایسے بھی بادل سرِ چرخ چھائے
بہاروں نے گایا چمن مسکرائے
طلب ہو جسے دین و دنیا کی آئے
کہ ہم اپنی مٹھی میں کونین لائے
مسلسل سہی حسن کی شعلہ تابی
ہماری محبت پہ کیوں آنچ آئے
اے جانِ ہر انجمن سب نے جانا
جسے تیری محفل کے آداب آئے
بتوں کی محبت کا حاصل نہ پوچھو
یہ جس دل میں بیٹھیں خدا یاد آئے
وہاں تک فضا مہکی مہکی سی پائی
جہاں تک گئے تیری زلفوں کے سائے
کہیں دونوں مل کر غزل بن نہ جائیں
تمہارے اشارے ہمارے کنائے
نہیں اس سے بڑھ کر کوئی ہے برائی
خدا مجھ کو ظرفہ حسد سے بچائے

قاتل اُس بُت کی بات ہوتی ہے
یعنی وجہِ ممات ہوتی ہے
ہجر کی شب ارے معاذ اللہ
اک تماشے کی رات ہوتی ہے
میری شانِ گناہ سے واعظ
بے گناہی کو مات ہوتی ہے
قیدِ تقویٰ سے شیخ صاحب کو
دیکھئے کب نجات ہوتی ہے
آدمی ہے تو ذات انساں کی
مرجعِ کائنات ہوتی ہے
راست گوئی کی بات کیا کہنا
راستی ایک بات ہوتی ہے
ٹل ہی جائے گی ایک دن سر سے
بے کسی بے ثبات ہوتی ہے
وہ خوشامد پسند اور ظفرؔ
صاف صاف اپنی بات ہوتی ہے

کوثر ابدی اعظمی

حالت یہ کیا ہوئی ہے دُنیائے رنگ و بو کی — آتی ہیں کیوں صدائیں ہر سمت ہاؤ ہو کی
لطفِ بہارِ عالم لے کر میں کیا کروں گا — جب محفلِ حسیں ہے اس جانِ آرزو کی
معلوم ہو رہا ہے خنجر کہیں چلا ہے — دامن پہ تیرے قاتل ہیں سرخیاں لہو کی
خنجر زنی میں تیرے ہاتھوں کو ہو نہ زحمت — مجھ کو نہیں ہے پروا اپنی رگِ گلو کی
آداب کی ہے حاجت، ہیں نازِ الفت — مسلک میں عاشقی کے کب شرط ہے وضو کی
انجام عاشقی کا اللہ جانے کیا ہو — بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی
اے جذبۂ طلب دے کوئی مجھے سہارا — ہمت نہ ٹوٹ جائے پیمانِ جستجو کی

تاریکیوں کا ڈیرا، کیوں کر رہے گا دل پر
اس شہر میں ہے کوثر تنویر شمع رو کی

افکارِ نو

میکش ناگپوری

پرتوِ حسنِ ذات ہیں ہم لوگ — شاہکارِ صفات ہیں ہم لوگ
دل میں خورشید آنکھ میں تنویر — جلوۂ معجزات ہیں ہم لوگ
خاک پر گل تو آسماں پہ نجوم — رونقِ کائنات ہیں ہم لوگ
لے قدم دوڑ کر جبینِ خرد — آسمانِ حیات ہیں ہم لوگ
ذات آئینہ دارِ ذات ہوئی — آپ اپنی صفات ہیں ہم لوگ
ساری دنیا غلط سمجھ بیٹھی — کتنے مشکل نکات ہیں ہم لوگ

شاہ بطحا کے صدقے میں میکش
حصہ دارِ نجات ہیں ہم لوگ

○

شباب ملت ایم۔ اے

انتباہ

میرے آزاد وطن ہند کے بے حس مردو!
تم روایات و تمدن کے نگہباں ہی سہی
بیچ دیتے ہو محبت کو مگر لے کے جہیز
اپنے ماں باپ کے تم تابعِ فرماں ہی سہی

صنفِ نازک نہیں تم حرص و ہوا کے پتلو
جنس بابستہ و درماندہ و مجبور ہو تم
غیرت و ننگ و شرافت کے محافظ ہو کر
غیرت و ننگ و شرافت سے بہت دور ہو تم

طوق و زنجیر میں پابستہ غلاموں کی طرح
آہ تم برسرِ بازار ہی بک جاتے ہو
گھونٹ دیتے ہو گلا اپنی تمناؤں کا
سونے چاندی کے لئے خود پہ ستم ڈھاتے ہو

رسمِ تسلیم و رضا چھوڑ کے اب عورت کو
بہر پیکار کے میداں میں نکلنا ہوگا
جس نے ہر دور میں ذلت کے سوا کچھ نہ دیا
اُسے اپنی ہمت سے وہ دستور بدلنا ہوگا

مظہر رحمانی

وہ پوچھ رہے ہیں خود مجھ سے کیا چیز محبت ہوتی ہے
اب کیسے بتاؤں اس دل کی وہ رکھ کے جو حالت ہوتی ہے
اُلفت میں سکونِ دل کیسا نظروں کی تسلی کیا معنی
بے چینی کا عالم ہوتا ہے بے تابِ طبیعت ہوتی ہے
جب ان کا خیال آتا ہے مجھے جب ان کا تصور کرتا ہوں
اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد کی شدت ہوتی ہے
دل دل سے ملے نظروں سے نظر اس وقت کا عالم کیا کہیے
دل کتنا دھڑکنے لگتا ہے کس درجہ مسرت ہوتی ہے
ہر شے ہے وہی ہر چیز وہی پہلی سی مگر اب بات کہاں
کہنے کو نظارا کرتے ہیں ہونے کو محبت ہوتی ہے
ہونے کو زمانے میں ہر شے افراط سے ہوتی ہے لیکن
وہ چیز نہیں ملتی مظہرؔ جس کی کہ ضرورت ہوتی ہے

پیرزادہ اقبال بیجاپوری

شورشِ آلام سے گھبرا گیا
دل فریبِ آرزو میں آگیا
کھول کر دروازۂ بزمِ خیال
ناز سے آہستہ کوئی آگیا
دید کے ہوتے گئے روشن چراغ
پردہ ان کے رخ سے جیسے اٹھا گیا
جب وہ آئینہ دلوئی افکار میں
ایک دریا غم کا بہتا گیا
آگیا جب ہاتھ میں دامانِ یار
سلسلہ عرفان کا ملتا گیا
دیکھ کر اقبالؔ چشمِ یار کو
ایک جادو زندگی پر چھا گیا

کاوش حیدری رائے پوری

میرا دشمن جہاں نہیں ہوتا
وہ جو دل میں نہاں نہیں ہوتا
آنسوؤں کو جو پی گئے ہوتے
رازِ اُلفت عیاں نہیں ہوتا
چاہتا ہوں کہ حال دل کہہ دوں
مجھ سے لیکن بیاں نہیں ہوتا
کوئی تو ہوتا آخر اے کاوشؔ
وہ اگر مہرباں نہیں ہوتا

جلال و جمال

عاجز ہنگن گھاٹی

محبت غم کے ہاتھوں جس گھڑی دم توڑتی ہوگی
مجھے دیوانگی ہوگی تمہیں آشفتگی ہوگی
تمہیں کھو کر دلِ دیوانہ کش مکش میں زندگی ہوگی
مجھے مرنے کا غم ہوگا نہ جینے کی خوشی ہوگی
خزاں پرور چمن کو دیکھ کر اک آہ نکلی تھی
بہار نو یہ نو ممکن ہے سن کر آگئی ہوگی
اگر تجھ بھی گئی شمعِ حرم تو فکر ہی کیا ہے
ہمارا دل جلے گا اور جہاں میں روشنی ہوگی
یہ بزمِ نازِ جاناں ہے نہ جھیڑ و ظلم کا قصہ
کہو گے تو یہاں عاجزؔ سنی بھی ان سنی ہوگی

سید عبدالحنان تبسم جلیپوری

دو چار سانس لے سکیں اپنی خوشی سے ہم
اتنے تو مطمئن ہی نہیں زندگی سے ہم
ہم کیا کہیں جو دل پہ گزرتی ہے رات دن
بہلا رہے ہیں دل کو غمِ بے کسی سے ہم
ضبطِ غمِ فراق سے دل بیٹھ سا گیا
محفل سے تیری اٹھ تو گئے بے بسی سے ہم
دن تھے کبھی کہ ہم بھی زمانہ شناس تھے
اپنے لئے ہی آج ہیں خود اجنبی سے ہم
سو بار دل پہ آئے تبسمؔ بصد ملال
سو بار ان کے در پہ گئے ہیں خوشی سے ہم

متین طالب۔ بھوپال

نظر چرائے ہوئے منہ چھپائے بیٹھے ہیں
یہی تو دیدۂ و دل میں سمائے بیٹھے ہیں
گھٹائیں یاس کی چھائی ہیں ہر طرف پھر سے
ہم آس ملنے کی تم سے لگائے بیٹھے ہیں
زمانہ تشنۂ محبت کو ہو گیا پھر سے
تمہاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
متاعِ دل بھی سکون و قرار بھی طالبؔ
کسی کی چاہ میں سب کچھ لٹائے بیٹھے ہیں

عادل رشید

دل کی آواز

ریڈیائی ڈرامہ

سین پہلا

(تیزی کی چاپ ۔ جو دور سے آرہی تھی آہستہ آہستہ نزدیک آتی جارہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی ہے)۔

نواب اسمٰعیل ۔ بیگم ۔ ! سنتی ہیں ۔ ارے میں نے کہا سنئے تو ۔ کہاں ہیں آپ ۔ ۔ ۔ ؟"

(قدم جو کہ ایک جگہ رک گئے تھے پھر متحرک ہوئے ۔ نواب اسمٰعیل کی آواز میں بے تابی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت ہے)

(نواب اسمٰعیل ۔ دیکھئے تو کتنی بڑی خوشی کی خبر اس لفافہ میں بند تھی ۔ ۔ ۔ "

(ان کی بیگم عابدہ دور سے آتے ہوئے)

عابدہ ۔ الٰہی خیر ۔ یہ پوری کوٹھی آپ نے سر پر کیوں اٹھا رکھی ہے ؟ بات کیا ہے آخر ۔ ؟"

(نواب اسمٰعیل اخبائی خوشی کی آواز میں کہتے ہیں)

نواب اسمٰعیل : ۔ لیجئے یہ خط پڑھئے ۔ دیکھئے تو ہماری بیٹی سلمٰی کا مقدر کتنا اونچا ہے ۔ نواب صاحب نذیر آباد نے اپنے بیٹے جاوید کے لئے ہماری بیٹی کا رشتہ مانگا ہے ۔ یہ دیکھئے ۔ ۔ ۔ ۔"

(کاغذ پڑھنے کی آواز ۔ عابدہ بیگم خط پڑھتی ہے چند لمحے کے وقفے کے بعد ۔ عابدہ کے منہ سے نکلتا ہے)

عابدہ ۔ نواب نذیر آباد کے لڑکے کا رشتہ !"

نواب اسمٰعیل ۔ ہاں ، ہاں ، پڑھ لیا آپ نے ۔"

(چند لمحے کے بعد تعجب کے ساتھ)

کیوں ۔ ۔ کیا بات ہے ۔ ! آپ اس طرح گم سم کیوں کھڑی ہیں ۔ ۔ ۔ ؟"

(عابدہ کی آواز میں دکھ ، سراسیمگی اور خوف ہوتا ہے)

عابدہ ۔ (رکتے ہوئے) لیکن ۔ میرا مطلب ہے کہ ۔ وہ شاید ۔ ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ۔"

(نواب اسمٰعیل بھانپ کر اپنی بیگم کی بات کاٹتے ہوئے نفرت سے)

۔ نواب اسمٰعیل ۔ چاہتے ہیں ۔ (زیر آواز کے ساتھ غصہ سے) کہیں آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا بیگم آپ اس شادی کی بات سے انکار تو نہیں کر رہی ہیں ۔ وہ نمائندہ ، غریب شاعر جو ہماری بیٹی سلمٰی کو دو وقت کی روٹی بھی عزت سے نہیں کھلا سکتا ۔ میں اس کے ساتھ سلمٰی کا بیاہ قیامت تک نہیں کروں گا ۔ خواہ کچھ ہو جائے ۔ ۔ ۔"

(عابدہ کی آواز میں نرمی ہے اور سمجھانے والا انداز بھی ۔ وہ کہتی ہے)

عابدہ ۔ شاید پڑھا لکھا لڑکا ہے ۔ تندرست اور خوبصورت ہے ۔ غریب گھر کا چراغ ہے تو کیا ہوا ؟ وہ ضرور ترقی کرے گا ۔ لڑکی کم سے ۔ ۔ ۔ ۔"

(نواب اسمٰعیل نے حقارت سے بیگم کی بات کاٹی ۔ وہ تڑخ کر بولے)

نواب اسمٰعیل ۔ ہمارا دماغ آپ خراب کیجئے بیگم ۔ محلوں کے فانوس جھونپڑوں میں روشن نہیں ہوا کرتے ۔ سلمٰی کی شادی شاعر سے ہرگز نہیں ہو سکتی ۔ آسمان اور زمین کا فرق بھی آپ کو نظر نہیں آتا ۔"

(عابدہ بیگم ٹھہر ٹھہر کے ہوئے انداز میں کہتی ہیں)

عابدہ ۔ ٹھنڈے دل سے آپ سوچئے ۔ جب دل اور دماغ ایک ہو جاتے ہیں تو آسمان اور زمین کا فرق مٹ جاتا ہے ۔ شاید خاندانی فرق کا ہے ۔ سلمٰی شاعر کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے ۔"

(نواب اسمٰعیل غصہ سے پاگل ہو کر چیختے ہیں)

نواب اسمٰعیل ۔ وہ ہوتی کون ہے فیصلہ کرنے والی ۔ میں اس کا فیصلہ اپنی بندوق کی گولی سے ٹھنڈا کر دوں گا"

(ان کی کرخت آواز کے ساتھ ہی ناگوار قسم کی موسیقی کا شور ابھرتا ہے جس سے دل اور دماغوں کا ہیجان ظاہر ہوتا ہے ۔)

(اور پھر اس تیز قسم کی موسیقی کے بعد ۔ یکا یک آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے تار کی ۔ اور موسیقی جس کی شاردے کہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔)

دوسرا سین

سلمٰی ۔ میں نہ کہتی تھی شاردے میرے اس فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا ۔ وفا اور محبت کی کھائی ہوئی میری قسمیں کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتیں ۔ میری ماں ہوئی

برادرم بلبل چین ! آداب

دو خطوط کے باوجود جواب غائب ۔ خیر تم نے نہیں بھلایا ، ہم نہ تمہیں بھلا سکے ، کون الجھنوں اور پریشانیوں میں ہو بھی ۔ ہم بھی تو ہیں آخر ۔ خدا آپ پر اپنا رحم کرے آمین ۔ ۔ ۔

"دل کی آواز" ایک ریڈیائی ڈرامہ بھجوا رہا ہوں ۔ شفقت و کرم کی نذر ہے ۔ مارچ کے آخر میں دہلی آرہا ہوں ۔ ۔ ۔

آپ کا ۔ ۔ ۔ عادل رشید

ذہانیں اور قسمتیں آخر میرے کام آ ہی گئیں۔ میرے خدا نے مجھ پر ترس کھا کر آپ حضور کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر ہی دیا آخر۔ پالیا نا میں نے تمہیں ——— "

شاہد۔ مجھے آج معلوم ہوا سلمیٰ کہ عورت کی وفا اور اس کی محبت ایک بہت بڑی قوت کا نام ہے میں تمہاری اتنی حضور کا یہی ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے لئے تمہارے ابا حضور کو راضی کر لیا۔ کہاں وہ ہم دونوں کو گولی مارنے والے تھے اور اب شادی کر دینے پر راضی ہیں ——— "

سلمیٰ ——— خدا نہ کرے کہ وہ تمہیں گولی مار دیتے میں اپنی جان ——— !"

(سلمیٰ کا جملہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یکایک گولیوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ گولیوں کا شور، بھگدڑ، چیخ پکار ——— ایک انتہائی ناگوار قسم کا شور ———)

سین تیسرا

(اور پھر اسی شور میں ریڈیو پر خبریں ———)

ریڈیو پر اناؤنس ہو رہا ہے ———

ریڈیو پر ——— چین نے ہمارے دیش کی مقدس سرزمین کو روندا ہے۔ اس نے دنیا میں احسان فراموشی کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ وہ اپنے اندھے پن اور اپنی خود غرضی کی طاقت کے جوش میں ہمارے ملک پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ لیہ اور لداخ کی طرف اس کی فوجیں بڑھ رہی ہے ——— "

(اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر کے چند فقرے جو انھوں نے اس موقع پر کہے تھے)

سین چوتھا

(تقریر آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی جا رہی ہے، اس کے ساتھ ہی ڈھولک پر لگائے جانے والے دردانگیز نغمے "سجا ہے کربیا ہی بدیسی" کی مخصوص آواز بلند ہوتی ہے)

(یہ نغمہ کچھ دیر آگے بڑھتا ہے کہ سلمیٰ کی نفرت میں ڈوبی ہوئی آواز اس نغمہ پر غالب آ جاتی ہے۔ نغمہ ختم ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کہہ رہی ہے ———)

سلمیٰ ——— بند کرو یہ بکواس ——— آہ میرے پیارے وطن کی پکار یہ نہیں، کچھ اور ہے ——— (وہ تڑپ کر کہتی ہے) آہ ہمارے اس دوست نما دشمن نے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتے تھے۔ چین کے چاؤ اور ماؤ کا دماغ خراب ہو گیا ہے ——— "

(بہت سی عورتوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں ———)

ایک آواز ——— سلمیٰ پاگل ہو گئی ہے شاید! "

دوسری آواز ——— اے ہے فوج کوئی اس جیسی لڑکی ہو۔ دماغ چل گیا ہے لڑکی کا ——— "

تیسری آواز ——— بابوں میں بیٹھ کر یہ انداز ——— گلا پھاڑ کر چلا رہی ہے ——— "

چوتھی آواز ——— کھوٹ ہے کھوٹ ——— !"

سلمیٰ ——— ہاں ——— یہ کھوٹ ہی تو ہے ——— ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ لگانے والے مکار چینیوں نے میرے وطن کی آبرو کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ پنچ شیل کا مذاق اڑا لیا ہے۔ جاؤ، ان لوگوں نے ——— "

وہ بپھر گئی ———

سلمیٰ ——— میں اپنے ملک کے دشمنوں کو کچا چبا جاؤں گی ——— "

(موسیقی کی ایک تیز لہر ——— موسیقی اپنے بام عروج پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے ———)

سین پانچواں

(سلمیٰ شاہد سے کہہ رہی ہے ———)

سلمیٰ ——— وطن کی عزت اور اس کے ناموس کا سوال آ پڑا ہے شاہد۔ وطن کی آزادی خطرہ میں ہے ——— اور وطن کی ان کی خاطر میں نے اپنے جسم کی بوٹی بوٹی نچھاور کر دینے کی قسم کھائی ہے۔ میرے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ بھارت ماتا کی آبرو پر قربان ہو جانے کے لئے میری نگوں میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ میں اپنے وطن کی آزادی کے محافظ جوانوں کی خدمت کے لئے نرس بننے جا رہی ہوں ——— "

وہ رک کر بولی ———

سلمیٰ: ——— ہمارا بیاہ اب اسی وقت ہوگا شاہد۔ جب ہمارے وطن کی مقدس سرزمین سے ان منحوس چینیوں کے سائے تک دور کر دیئے جائیں گے ——— "

شاہد۔ تمہارا یہ عزم قابل فخر ہے سلمیٰ۔ تم صحیح معنوں میں بھارت ماتا کی وہ شان دار بیٹی ہو جس پر جھانسی کی رانی سلطانہ چاند بی بی۔ سلطانہ رضیہ اور اودھ کی بیگمات کی مقدس روحیں سلام بھیج رہی ہیں "

سلمیٰ ——— تم بھی جاؤ شاہد۔ سلطان ٹیپو شہید مہاراناپرتاپ سنگھ، چندر شیکھر آزاد۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس اور شہید اعظم بھگت سنگھ کی مقدس قربانیوں کی یاد تازہ کرو ——— جنگ کے محاذ پر ایک آہنی قلعہ بن جاؤ تم ——— اور بھارت ماتا کی پیشانی پر فخر اور مسرور کا ٹیکہ سجا دو ——— ملک کی آزادی پر قربان ہو کر ایک ایسا جگمگاتا ہوا نشان بن جاؤ، تم بھارت ماتا کی پیشانی پر جس سے دشمنوں کی آنکھیں چندھیا جائیں ماں کی طرف بری آنکھ اٹھا کر دیکھنے والوں کی آنکھیں اندھی ہو جائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ——— "

سلمیٰ جوش میں بول رہی ہے)

سلمیٰ: ——— اب تم پُر فخر اور منحوس چینیوں کی آنکھیں نکال کر اور ان کے بھیجے پاش پاش کر کے ہی میری ان آنکھوں میں جگہ پا سکتے ہو جو تمہیں بے حد عزیز ہیں ——— "

(قدموں کی آواز ——— سلمیٰ کے والد صاحب نواب اسمٰعیل آ جاتے ہیں ——— عابدہ بھی ساتھ ہے ——— نواب اسمٰعیل پُر جوش آواز میں کہتے ہیں)۔

نواب اسمٰعیل: ——— بیٹی ——— ہمیں فخر ہے

(باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ کیجئے)

مترجمہ روشن پٹیالوی

خاموش چہرے

موپاساں کا ایک شاہکار

ان شان دار اور وسیع شیجوں کے خاتمے پر جو پہاڑوں کے درمیان دیکھنے میں آتی ہیں میں نے چار پانچ چھوٹے دیہاتی مکان دیکھے۔ ان کے عقب میں صنوبر کے درختوں کا ایک وسیع جنگل تھا جس میں سے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں چمکتی ہوئی ان پہاڑوں کی طرف جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک مکان اس قدر خوبصورت اور پرکشش تھا کہ میں اُسے دیکھنے کے لئے مجبور سا ہو گیا یہ مکان سفید پتھر کا بنا ہوا تھا بہت نیچا اور ہموار۔ سفید اور سُرخ گلاب کے پھول اس کے اوپر اُٹھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ باغ میں مختلف رنگوں کے جاذب توجہ پھول کھلے ہوئے تھے اور اس کی دیواریں سُرخ سُرخ ڈنگوروں اور زرد زرد شفتالوؤں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں کے سفید چبوترے گملوں سے لدے ہوئے تھے۔ جن میں شرابی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سنگتروں کے درختوں کی ایک لمبی قطار پہاڑ کے نیچے تک پہنچتی تھی۔

مکان کے دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ "ولا ڈی انیلان۔" ..... میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ایسے مکان میں کسی شاعر یا کسی خوبصورت عورت ہی رہائش ہو سکتی ہے"۔ .....

میں نے ایک آدمی سے جو کچھ فاصلے پر پتھر توڑ رہا تھا پوچھا۔ "اس مکان میں کون رہتا ہے"۔

"میڈم جولیا مین!" اس نے جواب دیا۔

"جولیا مین!" میں نے اپنے والد سے اکثر یہ نام سنا تھا۔ یہ مشہور ایکٹرس اریل، کی رقیبہ تھی یہ اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہو گی۔ ..... وہ ٹریس جس سے ہمارے زمانے کی دو مشہور ہستیاں ت کرتی تھیں اور جس نے ان میں سے ایک سے قطع تی کر کے تمام فرانس کو بدنام کر دیا تھا وہ ایک ہو کے ساتھ چلی گئی اور مسلسل، میں اپنی محبت ثبوت دیتا آیا اور کبھی یہ سلسلہ میں ہی اختتام کو پہنچا

پہچان لیا گیا۔ اور ایک اخباری نامہ نگار نے اپنے اخبار کو تمام حالات لکھ بھیجے کہ اس نے کس طرح انھیں کوہ آلپ کے اُبلتے ہوئے دہانے پر ننگا ہی جلتے ہوئے اور ایک دوسرے کی کمر کے گرد بازو حمائل کئے ہوئے دیکھا۔

وہ شاعر جس کے رومانی اشعار نے لوگوں کے دل لوٹ لئے۔ ان کا صبر و قرار چھین لیا، مر چکا تھا۔ اور جس آدمی کو ایکٹریس نے چھوڑ دیا تھا، جس کی ہستی کو اس نے جنم دیا تھا، وہ بھی مر چکا تھا۔

اور اب وہ اکیلی ہی اس مکان میں جو پھولوں ہی سے گھرا ہوا تھا زندہ تھی ــــ

میں نے بلا تامل کال بیل (گھنٹی) بجا دی۔ ایک بدصورت سے لڑکے نے دروازہ کھولا اور میں نے ملاقاتی کارڈ پر چند الفاظ تعریف اور التجا آمیز انداز میں لکھے۔ تاکہ بوڑھی ایکٹریس خوش ہو کر مجھے ملاقات کا وقت دے دے اور ساتھ ہی میرے نام سے بھی واقف ہو جائے .....

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ لڑکا چند لمحات کے بعد واپس آیا اور بولا۔ "میڈم آپ سے مل کر یقیناً خوشی ہوں گی"۔

وہ مجھے ایک سادہ سے ڈرائنگ روم میں لے کر پہنچا جس میں ایک خاص سرد پن کا سا دبیز پردے خلاف اندر ہی تھی۔ لڑکا مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر چلا گیا اور میں وہاں اکیلا رہ گیا۔

سامنے کی دیوار پر تین تصویریں لٹک رہی تھیں مشہور ایکٹریس جولیا مین کی جو ایک مقبول فلم میں پارٹ کرتے وقت لی گئی تھی۔ دوسری سٹیج کے بریط کے سامنے مستی کی حالت میں بیٹھے ہوئے ــــ اور تیسری مشہور شاعر کی ــــ یہ تصویریں بہت پرانی معلوم ہو رہی تھیں۔

دروازہ کھلا اور ایک پستہ قد بوڑھی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے بال سفید تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اس نے میری طرف ذرا دیدہ خوابیدہ سے دیکھا اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور بولی۔

"یہاں تشریف لانے کے لئے آپ کا شکریہ ــــ آج کل کے شرفا کا یہ طرز عمل قابل داد ہے کہ وہ پرانے زمانے کی شخصیتوں سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ بیٹھئے!"

میں نے اس کے مکان کی خوبصورتی کی تعریف کی اور بتایا کہ وہ اس مکان کو دیکھ کر اس کے مکین سے ملنے کی خواہش کو نہ روک سکا۔"

"میں آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہوں" اس نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ "خاص طور پر اس لئے کہ یہ واقعہ پہلی بار ہوا ہے۔ آپ کا ملاقاتی کارڈ پا کر میں نے اندر مسرت کا احساس کیا۔ اس نے بھی کہ میں ممکن ہے کہ میں جلد ہی اس دنیا سے اٹھ جاؤں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کس قدر لوگ مجھے فراموش کر چکے ہیں۔ اور جب میں مروں گی تو احباد دے تین دن تک مزید میرے نام کو خوب اچھالیں گے اور پھر ہمیشہ کے لئے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" .....

وہ پھر خاموشی کے بعد رو پھر گویا ہوئی۔ "اب کھیل ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ چند ماہ اور بس۔ تب وہ شاعرانہ خاموشی چہرے اور شمع کی شعلہ بار آنکھوں کی طرف حسرت سے دیکھنے لگی۔ اس شکست خوردہ ستارے کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر میرا دل رحم اور غم کے جذبات سے لبریز ہو گیا ..... میں خاموش بیٹھا رہا۔

وہ میرے خیالات کا جائزہ لے کر بڑبڑائی:۔

"کوئی بھی انسان ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہ سکتا۔"

"کسی وقت آپ کے لئے زندگی کتنی شاندار تھی۔" میں نے اطمینان آمیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں! اسی لئے میں اسے محسوس بھی زیادہ کرتی ہوں۔"

"کیا آپ تھیٹر و دیس کام کرتی تھیں؟ اس وقت سب سے زیادہ خوش تھیں؟" میں نے سوال کیا تاکہ وہ اپنے حالاتِ زندگی سنانے پر مجبور ہو جائے۔ وہ تصویروں کی طرف دیکھ کر مسکرائی ..... اور بولی:۔

"نہیں۔ میں سب سے زیادہ خوش اس وقت تھی جب اس سے محبت کرتی تھی۔"

"اس میں سے کس سے؟"

"دونوں سے!..... اس کی شخصیت کی بہ نسبت مجھے اس کی قربت اور محبت سے ازحد مسرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ محبت کے

"کیا کبھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا کہ کوئی سادہ مزاج حلیم الطبع انسان آپ سے محبت کرے ..... ایسا انسان جو پاک دل اور زندگی کے دکھ اور کوئی چیز نہ نہ کر سکے اور جس کا کوئی رقیب بھی نہ ہو۔"

"رقیب!"

"میرا مطلب شاعری اور موسیقی سے ہے۔"

"نہیں!" وہ ہنسنے لگی۔ "اور آدمی بھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ مگر اتنی گرم جوشی سے نہیں جتنی گرم جوشی سے یہ دونوں مجھ پر فدا تھے۔ کیونکہ یہ دونوں اپنی محبت کے اظہار پر پوری قدرت رکھتے تھے وہ ایک عورت کے دل کو گرما سکتے تھے۔ اس پر جادو کر سکتے تھے اسے خوش کر سکتے تھے۔ اگر بھلا کی محبت کچھ دیر تک مصنوعی اور فریب آلود بھی تھی تو بھی اس میں عجیب طمانیت اور روحانیت کا احساس ہوتا تھا۔" اور دفعتاً اس کی طبیعت بھر آئی اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

میں اس کے غم کو مقدس سمجھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ میرے پاس کہنے کے لئے کوئی بھی بات نہ تھی۔

چند لمحات کے وقفہ کے بعد وہ پھر بولی: "بہت سے آدمیوں کے دل بھی غم کے ساتھ ساتھ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ مگر گو میری عمر ستر سال ہے۔ مگر دل ایک بائیس سالہ نوجوان عورت کی طرح جوان ہے۔ اسی لئے میں غمگین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ یہ معلوم کر کے ہنسیں گے کہ میری شاعرانہ کیفیت اور غم اور گریہ و زاری میں

"ہنسوں گا!..... نہیں ہرگز نہیں۔ میں تو یہ معلوم کرنے کے لئے عزیز سے عزیز تر شے بھی آپ پر قربان کر سکتا ہوں۔"

"تب آج یہاں ہی قیام فرمائیے گا اور کھانا میرے ساتھ ہی کھائیے گا۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں التجا کی

"مجھے اس قیام اور طعام سے ازحد مسرت ہو گی۔" میں نے خوشی سے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

جب وہ اپنی خادمہ کو ہدایات دے چکی تو مجھ سے مخاطب ہو کر وہ عجیب الفاظ میں بولی۔ "اگر آپ میرے ساتھ باغ میں میرے لئے چلیں تو کتنا اچھا ہو۔"

"خوش گوار گرم شام تھی۔ یاسمین انواع و اقسام کے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سے معطر تھی۔ سورج غروب ہونے

کھانا برآمدے میں لگایا گیا۔ یہ واقعی بہت مزیدار تھا۔ میڈم روبن اور میں بہت جلد دوست بن گئے۔ میرے خیال میں اس نے میری ہمدردی اور صدق دل کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اور میں نے اس حقیقت کو اپنی خوش قسمتی سمجھا۔

جب ہم میز پر سے اٹھے تو اس نے آزردہ مگر پُرعزم لہجہ میں کہا۔ "کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ بوڑھی عورت کی قبر پر گریہ و زاری کا مذاق نہ اڑاؤ گے۔"

میں نے پختہ وعدہ کیا اور اس کے پتلے پھولے ہاتھ کو جو میں نے پکڑا ہوا تھا پکڑا اور پھر بوسہ دیا۔ اس کو بوسہ دینے سے وہ اس عمل سے بہت متاثر ہوئی۔ تب اس نے بدصورت لڑکے کو جو سبز وردی پہنے ہوئے تھا اشارہ کر کے بلایا اور جلدی سے اس کے کان میں کچھ کہا۔

"ہاں۔ ہاں میڈم۔ میں سمجھ گیا۔" وہ بولا۔ "ہم باغ میں بازو ڈال کر خوبصورت باغ کی روشوں پر ادھر ادھر گھومنے گے۔"

کیسا روح انگیز نظارہ تھا ..... میرا گریہ مجسم اٹھا اور میرے منہ سے از خود محبت کے نغمے نکلنے لگے۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔

واقعی ماحول بھی انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔

"آؤ یہاں بیٹھ کر ہم کچھ دیر باتیں کریں ... آج کل کے مرد بہادر نہیں ہوتے۔ ان میں کھلاڑیوں جیسا جذبہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ کاروباری قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ محبت کرنا نہیں جانتے۔ اس کی تقدیس کو نہیں۔ وہ اپنی پسند کی عورت سے اسی وقت محبت کرتے ہیں جب وہ قیمت ادا کرنے کے قابل نظر آئے اور اگر وہ پیسہ خرچ نہ کرے تو وہ قیمتی دکھائی دے۔ تو وہ رو کر چلا جائے۔ عجیب سا طوفان ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں اب دنیا میں نہیں ہوں اور پھر وہ دفعتاً اس نے میرا ہاتھ لیا اور بولی: "دیکھو اس طرف!"

وادی کے خاتمہ پر ایک بہت دلفریب

مسلسل ناول

مظفر حنفی مسوری بی۔ اے

تارِ عنکبوت

آخری قسط

جرائم کی فیکٹری

عمر سلیم کے منہ سے کپڑا نکال دیا گیا تھا۔ لیکن اب بھی اُسے بولنے میں دقت ہوتی تھی۔ اُس نے جوشی کی طنز آمیز باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش پڑا رہا۔ جوشی سنگھ اور منوہر نے جوشی کی عدم موجودگی میں طرح طرح سے اُس سے سوالات کئے تھے۔ لیکن وہ خاموشی سے سب کو ٹال گیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی اُسے معمولی چور سمجھ کر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔

سکیم خود کو گنہگار محسوس کر رہا تھا۔ اسے خیال تھا کہ شمیم اختر نے جو فرض اس کے ذمہ عائد کیا تھا۔ اس کی تکمیل کے بغیر ہی اس نے خود کو گرفتار ہو جانے کا موقع دیا۔ اب اس جگہ سے رہائی کی کیا صورت تھی۔؟ اس کے ہاتھ اور پیر جکڑے ہوئے تھے اور چوبیس گھنٹوں سے نامساعد حالت میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ انھیں حرکت دینے سے قاصر تھا۔ اس قید سے چھٹکارے کی اُسے کوئی اُمید نہ تھی۔

جوشی نے کہا ــــ "مورکھ منگھ! تم اس کے سامنے کرسی ڈالے بیٹھے رہو۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جڑ سے کاٹ دینے پر لوگ فنا ہو جاتے ہیں۔ تم بہت ہوشیاری کے ساتھ پہرہ دو۔ اگر وہ ذرا بھی بھاگنے کی بے شک چاقو بھونک کر قصہ تمام کر دینا میں ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں اور پھر دیکھوں گا یہ کس طرح خاموش رہتا ہے۔ زبان گدی سے باہر نہ کھینچ لی تو نام پنڈت جوشی نہیں ــــ!"

وہ اُسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ لیکن سلیم نگاہیں جھکائے ہوئے خاموش پڑا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اسے کن کن مصائب کا سامنا کرنا ہے۔ وہ اس وقت ایشیا کے سب سے بڑے بدمعاش کے نرغہ میں تھا۔ اور وہ اس بدحال دنیا کے عالم میں۔ اگر اس وقت اُسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ جوشی کی حسین بھوجہ بھی اسی عمارت میں موجود ہے تو اس کی بے بسی اور بھی گہری ہو جاتی۔

مور نے جوشی کا پہرہ دیکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور میں آیا ہے۔ اس نے خادمہ کو رخصت کر دیا۔ جوشی نے ایک سگریٹ سلگائی اور جب کہ خادمہ کمرے سے باہر نہ ہو گئی، خاموش رہا۔

"کیا بات ہے پیارے ــــ؟" مور نے دریافت کیا

اختصار کے ساتھ جوشی نے ساری روداد اُسے کہہ سنائی۔ مور متفکر نظر آنے لگی۔

"یہ شخص بے سبب ہی اس جگہ نہیں آ ٹپکا ہے" اُس نے جوشی سے کہا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ــــ" جوشی نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"کیا تم کو پختہ یقین ہے کہ وہ شمیم اختر کا اسسٹنٹ ہے؟"

"سو فیصدی" جوشی نے کہا "میں اسے کئی بار دیکھ چکا ہوں" وہ سلیم ہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شمیم کون سی چال چلنا چاہتا ہے۔ جہاں تک کام کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے خفیہ کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔"

"تو پھر اس نے سلیم کو اس کارخانہ میں مخبری کے لئے کیوں بھیجا" مور نے سوال کیا۔

جوشی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ فکر کی پرچھائیاں بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہاں کس لئے گیا ہے ــــ"

"تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے جوشی!" مور نے آگاہ کیا "کہ پرسوں شمیم اختر کی سرغنہ، جان توڑ کے ہمراہ رنگون میں تھی ــــ"

"مجھے یاد ہے ــــ" جوشی بولا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ شمیم اختر یا توڑ کرنی بھی چنڈی کی موت کا تعلق ہمارے ساتھ نہیں معلوم کر سکتا۔ سلیم ہمارے کارخانے میں کئی ہفتوں سے کام کر رہا ہے۔ پھر وہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شمیم اختر نے اسے یہاں کیوں بھیجا ہے۔ بنگلوں کے سلسلے میں مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ وہاں کے تمام سراغ میں مٹا چکا ہوں لیکن شمیم اختر کا یہ اسسٹنٹ بغیر کسی خاص مقصد کے یہاں نہیں آیا ــــ"

"خیر اب تو وہ تمہارے قبضہ میں ہے" مور نے دلاسہ دیا "فکر کی کیا بات ہے"

جوشی نے تو صیفی نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں جھوم گیا۔ اس کی محبوبہ صنفِ نازک کے لئے باعثِ فخر ہوتے ہوئے کتنی مردانگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ کتنی فراخدلی اور تدبر ہے وہ تمام دنیا میں چھان ڈالنے کے بعد بھی اُسے اتنے خفیہ ادارے کی ادارتی دیر مشقہ تنہا سنبھالے ہوئے ہے۔ اُس

کہا۔ "پیاری جوزتم مطمئن رہو، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو خادمہ کو بلا لینا۔"

جوشی دوسرے کمرے میں آیا۔ اس کا یہ مکان خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں لاتعداد ایسے خفیہ دروازے اور کھڑکیاں تھیں جن کا علم اس کے خاص آدمیوں کو بھی نہ تھا۔ اس عظیم عمارت میں کئی تہ خانے تھے اور ہر ایک میں داخلے کے لئے خفیہ راستے تھے۔ ایک دیوار کے قریب جا کر اس نے سوراخ میں کنجی داخل کی۔ دوسرے لمحے ایک آدمی کے داخل ہونے کے لئے دیوار میں شگاف پیدا ہو گیا۔ جوشی اس میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک طویل راستہ تھا۔ لیکن اس میں تاریکی تھی۔ جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کرنے کے بعد جوشی ایک دوسرے دروازے کے قریب پہنچا اور اسے بھی کھولا۔ اس سے ایک زینہ نیچے تہ خانہ میں گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ غور سے کچھ دیر تک سنتا رہا۔ نیچے سے کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں اس نے سکون کی سانس لی اور زینہ طے کر کے نیچے کی تاریک منزل میں پہنچ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں اپنے اردگرد نگاہ ڈالی اور پھر پاؤں سے ایک کھڑکی کے ہینڈل کو دبایا۔ سامنے ایک اور شگاف کھل گیا جس کی راہ سے ایک بڑا سا تہ خانہ نظر آنے لگا اس میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اور تقریباً نصف درجن آدمی جھکے ہوئے اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ جوشی کے چہرے پر مسرت کی لہریں رقص کرنے لگیں۔

ہر شخص دل و جان سے اپنے کام میں محو تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک گول آلہ تھا جو کہ ایک دوسرے پتلے سے جڑا ہوا تھا۔ یہ پہیے بڑی تیزی سے گردش کر رہے تھے مانند انہیں سے وہ کھڑکھڑاہٹ کی صدا پیدا ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرتا کہ ایشیا کے تمام ماہر ہیرے تراشنے والے اچانک کہاں لاپتہ ہو گئے تو جوشی کے علاوہ کوئی اور صحیح جواب نہ دے سکتا تھا۔

جوشی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بوڑھا آدمی جو موٹے دبیز شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا، اس کی جانب بڑھا اور جھک کر تعظیم کرنے کے بعد بولا۔

"دنوں سے آپ نظر نہیں آئے باس! مجھے بہت تشویش تھی۔"

"سب ٹھیک ہے جوگیندر!" جوشی نے جواب دیا۔ "میں ذرا ضروری کام سے باہر چلا گیا تھا۔ کوئی نئی خبر تو نہیں ہے۔ تمہارے سب آدمی آرام سے ہیں نا۔ اگر کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"یہاں ہر طرح کا آرام میسر ہے باس۔" جوگیندر نے کہا۔ "آپ کی عنایات کے لئے ہم لوگ صدقہ مشکور ہیں۔"

"میں نے جو کام دیا تھا وہ مکمل ہوا یا نہیں؟" جوشی بولا۔ "مجھے جلد ہی مال باہر بھیجنا ہے۔"

بوڑھا جوگیندر جوشی کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ ایک قیمتی ٹرے میں سیکڑوں بیش بہا ہیرے لعل اور نیلم وغیرہ رکھے ہوئے دمک رہے تھے۔ ان کی تراش خراش میں اتنی مہارت سے کام لیا گیا تھا کہ جوشی کی آنکھیں خوشی سے جگمگانے لگیں۔

"باس۔" جوگیندر نے کہا۔ "ان میں سے کچھ پتھر تو اتنے خوبصورت اور بڑے تھے کہ انہیں تراشنے میں مجھے تکلیف ہوتی تھی۔"

"میں سمجھتا ہوں جوگیندر!" جوشی نے کہا۔ "تم ایک عظیم رشٹ ہو اور تم چیزوں کو آرٹ کی نظر سے ہی دیکھتے ہو۔ چلو میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں اگر تمہارے کسی آدمی کو کوئی شکایت ہو تو بیان کر دینا۔"

کھانے پینے کی تو ہر آسائش ہم لوگوں کو میسر ہے بوڑھا فانی کا رہا۔ "البتہ ان میں سے بہت سے لوگ کچھ دنوں کے لئے باہر کی کھلی ہوا اور روشنی کے لئے بے چین ہیں۔"

"انہیں اطمینان دلاؤ جوگیندر۔" جوشی نے چہک کر کہا۔ "میں بہت جلد ان سب کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ سمیت رخصت دینے والا ہوں۔ میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کام چند دن بند رہے۔"

"آپ کا کرم ہے باس!"

جوشی نے ہر کاریگر کے پاس جا کر وہ چار فراہیہ باتیں کیں اور کام کا معائنہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا کہ اپنے کاریگروں کو خوش رکھنے میں ہی نفع ہے۔ اس سے اس کے آدمیوں کی بے اطمینانی دور ہو جاتی تھی۔ اسی طرح تمام کرے کا چکر لگانے کے بعد اس نے دوسرا دروازہ کھولا۔ یہ ایک دوسرا تہ خانہ تھا۔ یہاں بھی چھ سات آدمی کام کر رہے تھے مگر کھڑکھڑاہٹ کی آواز یہاں نہیں سنائی دیتی تھی۔ اس جگہ جیسی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ میز پر جھکے ہوئے کئی آدمی اس تہ خانہ میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے اگر شمیم اختر، مسٹر ٹونی یا انسپکٹر ان تہ خانوں کو دیکھتے تو یقیناً ان کے منہ سے اتنے عظیم الشان بم کے ناظم کے لئے کلمہ تحسین بلند ہوتا۔

یہاں بھی جوشی ہر شخص کے نزدیک گیا اور ہر ایک سے دو منٹ گفتگو کی۔ نوٹ چھاپنے کی ہر پلیٹ کو اس نے بغور دیکھا اور سب کام ٹھیک پا کر اسے یک گونہ تسکین کا احساس ہوا۔

اس کے بعد وہ دوسرے تہ خانہ میں گیا یہاں ایک بڑی سی عجلی کی بھٹی روشن تھی جس میں سونے کے سکے، انگوٹھیاں، زیورات، زنجیریں اور چھلے گلائے جا رہے تھے۔ گلے ہوئے سونے کو چھوٹی چھوٹی اینٹ میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ ان گنت نشستیں، الماریوں اور میزوں پر سونے کی چھوٹی چھوٹی اینٹیں

کو احتیاط کے ساتھ مقفل کر دیا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی جو کامیاب ہو رہی تھی۔ اسٹاف کا رخانہ سائیکلوں کی نیکڑی کی پشت پر چل رہا تھا۔ ایشیا کے بہترین ممالک سے ربڑ کا مال یہاں آتا تھا اور پھر وہ بالکل تبدیل شدہ شکل میں باہر نکل کر بکتا تھا۔ سینکڑوں کاریگر وہاں کام کرتے تھے۔ وہ سب یہیں رہتے تھے اور کھاتے پیتے تھے۔ صرف رات کے وقت کچھ دیر کے لئے باہر نکل کر باغ میں ٹہلنے کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی تھی۔

جوشی کا خواب حقیقت میں بدل گیا تھا۔ اب وہ کچھ دنوں کے لئے کاروبار بند کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیرا تاش باہر جانے والے سے کہا تھا کہ اس کا ارادہ ملازموں کو سہ ماہی تنخواہ ایک ماہ کی رخصت دینے کا ہے ایشیا کے مختلف ممالک کی پولیس پریشان ہو رہی تھی، اور جس طرح جرائم کی تفتیش میں محو تھی۔ علاوہ اس کے ایشیا کے عظیم ترین سراغرساں شمیم اختر کے اسسٹنٹ سلیم کی کارخانہ میں آمد نے بھی جوشی کو فکرمند بنا دیا تھا۔ سلیم اس کارخانے میں کیوں آیا۔؟ کیا شمیم اختر کو شوبھا سائیکل کمپنی پر شبہ ہو گیا ہے؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا آخر اس نے پریشانی کو اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔

"میں آج ہی اس گتھی کو سلجھنے پر مجبور کر دوں گا دیکھتا ہوں وہ کیسے خاموش رہتا ہے۔"

حملے کی تیاری

شمیم اختر کی نیند اچانک کھلی گئی اور وہ سراسر گوش ہو کر آہٹ لینے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کی نیند اچانک کیوں اچٹ گئی۔ ٹائم پیس ایک بجا رہا تھا شمیم اختر نے سرہانے رکھے ٹیبل پر سے اپنا سگریٹ کیس اٹھا کر ایک سگریٹ نکالا اور سلگا کر کش لینے لگا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ ہر چہار جانب سناٹا اور تاریکی ــــ اس نے بتی نصیب روشن کیا اور ایک بار ٹیبل میں چاروں طرف چکر لگایا۔ لیکن کسی قسم کی کوئی آہٹ اُسے سنائی نہیں دی۔ خادم کے کمرے میں وہ نہیں گیا۔ کیونکہ اسے اس جانب سے اطمینان تھا۔ اس لئے کہ وہاں اس کا وفادار بلڈاگ سو رہا تھا اور اس کی موجودگی میں اس طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔

غرضکہ کہیں بھی کچھ نہ تھا پھر اس کی نیند کیسے اچٹ گئی۔ اس نے سوچا کہ ضرور اس کے دل میں کوئی خیال اس قسم کا پیدا ہوا ہوگا جس نے اُسے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ سونے سے قبل کیا بات سوچ رہا تھا۔

"ہاں یاد آیا ــــ" وہ ہنستے ہوئے بڑبڑایا ــــ "میں گزشتہ سات ماہ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کولمبو کے سینٹرل بنک میں ڈکیتی۔ بینکاک بر ما کا واقعہ۔ پاکستان، انڈونیشیا اور دیگر ممالک میں لوٹ مار اور اس کے بعد چڑی کا قتل اور اس کے بینک کا دیوالہ ــــ"

ان واقعات کے یاد آتے ہی اس کا خیال سلیم کی رپورٹ کی جانب گیا اور اُسے یاد آیا کہ دو دن سے سلیم کا کوئی حال نہیں معلوم ہوا۔ کہیں سلیم، جوشی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا ــــ

یہ خیال آتے ہی وہ فکرمند ہو گیا۔ بار بار اس کی توجہ حالیہ واقعات اور سلیم کی جانب مبذول ہو جاتی تھی۔ اس نے پہلا سگریٹ پھینک کر دوسرا سگریٹ سلگا لیا اور پھر اچانک سارا راز اس کی سمجھ میں آ گیا۔

"اوہ!" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "کتنا کمزور ہو گیا ہے میرا دماغ! لیکن کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے ــــ؟ آخر شوبھا کمپنی کی سائیکلیں اتنی سستی کیوں فروخت ہو رہی ہیں؟ اگر میرے دماغی قوت نہیں تو بس پھر اس معمہ کا حل یہی ہے سائیکلوں کے فریم دیگر ممالک سے درآمد ہوتے ہیں سلیم نے لکھا تھا کہ فریم سیلون، برما، پاکستان وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکیداروں سے منگوائے جاتے ہیں کیا سیلون سے بھیجے جانے والے سائیکل فریموں اور کولمبو سینٹرل بینک کے سات لاکھ کے جعلی ڈرافٹ میں کوئی تعلق ممکن ہے؟ پاکستان میں ڈاکے اور وہاں سے بھی سائیکل فریموں کی درآمد ــــ تب تو یقیناً حال ہی میں رنگون سے بھی فریم آنے والے ہوں گے۔ لیکن سلیم ــــ ۔۔۔۔ دو دن سے اس کی کوئی رپورٹ کیوں نہیں آئی۔ اس نے اٹھ کر سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی۔ پھر فون کے قریب جا کر ایکسچینج سے گفتگو کی۔ اس کا نام سنتے ہی آپریٹر نے حکم کی تعمیل کی۔ شمیم اختر نے سکریٹریٹ سروس کی جانب سے نوٹ کو رنگون تجھیگرام بھجوایا۔

"مطلع کیجئے۔ کیا رنگون سے شوبھا سائیکل کمپنی بنگلم پور، انڈیا کے پتہ پر فریم وغیرہ بھیجے گئے ہیں یا بھیجے جانے والے ہیں؟ ہیمبر آف کامرس سے مدد لیجئے بات پوشیدہ رہے۔ جواب فوراً۔ شمیم اختر"

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور مرغولے اڑاتا ہوا سوچنے لگا۔

"اگر میرا خیال ٹھیک ہے تو اس بار یقیناً جوشی کو گرفتار کر سکوں گا۔ لیکن اگر یہ اس خط نکلا تو سکریٹریٹ سروس والے میری حماقت پر پھبتیاں کسیں گے ــــ"

سلیم کی خاموشی اسے پھر پریشان کرنے لگی۔ کیوں نہ اسپکٹر دن کو فون کیا جائے۔ اگر جوشی سلیم کو پہچان گیا تو اس پر بڑی آفت آ سکتی ہے زیادہ غور و خوض غیر مناسب سمجھ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور اسپکٹر دن کو رنگ کیا۔ کچھ دیر بعد دن کی آواز سنائی دی۔ بستر استراحت پر سے اُسے اٹھنا بار گزرا تھا۔ کیونکہ اس کی آواز بری طرح جھنجھلائی ہوئی تھی۔

"بڑے۔ کون ہے بھائی۔ یار لوگ بیچ سے سونے بھی نہیں دیتے۔"

"میں شمیم اختر بول رہا ہوں مدن!" اس نے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے فوراً کم از کم پچاس ساتھ مسلح آدمی دے سکتے ہو۔ ایک مقام پر چھاپہ مارنا ہے۔"

"پچاس ساٹھ آدمی۔؟ بات کیا ہے اختر صاحب!"

"وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں انسپکٹر!" شمیم نے تنگ کر کہا۔ "میں نصف گھنٹہ میں چھاپہ مارنا چاہتا ہوں۔ تم وہاں کے مقامی تھانے سے جتنے کچھ آدمیوں کا انتظام کر سکتے ہو میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ اگر میرا یہ قیاس درست نکلا تو سمجھو کہ یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ثابت ہوگی۔"

"لیکن اختر صاحب!" مدن نے تامل پیش کی "آپ خود سوچئے کہ کس طرح ممکن ہے اتنی رات گئے پچاس ساٹھ مسلح آدمیوں کے ہمراہ کسی مقام پر حملہ کرنا۔ طرہ یہ ہے کہ آپ کے پاس کسی کے خلاف مکمل ثبوت بھی موجود نہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کا خیال باطل ثابت ہوا تو میری کتنی بدنامی ہوگی۔؟"

"میں اور زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا مدن۔" شمیم اختر نے کہا۔ "اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کا تعلق بینک آف برما کے واقعہ اور دھنوں کے جیکر چنڈی والی واردات سے ہے۔ شاید تم نے ان دونوں واقعات کا حال سنا ہوگا۔"

"بس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"کیا یہ کافی نہیں ہے۔؟" شمیم اختر نے کہا۔ "اچھا اور سنو۔ خیال ہے کہ ہم لوگ اس طرح پنڈت جوشی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"

"ارے باپ رے!" مدن جوش میں آکر دو سر سے چیخا۔ "آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" شمیم اختر بولا "میں سیکرٹریٹ سروس کے احاطہ سے آ رہا ہوں۔ وہیں ملو۔"

شمیم اختر جیپ جلد کیجئے وغیرہ تبدیل کر کے تیار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیکرٹریٹ سروس میں تھا۔ دفتر والے اتنی رات گئے وہاں دیکھ کر چونک گئے اور سیکرٹریٹ سروس میں ہل چل مچ گئی۔ اس عظیم جاسوس کی آمد کا سبب تھا۔ ٹھیک کسی کو معلوم نہ تھا مگر کہ وہ پراسرار طور پر کام کرتا تھا۔ لیکن اس کے کارناموں کی وجہ سے حکومت کی نگاہوں میں بہت وقعت تھی۔ کئی بار اسے سیکرٹریٹ سروس میں بڑے بڑے عہدے پیش کئے گئے۔ لیکن وہ ہر طرح کی بندشوں سے علیحدہ رہ کر آزادانہ کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ تاکہ کسی کام بالا دست اس کے کسی کام میں بے جا مداخلت نہ کر سکیں۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر مدن بھی دفتر میں آگیا۔ شمیم اختر اس سے مخاطب ہوا۔

"آپ سمجھ لو انسپکٹر! کہ یہ ایک قسم کا جوا ہے۔ اگر تم چاہو تو اب بھی الگ ہو سکتے ہو۔ لیکن اتنا سوچ لو کہ اگر میرا قیاس درست ہوا اور تم جوشی کو گرفتار کر سکے تو کتنی عظیم کامیابی ہوگی۔ مجھے تو اس وقت سلیم کی جانب سے خدشہ لگا ہوا ہے۔ اگر کہیں وہ غریب لڑکا جوشی کے ہاتھ لگ گیا ہوگا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔؟"

انسپکٹر مدن کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا

"شمیم صاحب یہ تو سوچئے!" اس نے کہا۔ "یہ کتنی بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اتنے مسلح آدمیوں کے ہمراہ آدھی رات کو چھاپہ مارنا۔ اور پھر ہمارے پاس کوئی پختہ ثبوت بھی نہیں ہے۔ میں نے سب انسپکٹروں کو ہدایات دے دی ہیں اور آدھی پولیس لائنوں پر سنگم پور روانہ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اگر کہیں ہم ناکام رہے تو لوگ کتنی ہنسی اڑائیں گے کیا آپ کو اچھی طرح یقین ہے کہ جوشی وہاں پر موجود ہے؟"

"ہاں جوشی وہیں ہے۔" اس بے کا چٹ سے جھنجھلا کر شمیم اختر نے کہا۔ "ویسے بھی سکیرٹریٹ سروس کے ایک انسپکٹر پر کوئی انگلی اٹھا سکتا ہے۔ تم لوگوں کو تو خصوصی اختیارات حاصل ہیں اور محض شک کی بنا پر ہی تم شوجا بلیسر اور شوجا سائیکل کمپنی کی تلاشی لے سکتے ہو۔ خیال کرو کہ اب تک میرے ساتھ کام کرنے میں تم کبھی گھاٹے میں رہے ہو؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" مدن نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بات تو یہ ہے کہ حال کے واقعات سے سکرٹریٹ بہت بدنام ہو رہی ہے اور لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی غلطی میری جانب سے ہو گئی تو سمجھ لیجئے کہ سخت ایکشن لیا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" شمیم اختر غصہ سے سرخ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر تیکھے لہجہ میں بولا۔ "تم سوچتے اور سمجھتے رہو۔ لیکن یاد رکھو اس سے اچھا موقع شاید پھر کبھی نہ ملے گا کہ بلیسنٹرل بینک کے سات لاکھ کے بجائے آف برما کے بارہ لاکھ۔ چنڈی کا قتل اور اردگرد کے علاقہ میں ہونے والی فوٹ مار کا مال مسروقہ۔ جعلی نوٹوں کی واردات۔۔۔ اچھی طرح سوچ سب کے مجسم ایک ہی بار میں ہاتھ آتے ہیں۔ اگر اب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی تو چیف سے تمہیں مجبور نہ کروں گا، مجھے اکیلے کام کرنا بھی آتا ہے۔"

وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ انسپکٹر مدن نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ "واہ شمیم صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری اب تک کی کامیابی محض آپ کی امداد کی مرہون منت ہے۔ خدا حافظ میں چل رہا ہوں۔ خدا انتظام مکمل ہوئے۔"

شمیم اختر واپس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ میں انسپکٹر مدن نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ دس منٹ بعد وہ پولیس لائنوں پختہ سڑک پر سنگم پور کی جانب دندناتا

تھیں۔ ان کے پیچھے شمیم اختر اور انسپکٹر مدن کی کار تھی جس پر خفیہ پولیس کے دو جوان اور سوار تھے۔ ان کے عقب میں دو اور لاریاں تھیں جن میں سادہ وردی والے کانسٹیبل سوار تھے۔

قافلہ پورب کی طرف آ رہا تھا۔

چوہے بلی کا کھیل

موہن سنگھ نے زور سے اس کے شانے پر ٹھوکر ماری اور سلیم بیدار ہو گیا۔ اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس وقت رات ہے یا دن۔ ہاتھ پر طویل وقفہ تک پٹی بندھے رہنے کی وجہ سے ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ منہ میں بھی درد تھا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کسی خونخوار درندے کی طرح سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا جوشی اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

اس کا اشارہ پاکر منور نے سلیم کے ہاتھ پیر کھول دیئے۔ اور منہ سے کپڑا نکال لیا اور اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر ان خونخوار نہ ہونے کی وجہ سے سلیم بیٹھ نہ سکا اور غش کھا کر زمین پر لڑھک گیا۔ جوشی نے اپنے آدمیوں کو اسے ہوش میں لانے کا حکم دیا وہ لوگ برانڈی کا گلاس لائے اور اسے سلیم کے حلق میں انڈیل دیا سلیم میں اس وقت اتنی حس باقی نہ تھی کہ وہ کسی طرح کی مخالفت کر سکتا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے حواس کچھ بجا ہوئے اور جسم میں کچھ قوت عود کر آئی۔ منور نے اس کے ہاتھ اور پیروں پر کسی عرق کی مالش کی اور اس کے درد میں رفتہ رفتہ تخفیف ہونے لگی اور شریانوں میں دوران خون جاری ہو گیا۔ اس اثنا میں جوشی اپنی سگریٹ پھونک چکا تھا سلیم کو بھی طرح معلوم تھا کہ جوشی اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے والا ہے۔ اس کی درندگی اور اذیت کوشی فطرت سے سلیم بخوبی واقف تھا۔ دماغ ابھی پورا کام نہیں کر رہا تھا اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کمرے میں کم از کم تین دن تک پڑا رہا ہے۔ معلوم نہیں شمیم اختر اب تک واپس آئے یا نہیں۔ "اس نے دل ہی دل میں سوچا ہے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ وہ رنگون کس لئے گیا ہے۔ اگر شمیم اختر صاحب واپس آ گئے ہیں تو انھیں میرے بارے میں فکر لاحق ہو گی لیکن خدا خواستہ اگر وہ اب تک رنگون میں ہیں تو پھر میری حفاظت کس طرح ہو سکے گی؟

بہرحال اگر شمیم اختر رنگون سے ہندوستان واپس بھی آ گیا تو خدا جانے اس کی کیا امید کی جا سکتی تھی کہ وہ وقت پر اس کی مدد کو پہنچ سکے گا۔ سائیکل کمپنی کے پرزے میں دبا کر دی جانے والی چٹ کی تحریر کے مطابق اسے ۴۸ گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی اور اگر وہ اپنی جان دے کر اس کی شمیم شمیم اختر تک پہنچا سکتا تو خوشی راضی ہو جاتا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ باتوں ہی باتوں میں جتنا وقت ضائع کر سکے وہی غنیمت ہے۔ اسی وقت جوشی کی آواز نے اس کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا۔

"بس کرو منور! اتنا بہت ہے اب وہ ٹھیک ہو گیا ہے" پھر وہ سلیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں تمہیں ایک آخری موقع دینا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں زندگی سے محبت ہے تو سیدھی طرح میرے سوالات کا جواب دو۔ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ میرا مطلب تم سمجھے یا نہیں ——؟"

سلیم نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ لاپروائی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جوشی کا غصہ بھڑک اٹھا اور اس نے فرا کر کہا۔ "تم خود ہوش ہو کر اپنا منہ بچانا چاہتے ہو تمہارا علاج یہ ہے ——"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سلیم کی کنپٹیاں پکڑ کر پیچھے کی طرف مروڑ دیں اور انھیں ہلا دینے لگا سلیم کی تکلیف بڑھتی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کنپٹیاں پکے دھاگے کی طرح اب ٹوٹنے والی ہیں۔ اس کے چہرے کی سرخی یکلخت غائب ہو گئی۔ جیسے لہو کی ہر بوند اس سے نچوڑ لی گئی ہو اس نے اپنے پیروں سے جوشی کو لات مارنی چاہی لیکن منور انھیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ خاموش رہنے کا پختہ ارادہ کر لینے کے باوجود سلیم کے منہ سے چیخ نکل ہی گئی۔

"اب بولے گا یا نہیں —— ؟" جوشی نے گرج کر پوچھا اور کچھ کہنے کو ایک اور دبا دیا۔ سلیم بڑی مشکل سے کراہا "جوشی صاحب!" جوشی نے قہقہہ لگا کر کہا: "اگر اب بھی خاموش رہا تو تیری زبان باہر کھینچ لوں گا ——"

سلیم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ جوشی نے غصہ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پھر بے ہوش ہو گیا کم بخت —— ہوش میں لاؤ۔ اب یہ خاموش رہنے کی جرأت نہ کرے گا ——"

اس نے سلیم کو چھوڑ دیا اور سگریٹ سلگا کر کش لینے لگا۔ منور نے پھر سلیم کو برانڈی کا ایک پیگ پلایا اور اس کی پیٹھ، گردن اور ہاتھ وغیرہ میں اسی عرق کی مالش کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد سلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ اور نفرت سے جوشی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کہو برخوردار۔" جوشی زہر خند کر کے بولا۔

"مزاج شکنے پہنچا ہے؟"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو —— ؟" آخر سلیم نے کہا۔

"خوب!" جوشی خوش ہو کر بولا "میری ترکیب کارگر ہوئی۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو بیٹے تو میری باتوں کا جواب دیتے رہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اگر تم نے سچ سچ بتا دیا تو میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا صرف کچھ عرصہ کے لئے یہاں قید رکھا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے جیل جانے کی تدبیر اور کھوجی یہاں ایک بجلی کی بھٹی بھی ہے جو ایک سیکنڈ میں تمہارے جسم کو راکھ میں تبدیل کر سکتی ہے اور شمیم اختر چاہے جتنا کامیاب جاسوس ہو، راکھ میں سے اپنے اسسٹنٹ کو تلاش نہیں کر سکتا۔"

"تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سلیم نے

واکلوائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم نے میری سائیکل کمپنی میں نام تبدیل کرنے کا کام کیوں کیا۔؟" جوشی نے دریافت کیا۔

سلیم کو اچھی طرح علم تھا کہ جب تک وہ پوری بات نہ بتائے گا جوشی اسے جان سے نہیں مارے گا، دوسری طرف وہ کوئی ایسی بات جوشی کو نہیں بتانا چاہتا تھا جس سے شمیم اختر پر مصیبت آ جائے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لئے اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے میں سمجھا نہیں ——"

"لڑکے! جوشی نے ڈپٹ کر کہا۔ "میرے ساتھ چالاکی کرنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرا مقصد اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔ بتاؤ کہ تم نام تبدیل کر کے میرے کارخانے میں کیوں گھس آئے اور وہاں کیا کام کر رہے تھے؟ تم نے اپنا نام انور علی لکھوایا تھا؟"

"ہاں ——!"

"شمیم اختر نے بھیجا تھا ——؟"

"ہاں ——!"

"شمیم اختر کو میرا راز جاننا چاہتا تھا۔" جوشی نے پوچھا۔ "میرے اوپر کسی کو شک ہے؟"

"انہیں تمہارے اوپر کوئی شک نہیں ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔

"تم نے پھر شرارت شروع کی ——" جوشی غرایا اور پوری طاقت سے ایک طمانچہ سلیم کے منہ پر جمایا۔

شمیم صاحب کو اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ شوبھا سائیکل کمپنی کے مالک تم ہو۔" سلیم نے جواب دیا۔ "انہیں تو یہ بات میرے یہاں آنے کے بعد معلوم ہوئی"

جوشی سمجھ گیا کہ سلیم سچ کہہ رہا ہے، اس نے کہا

"اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"اختر صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں نہیں بلکہ شوبھا سائیکلوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ میں اور زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔" سلیم نے کہا۔

"اب میں جوشی نے کہنیوں کو پیٹ دینے والا پہلا داؤ پھر اس پر آزمایا۔ درد سے بلبلا کر سلیم نے کہا۔ "ٹھہرو بتاتا ہوں ——"

"اچھی بات ہے بولو ——" جوشی ہاتھ چھوڑ کر بولا "اگر اب تم نے کوئی چالاکی کی۔ تو میں دوسری ترکیب عمل میں لاؤں گا۔"

"اگر میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں ——" شمیم نے وقت گزاری کے لئے کہا ——"تو کیا تم مجھے یہاں سے چلا جانے دو گے ——"

"میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا اور بس ——" جوشی نے کہا۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں ——" سلیم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اختر صاحب نے مجھے صرف شوبھا سائیکلوں کے بارے میں ہدایات دے کر یہاں بھیجا تھا ——"

"کیوں ——؟" جوشی نے دریافت کیا۔

"ہاشمی سائیکل کمپنی کے جنرل منیجر اختر صاحب کے پاس آئے تھے۔" سلیم نے کہا۔ "وہ اختر صاحب کو یہ بات معلوم کرنے پر مقرر کرنا چاہتے تھے کہ شوبھا سائیکلوں کے دام اتنے کم کیوں رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے میں کارخانے میں کام بھی کر رہا تھا ——"

"سچ کہتے ہو ——" ٹٹولتی ہوئی نظروں سے جوشی نے اسے دیکھا۔

"میں قسم کھا سکتا ہوں ——"

جوشی کو یقین آ گیا کہ بات سچ ہے۔ اس نے کہا

"پھر تم نے سراغ لگایا ——؟"

"نہیں ——" سلیم بولا ——"مجھے کامیابی نہیں ہوئی ——"

"پھر تم میرے پلیس میں کیوں داخل ہوئے؟"

"میں نے سوچا ——" سلیم بولا ——"شاید یہاں کوئی راز معلوم ہو جائے۔ ہاشمی نے کہا تھا کہ اتنی سستی قیمت پر سائیکل فروخت کرنے میں منافع ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"کیا تم شمیم اختر کے پاس کوئی اطلاع بھیج چکے؟"

"ہاں"

"کیا تم نے اسے مطلع کر دیا کہ اس کارخانہ کا مالک میں ہوں ——؟"

"انہیں سب سے پہلی اطلاع میں نے یہی بھیجی تھی"

"ہوں ——" جوشی نے غرا کر منہ کو ہدایت کی "اس پر اور سختی سے نگرانی رکھو۔ صبح میں تمہیں مزید ہدایات دوں گا کہ اس سے کیا برتاؤ کیا جائے"

"لیکن تم تو کہتے تھے کہ مجھے چھوڑ دو گے ——" سلیم نے کہا۔

"خاموش رہو صرف!" جوشی اسے ڈپٹ کر بولا "مجھے ابھی تجھ سے اور کام لینا ہے۔ اسی وقت موہن سنگھ گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا

"ذرا جلدی چلئے باس —— بہت بڑی خبر ہے"

ٹڈی بھیڑ

سکریٹریٹ سروس کی لاریاں اور کاریں سکم پور پہنچ گئیں۔ سادہ لباس میں ملبوس کانسٹیبلوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مسلح پولیس کے آدمی ہیں۔

شمیم اختر انسپکٹر خان کے ہمراہ مقامی پولیس اسٹیشن کے انچارج کے پاس پہنچا۔ اس نے بڑی کے ساتھ انسپکٹر خان کو جواب دیا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ شوبھا سائیکل کمپنی کا کارخانہ کہاں واقع ہے۔ یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر شوبھا نامی عمارت اس کی قیام گاہ ہے۔ لیکن یہ سب معاملہ کیا ہے صاحب؟"

"آئی جی صاحب نے تم کو ہدایات بھیجی ہیں یا نہیں کہ تم کو میرے احکامات کی پابندی کرنی چاہئے ——؟"

"جی ہاں ——" انچارج افسر کچھ نرم پڑتا ہوا "لیکن پنڈت شوبھا رام ٹنڈی کو پڑھے لکھے اور اعلیٰ

ہر دلعزیز آدمی ہیں۔ ابھی گزشتہ دو چار دن سے باہر گئے ہوئے تھے۔ آج ہی شام کو واپس لوٹے ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے ——" انسپکٹر مدن نے کہا کہ وہ یہاں بہت ہر دلعزیز ہے۔ لیکن ہم لوگوں کو اس سے بہت ضروری کام ہے۔ تم صاحب کمشنر کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میرے احکامات کی پابندی کرو۔"

"فرمایئے میں حاضر ہوں۔"

"انسپکٹر مدن نے شمیم اختر کی طرف دیکھا اور گفتگو کا سارا پنا اوپر لیتے ہوئے شمیم اختر نے دریافت کیا کیا تم نے کبھی سیکریٹ سروس کے سابق انسپکٹر پنڈت شوبھارام جوشی کا نام سنا ہے ——؟"

"جی ہاں ——" انسپکٹر نے جلدی سے کہا۔ "سیکریٹ سروس کے نام پر یہ ایک بہت بڑا دھبہ ہے کہ ایک آنریری بدمعاش وہاں انسپکٹر رہ چکا ہے۔"

"تو جان لو کہ شوبھا سائیکل کمپنی کا مالک ہی بدمعاش ہے!"

انسپکٹر انتہائی فرطِ حیرت سے اچھل پڑا —— اور انھیں تعجب سے دیکھنے لگا۔ لیکن دونوں کے چہرے سنجیدہ تھے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ کیوں سیکریٹ سروس کا بہترین کارکن مدن اور ایشیا کا عظیم سراغرساں اختر اتنی رات کو وہاں آئے ہیں۔ اس نے کہا۔

"فرمایئے آپ کو کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے؟"

"آدمی ہمارے پاس کافی ہیں۔ صرف راہ بتانے والا کوئی چاہیئے۔"

اسی وقت پولیس اسٹیشن کی باؤنڈری میں ایک جیپ آکر رکی۔ اور آئی جی پولیس اپنی وردی میں ملبوس اس سے اتر کر اندر آگئے۔

"اختر!" وہ بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر بولے —— "یہ سب کیا معاملہ ہے ——"

دونوں بچپن سے ایک ہی جگہ دوست تھے۔ شمیم اختر نے اختصار کے ساتھ انھیں تمام واقعہ بتایا اور اس تمام داستان کو سن کر کمشنر صاحب پولیس افسران بدحواس رہ گئے۔ انھوں نے کہا۔

"یہ شوبھارام بہت قدآور حلقہ میں بہت مقبول شخص ہے۔ کہیں سے غلطی تو نہیں ہوئی ——"

"جی نہیں ——" شمیم اختر بولا "مجھے سلیم کی عقل پر اعتماد ہے ——"

"پھر یہ کرنی بیکار ہے۔ چلئے ——"

تھوڑی دیر بعد موٹریں شوبھا پبلیسٹی کے قریب پہنچیں مقامی انسپکٹر پولیس اور سارجنٹ کو راستہ اچھی طرح معلوم تھا۔ ان لوگوں نے شوبھا پبلیسٹی کے بارے میں خاص خاص باتیں شمیم اختر کو بتا دی تھیں۔ سارجنٹ نے صدر پھاٹک پر پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔

گھنٹی کی آواز سن کر موہن سنگھ نے دروازہ کھولا اور باہر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پھاٹک کا بائی پاس بند کر دیا۔ اور پھر اس کی نظر مقامی پولیس کے انسپکٹر پر جا پڑی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر فوراً پہچان گئے۔ اسمگلنگ کے سلسلے میں انسپکٹر نے ایک بار اسے گرفتار کر کے جیل بھجوایا تھا۔ موہن سنگھ نے فوراً دروازہ بند کرنا چاہا۔ لیکن شمیم اختر اور کمشنر پولیس نے دوسری طرف سے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ بارگنجائش کا کام جان کر موہن سنگھ تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ شمیم اختر کے ہمراہ دوسرے لوگوں نے اس کا تعاقب کیا، چونکہ وہ لوگ پبلیسی کے راستوں سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ اس لئے موہن سنگھ ان سے پہلے ہی عمارت میں پہنچ گیا۔

باؤنڈری پار کر کے وہ لوگ اندر پہنچے تو عمارت کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انسپکٹر مدن نے آئی جی صاحب سے کہا۔ "فرمایئے دروازہ توڑنے کے بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ تاکہ اسی بہانے بات پاکر جوشی فرار ہو سکتا ہے ——"

"لیکن وہ فرار کس راہ سے ہو سکتا ہے ——؟" آئی جی صاحب بولے۔ "باقی طرف سے عمارت کا

صاحب کیا بچا ہے؟ کیوں اختر صاحب؟ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"جوشی جیسے شخص کے لئے کوئی کام خارج از امکان نہیں ہے ——"

"اچھی بات ہے ——" آئی جی پولیس نے کہا —— "مناسب کے مطابق ایک بار گھنٹی بجا کر دیکھتے ہیں اگر دروازہ نہ کھلا تو مجبوراً توڑنا پڑے گا۔"

بٹن دبایا گیا۔ اندر کسی مقام پر گھنٹی بجی۔ لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اس وقت جوشی سلیم سے گفتگو کر رہا تھا۔ موہن سنگھ کی غیر متوقع آمد سے فوراً ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ موہن سنگھ نے بتایا کہ پولیس آگئی ہے اور دروازہ توڑا جا رہا ہے۔ جوشی نے سوچا کہ ضرور اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس کا خیال سلیم اور پھر شمیم اختر کی جانب گیا۔ اس نے موہن سنگھ سے کہا۔

"تم جاکر اپنی منزل سے دروازہ اور اس کی خادمہ کو نیچے لے آؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ گھنٹی کون بجا رہا ہے۔"

موہن سنگھ زینہ طے کر کے اوپر پہنچا اور جوشی نے بٹن دبا کر ایک شیشہ اپنے مقام سے ہٹایا اور دیکھا کہ چھ۔ آدمی صدر دروازے پر زور زور سے دھکا دے رہے ہیں۔ اُسے چار سپاہیوں کے ہجوم میں شمیم اختر پولیس کمشنر، انسپکٹر مدن اور مقامی پولیس انسپکٹر اور سارجنٹ وغیرہ نظر آئے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ پبلیسی سے شمیم اختر کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دے۔

شکاف سے روشنی چھنتی ہوئی دیکھ کر شمیم اختر اس طرف لپکا۔ اُسے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر جوشی پیچھے ہٹ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ ان لوگوں کے ہمراہ صرف اتنے ہی آدمی نہیں ہوں گے بلکہ اور بھی سپاہی ادھر ادھر چھپے ہوں گے۔ اس وقت اُسے صرف اپنی اور موہن سنگھ کی پڑی تھی۔ موہن سنگھ کے ہمراہ نیچے آنا بیکار تھا۔ وہ سیدھا کمرے میں گیا اور [illegible]

بڑی مشکل سے ساتھ گھنٹے بجنے لگے۔ یہ کارندوں کے لئے
مشعل تھا کہ وہ اپنی اپنی جانیں بچائیں۔

پھر وہ دوسرے کمرے میں جو کے ساتھ داخل ہوا
اور ایک پتھر کو ہٹا دیا۔ پتھر کی سل جس کے نیچے
اسپرنگ لگا تھا ایک طرف ہٹ گئی اور تہ خانے کا راستہ
کھل گیا۔ جو اور جوشی کے علاوہ ان کے ساتھیوں میں
سے کسی کو بھی اس راستے کا علم نہ تھا۔ وہیں سنگھ کو بہت دیر
سے شک تھا کہ اس کے باس نے فرار کے لئے کوئی ایسا راستہ
ضرور محفوظ رکھا ہوگا جس سے وہ لوگ عالم میں خاصہ
اور جوکا ہاتھ پکڑ کر جوشی نے انھیں نیچے اتار دیا۔ اور
پھر سل کو پہلے مقام پر لگا کر وہیں سنگھ سے کہا ــــ

"تم میرے ہمراہ آؤ ــــ"

وہ اس کے ساتھ دوسری طرف گیا اور اس خفیہ
تہ خانے میں جا پہنچے جہاں ہیرے وغیرہ تراشے جاتے
تھے ــــ

"تم رائفل لے کر یہاں پہرہ دو ــــ" اس نے وہیں سنگھ
کو حکم دیا۔ "اگر کوئی اس کمرے کی طرف نظر آئے تو فوراً
گولی سے اڑا دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر میری واپسی سے
قبل تم اس جگہ سے ہٹے تو جان کی خیر نہ سمجھنا ــــ"

سب کارندے اکٹھے ہو کر ایک کونے میں جمع ہو گئے تھے
یہاں سے باہر نکلنے کے لئے ایک خفیہ راستہ تھا۔ اس طرح
کے فیرستی حملے کے لئے جوشی نے کارندوں کو باہر نکالنے
کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔

"میرے دوستو!" جوشی نے بھرائے ہوئے گلے
سے کہا۔ "تم لوگ اس راہ سے باہر نکل جاؤ اور وہاں
سنسٹر اوکر شہر چلے جانا۔ وقت آنے پر میں تم لوگوں
کو اطلاع بھیجوں گا ــــ"

وہ لوگ باہر نکلتے ہوئے چھوڑ کر وہ تمام ہیرے
اور جواہرات وغیرہ ایک بیگ میں بھر کر دوسرے تہ خانے
میں آیا۔ جہاں نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ اس جگہ کے
تمام کاغذ پہلے ہی فروخت ہو چکے تھے۔ صرف ایک کاغذ
تھا جو فوٹو کے کاغذ، پلیٹوں کو بھی کی بھٹی میں جھونک
رہا تھا۔ تقریباً تمام چیزیں قدرتی ہو چکی تھیں۔ جو
چند باقی تھیں انھیں جلدی سے اٹھا کر جوشی نے بھٹی میں
ڈال دیا اور اس شخص سے کہا۔

"تم میرے ہمراہ اوپر آؤ شنکر!"

وہ پلٹ کر پھر اس مقام پر آیا جہاں موہن سنگھ
پہرا دے رہا تھا۔

"کیا کوئی اس طرف آیا تھا ــــ" جوشی نے اس سے
دریافت کیا۔

"جی نہیں باس!" اس نے جواب دیا "لیکن
معلوم ہوتا ہے دروازہ ٹوٹ چکا ہے"

جوشی دونوں آدمیوں کے ہمراہ اوپر آیا اور
تہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے۔ اوپر وہ لوگ اس
کمرے میں پہنچے جہاں جوا اور خادمہ کو چھوڑ گئے تھے۔
وہاں ان سب نے اپنے اپنے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے
پہنے۔ ہیرے جواہرات وغیرہ جیبوں اور تھیلوں میں
بھر نے کے بعد جوشی نے ان لوگوں سے کہا "تم لوگ
ایک ایک کر کے اس شگاف کی راہ سے نیچے چلے جاؤ۔
سامنے ایک دروازہ ملے گا۔ لیکن وہ بند نہیں ہے، دھکا
دے کر اسے کھول لینا۔ اور باہر چلے جانا۔ میں
تھوڑی دیر میں آتا ہوں ــــ"

پھر وہ جو سے مخاطب ہو کر بولا "ڈارلنگ
تم یہاں ٹھیر کر پانچ منٹ میرا انتظار کرو۔ اور اگر میں
اس اثنا میں واپس نہ آؤں تو اس شگاف سے باہر نکل
جانا۔ دروازے سے باہر نکل کر ایک سرنگ نیچے ہی نیچے
لے گی۔ وہ ایک گیراج میں نکلتی ہے۔ وہاں ایک جیپ تیار
کھڑی ہے۔ میں ذرا شمیم اختر سے نپٹ کر ابھی آتا ہوں
گھبرانا نہیں ــــ"

"میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی جوشی ڈارلنگ!"
جو نے کہا ــــ

"تم میری فکر نہ کرو ڈیئر!" جوشی بولا "میں
اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں ــــ"

جو کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ وہاں سے رخصت
ہو گیا۔ ایک بار اس نے اپنا پستول دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ
درست حالت میں ہے۔ جب وہ اوپر آیا تو شور و غل صاف
صاف سنائی دیتا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ پولیس تمام عمارت
کی تلاشی لے چکی ہے۔ اسے شمیم اختر کی آواز سنائی دی

"انسپکٹر صاحب! اس جگہ تلاشی میں وقت ضائع
کرنا بے کار ہے۔ میں نیچے تہ خانوں میں جاتا ہوں ــــ ہر طرف
سے محاصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس لئے جوشی آسانی سے فرار
نہ ہو سکے گا۔ میں اسے گرفتار کرنے کے لئے اس عمارت کی
اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

کسی کے سیڑھیوں سے نیچے آنے کی آواز سنائی دی
جوشی نے فائر کیا۔ گولی شمیم اختر کے شانے کو چھوتی ہوئی
نکل گئی۔ جواب میں اس نے بھی اندازے سے فائر کیا۔
جوشی ایک طرف بھاگا۔ لیکن ساتھ ساتھ پیچھے مڑ مڑ کر
گولیاں چلاتا جاتا تھا۔ ایک گولی شمیم اختر کی کنپٹی میں لگی
اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جوشی نے زور سے
قہقہہ لگایا اور نشانہ لے کر شمیم اختر پر فائر کیا۔ لیکن
افسوس اس کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے بائیں دیوار
سے ایک تختہ ہٹایا اور دوسرے تہ خانہ میں داخل ہو گیا
گولیوں کی آواز سن کر آنے والی پولیس بھی موقع پر
آ پہنچے تھے۔ خون کی بوندیں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے
شمیم اختر گو کہ درد سے بے چین تھا۔ لیکن جوشی کے تعاقب
میں لگا ہوا تھا۔ ایک مقام پر اسے بہت سا خون نظر آیا
اور پھر ایک خون آلود تختہ پر بھی اس کی نگاہ گئی۔ وہ سمجھ
گیا کہ جوشی بھی اس کی گولی سے زخمی ہو چکا ہے۔ اس نے
اس تختے کو اپنے مقام سے ہٹایا اور دوسرے تہ خانہ کا
راستہ اس کی نظروں کے سامنے کھل گیا۔ انسپکٹر پولیس
کے ہمراہ وہ اس میں داخل ہوا۔ انھوں نے شمیم سے کہا

"اختر صاحب آپ زخمی ہیں۔ پہلے اپنا خیال کیجئے"
لیکن شمیم اختر اپنی دھن کا پکا تھا کہنے لگا "کوئی

خاص بات نہیں کمشنر صاحب اس کی کچھ بھال بھی میں چکتی ہے۔ لیکن پھر جوشی کہاں ہاتھ آئے گا۔"

ان لوگوں نے نقاب بندی رکھا ایک کمرے۔ دوسرا خفیہ صدارہ جس کی تلاش میں ان لوگوں کو وقت ضائع کرنا پڑتا تھا۔ راہداری میں حائل ہوتا رہا۔ شمیم اختر سے لگے آگے تھا۔ کھانسی کے زخم سے کافی خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت نڈھال ہو گیا تھا۔ سی آئی ڈی پولیس نے ایک بار پھر اسے آرام کرنے کو کہا۔ لیکن وہ باز نہ آیا اسے صرف جوشی ہی کی فکر نہ تھی۔ سلیم کو بھی آزاد کرانا تھا۔ جوشی نے جس طرح پاگل بنا کر دھاندھلی کی تھیں، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے سے مجنوں ہو رہا ہے اور سلیم کی خیریت نہیں ہے۔

وہ لوگ اس کمرے میں پہنچے جہاں جواہرات کو تلاش کر دوسری منزل دی جاتی تھی۔ تمام آلات منتشر حالت میں پڑے تھے۔ انسپکٹر مدن کی آنکھیں خوشی سے جگمگا اٹھیں۔

"اب ان حالات کی تفصیل اخبارات میں آئے گی۔" اس نے کہا۔ "تو نام و نمود ہمیشہ کے لیے رہ جائے گی۔ ہم لوگ آپ کا احسان کبھی نہ بھلا سکیں گے اختر صاحب! میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

لیکن شمیم اختر کو اتنی تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور ضعف کا یہ عالم تھا کہ اس کو بولنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے محض سر کو اثبات میں جنبش دی اور کہا۔ اب اس کے پیر ڈگمگانے لگے تھے۔ اگر سی آئی ڈی پولیس بڑھ کر اسے سہارا نہ دیتے تو وہ گر پڑا تھا۔

"اب آپ کے لیے زیادہ محنت کرنا نقصان دہ ہے سر شمیم! مہربانی کر کے آرام کیجئے اور نقاب کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔"

مجبور ہو کر شمیم اختر کو ان کی بات ماننی پڑی۔ اس نے کہا۔ "آئی جی صاحب! جیسے ہی آپ سلیم کو بچا لیجئے۔"

اسی وقت وہ کانسٹیبل سلیم کو سنبھالتے ہوئے کمرے میں آ پہنچے۔ سلیم کی حالت اس وقت نڈھال اور خراب تھی۔ شمیم اختر کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیونکہ سلیم نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اختر صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بے فکر رہئے۔"

سنتے ہی پولیس سارجنٹ نے ذرا کر مطلع کیا۔ "صاحب جیل فون چلانے کی پیشین گوئی کی ہے!"

انسپکٹر مدن نے ایک بار پھر محبت بھری نگاہوں سے شمیم اختر کی جانب دیکھا۔

کچھ دیر بعد ایک کانسٹیبل خبر لایا کہ بیس پچیس آدمی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

"چلئے اختر صاحب!" آئی جی صاحب بولے "دیکھیں شاید ان میں جوشی بھی ہو۔"

شمیم اختر نے سر ہلا دیا۔

جتنے آدمی گرفتار ہوئے تھے سب ایسے تھے جن کے نام ہندوستان یا دیگر خارجی ممالک میں وارنٹ جاری تھے۔ انھیں لوگوں میں مرہٹہ سنگھ بھی تھا۔ اسی وقت ایک اور کانسٹیبل دوڑتا ہوا آیا۔

"صاحب!" وہ جلدی سے بولا "باہر کی ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی سے ایک کار بہت تیزی کے ساتھ نکلی اور غلہ اسپیڈ سے بھاگتی ہوئی شہر کی جانب جانے والی سڑک پر ہو لی۔ ہم لوگوں نے اس جھونپڑی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاید ڈاکوؤں نے اسی جگہ پر فرار کا انتظام کر رکھا تھا۔ کاریں چار آدمی تھے۔"

شمیم اختر نے اندازہ لگا لیا کہ ان میں ایک تو جوشی ہوگا۔ پولیس کاریں فوراً نقاب میں روانہ ہو گئیں۔

کب تک خیمہ منائیے گے

انسپکٹر مدن نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی اس واقعہ کے اخبارات میں شائع ہوتے ہی ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں اخباری نمائندے نقاب پور آئے۔ شوبھا ساہنی گئی اور شوبھا پریس کے ہزاروں ان لوگوں کی سینکڑوں تصاویر لی گئیں۔ جوشی کی وہ بیٹری بھی بہت سے ہیرے جواہرات پائے گئے جو اب کسی کے کام نہیں آ سکتے تھے۔ انھیں شناخت کر لیا گیا لیکن اصل مسروقہ مال برآمد نہیں ہوا۔

نامہ نگاروں کو انسپکٹر مدن اور انسپکٹر جنرل پولیس نے تمام حالات بتائے۔ لیکن ان لوگوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ شمیم اختر کی حالت خراب تھی۔ اس لئے وہ جناح روڈ پر اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ نامہ نگاروں نے اس کا مکان گھیر لیا اور آخر کچھ بہتر حالت ہو جانے پر شمیم اختر کو ان کے سامنے بیان دینا پڑا۔

"اس میں شبہ نہیں ہے۔" اس نے بیان دیتے ہوئے نامہ نگاروں کو بتایا ہے کہ جوشی اور اس کی بھیم جو نے ایک بہت با نظم ادارہ قائم کر لیا تھا۔ باقی ساتھیوں کے اصرار پر جوشی نے اپنے اسسٹنٹ سلیم کو خود ہانگ کانگ کمپنی بھیجا اور جب سلیم نے مجھے مطلع کیا کہ اس کمپنی کا مالک شوبھا رام ٹنڈیل کی آڑ میں ہمارا قیمتی دوست شوبھا ناتھ جوشی ہے تو میری حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ مجھے اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا آدمی چند ساتھی ایمان داری سے کیوں دھندا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

اس کے بعد شمیم اختر نے ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والی ڈکیتیوں اور جعل سازیوں کا مختصر حال انھیں سنایا اور کہا۔

"ایک بات مجھے خاص طور پر حیرت ناک معلوم ہوئی کہ جتنی بھی چیزیں یہ معاشوں نے مختلف مقامات پر لوٹیں وہ سب چھوٹی چھوٹی تھیں، جو آسانی سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کی جا سکتی تھیں لیکن انھیں فروخت کرنا دقت طلب تھا۔ آپ لوگ دیکھ چکے ہیں کہ ان کی شکل تبدیل کرنے کے لئے شوبھا رام جوشی نے ساہنی کمپنی کی آڑ میں کتنا بڑا کارخانہ کھول رکھا تھا۔

چند روز کے قتل و اقعہ سے جو شمیم اختر شدید

گیا۔ میرے کچھ میں نہ آتا تھا۔ تحقیق میرے اور پتھر وغیرہ جانے کہاں ہیں۔ اگر دھات کے ہیں تو فروخت ہو جائیں تو ضرور یہ بات بچوٹ جائے۔ اس وقت میری توجہ ان سائیکلوں کی طرف مبذول ہوئی۔ سلیم نے مجھے مطلع کیا تھا کہ شوہا سائیکل کمپنی کے لئے فریم کسی ایک جگہ سے نہیں آتے۔ بلکہ الگ الگ ممالک سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ تجارتی نقطۂ نگاہ سے یہ بات نقصان دہ تھی۔ اس طرح میری توجہ سائیکل کے فریموں کی طرف مبذول ہو گئی۔ میں نے سوچا، کیا یہ ممکن نہیں کہ مال مسروقہ ان فریموں کے اندر ڈال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے۔ آپ کو یاد کریں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ڈرائی اور ڈرائی جانے والی تمام چیزوں میں خاص طور پر اتنی چھوٹی چیزیں جو سائیکل کے فریم کے اندر آ سکیں ——"

تمام نامہ نگار سانس روکے ہوئے شمیم اختر کا بیان سن رہے تھے۔

"مختصر یہ ہے ——" شمیم اختر نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ مختلف ممالک میں بنا جانے والا مال ان سائیکل کے فریموں میں پرزے کر کے مختلف مقامات سے سنگاپور میں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں سے ان کی شکل تبدیل کر کے کھلے عام مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا تھا —— لیکن ایک بات رہ گئی ——"

"وہ کیا بات ہے ——" نامہ نگاروں نے ایک زبان ہو کر سوال کیا۔ ان کی پنسلیں رک گئیں اور سب کی نگاہیں ایشیا کے اس جاسوس اعظم کی جانب اٹھ گئیں۔

شمیم اختر نے اپنی ڈاک سے ایک تیلی گرام نکال کر ہمیں پڑھ کر سنایا۔ یہ تار رنگون سے برٹی سارنگ سمتر لڈ نے شمیم اختر کے تار کے جواب میں بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"آپ کی ہدایت کے مطابق ہم نے چیرا فت کامرس کی مدد سے سراغ لگایا اور سائیکلوں کے وہ تمام فریم جو رنگون سے سنگاپور بھیجے جانے والے تھے روک دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے اندر پینسٹھ لاکھ روپیہ کے نوٹ مل گئے ہیں اور تعجب ہے یہ معلوم ہوا کہ یہ روپیہ نوٹ ہیں جو کہ چنڈی نے اپنے چیک کے ذریعے نیو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہی اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ چنڈی کے چیک پر جو کمیشن ملتا تھا اس نے تمام حلقے داروں اور تاجروں کو ان کی رقم واپس کر دینے کا اطمینان دلایا ہے۔ آپ کی کامیابی پر مبارک باد —— ٹوڈ"

شمیم اختر نے تار کا مضمون ختم کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا —— "صاحبان —— اب آپ لوگ ——"

"لیکن اختر صاحب!" نامہ نگار چیخے "آپ نے جوشی اور جورج کے بارے میں تو ابھی تک کچھ نہیں بتایا"

"افسوس! وہ لوگ گرفتار نہیں کئے جا سکے"

شمیم اختر نے کہا —— "میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں، لیکن اتنا یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد آپ لوگوں کو اس کی گرفتاری کی خبر میں شائع کرنے کا موقع ملے گا —— اب میں شمیم اختر رخصت کرتا ہوں ——!"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ جوشی ہی سے چنڈی کو قتل کیا تھا ——؟" سوال ہوا۔

"ٹھیک ٹھیک کہا نہیں جا سکتا ——" شمیم اختر نے مسکرا کر کہا —— "بہر حال یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس نے نہیں تو اس کے گروہ کے کسی فرد نے چنڈی کو قتل کیا تھا۔ اس نے خود کشی نہیں کی تھی ——"

اس بیان کے بعد نامہ نگار مطمئن ہو کر رخصت ہو گئے اور شمیم اختر نے مسکراتے ہوئے اپنے سگریٹ کیس کو سلیم کو آواز دی ——

"بچوں روئی صورت بنائے بیٹھے ہو سلیم! کم از کم آج تو ہمیں فرصت ہے، پکچر دیکھنے چلتے ہو ——؟"

سلیم کی ساری سستی دور ہو گئی اور ایک نعرہ مسرت بلند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

بقیہ دل کی آواز (صفحہ ۲۳ سے آگے)

کے مطابق میں نے مختار اجیز رکشا کوشش میں حقیر نذرانہ کے طور پر دے دیا ہے ——"

عابدہ —— آخا بیٹی کا جہیز اور وطن کی ضرورت سے نواب! ہم یا علی نہیں ہے۔ بیٹیوں کے جہیز سے آخا ہمیں اپنی اور وطن کی آبرو عزیز ہونی چاہئے بیٹی۔

سلمیٰ —— بالکل سچ فرما رہی ہیں آپ ابا جان

نواب —— نہیں بیٹی، بلکہ میں نے اپنا سارا جمع کیا جوڑا سونا بھی اپنے وطن کی ضرورت کے —— حکومت کو سونپ دیا ہے —— پچاس ہزار کرشن جوڑی دے کر آ رہا ہوں —— یہ میرے دل کی آواز تھی بیٹی۔

(سلمیٰ کی بے اختیار خوشی سے چیخ نکل گئی)

سلمیٰ —— آپ نے بہت اچھا کیا ابا حضور —— بہت اچھا کیا —— کاش کہ آپ ہی کی طرح ہر حضور آج ہمارے اس دیش کا ہر بیٹا اپنی ماں کے لئے سب کچھ کر سکے۔ اسے یہی سب کچھ کرنا چاہئے ——

اُدھر ریڈیو سے یہ نغمہ چھوٹ پڑتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
سارے جہاں اچھا ——

موسیقی کی تیز لہر آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے

ٹوکن شعلۂ شبنم اقبالی مشاعرہ نمبر ۵۲

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۴۲ء
مصرع طرح ——

گلی ہنسی قوافی —— نہیں ردیف

نام .....

پورا پتہ .....

زیر ترتیب سال نمبر کے لئے اپنے معیاری مضامین نظم و نثر اولین فرصت میں بھیجئے۔ تاخیر سے آنے والے مضامین کی اشاعت کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۲

مصرعِ طرح

محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

غزل کے ساتھ نوٹ کن انعامی مشاعرہ یا اس کے متبادل
چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

عمران شائقی بلڈنگ
حضرات
مولانا ابر احسنی گنوری
شفا گوالیاری

شمشاد علی گوہر گونڈوی

سکوں کا بزم یہ عالم نہیں ہے
اندھیرا روشنی سے کم نہیں ہے

جہاں کی برہمی کا غم نہیں ہے
نگاہِ دوست اگر برہم نہیں ہے

پشیماں برق کو ہونا پڑے گا
ترا کافر تبسم کم نہیں ہے

ہمارے ساتھ رو دیتے گا اللہ مانہ
ہماری آنکھ ہی پُرنم نہیں ہے

مری قسمت کی گتھی کو نہ سلجھا
تمہاری زلف کا یہ خم نہیں ہے

وفاؤں کی کمی کا غم ہے مجھ کو
جفاؤں کا تمہاری غم نہیں ہے

برائے مصلحت ہنستا ہے گوہر
نہ سمجھو یہ کہ اس کو غم نہیں ہے

رضا بادری

زمانہ بے مخالف غم نہیں ہے
مزا جب یار تو برہم نہیں ہے

تصدق دولتِ کونین اس پر
غمِ جاناں کی دولت کم نہیں ہے

کروں سجدہ میں کیوں کعبے میں جا کے
تمہارا سنگِ در کچھ کم نہیں ہے

محبت فطرتِ آدم ہے ہمدم
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

گھٹاؤں کی ہے دنیا میں تزلزل
کسی کی زلف تو برہم نہیں ہے

ہزاروں غم ہیں قلبِ ناتواں میں
مگر داغِ مئے غم نہیں ہے

تماشہ رہبر ہو کیوں رضا کو
تمہارا نقشِ پا کچھ کم نہیں ہے

صدیق شبنم شکوہ آبادی

نہیں ان کی نظر تو غم نہیں ہے
مجھے تو اُن سے اُلفت کم نہیں ہے

شرابِ غم سے گھٹتا جا رہا ہوں
تو پھر کیا ہے اگر یہ سم نہیں ہے

مسرت اس کو کچھ حاصل نہ ہوگی
میسر جس کو کوئی غم نہیں ہے

جلائیں اپنے ہاتھوں کیوں نشیمن
نگاہِ برق بھی کچھ کم نہیں ہے

سمجھ کر کہہ دیا ہے تم نے شاید
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

یقیناً بھر گئیں ساقی کی نظریں
کہ مے خانے کا وہ عالم نہیں ہے

ہوئی ہیں خشک آنکھیں غم میں رو کر
کہ اب قطرہ کوئی شبنم نہیں ہے

نازک احسن شکوہ آبادی

محبت کی نظر تو کم نہیں ہے
مجھے پھر بھی تمنا وہ اب عالم نہیں ہے

خزاں سے مطمئن میں ہو چکا ہوں
بہاروں کا خدا جانے غم نہیں ہے

نگاہِ لطف کی بھی ہے ضرورت
علاجِ زخمِ دل مرہم نہیں ہے

اٹھائے ہیں ترا غم زندگی بھر
مجھے محشر کا کچھ بھی غم نہیں ہے

تری محفل تھی عشرت گاہ لیکن
یہاں بھی درد دل کا کم نہیں ہے

سفر ہی کیا بغیر عزم کامل
ارادہ کیا اگر مصمم نہیں ہے

ہے اُلفت آدمی کا فرضِ نازک
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

صادق قدیری سیمابی بھینڈ

چلے بھی آؤ تاب غم نہیں ہے
کوئی دم میں ہمارا دم نہیں ہے

رلاتا ہے یہ ہر دم یاد اُن کی
بڑی نعمت ہے ان کا غم نہیں ہے

پلائیں وہ تو پھر میں کیوں نہ پی لوں
شرابِ ارغواں بے سم نہیں ہے

میں اپنی بے کسی پر رو رہا ہوں
تمہاری بے رُخی کا غم نہیں ہے

جہاں گر جائیں گے گر جائے گی آگ
مرے آنسو ہیں یہ شبنم نہیں ہے

پریشاں حال ہے پھر کیوں زمانہ
مزاجِ ان کا اگر برہم نہیں ہے

کسی کو کیا خبر میری فقیری
شہنشاہی سے صادق کم نہیں ہے

نسیم احمد نجمی اجھاوی

کوئی مونس کوئی ہمدم نہیں ہے
ہماری بے کسی کچھ کم نہیں ہے

حوادث کی مسلسل یورشیں ہیں
ہماری آنکھ پھر بھی نم نہیں ہے

پریشاں ہے نظامِ زندگانی
مزاجِ یار تو برہم نہیں ہے

میسر ہے غمِ محبوب مجھ کو
بس اب دنیا کا کوئی غم نہیں ہے

نیّر کا ڈوبتا دیکھے تاباں
ابھی ذوقِ نظر مدھم نہیں ہے

مصائب ہیں اگر راہِ طلب میں
تو میرا حوصلہ بھی کم نہیں ہے

غلط فہمی میں نجمی مبتلا ہو
انھیں تو کچھ تمہارا غم نہیں ہے

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری

کوئی بھی بے نیازِ غم نہیں ہے
قیامت ہے کہ تم بھی ہنس رہے ہو
بھنور والے پریشاں ہو رہے ہیں
افقِ شوق کا عالم نہ پوچھو
غلط ہے کامیابی کا تصور
کوئی حق کہنے والا ہے نہیں یوں
یہ مانگ ہے کہ دل کا زخم اے دوست
بصیر الرحمٰن تابی بالاگھاٹی

دیا ہے ظلمتِ شب کم نہیں ہے
وہ بے حسی جنہیں ان کا دماں
اٹھو مل کر درود شمع دیرو کعبہ
اندھیرا ہے سرِ منزل تو کیا غم
محبت کو نہ الزامِ ہوس دے
مٹا دیتا ہر اُسے کیوں تاک کے چھیڑے
اگر ہے عہدِ منزل اپنی راہی
شہرت میرٹھی

وہ غم دیتے ہیں اس کا غم نہیں ہے
تسلط ہر طرف ہے ظلمتوں کا
بپا گر محبت میں ہے طوفاں
دیا ہے یہ بندے کو حق سے
مصیبت نے ہمیں سمجھا دیا یہ
فنا ہے ان کے در کی پاسبانی
کہو دنیا سے رانو دل نہ شہرت
انعام انصاری سلطان پوری

لبوں پر مسکراہٹ غم ہیں آنکھیں
خدا کس کو یہ افسانۂ غم
دکھا سکتا ہوں آئینہ قمر کو
نہیں کچھ غم جو ہو بر ہم زمانہ
وہ کیا جانے بھلا کیفیتِ غم
نظر میں فرد کی ظلمت ہے لیکن

تری زلفوں میں شاید غم نہیں ہے
یہ عالم ہوش کا عالم نہیں ہے
کہ دل کی روشنی کچھ کم نہیں ہے
ابھی کوشش کی ہم نہیں ہے
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے
جو گل آسودۂ شبنم نہیں ہے
تو شوقِ رہبری بھی کم نہیں ہے

یہ فرش ہوں یہ عزت کم نہیں ہے
قیاس و ہے یہ شام غم نہیں ہے
سنان آسماں کی کم نہیں ہے
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے
کوئی مونس کوئی ہمدم نہیں ہے
زہے قسمت یہ ہوں ہم ہیں ہے
یہاں کوئی شریکِ غم نہیں ہے

کرم مجھ پر یہ تیرا کم نہیں ہے
کوئی میرا شریکِ غم نہیں ہے
مرا دامن جگر کچھ کم نہیں ہے
نگاہِ یار تو برہم نہیں ہے
کہ جو انسان اسیرِ غم نہیں ہے
دیارِ یار کا عالم نہیں ہے

حیف ہے سر جھکا نا شیخ صاحب
اگر ناداں ہیں اپنے آپ بندے
علامہ بیکل اتساہی

دو شیشے مے سے ہاتھوں میں ان کا
جوانی جا چکی آیا بڑھاپا
مری نظروں میں کوئی اور پرسہ
تمنا تو نے بھی سینے سے لگایا
جنابِ شیخ کا ہے پیٹ یارو
مجھے دیکھو مرا پرتاؤ دیکھو
بہت دشوار ہے مرگھٹ کا رستہ
اے غلام نہ کاٹ اسکو چھری سے
یہ نا تمام ہے ہنگم ہے لیکن
جو تب ہوئی

امید نے کشتی مہم نہیں ہے
خبر کس کو، اسے کچھ غم نہیں ہے
دو ہستی کا ہوں تنہا مسافر
دیا محفل دیا نغمے دیا مے
بڑھا تاثیر کچھ طرزِ بیاں میں
شاذ لاکھ میری حسرتوں کو
والی سلطان پوری احمد آباد

نوازش اب بھی ان کی کم نہیں ہے
عبث سجدہ ہے وہ میری نظر میں
کرم فرما اگر ہے یاد ان کی
مجھے تنہائیوں کا غم نہیں ہے
محبت آدمیت کا ہے زیور
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے
مسلط کیوں ہے تاریکی جہاں میں
اگر تیری نظر برہم نہیں ہے
ہر اساں کیوں نظر آتا ہے دانی
یقیں شاید تمہیں ہم نہیں ہے
مقصود نشتری۔ اندور

پریشانی میں دل اچھا بھلا ہے
کسی کی یہ عنایت کم نہیں ہے
نہیں دنیا کی راحت سے غرض کچھ
یہ جامِ عشق جامِ جم نہیں ہے
یہ ساقی شاد رہے ہم کو کرنی
ابھی دنیا میں دنیا کم نہیں ہے

اگر دل بھی لحاظ غم نہیں ہے
تو یہ اتفاق بھی کچھ کم نہیں ہے

مزید یہ کوئی پرچم نہیں ہے
مگر میری کمر میں خم نہیں ہے
شبابی شعلہ و شبنم نہیں ہے
مگر دردِ جگر کچھ کم نہیں ہے
یہ ہمدرد کا ایٹم بم نہیں ہے
مجھے میں کوئی برہم نہیں ہے
غلط ہے اس میں پیچ و خم نہیں ہے
مرا دل ہے کوئی شبنم نہیں ہے
مگر جیا کسے ہنگم نہیں ہے

مرا ساقی ابھی برہم نہیں ہے
وہ گل جس پر کوئی شبنم نہیں ہے
کوئی ساتھی، کوئی ہمدم نہیں ہے
مگر وہ کیف کا عالم نہیں ہے
ابھی اک آنکھ بھی پرنم نہیں ہے
مرا شیوہ کبھی ماتم نہیں ہے

مگر پہلے سا وہ عالم نہیں ہے
جو سر کے ساتھ دل بھی خم نہیں ہے
مجھے تنہائیوں کا غم نہیں ہے
کرم یہ بھی ترا کچھ کم نہیں ہے
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے
اگر تیری نظر برہم نہیں ہے
یقیں شاید تمہیں ہم نہیں ہے

اپنا راستہ لیا۔

"تمہارے انٹرویو کا کیا بنا ۔۔؟" سکوت ٹوٹا اندھیرے میں آواز گونجی۔

"جی ..... انٹرویو!..... ہا..... ہا..... ہا ..... !" وہ ہسٹریائی مریض کی طرح قہقہے لگانے لگی تھی۔ گویا پاگل ہو گئی ہو۔ آس پاس کے اندھیروں میں اس کے عجیب و غریب قہقہے دیر تک ٹکراتے رہے۔ پھر وہ بھری ہوئی سانسوں کے درمیان گنگنانے لگی۔

میری بڑھی ماں نے بھی پوچھا تھا، بیٹا انٹرویو کیسا رہا۔ اور تم بھی پوچھتے ہو۔ انٹرویو کا کیا بنا اور اس پوچھنے کا مطلب شاید یہ ہی ہو گا کہ تمہیں ملازمت ملی یا نہیں۔ تم اس وقت کماؤ ہی ہو یا نہیں؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھلا کمانے نہ لگوں تو ــــ میری بوڑھی ماں، دو بھائی اور ایک بہن زندہ کیسے رہیں گے۔ آج کل میں ملازم نہ سہی، لیکن میں کماؤ ضرور ہوں ــــ ویسے پہلے مجھے بھی انٹرویو کا انتظار رہا کرتا تھا۔ لیکن جب یہ انتظار حد بلوغ پر پہنچ کر یکایک بوڑھا ہو گیا اور مفلسی کے ڈستے ہوئے زہر نے میرے ایک چھوٹے بھائی کو داری عدم کر دیا تو میری آنکھیں کھل گئیں، میرا شعور جاگ پڑا۔ بھوک جاگ پڑی اور احساس کی ساکت لہریں پھر تڑپنے اٹھنے آیا۔ پھر میں کمانے لگی، اب ہم خوشحال ہیں ۔۔ اس کے قدم تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئے اور وہ اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

"کیسے ۔۔۔ ؟" وہ اس کے پیچھے لپکا۔ ایک لمحے کے لئے وہ رکی اور اس کے چہرے پر تمسخر اڑانے کے آثار نمودار ہوئے۔

"اب تمہیں کس طرح سمجھاؤں ــــ پردہ اٹھ جاؤں تو حقیقت کا نظارہ دیکھ کر تم میرے منہ پر تھوک دو گے، چاٹنے لگو گے اور دنیا کا سب سے ذلیل

لڑکی کہو گے۔ لیکن مجھے جینا ہے۔ میری بوڑھی ماں اور بھائی بہنوں کو زندہ رہنا ہے۔ اس لئے کہ روٹی کا مسئلہ درپیش ہے۔ یہ رات کے کالے کالے اندھیرے جو تم دیکھ رہے ہو، اس میں میں اپنا نور بھرتی ہوں۔ وہ نور جس میں کسی لڑکی کے بھٹکتے ہوئے جذبوں کی وادیوں میں گم ہو کر آنکھ مچولی کھیلنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ زندگی سے پیار اور زندہ رہنے کی جدوجہد کا نام اگر حیات ہے تو میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے سوچا تھا ہر کنوارہ لڑکی کی طرح میری آنکھیں بھی کہکشاں بھر جائے گی۔ میرے خوابوں کی بھی تعبیر ہو گی۔ لیکن آج میرے ارمانوں کے سپنوں کو معاشیات کی آہنی زنجیروں نے جکڑ کر اس طرح بھینچ دیا ہے کہ وہ کینہ دینے ہو گئے۔ یہ رات کے اندھیرے جو تم دیکھ رہے ہو، ان اندھیروں میں مجھے بہت کچھ ملتا ہے۔ میرے اس جوان اور سڈول جسم کی بدولت، جس پر کبھی کسی ایک مرد کا حق ہونے والا تھا، لیکن آج میں یہ حق ان سب کو بانٹتی ہوں جو مجھے دو پیسہ پیسہ دیتے ہیں۔ مجھے اپنی عصمت تباہ ہونے کی کوئی فکر نہیں۔ بس مجھے پیسہ چاہئے۔ ان زندہ لاشوں کے لئے جو آج میرے زیر سایہ پرورش پا رہی ہیں۔ جو کل بڑھ بھال پڑھائی لکھائی اور پروان چڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ شاید تم پر بھی یہ ہی ذمہ داریاں عاید ہوں گی۔ آخر تم کب تک وزارت کا انتظار کرو گے ــــ ؟ یہ انٹرویو۔ یہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج۔ یہ کالیفیکیشن سرٹیفکیٹ قابلیت سب کچھ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ جھوٹی تسلی اور امید کے جھوٹے ٹانکے ٹھنے ہوئے ہیں تم بھی اب ملازمت کا انتظار کرنا چھوڑ دو۔ ان اندھیروں میں جہاں جھوٹا ہے، عزت بکتی ہے شراب بیچو۔ ایک ایک بوتل کی پچاس پچاس قیمت آئے گی پھر تمہارا سارا قلاش دور ہو جائے گا تم اپنی ماں کے لئے دوا لا سکو گے، بھائی اور بہنوں کو پڑھا لکھا سکو گے خوش ہو گے بہت خوش ہو گے۔" وہ ہنستا رہا۔ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ پھر ایک چونک اٹھا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا ــــ وہ جا چکی تھی۔

بہت دیر تک وہ اپنی جگہ پر مبہوت سا کھڑا رہا ــــ رات دم توڑ رہی تھی۔ نیلے آسمان پر کہکشاں کا حسن ماند پڑ رہا تھا اور دور مشرق کی سمت ایک سفید سی چادر اپنے دامن سے نور کی کرنیں بکھیرتی ہوئی بکھرتی اس کے قدم بڑھتی چڑیوں کے ساتھ تیز سے تیز تر بڑھ گئے۔ وہ جا رہا تھا۔ اس کے بغل میں گٹی ہوئی بھرپور تشنگی مچل رہی تھی۔ اپنا سارا وجود اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں شراب کی کئی ایک بوتلیں بھری ہوئی ہوں ــــ!

ابا حسن کی اصلاح (صفحہ ۹ سے آگے)

میں محسن صاحب کہیہ، دیہ وغیرہ تمام اصطلاحات فارسی کے ہیں اور یہ بے محل بات ہے۔

(۷) "ہم کی تکرار سو جگہ اور ہر جگہ بے ملف" تو ہم تو تجھ کو ملا کر، یہ تکرار ہی فضول و بے محل اور بے کیف ہے۔ ملف ہذا "راز ہم" بھی اسی قبیل کا ہے

(۸) "تو نفس سے ہے ہا تکرہ" تو کون ہے؟ شعر میں فاعل کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ شیاں کو چمن سے قوی واسطہ ہے باغ سے نہیں۔ باغ پھل دار درختوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں اگرچہ اب آشیانے باغباں ہی جلانے لگے ہیں۔ مگر آشیاں جلانے کی ذمہ داری برق و صیاد سے متعلق ہے۔

(۹) کشمکش کی تکرار ہے تھی "وہ" مشورہ تھا۔ محسن نے رات دن کھا۔ یعنی واؤ عطف فارسی و ہندی محاورات و اس کے درمیان ہے ناجائز ہے۔ فارسی عطف واؤ کی اضافت ذیبا و فارسی یا ہو ترکی یا ایک فارسی ایک عربی یا ایک فارسی ایک ترکی یا خاص محل پر ہو عربی اس کے درمیان ہو سکتی ہے۔ ہو ہندی یا ایک فارسی ایک ہندی وغیرہ کے درمیان نہیں۔ یہ واو عطف ہی کا کافی تھا کہ یہ محاورہ کا بول چال ہے۔

تبر الحسن محمد

محبت کا نہیں ہیں مظہریں احساس
وہ دل تو ہے دلِ آدم نہیں ہے
ارادہ آپ کا مصمم نہیں ہے

خدا حافظ ہے خود کشتی کا میری
ڈبو دے ناخدا کچھ غم نہیں ہے
اب اپنے ڈوبنے کا غم نہیں ہے

جہاں میں آزمائش گاہ میں ان کی
مجھے مٹنے کا اپنے غم نہیں ہے
پر میری میں ابھی دم نہیں ہے

وہ منزل کس طرح پائے گا یا رب
ارادہ جس کا مستحکم نہیں ہے
کریم انصاری بھاگل پوری

محمد نشتری امدد
جبھی یہ فیض تیرا کم نہیں ہے
نظر میں کون سا عالم نہیں ہے

عبادت میں بھی کوئی غم نہیں ہے
اگر ایمان مستحکم نہیں ہے
مٹانے کو مجھے کچھ کم نہیں ہے

اے انسان نہیں کچھ اور کہنے
عنصر دنیا میں جسدِ غم نہیں ہے
سوا اس کے کوئی محرم نہیں ہے

محبت میں جو جینا چاہتے ہیں
انھیں مٹنے کا کوئی غم نہیں ہے
یہ میرا دل ہے جامِ جم نہیں ہے

محبت میں مذہب میں دنیا
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے
کسی کا گیسوئے برہم نہیں ہے

پریشاں کیوں ہو دل محمود میرا
مری راہِ طلب پُر غم نہیں ہے
اسماعیل ذبیح مالیگانوی

خدا کے فضل سے اب اس جہاں میں
ترا غم ہے تو کوئی غم نہیں ہے
وہ سمجھے مجھ کو کوئی غم نہیں ہے

وہی ہوتا ہے اکثر طورِ ناحق
جہالت کا جہاں پرچم نہیں ہے
ہماری داستاں مبہم نہیں ہے

وہی گھر ہے وہی الفت ہے لیکن
جو کل تھا آج وہ عالم نہیں ہے
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

فلسفہ تکبر توڑ ڈالے
کسی میں آج اتنا دم نہیں ہے
حجاب شعلہ و شبنم نہیں ہے

یکایک دور آیا ہے جہاں میں
غریبوں کا کوئی ہمدم نہیں ہے
جبیں میری کہیں جھکتی نہیں ہے
ناصر

زمانہ درپئے آزار ہے کیوں
مزاجِ یار تو برہم نہیں ہے
کوئی دل شاد اور خرم نہیں ہے

ڈراتا ہے مرا افسانہ سب کو
تمھاری آنکھ ہی پرنم نہیں ہے
مجھے ایسا تو کوئی غم نہیں ہے

ڈھلک آتے ہیں آنسو بھی ہنسی میں
اگر شادی نہیں، ماتم نہیں ہے
فریبِ آرزو بھی کم نہیں ہے

عجب دو کوئی پیمانہ لبوں پر
چھڑکنے کو اگر زمزم نہیں ہے
مجھے تشویش بیش و کم نہیں ہے

دکھائیں کس کو ناصر درد پنہاں
کوئی اس درد کا محرم نہیں ہے
کوئی اپنا شریکِ غم نہیں ہے

محمد ایوب شرر سلطان پوری

ضیائے حسن ماند کم نہیں ہے
چراغِ عشق بھی مدھم نہیں ہے
کوئی دنیا میں ایسا دم نہیں ہے

فنا عشق میں دل تو جھکا ہے
بلائے سر بسر ادا غم نہیں ہے
جو تیرے سنگ در پر خم نہیں ہے

اسے کیا خاک منزل ہاتھ آئے
کہ جس کا عزم ہی محکم نہیں ہے
مگر راسخ نہیں مصمم نہیں ہے

ہزاروں گل ہیں اس گلشن میں لیکن
کوئی آسودۂ شبنم نہیں ہے
جو ہم میں پانچواں کالم نہیں ہے

اٹھے جانا نہ دیکھو تم شرر سے
کسی فن کار سے وہ کم نہیں ہے
انھیں پاداش کا کچھ غم نہیں ہے
طالب انصاری، جبل پوری

بڑے بوڑھوں کو کرتے تھے تم
یہ کیسا درد ہے جو کم نہیں ہے
حقیقت میں یہ وہ عالم نہیں ہے

تڑپنا آپ سے ہم کو سکھایا
عنایت آپ کی یہ کم نہیں ہے
کوئی محرم مرا محرم نہیں ہے

کہاں ہے منزلِ جاناں مے گی
وہ ساحل پر کھڑے ہیں دیکھنے کو
مجھے میرا خدا بھی غم نہیں ہے

وہی منزل کو طالب کون پائے
کریم انصاری بھاگل پوری

جنوں یہ فیض تیرا کم نہیں ہے
ترا اے دوست یہ طرزِ تغافل
سوا اس کے کوئی محرم نہیں ہے

چھلک جائے نہ چشمِ تر سے آنسو
ذرا توڑیں سمجھ کر آپ اس کو
یہ میرا دل ہے جامِ جم نہیں ہے

کریم ان الجھنوں پر بھی نظر ہیں
کسی کا گیسوئے برہم نہیں ہے
مظہر تقائی

جو دیکھا آنکھ بھر کے کوئی غم نہیں ہے
وہ سمجھے مجھ کو کوئی غم نہیں ہے

توجہ ان کی ہم پر کم ہے ورنہ
ہماری داستاں مبہم نہیں ہے

محبت ہے تجربہ آفرینش
محبت لغزشِ آدم نہیں ہے

رسالے اور بھی ہیں طرب لیکن
حجاب شعلہ و شبنم نہیں ہے

بجز اک آستانِ یار مظہر
جبیں میری کہیں جھکتی نہیں ہے
ہمایوں فانوس مالیگانوی

کہاں اس بات کا ماتم نہیں ہے
کوئی دل شاد اور خرم نہیں ہے

تمھارے غم سے بھی جو غم سوا ہو
مجھے ایسا تو کوئی غم نہیں ہے

چلا ہے لے کے مجھ کو ان کے در پر
فریبِ آرزو بھی کم نہیں ہے

ملے گا جو مری قسمت میں ہوگا
مجھے تشویش بیش و کم نہیں ہے

یہ ہے فانوس دستورِ زمانہ
کوئی اپنا شریکِ غم نہیں ہے
عبدالحفیظ گوہر بھیڈ

جو گوہر مبتلائے غم نہیں ہے
کوئی دنیا میں ایسا دم نہیں ہے

وہ سر سری نہیں کہنے کے قابل
جو تیرے سنگ در پر خم نہیں ہے

یقیں تو ان کے وعدے پر ہے مجھ کو
مگر راسخ نہیں محکم نہیں ہے

عدو کو کیوں پہنچ جاتی ہیں خبریں
جو ہم میں پانچواں کالم نہیں ہے

دکھا کر گیسوں وہ جو بیچتے ہیں
انھیں پاداش کا کچھ غم نہیں ہے
کالیخاں نشتر شوپورکاں

جہاں دل شاد ہو رہ کر کسی کا
حقیقت میں یہ وہ عالم نہیں ہے

ہوا تبدیل آئین محبت
کوئی محرم مرا محرم نہیں ہے

میں اس کے ہجر میں صرفِ الم ہوں
مجھے میرا خدا بھی غم نہیں ہے

ہمارے واسطے تیرا جفا بھی
ریاضت پر جزا جائے یہ نشتر
جمال الدین خاں عبد عظیم آبادی

ستم پر جب لبوں میں پھر بھی ہے شکوہ
ہوئے کچھ اس قدر ہم خوگرِ غم
چلا ہوں عشق کی منزل پہ تنہا
محبت ہے رہِ عرفانِ خالق
کہوں راز محبت وجد کس سے
اختر شاکر مانیکانوی

شریکِ حال کوئی غم نہیں ہے
ستاروں کو دکھائے آئینہ جو
محافظ ہے خدا کشتی کا میری
سیاہی اور پھیلے بھی تو کیا ڈر
کسی کی کم نگاہی ہے یہ شاکر
مشتاق احمد لطف ہاردوئی مانیکانوی

یہ غم میرے لئے کیا کم نہیں ہے
وفا کی راہ ہے دشوار لیکن
منور ہے تمناؤں کی دنیا
بجائے بیٹھا ہوں بزمِ تصور
گلوں کی چاک دامانی کا اے لطف
مسلم ساگری بھوپال

کوئی تیرے سوا ہمدم نہیں ہے
سنا ہے رات بھر روتی ہے شبنم
خوشی میں بھی نکل آتے ہیں آنسو
بڑھی جاتی ہے دل کی اور دھڑکن
سہارا بن گئی ہے یاد تیری
نور قیسی الہ آبادی

محبت فطرتِ آدم ہے لیکن
ہر بلائیں عیادت کو جو آئے
نظر بھر سے دلائے کوئی آکر
خوشی غم کر دامن میں چھپا لو

سنا ہے تو نے کسی کو حال دل کا
تمہارے گیسوؤں کی برہمی بھی
ابھی امید ہے آنے کی ان کی
ہمیں ہیں محوِ الزام اب تک
قفس کو لے کے اڑ سکتے ہیں لیکن
مجھے بھی شبنم و نیلوفر بھٹکا

ابھی دنیا کی رونق کم نہیں ہے
امید لطفِ پیہم تم سے کیا ہو
گرفتارِ مصیبت ہے زمانہ
میں بدعتی پہ اپنی رو رہی ہوں
خمار اعظمی

تماشہ ہے تو کوئی غم نہیں ہے
ترے زخمِ جگر کے کام آئیں
خطا سرزد نہ ہو دنیا میں جس سے
خمار اتنی بڑی دنیا ہے لیکن
یٰسین محمد یرق شوپارکلاں

ہمیں وہ چیز سے کچھ کم نہیں ہے
مجھے لاکر حشر کیا ہے اس مکاں کا
مسلسل غم ہے دنیا ہے جہاں میں
سنوارے ہیں نے گیسوئے دو عالم
سنائے گی اسے کیا برق دنیا
عابد صہرائی سکتی

اندھیری رات میں بے تاب ہے دل
ہزاروں مٹ گئے دل کی لگن سے
پہنچ جاؤں گا منزل تک کبھی میں
وہ خود آئیں گے میرے پاس عابد
عبدالعزیز صدیقی عابد بریلی، بھوپال۔

کسی کی یاد گر پیہم نہیں ہے
بشر گھبرا ہی جاتا ہے وگرنہ
تمنائے غم پہ نازاں ہی رہیں گے

یہاں اپنا کوئی ہمدم نہیں ہے
بجائے ناگہاں سے کم نہیں ہے
چراغِ آرزو مدھم نہیں ہے
توجہ ان کی ہم پر کم نہیں ہے
ہمارے باندھنوں میں دم نہیں ہے

ابھی یہ درد و غم پیہم نہیں ہے
تمنا جذبۂ پیہم نہیں ہے
مگر اس کا تمہیں کچھ غم نہیں ہے
دلِ مرحوم کا ماتم نہیں ہے

ترا غم بھی خوشی سے کم نہیں ہے
کسی کے پاس وہ مرہم نہیں ہے
وہ کوئی اور ہے آدم نہیں ہے
یہاں کوئی شریکِ غم نہیں ہے

جو غم میں شریکِ غم نہیں ہے
اگر بنیاد مستحکم نہیں ہے
نہیں ہے تو خوشی پیہم نہیں ہے
اسی سے آشتِ عالم نہیں ہے
مجھے مٹنے کا اپنے غم نہیں ہے

شبِ غم میں کوئی ہمدم نہیں ہے
یہ دنیا میں نیا کچھ غم نہیں ہے
مجھے دشوار ہے کا غم نہیں ہے
مرے دل کی لگن کچھ کم نہیں ہے

مگر پھر بھی محبت کم نہیں ہے
کہ دنیا میں حدودِ غم نہیں ہے
بجائے دنیا کوئی غم نہیں ہے

م محبوب کی عظمت مسلم — غم امروز بھی کچھ کم نہیں ہے
م الدین ادیب غازی پوری

یا جانے مت پا زندگی کو — جسے حاصل سوادِ ہمنم نہیں ہے
یں ہوں وہی دل ہے وہی تو — مگر پہلا سا وہ عالم نہیں ہے
اسودۂ ساحل نہ ہوں گے — وہ جن کے بازوؤں میں دم نہیں ہے
ہ اس زندگی کی کش مکش میں — خیالِ مہ وشاں بھی کم نہیں ہے
ی عاجز بیگم گھاٹی

ت دامنِ عصمت کسی کا — مجھے رسوائیوں کا غم نہیں ہے
دل کی بجھانے کے لئے اب — مری آنکھوں میں پانی کم نہیں ہے
یتیجہ میری زندگی پر — مرا دل بے نیازِ غم نہیں ہے
عاجز فریب آرزو پر — یقیں تو ہے مگر محکم نہیں ہے
ل سلطان پوری

ہمدمانہ کوئی ہمدم نہیں ہے — مرا کوئی شریکِ غم نہیں ہے
جانے اٹھے بہتر سے کب یہ — مریضِ عشق میں اب دم نہیں ہے
کیا منزلِ مقصود تم کو — تمہارا عزم مستحکم نہیں ہے
ل اتنے ہراساں کس لئے ہو — عنایت ان کی تم پر کم نہیں ہے
ان الدین شاہد سلطان پوری

ہے دل کو تم نے زخم ایسا — کہ جس کا اب کوئی مرہم نہیں ہے
ں تو سب مقاصد کے ہیں نیے — کسی کا کوئی بھی ہمدم نہیں ہے
م تقدیر کا بھی مجھ پہ شاید — نہ جانے آج تک کیوں کم نہیں ہے
یار حسن غافل چکی بریلی ایم پی

ارے حسن کی رنگینیوں سے — بہاروں کی کمی کا غم نہیں ہے
یادیں جام ہیں گردش میں لیکن — سرورِ بادۂ ہمنم کم نہیں ہے
بتے ہے کسی سے اب بھی غافل — مگر پہلا سا وہ عالم نہیں ہے
نسیم علوی کیلی

ی گل پہ رویا کون آکر — یہ اشکِ قطرۂ شبنم نہیں ہے
ہلیاں آئے ہیں گیسو کو اپنے — نظامِ زندگی برہم نہیں ہے
نگر سورتی

ر اپنے دل کو اپنا دل نہ سمجھو — اگر وہ مبتلائے غم نہیں ہے
ز گھر کر لو دل — ہ ہی خشک لب سے چشمِ پرنم — سحر ہے تو خزاں برہم نہیں ہے

آتش بیگم گھاٹی

شبِ غم کا تو مجھ کو غم نہیں ہے — یہی غم ہے کوئی ہمدم نہیں ہے
مرا دل بھول کر بھی یہ نہ بھولے گا — تا احسان مجھ پہ کم نہیں ہے
اسرار علی حسین نشتر صدیقی بریلی۔ ایم پی

محبت ہے حیاتِ جاودانی — عروجِ زندگی ہے غم نہیں ہے
محبت ہے بہارِ زندگانی — محبت فتنۂ آدم نہیں ہے
اقبال نیچ

محبت اشک بیلا اشکِ مجنوں — محبت ایسا ویسا غم نہیں ہے
محبت کو سمجھنا بھی ہے مشکل — محبت کر دکھانا کم نہیں ہے
دینکٹ راؤ سحر (سوت پوری (کیپل)

سوائے حسن کے حدِ نظر تک — نظر میں کوئی بھی عالم نہیں ہے
خدا کی دین ہے یہ تیغ غم — سحر اس کا مجھے کچھ غم نہیں ہے

خورد غوث پوری

قطعات

دین و مذہب کے ہم فدائی ہیں — کسی بے دین سے نہیں ڈرتے
ہم کٹائیں گے سر وطن کے لئے — روسیہ چین سے نہیں ڈرتے

سختیوں کو نہ لائے خاطر میں — تیرگی کو نہ تیرگی سمجھے
زندہ رکھنے کا حق اُسے ہے خرد — موت ہی کو جو زندگی سمجھے

گلستاں و فضا بدل جائے — میرے دل کا چراغ جل جائے
رات کٹتی نہیں کسی صورت — مسکراؤ تو رات ڈھل جائے

مصرعہ طرح انعامی مشاعرہ نمبر ۳۰

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
ہوا، سوا قوافی۔ کے رستے میں ردیف
غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ مئی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ شعاعِ شعر و ادب

شعاعِ شعر و ادب

جولائی
۱۹۶۳ء

زرِ سالانہ
چار روپے
شش ماہی
دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۷

بیڈ آفس
دریبہ کلاں۔ دلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصہ نظم
حضرت مولانا ابرار حسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بلبل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	راستھان میں اردو کا مستقبل	سلطان احمد	۲
۲	وطن اور سپاہی	نازکی احسنی	۶
۳	دو غزلیں	رگھبیر داس ساحر	۷
〃	〃	مرزہ قریشی	۷
۴	افکار نو	سلیم صدیقی	۸
〃	〃	شمشاد علی گوہر	۸
۵	چین کے حملے سے متاثر ہو کر	مسلم ساگری	۸
۶	طربیات	خلیل بیابانی کھاڈی	۹
〃	〃	محمد عبدالقیوم صدیقی مست	۹
۷	سنہری تلوار	وزیر بابو پانی پتی (کراچی)	۹
۸	جلال و جمال	محسن رتلامی ۔ دلی پبلی بھیتی	۱۱
〃	〃	راشد قریشی ۔ زاہد صدیقی	۱۱
〃	〃	قادری پبلی بھیتی ۔ محمد اصغر پبلی بھیتی	۱۱
۹	کالے پل کے کیس	کرشن چندر	۱۳
۱۰	خودکشی کیوں	شفیق حیدرآبادی	۱۹
۱۱	پریم چند زندہ باد	محمد شفیع صہبر کھاڈی	۲۳
۱۲	بھٹی کا نیا دام	ڈرپ کار ۔ باگوش	۲۶
۱۳	خطرۂ زبان	اسد ابنی	۲۸
۱۵	سہارا	مشتاق حیدرآبادی ساحر	۳۰
۱۶	طرحی مشاعرہ نمبر ۲	مرتب شفا گوالیاری	۳۳

اہتمام شعاعِ ادب دہلی پریس دریبہ کلاں دہلی سے چھپ کر دفتر شعاعِ ادب دہلی سے شائع ہوا

سلطان احمد بی۔ اے

راجستھان میں اُردو کا مستقبل

[illegible] ایک ہمہ گیر تحریک
[illegible] اُردو کے لسانی
حقوق کا جائز مطالبہ تھا جو ایک آزاد مملکت میں غیر مشروط
ہونا چاہئے۔ یہ بات حیرت انگیز اور افسوسناک تعجب کن ثابت ہوئی
کہ ہندی لابی (سیکولرزم) حکومت کے استحکام کے
بعد بھی موجودہ حکومت کی طرف سے کسی واضح لسانی
پالیسی کا اعلان نہ کیا گیا۔ کیونکہ ہندی کے قومی زبان قرار
دیئے جانے کے بعد بھی دستور میں ہندی اور معاون زبانوں
کی حیثیت کے بارے میں مختلف مکتبۂ خیال اور ذمہ دار
اکائیوں نے بڑا واضح اور بسط کی۔ اس سے اس
خیال کو تقویت پہنچی ہے کہ ہندی کی ہمہ گیر، جامع اور
مرکزی حیثیت مشتبہ ہے۔ جنوب میں مدراس کیرالہ اور
مغربی بنگال اور شمال میں پنجاب سے ہندی سے
قطعی بے تعلقی کا اظہار ہمارے خیال کا بین ثبوت ہے
بادی النظر میں سیاسی مقتضیات کو بالائے طاق رکھ کر
عقل سلیم کا فیصلہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ہندی
کی اکثریت کا ثبوت جواز حاصل نہیں۔ اب بھی راجگوپال
آچاریہ اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے تازہ بیانات
اور نشریہ خطبات ہندی کی موجودہ متعینہ پالیسی کے
خلاف کھلی للکار احتجاج ہیں۔ اُردو، گجراتی، بنگالی،
تامل وغیرہا کی صوبائی حیثیت کیا ہے؟ یا معاون زبان
کی حیثیت سے ان کی آئینی پوزیشن کیا ہو؟ یہ سیاسی
مدبروں کے سامنے ایک پیچیدہ مسئلہ اور ہماری تعلیم
کے جدید تقاضوں کے معلموں کے پیش نظر ہندوستانی
معاشرہ کا بنیادی سوال ہے۔ ایک یہ بھی نظریہ ہے کہ
ہندی بحیثیت زبانی جامعیت نہیں ہے اور
ہندوستانی عوام کے جذبات کی ترجمانی سے معرا ہے
لہٰذا اسے واحد سرکاری زبان بنایا جاسکتا ہے۔ میں نے
ان مختلف اور متضاد فی الامر پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے
اُردو کی ادبی اور علمی افادیت پر بحث کی ہے اور میرے
نزدیک حتی الامکان کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ
ایک علمی ادارے کی ضرورت اور ادبی تقاضوں کے اعتبار
سے "لسانی تحفظات" پر روشنی ڈالوں۔ راجستھان کے
صوبہ میں اُردو کی ترویج اور ترقی کے امکانات زیادہ
ہیں اور اس کا مستقبل درخشاں اور تابناک ہے۔ یہ شاہراہ
اتنی واضح ہے کہ اس موضوع پر بساط سے بڑھ کر
کچھ بھی عمل پیرا ہوا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل امور کی
جانب راجستھان کے اہل قلم اور اُردو کے سرپرست
اداروں اور اصحاب کی توجہ مبذول کرنے کے بارے میں
ایک عرصے سے سوچ بچار کیا تھا جس کا اجمالی مطالعہ
مسئلہ کی نوعیت کا صحیح تعین کرتا ہے، تجاویز فراخ دلی
طلب ہیں ۔ ——— !

(۱) یہ بات ارباب علم سے مخفی نہیں کہ کسی زبان کی
علمی حیثیت کو یہ آسانی کوئی حکومت ختم نہیں کر سکتی
حکومت جذبے اس معاملہ پر کافی غور اور پرداخت
کے بعد اس الامر اس نکتہ کا احساس کر لیا ہے۔ تشنگان
علم بخوبی جانتے ہیں کہ ہم جب اپنے ارباب حکومت کی
اُردو سے بے توجہی اور بے تعلقی پر نالاں تھے تو انگلش
اسٹیبلشمنٹ برطانیہ کے دور عوام میں اُردو کی تعلیم جاری تھی۔
اور یونیورسٹی میں علیحدہ شعبہ قائم تھا۔ بھٹکتے ہوئے کا کچھ
عرصہ پہلے تقرر اسی سلسلہ کی کڑی کا ایک اضافی
حصہ کہنا چاہئے۔ بی بی سی ریڈیو اور پیکنگ اور
ماسکو ریڈیو کے اُردو پروگرام کی تحریر میں نشریات
آج بھی مختلف اوقات پر سنے جاتے ہیں۔ آل انڈیا
ریڈیو نے اردو شعبہ نشریات علیحدہ قائم کر رکھا ہے
جس کی سرپرستی کے فرائض وزیر صاحب فرما رہے
ہیں۔ راجستھان میں آل انڈیا ریڈیو کا شارع
BRANCH ہے جس کا ہیڈ کوارٹر
جے پور ہے۔ جے پور ریڈیو اسٹیشن سے اکثر و بیشتر
اُردو مقالے، نظمیں اور افسانوں کا پروگرام پیش کیا
جاتا ہے۔ موجودہ ہنگامی صورت حال کے پیش نظر
چین کی جارحیت کے خلاف، اذعانہ خبروں کا بلیٹن
پیش کیا گیا۔ الغرض اُردو کی ضرورت
کا احساس ریڈیو اسٹیشن کے ارکین کو ہے، دوسرے
لفظوں میں یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ اُردو کی راجستھان
میں بحیثیت زبان ضرورت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ تشہیری مقاصد، نظموں کی ادبی حیثیت اور افادیت کے
انتخاب کے لئے ایک
شعبہ کا قائم کیا جانا اشد ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ ریڈیو
اسٹیشن جے پور میں اُردو نشریات کا کوئی شعبہ نہیں
یہ بات قطعی غیر ضروری ہے کہ کسی ایک ادبی یا غیر ادبی
شخصیت کو لے لیا جاوے اور وہ بحیثیت رضاکار
کے کام کرے۔ یہ شعبہ تین یا چار اشخاص پر مشتمل
ہونا چاہئے۔ جس کے انچارج کی پوزیشن
ریڈیو اسٹیشن کے ضوابط کے بموجب آزاد اور خود مختار
درجہ کے ہونا چاہئے۔

اور اس کے شخصی وقار کا زیادہ سے زیادہ خیال کیا جائے کیونکہ وہ اقلیتوں کے نمائندے کے مترادف ہے۔

(۳) اس ضمن میں دو سری بات اور غور طلب ہے۔ گورنمنٹ ہند کی سرپرستی اور نگرانی کے تحت ساہتیہ اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد بہت سی اکاڈمیاں قائم کی گئیں۔ ساہتیہ اکاڈمی کی اطلاعت میں مرحوم نام سے ایک پتریکا شائع ہوئی۔ اردو شعراء اور مصنفین کی تخلیقات کو بھی جگہ دی گئی۔ رسم الخط ہندی ہوا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے ارکان نے جہاں اردو کے ساتھ حکومت ہند کے ایما کے بموجب فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اگر اس دو باتوں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تو کتنا بہتر تھا۔ (۱) اردو سکرپٹ کا رسم الخط اردو ہونا چاہیے۔ اردو لیٹو وغیرہ کی دشواریاں مزید ہیں۔ مگر جہاں حکومت گرانی اور سرپرست ہو، وہاں دشواریاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ (۲) بالفرض یہ وقت بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مذکورہ تجویز فی الحال عملی جامہ نہیں پہن سکتی ہے حکومت ہند کی منظوری لازمی ہے تو اسے اختیار میں رہنے دو۔ پھر بھی یہ غور طلب امر ہے کہ اردو تنقیدی مضامین اور نظموں کی طباعت کے انتخاب کا فیصلہ کون کرے گا؟ یہ طریقہ ایک علمی ادارے کے شایان شان نہیں کہ کسی مصنف کا ارسال کردہ مسودہ چاہے وہ معیاری ہو یا نہ ہو شائع کر دیا جائے۔ بلکہ مضمون کی افادیت اور علمی حیثیت کا تعین کرنے والا شعبہ ہونا لازمی ہے۔ تنقیدی جائزے اور حیثیت کے پرکھے بغیر شائع کرنا ایک منفعل خیز بات ہے اور علمی صداقت کی کوئی پرواہ الا ماشاء اللہ نہیں ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی جیسے سنجیدہ اور باشعور ادارے کو زیب نہیں دیتا۔

(۴) حکومت ہند نے فکشن آثار قدیمہ کے نام سے ایک یا ضلع علیحدہ محکمہ قائم کر دیا ہے یہ محکمہ چھ ماہ سال سے ایک علیحدہ ادارے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ پہلے یہ کمیٹی

ڈیپارٹمنٹ سے ملحق تھا۔ آج کل اس کے ڈائریکٹر کھڑکاوت ہیں۔ اس ادارے کی شاخیں بیجاپور، اوشہ پور، بھدرواچل، کوٹہ، ٹونک، بوندی، جیسلمیر اور جودھ پور وغیرہ میں ہیں۔ ایسا پانچ جگہوں پر شاخیں رکھ کر ریجنل آفس بنایا گیا ہے۔ اس محکمہ کا کام مقبرہ و حکومت کی سیاحتی خطوط کی بت اور معاشرہ کے حالات اور ثقافت کی طبع ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ راجستھان کی تحویل میں نیا دفتر فارسی مخطوطہ ریکارڈ ہے۔ مثلاً اخبارات معلی، بیگمات کے خطوط شاہی فرامین، وقائع، خطوط جہاراجگان۔

سر جادو ناتھ سرکار مشہور مورخ اور دیگر ہندوستان کے نامور مورخ ایس، آر شرما، پروفیسر ذوالحسن۔ عبداللہ ٹب (پاکستان) ایشوری پرشاد، ستیش چندر ڈاکٹر بین اور ڈاکٹر سنہا اپنی تصانیف کے سلسلہ میں اس محکمہ سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ پی، ایچ ڈی کے طلبہ ہر سال یہاں آتے ہیں تاکہ اپنی کا مسودہ تیار کریں۔ انھیں فارسی سے اردو اقلیت کی بنا پر ترجمہ کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔ حکومت راجستھان کو چاہیے کہ فارسی کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جاوے تاکہ صحیح معنی میں تاریخ کے اس شعبہ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ تراجم کے لئے بہتر مترجم ہوں اور ان کی علمی استعداد اور لیاقت اس قابل ہونا چاہیے کہ ترجمے صحت کے ساتھ شائع کئے جاویں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کا وہاں کوئی شعبہ نہیں ہے۔ ڈائریکٹر بھی کوئی قابل شخصیت ہونی چاہیے۔ جو لسانیات سے واقف ہو۔ اور پی، ایچ ڈی کے معیار پر تحقیق اور ریسرچ کا کام کر چکا ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فارسی سے ناواقف ہو اور مقبرہ و پر تحقیق کی کاوش فرمایا ہو جیسا کہ جو وہ حالت میں ہے۔

(۵) راجستھان میں صوبائی حکومت اس امر پر کچھ اتفاق رکھتی ہے کہ اردو معاون زبان کی حیثیت سے بھی اداروں میں پڑھائی جائے۔ محکمہ تعلیم کے سامنے دو باتیں اہم ہیں (۱) بہتر اور کامیاب اردو اساتذہ کی فراہمی اس محکمہ تعلیم کی ڈائریکٹوریٹ میں تصنیف و تالیف کی ذمہ داری کے اعلیٰ فرائض کا انجام دہی ہے۔ ایک

کمیٹی قائم ہو۔ اول الذکر کے سلسلہ میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف اردو کے اساتذہ کے نہ ملنے کا شکوہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل کیا جاتا ہے۔ جواز مقدمہ میں میں اپنی مثال پیش کروں تو غیر متعلقہ نہ ہوگی۔ انسپکٹر محکمہ تعلیم کو عرضداشت پیش کر چکا ہوں۔ ہر مرتبہ کسی نہ کسی قسم کا حیلہ تراش دیا جاتا ہے۔ راجستھان کے ریسرچ سیکشن میں کام کر چکا ہوں ادب میں پی ڈی ہوں اور اس علاقے میں میرے سے زیادہ کون کسی امیدوار کے نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ محکمہ تعلیم کو کافی فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر جمہوریہ ہند کے خدا خدا سیاست، سیکولر حکومت کی نہ جانے کس پر نوسٹی کے فارغ التحصیل ہیں کہ کافی پر ہوں تک نہیں رینگتی، اردو اس طرح بولتے ہیں جیسے انگریزی میں کوئی فرنچ شخصیت صدارت پیش کر رہا ہو۔ انگریزی بچاری کا حال ہے کہ تلفظ تک درست نہیں۔ فلسفہ اور فلسفہ تعلیم سے انھیں کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ضمناً مضمون میں میں نے اپنی کسی بپتا کا تذکرہ بھی کر دیا۔ یہ بھی فالتو تھا۔ راجستھان میں اردو فروزی کے ایک حصہ کی یہ گذشت تھی۔ ضبط تحریر میں آ گئی۔ ورنہ نہیں گوش احوال واقعی۔

راجستھان میں سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد کے جانے کے بارے میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ اور راجستھان شاخ مرکز پر جو کوشاں ہونا چاہیے اس سے بھی اردو کی کلاسوں میں طلباء کی تعداد بڑھے گی اور اردو کو اپنا جائز مقام ملنے کے امکانات وسیع ہوں گے۔ بنیادی باتیں تین ہیں (۱) تیسرے درجہ تک بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دی جائے (۲) تیسرے درجہ سے پانچویں جماعت تک ہندی

جنگ آزمائی سیوک شکوہ آبادی

وطن اور سپاہی

جنگِ چین سے ——— متاثر ہو کر

اسی کا نام تو ہے بے گناہی بدامنی ہے نہ کوئی بے پناہی
ہے ان کے دم سے قائم بادشاہی
زمانہ دے رہا ہے یہ گواہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

جہانِ ظلم کو کیسے مٹا دیں یہ چاہیں قصرِ استبداد ڈھا دیں
عدو کی بڑھ کے یہ گردن جھکا دیں
یہ شہرہ ہے فلک سے تا بماہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

ستم کی ہار ہی ہوں جب گھٹائیں نہ ملتی ہوں کسی بھی سمت راہیں
یہ تاریکی میں شمعیں جگمگا دیں
سفیدی سے بدل دیں یہ سیاہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

یہ ڈرتے ہی نہیں کوئی ہو آفت سمجھتے ہیں یہ ہر کلفت کو راحت
یہ خوش ہوتے ہیں جب آئے مصیبت
سمجھتا ہے اسے اپنا خدا ہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

یہاں افیون سے ہیں پاک سینے شرابِ ناب ہیں اپنے پسینے
یہیں مدہوشیوں کے جام پینے
کسے منظور ہے اپنی تباہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

ہزاروں زخم ہیں نازک بدن میں ہیں کتنی گولیاں پیوست تن میں
یہ کہہ کہہ کر بڑھے جاتے ہیں رن میں
قدم ڈگمگنے نہ پائیں یا الٰہی وطن پر جان دیتے ہیں سپاہی

رگھبیر داس ساحر (سیالکوٹی) جالندھر

دو غزلیں

مے تلخ ہے کم دافعِ آلام بہت ہے
تکلیف ہے تھوڑی مگر آرام بہت ہے

اے دل مجھے اندیشۂ انجام بہت ہے
یہ مان لیا رزق تہ دام بہت ہے

جھوٹا ہی سہی وعدۂ فردا پہ ہوں نازاں
تھوڑا بھی تخیل کا یہ انعام بہت ہے

ہمراز بنایا دلِ مضطر ہی کو ہم نے
تھی عقل بھی لیکن وہ ابھی خام بہت ہے

برباد کیا ہم کو مقدر کے بہانے
عیار تو اے گردشِ ایام بہت ہے

ہم تجھ کو ستمگر کبھی کہتے نہیں لیکن،
دنیا میں یہ چرچا سحر و شام بہت ہے

ہم وہ نہیں تجھ سے جنہیں ملنے کی ہوس ہو
تسکینِ محبت کو ترا نام بہت ہے

حاصل تو محبت سے جو ہوگا وہی ہوگا
یہ کام مگر اے دلِ ناکام بہت ہے

مے کا نہیں، ساقی کی توجہ کا ہوں خواہاں
مل جائے جو محفل میں تو اک جام بہت ہے

پیمانہ جو چھلکے تو چھلک جائیں آپ بھی واعظ
کہتا ہے "مجھے کام سرِ شام بہت ہے"

دل ترکِ محبت سے بھی کچھ خوش نہیں ساحر
کہنے کو تو کہتا ہے کہ آرام بہت ہے

(بقیہ یک قافیہ)

بند کر آنکھوں کو ہستی سے گزرنے والے
تیرے مرنے میں ابھی شبہ ہے مرنے والے

مرنے والوں میں نہیں ہوتا کبھی اُن کا شمار
کبھی مرتے ہی نہیں آپ پہ مرنے والے

دیکھ پامال نہ کر ان کو یہ ہیں حشر نواز
کل اُٹھائیں گے قیامت یہی مرنے والے

اختیاراتِ محبت کا سہارا لے کر
جبر کی حد سے گزر جاتے ہیں مرنے والے

کچھ نہ کچھ رابطۂ عشق تو ہوتا ہے ضرور
بے سبب آپ پہ مرتے نہیں مرنے والے

نشۂ عشق میں ہو جاتے ہیں ایسے سرشار
آپ میں رہتے نہیں آپ پہ مرنے والے

مغفرت ان کی یہیں ہے، یہیں اُنکی ہے نجات
تیرے آغوش میں دم توڑیں گے مرنے والے

جزو سیماب ہیں ہم، فطرتِ سیماب ہیں ہم
تم ہمیں مارتے ہو، ہم نہیں مرنے والے

کیوں نہ اپنے حریفوں سے جواب تک طرفہ
بخش دو ان کو کہ وہ لوگ ہیں مرنے والے

شیخ سلیم سدی

شیرازہ میرے دل کا بکھرتا چلا گیا — فردِ شکستِ حیات اُبھرتا چلا گیا
طوفانِ درد و غم نے دبایا بہت مگر — نقشِ حیات اور اُبھرتا چلا گیا
میں مسکراتا جھومتا بے خوف و بے خطر — ہر راہِ پُرخطر سے گزرتا چلا گیا
حق بات تو یہ ہے، مرا دامانِ زندگی — تیری نوازشوں ہی سے بھرتا چلا گیا
خونِ جگر کا میرے اڑا کر تمام رنگ — حُسنِ شفق کچھ اور نکھرتا چلا گیا
کیا پوچھتے ہو ترکِ محبت کے بعد بھی — کیوں میرے دل کا داغ اُبھرتا چلا گیا
دیوانۂ بہار خدا جانے کس لئے — دامن کو اپنے کانٹوں سے بھرتا چلا گیا

فکرِ جمیل سے کبھی ذوقِ سلیم سے
میں بزمِ شاعری میں اُبھرتا چلا گیا

افکارِ نو

شمشاد دلی گوہر کوڈی

خوش ہوں یوں غم کی وابستگی سے — جیسے مطلب نہ تھا کچھ خوشی سے
وہ یہ کہتے ہیں کس سادگی سے — ہم نے اُلفت بھی کی ہے کسی سے
زہر آلود بھی ہو تو کیا ہے — تُو جو ساقی پلائے خوشی سے
جن کو ہوتا نہیں پاسِ عزت — وہ اُلجھ جاتے ہیں ہر کسی سے
بھر گیا ساغرِ صبر اب تو — باز آجائیے بے رُخی سے
مجھ کو ماضی نے آواز دی ہے — جب بھی گزرا ہوں ان کی گلی سے

رفتہ رفتہ مرے داغِ گوہر
بن گئے پھول کھل کر کلی سے

مسلم ساگری

چین کے حملے سے متاثر ہو کر

ہمارے حوصلے اور جرأتیں ہم سے یہ کہتی ہیں
وطن کی آبرو لٹنے نہ پائے ایک ہو جاؤ
اُٹھو، اُٹھ کر ہلا دو، دشمنوں کی ساری بنیادیں
جہاں ہمت نہیں کرتے ہیں کم ظرفی سے فریادیں
بڑھو ہاتھوں میں لو ہتھیار یارو وقت آیا ہے
کہیں تیم اور ارجن نے بھی اپنا سر جھکایا ہے
چلو اُٹھو یہی اب وقت کا تقاضا ہے
ہر اک لمحہ ہر اک لحظہ ہمیں ہشیار رہنا ہے
مقابل چینیوں کے جان کی بازی لگانا ہے
بہر صورت جو افعی ہم کو کچھ کر کے دکھانا ہے
بڑھو ہاتھوں میں لو ہتھیار یارو وقت آیا ہے
کہیں تیم اور ارجن نے بھی اپنا سر جھکایا ہے
ہمیں مل جل کے آزادی کی اپنی شان رکھنا ہے
اسی دھرتی پہ جینا ہے اسی دھرتی پہ مرنا ہے
کوئی پروا نہیں جو ظلمتِ پیہم نے گھیرا ہے
یہ کچھ رات ہی کی آڑ میں پنہاں سویرا ہے
بڑھو ہاتھوں میں لو ہتھیار یارو وقت آیا ہے
کہیں تیم اور ارجن نے بھی اپنا سر جھکایا ہے

خلیل سیمابی کوہاری۔ حیدر

کسی کے پاؤں پسری نہیں کچھ اور بھی ہے
متاعِ قلب و جگر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تُو لاکھ پردوں کے اندر بھی چھپ نہیں سکتا
ہمارے پاس نظر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

کسی کی یاد میں اس طرح خون روتا ہوں
ہر ایک اشک گہر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

اگر میں چاہوں تو ہر شام صبح ہو جائے
مری زباں میں اثر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

بچاؤں اپنے نشیمن کو کس طرح گل چیں
ہجومِ برق و شرر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ہر ایک سانس کا اپنی حساب رکھتا ہوں
خیالِ شام و سحر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

خلیلؔ سرد ہو کیوں کر نہ آگ دوزخ کی
کمالِ دیدۂ تر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

غزلیات

محمد عبدالقیوم صدیقی مستؔ۔ فتحپور (یوپی)

ہیں وہ جلوے قلبِ مومن کے لئے
سر بسجدہ ہیں ملک جن کے لئے

آشیاں کو میں نے وہ تنکے لئے
مضطرب تھیں بجلیاں جن کے لئے

ہیں وہی اعمال ہم راہِ سفر
چھوڑ کر دنیا چلے جن کے لئے

دن کو روتا ہوں کہ رات آئے کہیں
رات کو روتا ہوں میں دن کے لئے

وہ نہ آئے موت آخر آ گئی
جی رہے تھے کیا اسی دن کے لئے

کیا بہاروں پر ہمارا حق نہیں
ہیں گل و گلزار یہ کن کے لئے

ذرّہ ذرہ ہے شرارہ طور کا
در حقیقت چشمِ بالطن کے لئے

مستؔ ان کو فکر ہے مرنے کے بعد
چاہئے کیسا کفن ان کے لئے

وزیری پانی پتی۔ کراچی

سنہری تلوار

مطلعِ فکر پہ چھائے ہوئے بادل سرکے
پھر کسی یاد کا مہتاب نمودار ہوا

پردۂ در سے چھلکتا ہوا پوشاک کا رنگ
اپنی حد میں نہ ٹھہرتی ہوئی خوشبوئے بدن

جیسے آغوشِ تصور میں کوئی خوابِ نشاط
جیسے آئینۂ تخئیل میں شہ پارۂ فن

گلشنِ عیش میں موسم کا نکھرتا ہوا روپ
دُور تک سلسلۂ سنبلِ گیسو کا سماں

دستِ بیباک خمِ شاخِ سراپا ناز
لبِ گلناز و سرِ لالۂ رخسارِ جواں

عشق وارفتگیٔ حسنِ پریشاں پہ فدا
حسن دیوانگیٔ عشقِ فراواں پہ نثار

فرطِ جذبات میں احساسِ خودی حرفِ غلط
شدتِ کیف میں تمیزِ من و تو دشوار

ناگہاں آگے بیابانِ قدم در منزلِ شوق
رکھ گیا کون یہ تلوارِ سنہری تلوار

بقیہ: خودکشی کیوں (صفحہ ۳۲ سے آگے)

پھول کھلنے کا وقت آیا تو اسے بغیر کھلکھلا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"اشانہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھول جاؤ کہ تم نے کبھی مجھ سے پریم کیا تھا۔ سمجھ لو کہ وہ ایک خواب تھا ایک سنہرا خواب اور خواب کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔"

بہت دیر تک وہ اسی طرح زندگی کی گتھیاں سلجھاتے رہے۔ لیکن گتھی اور الجھتی گئی۔ اشانہ کسی بہاتی ہوئی ندی کی طرح دوسرے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

آشا کے جانے کے بعد دیپک بہت دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اپنے دل کو سمجھاتا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے خیال سر ابھار رہے تھے کہ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے آشا سے ایسی روکھی باتیں کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔ یہی محبت کے معنی ہیں۔ کیا مجھے ایسا برتاؤ کرنا چاہئے تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے اسے تشفی اور تسکین دینے کی خواہ مخواہ ہر لمحہ کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس کے ضمیر نے پھر آواز دی۔ ہاں ہاں اس کے لئے صرف یہی علاج ہے اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا ہے وہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ دے گا۔ اپنی تمام آرزوؤں کو دفن کر دے گا مگر وہ اپنے باپ کے راستے کا روڑا نہیں بن سکتا۔ لیکن ..... لیکن وہ اپنی محبت کا بندہ اپنی آنکھوں کے سامنے اٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے برداشت سے باہر ہے۔ پھر اسے کیا کرنا چاہئے۔ ہاں ایک علاج ہے۔ اسے مر جانا چاہئے یہی سب سے بہتر علاج ہے۔ نہ وہ خود رہے گا۔ نہ یہ حسرتناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ ہاں ہاں اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جس لڑکی سے محبت کی جاتی ہے جو اس کے دل و دماغ کی ملکہ بن چکی ہے۔ اب وہ قانون اور سماج کی نظروں میں ماں کہلائے گی ہاں ہاں۔ اگر اسے اس کا بیٹا تصور کر لیں گے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

دوسرے دن پروفیسر مہتا کو معلوم ہوا کہ دیپک نے خودکشی کر لی ہے۔ سنتے ہی ایسا لگا جیسے کسی نے کرشن کے ذریعہ ان کی روح کھینچ لی ہو اور گوشت اور ہڈیوں کا صرف ڈھانچہ رہ گیا ہو۔ ان کی آنکھوں میں ساری کائنات گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بمشکل تمام وہ ہوسٹل پہنچے۔ دیپک واقعی لاش پر مسند پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کی آواز اس کی ہنسی کے اندر دب کر رہ گئی۔ وہ روتا چیختا تھا۔ لیکن آنسو خشک ہو گئے تھے حیرت و استعجاب کی تصویر بنے پچیس سال کی کمائی دیکھ رہے تھے۔

دیپک نے سوائے ایک خط کے جو اس کے پتا کے نام تھا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

پتاجی!

جب تک یہ راز آپ پر اور دنیا والوں پر فاش ہوگا اس وقت میں بہت دور پہنچ چکا ہوں گا۔ دل کی دھڑکنیں خاموش ہو چکی ہوں گی۔ سچ مانئے مجھے اس موت سے خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن آپ کو میرے خط سے معلوم ہوگا کہ موت سے میں ایک غم میں مبتلا تھا۔

ناچنے والا جب اپنے فن سے رسوا ہو جاتا ہے تو وہ یہی چاہتا ہے کہ وہ ناچنا چھوڑ دے لیکن طبلے کی آواز پھر اسے اپنی طرف راغب کر لیتی ہے

یوں تو آپ نے میرے لئے دنیا کی تمام خوشیاں اکٹھی کر دیں لیکن میں ایسا بدنصیب تھا کہ آپ کی دی ہوئی خوشیاں مجھے راس نہ آئیں۔

اور مجھ میں کچھ کہنے کچھ لکھنے کی طاقت نہیں ہے دعا اپنا خود کھا رہی ہے۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ سانس اکھڑا جا رہا ہے آواز گھٹتی جا رہی ہے۔ اب میں قلم کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں امید ہے کہ میری غلطی کو معاف فرمائیں گے فقط

آپ کا بدنصیب بیٹا۔ دیپک

پروفیسر مہتا کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے صرف اتنا ہی نکلا کہ تم نے سب کچھ لکھ دیا لیکن یہ کہیں نہ لکھا کہ تم نے خودکشی کی فکر کیوں ——؟

بقیہ: بھینگی کا نیلام (صفحہ ۲۷ سے آگے)

"بولی گھنٹہ گھنٹہ تک جاری رہی۔ ایک ایک کے منہ سے ایک ہزار روپیہ نکلتا پڑا۔ روپئی کا نام سنتے ہی گونی نائکہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اسے یقین شاید اس میں ایک پائی کی نقد رقم بھی نہ ہوگی۔ پھر جب نائکہ کا نام سنا تو وہ جانچ گیا۔ اگر وہ اب بھی اس کی آواز کو نہ روکے تو سرکار کی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ نہ جانے کتنا تنخواہ نہ ہڑپ لگا یا نہ لگا یا نہ دے گی یا نسری! اس کا ہاتھ پڑتے ہی نائکہ نے بھی ایک پتھر مار کر سر کاٹ سے ندی داری کا ثبوت دیا۔ نام دیا لی مگر فساد کر دیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے پھانسی ہوگی یا پھر کالے پانی بھیجا جائے گا یا پھر کہیں کی پولیس چوکی کے پیچھے اسے زندہ دفن کیا جائے گا۔

دوسرے دن اخبار میں لوگوں نے پڑھا کہ نشہ بندی کا قانون ہٹا یا جائے گا یا نہیں۔ یہ مسئلہ غور طلب ہے اگر حل ہو گیا تو نشہ بندی کا قانون رد کر دیا جائے گا ورنہ پرانی رسم جاری رہے گی۔ جو آج تک چل رہی ہے سنتا ہوں اب تک اس کا کوئی حل تلاش نہیں کیا گیا اتنا سن کر خاموش ہو گیا کہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اور پھر کا کوئی پتہ نہ چلا۔ نہ اس کی بھینگی کے نیلام کے بارے میں کسی اخبار نے کچھ لکھا، پتہ نہیں کیوں ——؟

نوکی شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۵۵
غزل ارسال ہونے کی آخری تاریخ ۵ جولائی
مصرع طرح۔ شرکت فرمائیں نہیں چاہتی خیر تیری
خیر، فرقت قمانی —— میری رہنے
نام .....
پتہ .....

فصیح تاجی ناگر

تمہیں تکریم کرتا ہوں مصور حسنِ جاناں کی
نئی ترکیب ہاتھ آئی ہے تکمیلِ ایماں کی
زمانہ خندہ زن ہے ہر طرف جب میری وحشت پر
اڑا لو اب ہنسی تم بھی مرے حالِ پریشاں کی
یہ کس جاں باز پروانے کی آمد ہے سرِ محفل
یہاں تھرا رہی ہے آج لو شمعِ فروزاں کی
کیا دستِ جنوں نے چاک جب کر جوشِ وحشت میں
بہاریں لے اڑیں وہ دھجیاں میرے گریباں کی
سوالِ احتسابِ شمعِ محفل پر کہا ہنس کر
جلیں جس جا نہ پروانے دل ضرورت کیا چراغاں کی
کہاں وہ التفاتِ دلکشا کے بعد میں شاہانہ
کہاں یہ دھجیاں محسن ترے جیب و گریباں کی

دلی پیلی بھیتی

ہر کوئی اپنی فطرت سے مجبور رہے
عشق خودسر ہے حسن مغرور ہے
پیرِ مے خانہ، مے سے فرض کیا مجھے
اب مرے سامنے چشمِ مخمور ہے
جو بچایا گیا وہ جلایا گیا
شمعِ محفل یہ کیا تیرا دستور ہے
وہ مرے سامنے بے نقاب آ گئے
جلوۂ حسن سے دل مرا طور ہے
اے خوشی میں تجھے کس طرح دوں جگہ
خانۂ دل مرا غم سے معمور ہے
کشتیٔ زیست ہے غم کے طوفان میں
آہ ساحل دلی منزلوں دور ہے

راشد قریشی حسن پوری

جو دل جوشِ وفا میں درد کا حامل نہیں ہوتا
حقیقت میں وہ دل کچھ بھی ہو لیکن دل نہیں ہوتا
سہارا چاہتا ہوں ہر قدم پر راہِ الفت میں
کسی رہرو کو خود اندازۂ منزل نہیں ہوتا
محبت کا مزا جب ہے کہ دل آنکھوں میں آ جائے
وہ آنسو کیا کہ جس میں خونِ دل شامل نہیں ہوتا
مقدر بھی بدل جاتے ہیں اکثر جہدِ پیہم سے
جو ہمت ہو تو کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا
عمل ہے زندگی کا راز، ورنہ کچھ نہیں راشد
فقط باتوں ہی باتوں سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا

جلال و جمال

زاہد صدیقی دھولیوی

جلوے تمہارے پیشِ نظر دیکھتے رہے
ہاں فرقتوں میں نورِ سحر دیکھتے رہے
بدلی نگاہِ ناز جو ہم سے مرے ندیم
دامانِ دل کے زیر و زبر دیکھتے رہے
واقف تھے اپنی منزلِ مقصد سے اہلِ دل
لیکن تمہاری راہ گذر دیکھتے رہے
اُجڑے ہوئے چمن کا یہ حالِ نزار دیکھا گیا نہ ہم سے مگر دیکھتے رہے
شمس و قمر کی بات نہ کر زاہدِ حزیں
ذرے بھی جگمگا کے سحر دیکھتے رہے

قادری پیلی بھیتی

نہ جانے کر دیا مشکل نے کیا جادو مرے دل پر
کہ ہنس دیتا ہوں مشکل دیکھ کر ہر ایک مشکل پر
سنا کرتا ہوں جب آئیں گے وہ بے پردہ آئیں گے
خدا جانے کہ وقتِ دید کیا گزرے مرے دل پر
سکون آتا نہ آتا، درد کم ہوتا کہ بڑھ جاتا
مگر وہ ہاتھ رکھ کر دیکھ تو جاتے مرے دل پر
مرا جذبِ تجسس راس آئے قادری مجھ کو
وہ دن آئے گا اک دن تو مجھے دیکھو گے منزل پر

محمد اصغر پیلی بھیتی

عید

صاحبِ زر کے لئے آتی ہے عید
کب فقیروں کے لئے آتی ہے عید
کون کہتا ہے کہ کچھ لاتی نہیں
دیکھ کتنے غم لے آتی ہے عید
مسکراہٹ نام کو لاتی نہیں
اشک کچھ آنکھوں میں بھر جاتی ہے عید
عیدکی خوشیاں نہیں لاتی ہے جب
کس لئے تخلیق فرماتی ہے عید

کرشن چندر

کالے پُل کے مکیں

سُندر داس اور جاوید بائیسکل پُل کے نیچے رکتے اور ڈھنگ بجاتے ہوئے نکلتے اور بائیسکل کے گرد آ پڑتے۔ سُندر داس کے ہر بچے میں بلا کا سُر تھا اور جاوید کی ڈھنگ کی تھاپ میں ایک عجیب چمک تھی۔ ماں باپ بیٹے کی کرسماں باندھ دیتے تھے۔ بچے بائیسکل کے ٹکڑے پیدل چل کر تو جوہو سمندر کے کنارے پہنچ جاتے تھے مگر جوہو پر انھیں خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی تھی۔ ماں کو راستے میں بھل بھاجا پاؤ بھاجی وغیرہ بیچنے کے ٹوکرے، گلیاں اور بازار ایسے تھے جہاں انھیں خاصی آمدنی ہو جاتی تھی مگر جوہو اس معاملہ میں بہترین جگہ تھی۔ وہاں کے سیٹھ ساہوکاروں پر ہر وقت ہی روپیہ برستا رہتا تھا۔ اس لئے بچے اور جوان جو فلمی گیت کے شیدائی تھے اور "زبان یار من ترکی" اور "یاہو" کا نعرہ چاہتے تھے۔ انھیں کچھ پسند کر سکتے تھے۔؟

سُندر داس کی آواز میں ضعیفی کے باوجود ایک جذب و کشش تھی۔ بڑی دلکش آواز تھی۔ جیسے آنکھیں کھول کھول کر دنیا کا نظارہ کر رہا ہو۔ بستی سُندر داس سے آنکھیں چرا کر گزر جاتی اس کی آواز کو آنکھیں دے دیتی تھیں وہ جیسے آواز سے لوگوں کے دل ٹٹول لیتا تھا۔ اور کبھی کبھی ان کی جیبیں بھی۔

اُس کا بیٹا دھرمے بدن کا مضبوط کاٹھی کا گٹھا جوان تھا۔ اپنے چوڑے سینے پر ڈھنگ ٹکائے برے جب وہ اپنے باپ کے ساتھ کبھی کبھی کوئی تان اُٹھاتا اور تنے ہوئے مضبوط ہاتھوں سے تال دیتا تو بے حد اچھا معلوم ہوتا۔ جاوید کی تالی میں زندگی کی بے فکری اور جوانی کا نشہ دونوں موجود تھے اور جب کبھی وہ پلٹ کر جان اُٹھاتا تو اپنے باپ کی دور بھری اور گمبھیر آواز کے آرپار اس کی نعرہ زن روح جیسے سمندر کی لہروں پر عقاب بن کر پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی۔

سُندر داس اور جاوید بائیسکل کے ٹوکرے چلا کر چرنی گھر کے دروازے تک پہنچتے۔ وہاں سے پارسیوں کے گنبارہ کے تجوری آتے، جہاں ان کے شیدائی کچھ بوڑھے پارسی اس وقت ان کے انتظار میں جمع رہتے تھے، وہاں سے ہو کر وہ دونوں لعل باغ اور پریل کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ اور یہ صرف چند گھنٹوں کا وقفہ تھا جہاں انھیں کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ فیصلہ ہی پارک البتہ ان کے لئے بڑی فاضل بخش جگہ تھی۔ دوپہر کے قریب وہ باہم میں سندھیوں کے حلقہ کے باہر پہنچ جاتے، یہاں پر بہت سی سندھی عورتیں انھیں گھیر لیتی تھیں اور ایک دو پیسے دے کر ان سے ہری بھجن سنتی تھیں۔

آگے باہم کی درگاہ کا حلقہ تھا۔ یہاں ہری بھجن کی کچھ گنجائش نہ تھی۔ یہاں تو سلام، نعت اور قوالی کا دور تھا۔ اس لئے سُندر داس اور جاوید دونوں جلدی جلدی باہم کا چکر پار کر کے، باہم کراس کر کے باندرہ پہنچتے جہاں چمک میں باندرہ کی مسجد تھی۔ اونٹ کے کباب اور مسیح داؤں کی دوکان تھی۔ اس لئے یہ علاقہ بھی جاوید اور سُندر داس کے جغرافیہ میں بنجر علاقہ کہلاتا تھا۔ پھر باندرہ ٹاکیز سے لیڈ سینما تک، جہاں باندرہ سے شتاکروز تک خالی خالی تھا۔ جہاں نہ ہری بھجن، نہ سلام نہ نعت نہ قوالی نہ کیرتن۔ یہاں پر دوکان پر بیٹھے ہوئے سیٹھ لوگ تھا اور ہر کھڑکی سے لے لے کی صدا بلند۔ ایسا بین ڈیکا۔ ٹایا ڈیا ڈیکا۔ "تیری نظروں نے ایسا کاٹا۔" وغیرہ کی دل میرا بانٹ سادہ "میرا اب تو کنکر ٹاٹا۔" ایسے شاہکار سنائی دیتے تھے

گیتوں کے سامنے میرا بائی، سُندر داس اور تلسی گیتوں کی کیا حیثیت تھی!

اس لئے ان تمام بنجر اور ویران علاقوں باپ بیٹے خاموش اور کچھ بوجھل، اداسی سے جب جوہو پہنچتے تو ان کی جان میں جان آتی۔ جوہو والوں کو زیادہ تر بانکڑوں اور جوانوں کی حد تک تعلیم خاصی تھیں۔ اندھیرے کے ڈھکے چھپے آدمی گھنٹہ، روشن اور تفریحی موڈ میں ہوتا۔ بھیل پوری۔ دہی بڑے کی چاٹ اور مونگ کھاتے کھاتے جیب میں ہاتھ ڈال کر قریب سے جوئے بوڑھے کو پانچ پیسے تھما دینا کوئی بات نہیں ہوتی۔ خیرات خیرات نہیں، بلکہ زندہ معلوم ہوتی ہے۔

مگر بوڑھا سُندر داس اپنے آپ کو بھکاری سمجھتا تھا۔ وہ بہت خود دار تھا۔ اکثر بوڈھے لئے جب جوہو کے کنارے اپنی کھڑی کر کے کنارے کی کھڑکی سے سر نکال کر اپنے گود میں بچے سے کہا۔ "بیٹا اس اندھے بھکاری دے دو۔" تو سُندر داس نے جلدی سے اپنا کھینچ لیا اور بولا۔ "سیٹھ میں اندھا ضرور بھکاری نہیں ہوں۔ روز صبح آٹھ بجے سے بجے تک گھنٹے گیت گاتا ہوں، لوگوں کا د

تب چار پیسے کماتا ہوں۔ یہ بھیک نہیں ہے، میرے گیتوں کی مزدوری ہے!"

کاموداسی سیٹھ نے نادم ہو کر کہا "مجھ سے بھول ہو گئی سُودرداس جی۔ یہ لو اپنے گیتوں کی مزدوری۔" یہ کہہ کر سیٹھ نے پانچ پیسے بڑھے سُودرداس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور بڑھا اُسے دعائیں دینے لگا۔ بیٹھا تھوڑا ضرور تھا، مگر دل کا بُرا نہیں تھا۔

آٹھ بجے کے بعد جب بھجن والی عورتوں اور خانہ دار مردوں کی بھیڑ چھٹ گئی اور جمنا جو کے ساحل پر اکے دُکے عشق کرنے والے جوڑے رہ گئے تو باپ بیٹے نے واپس چلنے کی ٹھانی۔ عاشق کے جوڑوں کے سامنے ہری بھجن ایسا ہی ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ اس لئے باپ بیٹے جُوہو سے پیدل سنتا کروز روانہ ہوئے اور وہاں سے وکل ٹرین میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچے۔

اُن کا گھر بائیکلہ کے پاس ریلوے پُل کے نیچے تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور قدیمی پُل تھا۔ جس کی محرابوں کے نیچے ریل کی کئی پٹریاں گزرتی تھیں اور اُوپر سینے پر ٹرام کا پہیہ گھومتا تھا۔ نیز موٹریں اور بسیں دندناتی تھیں۔ یہ شہر کا سب سے مضبوط اور سب سے پرانا پُل تھا جس کی محرابوں کا پلاستر انجن کے دھوئیں اور زمانے کی جنگ سے کالا اور سخت ہو گیا تھا۔ محرابوں کی چھتیں بھی کالی تھیں، اور پُل کے پتھر بھی کالے پڑ گئے تھے۔ اسی وجہ سے اس پُل کے نیچے رہنے والے لوگ اُسے کالا پُل کہتے تھے۔

اس کالے پُل کے نیچے کون لوگ رہتے تھے؟ اس کالے پُل کے نیچے وہ لوگ رہتے تھے، جنہیں آسمان کی محراب کے نیچے کوئی پناہ نہ ملی۔ زندگی کی محرابوں کے نیچے کوئی راحت نہ ملی اور دھرتی کی محرابوں کے نیچے دولت نہ ملی، اس لئے وہ لوگ جو غریبوں میں سب سے غریب، نیچوں میں سب سے نیچ اور شامتِ کہنہ کا اوتار تھے سب سے زیادہ شامت کے مارے تھے۔ اس پُل کے نیچے پناہ ڈھونڈتے ہوئے آ گئے تھے۔ یہیں پر سُودرداس اور اُس کا جیا جھاویر رہتے تھے۔ ریلوے لائن کے اُدھر ڈوبے کے جنگلے اور پُل کی محرابوں کے نیچے کوئی دو ڈھائی سو فٹ لمبی اور ایک سو فٹ چوڑی محفوظ جگہ تھی۔ جہاں نہ بارش کا گزر تھا، نہ دھوپ کا نہ سردی کا۔ نہ کسی مالک مکان کو کرایہ کا۔ اس لئے سُودرداس اور جھاویر، محمود بن ستری لگر بھجن منڈلی، جس کا فضلو بریٹ پالش والے بھالو ڈبل روٹی بیچنے والے۔ مانڈو رام بیچنے والے۔ شامو گرکٹ، جارج اور بھیکو دلال کے لئے اس سے بہتر پناہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر دو بڑی عورتیں تھیں۔ سنتی اور جینا بائی جو جھانی میں پیشکرتی تھیں اور اب بڑھاپے میں بھیک مانگتی تھیں۔ مٹر کدل اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے روٹی اکٹھی کرنے والا بگلا تھا۔ اس کی چھپک دوبیری گھنٹی تھی اور اُس کی نوجوان لڑکی سوگندھی۔ سبزی بیچنے والی قدر اکتی اور ایک طالب علم بھی تھا جس کا نام طالب علم تھا جو اکثر راتوں میں کالی محرابوں کے خدا باہر بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اپنی کتابوں کے اُوپر جھکا ہوا پایا جاتا تھا۔

یہ اکیلی متعدد ایسے لوگ تھے جو اس کالے پُل کے نیچے رہتے تھے۔ جیسے سب کی صرف کا ایک دن معین ہے اسی طرح ان میں سے ہر آدمی کی جگہ اس محراب کے نیچے مقرر تھی۔ ان میں سے ہر آدمی کی اپنی بھوک تھی، اپنے پھٹے چیتھڑے تھے اور گلی سڑی ایک پوٹلی تھی جس میں ہر آدمی شب کو سب کی نظروں سے بچا کر اپنی فریاد گو کر اور باندھ کر اگ سے رکھ دیتا تھا۔ اور پھر اُسے اپنے سرہانے رکھ کر سو جاتا تھا ——

تھکے ماندے سُودرداس نے پُل کے نیچے آ کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنی جگہ بیٹھ کر محراب سے ٹیک لگا کر کہا "جھاویر بیڑی لائے ہو——؟"

"بابو تم آج دن بھر میں چار آنے کی بیڑی پی چکے ہو——" جھاویر نے کہا۔

سُودرداس نے یہ جملہ تھکن سے چُور ہوتے ہوئے کہا "مجھے ایک بیڑی دے دے بیٹا——"

جھاویر نے بڑی سختی سے کہا "نہیں ہے"

سُودرداس بولا "نہیں ہے تو لا دے۔ شام ہو رہی ہے" پھر وہ آہ بھر کر بولا "بڑے لوگوں کی تقدیر بڑی ہوتی ہے۔ شراب ہے۔ ڈانس ہے۔ غریب کا تو ایک ہی سہارا ہے بیڑی——"

جھاویر نے اچانک اپنی جیب سے بیڑی کا پورا بنڈل نکالا اور اُسے زور سے سُودرداس کی گود میں پھینک دیا اور جھلا کر بولا "لو پیو۔ سارا بنڈل پی جاؤ——"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سُودرداس نے بیڑی کا بنڈل کھولا۔ بنڈل کھول کر ایک بیڑی نکالی۔ ٹھنڈے پڑے ناخون کی نوک سے ٹیک کو کے منہ میں رکھا اور دیا سلائی جلا کر ٹکایا، پھر زور سے پھیپھڑے کو کھینچا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سر محراب کی دیوار سے ٹکا دیا۔ اور بیڑی کا دھواں آہستہ آہستہ ہوا میں چھوڑ کر بولا "یہ بیڑی کا سُٹا! دن بھر کی تھکان کے بعد بالکل جنت کا جھونکا معلوم ہوتا ہے (اپنے بیٹے سے) تم ایک سُٹا لے کر تو دیکھو!"

"اونہہ! مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا——" جھاویر جھلا کر بولا۔

"کیا اچھا نہیں لگتا——؟" سُودرداس نے خفا ہو کر پوچھا۔

"نہ تمہاری بیڑی، نہ اپنی بیڑی، نہ یہ منحوس کالا پُل جس کے نیچے ہم اپنی منحوس کالی زندگی گزارتے ہیں" جھاویر نے جھریرے جھریرے بدن سے بولا اور کھانسنے کی اپنی ٹھنڈیاں بھینچ کر زور زور سے کالے پُل کی دیواروں پر مارنے لگا۔ اُس کے پھیپھڑے کی کراہٹ اور جھلاہٹ بڑھتی گئی——

"اس کالے پُل کی کالی دیواریں کتنی مضبوط اور مضبوط ہیں۔ میری قسمت کی طرح کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتیں۔ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتیں۔ کیا مجال جو کبھی اپنی جگہ سے

[illegible] محسوس کیا۔ وہ مسکرا دیئے۔

جاوید نے اپنے جسم کو جھٹکوں کی ضرب سے فوراً سنبھالا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی دونوں بانہوں میں سمیٹ کر بھینچ لیا۔ سودھا داس نے اپنے بیٹے کے سسکنے کی آواز کو سن لیا۔ وہ پل کے نیچے سے گزرنے والی کسی آواز کو کان لگا کر سنتا ہے۔ ہاں اس کو بڑی نفیس آواز تھی۔ جو اس کے اپنے سینے سے گونجی تھی اور اس نے اپنا پاؤں اٹھا لیا۔ اس پل کے نیچے رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنا پاؤں جمنا کے اس پل کے نیچے اسے جم دیا تھا اور پھر اسے اپنا مرہم بھی کہا تھا جس نے جاوید کو اس پل کے نیچے پھینکا تھا۔ اس نے سوچا پل تو اٹل ہے۔ ایک ہی جگہ پر کھڑا ہوا ہے۔ کبھی جنبش نہ کرنے والا ہے۔ پتھروں کی زندگی میں ایک تاریک بندر کی طرح اکڑا ہے اور فریب کی دنیا میں اپنے خاندان کی وراثت چلا رہا ہے۔ اس سے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں یا قابل تردید حقیقت کہہ سکتے ہیں۔

وہ جو چیز دنیا میں اٹل ہے اس کا فرد کر نہیں کرتے تھے۔ سودھا داس اپنے سسکتے ہوئے بیٹے کو سمجھانے لگا۔ اس کا فرض تھوڑا سا اس بڑی سے دور ہٹا ہے اور بیٹے کو بڑی تسلی سے۔

ٹھیک شب کے سناٹے میں پل سے گزرنے والے کسی اجنبی کے دردناک آواز کو سن کر سودھا داس نے جاوید سے کہا۔ "یہ پل ہندوستان پر حملہ کرے گا۔" "یہ پل کی دھڑکن ہے۔" "ہندوستان کی سرحد پر ایک حملہ۔" "پیشل بیشن۔"

جاوید نے بچے کھچے کھرے کی صدا تاریکی میں ڈوب گئی اور کسی نے اس کی آواز کو نہیں سنا۔ کیونکہ سب لوگ سو رہے تھے۔ محراب کے اوپر اور محراب کے نیچے۔ دوسرے دن کی پہلی صبح کی اور سورج نکلنے تک سودھا داس کی آواز بھی بند ہو گئی اور سورج نکلنے پر جاوید کی آنکھ کھلی تو سودھا داس اپنے بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔ جس طرح پہلے تھے۔ محراب کے کنارے پر انہیں صرف دو دن ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ پل سے ہمیشہ اپنی پہچان ہو جانی چاہیے تھی۔ انہوں نے دو دن نکل جانا کہا کرتے تھے۔

"کیا بات ہے" سودھا داس نے پوچھا۔ "آج لوگ دیتے نہیں!"

"ہاں کیا بات ہے؟" جاوید نے بڑی حیرت سے کہا۔

وہ دونوں اپنی فکر میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں دنیا کی کوئی خبر نہ تھی۔ خبر معلوم کرنے کی کوئی خواہش بھی نہ تھی۔ وہ لوگ گیت گاتے ہوئے چلتے رہے اور ہر ایک چلتے ہوئے گیت میں انہیں پہلے سے بہت کم پیسے ملتے رہے کئی مجلسوں سے تو ایک پیسہ بھی نہ ملا اور وہ لوگ پانی فریب کی ایک ایک پائی کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہوئے اپنے اندر ہی اندر حال میں گرفتار ہوتے ہوئے مجبور ہو گئے! اب تک صرف ایک روپیہ تین پیسے ہوئے تھے۔ جب کہ مجبور ہو کر پہنچے پہنچے دو دھائی روپے ہر روز ہو جاتے تھے۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکے کہ ہوا کیا ہے۔؟

جاوید گیت گاتے گاتے جاوید نے بیٹھ سے سودھا داس کو ایک آدمی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جس کا کوٹ میں نارنگی فرک پہنے ہوئے بانہوں میں دبائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ بچہ کے پاس نے اپنی جیب سے چار پیسے کا ایک سکہ نکال کر اپنی بیٹی کے حوالے کیا اور اس نے کہا "یہ بابا بچے سودھا داس کو دے دو!"

لڑکی نے بچہ نہ سے نفی میں سر ہلا دیا اور بولی "نہیں، نہیں یہ بابا پیسے۔ ڈیشن فقیر میں دیتا ہوں گا" اس کو معلوم نہیں ہے، پیسے نے ہمارے لئے پیدا کر دیا ہے" ایک لمبے سے کار میں بیٹھے ہوئے سودھا داس نے اپنے بچے کی بات سنی اور اس کے ہاتھ سے سکہ لے کر پھینک دیا اور سر سے کہتے ہوئے جاوید سے بولا سودھا داس نے بڑی حیرت سے کہا کہ اپنی ننھی بیٹی کی انگلیوں سے جاوید نے سودھا داس کو دیکھا۔ جاوید نے جب کہ بچہ سے پیسے اٹھا لئے تھے۔

اسی شب وہ سب لوگ کالے پل کے نیچے جمع ہوئے چاروں طرف بیٹھ ہوئے اور گفتگو کی باتیں ہونے لگیں ایک عجیب جذبہ ان سب کے دل میں ابھرنے لگا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگے کہ ایک سرد اور فریب بھری دنیا میں رہتے ہوئے اور تاریکی کے باوجود ان کے پاس کچھ ہے کا ایک چمکتا ہے۔ روشنی کی کرن ہے، پتھر کا کیا کہنا ہے جسے انہیں پہچانا ہے۔ اور اس ریزہ ریزہ ہونے کے جھگڑے۔ پتھر کی محراب سے گھٹ پھٹ اور سیکڑوں ہزاروں ایسے ٹکڑے جو ہوا میں اڑتے ہوئے ایک کھلبلی سی کی تصویر کو مرتسم کر دیتے ہیں لوگ نہ کہہ سکتے ہیں۔

طالب علم کہہ رہا تھا۔ ہمارا ملک ہمیشہ اس چاہتا رہا۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے ملک کو کیا کچھ نہیں کیا۔ ہماری تہذیب دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے قدیم اس کی تہذیب رہی ہے۔ ہمارے ملک نے ہمیشہ امن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے لیکن ہمارے ہاتھ بندوق کی گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے ہیں۔ کاہ بیسویں صدی کی دنیا ہے جو ہر ایک کمزور ملک کو ہڑپ کر جانے کی ہوس رکھتی ہے۔ ہندوستان کی مدافعتی طاقت کو ختم کر دیا ہے کچھ ہو جائے لیکن ہے آج ہو جائے۔ لڑائی ہو جائے گی اب وہ محبت کبھی نہیں ہوگی۔ محبت کا وہ نمونہ جو بدھ کے زمانہ میں تھا اب صدیوں کے ختم ہو چکا اب ہمارے پاس بھوٹی سانگا کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم کو حالات نے ان پر غور کرنے نہیں دیا ہے۔ اب ہمارا ہر حال میں اپنے آپ کو مضبوط بنانا ہے۔ اپنے تحفظ کے لئے جہاں ضرورت ہے اور جس کو ضرورت ہے ہر شکست خوردہ ہے۔

"ہم لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں، ہم لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں" طالب علم نے کہا۔

"ہم لوگ بہت بڑی قوم نہیں ہیں" ہاں تو وہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے اب تک ہر طرف

"اپنے لئے نہیں، میرے لئے مانگتا ہے۔" سُندر داس نے جواب دیا۔

"تیرے لئے کیا نہیں باپو؟"

"آج سے ایک وقت کھانا کھاؤں گا۔"

"باپو۔۔۔؟" جاوید نے تعجب سے چلا کر کہا۔

"جاوید بیٹا۔۔۔ کھٹ کھٹ نہ کر۔" سُندر داس نے گلے کو بھر کر اس محبت سے کہا کہ جاوید چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

جس دن کھیپ کی آخری رات تھی۔ اُس رات کالے پُل کا ہر مکین اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا اپنی اپنی پرانی لگن جا تھا۔ ان سب کے چہرے پر مسرت کی چمک تھی کیونکہ چھ ہفتے سے جو پیٹ بندھے رہتے ہوئے آج ان میں سے ہر ایک محسوس کر رہا تھا کہ ایک دوسرے سے بھوکے ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی وہ سب میں بانٹ کھا رہا ہے۔ جو انھیں مفلر کر کھاتی ہے، ملاتی ہے، ایک کر دیتی ہے۔ پیٹ بھرے تھے انھیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے سو گئے پیٹ ننگے ہیں مگر سب کی کرایہ دار پیٹ ہوتے ہیں اس لئے ہر آدمی جو اپنی اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا کو ایک نئی نگاہ سے اپنے پڑوسی کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اُس کا اور اپنا کوئی نیا رشتہ پیدا ہو رہا ہو۔

نصلو بیڑی والے نے اپنی رقم شمار کر کے بڑے فخر سے کہا۔ "اپنے پاس تو سترہ روپے آٹھ آنے ہو گئے ہیں۔ تم نے کتنے جمع کئے ہیں۔۔۔؟" اُس نے مجبور ڈبل روٹی والے سے پوچھا۔

"پورے گیارہ روپے!" مجبور ڈبل روٹی والے نے اپنی پوٹلی ہاتھ پر لے کر کہا۔

پھر اُس نے شاعر گوکٹ سے پوچھا۔ "تم نے کتنے جمع کئے؟"

"اے کیا پوچھتے ہو! اپنا تو صندوہ بہت مندا ہے کل کل۔ جو پاکٹ مار اس میں سے نیشنل ڈیفنس بانڈ نکالے۔" شاعر گوکٹ نے بڑی تاسف بھری حیرت سے

کھول کر مجبور ڈبل روٹی والے کے سامنے پھینک دیئے اور بولا "یقین نہ ہو تو خود دیکھ لو۔"

ماسٹر ہمارشنس کر بولا۔ "ایسے حرام کا دھندا کرے گا تو یہی ملے گا۔"

جاوید اپنی جگہ پر سکوں کی ڈھیریاں بنتے ہوئے گن رہا تھا۔ جب وہ سب رقم شمار کر چکا تو سُندر داس نے بیٹے سے پوچھا۔ "کتنا ہوا۔۔۔؟"

"سندر پیسہ چار آنہ!"

"ٹھیک سے گن لیا؟"

"ٹھیک سے گن لیا۔"

"ادھر لا۔۔۔!"

جاوید نے پوری سو کی رقم سُندر داس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ چوٹی کدھر ہے۔۔۔؟"

جاوید چپ رہا۔ سُندر داس نے پھر بڑی سختی سے پوچھا۔ "یہ چوٹی کدھر ہے، میں پوچھتا ہوں بتا۔۔۔؟"

جاوید چپ رہا تو بوڑھے نے ایک نوٹ کا چانٹا اُس کے منہ پر دیا۔ سب لوگ تعجب سے باپ بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر جاوید کے چہرے پر خفا نہیں ہوا۔ زیر لب مسکرانے لگا اور اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے ٹٹولا اور کچھ نکال کر اُس نے اس بوڑھے کی گود میں پھینک دیا۔ اور بولا۔ "چوٹی کی پڑیاں لایا ہوں تیرے لئے۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بولا۔ چانٹا کیوں کھایا۔" بوڑھے کی آواز میں ایک عجیب قسم کی ندامت اور پشیمانی تھی۔

"تیرا چانٹا کھانے کو کبھی جی چاہتا ہے۔" جاوید نے آہستہ سے کہا۔

بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑی سگائی نوٹ کا ایک گولہ سا بنایا۔ آنکھیں بند کر کے سر محراب کی کالی دیواروں سے لگا دیا اور دھوئیں چھوڑتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجہ میں بولا۔۔۔ "آج سو گز کا چھپر بنا لیا ہے رات کو سب سو گئے۔ مگر سُندر داس کو نیند نہیں آئی وہ پاگل پاگل کر دیر تک سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔

"سو جاؤ باپو۔۔۔" جاوید نے کہا۔

"نیند نہیں آرہی بیٹا۔۔۔"

"کیا سوچ رہے ہو۔۔۔؟"

"سوچ رہا ہوں بیٹا، کب رات ختم ہوگی، کب سویرا ہوگی کب ہم لوگ جلوس بنا کر شہر کی انجمن کے پاس جائیں گے اور روپیہ، روپیہ مکھ کے تحفظ کے لئے جمع کرائیں گے۔۔۔"

جاوید چپ رہا۔

"ایسا لگتا ہے بیٹا جیسے یہ دنیا بدل سکتی ہے۔"

جاوید پھر چپ رہا۔

اچانک کالے پُل پر ایک گرج سنائی دی جو آہستہ آہستہ دُور ہوتی گئی۔ سُندر داس اپنی جگہ سے اُٹھا اور کالے پُل کی محراب سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی پُر نور آنکھیں اُٹھا کر دُور آسمان کو دیکھنے لگا۔

"یہ گرج کیسی تھی بیٹا۔۔۔؟"

"ہوائی جہاز تھا۔۔۔"

سُندر داس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آئی اُس نے اپنی بے نُور آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے کہا۔ "اس میں ہمارے جوان ہوں گے۔ سرحد پر جا رہے ہیں اپنے دیش کی حفاظت کے لئے۔"

جاوید بھی بڑی توجہ سے اُوپر دیکھ رہا تھا۔۔۔ اچانک دھیرے سے بولا۔ "بابو جی مجھے بہت جی چاہتا ہے، میں بھی بڑا ہو جاؤں۔ میں بھی ہوائی جہازوں کے ساتھ۔"

اچانک ایک اور ہوائی جہاز گرجا اور پُل کے اوپر شور مچاتا ہوا دور نکل گیا۔ پھر دوسرا ایا، تیسرا ایا۔۔۔ چوتھا ایا۔ پانچواں ایا۔ اس تیز ہوائی جہازوں کا لوک آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی چلی گئی۔ سارے جہاز

خوفناک لہریں پیدا ہو گئیں اور کانوں میں بادلوں کی سی گھن گرج اور گونج پیدا ہونے لگی۔ کالے پل کی دیوار سے لگے لگے بوڑھے سُودا داس نے محسوس کیا جیسے ان برقدم ہوائی جہازوں کی دھمک سے کالے پل کی دیواریں کانپ اُٹھیں اور کالی چمنی کی ٹہنی اُکھڑ اُکھڑ کر گر رہی ہے، اور خوشی سے چلا کر اُس نے کہا "کالا پُل ہل رہا ہے جاوید — کالا پُل ہل رہا ہے —"

سب طالب علم سب سے پہلے اُٹھا۔ اُس نے سب لوگوں کو جمع کیا اور بتایا کہ ان کے جلوس کے لئے کلیر روڈ کی کمیٹی نے ایک جگہ دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ جگہ یہاں پہنچ جائے گا۔ سب لوگ تیار ہو جائیں۔ اور اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لیں۔ پھر وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا اور بولا — "سب لوگ اپنا اپنا نام اور رقم بولتے جائیں میں فہرست بنا لیتا ہوں —"

بھولو روٹی والے نے کہا — "گیارہ روپے میرے لکھ لو —"

محمد دین مستری بولا — "سینتالیس روپے پچاس پیسے میرے لکھ لو —"

فضلو بوٹ پالش والا — "سترہ روپے آٹھ پیسے میرے —"

گُرچن سنگھ بولا — "چالیس روپے میرے!"

سُودا داس زور سے چلایا — "سو روپیہ۔ پورا سو روپیہ میرا —"

سُودا داس نے اتنا کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر اچھی طرح سے ٹٹولنا شروع کیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا "اِدھر کہہ رہے، اسی جیب میں رکھا تھا رات کو — یہیں رکھا تھا —" وہ ایک دم چلا کر بولا "کسی نے رات کو میری جیب کاٹ لی —"

اتنا کہہ کر اُس نے سارے کپڑے ٹٹولے اور سارے بستر کی تلاش میں فٹ پاتھ پر بکھرے کوڑے ٹٹولنے لگیں۔ مگر شیا موجب کہیں نظر نہیں آیا۔ رات کو تو اس پُل کے نیچے سویا تھا۔ سب نے اُسے دیکھا تھا۔ مگر صبح سویرے کس وقت غائب ہو گیا، کسی کو معلوم نہ تھا۔ جاوید کا خون کھولنے لگا۔ مگر سُودا داس بالکل بے بس ہو کر بچوں کی طرح سسکنے لگا۔ "میرے سو روپے میرے سو روپے" اُس نے روتے ہوئے کہا — "سو روپے جو میں شہری انجمن کو دینے والا تھا — میری مہینے بھر کی دن رات کی محنت کی کمائی —"

جاوید نے دانت پیس کر کہا "وہ شیا مجھے اس وقت اگر مجھے کہیں مل جائے —!"

وہ سب سُودا داس کو تسلی دینے لگے۔ پھر بھولو بولا — "بھاگ کر جائے گا کہاں۔ اس شہر میں کہیں تو ملے گا۔ ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے —"

رامو چمار بولا — "ہم سب اڈے جانتے ہیں اور ہم اُسے تلاش کر لیں گے اور تمہاری ایک ایک پائی اس سے اگلوا لیں گے —"

فضلو بوٹ پالش والے نے گھونسہ تان کر کہا "میرا اُس سُور کی اولاد کے سوئکڑے کر دوں گا۔ سُودا جی تمہارا روپیہ ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ رو نہیں سُودا جی!"

اتنے میں کلیر روڈ کمیٹی کا ہیڈ آ گیا اور کالے پُل کے مکین جلوس بنا کر روانہ ہونے لگے۔ سب سے آگے طالب علم قومی جھنڈا اُٹھائے چل رہا تھا۔ پھر ایک ایک کر کے سب لوگ اس کالے پُل کی محراب سے نکل کر روشنی میں جاتے ہوئے جلوس میں شامل ہو گئے —

بھولو — رامو — فضلو — گُرچن — جارج — ڈکرز — بچن لال — کلاکر — اور جگنا بھی جلوس میں گیت گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ محراب کے نیچے سُودا داس سسکتا رہ گیا۔ جاوید زور زور سے مُٹھیاں بھینچتا ہوا محراب کی دیوار کو غصہ زور سے غصہ سے کوٹنے لگا۔ اچانک سُودا داس سسکتے سسکتے ہنسنے لگا۔ جاوید پُل کی دیوار کو مارتے مارتے رک گیا۔ باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ سُودا داس دھیرے دھیرے مُنہ پونچھنے لگا۔ اُداس چہرے پر ایک روشنی سی کوند آئی۔ اور جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر بولا — جاوید — جاوید! کہاں ہو تم؟"

"یہاں، تمہارے پاس ہوں باپو —" جاوید سُودا داس کے قریب چلا گیا —

جاوید کا ہاتھ پکڑ کر سُودا داس نے چیخ کر بولا — "مجھے بھی جلوس میں لے چلو —"

"ہم جلوس میں جا کر کیا کریں گے" جاوید نے بڑی نا اُمیدی سے کہا — "ہمارے پاس روپے کے لئے ہے کیا —؟"

"کچھ نہیں ہے، پھر بھی تم مجھے جلوس میں لے چلو —"

"کہیں چھپا کر رکھا ہو گا تم نے —" جاوید نے سودا اُس کو مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا —

"ہاں — ہاں —" بڈھا اب مسکرا کر بولا "بہت چھپا کر رکھا ہے۔ سب کی نظروں سے چھپا کر رکھا ہے۔ کہیں دل کے قریب —"

سُودا داس نے اپنے چوگیا رنگ کے کوٹ کے اندر ہاتھ کیا — "گھبراؤ تم دیر مت کرو جاوید — مجھے جلدی سے لے چلو —!"

جاوید نے نا اُمیدی سے سر ہلا کر کہا "معلوم ہوتا ہے بڑھاپے نے مغز خراب کر دیا ہے —"

جب جاوید اپنے بڈھے باپ کو لے کر جلوس میں شہری کمیٹی کا جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر ایک میز بیٹھا تھا اور ایک طرف طالب علم کالے پل کے نیچے رہنے والے لوگوں کی رقمیں اور نام ایک فہرست سے پڑھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اسٹیج کے سامنے بیٹھے ہوئے سبھی لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔

شفق جون پوری (لکھنؤ)

"خودکشی کیوں؟"

"قاتل ـــــ!"

"ہاں قاتل ـــ سب سے بڑا قاتل ـ میری محبت کے قاتل ـ تم نے! ہاں ہاں تم نے!! میری محبت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ میرے ارمانوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح کچل دیا ہے جیسے کسی پھول کی خوشبو سونگھ کر اس کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا جائے ـ ایک سگریٹ کی طرح کہ اس کو پاؤں کے نیچے مسل دیا جائے۔ تم نے کبھی محبت کا بدلہ محبت سے نہیں دیا محبت! محبت کا تو تم نے مذاق اڑایا ہے۔ میں جب کبھی تمہارے قریب آئی، تم اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے، ایک شکار کی طرح، جو شکاری کے خوف و ہراس سے دور بھاگتا ہے، میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں۔ اس کا تم نے کبھی اندازہ ہی نہیں لگایا۔ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کبھی سوچا بھی نہیں کہ وہ کیوں دھڑکتا ہے۔ تم نے کبھی اندازہ ہی نہیں لگایا

ـ تم نے یہ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ رات کو سوتے سوتے نیند کیوں اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ نیند آنکھوں سے دور کیوں چلی جاتی ہے، تم نے مجھے نہیں چاہا، میں نے تمہیں چاہا ہے۔ میں نے تمہیں اپنا بنانا چاہا ہے۔ میں نے تمہاری پرستش کی ہے اور کرتی ہوں۔ ایک دیوتا کی طرح۔ لیکن تمہیں ان سب باتوں کا کچھ احساس ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! تم تو ایک پتھر ہو! پتھر! جو سب کی سنتا ہے۔ لیکن خاموش رہتا ہے، بے حس و حرکت۔ تم مجھے محبت کے دہکتے ہوئے انگارے میں پھینک کر خود اسے بجھانا چاہتے ہو۔ یہی محبت کا دستور ہے، اسی محبت پر تمہیں ناز ہے، جانتے ہو کالج کی لڑکیاں کیا کہتی ہیں۔ کہتی ہیں تم پاگل ہو، بزدل ہو، پتھر ہو، محبت کی قدر نہیں جانتے۔ یہ تو تمہیں یہ سب منظور ہے کیا؟ یہ ان کے طعنے سنوں، ان کی زہر آلود باتیں برداشت کروں!!

"اور کچھ باقی رہ گیا ہو تو وہ بھی کہہ ڈالو۔ آخر کچھ تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو بے پر کی اڑانے لگیں یہ بات کی رو میں تم نے کیا کیا کہہ سنایا۔ اری پگلی! محبت شور نہیں مچایا کرتی یہ بھی کوئی دکھانے کی چیز ہے کہ جہاں تہاں سے محبت ہے۔ وہ محبت نہیں دکھاوا ہے، ایک ڈھونگ ہے، ایک ناٹک، جو چیز دل سے ہوتی ہے۔ اس میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اس کا ڈھنڈورا پیٹنا نہیں چاہتا۔ جانتی ہو جب تک میں تمہیں نہیں دیکھتا۔ میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے جس طرح ایک مچھلی کی کیفیت پانی سے باہر آنے کے بعد ہوتی ہے۔ اتنا کہ میں تم سے دور رہتا ہوں، لیکن جب وہ دور مل جاتے ہیں تو بظاہر دوری کوئی دوری نہیں ہوتی۔ ارے تمہارے بغیر تو میری زندگی نامکمل ہے۔ میرے تمام سپنے ادھورے ہیں۔ جانتی ہو اس دنیا سے مجھے کتنی نفرت ہے کیا دیا ہے اس نے؟ پیدا ہوتے ہی کچھ ہی مہینوں بعد ماں مر گئی، ماں کا وہ لاڈ پیار جو بچے کے لئے ہوتا ہے، نہ مل سکا، اس کی امت سے محروم رہا۔ جب ہوش سنبھالا تو تم کو سامنے پایا، تمہاری وجہ سے تو میں زندہ ہوں اور نہ زندہ رہوں گا۔ میری ہر مسکراہٹ، ہر خوشی تمہاری خوشی سے ہم بظاہر جدا ہیں۔ لیکن اصل میں ایک ہیں۔ ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا اور جس دن تم میری دنیا سے چلی گئیں، پھر جانتی ہو میرا کیا ہوگا؟

"ایسی باتیں نہیں کہا کرتے، بھگوان نہ کرے ایسا ہو، اگر بدقسمتی سے ایسا ہو بھی گیا، تو بھی ہم ایک ہی رہیں گے۔ ہماری روحیں ایک رہیں گی۔ پھر ہمیں کون الگ کر سکے گا"

"کل کالج آؤ گی نا!"

"وہ تو آنا ہی پڑے گا اور تم....."

"میں نہیں آ سکتا۔ اور پھر اب پڑھائی فیو تو ہوگی نہیں، مجھے تو اسٹڈی کرنی ہے۔ امتحان نزدیک ہے نا۔ دیکھو! اگر آنا تو ہوسٹل ہی میں آ جانا۔ یہیں ملاقات ہوگی"

دوسرے دن جب آشا کالج پہنچی، تو کلاس شروع ہو چکی تھی۔ فوراً فوراً رول نمبر پکارے جا رہے تھے

"رول نمبر ۲!"

"یس سر"

"رول نمبر ۲۰!"

"یس سر"

کلاس میں مختلف قسم کی آوازیں گونج رہی تھیں اب اس کے رول نمبر کا رول تھا۔ قبل اس کے کہ پروفیسر سنہا اس کا رول نمبر پکاریں، وہ پہنچ گئی۔

"May I come in Sir"

"Yes! Come in"

پروفیسر سنہا [illegible]

کا شعر پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ تشریح کے دوران انہوں نے کہا کہ فانی شاعر قدرت کے پرستار تھے۔ مناظرِ فطرت ان کا محبوب موضوع تھا۔ وہ انھیں دیکھتے تھا اور ان سے لطف اندوز ہوتا تھا اور یہ نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ اتفاق سے وہ ایک دن تالاب سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک لڑکی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک دیہاتی لڑکی تنہائی میں مگن گانے میں مصروف ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فضا بھی گیت گا رہی ہے۔ وہ اس کے گانے سے اس قدر متاثر ہوا کہ بہت دیر تک محو حیرت بنا سنتا رہا۔ گرچہ اس لڑکی کی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے نغمے میں ایسا سحر تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اُس کا سازندہ کوئی سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں کوئی بھی آواز نہیں پا رہی تھی۔ جب بہت دیر کے بعد اس کا سحر ٹوٹا تو وہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھا، لیکن اس کے نغمے اب بھی کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ جیسے وہ لڑکی اس کے سامنے موجود ہو۔ اسے جہاں شاعر نے اپنے کو یکجا محسوس کرتا، یا کسی پرندے کی چہچہاہٹ۔ وہ ذرا وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا اور اس کے تمام افکار خیالوں میں ہو جاتے۔

ایک گھنٹہ کا لیکچر کرنے کے بعد کلاس ختم ہو گئی اور تمام لڑکیاں اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ پروفیسر سنہا کی آنکھیں نم معلوم ہو رہی تھیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ اچانک انھوں نے اشا کو دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا اور یک لخت اس کے پاس پہنچ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آشا!"

"جی!..... جی"

دیکھو کل شام کو میرے گھر چلی آنا، مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں"

"جی... جی..... آج شام کو..... جی..... اچھا"

"یاد رہے گا نا!"

"جی..... ہاں"

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ سورج اب ڈوبنے ہی والا تھا۔ چڑیوں کا غول آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کسانوں اور آفسوں کے ملازمین لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شام کی سیاہی اپنا منہ کھولے چلی آ رہی تھی۔ غرض دنیا کی ہر شے سمٹ کر اپنے اپنے مرکز پر چلی گئی تھی۔ ہلکی سی بارش ہو جانے سے فضا میں کچھ خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو جسم میں ایک لہر دوڑ جاتی۔ ہر طرف بھی سناٹا چھایا تھا، ہر شے دھلی دھلائی معلوم ہو رہی تھی۔ جا بجا راستوں پر اور سڑکوں پر بارش کے آثار نمودار تھے

پروفیسر سنہا کرام کرسی پر بیٹھے کسی رسالے کا مطالعہ کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ کے کش بھی لئے جا رہے تھے۔ بظاہر ان کی نظریں رسالے پر تھیں لیکن ان کی تمام توجہ دروازے کی طرف مرکوز تھی۔ بار بار نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ یکایک دروازے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اور آشا دروازے میں داخل ہوئی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں سر؟"

"ہاں ہاں آؤ، مجھے تم سے بہت دیر سے ایک ضروری بات کرنا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ تم نہیں آؤ گی"

"جی نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس ذرا دیر ہو گئی"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جیسے کہ کسی کا وجود ہی نہ ہو۔ دیوار پر لٹکا ہوا کلاک ٹک ٹک کئے جا رہا تھا۔ آشا اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ آخر سر نے اسے کیوں بلایا ہے۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو وہ کلاس میں نہیں کہہ سکتے تھے۔ آشا اپنے دل میں سوچ ہی رہی تھی کہ پروفیسر صاحب نے کہا۔

"تمہارا امتحان نزدیک ہے، محنت کر رہی ہو نا!

اب کتنے دن رہ گئے ہیں بشمول اس کے ایک مہینہ ہو گا"

"جی ہاں! تیاری تو کر رہی ہوں۔ لیکن گھر کے کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ اس میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر سکوں"

"کہیں ٹیوشن بھی پڑھتی ہو کہ نہیں؟"

"جی نہیں۔ گھر ہی پر جو کچھ ہو سکتا ہے، دیکھ لیتی ہوں"

"اچھا ایک کام کرو جو سبجیکٹ تمہیں سب سے مشکل ہوں۔ اسے میرے پاس آ کر سمجھ جایا کرو۔ کلاس کے بعد میں فرصت میں رہتا ہوں۔ ویسے بھی تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں خود اپنا بھی کچھ مشورہ کروں"

"ہاں ہاں کرو، کوئی ہرج نہیں۔ اگر تم کل سے شروع کر دو"

"جی بہتر ہے۔ اچھا اب بہت دیر ہو گئی ہے میں اجازت چاہوں گی۔"

پروفیسر صاحب سوچ رہے تھے کہ کیا آشا جانا چاہتی ہے؟ یہ سوچ کر انھوں نے کہا۔

"تم جانا چاہتی ہو؟ اچھا میں نے کچھ اور سمجھا تھا۔ خیر جاؤ۔ کل کے بجائے پرسوں سے شروع کرنا"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے کہا کہ آشا جانا چاہتی ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے کہا کہ آشا جانا چاہتی ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے کہا کہ آشا جانا چاہتی ہے۔

یوں الجھن کر بیٹھ گئے جیسے وہ ابھی مرغہ ہو اور اسے ذبح کرنا ہو۔

دوسرے دن کالج سے آنے کے بعد وہ سوچنے لگی کہ آج اسے ڈیک سے ضرور ملنا چاہئے۔ کل بھی نہیں جا سکی تھی۔ اور پھر کون جانے سے وہ کیا سوچ رہا ہے۔ سوچتا کیا ہوگا وہ وعدہ فراموش ہے۔ اس کے دل میں جھوٹی بات ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا سوچ بیٹھے ——— نہیں ..... نہیں، آج وہ ضرور جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے کپڑے بدلے۔ آئینہ کے سامنے بیٹھ بال سنوارے اور کئی مرتبہ اپنے آپ کو دیکھا۔ پھر اپنے میں کوئی کمی محسوس کر رہی ہو۔ جلدی جلدی اپنے آپ کو درست کر کے پڑھنے کی طرف چل پڑی۔ اسے دیکھتے ہی ڈیک نے خلاینوں کی بوچھار شروع کر دی۔

"کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کم بخت آنکھیں پتھرا گئیں۔ آخر کہاں کھو گئی تھیں۔ ؟"

"معافی چاہتی ہوں حضور، جو سزا آپ دیں مجھے منظور ہے۔"

"مجھے نا دُمت، یہاں تو جان کی آپ کی ادا ظہری دا مضمون ہے۔ سچ سچا کہو کیا بات تھی ؟"

"جب آپ حضور تو سنئے، وہ اپنے انگلش کے پروفیسر سنہا صاحب ہیں نا، انھوں نے کل مجھے اپنے گھر بلایا تھا"

"کیوں ——— ؟"

"کہہ رہے تھے کہ امتحان نزدیک ہے کچھ تیاری کر رہا ہو۔ نہیں تو میرے پاس آجایا کرو۔ ہر طرح مدد کروں گا۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا ؟"

"میں نے ——— ؟"

"ہاں ہاں تم نے کیا جواب دیا ؟"

"میں نے کہہ دیا کہ پتاجی سے مشورہ کر کے کل یا پرسوں آجاؤں گی کہ کس دن آنا ہے۔ میں نے کچھ غلط کیا ؟"

"نہیں، نہیں! بالکل نہیں!! اچھا ہے گھر میں تو کچھ خاص تیاری ہو نہیں سکتی اور پھر اس دفعہ تمہیں اچھی نمبر سے کامیاب ہونا ہوگا۔ بیٹھے چلی جایا کرو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم کیسی تیاری کر رہے ہو تمہارا بھی تو امتحان قریب ہے ؟"

"وہ تو میں جانتا ہوں اور اس لئے تو میں آج کل کہیں گھومنے پھرنے جاتا ہی نہیں۔ بس میں ہوں اور یہ پوسٹن۔ دیکھو اس قید بامشقت سے کب نجات ملتی ہے۔"

"بہت غریب! تو یہ آپ کے لئے قید ہے ؟"

"اس میں کیا شک! جب تم نہیں تو یہ قید ہی ہے۔ ہفتوں گذر جاتے تمہارا دیدار نہیں ہوتا کم سے کم ایک آدھ مرتبہ تو درشن دے دیا کرو تاکہ یہ پران قائم رہ سکے۔"

"بہت باتیں کرتے ہو، یہ بتاؤ کہ چائے وائے پی کر نہیں ؟"

"سب کچھ پی لیا۔ تمہیں دیکھ لینے کے بعد پھر کس چیز کی حاجت رہ جاتی ہے۔ تم تو دو شش چوکور ایک مرتبہ پیش ہو جاتے پھر اس کا جوش میں آنا بھی ناممکن ہے۔"

"اچھا ایسی جلتی ہوں پھر ملوں گی۔"

دوسرے دن وہ سے اٹھا کے سنہا صاحب کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ قریب قریب ایک گھنٹہ کے لئے روز ہی جاتی۔ اتفاق سے ایک دن جب وہ پہنچی تو دیکھا کہ پروفیسر صاحب کسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آشا کو دیکھتے ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے۔

"آج آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔ کیا طبیعت علیل ہے ؟ آج آپ کالج بھی نہیں گئے ——— ؟"

"تم بیٹھ جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔"

"پھر آپ کی آنکھیں لال کیوں ہیں ؟ چہرے پر پریشانی کیسی جھلک رہی ہے ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا رات بھر نہ سو سکے ہوں۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ بتائیے نا کیا بات ہے ؟"

"بتانا چاہتی ہو تو سنو۔ کہنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن میرا کیا جانے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لئے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے۔ تم پر بیتی ہوتا کہ میری [illegible] میں میں پریشان کیوں۔ میں رات بھر کیوں نہ سو سکا آج کالج کیوں نہیں جا سکا۔

میری ان تمام پریشانیوں کی جڑ تم ہو۔ سب تم ہو۔ تمہارا [illegible] دیدے میں رات بھر نہ سو سکا سونے کی بہتیری کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ آشا میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ نہ جانے تم نے کون سا جادو کیا ہے کہ میں تمہاری طرف مائل ہوتا جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا، بہت روکا، لیکن کا پاگل پن تو تم جانتی ہی ہو، نہیں مانا۔ آشا میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں، میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ تم ابھی بالکل معصوم ہو، ایک ایسی کلی ہو جو ابھی تک کسی سے بھنورے نہیں چھو سکے۔ ابھی صرف گلشن کی زینت ہو، کسی باغبان تک نہیں پہنچی گئی ہو۔ میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ لیکن پھر بھی میں مجبور ہوں، جانتا ہوں میری بیوی ہے، بچوں کی ماں ہے، میں نے جھوٹ بولا کہ اب میں شادی نہیں کروں گا۔ ایک لڑکا ہے اس کی پرورش کروں گا۔ اور اسی طرح خوشی یا رضا سے زندگی گذار دوں گا۔

عہد تو ابھی تک قائم رہا۔ لیکن جیسے سے تم میرے کمرے میں آئی ہو میں تمہاری طرف کھنچتا چلا جا رہا ہوں۔ تم سے ایک غائبانہ وابستگی محسوس کرنے لگا ہوں۔ دیکھنے میں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں لیکن حقیقت میں تمہیں یہ دیکھتا رہتا ہوں میرے تمام قدم تمہاری طرف اٹھتے ہیں، جس روز تم نہیں آتیں میرا دل نہیں لگتا۔ آشا اگر میری یہ کیفیت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا کیونکہ اب مجھ میں برداشت کا مادہ نہیں رہا۔ میں اور زیادہ تمہارے فراق کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آشا میں کسی بات کو چھپانا نہیں چاہتا، بولو تمہیں منظور ہے؟"

یہ سنتے ہی آشا کو یوں معلوم ہوا جیسے اسے کسی نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں کسی نے گرم گرم سیسہ پگھلا دیا ہو۔ اسے اپنے سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا تو دوسرا جاتا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے پروفیسر صاحب نے جلدی سے اپنی گود میں اٹھا لیا اور آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد آشا ہوش میں آ گئی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اپنی سہمی آنکھوں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر کمرے میں بکھری ہوئی تمام چیزوں کو جانچ لیا۔ پھر اس کی نظریں کھڑکی کی جانب جھک گئیں۔ پروفیسر صاحب نے پوچھا:

"آشا مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی"

آشا نے ان کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا اور بدستور خاموش رہی۔

پروفیسر صاحب نے خاموشی کو دور کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو آشا میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ لیکن ایک بات یہ ہے کہ میری زندگی بھی تمہاری ہاں یا نہیں پر منحصر ہے۔ آشا اب میں اس منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں سے مجھے کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ فوری طور پر میں کچھ نہیں چاہتا۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو یا کہو تو میں تمہارے پتاجی سے خود بات کروں۔"

"پتاجی سے" یہ سن کر وہ یوں چونک پڑی جیسے کسی نے اسے سوتے سے جگا دیا ہو۔

"ہاں ہاں اس میں تعجب کی کون سی بات ہے آخر وہ تمہارے پتا ہیں، ان کی رائے بھی تو ضروری ہے۔"

"پروفیسر صاحب! میں کیا عرض کروں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ میں یہ کیسے سمجھاؤں کہ میں کسی کی ہو چکی ہوں۔ میرا دل اب میرا نہیں رہا۔ بلکہ دوسرے کے قبضہ میں ہے۔ یہ میرا جیون ہے، ہم ہمیشہ ایک رہیں گے اگر زندگی میں ایک دوسرے کے نہ ہو سکے تو کیا ہوا۔ ہمارا رشتہ تو ایک اٹوٹ رشتہ ہے، جسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اس کے آگے اپنی سے اپنی زبان میں بے کار ہیں۔ یہ کسی قید و سلاسل کی پابند نہیں، اب آپ ہی غور فرمائیں۔ کہ میں کیا کروں"

"ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی وقت ہے آشا ابھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کی میں خواہش ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میری یہ کیفیت دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ بدل دو گی۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں"

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں"

"جی نہیں۔ آپ زحمت نہ کیجئے، میں خود چلی جاؤں گی۔"

پروفیسر صاحب کی نظریں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد کئی روز تک آشا دیپک سے نہیں مل سکی۔ نہ ہی وہ کالج گئی۔ اب اس کا ایک ہی کام تھا۔ دن رات بستر پر پڑے پڑے کروٹیں لینا لیکن اس کو اس نرم گداز بستر بھی آرام نہ دیتا تھا۔ جیسے وہ نرم بستر نہ ہو، بلکہ اس پر آگ کے دہکتے ہوئے انگارے بچھے ہوں۔ اس کے پتاجی نے بھی کئی بار اس سے دریافت کیا، کہ کیا وجہ ہے کہ وہ پریشان ہے، لیکن وہ ادھر ادھر کی کہہ کر ٹال گئی۔

ادھر کئی روز سے نہ ملنے کی وجہ سے دیپک کو بھی تشویش ہو رہی تھی، اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا، اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ وہ نہ آئی ہے کہیں طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی، پھر اس کا ضمیر کہتا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ امتحان کی مصروفیتوں کی وجہ سے نہ آ سکی ہو۔ دل پھر کہتا، نہیں، نہیں، ایسی بھی کیا مصروفیت، کم سے کم ہفتہ میں ایک بار تو مل لینے میں کیا قباحت ہے۔ وہ یونہی بیٹھے بیٹھے خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطہ کھا رہا تھا۔ کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی تھی لیکن اس کا دماغ کسی اور طرف الجھا ہوا تھا۔ وہ لکھتے لکھتے قلم کو ہاتھ میں لئے سوچنے لگتا۔ پھر قلم کو صفحۂ قرطاس پر گھسیٹنے لگتا۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود وہ اپنی پریشان خیالی پر غالب نہ آ سکا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی جسے سن کر وہ چونک پڑا اور آشا اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"وہ تو صاف ہی ہے"

"ابھی امتحان کے کتنے دن اور رہ گئے ہیں۔؟"

"پندرہ روز اور ہیں"

"اسٹڈی روم میں چلو گے نا"

"تمہارے بغیر کیا خاک اسٹڈی ہو گی۔ آخر تم اتنے دنوں کہاں غائب تھیں، جو آتی ہو، میں نے

کی گڑیاں کتنی مشکل سے کاٹی ہیں، کتنی راتیں
جاگ گئیں، کتنے حسین دن گزر گئے، لیکن تم نے
کوئی بھی ایسا دن نہیں گزرا جو تمہارے ساتھ
خالی گزرا ہو۔ کتاب لے کر بیٹھتا تو مجھے پہاڑ
پڑھتے پڑھتے خیالی تمہاری طرف متوجہ
ہوتا اور پھر انہیں خیالوں میں کہیں دور بھٹک
جہاں پہنچ کر مجھے اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہوتی
ابھی تو ایک ہفتہ نہ دیکھنے سے یہ حالت ہو جاتی
اگر ہم کہیں برس دو برس نہ ملے تو کیا ہوگا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو"

"میں ٹھیک کہتا ہوں؟ یہ آہ تم کیسی بہکی باتیں
کرتی ہو۔ چہرے کا رنگ کیوں اڑا جا رہا ہے، آنکھیں
بوجھل معلوم ہو رہی ہیں، جیسے کئی روز سے سوئی نہ
ہو۔ یہ تمہارے بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟
کہو آشا کیا بات ہے؟ تم جانتی ہو میرا دل کتنا
کمزور ہے وہ ذرا سے بھی صدمے کا متحمل نہیں ہو سکتا"

"کوئی بات نہیں، میں تو بالکل ٹھیک ہوں"

"دیکھو آشا تم ضرور کچھ چھپا رہی ہو۔ ہم
ایک دوسرے کو آج سے نہیں برسوں سے جانتے ہیں
کبھی ایسی بات نہیں ہوئی پھر آج ..... .
میں تمہاری قسم جو نہ بتاؤ"

"دیپک مجھے مجبور نہ کرو۔ میری زبان کھلنے سے
ایسی داستان شروع ہو جائے گی جو تمہارے لئے
ناقابل برداشت ہوگی، تم اس پر غالب نہیں آ سکتے
یہ ایسی پُردرد داستان ہے جس نے ہم دونوں کی
زندگی کا فیصلہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ہمیں ایسی
جگہ پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں سے ہم پھر
واپس نہیں آ سکتے۔"

"آشا! محبت کے شکستہ پیمانوں کو سنبھالو۔
بات کو صاف صاف بتاؤ"

"اب اور کیا بتانے کو رہ گیا ہے"

"یہ نہ تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

"مطلب! ۔۔۔ مطلب یہ کہ میں تمہارے بھائی
کسی اور کی ہونے والی ہوں اور وہ جس نے مجھے تم
سے چھیننے کی کوشش کی ہے وہ ہے ..... .
پروفیسر سنہا"

"کیا کہا ۔۔۔!! پروفیسر ۔۔۔!!"

دیپک پر یک لخت بجلی گر پڑی۔ اتنی زور سے چیخا کہ
اس کی آواز اس کی حلق کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔
اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یوں معلوم
ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے دیوار سے اس کا کلیجہ
چھلنی کر دیا ہو۔ اس کو اپنے سامنے کی ہر چیز گھومتی
معلوم ہو رہی تھی۔

"تم پروفیسر سنہا کے نام سے چونک کیوں گئے"

"ہاں ۔۔۔ کچھ نہیں۔ یونہی" دیپک نے اپنے
ہوش و حواس درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ آشا پر
ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ پروفیسر سنہا اس کے پتا
ہیں، اگر کہیں وہ سمجھ گئی تو کیا ہوگا، وہ نروس ہو جائے
گا۔ صدمہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور پھر اس
کے بعد ۔۔۔ اُف! لوگ کس نگاہ سے ان کو دیکھیں گے
دیپک میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے
انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ میرے پتا جی سے
اس کے متعلق بات چیت کریں گے۔ یہ سن کر اور صریح
طور پر میری روح فنا ہوئی جا رہی ہے، ڈرتی ہوں کہ کہیں
پتا جی نے منظور کر لیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ میری سمجھ میں تو
ایک تدبیر آتی ہے۔ چلو دیپک کہیں بھاگ چلیں۔ کسی
ایسے دور جہاں یہ ظلم نہیں ہوتا۔

"نہیں آشا۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ سوچو
اگر تم نے یا میں نے ایسا کر بھی لیا تو کیا اس میں ہماری عزت
یا ہمارے خاندان کی عزت باقی رہ جائے گی۔ پھر ہم
انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے
اور یہی حال ان کا بھی ہوگا۔ کسی کے سامنے سر نہیں
اٹھا سکیں گے۔ ہاں ہمیں حرف سب میاہیٹ ہو جائے گی
آشا میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور پھر
اس کا صحیح اندازہ لگا کر فیصلہ کیا کرنا چاہئے۔"

دیپک اس وقت مجھے نصیحت مت دو مجھے ہر طرف
اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی
کہ تم ایسے نازک وقت میں ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے
اس وقت ہم دونوں کی زندگیوں کا سوال ہے اور تمہیں
نصیحت سوجھی ہے۔ اگر تمہیں ہی سب کرنا مقصود تھا
تو پھر تم نے کیوں محبت کا ڈھونگ رچایا تھا کیا صرف
تفریح کے لیے پیسے دیکھنے کی۔"

"آشا میری باتوں کا غلط مفہوم نہ لو جو کچھ کہہ
رہا ہوں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارا
نقصان کبھی نہیں چاہ سکتا۔ فرض کرو اگر تمہارے پتا جی
نے یہ رشتہ منظور کر لیا تو کیا ہوگا۔ آخر انہیں تمہاری
شادی کسی نہ کسی کے ساتھ تو کرنی ہوگی۔ انھوں نے
تمہاری پرورش کی، پڑھایا لکھایا، پھر کیا ان کا تم پر
اتنا بھی اختیار نہیں۔ آشا اسی میں تمہاری بھلائی
ہے۔ خاندان کی عزت ہے میرا کہا سمجھ لو گی کہ
سپنا دیکھ رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل گئی۔ پھر
سپنا سپنا ہی ہوتا ہے، نہ اس کی خوشی نہ غم، سمجھ لو گی
کہ میری زندگی میں تم کبھی ایک سپنا بن کر آئیں اور چلی گئیں
آشا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، مجھے تو خوشی ہوگی
اگر تم اپنے پتا کی خواہش پوری کرو۔"

"خوب محبت کا حق ادا کیا تم نے۔ تم سے ایسی ہی
امید تھی، تم بزدل ہو۔ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔
وہ نہ تم اس کی قیمت سمجھتے۔ دیپک اپنے آپ کو ہوش میں
لاؤ۔ ٹھیک ہے جب تمہاری طرف سے یہ بات ہے پھر
اور کسی سے کیا شکایت اور تم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ میرا
ان کا کیا مقابلہ ہے۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں کبھی خوش نہ رہ سکوں گی
دیپک میرا جیون تباہ ہو جائے گا۔ میری خوشیوں کی ارتھی
نکل جائے گی۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے اور جب کہ

باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

محمد علی شریف جوہر کوٹھاری

پریم چند زندہ باد

کی تقسیم ہوتی ہے۔ زمین جائداد تقسیم ہوتی ہے۔ مال تقسیم ہوتی ہے۔ نصب تقسیم ہوتا ہے۔ مگر تقسیم ہوتے ہی۔ سب سے زیادہ تقسیم ہوتی ہے اور سب سے آسانی سے تقسیم ہوتی ہے۔ جہاں آسانی تقسیم ہوتی ہے وہاں تقسیم ضرور ہوتی ہے۔ تقریق کا یہ ایک عام قانون ہے۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ ہمارے شہر میں اردو ہندی، کشمیری اور دوسری مختلف زبانوں کے ادیبوں نے متفقہ طور پر مل کر سرگرمی پریم چند کی برسی منانے کا اعلان کیا۔ ہمارے شہر کی تاریخ میں اس نوعیت کا یہ پہلا جلسہ تھا کہ اردو اور ہندی کے عظیم ناول نگار کی برسی منائی جا رہی تھی۔ مقامی اخباروں نے دلچسپ سرخیوں کے ساتھ اس اعلان پر خوش آمدید کہا۔

جلسے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جلسے کی صدارت ایک نوجوان صورت ایکٹرس صاحبہ فرما رہی تھیں۔ جلسہ میں پردہ دار طوائفوں کے لئے پردہ کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ اور جو خواتین پردہ کو تہذیب حاضر کی جبین پر بدنما داغ خیال کرتی تھیں، ان کے لئے مخصوص نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

خدا خدا کر کے جلسہ کا دن آگیا جس کا ہم سب بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ایک چھوٹے موٹے شاعر کی حیثیت سے ہم نے بھی اپنی کالی شیروانی جو تقریباً اپنا اصلی رنگ کھو چکی تھی اور جو ناخ کیپ جس کے سب بال غائب ہو گئے تھے، پہن کر وقت سے کچھ قبل ہی ہال پر پہنچ گئے۔ تاکہ مناسب جگہ پر قبضہ کر سکیں۔ ہم عورتوں کے پردے سے کچھ پرے بیٹھنا چاہتے تھے۔ لیکن خود بخود ہماری نظر انتخاب رنگین ٹوپیوں کی قریب کی جگہ پر پڑ گئی اور ہم وہیں جم کر رہ گئے۔

پریسی کمیٹی کے کچھ ممبر اور ایڈیٹر ہنوز ہال کی آرائش میں منہمک تھے۔ ایک صاحب جن کا کچھ اچھا نام تھا۔ وہ شاید کمیٹی کے صدر تھے۔ ادھر ادھر پریشان پھر رہے تھے کہ ٹکٹ کی بڑی گھڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کچھ لوگ محترمہ صدر صاحبہ کی بہترین ایکٹنگ اور ان کے ابھرتے ہوئے خدوخال پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔ زبان اردو کے ایک شاعر صاحب کثرتی زبان کے ایک شاعر صاحب کو اپنی ایک پرانی نظم سنا رہے تھے۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ادھر برسی کمیٹی کے ممبر پریشان تھے کہ ابھی تک محترمہ صدر صاحبہ نہیں آئی تھیں۔ کچھ، کسی کی پیدائش جلدی سے بلیک مارکیٹ کی گھڑی نے چھپا دیئے۔ لوگوں میں جذبہ بے چینی بڑھ رہا تھا۔ جلسے کے نظام میں بدنظمی پھیلنے لگ گئی۔ پردوں کے پیچھے سے بچوں کی آوازیں ابھرنے لگ گئیں۔ چند خواتین اپنے بے صبر بچوں کو مٹھائی دلانے کا وعدہ کر کے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ایک اب نوزائیدہ ماں اپنے ماڈرن بچے کو گنگا جمنا قسم دکھانے کا وعدہ کر کے خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور بچہ "ہنٹر والی" فلم دیکھنے کی ضد لگائے تھا جب خدا کر تقریباً چالیس منٹ ہو گئے۔ کچھ تعلیم یافتہ نوجوان۔ اس کمیں جلسہ کے انتظام پر اگریزی زبان میں دلچسپ ریمارکس پاس کر رہے تھے اور کچھ مہذب قسم کے جانوروں کے قریب جا کر نہایت مہذب انداز میں بچوں کی مائوں سے استدعا کر رہے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو چپ کرائیں۔

ایک طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ وہ آگئیں ممبروں کے چہروں پر ایک پُرکیف رونق آگئی۔ شیروانیوں کو درست کرتے ہوئے، بچوں کو روندتے ہوئے، صدر صاحبہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے دوڑ ہو گئے۔ صدر صاحبہ کی خوبصورت بیوک اپنی شان کے ساتھ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی "ویل گیٹ" پر آکر رک گئی۔ صدر صاحبہ کیا آئیں، پورے میں جان آگئی۔ جان محفل نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے لوگوں کی بھوکی پیاسی نگاہوں کا خیر مقدم

جلسہ ٹھیک ساڑھے سات بجے شروع ہوا۔ پنڈال کے برقی لیمپوں کی تیز روشنی صدر صاحبہ ایک اپنے آگے ماند پڑ گئی۔ برسی کی محفل کی رونق کے لئے صدر صاحبہ نے جارجٹ کی کالی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سب سے پہلے ایک نوجوان نے خاکہ استائل میں نعت سنائی۔ اپنے علم جسم کو سنبھالتے ہوئے صدر کمیٹی نے سامعین سے صدر صاحبہ کا تعارف کرایا۔ جس میں انھوں نے صدر صاحبہ کی سماجی خدمات، ان کی علم دوستی، ان کی ادب پروری، فرض شناسی، انکساری وغیرہ وغیرہ پر اتنے الفاظ خرچ کئے کہ دوسرے مقرر کو پریم چند کی شان میں تلاش کرنے میں مشغول ہونا پڑا۔ ایک من چلے نوجوان نے کھڑے ہو کر صدر کمیٹی سے کہا، اپنی تقریر کی پرچار

فی الحال دیوی جی کا کوئی دلفریب گانا سنوایئے۔
صدر صاحب بھی شاید اپنی لمبی چوڑی تقریر سے کچھ تھک سے گئے تھے۔ اس لئے لوگوں کو خاموش بیٹھنے کی تلقین کر کے اپنی جگہ لینی صدر صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

دستور العمل کے مطابق سب سے پہلے ایک علاقائی زبان کے مقرر صاحب کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ مقرر صاحب نے پریم چند کو ہندوستان کا ایک بہترین سیاست داں بتا کر نیتاؤں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ جوش عقیدت سے صاحب موصوف نے پریم چند کو ہندوستان کے دوسرے "باپو جی" کہہ دیا۔ ہندی اور ہندی ساتم کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر ڈالی۔ میرے قریب ہی ایک خوش پوش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔ کیوں صاحب کیا ہندوستان میں دو پریم چند گزرے ہیں؟ جو میں ایک عظیم ناول نگار تھے اور یہ دوسرے کیا کوئی بڑے سیاست داں اور دیش بھگت تھے ــــ
میں نے کہا قبلہ دو کیا بلکہ تین گزرے ہیں، جن میں سے ایک ہندوستان کے مشہور راہبر تھے، جنھوں نے اپنی عجیب و غریب وصیت کے ذریعہ ڈھائی سو یتیم خانے تین سو مینٹل ہاسپٹل بنوائے جو اب تک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

دوسری تقریر زبان انگریزی میں تھی۔ انگریزی زبان کے مقرر صاحب نے پریم چند کو ہندوستان کا شیکسپیئر بنا دیا اور "تھینک یو" کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر بیٹھے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا یہ مقرر صاحب کیوں لڑھکڑا رہے ہیں۔ میں نے کہا قبلۂ عالم مقرر صاحب پریم چند کا غم بھلانے کے لئے بہت زیادہ وہسکی شراب پی گئے ہیں۔ بے چارے کو پریم چند سے بہت لگاؤ ہے شاید!!

صدر صاحب انھتر زبان کے سوا دوسری زبانوں سے شاید ناواقف معلوم ہوتی تھیں۔ پھر بھی بڑی شان بے نیازی کے ساتھ مقرروں کی داد دہی دیتی تھیں۔ اب اردو زبان کے مقرر صاحب کی باری آئی سب سے پہلے انھوں نے پریم چند کی کتابوں پر لکھا ہوا ایک طویل مقالہ پڑھ کر سنایا، صدر صاحبہ داد و تحسین دیئے جا رہی تھیں۔ وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا پیچھے سے صدر سبھا کمیٹی مقرر صاحب کی شیروانی کھینچ کھینچ کر دے رہے تھے۔ مقرر صاحب نے فی البدیہہ "یہ دستور زبان بندی ہے کیسا تیرا محفل میں" کہہ کر اپنی ادھوری تقریر ختم کر ڈالی۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہندی اور اردو کے بہت سے مقرروں کے نام دستور العمل سے نکال دیئے گئے۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ صدر صاحبہ تقریر ہیوی کی زبان مبارک سے ہر روز مگر میں سن سکتے ہیں۔ جمعہ کے خطبہ میں بھی اور مسلمان شاہ دلی کی درگاہ پر بھی اور ہندی میں ہر روز سینما اور ریڈیو پر بھی سنی جا سکتی ہیں۔

صدر صاحبہ کی تقریر فحش ضربوں اور بچوں کی چیخ و پکار میں قلیل ہو کر رہ گئی۔ تقسیم انعامات کا کام اپنے شریک کاروں پر چھوڑ کر صدر کمیٹی، صدر صاحبہ کے ہم رکاب روانہ ہو گئے۔

ہندوستان کے عظیم فن کار کی برسی تقسیم انعامات میں ضرب ہو کر تفریق ہو گئی اور اپنے پیچھے ایک فضیحت آمیز تاثر چھوڑ گئی۔

ہندوستان زندہ باد!! پریم چند زندہ باد

---

(۳) آخر یہ ہندی فرمودات خصوصاً سنسکرت، فارسی یا اردو اختیاری مضامین ہوں۔ ضابطہ کی زبان مشکل اور اوسط کے لئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوگی بلکہ یہ حکومت کے فرائض میں ہے کہ کتابوں کی وضاحت اور فراہمی کے لئے تعلیم یافتہ سماج میں ایک سرکاری فرض اور بنیادی مقصد ہیں۔ جس کی انجام دہی حکومت کسی بھی حالت میں ملتوی نہیں کر سکتی ہے ایک بات اور ضروری ہے جس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ ہندی کی خیر سگالی جمعیت اور شمال ہند بالخصوص یوپی اور مرکزی کانجیس میں ہندی کے سرپرستوں کے سیاسی غلبہ اور اکثریت نے مسئلہ کو الجھن بنا دیا ہے ورنہ لسانی مسئلہ صاف ہے جو تاریخی اور سیاسی بنیاد پر طے ہو سکتا ہے۔ ہندوستان مختلف اور متنوع گھر اور قومیں ہیں۔ ہندوستانی قومیت بہتے ہوئے رنگ نسل زبان جداگانہ ہیں۔ دستوری طور کی حیثیت میں علاقائی آزادی (خود ارادیت) بنیادی حق ہے اور ایک دانشمند ہندوستان کی دستوری پیشین ہے کہ ہندوستان ایک وفاقی ریاست نہیں، بلکہ وفاقی حکومت ہے اور وفاق کے نظام میں مختلف صوبوں کے لوگوں یا لسانی اقلیتوں کو ان کی ماوری زبان یا علاقائی زبان میں تعلیم دی جائے تو اس سے ملک کی سالمیت اور یکجہتی مضبوط ہوتی ہے۔ اور یہ ایک اصولی بات ہے جس سے بالکل صائمن (حکم ریاست) کا مطالب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی سیدھی اور سادہ بات پر ابھی تک اتنا پس و پیش کیوں کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ آئین تو ہندی اور ہندوؤں کا فرض ہے کہ اس جانب کوشاں ہوں اور حکومت چند کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں۔ آئین اس سلسلہ میں کافی جد و جہد کر چکی ہے جو مفید اور بار آور ثابت ہوئی ہے۔ ادارہ اور آئین کی مدد سے اس تحریک کو عام گیر پیمانہ پر چلائے۔ آزادی ہند کے بعد اردو کی بقا کے لئے اس ادارہ کی خدمت بھلائی نہیں جا سکیں گی۔ مستقبل اردو کی زندگی اور ترقی اس ادارہ سے وابستہ ہیں۔

مضمون طرح طرحی مشاعرہ منعقدہ
دل ہی کو پیٹتا یا دل ہی سے کوئی کی
گنگا جمنا تہذیب ــ کی روایت
غزل کو صول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی

فوجدار پاکوٹی

بھٹی کا نیلام

چاولہ بلڈنگ کے باہر پولیس کھڑی تھی۔ لوگ جمع ہو رہے تھے اور بھیڑ خاصی بھیڑ ہو گئی۔ مگر ہجوم کے دھیان میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس وقت پولیس یہاں کیوں کھڑی ہے؟ بھیڑ بھیڑ ہے۔ فضا گونج رہی تھی اور لوگوں کا تجسس بڑھ گیا۔ جیسے وہ کسی نئی واردات کے منتظر تھے۔ اور وہ باتیں چیتے چیتے سے ہو رہے تھے۔ کہیں کچھ ہو جائے اور آنکھ اوجھل سے پہاڑی مل جائے کہاوت تو انہیں کو آتی ہے بندر روٹی بانٹ کے نیچے ایک بکری کا بچہ اور دو انسان کے بچے مر گئے تھے۔ ان کے قریبی مددگاروں کا پتا اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا افسوس کر رہا تھا۔ ان عورتوں کے درمیان مرنے والوں کے گیت گائے جا رہی تھی۔ جیتا ہوا ہے انسان پہلے مرتبے، پھر قبرین کے پل باندھے جاتے ہیں۔ زندہ دو گز دامن تک رفو ہو جاتا ہے جب کسی کے منہ پر ایک بھی سچی بخشش نہیں ہوتی۔ لوگوں کی بے چینی آپس میں کہہ سنا تماشا بن رہی تھی۔ ہجوم میں ہر سو میں ہی ایک آدھ نے کئی شراب کی بوتلیں دیکھ لی تھیں۔ اس سے دو روز پہلے رام دیال کے بیٹے دو عورتوں کو دھندا کرتے پکڑا گیا۔ اسے بھی دھندا نہیں کریں گے تو کھائیں گے کیا؟ ایک جھگڑا بچ گیا۔ پولیس کی ایک گاڑی آئی اور ہجوم کو چیرتی ہوئی چاولہ بلڈنگ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ جیسے ہی دیال باہر آیا تو کچھ لوگوں نے جان لیا۔ جانتے ہی وہ لوگ جو اکثر رات کو اس سے شراب پیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار اُدھار بھی لیتے تھے اور جب کبھی قرضہ بڑھتا ہی جاتا تو رام دیال سے شراب ملنی بند ہو جاتی تو یہی لوگ کاندھا ہلا ہلا کر رام دیال کی تنقید کرتے! رام دیال سیدھا اور حریفانہ کاروبار کرتا تھا۔ وہ شراب بیچتا۔ رات کو اپنی عادت سے پیشہ کرتا اور دن کو کبھی تان کر سوتا۔ اس سے زیادہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اس کا دن اس وقت شروع ہوتا جب ہر ہفتے سو بیا سفر بی پہاڑی اڈے میں پہنچنے کی کوشش کرتا اور وہ اس منظر کو اس طرح سے دیکھتا جیسے لوگ جیل کے وقت پتنگوں پر پڑی شبنم کو دیکھتے ہیں۔ دن کو سفید ٹوپی پہن کر لوگوں کو وعظ و نصیحت میں شریف ہوں۔ رات کو مزدوروں کے ساتھ گپ شپ اڑا کر یہ بتاتا کہ میں کیونسٹ ہوں اور کبھی کبھار چھا ہنر دکی طرح ایک گلاب کا پھول اپنی پگڑی میں ٹانک کر کہتا۔ میں ہنر دکا شائق ہوں۔ البتہ اوسط درجے کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ ایک بھٹی کا مالک ہے جس میں شراب بنتی ہے اور اس شراب سے رام دیال اپنے پیٹ کا ایندھن مہیا کرتا۔

کل ہی رات اس نے کچھ لوگوں کو شراب نہیں دی تھی اور گاہک اس کے گھر کے سامنے پولیس کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر کچھ مزدوروں کو سکون سا محسوس ہوا کیونکہ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھی گالیاں بکنی شروع کیں۔ اچھا ہوا جو پکڑا گیا۔ کل ماچس تو نے اپنے دروازے سے واپس کی تھا۔ ضمانت کے سارے پائی نا ممکن تھی۔ یہ سب جتنا بھی کوڈ بکتا جا رہا تھا اندر بنا دھاندلی! اتنے میں گوپی ناتھ حوالدار کو باہر آتا دیکھ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اب انکے سوال کا حل مل گیا ہے پر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ کہ وہ گوپی ناتھ سے پوچھ سکے۔ مگر گوپی ناتھ حوالدار کو رام دیال سے ہفتہ کا بھتہ ملتا تھا۔ اور یہ کی آمدنی میں شرابی بھی وہ دو چار جماعتے کھا دیتے تھے۔ غرض ہر کام اصول سے ہوتا تھا۔ مگر ان کے اپنے میں کبھی کی کہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اتنا بھی پوچھ لیں۔ کہ بھٹی معاف کیا ہے؟ گوپی ناتھ نے تک کیا ہوا تھا۔ کیسے وہ سکتا تھا۔ جتنی بات وہ جانتا تھا اگر کہہ دیں۔ رام دیال بھٹی کا نیلام کرنا چاہتا ہے ساتھ ہی آواز میں آ گئیں۔ مگر کیوں ——؟ کیوں کا جواب ضرور ہی کے پاس نہیں تھا۔ گوپی ناتھ حوالدار خاموش ہو گیا —— وقت فضا گنگنانے لگی۔ رام دیال بھٹی کا نیلام کرنا چاہتا ہے —— مگر کیوں؟ رام دیال بھٹی کا نیلام کرنا چاہتا ہے مگر کیوں؟ —— پھر یہ زور ہو گئے۔ بھٹی کی خاموشی ابھرنے لگی۔ اُدھار پینے والوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ یہ اور بڑھ گئی۔ اتنے میں ایک آدمی نکے کے دار باہر آیا۔ نکے کا نیا تھا۔ دھوپ میں چھتری تان کر ٹریفک کو راستہ دیتا تھا اس لئے راستہ کا معاملہ صرف چوٹی میں حل ہو جاتا تھا دوپہر کے وقت اکثر وہ پاس والے ہوٹل میں بیٹھ کر کافی پیتے پیتے سو جاتا تھا اور اسی وقت کاریں اور ٹرک آ جاتی تھیں۔ کئی گاڑیاں گھنٹے سے بھری گزرتی تھیں۔ جن کے ڈرائیور تھے ہیں اکثر شراب پیا کرتے تھے رام دیال کی بوتلیں بکتی تھیں۔ نیا نائب اس لئے صرف ایک بوتل پر قناعت کر لیتا تھا۔ نائب ہوتے ہی آدھی پی جاتا۔ کچی ہوئی آدھی شراب ڈرائیور کار والوں کو بیچتا۔ جس سے اسے دگنی قیمت ملتی اسی پر رسم تھی جو وہ پوری کر رہا تھا۔ کچھ نکے کی باتوں سے لوگوں میں اضطراب کی کیفیت ابھر آئی جب لوگوں نے سنا کہ رام دیال اپنی بھٹی کا نیلام کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی عجیب کی بات تھی۔ مگر

کر خواب سے کچھ نہیں جاگ سکتے اس لئے جیتے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ کم بخت رام دیال کیا سوچتی کہ وہ خود حکومت کے ہاتھوں سوچ رہا ہے اور سر پر لاد تو وہ نیلام کر رہا ہے، جیسے اپنا کھیت بیچ رہا ہو کوئی گھریا گھر کا سامان یا جیسے بیوی کے گہنے بیچ رہا ہو۔ لوگوں نے حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دبالیں اور پھر ایک بار مجمع کے لوگ اس پر ترس کھانے لگے۔ بے چارہ جیل جائے گا خوامخواہ کے پڑیں گے۔ بیوی کا کیا ہوگا؟ یہاں پر ان کی پوری ہمدردیاں رام دیال کے ساتھ ہوتیں۔ اسی سے تھانیدار گورنا تھ سنگھ جب باہر کیا۔ تب لوگوں میں امید کی ایک ہلکی سی کرن جاگ اٹھی۔ اور پھر ایک بار انھیں اپنی منزل بہت قریب دکھائی دی۔ گورنا تھ سنگھ کی بڑی بڑی مونچھیں۔ سر پر بندھی ہوئی رعب دار پگڑی کی وجہ سے لوگوں میں اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی کہ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچ سکیں۔ گورنا تھ سنگھ کے ہاتھوں میں دو انگریزی اخبار ایک اردو، ایک مرہٹی کل چار اخبار تھے اور وہ باری باری ان کی سرخیوں کو پڑھ رہا تھا۔ بلڈنگ میں پھر سے داخل ہونے سے پہلے اس نے اخبار لوگوں کی طرف اچھال دیئے، ویسے ہی جیسے لاکھوں غریبوں اور فقیروں کی بھیڑ میں کوئی ایک آدھ گز کپڑا اٹھا دیتا ہے اور فقیر اسے حاصل کرنے کی کوشش میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اور کوئی حاصل نہیں کر پاتا۔ یہی حال یہاں بھی ہوا۔ اخبار پڑھنے کی بجائے اس کی دھجیاں اڑ گئیں اور ٹکڑے ہوا میں اڑنے لگے۔ جیسے ننھے ننھے بچے ہوا میں پتنگ اڑاتے ہیں اور ڈور کے ٹوٹ جانے کے بعد اسی امید پر آسمان لگائے بیٹھے رہتے ہیں، جیسے یہ ٹوٹ گئی، ویسے ہی واپس آئے گی۔ پر ایسا تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگا۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید اس لئے کہ کمان سے نکلا ہوا تیر پھر واپس نہیں آتا۔

پھر لوگوں پر ٹڈی دل کی طرح سناٹا چھا گیا۔ پہلے جتنے سپاہی باہر آئے۔ پھر رام دیال باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اس کا اترا ہوا چہرہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے خوب مار کھائی ہے۔ چاروں طرف شانتی پھیل گئی اور لوگوں کے کان چوکنے ہو گئے۔ سب کی نظریں پتھر جیسی سخت ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے کائنات رک سی گئی۔ اتنے میں تھانے کا بڑا افسر چلایا ــــ رام دیال اپنی بیٹی کا نیلام کرنا چاہتا ہے ہم نے لاکھ وجہ پوچھی۔ ہر طرح منایا۔ پر اس نے انکار کر دیا وہ چار ہتھڑ بھی جملے۔ مگر اس نے ہر بار یہی کہا، اس کی وجہ میں تمام لوگوں کے سامنے بتاؤں گا۔ پھر تھانے دار سخت ہو کر چیخ پڑا یہ نالائق بکے اب جو کہنا چاہتا ہے کہہ لے۔ دیکھ یہاں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ اب تو تو اکیلا نہیں۔ ورنہ پھر ایک بار چابک برسے گا۔

چابک کا نام سنتے ہی رام دیال نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے اب وہ واقعی کہنے کے لئے تیار ہے۔ پھر رام دیال دھیمے دھیمے چیخ پڑا ــــ ..... تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ مہاراشٹر سرکار یا اپنی حکومت کہوں تو بہتر نہ ہوگا۔ وہ شراب کو عام بنانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس پر جو قوانین عائد ہیں وہ ہٹا لئے جائیں۔ گو کہ اس سے پہلے بھی شراب ہر جگہ ملتی تھی۔ مگر اب نشہ بندی کا قانون اگر حکومت سے نکال دیا جائے تو گوپی ناتھ کا کیا ہوگا۔ جو مجھ سے ہر ہفتے ساٹھ روپے بھتہ لیتا ہے اس ناکے دار کا کیا ہوگا۔ جسے ایک بوتل میرے یہاں سے روز ملتی ہے۔ اور کبھی چھ بوتل اور کبھی دو بوتل۔ یہ لوگ ہماری سرکار سے بہت کم تنخواہ پاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کی تنخواہ پوچھنا جرم ہے۔ اس لئے اس بات کو میں یہاں نہیں کہوں گا۔ صرف اتنا کہوں گا سرکار کے ان دیئے ہوئے روپیوں میں ان کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہ اوپری آمدنی تھی سو کام چل جاتا تھا۔ اب اگر شراب پر سے پابندی اٹھا لی جائے تو ان ناکے داروں اور تھانیداروں کا کیا ہوگا؟ جن کے گھروں میں بمشکل ایک وقت چولھا جلایا جاتا ہے سرکار سے کہکر یا تو وہ ان کی تنخواہ میں اضافہ کرے، یا اس نشہ بندی کے قانون کو اسی طرح رکھے جس طرح کہ اب تک چلتا تھا۔ یہ کہتے کہتے اچانک سرکار کے خلاف بھی خاموش تھے اور ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے پھر بھڑکنے کے بعد پھر رام دیال گرج اٹھا۔ اور پھر وہ لوگ بھی جو شراب پیتے ہیں اور وہ بھی ادھار۔ اور وہ مہینے کے آخر میں اپنی بیوی کے گہنے چرا کر یا گھر میں بند کرا جاتے ہیں۔ مگر سرکار اس قانون کو رد کر کے بھٹیوں کو خود چلانے کے لئے اپنے ہاتھوں میں لے گی تو کیا وہ تمہیں خراب ادھار پینے کے لئے دے گی۔ کیا وہ ناکیداروں اور تھانیداروں کو بھتہ مقرر کر کے برابر وقت پر پہنچائے گی؟ ایسے سوچنے کی بات ہے جو سرکار ہمیں ماشن ادھار نہیں دیتی، کیا وہ شراب جیسی چیز ہمیں ادھار دے گی؟ نا ممکن بالکل غلط، وہ کبھی نہیں دے گی۔ اسی لئے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے، اپنے لئے نہیں، گوپی ناتھ تھانیدار اور اس کے بیوی بچوں کے لئے، ناکے دار کے بڑے سے ناشپتی کے اور اپنی دھن کے متوالے شرابیو تمہارے لئے! میں کبھی تمہارا خون برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہر ناکے دار، ہر ادھار پینے والا دو بوند گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔ اوپری آمدنی بری چیز ہے۔ گرچہ گھر میں تو راجہ کے محل سے شروع ہوتی ہے جو جھونپڑی میں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میرا اپیل ہے کہ اگر سرکار بھٹیوں کو چلانا ہی نہیں چاہتی تو وہ سب سے پہلے میرا بھٹہ اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ میں اسے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔ اسے یہ میرے اکیلے کے پیٹ کا ایندھن نہیں تھا۔ اس سے کئی اور لوگ پل رہے تھے۔ ہماری مجبوریاں کون سمجھے گا؟ وہ خود چلائے گی تب شاید وہ جان سکے گی کہ ہم کتنے مجبور و بے بس ہیں اور وہ کیسے کیسے ناحق اصولوں اور قانون میں کتنی پیچیدگی کے ہماری زندگیاں اجیرن کرنا چاہتی ہے رہی تو سمجھتا تھا کہ سرکار لوگوں کی بھلائی اور آرام کے لئے ہوتی ہے۔ پر یہ تو ایک ساتھ کئی لوگوں کی روزی چھین رہی ہے ــــ

باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

طنز و مزاح

..... خطرۂ زبان

JAMIA LIBRARY Jamia Millia DELHI

آیئے آج آپ کو ایک بالکل نیا اور اچھوتا مقولہ سنائوں کہ اس سے ملتے جلتے مقولے آپ نے بارہا سنے ہونگے مگر یہ مقولہ شاید آپ نے کبھی نہ سنا ہو۔ لیجئے آپ بھی سنئے دھیان فرمائیے، لیکن مقولہ سننے سے پہلے ذرا آپ اپنے دوستوں اور واقف کاروں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجئے اگر خدانخواستہ آپ کی ذات یا صفات یا کارہائے نمایاں میرے مقولہ کے معیار پر پورا اترے تو بیچارے

"نیم شاعر خطرۂ زبان!"

آپ چونک پڑے ——— ہے کم از کم میں وہ بات ہرگز نہیں کہتا جس کی دلیل نہ دے سکوں ذرا سنجیدگی سے سوچنے پر ان حضرات کیلئے یہ مقولہ بالکل درست ہے جو خاصر تو ہیں نہیں مگر خود کو شاعر کہلوانے کے لئے زمین و آسمان ایک کئے دیتے ہیں۔ اور یہ عام اپنی جگہ پر مسلم ہے ایسے شاعر قسم کے لوگوں سے زبان و ادب کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ نقصان فرقہ وارانہ ذہنیت سے کہیں زیادہ ہے۔

"یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ لفظ "نیم" کتنا کڑوا اور کسیلا ہے، اس کے لفظی معنی بھی تلخ، کچا اور ترش ہے، لہٰذا ایسے شاعروں کی شاعری اور ادب نوازی کیسی ہوگی کا ہے؟ لفظ "نیم" ذہن میں آتے ہی طبیعت کسل مند اور تلخ ہو جاتی ہے اور زبان ایک عجیب ذائقہ محسوس کرنے لگتی ہے ——!!"

"یہ تو لفظ "نیم" کی شرح ہوئی اب میں آگے ہاتھوں "خطرۂ زباں" کی بھی تشریح کر دوں اس کی تشریح کرنے سے پہلے میں ایک ایسے مقدس ہستی کا تعارف کرا دوں جس سے اس پورے جملے کی تشریح بھی ہو جائیگی اور ایک فائدہ یہ ہوگا کہ کم از کم آپ ایسے لوگوں سے [illegible]

آپ سوچتے ہونگے کہ میں شاعر ہوں اور کالی شاعر ہوں ——— مگر آپ کا سوچنے کہاں تک درست ہے اس کا پتہ ابھی فوراً لگ جاتا ہے۔!

استدراکی

مرحوم ۲۲ کے لگ بھگ، لباس پریشان بال پکے گھنے اور کنپٹیوں کی ڈھلان نمایاں عمر کو دھندلی ہوئی تھوڑی بڑی بڑی بین جیسی ابھری ہوئی آنکھیں اور ان آنکھوں میں ہمیشہ ویرانی اور نا آسودگی کی علامت حقیقی ہے یا مصنوعی چال میں بے فکری اور لاابالی پن پیدا کرنا کام سی سی ——— آپ ہیں جناب تعلم کرم ثاقب!" ان سے میری پہلی ملاقات کالج کے ایک مشاعرہ میں ہوئی ——— کالج کا سالانہ جلسہ منایا جا رہا تھا جن میں بہت سارے شعراء کرام تشریف فرما تھے جن میں اختر رہبری، شاعر لکھنوی، شاہین غازی پوری، شافی قادری، صحیفہ شاہ گنجوی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈائس کے قریب آپ کالی شیروانی ڈاٹے آپ بھی جلوہ افروز تھے۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی لوگ آٹوگراف بک لیکر شاعروں پر ٹوٹ پڑے، ان میں بھی تھا، باری باری سبھوں سے آٹوگراف لیتا گیا بھیڑ کی وجہ سے میں جلدی میں تھا کہ یکایک میرے ہاتھ سے آٹوگراف بک کسی نے لی۔ میں نے دیکھا کہ کرم صاحب آٹوگراف بک کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔

"انہیں تو کتنا مناسب نہیں سمجھا جو نکتہ طرز زباں سے وہ ایک شاعر سے کسی بھی طرح کم نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خاموشی سے انکی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے عجلت ختم کرتا لا اور پٹ اپنا بھی آٹوگراف

دے مارا ——!

میں تو سمجھتا کردہ گیا، بھیڑ سے بمشکل سامنے پروجیکٹر لایا گیا۔ اس نے کچھ سنتے ہی کہا کہ سے پاگل گیا، بن مانگے آٹوگراف دینا خطرنا کیفیت ——!!

کیوں تم اسے جانتے ہو؟ میں نے پوچھا طرح اس کی ذات لپشت سے واقف ہوں لکھنؤ کی سرزمین سے منسلک کرتے ہیں ا کے لفظ "ش" سے بھی واقف نہیں اور چلے دینے! پرویز نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

کچھ دنوں کے بعد اُن سے میری ملاقات خانے کے قی استاں پر ہوئی، میں اپنے سا ساتھ جائے فی رہا تھا کہ چند لوگ سامنے دکھائی دیئے۔ جن میں کرم صاحب بھی گذشتہ مشاعرہ پر زور شور سے بحث میں بھی ان میں شریک ہو گیا۔ کرم صاحب لگے کہ بولنے کا موقع نہیں دیا گیا، کتنی غ کو جاگ جاگ کر ایک غزل اس مشاعرہ کی تھی مگر ——— ! ! ! ! ! ! ! ! !

میں نے ان کی ہمت بندھائی کہ کاوش کئے جائیں ایک روز آپ کو وہ جائے گا جس کے آپ اہل ہیں۔"

ابھی جناب آپ ابھی کہتے ہیں، یہاں ادب
ں بھی اتنی دھاندلی ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں، ناموں کی
توہین ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! اور جو ان کے پیچھے
ار ہیں اب آگئے گا اور تعریف کے قلابے ملا
ہے: "مجھے ہی لیجئے۔ کیا میں شاعر نہیں ہوں؟
اپنی قادری اور شاعر اگر سے کچھ کم نہیں ہوں
ر کا خراب ہے جو محفل میں نہیں پڑھ سکتا؟؟ میں
کتی محنت سے اپنا کلام سنایا ہے!
میں نے دل میں عہد کر لیا کہ ایک بار موقع ملنے
کی ہے سو وہ بھی بھگتا ہی کر لیں) ضرور ضرور ....
کی دنیا ہم خود کے پیچھے بھاگتی ہے۔ انہیں
مشورہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

اس ملاقات کے بعد وہ برابر ملنے لگا کبھی کسی
وٹی میں گھسیٹ لے جاتا اور ایک کپ چائے کے
لے اس کی ناقص لنترانی سننی پڑتی۔ کچھ ہی دنوں
دروازے بھی کھل گیا کہ ان میں شاعری کی صلاحیت
ور ابھی نہیں ہے۔ واقف کاروں کی زبانی یہ بھی معلوم
ہوا کہ ان کے پاس پرانے رسائل و جرائد کافی ہیں
درحقیقت کرتے یہ ہیں کہ ایک شعر ۱۹۳۸ء کے نقوش
سے لے لیا اور دوسرا ۱۹۴۰ء کے "شاہکار" نمبر کا تیسرا
۱۹۴۲ء کے نیرنگ خیال سے تو چوتھا ۱۹۴۵ء کے شاعر سے
اور اسی طرح کچھ اپنی بھی مغز ماری کر لی اور پھر ایک
غزل۔ ایک نظم۔ ایک رباعی یا ایک قطعہ تیار کر
لیتے ہیں!

نظم ہے تو کوئی ربط نہیں، غزل ہے تو
اصول غزلیت کے خلاف رباعی اور قطعہ بھی کوئی
چیز نہیں اور خود کو شاعر کہن کہتے ہیں!!
ان کے پاس اتنے سارے بچے کہاں سے آئے۔ ہر
بچے کی کوئی کہانی ہے۔! "یہاں ایک ماہر سیرت تھی
جن نامی کتابوں کی تعداد اچھی خاصی تھی ۱۹۳۸ء میں
یہاں ترقی دار افسانہ ہوا اور اسی افسانہ میں کرم صاحب

کو کہانی کتابیں اور رسائل ہاتھ لگ گئے!!"
خود کو شاعر کہن کہیں گے، اگر خدا نخواستہ کہیں طرحی
مشاعرہ کا پروگرام ہوا تو کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں
کریں گے اور جہاں غیر طرحی کا نام سنا لیں..!
یہاں ہی نہیں آپ سبھا گلپور رنگ، اپنی شاعری کی
دھاک جمانے پہنچے ہیں

ایک بار کچھ طلبا اور شہر کے چند لوگوں نے
فکر ایک مشاعرہ کا پروگرام مرتب کیا، غیر طرحی مشاعرہ
تھا لہذا آپ کا نام مزدی تھا۔ آپ آئے اور خوب جن
سنور کر آئے۔ کچھ لمحہ تو انتظار کیا اس کے بعد ایک
رقعہ میرے پاس بھیجا "چوں کہ انا ونسر کے فرائض
میں ہی اور کر رہا تھا" لہذا میں نے ان کا نام پکارا!

آپ ایک شان سے اپنی جگہ سے اٹھے اور
ڈائس پر جلوہ افروز ہوئے، پہلے تو ایک طائرانہ
نگاہ مجمع پر ڈالی پھر کچھ ہچکچاہٹ سر دوں میں کچھ
گنگنانے لگے، جب اچھی طرح گنگنا چکے تو ترنم کے ساتھ
ایک غزل سنانے لگے۔ دو چار اشعار پر داد بھی ملی۔
کچھ ہی وقفہ کے بعد پھر صف سے شور۔ ابھرا۔ میں نے
دیکھا کہ کرم صاحب کچھ نروس سے نظر آ رہے ہیں
میں نے نہیں سمجھا دیا، لوگوں سے مخاطب ہو کر
کہ آپ لوگ اللہ خاموش ہو جائیں اور انہیں کلام
سے حظ اٹھائیں۔ ایک شعر کے بعد پھر شور ابھرا
میں نے بھی محسوس کیا کہ یہ شور ان کا ہرگز نہیں ہے۔
مجمع میں افراتفری بڑھنے لگی۔ وہ شعر ابھی تک مجھے
یاد ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

شکر ادا کیے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکش امتحاں سے ہم

شور بڑھتا گیا، مجبوراً انہیں اکھاڑ جا پڑا۔ تب کہیں
جا کر لوگ خاموش ہوئے، یہ شعر تو مجاز کا ہے اسے
سارے لوگ جانتے ہیں، اور آپ ہیں جو جوم
جوم کر گا رہے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا ــــ مگر
کرم صاحب وہاں ٹھہرے نہیں۔ دوسرے روز
وہ پھر ٹی اسٹال پر ملے، میں نے انھیں خوب
کھری کھری سنائی۔ آپ ہی لوگوں کی وجہ سے ادب
کا معیار اتنا گر رہا ہے۔ چوری اور سرقہ سے
تو بہتر ہے کہ اپنا قیمتی وقت کسی دوسرے دھندے
میں صرف کریں۔ اس کے بعد قریب چار پانچ دنوں
تک کرم صاحب لاپتہ رہے۔

ایک بار میں کالج جا رہا تھا تو ان سے اتفاقیہ
ڈی کس ہوٹل کے قریب ملاقات ہو گئی۔ حلیہ بگڑا
پہلے تو میں پہچان ہی نہیں سکا۔ بال حد سے زیادہ
الجھے ہوئے۔ آنکھوں میں ویرانی اور زیادہ گہری ہو گئی
تھی، ڈاڑھی کافی بڑھ گئی تھی، کپڑے بے ترتیب
غرض انہوں نے اپنا حلیہ کچھ اس طرح کا بنا لیا تھا
کہ حلیہ کھلے لفظوں میں کہہ رہا تھا "کیا اب بھی آپ
مجھے شاعر نہیں سمجھتے؟"

کالج کا وقت ہو رہا تھا اس لئے میں ان سے
ملے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دوسرے پیریڈ کے بعد تین
لڑکے کے ساتھ "ڈی لکس" میں آیا تو دیکھا کہ کرم صاحب
ابھی تک براجمان ہیں اور ان کے ساتھ چار پانچ
منچلے بیٹھے چائے کی چسکی لے رہے ہیں، کرم صاحب
ترنم سے کوئی غزل انہیں سنا رہے ہیں۔ اور وہ
لوگ واہ واہ کے نعرے کچھ اس طرح لگا رہے
تھے جیسے زبردستی ان سے کہلوایا جا رہا ہے۔!
کرم صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور چائے کی
دعوت دے دی، میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی
۔ وہ میرے ٹیبل پر آ گئے اور آتے ہی کہنے لگے کہ
آج کل شاعری کا معیار بہت ہی گرتا جا رہا ہے۔ میں نے
کہا کہ آپ نے یہ کہاں دیکھا ہے؟ وہ گڑبڑا گئے!
اچھا ایک غزل سماعت فرمایئے، بات کاٹتے ہوئے
اس نے ایک غزر کے ساتھ مجھ سے کہا۔

بقیہ نظر ثانی کالم نمبر ۱ پر ملاحظہ فرمایئے

سہارا

مشن۔ غیر ملکیوں میں سادہ۔ ہیلی

آج میرے بنگلہ کی ان پر جہاں ہری بھری گھاس بچھی ہوئی ہے کئی ٹیبل اور کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ میرے ادھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ لوگوں کے ہنسنے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ راجیش کے ساتھ میری سگائی ہو رہی ہے۔ مگر راجیش باغ میں ٹہلتا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا ہے۔ شاید کہ اُسے وقت سے خوش ہونا چاہئے تھا۔ وہ تو مجھ سے بے انتہا پیار کرتا ہے، پھر وہ بے چین کیوں ہے ——؟

میری سہیلیاں مسکرا رہی ہیں۔ سب جولی اپنے خوبصورت ہیئر کٹ کے ساتھ بڑے ہی شوخ انداز سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے اور کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتی ہے ان کے قریب بیٹھی ہوئی لڑکیاں بیلا، نتاشا اور روشنا جانے آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی گردنیں فرط سے اکڑی ہوئی ہیں۔ ان کے چہروں سے ان کی دلی کیفیت کا صاف اظہار ہو رہا ہے وہ دل ہی دل میں مجھ پر ہنس رہی ہیں کہ میں نے راجیش کو پسند کیا ہے جبکہ میں اُس سے محبت نہیں کرتی تھی! یہ بات بھی ٹھیک ہے مجھے راجیش سے بالکل محبت نہیں تھی۔ میں محبت کی قائل بھی نہیں تھی۔ لیکن اب میں اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔ سب کا اس پر حیرت ہے۔ مگر جانے وہ کون کیسا تھا جس نے میری زندگی ہی بدل دی۔ اُسی ایک لمحے میں میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے دل کے کسی ویران گوشے سے راجیش کے لئے محبت کا طوفان اُٹھ کر میرے دل کو یقین دلا رہا ہے کہ میں اُس سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ میری سہیلیاں جو آج مجھ پر دل ہی دل میں ہنس رہی ہیں اگر وہ خود اُس ایک لمحہ سے دوچار ہوتیں، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں نے راجیش کو کیوں پسند کیا ہے!

آج جب کہ مجھے راجیش سے بے انتہا پیار ہے میں دونوں کو یاد کر کے خود بھی ہنس دیتی ہوں جب راجیش مجھ سے اظہار محبت کرتا تھا اور میں بے پروائی سے اس کی محبت کو بڑے متانت سے ٹھکرا دیتی تھی۔

اُس وقت وہ بی۔ اے میں تھا۔ میں بھی بی۔ اے میں تھی بائیس تئیس سال کا خوب رو، تندرست، نوجوان۔ جب وہ این سی سی کی وردی پہنے لڑکیوں کے قریب سے گزر جاتا تھا تو یہی لڑکیاں جو آج مجھ پر ہنس رہی ہیں بہت دیر تک اُس کی طرف دیکھ کر آہیں بھرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے کالج کے این۔ سی۔ سی۔ بیچ کا انڈر آفیسر تھا۔ مجھے بہت چاہتا تھا۔ مگر اُس وقت مجھے راجیش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ مجھ سے محبت کرتا رہا اور میں اُس کی محبت کو ٹھکراتی رہی——

کالج کے گیٹ پر کار رُکتے ہی میں کار سے اُتر پڑی۔ وہ این سی سی کی شاندار وردی میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ شاید وہ پریڈ ختم کر کے واپس جا رہا تھا۔ میں نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا۔ مگر وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں جھنجلا گئی۔

"جب تک تم میری محبت کا جواب محبت سے نہ دو گی میں اسی طرح تمہیں پریشان کرتا رہوں گا۔" اُس نے اپنا مخصوص جملہ دُہرایا۔ اچانک میرے دماغ میں اُس سے پیچھا چھڑانے کی ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"ہاں! چاہو تو آزما لو——" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے تازہ اخبار اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے سرخی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہندوستان پر چین کا حملہ" مجھے معلوم ہے میں اخبار پڑھ چکا ہوں" اُس نے سرخی پڑھتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تم فوج میں داخل ہو کر جنگ پر چلے جاؤ۔ جب وہاں سے واپس آؤ گے تو میں تم سے بیاہ کر لوں گی——" اور میں آگے بڑھ گئی۔

آٹھ دن تک وہ مجھے کالج میں نظر نہ آیا۔ ایک دن اچانک مل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت ہی خوش ہو۔

"کل میں جا رہا ہوں"

"کہاں——؟" میں نے تعجب سے پوچھا

"میں فوج میں داخل ہو گیا ہوں۔ سات دن کی ٹریننگ اور ساتھ ہی اے۔ پی۔ کا سرٹیفکیٹ رکھنے کی وجہ سے مجھے جلد سلیکٹ کر لیا گیا——" میں حیران رہ گئی۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا کہ راجیش میرے لئے سچ مچ فوج میں چلا جائے گا۔ جاتے وقت اُس نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ میں اپنا وعدہ یاد رکھوں——"

اس کے جانے کے ٹھیک دس دن بعد مجھے محاذ سے اُس کا ایک خط ملا کہ وہ وہاں کی ایک چوکی پر ہے۔ ہر وقت شدید گولے برس رہے ہیں۔ میں اُس کا خط پڑھ کر بہت دیر تک سوچتی رہی کہ کیا محبت انسان

کر پتا پتا بلبل بنا دیتا ہے۔ وہ میری محبت کی خاطر ہی تو آہ و فغاں میں چینیوں سے لڑ رہا تھا۔

دوسرے دن میں نے اخباروں میں پڑھا کہ دراغ کی پانچ چوکیاں ہندوستانی فوج کے قبضہ سے نکل گئیں اور ہندوستانی فوج کو کافی جانی نقصان ہوا ہے۔

اُس وقت میرا دل پہلی بار زور سے دھڑکا تھا۔ ... میں نے نہ جانے کس جذبہ کے تحت بے اختیار جگدیش سے راجیش کی سلامتی کے لئے دُعا مانگی تھی۔

اُس کے تیسرے دن مجھے ملٹری ہسپتال سے اس کا خط ملا کہ وہ شدید زخمی حالت میں وہاں لایا گیا ہے۔ یہ پڑھ کر میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا اور میں اس سے ملنے کے لئے ہسپتال اس طرح چلی گئی کہ جیسے وہ میرا بہت قریبی رشتہ دار ہو۔

جب میں اس کے بیڈ کے قریب گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر درد سے اُٹھ نہ سکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"بہت تکلیف ہے" میں نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ کچھ" اس نے اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کے پیروں پر سے کمبل ہٹا دیا اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل پڑی۔

"تمہارا پیر!" اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے زرد چہرے پر گر پڑے

"دراغ کی مٹی میں دفن ہے" اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی درد بھری آواز جیسے مندر کی گھنٹیوں کی طرح میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ یہ وہ ایک لمحہ تھا جس نے میری زندگی بدل دی۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ یہی وہ ایک لمحہ تھا جس نے میری نگاہوں میں راجیش کی عظمت کو کئی گنا بڑھا دیا۔

میرے پوچھنے پر اس نے کہنا شروع کیا

"ہماری تعداد چینیوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ اور ہمارے پاس زیادہ امونیشن بھی نہیں تھا حملہ ہو چکا تھا۔ ہم سب اپنے اپنے مورچوں پر اپنی گنیں سنبھالے ہوئے دشمن کی تاک میں تھے کہ اچانک دشمن کی آمد سے پہلے شدید بمباری شروع ہو گئی۔ دس منٹ تک کافی بمباری ہوتی رہی۔ ہمیں ایک دوسرے کی بالکل خبر نہیں تھی۔ دس منٹ بعد جب بمباری رُکی تو میں نے دیکھا کہ ہمارے سب مورچے برباد ہو چکے ہیں اپنی چوکی پر میں تن تنہا رہ گیا تھا۔ اس وقت اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا میں یہاں سے واپس جا سکوں گا۔ مگر دوسرے لمحے میں اپنی گن پر جھک گیا میرے یہ تمام ساتھی بھی تو واپس نہیں جا سکے۔ جان تھی کس لئے؟ صرف اپنے دیش کے لئے۔ تو کیا میں اپنے دیش کی محبت پر تمہاری محبت قربان نہیں کر سکتا؟ اس خیال کے آتے ہی میرے تن بدن میں ایک نئی طاقت آ گئی۔ اور میں اپنے مورچے پر جھک کر ان چینیوں کو دیکھنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ہی میں گیا وہ چینی ایک قطار میں بڑھے۔ میری انگلی ٹریگر پر پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس چینیوں کی وہ قطار زمین پر دم توڑ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے دس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میں یہاں ہسپتال میں تھا اور میرا یہ پیر غائب!"

آہ وہ مایوس نظر آ رہا ہے کہ اس کا ایک پیر نہیں ہے۔ مگر میں خوش ہوں۔ بہت ہی خوش کہ راجیش کی محبت جیت گئی تھی۔ اس نے میرے لئے اور اپنے دیش کے لئے اپنا ایک پیر قربان کر دیا ہے، مجھے فخر ہے کہ میرا ہونے والا شوہر شیر مرد ہے، جس کا ایک پیر دراغ کی مٹی میں دبا ہوا ہے۔ اس کی بے مثال شجاعت کا غیر فانی کارنامہ اپنا پیر اپنی بھارت ماتا کی مٹی میں دب جانے، اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے۔

میرے پتا نے ہماری سگائی کا اعلان کر دیا ہے سب لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ راجیش صوفے سے اٹھ گیا ہے لیکن وہ مصنوعی ٹانگ کے سہارے زیادہ دیر تک نہیں کھڑا رہ سکتا۔ میں مسکراتے ہوئے اسے سہارا دے رہی ہوں۔ مجھے سہارا دینا ہی چاہئے۔ فی الحقیقت

بقیہ طرحی مشاعرہ ــــ صفحہ ۳۲ سے آگے

اسی کا نام ہمارا ہے، ہادیٔ سبزہ زار
کٹ گیا جس نے سر اپنا خدا کے رستے میں

شاداب دل بھی سکون و قرار بھی اصغر
فنا کے بیٹھ گئے ہم وفا کے رستے میں

آزاد بانوی

کہہ جاتا ہے کہ ہم آدمی ہیں اے واعظ
نہ لغزشیں ہوں تو نہ جائیں خطا کے رستے میں

تمہیں بتاؤ کہاں ہیں شمار کے قابل
مری خطائیں تمہاری عطا کے رستے میں

ہزاروں باب ہیں مذہب کے نام پر جاری
لٹے ہیں قافلے کتنوں خدا کے رستے میں

ستم ظریفیٔ صیاد دیکھنا آزاد
قفس کو رکھ دیا بالِ صبا کے رستے میں

ضیاء انجم پرتاب گڑھی

تمہاری ذات کی سوگند شامِ فرقت میں
چراغ اشک جلائے ہوا کے رستے میں

شریکِ حال ہمارا غبارِ راہ ہوا
لٹ گئی ہے ہمیں گرد پا کے رستے میں

وہ دور رہم سے بہت دور ہو گئے آخر
چلے تھے یوں تو قدم ہم ملا کے رستے میں

منظور قاضی

دوا اگرچہ ہے تریاق بے اثر ہو گئی
اثر دعا کا ہے لیکن تضاد کے رستے میں

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۴

مصرع طرح

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

فوائد کیلئے ۲۰ پوسٹ کارڈ یا اس کے متبادل
دانہ کے ساتھ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

ممبران ثانی بورڈ
حضرت
مولانا ابر احسنی گنوری
شفا گوالیاری

آ احسنی سیدک شکوہ آبادی

ظفر ہمیں ہر رہنما کے رستے میں
ئی فرض کی کچھ جو ہش اب بھی آجائے
ہوا تو جوش میں رہ کر سنبھل کے چلتا ہے
تو یہ تب سے پھیلائے تو ہاتھ اپنا
وہ تا ہوں کہاں سے میں آگیا ہوں کہاں
ادا شتی رہیں آندھیاں مگر تا رک
دتی شبنم شکوہ آبادی

فا سے کام لیا ہے وفا کے رستے میں
ے یگی دوست بنا یا دہن گیا دشمن
ظاہر ہے کہ رہتی ہے عاصیوں پہ نظر
واخدا کے کرم کی اور بچ نہیں سکتا
بھٹکنے والوں سے ان کا مسلک نہ دیکھو
نہ آنکھ میں آنسو ہیں پی گیا شبنم
ملاق قدرتاً ہیما بی ابھٹہ

یب چمن کا عالم دکھا کے رستے میں
ر تو عشق میں رستہ دکھائیں گے ہم کو
نہ اپنے گھر کے ہوئے وہ ان کے در کے ہو
لسی پر راز محبت نہ فاش ہو جائے
قدم قدم پہ آ سے صفر کریں نہ یہ کیوں
جنوں کی راہ میں دنیا بھی مجھے لیکن
محمد علی اختر ہیشگن گھاٹی

نکے آخیاں ہم نے ہوا کے رستے میں
جنہیں عشق کی منزل پہ کوچ کرنا ہے
فع حیات کی فکر سے باخبر ہو کر

کر لوٹ لیتے ہیں یہ خود بلا کے رستے میں
ہوئی ہیں لغزشیں کتنی جفا کے رستے میں
ملیں گے موڑ ہزاروں خدا کے رستے میں
نہیں ہے کوئی رکاوٹ خدا کے رستے میں
اکیلا چھوڑ گیا کوئی کارواں کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
فریب ہم کو ملا آشنا کے رستے میں
ملیں گی رحمتیں اس کی خطا کے رستے میں
بقا کا ذکر ہی کیا ہے فنا کے رستے میں
دکھائی منزل مقصود آ کے رستے میں
جفا سے کام پڑا جب وفا کے رستے میں

وہ چل دیئے مجھے بے خود بنا کے رستے میں
ہمارے داغ جگر جگمگا کے رستے میں
جدا وہ بھول گئے گھر سے آ کے رستے میں
نہ دیکھ دیکھ مجھے مسکرا کے رستے میں
چلا غرور سے جو سر اٹھا کے رستے میں
ملا نہ کوئی بھی صادق خدا کے رستے میں

شکست دی ہے فلک کو وفا کے رستے میں
بھٹک کے رہ گئے کتنے وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

جا بیٹھ کے جو آنکھ بھر آئے تو بہتر جائے
عجب نہ تھا کہ پہنچ کر قبول ہو جاتی
ادا کسی کی ادا تھی ادا مگر اختصر
حکیم عبدالحی حکیم پوری

رموز عشق و محبت سکھا کے رستے میں
جفائے یار سے گھبرا رہا ہوں کیوں اتنا
ستم ہے راہبروں نے ہی مجھ کو لوٹ لیا
ہر ایک گام پہ ملتی مجھے نئی منزل
ہمیں نصیب جو ہوتی تمہاری ہم سفری
یوں کی یاد ستاتی رہی ہمیں پیہم
شہرت میرٹھی

پتہ بتائیں گے منزل کا چلنے والوں کو
زمانہ داد نہ کیوں دے ہماری کوشش کی
شعاع شمس نہ کیوں چمکیں خاک کے ذرے
خدا ہی جانے کہ منزل پہ کیسے پہنچے گی
امید رکھتا ہے تم سے جو گل فشانی کی
سنبھل کے رکھنا قدم تم کہ کانٹے والو
خضر محمد خضر ناگ پوری

جہاں نے کچھ نہیں پایا بھٹک کے رستے میں
ہمیں بتاؤ مسیحا تجھے ملا بھی ہے
ادھر بھی اک نگہ التفات ہو جائے
زمانہ بدلے رویہ دہر کی بدل جائے
ہماری منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں
ہزاروں منزلیں آئیں وفا کے رستے میں

بقا کے نقش چھپے ہیں فنا کے رستے میں
نصیب ہو گیا حاصل دعا کے رستے میں
قضا ہی آ گئی ظالم ادا کے رستے میں

دل حزیں کو چلایا وفا کے رستے میں
بھٹک نہ جائے کہیں دل وفا کے رستے میں
چراغ راہبر کو بجھا کے رستے میں
وہ کاش چلتے قدم کو ملا کے رستے میں
تو نقد جاں کو بھی چلتے لٹا کے رستے میں
اگرچہ چلتے رہے ہم خدا کے رستے میں

ہمارے نقش قدم ہیں وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
مرا مزار ہے اک مرقع کے رستے میں
قدم قدم پہ ہیں کانٹے خدا کے رستے میں
بچھاؤ خار نہ احمد وفا کے رستے میں
خیال بدلے ہیں اب تو ہوا کے رستے میں

ہمارا نام ہے روشن وفا کے رستے میں
کوئی مریض محبت شفا کے رستے میں
لگائے آس کھڑا ہوں میں آ کے رستے میں
وفا شعار ملیں گے وفا کے رستے میں
ہزاروں منزلیں آئیں وفا کے رستے میں

ملا ہے عشق میں اے خضر زندگی کا لطف
ادھوری زیست تھی عمر بقا کے رستے میں

حبیب اللہ شاہ۔ شاہ حداس

وہ اک دوانۂ تبسم دکھا کے رستے میں
گزر رہا تھا میں دامن بچا کے رستے میں
ہر اپنی شوخیٔ فطرت پہ مہر بلب ہیں
خبر نہ اہلِ جفا کو کہ ٹوٹتے ہیں بتوں سے
وہ خارِ راہِ جہاں ہے سبیلِ دلی ناداں
تھپیڑے سیلِ حوادث کے سر پہ کھائے
اسماعیل ذبیح مانگا نوی

قدم ہے جن کا عزیمت فنا کے رستے میں
نہ چھوٹا اور نہ چھوٹے گا صبر کا دامن
اسی کے لطف و کرم اور نوازشوں کی قسمیں
بھر گئی آہ جو آئے مقابلے کے لئے
اسی کو حاصلِ محفل و شعور کا تحفہ
نہ پہنچے منزلِ مقصود پر ذبیح حزیں
ہادی نانک پوری

وفا کا ذکر حماقت جفا کے رستے میں
جو چھپ کے شیخ نے پی خانقاہ میں پی لی
ذکر کو اس کے دباتے ہیں جو فقیہوں میں دام
سفارشوں کے جھمیلے تو فکر دونوں کی
قبول ہی نہیں ہوتی کبھی بغیر نیاز
بچے جو رند سے حافظ تو کیا عجب ہادی
علامہ بیباک ٹنک بندی

مجھے نہ دیکھا تم مسکرا کے رستے میں
جو راہِ عشق میں بجلی کے گر گئی ٹھوکر
بدل کے رکھ دیئے رستے ہر ایک طوفاں کے
قدم قدم پہ تھا قدم قدم پہ رقیب
خدا کرے کہ سلامت جاؤ تھک کے دو گھنٹہ
نظر میں پھر گئی میرے فسانے کے دانے
اطہر انصاری سلطان پوری

جو گام گام ہیں اندیشے جفا کے رستے میں
تمہارے چاہنے والے تمہاری آرزو میں

گئے ہیں برق سی دل پر گرا کے رستے میں
کسی نے لوٹ لیا مسکرا کے رستے میں
نجات دل کو ہے عہدِ وفا کے رستے میں
ہم آج گرمِ سفر ہیں وفا کے رستے میں
یہاں سے چلنا ہے دامن بچا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

ہمیشہ رہتے ہیں دونوں وفا نبھا کے رستے میں
ہزاروں ٹھوکریں کھائیں وفا کے رستے میں
خراب حال رہے ہم وفا کے رستے میں
ہیں جان و دل سے کھڑا ہونا کے رستے میں
گرا جو ٹھوکریں کھا کے رستے میں
اٹک کے رہ گئے آخر خطا کے رستے میں

ثواب ڈھونڈھ نہ عاشق خطا کے رستے میں
تو زندہ آئے گا کیوں پار سا کے رستے میں
محل رقیب ہیں آہ و رسا کے رستے میں
ہزار ٹھوکریں ہیں ہر رہنما کے رستے میں
مٹھائی کی ہے ضرورت دعا کے رستے میں
شریف آتے نہیں بے حیا کے رستے میں

کہیں میں گر نہ پڑوں لڑکھڑا کے رستے میں
تو پھر وہ بیٹھ گیا ہمت گنوا کے رستے میں
کھڑے ہو جو گئے آنکھیں اڑا کے رستے میں
بہت بکھیڑے ہیں اے دل وفا کے رستے میں
مرے نیم ہے تمہارا قضا کے رستے میں
وہ مسکرا دیئے جب پان کھا کے رستے میں

کبھی وہ چل نہیں سکتے دغا کے رستے میں
ادب سے بیٹھے ہیں آنکھیں بچھا کے رستے میں

ہمیں سہارا دیا بڑھ کے عزم محکم نے
وہ حیات ہیں مختصر انہیں نہیں گنتی
لگا کے جان کی بازی کریں گے اس کو
بصد خوشی میں اسے بھی نثار کر دوں گا
محمد عبدالقیوم صدیقی مت فتح پوری

سکون دل نہ ملے گا جفا کے رستے میں
نفس کی آمد و شد پہرہ دار ہے جس کا
جنونِ عشق میں مضمر ہے مار فطرت کا
ازل سے ہوتی ہے تکمیل زندگانی کی
یہی ہے راز ترقی یہی ہے راز نمو
اسے بلاؤں کے طوفاں ہٹا نہیں سکتے
حبیب الرحمٰن راہی بالا گھاٹی

بچھا رہے ہیں جو کانٹے وفا کے رستے میں
ہمیں حیات ملی ہے قضا کے رستے میں
بھٹک سکے گا نہ اب کارواں ہوش خود
نوائی نکہت سنبل۔ نہ بوئے لالہ و گل
خلوصِ دل کے تقدس کو مستجاب جوئی
چلو تلاش کریں اُن کے نقشِ پا راہی
محمود حیا سیوہاروی

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
دوا نہ چھوڑ دے اے چارہ گر دعا کیں کر
جمال ہی نہ جوئی رعب حسن تھا ایسا
شہید زندہ ہے مرتا نہیں قیامت تک
نہ تا پیر مغاں یہ سمجھ کے ہوں مخمور
حمید ناشکر۔ ٹانک پوری

اٹھا رہے ہیں ستم گو بلا کے رستے میں
صدائے حق جو لگائی تو دی مثالِ صلیب
سمجھ رہا تھا محبت کا رہنما دل کو
ہمارے عزمِ وفا جادہ پر اثر نہ ہوا

ترقیوں سے بس اتنی ہی رہ گئی دلکش
کبھی تو یاد کریں گے وفا کے رستے میں

کبھی جگر پڑے ہم لڑکھڑا کے رستے میں
جو لوگ چلتے ہیں نظریں جھکا کے رستے میں
جو فاصلے ہے بقا و فنا کے رستے میں
جو کام جان بھی آئے وفا کے رستے میں

وفا کا نام نہیں بے وفا کے رستے میں
وہ کیا چراغ بجھے گا ہوا کے رستے میں
فنا کا درس ملا ہے بقا کے رستے میں
لگے ہیں زیست کے پیرے قضا کے رستے میں
فدائے دل نہ رکے ہیں نہ رکے رستے میں
قدم جمائے جس نے خدا کے رستے میں

وہ اہرمن ہیں یقیں خدا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
کھڑے ہیں اہلِ جنوں دل جلا کے رستے میں
بجھے ہوئے ہیں شاید صبا کے رستے میں
ہزار ہم دگماں تھے وفا کے رستے میں
جو دل جلا کے چلے ہیں وفا کے رستے میں

وہی خیال ہی مسلط گھٹا کے رستے میں
دوا اثر نہیں کرتی قضا کے رستے میں
جمال دیکھ لو نظریں اٹھا کے رستے میں
جو اس کی جان گئی ہو خدا کے رستے میں
پلا ہی دی مجھے آخر بٹھا کے رستے میں

وفا شعار چلے ہیں وفا کے رستے میں
زمانہ جو گیا دشمن خدا کے رستے میں
نگاہ پھیر لی کافر ادا کے رستے میں
فنا کے بعد بھی آئے بقا کے رستے میں

نظام الدین اویب فاروقی بدایونی

قفس کی یاد کو دیرینہ کے رہتے ہیں
قدم اٹھائے ہیں جس نے وفا کے رستے میں

نظر چراغ جلانے سے کچھ نہیں ہوگا
ہر جگر کا جلاؤ خدا کے رستے میں

وہ رہ نورد محبت ہوں اس زمانے میں
جو کارواں بھی چلا چھوڑ کے رستے میں

یہ تیرا لطف و کرم ہے کہ تیرا دیوانہ
بقا سے کھیل رہا ہے قضا کے رستے میں

ہماری جہت برجات کی داد نہ کوئی
چراغ ہم نے جلائے وفا کے رستے میں

عاد سحرائی سکتی ایم اے

تڑپ کے رہ گیا دل بے وفا کے رستے میں
غضب ہوا کہ گیا آنکھیں ملا کے رستے میں

ہمارے ذوق سفر میں نہ فرق کچھ آیا
ہزار شکلیں آئیں وفا کے رستے میں

مجھے تو ان کی محبت ہی جان دینی ہے
وہ آئے آئیں نہ میری قضا کے رستے میں

وفا کہ سکتے ہیں جینا کبھی نہ چھوڑیں گا
بلائیں لاکھ بھی آئیں وفا کے رستے میں

ضمیر داغ دلی ان کو دکھاؤں کیا عاد
یہ کیوں چراغ جلائے ہوا کے رستے میں

اکرام اعظم برجمی

جھکا جھکا کے نگاہیں ملا کے رستے میں
کسی نے لوٹ لیا مسکرا کے رستے میں

تمہاری دید کے مشتاق کب سے بیٹھے ہیں
چراغ آرزوئے دل جلا کے رستے میں

بقائے نیست ہوئی ہے نصیب اس کو ہی
مٹا چکا ہے جو خود کو وفا کے رستے میں

ابھی جنون و محبت کے قاعدے مجھ سے
نہ جانے سیکھیں گے کتنے وفا کے رستے میں

نثار کر دیا ہم نے یہ جان و دل اعظم
یہ فیض عشق خدا کی رضا کے رستے میں

کریم احسن بھاگل پوری

بچھا دیا ہے دل اس کا ادا کے رستے میں
وفا سے کام لیا ہے جفا کے رستے میں

ہے بھی دامن امید میں سمیٹ لیا
ہے جو خار بھی اس دل ربا کے رستے میں

نہیں ہے کوئی صلہ یہ اک حقیقت ہے
بقا کا راز نہاں ہے فنا کے رستے میں

بجھا کر دیا سلائے میں تیرگی کے کریم
چراغ داغ جگر سے جلا کے رستے میں

وہ جلوہ ریز تھے نظریں فنا کے رستے میں
کہ جیسے چاند ہو کالی گھٹا کے رستے میں

یہی ہے عشق و محبت کا نام ہے روشن
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

وہی ہوئے ہیں مشرف خدا کے جلووں سے
خودی مٹا کے چلے جو خدا کے رستے میں

ہے گی نزل مقصود کیا اسے حشمی
کہ بیٹھ جائے جو سر کو جھکا کے رستے میں

یہ جان کر کہ قضا ہے وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے وفا کے رستے میں

سنا ادھر سے وہ گزرے گا آج رتی جلال
تو آ کے بیٹھ گئے ہم قضا کے رستے میں

(باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

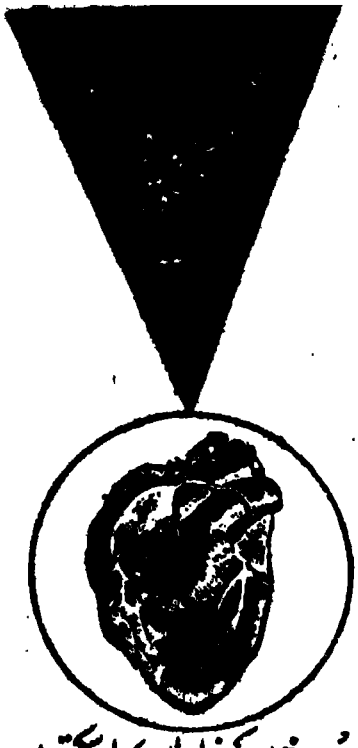

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظام عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے
خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

[redacted] دہلی — کانپور — پٹنہ

نوٹ

دستی سامان اور اس کے لے جانے کی بکنگ

دفعات ذیل ہدایات کے باوجود دیکھا گیا ہے کہ مسافر بعض دستی بکس، ٹرنک، سوٹ کیس وغیرہ اپنے ہمراہ ڈبوں میں لے جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر دیگر مسافروں کو غیر معمولی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ انڈین ریلویز مسافر فنانس (ایس سی) ایکٹ کے رول 606 کو چیپٹر نمبر 19 پارٹ I میں یکم اگست 1963ء سے مندرجہ ذیل ترمیم کی گئی ہے۔

606 - لگیج انچارج آف ایر کنڈیشنڈ اور فرسٹ کلاس کے مسافر

ایک مسافر اپنے ہمراہ صرف ایسی چھوٹی چھوٹی دستی استعمال کی اشیاء کو سکتا ہے جو کہ اس کے ذاتی استعمال کے لئے لازمی ہوں اور جنہیں بآسانی سیٹ کے نیچے میں رکھا جا سکے اور جن سے دیگر مسافروں کو پریشانی نہ ہو۔ نیز جن کے باعث ڈبے میں بیٹھنے، سونے اور آمد و رفت کی جگہ نہ گھٹتی ہو۔

ٹرنک، بکس، سوٹ کیس جو لمبائی میں تقریباً ستر سینٹی میٹر، چوڑائی میں 60 سینٹی میٹر اور اونچائی میں 25 سینٹی میٹر سائز کے ہوں، مسافروں کو ڈبوں میں نہیں رکھنے چاہئیں۔ بلکہ انہیں بریک وان میں رکھنا چاہئے۔ اس کے برخلاف کرنے والے مسافر سامان کا چالان ادا کرنے کے باوجود انہیں جائز سامان لے جانے کی رعایت سے محروم ہونا پڑے گا۔ ایسا سامان کسی بھی جگہ پر بریک وان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مفت سامان کے لئے رعایت صرف بریک وان میں سامان رکھنے پر دی جائے گی۔ جتنے فاصلے تک یہ سامان مسافروں کے ڈبے میں لے جایا جائے گا کسی قسم کی رعایت نہیں دی جائے گی اور پورا کرایہ مکمل وزن پر وصول کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا رول ایسے سامان پر لاگو نہیں ہوتا

اگر پورا ڈبہ ایک پارٹی کے نام منظور کیا گیا ہو۔ بسکٹس، چنے، بیگیں، چھتریاں، چھڑیاں، صراحیاں وغیرہ اشیاء زیر دفعہ (I) (a) 605، 606 انڈین ریلویز مسافر فنانس ایسوسی ایشن کو چھٹے شیڈول نمبر 19 پارٹ (I) کی کسی حالت میں مسافروں کے ساتھ لازماً سامان میں نہیں جانا چاہئیں۔ ڈبے میں رکھی گئی تمام اشیاء کی تمام تر ذمہ داری مسافروں پر ہے۔

کوئی شخص جو اس رول کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ مستوجب سزا ٹھہرے گا۔ یہ رول (606) سکنڈ اور تھرڈ کلاس کے مسافروں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ مزید برآں مندرجہ ذیل ترمیم کے ساتھ

606 (I) لگیج انچارج آف سکنڈ و تھرڈ کلاس پسنجرز

چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ

شعلہ و شبنم دہلی

اگست ۱۹۶۳ء

زرِ سالانہ چار روپے
ششماہی دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۸

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں - دہلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصۂ نظم
حضرت مولانا آبا حسنی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
فرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	آ صفی گزٹ کوٹہ	مفتوں کوٹوی	۵
۲	تبصرے	ادارہ	۹
۳	ارشادات	نوح ناروی	۱۰
۴	دو غزلیں	آثم کرنولوی	۱۱
۵	"	روشن پٹیالوی	۱۲
۵	غزلیات	راجہ بنت اقبال	۱۳
۶	"	مظفر حنفی بی اے	۶
۶	"	شہرت میرٹھی بی - اے	۶
۶	انکار نو	جودت ابرہی رائے پوری	۱۳
۶	"	ہدایت اللہ ہادی ناگ پوری	۶
۶	"	یٰسین مشہود ناگ پوری	۶
۷	جلال و جمال	آکر اندوری - تاجی بالا گھاٹی	۱۴
۶	"	عبدالحمید اثر راجوری - رئیس بھوپالی	۶
۶	"	تمرا ینی - لطف ہاردنی	۶
۸	بزم مسالہ ناگ پور	طرفہ قریشی	۱۵
۹	مجلتے پتھر	نصیر کیفی	۱۹
۱۰	خوبصورت کھونا	صمد حیدری	۲۲
۱۱	ذہنی طوفان	اختر جاوید مالیگانوی	۲۶
۱۲	پرواز تخیل	غفران انصاری	۲۸
۱۳	طرحی مشاعرہ	مرتبہ شفا گوالیاری	۳۰

ہفت روزہ شعلہ و شبنم دہلی پریس ایجنسی کے لئے بمل جین کی طرف سے شائع کیا

دابستان کی ادبی فضاؤں کی سیر

آصفی گزٹ کوٹہ

[illegible] کی [illegible] کی
[illegible] کی [illegible] کی
[illegible] کی [illegible] کی

یہ ان کی کمی ہے ہم کہ تم شعر سنیے
اس طرح کی پختگی کا انکار ہوگا ؎

سال رحلت دعائیہ باشد
بندری گردند نہاں ہر دم
بشنو الحمد با تلفظ از غیب
کن الہام ماں چناں ہر دم
کامد بزبان زباو دعا
قبنا اغفر لوالدی و ارحم
۴۵ ۱۹ ۲

• جان نامہ دلے سنج آصف آبادی کی غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

تیرا بجا ہے خود کو حسرت دیدہ کہنا
کیا تیس وہ تجلیاں پھر بھی بجھے جگر نہیں
تب تو پکا چاہئے ہی کا خیال پھر سے
ہاں تو ہے شاذ فدا وہ تو کسی کا گھر نہیں

مولانا مولوی الحاج خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی غزل جو ہماری مشاقی، پختگی اور فنی رکھ رکھاؤ پر دلیل تام ہے سب سے دلچسپ ہوتے ہیں یہ اشعار جنہیں ان کے جواب اجابت دیکھئے ؎

کہتا ہوا پھرتا ہے محشر میں دیوانہ
یا رب مرا دیوانہ یا رب مرا دیوانہ

ہے آمد فتنہ پاں اس بزم میں مستانہ
کی در پہ قیامت ہے اک دور ہے خانہ
جی میں ہے چھلا جائے یہ بیخانہ یہ میخانہ
ہاں ساقی دریا دل پیمانہ پہ پیمانہ
تبدیل جواب ساقی رسم دورے خانہ
غم کر تو بنا شیشہ اگر شیشہ گرے خانہ
مجذوب کو جب دیکھا محفل کی طرف آتے
گھبرا کے پکار اٹھے یہ آیا ہے دیوانہ

(بقیہ پہلا تھیں خیالوں میں (صفحہ ۲۹ سے آگے)
پھر نیند نہیں آئی۔ وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیالات آتے رہے اور وہ الجھتا رہا ——
دوسرے دن اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خالہ کی بات مان لے گا۔ دس بجے خالہ نے اسے اس کمرہ میں بھیجا جہاں وہ لڑکی منی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھی۔ اسد نے جب کمرے میں قدم رکھا تو اس کے چہرے پر مسرتوں کے چراغ روشن ہو اٹھے۔ کمرے میں وہی لڑکی تھی جسے اس نے برسوں سے چاہا تھا —— !!

بقیہ بنم مسالمہ جنگ پور (صفحہ ۔ سے آگے)
نے ایک بڑا اعلان کیا ہے کہ کل شب میں ہی اسی مقام پر مولانا

نوٹ: حضرت طرفہ خضرت ٹونکی کی کتاب دیوان کی یہ اشاعت اب سے پہلے کسی بھی مطبع سے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے طرفہ صاحب کے ورثہ تبریک پیش کرتا ہے کہ انہوں نے مکتبہ کو ایک نیا راستہ دکھایا —— ادارہ

مصرع طرح اخبار مشاعرہ نمبر ۵۶
موسم گل ہے شباب جوش پہ ہے بادلوں میں
دیوانوں، بھیجا کرو غزلیں اپنی مدیر
غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء

ایجنٹ صاحبان نوٹ فرمالیں

شعلہ و شبنم کا آئندہ شمارہ آزادی ایڈیشن زیر ترتیب ہے۔ ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر بلا پس و پیش بھیج دیں بعد از وقت آرڈر موصول ہونے کی صورت میں ہم تعمیل سے معذور ہوں گے۔

شعلہ و شبنم کی فروخت کے لئے بھوپال میں ایک دیانت دار ایجنٹ کی ضرورت ہے۔ خواہش مند حضرات منیجر شعلہ و شبنم دریہ کلاں دہلی سے خط و کتابت

نوٹس شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۵۶

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء

مصرع طرح دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے گفتگو کی
گفتگو۔ جستجو قوافی —— کی ردیف

۱ ... ...
۲ ... ...
۳ ... ...

بقیہ طرحی مشاعرہ نمبر ۵۵

صفحہ ۳۴ سے آگے

خلیل آفریدی۔ فرخ آبادی

تم جو کہتے ہو مجھے چین نہیں آتی ہے — یہ محبت ہے مرا جان محبت میری

سید محمود آفاق سہسپالی

کوئی مجنوں کوئی فرہاد کہا ہے لقب — اس کی خاطر ہوئی دنیا میں یہ شہرت میری

اسماعیل ذبیح مالی گاؤں

آنکھ میں ان کی نظر آئی ہے جادو کیسا — دیکھنا ان کو ہے کیا ہوگی ضرورت میری

حمید دانش۔ مالی پوری

[illegible] — [illegible] محبت میری

تبصرے

(تبصرہ کے لئے دو نسخوں کا آنا لازمی ہے)

رنگ و بو صفحات ۱۰۰ سائز ۲۰×۳۰ عمدہ جلد اور چھاکاغذ۔ کھائی چھپائی سیاری۔ ۱۰۰ صفحات پر ۱۰۰ تصویر مصنف۔ قیمت ڈھائی روپے علاوہ محصول ڈاک ملنے کا پتہ۔ مکتبہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں۔ دہلی ۶ (۲) مکتبہ بزم ادب ۱۴ گنپت پرساد روڈ۔ کلکتہ ۶

یہ دیوان خرد یات کلکتہ کے مشہور و مقبول شاعر خرد غوث پوری کا ہے۔ آپ کا کلام مدت دراز سے ادبی رسائل میں دیکھا جا رہا ہے۔ دیوان میں بڑی تعداد میں عمدہ اشعار ملتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر روح کو تازگی اور دماغ کو فرحت ملتی ہے کلام اخلاق سخن سے پاک ہے۔ متروکات سے کافی حد تک دامن بچا کر رکھا گیا ہے جو اکثر دیوانوں میں نہیں دیکھا جاتا۔ انداز بیان سادہ شستہ اور خیالات بلند و پاکیزہ ہیں۔ زبان شگفتہ ہے۔ غالباً انھیں خیالات کے پیش نظر شاعر بزرگ جناب بیخود بدایونی پی ایچ ڈی جناب شانتا رنجن بھٹا چاریہ جناب جرم محمد آبادی اور جناب پروفیسر دیوکنڈر پال صابر ایم۔ اے نے اپنے مقالات میں بھی کھول کر داد سخن دی ہے۔

پہلی کرن صفحات ۲۰۰ سائز ۲۰×۳۰ بیچ تصویر مصنف۔ کاغذ عمدہ۔ کھائی چھپائی بہتر۔ جلد۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ۔ طرفہ قریشی۔ مون پورہ۔ معصوم شاہ کا ٹکیہ۔ ناگپور ۱۲

یہ دیوان چار شعرا کے نمائندہ شاعر حضرت طرفہ قریشی کا ہے۔ طرفہ قریشی اپنے کمالات شاعری کے باعث محتاج تعارف نہیں۔ ان کا شمار ملک کے مشہور شعراء میں ہے۔ وہ اپنی خوش گوئی و پختہ گوئی کے لئے مشہور ہیں ان کے کلام میں انفرادیت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا کلام دل پر خاص اثر کرتا ہے اور دماغ کو مسرور۔

یہ دیوان ان کی حمد نظمیں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس دیوان پر بیرت کے مشاہیر نے اپنی رائیں، تقریظیں اور مقالات لکھے ہیں۔ علاوہ ہر صاحب ذوق سے اس عمدہ دیوان کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہے

نمونہ کے اشعار اس لئے نہیں دیئے کہ ملک کے مستند ناقد طرفہ صاحب کے کلام پر قلم اٹھا چکے ہیں اور اظہار رائے ہیں۔ انھوں نے اس فن کار کو پہچان لیا ہے اور قدر دانی کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ دیکھیے گا طرفہ صاحب کا کلام نا قریب شعلہ شبنم کی عنایت طبع کے بعد [illegible]

مکتبہ شعلہ و شبنم کی دو خصوصی پیش کش

گردِ راہ

حضرت ضیا فتح آبادی کا نیا مجموعہ کلام

بہت جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر

پیش ہو رہا ہے

قیمت ——— تین روپے

حضرت خرد غوث پوری کا

پہلا مجموعہ کلام

رنگ و بو

عمدہ کاغذ، معیاری طباعت

قیمت ڈھائی روپے

مکتبہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں۔ دہلی ۶

ارشادات

شوق پورا یوں ہمارا ہوگیا　　بند کیں آنکھیں نظارا ہوگیا
ان کی آنکھوں کا اشارا ہوگیا　　اتنے ہی میں کام سارا ہوگیا
عشق میں سب کچھ گوارا ہوگیا　　ظلم بھی پیارے کا پیارا ہوگیا
ہے تعجب دیکھتے ہی دیکھتے　　دل ہمارا تھا تمہارا ہوگیا
دل دیا تھا نفع کی اُمید میں　　نفع کے بدلے خسارا ہوگیا
زیرِ خنجر اس خوشی سے جان دی　　نام مقتل میں ہمارا ہوگیا
اللہ اللہ یہ مرا اعجازِ عشق　　اشک جو نکلا وہ تارا ہوگیا
ہے کرم بھی کچھ ستم کے ساتھ ساتھ　　جینے مرنے کا سہارا ہوگیا
بات کھل کر وہ نہ مجھ سے کرسکے　　آنکھ آنکھوں میں اشارا ہوگیا
غیر معمولی تھا ان کا ہر ستم　　کس طرح مجھ کو گوارا ہوگیا
بھر غم نے کر دیا غرقاب غم　　خود بخود پیدا کنارا ہوگیا
آپ کے نزدیک تو کچھ بھی نہیں　　لیکن اپنا وارا نیارا ہوگیا
تھا مرا قطع تعلق بے اثر　　عشق پھر ان کا دوبارا ہوگیا

رہ گئے اے ناصح ناعاقبت اندیش کے گھر
جلے طرح دیران تمارا ہوگیا

روشن آرائی

آثم کرنالی

دو غزلیں

جو خوش نصیب راہِ جنوں سے گزر گیا
دل اس کا آگہی کی تجلی سے بھر گیا

دو دن ہی میں وہ عہدِ جوانی گزر گیا
دریا چڑھا ہوا تھا جو آخر اتر گیا

ہر گام پر بجز غمِ کائنات تھا
پھر بھی میں راہِ زیست سے ہنس کر گزر گیا

پھر کیا کسی نظر میں سمائے وہ نامراد
جو ایک بار تیری نظر سے گزر گیا

مقتل میں آ کے پوچھ رہے ہیں یہی سے وہ
بسمل ہمارے تیرِ نظر کا کدھر گیا؟

ناصح سمجھ سکا نہ کبھی زندگی کا راز
افسوس اس جہان سے وہ بے خبر گیا

ماہِ حیات کو کیا تجھ نور صدق سے
کتنا عظیم کام میں دنیا میں کر گیا

جب اٹھ گئی نقاب رخِ تابناک سے
رنگِ حیات چہرۂ گیتی پہ بھر گیا

روشن ترے بغیر ہے دل کا ہر اک چراغ
تابندگی کے بعد یہ کیسا اندھیر گیا

روئے پر آب و تاب کیا کہئے
مطلعِ آفتاب کیا کہئے

آسماں بھی ہے ٹوٹ پڑنے کو
یہ اُبھرتا شباب کیا کہئے

روئے روشن پہ زلفِ عنبریاں
ماہ زیرِ سحاب کیا کہئے

چھیڑ پھر نغمۂ رگِ جاں کو
تیرا تارِ رباب کیا کہئے

مضطرب دل کو یوں ہی رہنے دے
رُخ پہ تیرے نقاب کیا کہئے

تو جو ہو جائے صاحبِ میزاں
روزِ محشر حساب کیا کہئے

شیخ جی اور بزمِ رنداں میں
لطفِ جامِ شراب کیا کہئے

آپ ہے اپنے طرز کی موجد
طبعِ آثم جناب کیا کہئے

عترت بیگم بنت اقبال

تجھ پہ ہی بھروسا ہے تیرا ہی آسرا ہے
تجھ پہ ہی بھروسا ہے تیری ہی توجہ چاہتی ہے

وہ دن گئے ہیں دل کے مرے دن بھی گئے
اظہار بھی جس کا مشکل ہے وہ سر پہ مصیبت آتی ہے

گھٹ گھٹ کے دم نکلتا ہے ایام جدائی میں کہئے
جب یاد کسی کی آتی ہے سینہ پہ گھٹا سی چھاتی ہے

دل جلتا ہے تو جلنے دے آنسو نہ بہا فریاد نہ کر
ناموں کے لبوں پر آتے ہی رسوائی بھی ساتھ آتی ہے

ہر گل پہ ہر درد پژمردہ سب کلیاں سوکھی سوکھی سی
چھائی ہے خزاں ہر اک جانب یا فصل بہار آتی ہے

قسمت نے مسرت چھینی ہے قسمت نے کی ہے دغا مجھ سے
پھر جور فلک کا کیا شکوہ قسمت ہی ستم جب ڈھاتی ہے

اے راقبہ اپنے عالم میں مسرور ہوں میں دل شاد ہوں میں
یہ کیف بھی مجھ کو کیا کم ہے، دل یاد اُن کی بر آتی ہے

غزلیات

مظفر حنفی بسوی

شکایتِ بزمِ یار نہیں، بات کیا کریں
کوئی بھی غم گسار نہیں، بات کیا کریں

ہے آپ کو پسند ہر اک خوش گوار بات
ہر بات خوش گوار نہیں، بات کیا کریں

ایسی ہے شہریار میں مصروفِ گفتگو
ہم لوگ شہریار نہیں، بات کیا کریں

حالات سازگار نہیں بات کیا کریں
اپنا بھی اعتبار نہیں، بات کیا کریں

یارانِ باغ و راغ مظفر کے باب میں
گنجائشِ خمار نہیں، بات کیا کریں

شہرت بیگم

غم پہ غم کر دو خوف و خطر کس کا ہے
تم پہ مرتا ہے زمانہ تمہیں ڈر کس کا ہے

جلوہ گاہیں کو ندتی ہیں مدخ سے اٹھاتے ہی نقاب
ڈالے جلووں پہ نظر اتنا جگر کس کا ہے

شمع ہستی پہ مٹانے کے لئے آئے ہیں
پھونک دے پھونک دے پروانوں کو ڈر کس کا ہے

بار بار آپ جو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں
کہئے سرکار یہ خط پیشِ نظر کس کا ہے

گوشہ گوشہ ہے تجلی سے منور دل کا
آہ یہ میرے تصور میں گزر کس کا ہے

کس کی جرأت ہے نکالے ہمیں مے خانے سے
پینے والے ہیں ہمارا ہے یہ گھر کس کا ہے

آہ رحمت کی گھٹا چھائی ہے ہر سو شہرت
حشر میں ڈٹ کے پئیں گے ہمیں ڈر کس کا ہے

قطعات

(۱)

مفت بھی ملتی ہے نیکی تو کوئی لیتا نہیں
لے کے پیسے دوڑتے ہیں خار زاروں کی طرف
اتنی تیزی سے برائی کی طرف بڑھتے ہیں لوگ
جس طرح جاتا ہے رکشہ چاند تاروں کی طرف

(۲)

جلکے بھوپو سے کردو یہ اعلان
چنگو منگو چلے ہیں اب جاپان
وہ ترقی کریں گے بزنس میں
ہم چباتے رہیں گے بیٹھے پان

(۳)

نہ تو بوزلزلوں پہ ہے نہ سیلابوں پہ ہے قبضہ
ہوا پر کچھ تسلط ہے تو اونچی بات کرتا ہے
کہا کرتا ہے میں چھا جاؤں گا دونوں جہانوں پر
وہ انساں ہے مگر شیطان کی سی بات کرتا ہے

(۴)

تمام کوششیں ہیں چاند پر پہنچنے کی
ہر ایک ملک ہے اس کا متمنی و خواہاں
ادھر سے جائیں گے روسی اُدھر سے امریکی
سنا کیا ہے وہاں کی مشاعرے ہیں کہاں

ں فریب رنگ و بو کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
واہ ری دنیا تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

پہنچ ہی جاتے ہیں تیرے آستانے کی کشش
ورنہ ہر اک در کو ہی کعبہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

ات اس کا اصل میں ہے سراب زندگی
عیش و عشرت کا جسے دریا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ر گزری جس پہ تیرے خود سروں کی داد دی
ورنہ اپنے عشق کو رسوا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بد نظر سے چھٹ دنیا نظر آنے لگی
جب گلشن کو غلط دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

وشوق دید میں یہ منزلیں بھی آئی تھیں
جب ترے جلووں کو ہی پیدا سمجھ بیٹھے تھے ہم

آشیاں جلنے سے جدت یہ بھرم بھی کھل گیا
باغباں کو ورنہ خود اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

افکار نو

یٰسین مشہود۔ ناگ پوری

تضمین بر غزل حضرت شفا گوالیاری

مرحبا دیوانگی فرزانگی تک آ گئے
کاروان بردوش ہو کر رہبری تک آ گئے

مل گئیں منزل کی راہیں روشنی تک آ گئے
توڑ کر ہم بے خودی کی حد خودی تک آ گئے

موت سے کر کے بغاوت زندگی تک آ گئے

حسن پہ قرباں تری حشر طرازی کے نثار
اے حقیقت کوش اس رنگ مجازی کے نثار

جامہ فرمائے محبت چارہ سازی کے نثار
اے فلم عالم تری اس دلنوازی کے نثار

تیرے نزدیک آ کے جیسے ہر خوشی تک آ گئے

شام کے عارض پہ ہے کیوں صبح نو کا انتظار
بے شباب انگیز کیوں تصویر عالم کا اُبھار

کیوں بجھا بجھا ہے صبا کے دوش پر بوئے بہار
کیوں فضاؤں میں نظر آتے ہیں جلووں کے غبار

کیا ہوا خود مشید گرد آدمی تک آ گئے

چین میرا جذبۂ سجدہ نہ دل پائے گا
موسم گل اک نیا انداز لے کر آئے گا

عشق کی محفل میں ساغر حسن کا لہرائے گا
اب محبت کا ہر اک زخم آئینہ بن جائے گا

آج ہم ان کی نگاہ بے خودی تک آ گئے

سرخی سہرا منزل ہیں تمناؤں کے داغ
بادۂ الفت سے ہیں ہر زخم آرزو کے ایاغ

بن گیا مقتل ترا ہر گام ہے میرا سراغ
شاعروں کی راہ میں کرتے ہیں روشن چراغ

اے فنا ہم بھی مقام زندگی تک آ گئے

قمر جلالی کی غزل

فضا بھیگی ہوئی ہے، سبزہ بھی جھومنے لگا ہے
ہوا ہے ساقیٔ رنگیں کی ہم کو یاد آنے لگی
بڑی بے تابیاں ہیں بھری ہوئی میں مست ہو جانے کی
اگر موسم یہی جلد رہا تو دنیا خیر ہو جائے گی
شریعت کے کشتہ کا ہو گئے تھے یہ اے زاہد
ادھر میں مسکرایا ادھر تو نے مسکرائے گی
یہ مانا مست ازل ہوں ابد تک ہے مری مستی
اگر موت آئی بھی کہ تو تیرے خانے میں آئے گی
اگر جو بھی گا ستانہ کبھی مستی میں ساقی اس کے
تو کیا ہو جائے گا زاہد یہی کہ خیر ہو جائے گی
قمر ہر شعر میں میرے نئی مستی کا عالم ہے
غزل یہ دیکھ کر زاہد کی توبہ ٹوٹ جائے گی

منظر لکھنوی کی غزل

ہر شخص نے زمیں کو ٹٹولا ہر آسماں چھانی ہے
پھر بھی ہر ایک جا گئی اک کمی سی محسوس ہوئی ہے
ہر شے میں تیری نقصاں ہے ہر شے پہ جوانی آئی ہے
یاد وقت نے اپنا رنگ بدلا یا آپ کی یہ انگڑائی ہے
پھر بھی دنیا ایک جا گئی ہے پھر آج وہی تنہائی ہے
پھر آنکھ بھاری پُرنم ہے، پھر یاد کسی کی آئی ہے
کل تک جو ان گلشن تھے ہیں آج وہی زنداں میں
کب اس نے کسی کا ساتھ دیا یہ وقت بھی اک ہرجائی ہے
کہتے ہیں بہاریں آئی تھیں ہم نے تو مگر یہ دیکھا ہے
ہر گل کی آنکھیں پُرنم ہیں ہر ایک کلی مرجھائی ہے

نظر لکھنوی کی غزل

دل نامراد نے کچھ ہے کیا
ہزاروں داغ نے کر لیے ہیں
قفس کی زندگی کیا پوچھتے ہو
غم پرواز نے کر ہی رہے ہیں
حکم کیا، ترنم کیا غزل کیا
تیری آواز نے کر ہی رہے ہیں
کئی فنوں کا دم گھٹنے لگا ہے
شکستہ ساز نے کر جو رہے ہیں
غم انجام کو صورت آگئی ہے
حسین آغاز نے کر ہی رہے ہیں
اگر پوچھیں ہے فکر دنیا
غزل کا ساز نے کر ہی رہے ہیں

جلال و جمال

حبیب الرحمٰن راہی بالاگھاٹی

تمہارے گیسو، تمہارے عارض، کروں تپش اضطراب دیں گے
کسی کی آنکھوں کو اشک دیں گے کسی کی آنکھوں کو خواب دیں گے
کرم ہے یہ انتہا تمہارا، مگر ستم کی بھی حد نہیں ہے
پھر اس پہ بھی تم حساب لو گے تو خیر ہم بھی حساب دیں گے
کسی نے پوچھا کہ کون ہیں ہم تو ہنس کے کہہ تم بتا ہی دو گے
کسی نے پوچھا کہ کون ہو تم تو آہ ہم کیا جواب دیں گے
شکستہ پیماں کو ضبط گر ہے تو ناتوانی ہی کا شیوہ
کیا کا کوئی حساب دیں گے وہ کیا بھی کو شباب دیں گے
ابھی نہ چھیڑو کہ دل بھرا ہے ہمارے دل میں وہ آئے ہیں
گے نشتر آبدار بن کر پیام مضطر جواب دیں گے

حبیب الحمید اثر۔ راجپوری

تو ہے وجود میں پنہاں ہے قوتِ شاہیں
ہو خیال سے اونچا مقام پیدا کر
زبانِ حال سے کہتا تو سب کو آتا ہے
نظر سے صورتِ عزتِ پیام پیدا کر
اگر بلند ہے پرواز تو عزیز ہو جانا
تو دل میں جذبۂ درد و عوام پیدا کر
خدائے وقت ذلت جائے عظمت سیتا
یہ راہ توں کا زمانہ ہے رام پیدا کر
جہاں جہاں ہیں کمال فن ہے اثرؔ
کوئی کلام ہے جو خوش کلام پیدا کر

لطف بارونی۔ مالیگانوی

صبح وہ جس کی آرزو ہے بہت
اس زمانہ میں وہ سحر نہ ہوئی
یہ بھی انداز ہے تغافل کا
مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
قابلِ داد ضبط ہے میرا
دل پہ اک آنکھ تر نہ ہوئی
حال کے رنگ و بو میں کھوئے ہیں
اپنے انجام پہ نظر نہ ہوئی
انکھیاں سب پہ پیار آتا ہے
اپنے کہ پہ نظر نہ ہوئی

طرحدار قریشی حیدرآبادی

بزمِ مسالمہ ناگ پور

ایک شان دار عمارت ہے جو مسالمہ شریف کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت مرحوم کی بنائی ہوئی ہے جو تقریباً پانچ سال پہلے منشی صاحب مرحوم نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اول اول اس درسگاہ میں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اب اس نے باقاعدہ مڈل اسکول کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور شہر کے متعدد طلبا دینی و دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اس درس گاہ کا انتظام ایک ٹرسٹ کمیٹی کے زیرِ اہتمام ہے جس کے صدر نائب عالی جناب حاجی عبداللہ میاں جی صاحب ہیں۔ درس گاہ کی عالی شان عمارت موضع پورہ کے اس وسطی علاقہ میں واقع ہے جو منڈی چوک کہلاتا ہے۔ اطراف و اکناف میں شان دار دکانیں ہیں۔ دونوں طرف سے دو بڑے بین روڈ گزرنے کی وجہ سے روزانہ صبح سے رات کے دو بجے تک لوگوں کی چہل پہل رہتی ہے اور یہ منڈی چوک عوام کی تفریح گاہ بن گیا ہے۔

آج مجھ کو ماہِ محرم الحرام کی سات تاریخ مطابق ۳۱ مئی ۱۹۲۳ء ہے۔ مدرسہ کی جانب سے شہر میں اعلان کرایا گیا ہے کہ روایات سابقہ کے مطابق امسال بھی مدرسہ ہذا میں ایک شان دار طرحی مسالمہ کا انعقاد ہوگا اور اس کی صدارت ملک ناموَر و ممتاز اُستاد سخن حضرت مولانا آبر حسنی گنوری فرمائیں گے ۔۔۔!

مدرسہ کی عمارت کو رنگ برنگی قمقموں اور رنگ برنگ جھنڈیوں سے خوب سجایا گیا ہے۔ چاندی رات بقعۂ نور بن گئی ہے۔ رات کے نو بج چکے ہیں۔ دور دراز کے شعرِ سخن اور عقیدتمندانِ آلِ رسول کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ صدر دروازہ پر مدرسہ کے اراکین موجود ہیں اور آنے والے معززین شہر کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ ہو چکا ہے کہ [illegible]

حضرت مولانا آبر حسنی گنوری ـــــ ناگ پور کے ایک بزرگ شاعر حضرت مرزا فکر کے دولت کدہ پر قیام فرما ہیں۔ مولانائے موصوف کو لینے کے لئے تانگہ کے خوش فکر و خوش اخلاق شاعر جناب صاحب تمسر کو بھیجا گیا ہے۔ ہدایت اللہ صاحب ہادی چراغ کے جلسے کے سب کچھ ہیں۔ صدر موصوف کی آمد کے لئے چشم براہ ہیں۔ مسالمہ کی کارروائی اور وقت کا اہم انہیں سپرد کئے ہوئے ہے۔

لیجئے وہ مرزا فکر الصمد اور تمسر کے ہمراہ مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ ہادی صاحب مولانا کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھ چکے ہیں۔ صدر دروازہ پر صدر مدرسہ اور اراکین مولانا کا پرجوش استقبال فرما رہے ہیں۔

ہدایت اللہ صاحب ہادی کی تجویز اور اہم الحروف کی تائید کے بعد مولانا آبر حسنی مسند صدارت پر رونق افروز ہو چکے ہیں۔ صدارتی تقریر کے لئے موصوف نے اہلکبر الصوت کو اپنے قریب کرلیا ہے اور سامعین مشاعرہ کے شور کے بعد اپنی تقریر شروع کر دی ہے۔ تقریر کا موضوع "حسین اور اسلام" ہے۔ مولانا کو لوگ اب تک ایک کامیاب اُستاد فن کی حیثیت سے جانتے اور مانتے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی عبقری تقریر نے ان کی ایک نئی شخصیت کر بھی [illegible]

تقریر فرما رہے ہیں مولانا ؛؛

تقریر کو آدھ گھنٹہ ہو چکا ہے۔ سامعین شعور سے شہادت کے موضوع پر استفادہ کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ مولانا نے بھی اسے محسوس کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابھی وقت کافی ہو چکا ہے۔ اس لئے سلام خوانی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ لہٰذا "خیالِ خاطرِ احباب" کو ملحوظ رکھتے ہوئے جناب محمد حسین صاحب خاطر کو زحمت دیتا ہوں کہ وہ خوش الحانی سے سلام خوانی کا آغاز فرمائیں ـــــ

خاطر صاحب مائک پر تشریف لائے ہیں۔ خود شاعر نہیں ہیں۔ شوقیہ طور پر اپنے نام کے ساتھ خاطر کا لیبل لگا لیا ہے۔ میر تقی میر کی نعت خوانی اس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ نعت پاک کا ہر مصرع محترم ہے۔ سامعین میر کا پاکیزہ کلام سماعت فرما رہے ہیں۔ سخن فہم حضرات نے حرفِ بوالہوسی کا تصور کر لیا ہے۔ منزل بڑی دشوار ہے۔ اس منزل کی رہنمائی کے لئے جناب حامد ناگپوری کو آواز دی گئی ہے۔ سنئے حامد صاحب کہہ رہے ہیں آپ۔ مصرع اٹھا رہے ہیں ـــــ

"محبت کے لئے دل خاص ہونا چاہئے"

پر سلام ہمت افزا فرما رہے ہیں۔ آپ کی [illegible]

خصوصاً [illegible]

کہ [illegible]

زمین و آسمان دونوں جا محشر ہی محشر تھا
خضر صاحب نے کا رخ کربلا کی طرف کر لیا
موضوع کا رخ موڑ دیا ہے۔ میدان کربلا کا نقشہ
سامعین کے ذہن و تصور میں آ چکا ہے بیت اسی
کی طرف ہے کہ کوئی توانا و تندرست نوجوان اس
میدان میں آ کر اپنی نصرت و کامرانی کا نعرہ بلند کرے
اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے جناب عبدالحی صاحب
ناصر سامنے آ رہے ہیں۔ مردم شناس اناؤنسر نے
ان کی ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا ہے ارشاد ہوا ہے
کہ اب ناصر صاحب اپنا کلام جوہر دلاویز پیش فرمائیں گے
ملاحظہ فرمائیے ؎

پیام منظور ہے اللہ کو قدرت کے کام آئے
یہ بازو ہے فاطمہ کے لال کا آزما مقدر تھا

دور حاضر میں اہل بیت کے دشمنوں میں رقت پیدا
ہو چکی ہے ہر طرف ایک سکوت نظر آ رہا ہے۔ ہر
شخص ندامت کے تصور میں گم سم ہے۔ کاروان
ارادت حسینؑ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے حزن و
ملال کے بادل چھائے ہوئے ہیں، اندیشہ ہے کہ
ایسے عالم میں عزاداران اہل بیت کا یہ جلوس کارواں
منزل تک پہنچ جائے، ضرورت ہے اس کی رہبری کے
لئے کسی بے باک خضر راہ کو یاد کیا جائے۔ اناؤنسر
نے اس خدمت کے لئے ایک ایسے خضر وقت کو آواز
دی ہے جو سرسبز پاؤں تک بیابانی ہی بیابانی ہے
اور یہی جناب خضر ناگپوری۔ آیئے خضر صاحب
سلام کریں کا کبھی جب پہ ہوں منظر تھا
کعبے کے ہاتھ میں خنجر تھا کوئی زیر خنجر تھا

سبحان اللہ کیسا اچھا مطلع ارشاد فرمایا ہے
خضر صاحب نے۔ داد و تحسین کی آوازیں بلند ہیں
اور شاعر خضر فرما رہے ؎

وہ ایک کام کہ جس کا کہیں پتہ نہ تھا
وہ کام کرنے کو خضر زیر خنجر تھا

خضر کے اس شعر پر تو کہنہ مشق بھی چونک گئے ہیں
شعر ہر لحاظ سے مکمل ہے۔
خضر کے کلام نے محفل میں کافی گرمی پیدا کر دی ہے
مشاعرہ ہدایت کے بام چھلکانے کا اچھا وقت ہے
اناؤنسر نے فرست پر خیابانہ نظر ڈالی ہے اور
ایک ایسے شاعر کو بھانت نکالا ہے جو اپنے تن و توش
اور شعری نسبت کے لحاظ سے نہایت موزوں ہے یعنی
جناب ساشد ترپتی بانکے سنبھال رہے ہیں۔ سنئے ساشد
صاحب کو ؎

اے یار رحم تجھ کو پیاس پر آل محمد کی
قسم ابن عمر تیرا کیجیو تھا کہ چنجر تھا

محفل پر سکوت طاری ہے۔ ساشد صاحب کا کلام
نہایت پر سکون فضا میں سنا جا رہا ہے۔ محفل شعور و فن
میں سامعین کا زیادہ سکوت بھی شاعر کی ہمت پست
کر دیتا ہے۔ اس سکوت کو توڑنے کے لئے ایک ایسے
منچلے شاعر کو بلایا جا رہا ہے جو اپنی ظاہری سج دھج
کے اعتبار ہی سے نہیں۔ بلکہ لہن و لہجہ کے لحاظ سے بھی
پورا چوکس ہے یقین ہے کہ اس کا نیم اس تمام محفل کے
سکوت کو توڑنے کا ضامن ہوگا۔ ضامن صاحب
ناگپوری!

ضامن صاحب نے اسٹیج پر آتے ہی سامعین کے
ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑا دی ہے بسم اللہ ارشاد ہوا ہے
نہ اس کا کوئی ثانی تھا نہ ان کا کوئی ہمسر تھا
کہ جن کا نام نامی فرزند آدم ابن حیدر تھا

داد و دہش والوں کا لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا
ہے کہ یہ داد نہیں بیداد ہے ایک صاحب آہستہ
سے فرما رہے ہیں کہ ــــ "فرزند آدم" اور "ابن حیدر"
کس کا نام نامی تھا؟

ضامن صاحب اسی فضا میں مائک چھوڑ چکے ہیں
اب اس مشاعرہ کو داد دیجئے کے لئے جناب شاکل
بانکپوری کو زحمت دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہر سر جھکا کے کہتا تھا کیا وقت میر تھا
فاتح امت احمدی کا ظرف یہ تحمل تھا
مناسب داد دل رہا ہے۔
جھکتا جادۂ صبر و رضا کی سمت پر کیونکر
امیر بے بدل جب کاروانِ کل چلا تھا

پر مذاق سلام اچھا ہے۔ سامعین نے داد کی کافی
حوصلہ افزائی کی ہے۔

اب اناؤنسر کی نگاہیں ایک معنی خیز مسکراہٹ
کے ساتھ برابر ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مجاہد صفت
جوان کے چاکلیٹ کلر کے ہیرے پر پڑ رہی ہیں اور کہا
جا رہا ہے کہ وقت سلام اور منقبت کے موضوع پر
قلم اٹھاتے وقت جیش تحریر میدان چھوڑ کر بھاگ
جاتے ہیں۔ لیکن جس پہلوان سخن کی اس وقت للکارا جا رہا
ہے وہ میدان چھوڑنے والا شیر نہیں ہے۔ جب مرکز
سخن میں نبرد آزما ہوتا ہے تو فوجوں کو تہ تیغ جا کے
بلکہ دیکھنے والوں کو بھی اپنا ہم جنس بنا لیتا ہے۔ طنز و
مزاح کا یہ بادشاہ اپنے ہم عصروں میں منفرد کلر رکھتا
ہے۔ نام پر نہ جایئے اس کا نام اس کے کام سے بالکل
مختلف ہے۔ ایسا متصف الصفات جناب ہدایت اللہ
صاحب ہادی کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟ ہادی صاحب
کا نام سنتے ہی محفل سنبھل گئی ہے۔ دیکھئے کس ادا کے
ساتھ فرما رہے ہیں ؎

علی کے شیر پہ باندھا تھا تیغ زن کی
وگرنہ سارا لشکر ایک خیبر کے برابر تھا

دوسرے مصرعے نے سامعین کے ہونٹوں پر تبسم کا لہر
دوڑا دی ہے اور سنئے ؎

حسین ابن علی کی تیغ اندازی کا کیا کہنا
پڑا اک ہاتھ تھی جس پر ہدیٰ کی فوج لشکر تھا

سارا محفل منقبت نادر بن گیا ہے۔ کون ہے جو
اس بگڑتی ہوئی فضا پر قابو پائے اور محفل میں اپنی
سنجیدگی و متانت برقرار رکھے۔ اناؤنسر نے بہت

سرپرستی کرتے ہیں۔ نظام حیدرآباد کے
نائب اللہ سرزمین دکن مرجع ارباب ہنر تھا
شب عشر کا سینہ جب چیرا تھا شب تم سے
نمود صبح کا منظر، طلوع صبح محشر تھا

حسن نظم حضرت کو داد تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ قت الفاظ میں پڑھ رہے ہیں۔ پڑھتے ہیں ایک خاص وقار ہے۔

تسلیم صاحب کے بعد مدرسہ ہذا کے صدر مدرس جناب شاہ میر خاں صاحب تیر تشریف لائے ہیں، انھوں نے دوسرے مصرع طرح

"تشنہ لب، زخمی بدن، صبر و رضا والے چلے"

پر طبع آزمائی کی ہے۔ بہت صاف شعر کہتے ہیں خصوصاً اس شعر کو کافی سراہا گیا ہے۔

سر میں سودائے شہادت لب پہ ہر تشنگی
حوض کوثر کی طرف یوں مصطفےٰ والے چلے

رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی ہے۔ سوز و ساز کے ساتھ نغمہ افشانی کا بہترین وقت ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ کسی مترنم شاعر کی آواز دی جائے۔ ناظم نے تنویر ناگپوری کا نام پکارا ہے سنئے تنویر صاحب کا کلام۔ انھوں نے بھی دوسرے مصرع پر فکر فرمائی ہے

فاطمہ زہرا کے پیارے صاحب جان علیؓ
مشکلوں کو بھیجئے مشکل کشا والے چلے

شعر صاف اور اچھا ہے داد سنئے

اپنے خون پاک سے طوع زمیں پر دائمی
چھوڑ کر نقش صداقت کربلا والے چلے

سبحان اللہ کتنی قدامت ہے اس شعر میں تنویر صاحب نے بھی اچھی داد حاصل کی ہے۔

پچھلے سال آپ کے جانے پہچانے مزاح نگار شاعر جناب [illegible] تشریف لا رہے ہیں۔ سنئے کیا فرما رہے ہیں؟ ترنم صاحب سے

[illegible]

وہ بھی تشنہ لب چلے ہیں جو کہ سرچشمہ
اچھی داد لے رہے ہیں۔ لیکن ان کا سلام ان کے مزاح شاعری کے موافق نہیں ہے، وہ پہلے بھی مزاح سے ہٹ گئے ہیں۔

محض ہی کسل و جمود کے آثار نمودار ہو چکے ہیں ضرورت ہے کہ شراب انگبیں کا دور چلے۔ ایسی ضرب جو قدح خوار ان محبت اہل بیت کے مسلک میں جاں بحق اس جام کو گردش میں لانے کے لئے ایک پختہ شاعر رند مشرب کو منتخب کیا جا رہا ہے جو نہ صرف اپنے تخلص کی رعایتوں کا دور نشہ دار رہے۔ بلکہ اس مسلک کا سچا سلیقہ کار بھی ہے اور اس فاقہ کا مزہ وہی کے ساتھ میں بڑا فیاض بھی۔ صرف ظرف ہے کا کچھ ہم سب کو پلائے گا۔ آیئے پیکش صاحب! ۔۔۔ جناب پیکش ناگپوری ؎

سرخ روئی کے لئے صبر و رضا والے چلے
وا زر کر بلا میں مصطفےٰ والے چلے

شعر و از بات شعری سے معمور ہے بڑے ٹھسکے سے مطلع کہا ہے پیکش نے، پورا سلام اسی ٹھسکے کا ہے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ۔۔۔

زہد و رند کا تفاوت بل بھی کبھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ آج کل کی محفل اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی شائستہ محفل ہے، اس لئے اس خطرہ کا مطلق گمان نہیں۔ پیکش کے بعد رند مشرب شاعر کو بلایا گیا ہے۔ سنئے اب مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں

سمجھ کی میں نہیں آتا کبھی یہ بات تیغ
سر اقبال کے جھکتے جو سر شوں پہ بشارت

مولوی صاحب نے پہلی ہی صف سے سلام پیش فرمایا ہے۔ سلام کا [illegible]

اب آپ کے [illegible]

[illegible]

...ہے۔ مطلع ...

پکے ...ی نظر ہے دونوں جانب کا یہ نظارہ
ادھر ہے کفر پیہم، اور ادھر ہے ایک پیغمبر

یکایک ...نے کیسے مصرعے کا مطلع چھیڑا ہے حکیم صاحب نے۔ اس وقت دو حقیقتوں کی زد میں سلیقہ و شعور بھی شامل ہو تو پھر گفتگو کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ دیکھئے جناب حضرت شعلہ کا پیش کردہ شعر حکیم صاحب یہاں کہ پہنچ کر شعلہ بن گئے۔ بڑے ہی پختہ قسم کے شعر فرماتے ہیں۔ تشریف لائیے شعر و ادب صاحب ؎

ادھر تھا حق کا شیدائی ادھر باطل کا لشکر تھا
ادھر تھا خیر کا پانی، ادھر پیکانہ شر تھا

مطلع پر اچھی داد پائی ہے۔ حسن مطلع ملاحظہ کیجئے کہ دونوں مصرعوں کا ڈھانچہ ایک ہی ہے۔ ؎

کچھ ایسا مرتبہ شبیر کا اللہ اکبر تھا

اب بندۂ ناچیز راقم الحروف کو دعوت شعر خوانی دی ہے، کیا پوچھئے کہ چیز خوانی کی ہے کیسے قدر دانی کی بات سے نوازا ہے سماعت فرمائیے ——— دوسرا شعر تو خیر جانے بھی دیجئے کہ کیا بن جائے ——— مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

فساد شر و شیطاں اصل میں امر مقدر تھا
کہیں تسخیر تھی یکجہتی کہیں قسمت میں پتھر تھا

اپنے بارے میں کچھ کہنا اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف ہوتا ہے۔ شعر سنئے شاید کسی قابل ہو۔ پڑھا کہ اپنی موجیں جانب تشنہ لباں کیوں کر
فرات اس وقت خود اس تشنگی کا ان پہ قرضہ تھا

قرضہ اتارنا ہے! ——— کرم ہے مہربانی ہے ——— شکریہ!!

اب سنئے اپنے شہر کے رنگ شاعر حضرت ناظر ...ام کی جماعت میں داخل کر کے کچھ حصہ قدیم فرمائیے ہیں ؎

جسم نازک تھا مگر سینہ پہ پتھر تھا
پناہ اسلام کو دی جس نے وہ سینہ پیمبر تھا

مطلع سن کر داد کا ایک شور اٹھا جو کافی دیر قائم رہا اور سنئے ؎

وہ حسین لم یزل تھا مگر وہ حسین پیمبر تھا
قیامت ہے کہ تیرہ پر اسی معصوم کا سر تھا

اور پھر تالیوں سے ہال بہت دیر تک گونجتا رہا۔ فوراً حضرت ناظر نے کافی داد حاصل کی۔ ہر شعر کو کر پڑھا گیا۔ محفل کا رنگ جما گیا ہے اور اٹھئے داد دیجئے گئے ہیں ———

اب صدر مشاعرہ کے علاوہ دو مقبول ترین شاعر اور رہ گئے ہیں۔ یہ وہی شاعر ہیں، جن کے بغیر کوئی مشاعرہ، مشاعرہ نہیں سمجھا جاتا ——— آسمان کی چاند بار بار دیکھئے، مطلع بالکل صاف ہونے کے باوجود آسمان کے تاروں کی روشنی مدھم ہو چکی ہے ——— اپنی زمین کے روشن ستارے کی گرانقدر خدمات فرمائیے ——— واہ کون! ——— حضرت آذر سیمابی!! ——— آیئے تبسم فرمائیے! ؎

سلامی کس جا کا مستحق ابن حمید تھا
زمیں کی گود میں تن تھا ہوا کے دوش پر سر تھا

کیا کہنے ہیں آذر صاحب ——— مکرر ارشاد فرمائیے بڑا معیاری مطلع فرمایا ہے حضرت آذر نے۔ شعر سنئے ؎

حسین ابن علی کی طرز نوشی کا کیا کہنا
نظر پیاز تسلیم دل پیمانہ کوثر تھا

سبحان اللہ کیا پیارا شعر فرمایا ہے۔ جس کی نظر پیاز تسلیم، اور دل پیمانہ کوثر ہو، حقیقتاً اس کی طرز نوشی کا کیا کہنا ہے۔ یہ آپ رسول ہی کا حق تھا ———

اب آج کی محفل کے آخری شاعر حضرت قمر نگہت کو زحمت دی جا رہی ہے۔ حضرت قمر سے مستفیض کیا جائے۔ موصوف اپنے نام اور کلام دونوں حیثیت سے محروم الصوت ہیں۔ [illegible] سلام تحریر پر [illegible] کا مصرعہ [illegible] مولانا شبیر تحریر [illegible] کیسی بھی اور کیسی تشبیہ کے ساتھ سلام فرمایا ہے حضرت حمید کے! تبھی تو کوئی شعلہ جمالی حسین اکبر ہوتے ——— حضرت اکبر بھی بھی بھی ہوتے ——— بہرحال اللہ! ایسا شعر کوئی پختہ مشق شاعر ہی کہہ سکتا ہے اور سنئے ؎

خود ہی سے باخبر تھی وہ جمالی ذات کبریٰ کی
تمام معرفت تھا پیرو حدت کا مشاہد تھا

بے شک! ——— حسین کہئے کہ اس وقت محفل کا رنگ کیا ہوگا۔

بندہ ناچیز اسی انداز کا قطعہ مسلسلہ کا شباب انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ رات کا کافی حصہ گزر چکا ہے اب صرف صدر موصوف کے کلام بلاغت نظام کی باری ہے۔ موصوف کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہیں ہے بندہ پاکٹ کے کرشمہ کہنے میں آپ کے جانثار ماننے والوں کی کثرت ہے۔ ان کی شعری و فنی حیثیت مسلم و مستحکم ہے سنئے حضرت مولانا آپ سے ان کا استاذ کلام ؎

پسند آئی تجھے جس کو موت باطل کی فنا ہے سے
حسین آزادیٔ انساں کا وہ پہلا پیمبر تھا

کیا کہنے ہیں قبلہ ——— سبحان اللہ سبحان اللہ۔ مکرر ارشاد فرمائیں! ——— ضرور ارشاد فرمائیے چند ہے۔

فساد و اختلاف و جہل و بیداد و ستم کی
دیار حریت کے جانے کیا کیا ہو گئے تھے جہاں فرقہ

ایسا شعر صرف ایک محنت ہی کہہ سکتا ہے اور اس پر بے نیاز تحسین ہے۔ سامعین نے داد سے اور کچھ فرمانے کی فرمائش کی ہے۔ موصوف اپنا دوسرا اور شاعر فرما رہے ہیں ؎ [illegible] سلام [illegible] کا [illegible] ہو چکا ہے [illegible] ارشاد فرمائیے

تحریر: کنیز امروہوی

پگھلتے پتھر

وہ سخت بے چین تھا۔ ..... وہ اس کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے وہ بار بار پڑھ رہا تھا اور اس تحریر کی سطروں سے گھبرا کر وہ کبھی کبھی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مسلسل ایک گھنٹے سے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ کل شام وہ اپنے ہاتھوں میں سونپ دی جائے گی۔ وہ اپنے ارمان دیکھے ہاتھوں میں اس کی سسکیاں دم توڑ دیں گی اور وہ اس گھر کی چار دیواری سے ..... نئے گھر کے آنگن کی پاکدامن اور آزاد فضا میں اڑھکیل دی جائے گی۔ کیا اس کو اپنی زندگی بنانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کو اپنا فیصلہ خود کرنے کا کوئی اختیار کوئی ضرورت نہیں ہے ..... ؟

وہ مسلسل ایک گھنٹے سے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ تمام آسمان کہکشاں کی جگمگاہٹوں سے مزین نظر آ رہا تھا۔ چاند کس قدر دلکش اور دلچسپ لگ رہا تھا۔ فضا میں کس قدر نغمگی، اچھوتی اور انجانی سی لگ رہی تھیں اور خوشیوں اور مسرتوں کے ہزار سیلاب فضا میں اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ کیوں ..... ؟ آج جیکا متبرک دن ہے، چاہنے والوں، پیار اور محبتیں جان ہونے کا دن ہے۔ یہی وہ ان تمام خوش آیند تصورات سے گریزاں، ان چمکتے دمکتے ستاروں سے خائف، چاند کی کرنوں شاعروں سے بے نیاز۔ فضاؤں کی نشیلی کیفیات سے بے پروا شاہدہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کس طرح شاہدہ کو فریبیاں دے سکتا ہے ؟ یہی ایک اہم سوال اس کے ذہن میں ناچ رہا تھا۔ وہ بری طرح لرز اٹھا۔ لیکن وہ اس قدر بزدل اور کم ہمت ہے کہ وہ ایک کنواری اور معصوم لڑکی کو برباد ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ وہ اس کی معصوم اور خوش بھری باتوں کو نہیں بھول سکتا۔

شاہدہ جو اس کو بے پناہ چاہتی ہے، بے اندازہ پیار کرتی ہے۔ وہ اس پیار کی تڑپ میں بے تاب ہو گیا۔ اور وہ اس پیار کی پاکیزگی کو کھلتے دیکھ رہا تھا۔ تباہی اور بربادی کا خطرہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے اعصاب

میں اُلجھاؤ آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ کیا نہ کرے ؟ ؟

شدت غم سے اس نے اپنا ماتھا ایک شکستہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ دوسرے لمحے وہ چونک پڑا ..... سامنے اتنی کھڑکی تھیں، مگر اس کو خیال آیا، وہ یہاں کیوں ہے ؟ لیکن اتنا سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ شریر اور دلکش آواز میں پوچھ رہی تھی۔ "کیا سوچ رہے ہو تم ؟" وہ پھر بھی گم صم کھڑا رہا۔ اس کے چہرے سے شکستگی نمایاں تھی بال اُلجھے تھے۔ لباس پُر شکن تھا۔ حتیٰ کہ اس کے دل و دماغ بھی اس حالت کے غماز تھے۔ جواب نہ پا کر اتنی پھر چیخی۔ "ننھی بھائی گئی باندھ سے دودھ لا دے" وہ پھر بھی خاموش رہا۔ جھنجھلا اتنی قریب آئیں۔ کہنے لگیں "ارے بچے شاعری کا وقت نہیں ہے۔ شادی کا وقت ہے آخر کچھ کہتا ہے کہ نہیں ....." وہ بھڑک اٹھا، لرزتے کانپتے لہجے میں بولا۔ "امی پریشان نہیں ہونگی"

"کیوں ..... ؟ امی بڑبڑائیں۔

"بس میں نے کہہ دیا ....." یہ کہتا ہوا بیرونی دروازے اور کھڑکیوں سے گذرتا ہوا جانے کہاں جا پہنچا۔ جانے کن منزلوں کی تلاش میں گم ہو گیا۔ شب کے اُجالے بھری تاریکی میں ہزار قندیلیں، سرگوشیاں اور نغمگی اداسیوں کا پتہ پوچھتیں۔ مگر وہ ان تمام سے بے نیاز کیا سوچ رہا تھا ایک بار پھر شاہدہ کے بارے میں سوچنے لگا ..... اس کے دشمن سے ہار دینے کی جگہ ابھر رہی تھی۔ میں مر جاؤں گی ..... ؟ اس کو شاہدہ کی زندگی، کا پتہ

سرگوشی اب تک یاد تھی۔ "میں مر جاؤں گی ....." وہ اس سرگوشی کے درد کو، چیخ کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس کو اپنے دامن پر ایک نئے خون کا دھبہ لگتا تھا۔ لیکن اس نے ابھی تک کوئی ایسا سنگین قدم نہ اٹھایا تھا جس سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ وہ بہت پہلے جان چکا تھا کہ یہ شادی یہ رشتہ یہ ابدی انسان شاہدہ کو قطعی پسند نہیں..... وہ شاہدہ کی ذہنی پستی صاف صاف آنکھوں کو چھلکتے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاہا بھی تھا کہ وہ اس سے کہے، اُسے سمجھائے "شاہدہ اب بس کرو۔ اس جاؤ کہ یہ اس سماج کا آخر ظلم ہے جہاں انسان کے اپنے تمام جذبے بے آواز اور بے رنگ ہو جایا کرتے ہیں۔ جہاں اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا ..... نہیں زیادہ کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کسی کی زندگی برباد ہو کر آباد ہو، کوئی جان سے جائے یا رہے ؟ ٹھنڈے دل سے تو ہمیں اپنا فریضہ، اپنا انداز فکر، تربیت اور کامیابی کے دعوے ہی دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کبھی کی شام اتنا کیوں سوگوار ہو گئی ہے ؟ کسی کی زندگی برباد ہو کر آباد۔ کوئی جان سے جائے ..... انہیں نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی اپنی خوشیوں، ارمانوں اور آرزوؤں کو دم توڑتے، حسرت بھری نگاہوں، لرزتے ہوئے آنسوؤں سے دیکھ رہا ہے، اپنے ارمانوں کے مرغزاروں کو جلتا، برباد ہوتا دیکھ رہا ہے۔

کیوں کہ ہر خوشی کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں، کچھ لوگ

ٹی ہاؤس سے، کوفی ہاؤس سے، شاعروں سے، سب کچھ سے کترا کر بڑھاپا سال دو سال کے لئے دیکھنا چاہتے ہیں جس کی جڑیں اس دور کے وجود میں گڑ جائیں جو کوئی ہنگامہ کوئی طوفان کبھی نہ دیکھ سکے۔ انہیں اس کا کیا پتہ کہ کتنے غریب بے گھر ہو رہے ہیں۔ کچھ مستقل سہی ذہنی ہمیشہ کے لئے مجرموں کی محفل میں گھٹ کر دم توڑ رہی ہیں اپنی جوانی کے رد ہونے خوابوں کا ماتم کر رہی ہیں۔ لیکن کوئی کسی کی کراہ نہیں جانتا۔ وہ کالم نہیں لکھتا۔ بس سب کچھ چاہتے ہیں کہ گھر کے آنگن میں آگ بہار یہاں رہے پھر خوشیاں ہوں، مسرتیں اپنائے، بہار بن کر آئے اور رقص کرتی ہوئی اس نئے ماحول کا نظارہ بنا دے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس سراپا پیار کے حوالے میں ایک زخم چھپا گیا، ایک گہرا گھاؤ آگیا ہے۔ ایک نظر جو نئے خیال دے گیا ہے۔ وہ اس وقت قدرتی خیال کی کسک، جلن، چبھن سے کس طرح بچے۔ کس طرح اپنے سنجیدہ چہرے پر شوخیوں کے چراغ جلائے۔ کس طرح مسرتوں کے خزانے لٹائے؟ وہ سمجھی نہیں سکے گا کہ ہر ماں کا اپنا ماحول کیا ہے۔ اور کس ماحول کو اپنانے میں ماں کے اپنے اندر کتنی خامیاں ہیں اور کتنی اچھائیاں کہ بچا سوچ سمجھ کے اپنا سکے۔ وہ اپنی وضاحت خود نہیں کر سکتے۔ دوسروں سے اپنی خامیوں کی بھیک مانگتے ہیں، بزدل..... بے سلیقہ انسان..... وہ ایک بار پھر لرز کر رہ گیا۔ سامنے اس کا اپنا دوست آفاق کھڑا تھا ــــ!

ایک لمحے کے لئے وہ سوچ میں ڈوب گیا، جانے وہ کیا سمجھے گا، کم ظرف، بزدل، بے مروت ــــ لیکن لمحے آفاق وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ مزید چونک پڑا۔ آفاق کو کیسے پتہ چلا کہ وہ یہاں ہے؟ پریشان ہے، کچھ سوچ رہا ہے شاید کے بارے میں..... اس کے مستقبل کے بارے میں، اس کی خوشیوں، غموں اور مسرتوں اور گناہ کے مقام کے بارے میں..... لیکن وہ یہ سب کچھ کیسے سمجھ گیا تھا۔ اس نے ایک نظر میں دیکھا

تھا۔ آفاق کسی چہرے پر نہ ٹوٹنے کی طرح چاند خوش نما تھی فریم نہ تھا، ایک ظہور، ایک پُرسکون خلا کا بہاؤ سا تھا۔ ایک سنجیدہ تبسم کا نہ ہونا جو محسوس ہو رہا تھا جیسے سنجیدگی کسی بہت بڑے مسئلے کا ایک اہم سوال ہو۔ جیسے یہ ٹھہراؤ کسی طوفان سے پہلے کا جیسا ایک بار ہو جیسے یہ خاموشی..... کسی تند و تیز طوفان کی گھٹن ہو۔ وہ بڑی مدت تک خوف زدہ رہتا تھا آفاق نے اسے اس حالت میں دیکھا ہے۔ سوچوں میں ڈوبا ہوا..... وہ کیا سوچے گا۔ کوئی غلط مطلب نہ نکال بیٹھے ــــ نہیں، وہ ایسا نہیں ہے، وہ بہت کچھ جانتا، سوچتا سمجھتا تھا ایک ساتھی ہے، وہ آفاق بزدل نہیں ہے۔ وہ اچھی خیال رکھنے والا ایک سچا دوست بھی ہے۔ وہ کوئی غلط اثر ذہن میں نہ بسائے گا۔ لیکن دانشور کی آگ نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ اپنے آفاق کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا ــــ!

آفاق ــــ!! اس کے ذہن میں آفاق کی شخصیت کا پرتو جاگا اٹھا۔ وہ کس قدر عجیب و غریب انسان ہے۔ کس قدر سادہ دل، نیک خصلت اور ملنسار ہے اس کا قصور بس یہی ہے کہ وہ غریب ہے، بے سہارا ہے۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی بے کار ہے اور بے روزگار گلی گلی ــــ شہر شہر دھکے کھاتا مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ قصور نہیں، یہ اس کی جدوجہد، تلاش کا نتیجہ نہیں یہ تو ایک سزا ہے، ایک امتحان ہے ایک موڑ ہے جو اس کو ہر لمحہ ایک نئی منزل، ایک نئے مقام پہ لے جاتا ہے۔ وہ روزگار کے لئے بھٹکا پھرا ہے، وہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے دفتر دفتر خاک اڑاتا پھرا ہے۔ یہ قصور اس کا نہیں جدوجہد کو مشکل اور ناکامی کی داستان ہے۔ یہ قصہ جدوجہد نہ کر سکنے کو شوق کے خمار کے..... یہ تو ایک کھلی فضا گیں کتاب ہے جو شروع سے آخر تک فہم انگیز ہے۔ وہ اس داستان کو فضا کے ابواب سے حال کر نشاط انگیز فسانہ میں ڈھال دے گا۔ یہ تو ایک

جدوجہد کا نام ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ اس کا نام ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ اس کا نام ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ اس

خاموشی سے ایک مقدس فریضہ کی طرح اپنے جذبات پر قابو
کا پتھر رکھ کر اشاعت کرتی اس نے اپنے احساس کی دنیا پر
ہو جاتی ہے جیسی احساس سے یہ دنیا ظاہر کرتی ہے
لیکن کیا ایسا ہوتا ہے ..... ؟ اس کے ذہن میں ایک بے پناہ سوال
ابھرا۔ نہیں، وہ ایک کمزور اور حقیر روایت کی ہے
اچھا بُرا سوچنے سمجھنے کی تمیز کر سکتی ہے۔ وہ اچھے جیسے
احول کو پرکھ سکتی ہے، اپنا حق منوانے کے لئے وہ ماحول
سے بغاوت بھی کر سکتی ہے ..... لیکن وہ ایسا کیوں خاموش
کیوں ہے ..... ؟ وہ اپنے اس حق کے لئے کوئی آواز
بلند کیوں نہیں کر سکی۔ وہ دبی دبی سسکیوں سے اپنی
محبت کے دکھ کا پتا تو کیوں بہا رہی ہے۔ اُسے بڑھ کر
ان حالات کا رُخ موڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنے جذبات کا
اظہار کر دے وہ ان خوابوں کی حقیقت بیان کر دے
جس کے لئے وہ آج تک انتظار کرتی رہی۔ وہ ان لمحوں کا
پھر دیکھ دے جن کے انتظار میں اس نے نہ جانے کتنے
اذیت ناک اور حسین لمحوں کو اپنائے رکھا ہے، ہر ظلم کو، ہر
ناانصافی کو سہا ہے، ہر خواہش کا دم قتل ہے۔ ہر تمنا کو گھٹتے
دیکھا ہے، کیا آج وہ ایسا سب کچھ کر سکے گی، اپنا
اپنا مستقبل بنانے کے لئے اپنے پیار کو بلندی کی منزل پر
لے جائے گی ـــ لیکن نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکے گی، وہ
بھی عام مشرقی لڑکی کی طرح اپنا مقدر، اپنی منزل کھو
دے گی۔ وہ بھی ہمیشہ خوابوں کو اپنائے گی، ہر آرزو، ہر تمنا
کو اپنے ہاتھوں گھونٹ دے گی، وہ بھول جائے گی اس
نے اس کے لئے کتنی قربانیاں دیں، وہ خوبصورت لمحے
کیا اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے جو اس نے
ساتھ بتائے تھے، کیا اس کے لئے وہ لمحے کچھ بھی
نہیں ..... ؟!

وہ بھی بھول جائے گی، ایک فریب انسان کے اپنے
بہت کمزور بنا دیتے ہیں۔ وہ بھی
اپنی محبت کا جرم کر دے گی ..... نہیں ..... وہ ایسا
نہیں ہونے دے گا! وہ ایسا نہیں کرنے دے گا۔
وہ شاہد کو اس مقام تک پہنچنے نہیں دے گا۔ وہ ایک

ایک نئی طاقت سے ٹکرانے کی تباہی سے بچائے
گا۔ آنے والے طوفان کا رُخ موڑ دے گا۔ وہ خود اس طوفان
سے ٹکرا جائے گا چاہے انجام کس قدر بھیانک ہو کیوں نہ ہو
وہ خود اپنے کو اس کے لئے پیش کر دے گا۔ وہ ہر امکانی خطرہ
پر اس کو اس تباہی، ناکامی اور ذلت سے بچائے گا، اس کے
جذبات کی صداقت کے لئے، اس کے احساسات کی خوشحالی
کے لئے وہ ہر مقام، ہر لمحہ کو بھول جائے گا اور کر سکے گا
استحصال میں کون سے معاشرتی اصول ہیں کون سی اخلاقی
بندشیں ہیں اور ماحول اور فضا کی زہر ناکیوں کو خود قبول
کرے گا۔ مگر شاہد کو کوئی حالات بھی تباہ نہ ہونے دے گا۔ وہ ہو
اس کے لئے ..... وہ اسے کرتی رہی ہے۔ ہر قدم پر کام آتی رہی
ہے۔ ہر اچھا برا سمجھتی رہی ہے۔ اور اب وہ اس کی غلطیوں پر
خود نادم ہوتی ہے تو وہ خود محروم ہو جائے گا۔ وہ صاف طریقے
پر اس سے کہہ دے گا۔ وہ مجرم ہے ..... وہ مجرم
ہے ..... اس کا گناہ یہی ہے کہ وہ ایک کنواری لڑکی کو
ایک نئے اور انوکھے اقدام کے لئے اکسا رہا ہے، ایک
بیاہی جانے والی لڑکی کو اس کی جانی پہچانی منزل کی
جانب لے جا رہا ہے۔ ایک نورس کلی کو مرجھایا ہوا
کھلا رہا ہے وہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کو محبت کی نکہتیں
لٹتیں اور کو ملتے دے گا ـــ وہ اس رسک کو خوشی قبول
کرے گا چاہے اس کا معاشرہ، سماج اور ماحول کچھ بھی
سوچے، کچھ بھی کہے لیکن وہ ایسا سب کچھ ابھی کرے گا
اسی لمحے ـــ اس نے ایک بار پھر شاہد کا کہا ہوا جملہ
جانے کیوں اچانک اس کی یادداشت کے لئے مددگار ثابت
ہوئے۔ اس نے خط سے نظر اٹھائی تھی۔ وہ ایک پتھر
پر بیٹھ گیا اور اس خط کو ٹکڑوں کے ٹکڑے ہوا میں اڑانے
لگا۔ ایک ننھے جذبے میں کم سے ایک ننھے احساس سے
ہو کر ـــ!

میرے ساتھی ..... وہ مٹ کے ٹوٹنے دل کا
آخری سہارا قبول کرو

سوچتے ہوئے۔ میں کس قدر مجبور ہوں، بے بس ہوں
بھلا ہوں کہ مقدر سے وہ کامیاب ہو گئی۔ تمہاری محبت نہ پا سکی
کر وہ تمہارے قدموں سے منہ موڑ گئی۔ نہیں ..... نہیں تم
ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صرف تمہارا
کا انتقام ہے میرے ساتھ حالات کا ایک خطرناک میرے
دل پر۔ میں تمہاری حالت سے غافل نہیں ہو سکتی!
مگر کیا کروں کس قدر مجبور ہوں تم سے ملنے کی کوشش نہیں
اور طوفان ہر لمحہ سامنے آتا چلا جا رہا ہے اور میں بندش کی
نظر میں ہر لمحہ بھاری ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن ایسا بھی
آئے گا کہ تم مجھ سے اور میں تم سے جدا ہو جاؤں گی پھر میری
صورت بھی کبھی نہ دیکھ سکو گے۔ برسوں کی محبت ایک لمحہ میں خاک ہو
جائے گی اور میں سسکتی، بھیگی آرزوؤں کو گلے گلے پھنسے خوابوں
کی عزت و وجاہت کو سنبھالے ایک اجنبی ماحول میں بیچ
دی جاؤں گی ..... نہیں ..... ساتھی ایسا نہیں ہو گا۔
میں ان بیاہوں کو خوشیوں کو آگ لگا دوں گی جو میری محبت
کے چمن پر قہقہے بکھیر رہی ہیں۔ میں ان تمام بدصورت کانٹے
پھینکوں گی جو میرے اور تمہارے درمیان بچھائے جا رہے ہیں۔ میں
تم سے ضرور ملوں گی، اور اپنی محبت کو کبھی برباد نہ ہونے دوں گی
محبت، جس نے ہمیں جینے کا عمل اور جدوجہد کا حوصلہ
دیا منزل پانے کی قوت اور توانائی بخشی۔ میں یہاں
آنسوؤں کے موتی پیش نہیں کروں گی، ان کے لئے میرا دامن
کافی ہے۔ میں تو تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں نے اس
محبت کے طفیل اپنے نصب العین کو کس قدر حاصل کر لیا ہے
یہ بتانے آپ کہ کتنی ہوں، اس محبت کے بدلے
سمجھ لو جو اور اچھے بھلے کی تمیز ہے اور اسی
جذبے میں ڈوب کر میں نے زندگی کی ضد و نزاکت کو
ساتھی ..... میں سمجھ گئی۔ لیکن اب نہیں، اب نہیں
میں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے سچے ساتھی کے سامنے کر دیا
تھا لیکن والدین نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ..... میں
بارہ کا ارادہ کر چکا ہے۔ تعلیم و ایم کوئی چیز نہیں
ہے۔ ہے کی اس قسم پر بات کر کیا کہیں ایک عورت
کچھ ہو کر بھی اس ماحول اور اس زمان سے نکل

تو خود کو ختم کر دوں گی۔ وہ حالات کی تمام زنجیریں توڑ کر تم سے آملوں گی۔ مجھے امید ہے کہ تم ان حالات کے ساتھ تلاش اور جدوجہد سے کھیلو گے۔ بلکہ اس جدوجہد سے ان حالات کا مقابلہ کرو گے۔ جس محبت سے کل تک تم اپنے منتشر اور سخت حالات سے گزرتے ہوئے نظیم کی دنیا، ہنسنے گاتے کی دنیا کی گردش اور سختیاں جھیلتے تھے۔ ہمارے سامنے یہ آخری طوفان ہے۔ اگر ہم اس طوفان سے گزر گئے ـــ یقیناً ہم خوش نصیب کہلائیں گے۔ ساتھی دوستو! میرا انتظار اور کہاں کے پھولوں سے کھیلنا ممکن ـــ پر سوداں نہ آسکی اس کا مجھے افسوس ہے

انتظاری شاہدہ

آخری جملہ پڑھ کر وہ چونک گیا "پر سوداں نہ آسکی" اس نے ایک ٹھنڈی کے جذبے سے سرشار ہو کر پڑھ جانے جیسے وہ اس تیز طوفان کا مقابلہ کرے گا اور شاہدہ کو نئی زندگی دے دے گا۔ اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ ستارے لرز رہے تھے اس کے قدموں کی آہٹ، جو وہ شاہدہ کے لئے اٹھا رہا تھا۔ کل جمعہ کا مبارک اور متبرک دن ہے۔ اس نے تیزی سے سوچا۔ کل کتنی خوشی کا دن ہے، کیونکہ ایک خوشی کے موقع پر یہ المناک حادثہ کرے گا۔ وہ کانپ گیا اور ایک لمحہ کے لئے اپنے بھیانک حواس کا جائزہ لینے لگا۔ کل کتنے دوست اس سے گلے ملنے کے لئے بے تاب ہوں گے کتنے چہرے اس کے لئے مسرور ہوں گے اور وہ فیصلہ کن اضطراب میں اس ماحول سے نکل گیا۔

اس نے دیکھا انگیٹھی کے کوئلے دم توڑ چکے ہیں، اور نقرئی قہقہے بکھر چکے ہیں اور ہنستی، مسکراتی، لجاتی کنواریاں سازوں کے جزیروں میں بھٹک رہی ہیں اور جوانیوں کے دمکتے چہرے ایک نئی خوشی سے سرشار ہیں۔ اور پھر یہ ماحول کس قدر عجیب ہے۔ کل جب یہ حادثہ یہ سانحہ ان لوگوں کے سامنے آئے گا۔ یہ کیا کہیں گے یا خاندان کی عزت کا تار تار ہو جائے گا، معاشرتی وقار روند دیا جائے گا اور جھوٹی عزت، شرافت اور وجاہت کا جنازہ نکل جائے گا

لیکن اتنے تلخ حالات بھانپ لانے کا اسے قطعی خوف نہ تھا۔ بلکہ ایک سرخوشی تھی کہ وہ ایک کلی کو کھلنے سے پہلے مرجھانے نہ دے گا۔ ایک کنواری لڑکی کو دنیا کے اور ان حسرتیں لئے مرنے نہ دے گا وہ ان تمام حالات سے بے نیاز کھنڈر کے مغربی حالات میں چلا گیا۔ ایک شکستہ عمارت۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، پتھر، اینٹیں، حسرتوں کے گم شدہ مزار، ارمانوں کے ٹوٹے کالموں، محبتوں کے دفن ـــ تمناؤں کی سسکتی وشیشیں ـــ جانے اس کھنڈر میں کتنی ہی سسکی جوانیاں، اور کھلی کلیاں ہنستے ہنستے توڑ مروڑ دی گئی ہوں گی وہ یہ سب کچھ سوچے چلا جا رہا تھا۔ ناگاہ وہ چونک پڑا..... سامنے دو سائے ایک ستون کی آڑ میں تھرک رہے تھے ـــ وہ ایک ٹوٹی دیوار کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ وہ چونک پڑا ـــ یہ کیا؟ سلمیٰ اور شاہدہ ایک دوسرے سے بغل گیر تھیں اور دونوں سسک رہی تھیں۔ سرگوشیوں کے کانپتے لہجے میں جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ دھندے، قہقہے، جو جھے اور جراتیں دلا رہی تھیں..... اس کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی۔ ایک عرصلہ انگیز سکون اور جرأت آفرینی بیدار ہوئی۔ وہ جلد سے جلد اس کے سامنے جانا چاہتا تھا اور تمام حالات سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔

اور آگے اس نے دیکھا سلمیٰ ڈگمگاتے قدموں سے کھنڈر کے مشرقی دروازے سے نکل گئی۔ سانحہ صرف شاہدہ کھڑی تھی۔ سہمی، ٹھٹکی، جھجکی، شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے کس قدر نقدس برس رہا تھا جھلک رہی تھی۔ اس کے کولہے بھاری پر کتنے تیز نشے کے مقدس رول تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی مرمریں بانہوں میں محبت سمائے لاکھ وفا نے کی قوت کانپ رہی تھی۔ اس نے دیکھا وہ سہمی سہمی کسی کی متلاشی ہے، اس کی خوف زدہ نگاہیں ہوا کی سرسراہٹ پر چونک جاتی ہیں اور پھر دفعتاً وہ پکار سے وہ کانپ جاتی ہے اور ٹھنڈے سناٹے سے ڈر جاتی ہے۔ اس نے چاہا وہ قریب چلا جائے لیکن وہ سوچ میں گم ہو گئی

حالت میں کھڑا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کا منتظر رہا جب وہ ایک نتیجہ پر پہنچ سے وہ مطمئن ہو سکے، اس نے دیکھا شاہدہ ستون کی آڑ سے ہٹ کر شکستہ مندر کے پیچھے سے ہو کر رہی ہے جہاں رک کے تمام مناظر کو فاتح نظروں سے پیش کرتا ہے..... اس نے بڑی جرأت سے، بڑی ہمت سے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ وہ اس وقت بہت احتمال اور طمراز کے ساتھ اپنا قدم اٹھا رہا تھا اور جذبات سے دور رہ کر ـــ سنجیدگی سے اس جیسا ایک قدم کا حل نکال رہا تھا۔

اگلے لمحہ وہ پھر چونک پڑا۔ سایہ تیزی سے اس کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ اور شاہدہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی اس سے آگے وہ اور نہ دیکھ سکا۔ اس کے جسم میں ایک حرارت آمیز جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ ایک عجیب کش مکش کی حالت میں گھر گیا۔ وہ ان دونوں سایوں سے بچنا چاہتا، ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے ٹکراتا۔ ان کے قریب پہنچ گیا اور قریب پہنچ کر وہ ہلکے طور پر کھانسا۔ تیزی سے دونوں سائے جدا ہو گئے اور متوحش نظروں سے خوف زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے اور جب کوئی نظر نہ آیا شاہدہ گھبرائے لہجہ میں بولی "اب کیا ہوگا ـــ؟"

"سب کچھ ہوگا ـــ!" تیزی سے وہ ان دونوں کے درمیان آگیا۔ اور ان دونوں کے چہرے پر چھائے خوف کو دیکھنے لگا اور پھر نرم لہجہ میں کہنے لگا "شاہدہ مجھے یہ معلوم کر کے اتنا افسوس ہوا ہے کہ تم نے اتفاق سے غلط فہمی کا شکار ہو کر اس نام نہاد سماج کی دھجیاں بکھیر دیں، مجھے خوشی ہے کہ میری بہن نے اپنا حق منوانے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ـــ!" وہ یہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اتفاق ہی طرح کا کانپ رہا تھا، جیسے وہ ابھی شوٹ کر دیا جائے گا، جیسے وہ پھانسی کا مجرم ہو۔ اور اپنی سزا کا منتظر ہو۔ وہ دونوں بھیانک موت کے چکر میں گھر گئے ہوں

شاہدہ بھی لرز رہی تھی اور خوف کھا رہی تھی شاید اس کی نگاہیں زمین میں گڑ گئی تھیں اور وہ چاہتی زمین شق ہو جائے اور وہ اس ـــ لمحہ سے

لیکن ہیبت ناک مجرم فی الوقت خاموش تھے۔ وہ سر جھکائے مجرم بنے کھڑے تھے۔ ماحول پر موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فضا کا سناٹا بتدریج بڑھ رہا تھا۔

"کیوں بھیا..... ہیں بالکل..... ہیں بالکل..... ہیں.....!" لڑکے کا پتلے اور پھٹے ہوئے لہجہ میں شاہدہ بولی "بات کا شکر ہوا" "لو بھائی کا غصہ ہے.....!" دونوں نے مجرم گھبرائے۔ لیکن اگلے لمحہ وہ خیر واضح الفاظ میں کہنے لگا۔ "ذرا موت شاہدہ باجی نے یہ خط سلمیٰ سے زبردستی حاصل کیا ہے۔ تب ہی کہہ کر دیا تھا۔ اشاہدہ باجی" مگر شاہدہ کانپتے ہوئے آفاق کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جو خود بھی گردن نیچی کئے کھڑا تھا اور کسی بہت بڑے شش و پنج میں الجھا ہوا تھا۔ بڑے بھیانک انداز میں وہ بولی "ہی.....!"

"ٹھیک.....!" اس نے ٹھہرے لہجے میں کہا وہ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجرم بھری عدالت میں ہوں اور ان کو سزا جزا دینا اس کے اپنے اختیار میں ہو۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی قائم تھی۔ کہنے لگا "بہن مجھے تمام حالات کا علم ہے۔ تمہاری خواہشات کا۔ محبت کا۔ آفاق کی جذبہ گرداری، ایمان داری اور دوستی کا بھی۔ والدین نے تمہارے ساتھ کوئی فیصلہ کن انصاف نہیں کیا..... لیکن میں تمہارے ساتھ پورا انصاف کروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے تمام خاندان سے جھگڑا ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ میں جانتا ہوں اس خوش گوار معاملے کا سب سے بڑا سبب میں ہوں۔ لیکن میں اپنی بہن کی خوشی کے لئے یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کروں گا مجھے آفاق پر یقین ہی نہیں اعتماد بھی ہے کہ وہ اپنے قوت بازو سے تمام زندگی خوشیاں فراہم کرتا رہے گا اور اپنی دوستی پر بھی۔ میں اس کی اور تمہاری زندگی سے متاثر ہو کر اپنی بہن کو غیر سماجی طور پر اس کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔" اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا۔!

بقیہ افسانہ زندگی طوفان (صفحہ ۲۷ سے آگے)

میری زندگی میں کیوں نہ آ جائیں۔ کہ کوئی پرواہ نہیں۔ دیکھئے میری آنکھوں میں جھانک کر۔ ان میں کوئی تمنا نہیں جو کسی کی زندگی میں بھی اجالا پھیلا سکیں۔ دیکھئے یہ بھی ایک دھوکا ہیں۔ کوئی حقیقت نہیں۔ ان میں۔ ایک باپ نے کسی سنگ تراش کی فن کاری اور کسی سائنس داں کے ذہن کو ضرور کرید رکھ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک زبردست دھوکا ہیں۔

اور پھر صفدر حیرت سے شہناز کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ جن میں لاکھوں دکھ سہنے کے باوجود بھی کوئی نمی نہ تھی۔

لیکن طوفان خاموش تھا.....!

بقیہ افسانہ خوبصورت کھلونا صفحہ ۵ سے آگے

اس کی حفاظت اور نگہداشت سے پہلو تہی کرنے لگے تو پھر ایک ایسے نقطہ پر پہنچ جاتی ہے کہ ہر شریف آدمی کو اس پر سوچ بچار کرنا پڑتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے..... جج ارڈر اپنے فیصلہ میں قابل احترام حمیدی اور عزت مآب کے سر چھوڑتا ہوں۔ اب وہ چاہیں میری موکلہ کو سزا دیں یا باعزت بری کریں.....

مقدمے کی سماعت، فاضل وکلاء کی جرح اور سماعت اور گواہوں کی قیمتی شہادت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ ملزمہ اور مدعیہ کے درمیان شاہد باہمی یگانگت تھی اور مدعیہ کے مشورے سے ہی ملزمہ نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ جیسا کہ وکیل صفائی نے اپنے بیان میں کہا ہے..... محبت ایک خوبصورت کھلونا نہیں۔ بلکہ اس گوشت پوست کی نئی مخلوق کے لئے اس کو اس کا حق ملنا ہی چاہئے..... اور یہ بات ہر کوئی اس کا نہیں کرتا ہے.....

دیکھی بھالی حویلی۔ گھر بھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ عورتیں، لڑکیاں چیخ چیخ کر بین کر رہی تھیں۔ کیا عجیب سی خوفناک طوفان تھی۔ وہ اچھے بھلے ہنستے مسکراتے ماحول پر سکون خیالات اور چہرے لئے گھر میں داخل ہوا۔ ایک دم خاموش ہو کر وہ بولا "امی! شاہدہ نے آپ کو..... اور ابا جان کو بہت شرمندہ ہے۔ آپ کی مرضی کو نہ سراہا تھا اور اپنے جذبوں کی پکار سے آفاق کو اپنائے ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکی ہے.....!" وہ خاموش تھے۔ گہری سب سناٹے تھے۔ شادی کی چہل پہل دم توڑ گئی۔ امی نے غصہ میں آ کر اپنا منہ پیٹ لیا۔ ابا جان نے غصیلے انداز میں ایک زبردار طمانچہ اس کے منہ پر مارا اور پھر بولے

"قریہ خاندان کی بے عزتی، سب تیری اپنی شرارت کا نتیجہ ہے.!"

"جی ہاں.....!" وہ ٹھہرے لہجے میں بولا "مجرم میں ہوں، میں نے خود شاہدہ کو آفاق کے ساتھ کیا ہے۔ کیوں کہ آپ لوگوں نے اس کے اظہار سے بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اپنا حق چاہتی تھی۔ آپ نے اس کا حق ٹھکرا دیا۔ وہ آفاق سے محبت کرتی تھی۔ محبت جو تمام غیر انسانی جذبوں سے پاک اور بلند ہے، میں نے اس کی کوکھ جلنے سے بچایا ہے۔ میں نے جرم جانتے بوجھتے کیا ہے کہ اس کو ایک نئی منزل کی جانب جانے دیا۔ آپ اس کی زندگی کو سے کھیلنے سے باز نہ آئے۔ میں نے اسے زندگی دی ہے۔ میں نے اس کی خوشیوں کا سودا نہیں کیا ہے.....!" وہ رکا لمحہ ٹھہر کر پھر بولا "مجھے کل رات ہی پتہ چل گیا تھا، کہ جب وہ سلمیٰ سے کہہ رہی تھی۔ "سلمیٰ میں مر جاؤں گی.....!" میں نے اس کو مرنے سے بچایا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں۔ آپ لوگ مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ شاہدہ بے گناہ، بے قصور ایک لڑکی ہے۔ اس کو آپ کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ میں اس سزا کا خندہ پیشانی سے استقبال کروں گا.....!"

اور پھر بھری گھر میں سناٹا چھا گیا، اور تمام خاندانی عزت دو جاہت لمحہ بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اور وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جانے کیوں.....؟

صمد حمیدی

خوبصورت کھلونا

"لارڈ۔ نرملا دیوی ایک حرت ناک گھرانے کی بیشتر افراد کی طرح بدنصیب عورت ہیں۔ ان پر لگائے گئے الزامات قطعی ناقابل یقین ہیں۔ میں مسز جیوری اور قابل احترام ممبران سے کہوں گا کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرکے اپنا فیصلہ صادر کریں۔ اس میں شک نہیں کہ آج کا سماج شوخ گھرانوں سے آلودہ ہے۔ پھر بھی عورت کو رائے کی یکطرفہ پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔!"

"پراسکیوٹر۔ مجھے وکیل صفائی کے بیان سے اتفاق نہیں، مجھے ان سے شدید اختلاف ہے۔"

"لارڈ۔ اسٹنٹ۔ وکیل استغاثہ اگر کچھ کہنا چاہتے ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

"یور جسٹس! جہاں تک نرملا دیوی کے مقدمے کا تعلق ہے ان کا مقدمہ اتنا پیچیدہ نہیں کہ وکیل صفائی اس سلسلہ میں اپنی چوٹی کا زور لگا کر ان کو غیر مجرم ثابت کریں۔ یہ افعال کا کیس محض ہے اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۲ کی رو سے مجرم کو اس کی سزا ملنا ہی چاہئے۔ میں فاضل وکیل سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ اس رات کہاں تھیں جب کہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ ایک شریف عورت کا گھر سے باہر رات بھر کیا کام۔؟ ظاہر ہے، سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت سب کارروائی عمل میں لائی گئی لیکن وکیل صفائی سب پر پردہ ڈال کر مجرم کو نرملا دیوی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ تفتیشی کے دوران پولیس کی رپورٹ سے ثابت ہے کہ نرملا دیوی بے قصور ہرگز نہیں۔"

"لارڈ۔ استغاثہ کے وکیل جذبات کی رو میں بہہ کر میرے موکل پر الزام لگانے لگے ہیں۔ مقدمہ کا ان کے اس بیان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"یور آنر! مسز جیوری۔ میں پھر بھی یہ کہوں گا کہ مقدمہ کا میرے اس بیان سے تعلق ہے اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء کی رات جب مسز بالا دیوی اپنے بنگلے میں قدم رکھتا تو ملزمہ نرملا دیوی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ نوکر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ اپنی دوست بھلا دیوی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ گیارہ بجے تک جب وہ نہیں لوٹیں تو مسز بالا دیوی کو فون کیا۔ نرملا دیوی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ موٹر نکال کر انھوں نے ان کی تلاش شروع کر دی۔ پولیس نے ان کو جس حالت میں ڈھونڈ نکالا۔ یہ بیان کرنے کے لائق بات نہیں ــــ انھوں نے نہ صرف اپنے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ بلکہ اس ہندوستانی عورت کی لاج پر کالک پوتنے کی کوشش کی جس کی روایت میں پاکیزگی، عصمت مآبی اور ستی ہونے کا جذبہ عرصے سے کارفرما رہا ہے۔"

"اب جینٹلمن آف دی جوری! نرملا دیوی پر بے جا اتہام ہے۔ انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ہندوستانی روایت کو دھکا لگے ــــ انھوں نے صرف اپنے حق کے لئے جدوجہد کی اور میں تو سمجھتا ہوں ہر ہندوستانی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بہتر زندگی کو سوچے۔ نرملا دیوی۔ اپنی سہیلی بالا دیوی کے یہاں تھیں، اور بات ہے کہ اس کا اظہار انھوں نے شوہر سے نہیں کیا۔ شاید مذاق کے طور پر۔ یہ بات ان سے اختیار کی گئی حالات کو میں اپنے شواہد پیش کر سکتا ہوں جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ۲۰ دسمبر کو رات ۱۲ بجے تک وہ وہیں تھیں۔ پولیس کا پھر ایسے ویسے حالات میں ڈھونڈ نکالنا اور بھی ثابت کرتا ہے کہ دفعہ ۲۱۸ تعزیرات ہند کا جرم قرار پاتا ہے ــــ۔۔۔۔

"بالا دیوی۔ مقدس گیتا کی سوگند۔ جو کچھ آپ سے پوچھا جائے، سچ سچ جواب دیجئے گا ــــ ۲۰ دسمبر کی رات نرملا دیوی کا آپ کے یہاں کتنے بجے تک تھیں کیا آپ بالا دیوی کا کوئی فون آپ کو ملا تھا؟"

"میں جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی۔ سچ کے علاوہ کچھ اور نہیں کہوں گی۔ ۱۲ بجے تک ہم لوگ ایک ساتھ ہی رہے۔ پھر بھیا نے خود کار میں انھیں سوار کرا کے ان کے گھر پہنچا دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں!"

"آپ کو ٹھیک پتہ ہے کہ آپ لوگ بارہ بجے کے بعد علیحدہ ہوئیں۔ کچھ کم و بیش بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس رات کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ میری سالگرہ شادی کی رات تھی۔ آدمی سب کچھ بھول سکتا ہے۔ لیکن اس رات کو نہیں بھول سکتا۔"

"ہا ہا ہا ــــ" ایک نعرہ قہقہہ پڑا نرملا دیوی شرما کر رہ گئیں۔

"آنریبل ــــ آنرڈ ــــ؟"

"کچھ اور آپ کو پوچھنا ہے ــــ؟"

"نہیں لارڈ! آپ کا شکریہ!"

"یور آنر! میں چند ایک سوال کرنا چاہتا ہوں"

"یس سیڈ مسٹر بلیمر"

"بالا دیوی! مگر آپ کے ساتھ وہ رات تک نرملا دیوی تھیں تو گیارہ بجے کے بعد تفتیش پر آپ کے بیان کے مطابق

مان میں یہ کہہ کر کہ ہائی تھیں ہو گیا، دوسری نرملا دیوی تھیں۔ پولیس نے شناخت کی تھی کہ یہ نرملا دیوی ہے پھر آپ جھوٹ بولنے کی کوشش مت کیجئے۔ سچ سچ بتا دیجئے کہ واقعہ کیا ہوا تھا۔ ؟"

"مسٹر ایڈ ــــ میرے گواہ پردہ نشین مستغیثہ کی بیوی خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔ میں حرض کروں گا کہ ان کو اس طرح کی حرکتوں سے باز رکھا جائے۔"

"نہیں یور آنر جسٹس! میں حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس میں دھمکانے کی کون سی بات ہوئی۔ میں پھر کہتا ہوں گا کہ فاضل وکیل صفائی مقدمے کو الجھا رہے ہیں اور عدالت کی توجہ فروعی باتوں کی طرف مبذول کرا کے اس کو بھٹکا رہے ہیں ــــ موہن بابو سے پوچھ لیا جائے وہ اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ۔ ۔ ۔"

"موہن بابو آپ نے اس رات نرملا دیوی کو جس حالت میں دیکھا ضرور ناظرین کو بیان کیجئے۔"

"جناب والا! بدقسمتی سے میں نرملا دیوی کا شوہر ہوں۔ اخلاق اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنے منہ سے اپنی بیوی کا کچا چٹھا پیش کروں۔ بس اتنا سمجھ لیا جائے کہ نرملا دیوی اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ ان کو کپڑے تک کی کا ہوش نہیں تھا۔ اگر یقین نہ ہو تو آپ مسٹر بابو سے پوچھ لیں۔ جو جائے وقوع پر نرملا دیوی کے ساتھ موجود تھے ــــ"

"مسٹر بابو، کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس رات نرملا دیوی کے ساتھ تھے۔ آپ سے ان کی کیا کیا باتیں ہوئیں اور کیا تعلقات ہیں۔ ؟"

"جناب والا، میں نرملا کا بچپن کا ساتھی ہوں کالج تک ہم لوگ ایک ساتھ رہے۔ شادی کے بعد وہ اپنی سسرال جا بسیں۔ اور میں سروس کے سلسلہ میں بمبئی جا پہنچا۔ پھر برسوں ملاقات بہت کم ہو گئی۔ البتہ خط کتابت جاری رہا۔ اتفاق کی بات ــــ یہ دسمبر کے آخر کا ہفتہ تھا کہ یہاں پہنچا۔ نرملا دیوی سے ملاقات ہوئی ــــ گرم جوشی سے ہم لوگ نے بہت پرانے دنوں کی یاد تازہ کی۔ رات کو تو یہاں رہتے رہے۔ صبح ناشتہ میں نے نرملا دیوی کو دیکھا۔ کہ نرملا دیوی حد درجہ قابل رحم شخصیت ہیں۔ میں نے وجہ پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بتا نہ پائیں۔ پھر میں اپنے مکان لوٹ گیا۔ مجھے پتہ نہیں پھر کیا ہوا کیا نہیں ؟"

"آنریبل ــــ آنریبل مقدمے کی سماعت کل تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے ــــ!!"

× × × × ×

"مسٹر ایڈووکیٹ جنرل! آپ اجلاس کے عین حالات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وکیل استغاثہ کا الزام سراسر جھوٹ اور افترا پر مبنی ہے۔ ملزمہ نرملا دیوی بالکل بے قصور ہیں۔ ان پر کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوتا ــــ میں عدالت سے باادب درخواست کروں گا کہ نرملا دیوی دادرسی کی ہاتھ پرشاد، نوید فتح موہن پرشاد کو باعزت بری کیا جائے اور موہن بابو پر زیر دفعہ تعزیرات ہند ۱۹۱ جھوٹ اور بد حرمتی کا مقدمہ چلایا جائے ــــ"

"یور آنر! وکیل صفائی نرملا دیوی کی پرسنل لیبیس فضلی کرنا اصل مدعا میں اڑانا چاہتے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر ان کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا تو وہ ایک غیر مرد کے ساتھ کیوں رنگ رلیاں منائی دیکھی گئیں اور وکیل صفائی اس کا کیا جواب دینا چاہتے ہیں ؟"

"مسٹر ایڈووکیٹ۔ جہاں تک رنگ رلیوں کا تعلق ہے یہ سراسر نرملا دیوی پر بہتان تراشی ہے اور زیر دفعہ ۹۹ وکیل استغاثہ پر بھی حرکت کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔"

"یور آنر جسٹس! اندھی بہری! میں پھر بھی اپنے الزامات کو دہراؤں گا۔ یہ وکیل صفائی ہو یا کوئی دوسرا ــــ یہ صرف نرملا دیوی کی عزت کا سوال ہے۔ بلکہ موہن بابو کی ناموس کا بھی ہے۔ اس سے نتائج متعلق ہے، جتنا کہ نرملا دیوی کا۔ آخر کیا کچھ نہ نرملا دیوی کر سکتی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر دوسرے کے پہلو میں جا بیٹھے۔ موہن بابو ایک ذی حیثیت اور باوقار شخصیت لوگوں میں ہیں۔ تو پھر نرملا دیوی کا یوں گھر سے باہر رہنا ــــ کوئی اچھا فعل نہیں قرار دیا جا سکتا ــــ۔ ؟"

"مسٹر ایڈووکیٹ اور مسز جیوری! شوہر کا گھر چھوڑنا اور کہیں آنا جانا کس قانون کے مطابق قابل گرفت ہے مجھے وکیل استغاثہ بتلائیں۔ ہو سکتا ہے نرملا دیوی کسی مجبوری کی وجہ سے ہی گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی ہوں روشنی ڈالیں تو عدالت کے فیصلے میں آسانی ہو جائے میں تو پھر یہی کہوں گا کہ نرملا دیوی ــــ محل کی طرح پوتر اور ساوتری کی طرح پاک دامن ہیں۔ ہو سکتا ہے موہن بابو ہی قصوروار ہوں جو کہ کاہے نرملا دیوی کو گھر سے باہر رہنا پڑا ــــ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ موہن بابو کا یہ کہنا نہیں کہ آپ گھر سے بالکل دلچسپی نہیں لیتے ــــ میں سمجھتا ہوں آپ کی بنی بنائی سازش کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ نے نرملا دیوی کو اس رات غائب کر کے ان پر مندرجہ ذیل سنگین الزام تھوپنے کی کوشش کی۔ اس سے آپ کا مقصد آپ نے کھون خیر کیوں نہ ہو ــــ لیکن آپ کے بیان ۲۵ دسمبر کی رات کو کہ آپ نے ــــ ؟ جو لوگ اور جنٹلمین آف دی جیوری کا ہے اس سے بیان باہر نہیں ہو تا کہ یہ سب منظم سازش کا نتیجہ ہے۔ حضرات! عورت ایک خوبصورت کھلونا نہیں کہ اسے صرف اس لئے کہ وہ اداستہ پیراستہ گھر میں رکھی جائے بلکہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جس میں جذبات ہیں۔ جینے مرنے اور گانے کی صلاحیت قدرت نے ودیعت کی ہے۔ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اگر عورت اپنا حق مانگتی ہے تو وہ نرملا دیوی جیسی عورت ہی کیوں نہ ہو، تو کیا یہ ناقابل معافی جرم ہے ؟ نسائیت زن کا گہوارہ ہے لیکن جب یہی

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

اختر مایہ۔ لیگاڑی

زخمی طوفان

وہ خوف زدہ نیچی سرپہاڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک کوئی خوفناک آندھی اسے اپنے ساتھ اڑا لے جائے گی۔ اس کی سانسوں کی بازگشت جو ہوا کی گھنٹیوں سے نہیں بلکہ کئی برسوں سے اس کے سینے میں ہمیشہ کے لئے گہرائیوں میں ڈوب کر کبھی نہ ابھرے گی ——

شہناز پتوں کی سرسراہٹ سے بھی لرز اٹھتی ہے۔ اب کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ مسلسل خاموشی ہے کوئی کھٹکا نہیں کہیں باہر باغ میں چڑیا چہک رہی ہے۔ یا دل گرج رہے ہیں اور اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے ——

"میرے اللہ کیا ہوگا؟" جس کمرے میں وہ گم صم بیٹھی ہے۔ اس میں جگمگاتی ہوئی برقی بتیاں خاموشی سے گھور رہی ہیں۔ پھولوں کی خوشبو اس کے احساس میں سوئیاں چبھو رہی ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے تو صرف اس طوفان کا انتظار ہے اس طوفان کا وہ برسوں سے انتظار کر رہی تھی۔ یہ قیامت تو..... اس قیامت کی تو وہ برسوں پہلے سے دعائیں مانگ رہی تھی لیکن آج اس کا دل کیوں دھڑک رہا ہے۔ منزل کے قریب اس کے قدم کیوں ڈگمگا رہے ہیں۔ منزل تک تو وہ پہنچ چکی ہے پھر اسے طوفان کا انتظار اتنی شدت سے کیوں ہے۔ آج اسے وہ سب کچھ مل گیا ہے جو ایک کنواری اور جوان لڑکی کی آرزو ہوتی ہے۔ ڈولتی ہوئی کشتی طوفانوں سے بچ کر ساحل کے قریب آ چکی ہے —— آج اس کے کانوں نے بابل کے میٹھے گیت، ڈھولک کی تھاپ اور شہنائیوں کی مدھر آوازیں بھی سن لی ہیں۔ آج تو اس کے دامن میں ہوتا۔ خوشی، رائیگاں اور نہ جانے کتنے قسم کے پھول بھر جانے چاہئے۔ آج تو اسے خوش ہونا چاہئے۔ اس کی بھرپور زندگی میں ایک نیا چاند طلوع ہونے والا ہے۔ اس کی بے چین روح کو پیار بھرے لفظوں سے تازہ کرنے کا

پھر تو وہ ایک ڈولتی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ ایک زخمی کلی تھی۔ ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح تھی۔

"لیکن پھر یہ طوفان کی آمد کا انتظار کیسا؟" مہتاب جلی نہ جانے کہاں گری کہ اس کا دل دہل گیا کوئی اس کی طرف آیا تھا۔ جوتوں کی آواز اس بات کی غماز تھی۔ اس نے بمشکل تمام دل کو سنبھالا اور خود بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"یا اللہ روک دے اس طوفان کو۔ یہ بجلی بار بار بادلوں سے کیوں ٹکرا رہی ہے کیا میرے ہی دل پر گر کر دم لے گی کتنی بار تو گر چکی ہے"

چند منٹ بعد ہی کوئی اس کے قریب بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ ظلم کیا گیا ہے ——" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آواز ابھری۔ اس آواز سے وہ قدرے چونکی۔ یہ تو صفدر تھا۔ وہ صفدر کی ہے جس کے ساتھ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اور رفیق حیات بنا کر سینکڑوں میل دور بھیج دیا گیا ہے۔ اس نے اُف بھی نہیں کی —— اس نے اُف بھی نہیں کی۔ لیکن اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ طوفان کا آغاز ہو چکا ہے۔

"یقیناً تمہارے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے" شہناز نے اس نے سمجھ کہا

"یہ آپ بار بار یہ کیوں کہے جا رہے ہیں" شہناز نے بمشکل تمام دل کی دھڑکنوں کو روکتے ہوئے کہا

"تمہیں چیخیں مارنی چاہئے تھیں شہناز خود سے کانپ اٹھنا چاہئے تھا"

"لیکن کیوں ——؟" اب شہناز کا جسم بھی کانپنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے تمہارا جسم تو کانپنے لگا ہے لیکن تم نے اپنی چیخوں کو مجبوری کے بوجھ تلے دبا دیا ہے۔ لیکن دیکھو یہ تمہاری بھیانک نظریں اٹھا کر۔ کہیں —— میرا چہرہ کتنا بھیانک ہے۔ میں تمہاری جیسی لڑکی کے قابل نہیں ہو سکتا"

"خدا کے واسطے ایسا نہ کہئے ——"

صفدر نے شہناز کی اس معصومیت پر ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ "معصوم اور مجبور لڑکی دیکھنے میں حقیقت میں کتنا بھیانک ہوں۔ دھوکے سے تمہاری شادی میرے ساتھ کی گئی ہے۔ فاصلوں کی دیواریں اس لئے حائل کر دی گئی ہیں کہ میں ایک درندہ ہوں لیکن دیکھو کہ میرے چہرے پر کتنے لمبے لمبے اور گہرے نشان ہیں اور یہ نشان جس نے میرے چہرے کو دو حصوں کو بالکل ہندوستان اور پاکستان کی طرح تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن ان نشانات کو چھپا کر۔ ان میں سانپ کی طرح بھر کر زہریلی خول چڑھا کر مجھے تمہارے والد کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ بالکل اسی نوعیت کی طرح۔ اور اس طرح جیسے ہر سونے کی تہہ چڑھا کر اسے سونا ثابت کیا گیا اور تمہارے والد صاحب کے بھی سامنے نے مجھے بھرپور تھپکیوں میں ایک دبلا دکھتا

کیے ہوئے کی سزا ملنا تو درست مگر دوستی نبھانے رکھنے کی خاطر شہناز کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور میرے مخالف فریق شاید دولت کی کمزوری ہونے کے باعث میرے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی کہ میں ایک کمسن لڑکے کا باپ بن جاؤں لیکن جس کی صورت اور کردار سے ہر شریف انسان کو نفرت کرنے کا حق ہے۔ ایسی نفرت جو کبھی نہیں مٹ سکتی۔"

"لیکن آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں سنانے جا رہے ہیں مجھے تو آپ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔" شہناز نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"شہناز تمہارے نظریوں کا قصور ہے جو تمہاری بھولی ہوئی ہیں۔ اس لئے تم یہ سب کچھ کہہ رہی ہو۔ تم نہیں بلکہ ایک جنگلی مشرقی لڑکی تم سے کہلوا رہی ہے۔ تم حقیقت میں پڑھا لکھا ذہن ہو۔ لیکن وہ جنگلی ہوئی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھو کہ میں کیا ہوں، جانتی ہو کہ یہ گہرے نشان مجھے کس نے دیئے ہیں یہ میرے چہرے کو دو حصوں میں کس نے تقسیم کیا ہے۔ تم نہیں جان سکتیں شہناز۔۔۔۔ تم صرف محسوس کر سکتی ہو۔ محسوس کر سکتی ہو۔ اپنی زندہ آرزوؤں کو دفن کر سکتی ہو۔ وہ چیخیں روک سکتی ہو جو مجھے دیکھتے ہی تمہارے دل سے ابھرنا چاہتی تھیں۔ لیکن تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔"

"خدا کے لئے اب آپ خاموش ہو جائیے۔ میں کچھ نہیں سن سکتی۔ میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔"

"شہناز تمہارے ذہن اس کا مجھے اندازہ ہے۔ لیکن میں تمہیں آج سب کچھ بتا دوں گا تاکہ شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔۔۔۔ تمہیں سب کچھ سننا پڑے گا۔ میں سنا لیں کی بات ہے۔ میں دولت کے نشے میں چور تھا۔ دولت کے غرور کا یہ عالم تھا۔ دنیا کی ہر چیز کو میں اپنے قدموں میں جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک دن میرے غرور کا بت ٹوٹ گیا۔ میرے ہر شریف انسان کی نفرت کا شکار ہو گیا۔ میرے دل کی ہر خواہش میرے قدموں میں سر جھکا کر رہ گئی۔ میں نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جو میرے کاروبار کی ترقی کے لئے ضروری تھی۔ میں نے اس کی خوبصورتی کو نہیں دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکا۔ میں نے اس کے دل کی آواز نہیں سنی۔ میں نے اس کی روح کو نہیں چھوا۔ میں نے اس کے جسم کو خریدا۔ اس کی روح کو نہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت دیکھی۔ میں نے اس کے دل میں اپنے لئے نفرت محسوس کی۔ میں نے اس کی روح میں اپنے لئے نفرت پائی۔ لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ میں نے اس کی نفرت کو اس کی محبت سمجھا۔ میں نے اس کی نفرت کو اس کی وفا سمجھا۔ میں نے اس کی نفرت کو اس کی عقیدت سمجھا۔ میں نے اس کی نفرت کو اس کی چاہت سمجھا۔ میں نے اس کی نفرت کو اس کی خوشی سمجھا۔ اگر میری کوئی بہن ہوتی تو یقیناً اس کی طرح ہوتی۔ میرا آخری وار جب وہ منظر آیا تو میرا دماغ دل کا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں نے اس کی بہن سے اس کے خلاف گواہی دلوا کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اس کے حسن نے میرے جسم میں ہوس کی آگ بھڑکا دی تھی اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "ظالم خدا کے خوف سے ڈر میں تیری بہن ہی ہو سکتی تھی۔ تجھے بہن کی عزت پر ترس کھانا چاہیے۔" لیکن میں نے چیختی ہوئی چھری سے اور قاتل نگاہوں سے اس کی آرزو کا خون کر دیا تھا۔ اور جب اس نے میری کنپٹی پر چھری سے میرے چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تو میں نے اس کی معصوم زندگی کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔"

اتنا کہہ کر صفدر نے ایک طویل و عمیق سانس لی۔ پھر دیکھا کہ شہناز کا بدن کپکپے کے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"شہناز اب خاموش کیوں ہو؟ کہو کہ تم مجھے بہت ناپسند کرتی ہو۔۔۔۔ نہیں کہہ دو کہ میں تمہیں پسند نہیں، مجھ سے تمہیں نفرت ہے۔ تم میرے چہرے پر میرے کردار پر تھوکنا بھی توہین سمجھتی ہو۔۔۔۔ ہاں تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے بدترین انسان، غیر انسان۔۔۔۔"

"آپ جیسے ۔۔۔۔ جیسے کیا میں بہت اچھے ہیں؟" شہناز نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اُف! شہناز تم اس قدر مجھ کیوں ہو۔ آہ میں کس مجبوری کی آرزوؤں سے نہیں کھیل سکتا۔ میرا دل۔۔۔۔۔" صفدر نے چند ثانیے لیتے ہوئے پھر کہا۔ "شہناز تم بہت خوبصورت ہو اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری تلخ زندگی کی تلخی بن کر رہ جاؤ۔ اگر کچھ نہیں بگڑا ہے تو میرے دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہیں اپنی منزل تک پہنچ جانا چاہئے۔ ہاں تم خوش ہو سکتی ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ اس ساحل پر میرا

(باقی صفحہ ۳۷ پر)

ساحل پر مسکراتے ہوئے۔ میرے دوست تو نہیں بن سکے تو کم از کم دشمن بن کر ہی ساتھ نبھا جانا۔ خوبصورت زندگی کے ساتھ ہی تو شریک حیات کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔"

"اُف میرے اللہ! آپ اس قدر اکیلے پڑ جائیں گے مجھے گمان بھی نہ تھا اور میرا خیال اس طرح نہ تھا۔"

"نہیں شہناز یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ چاندی روشن آسمان سے زمین کی دستوں تک پھیلی ہوئی اچھی لگتی ہے لیکن ایک ایسا حصہ ہوں جسے چھپانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ چاندی کی کرن بھی مجھے چھو سکے۔"

"لیکن میں بھی تو ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔ میرا بھی تو کوئی نہیں۔ معلوم نہیں کہ اس کی دوست کہاں تک ہے؟"

شہناز نے اتنا ہی کہا تھا کہ بجلی ایک بار پھر کڑک کر کہیں دور جا گری۔ بادل چیخنے لگے۔ ایک خوفناک آواز سارے عالم پر چھا گئی۔

اور پھر خوف زدہ ہو کر غیر ارادی طور پر وہ صفدر کے سینے سے چمٹ گئی۔

"شہناز مجھے معلوم تھا کہ طوفان میرے ساتھ ہی تمہاری زندگی میں آگیا ہے۔ لیکن اتنا کہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔" صفدر نے ایک بار شہناز کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد شہناز نے کہا۔ "لیکن یہ طوفان کبھی نہ کبھی تو رکے گا۔ خدا کرے قیامت تک نہ رکے۔"

"نہیں شہناز میں اسے ضرور روک لوں گا۔"

"لیکن اب میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ آپ کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا ہے۔"

"یہ فیصلہ شہناز مجھے کرنے دو۔ اب کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں خود ایک دھوکا ہوں۔"

"لیکن میں آپ کی زندگی میں ایک ایسا طوفان کی کرن بن کر آئی ہوں جس نے دھوکے کی ہر چیز کو ختم کر دیا ہے۔ اب آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ [illegible]

ضیاء احمد ضیاء

پوچھا تھیں خیالوں میں

[illegible] بات چیت کرتی [illegible]
[illegible] اور [illegible]
کے [illegible] ہنستے۔ اس کی خوبصورت نام دادی
[illegible] رفیق قسمت کی اس [illegible] کچھ [illegible]
[illegible] تھا کہ وقت اس نے اپنے قریب [illegible]
سے [illegible]۔ وہ چونک پڑا۔ اس نے داہنی طرف
دیکھا۔ اسے چھاؤں کے پردے کے پاس ایک جوان لڑکی
[illegible] اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی پر [illegible]
تھی۔ رفیق اس پر نظر کر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس وقت وہ تنہا تھی۔ وہ بیش قیمت ساڑی پہنے
ہوئے تھی۔ اس کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح تھے
[illegible] کی وجہ سے یہاں ہر وہ [illegible] کو چومتی ہوئی
[illegible] کے دونوں طرف کسی مست ناگن کی طرح
[illegible] تھیں اور بالوں میں اس نے گلاب کے پھول لگا
رکھے تھے۔ جس وقت وہ بے حد حسین نظر آرہی تھی اس کی
[illegible] انگلیوں میں انگلی پہنی ہوئی تھیں جس پر وہ
[illegible] ماری تھی لیکن کبھی کبھی وہ مذکورہ نظروں سے
رفیق کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی رفیق
کا دل دھڑکنے لگا۔ جب حسن سے اس کے قدم
[illegible] گئے۔ وہیں وہ مبہوت کھڑا اپنی پرشوق نگاہوں
سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی کی سہیلیاں
[illegible] ہو گئیں۔ لیکن اب بھی انگلی پر وہ پھونکیں مار رہی
تھی اور کبھی کبھی اس انگلی پر دوسری انگلیاں یوں لگتی
جیسے کچھ پکڑنا چاہتی ہو۔ جیسے ہی وہ انگلیاں رکتی
ہوں کہ منہ سے "وہ" کی آواز نکل جاتی۔ تھوڑی
دیر کے بعد وہ بڑبڑائی

"نہ جانے بچوں میں کانٹے کیوں ہوتے ہیں؟"

رفیق نے سوچا شاید بچوں کو [illegible] وقت کوئی کانٹا
[illegible] ہے۔

"[illegible] انگلیوں کا کانٹا نکال دوں"

[illegible] کے [illegible] اس کے
[illegible] چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ لڑکی پہلے تو جھجکی پھر رفیق
کو فلک کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے چہرے کا بغور
جائزہ لینے لگی اور پھر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا
دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ رفیق نے بڑے پیار
سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد
رفیق کانٹے کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور جب اس نے
لڑکی کا ہاتھ چھوڑا تو اس کے معصوم سے رخسار حیا سے
سرخ ہو گئے۔ وہ اپنی انگلیاں جانے کہاں سے بوجھل
ہو گئی۔ رفیق کی نظریں وہ اس وقت حسن و رعنائی
بن گئی۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش کھڑے رہے
دونوں کچھ بولنا چاہتے تھے۔ لیکن الفاظ کسی کی زبان
پر آ ہی نہیں رہے تھے۔ آخر لڑکی نے اس سکوت کو توڑا

"شکریہ! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"مجھے رفیق کہتے ہیں اور آپ کو ——؟"

رفیق نے کہا۔ اور اس کی نیلگوں جھیل جیسی آنکھوں
کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

"میرا نام سلمہ ہے"

لڑکی کا لب بولے ایسا لگا معلوم ہوا جیسے
مندر کی گھنٹیاں دھیمے دھیمے بج اٹھی ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ جانے لگی۔
تو اس نے من ہی من میں سوچا لڑکی دیوی ہے جسے میں
پوجتا ہوں۔ رفیق اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اس
کا دل رفیق تیزی سے [illegible] دھڑکنا شروع ہو گیا۔ کسی کا پتھر سا
دل آج پگھل گیا تھا۔ نہ جانے کیا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے دل
کے ویرانے میں کچھ چراغ جل اٹھے ہوں!

رفیق محبت کے معاملہ میں بالکل کورا تھا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔ اس
کے دوست جب اپنی محبت کے قصے اسے سناتے تو
وہ تعجب کرتا۔ کسی نے کسی سیٹھ کی لڑکی سے محبت کر کے
اپنی مالی پوزیشن اچھی بنا لی۔ تو کسی نے کسی بڑے افسر
کی لڑکی سے محبت کر کے کوئی اچھی سی ملازمت حاصل
کر لی۔ لیکن رفیق کو ان سب باتوں سے کچھ سروکار نہ
تھا۔ وہ یوں دولت یا عہدہ حاصل نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ اسے دولت کی ضرورت بھی تو نہیں تھی اسے
تو ترکہ میں کافی دولت ملی تھی۔ اسے صرف اپنے کام
سے کام تھا۔ وہ روزانہ اپنے کپڑے کی دوکان پر جاتا
اور رات کو دوکان بند کر کے جب گھر پہنچتا تو اس کی
چھوٹی بہن منی دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاتی
اور خوشی سے جھوم کر کہتی ——

"بھائی جان مٹھائیاں دیجئے" اور رفیق
منی کو مٹھائیاں دے دیتا۔ منی مٹھائیاں پا کر خوش
ہو جاتی۔ رفیق اپنی بہن کو خوش دیکھ کر بہت خوش
ہو جاتا۔ رفیق منی کو بہت پیار کرتا تھا۔ وہ نہیں
چاہتا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کبھی یہ محسوس کرے
کہ اس کے ماں باپ مر گئے ہیں۔ اسی لئے وہ اسے ہر وقت
خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر کبھی منی کے چہرے پر غصہ
کی شکن بھی دیکھ لیتا تو وہ بے [illegible] دیکھنے لگتا۔

طرحی مشاعرہ نمبر ۵

مصرعِ طرح

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فرصت میری

غزل کے ساتھ ٹوکن طرحی مشاعرہ یا اس کے تبادل چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

مصرعِ طرح
حضرت
مولانا ابوالحسنی گنوری
شفا گوالیاری

حمد

کلکِ حسنی تیرے شکر و ثنا میں گویا
لکھ رہا ہے ترے انعام کی فہرست میری

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فرصت میری
سر جھکانے نہیں دیتی ہے عقیدت میری
تیرا رحمت ہی ہے میری ذری جنت میری
کتنی سنجیدہ نظر آتی ہے وحشت میری
صاف ظاہر ہے جو کچھ کہتی ہے حقیقت میری
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فرصت میری

اب نہ وہ شان ہے میری نہ وہ شوکت میری
کاش ایسے ہی کسی کو ہو ضرورت میری
بوڑھے سے اور بھی بڑھ جائے گی اُلفت میری
اب چھپائے سے چھپے گی نہ شہادت میری
شدتِ رفع میں جیکام نہ دے ہمت میری
میں سناؤں جو سنیں آپ حکایت میری

اُن کے در تک مجھے لے آئی ہے قسمت میری
باعثِ فخر و مباہات ہے ہجرت میری
اضطرابِ شبِ غم نے کا طہارت میری
آہ طوفان میں بے کشتی اُمنگ میری
سب پہ ظاہر ہے یہ طرفہ حقیقت میری
ہر سخن فہم کی نظروں میں ہے عزت میری

ہے مجھے اسوہ سے زندہ شریعت میری
کتنی شائستہ ہوئی جاتی ہے وحشت میری
پردہ بن جائے جو حیرت تو ہے قسمت میری

میں نے سر کب کا جھکایا ہے تمہارے در پر
تم کو زحمت ہے میسر ہے بدولت میری
تم بھی کر دیتے ہو خوش محبت میری
پیشتر مجھ کو سنانے سے کرو غور اس پر
تم کو ہو سکتی ہے کب مدِ مقابل میری
متین بدایونی

دشمنی تیری شناسا ہے محبت میری
یہ تماشہ ہے ترا اور یہ ہے دولت میری
وہ تصور میں وہی دل میں وہی فکروں میں
کیا شبِ وصل سے کم ہے شبِ فرقت میری
وقت کے دھارے میں بہنا نہیں آتا مجھ کو
ہے زمانے سے الگ وضع طبیعت میری
وہ جفا کار بعہد الم میں پابندِ وفا
آئے انصاف کہاں تک شرافت میری
مجھ کو وہ خانگیِ شوق نے دیوانہ کیا
تم کو بدنام کروں یہ نہ تھی نیت میری
عشق کہتا ہے ہر دار مجھے پہنچا کر
اے متین آج ادا دیکھئے قیمت میری
ہدایت اللہ ہادی۔ ناگپوری

جن کی نظروں میں نہیں کچھ بھی حقیقت میری
کبھی اُن تک بھی پہنچ جائے گی شہرت میری
میں چڑھا ہے پہ فرصت نے پکارا مجھ کو
آپ دیکھا کئے منہ پھیر کے عزت میری
کبھی وہ بول تو اچھے گی مگر تب نہ سنے
بس برائی ہی کئے جاتے ہیں حضرت میری
آج کے دور میں وہ بھی ہے گوارا مجھ کو
جو گوارا کبھی کرتی نہیں غیرت میری
شام دیکھیں نہ سحر آتے ہیں ایسا کس نے
جب بھی پڑھ جاتی ہے یاروں کو ضرورت میری
کل یہ چرچا ہے پہ آدمی سے کہا تھا کس نے
صرف اک چاہنے والے پہ ہے قسمت میری
ذوالعدہ ہمسر ناگپوری

غیر کرتے ہیں کریں تم سے شکایت میری
اس سے کب ہوتی ہے توہینِ محبت میری
میں وہی ہوں جو تری بزم میں کل آیا تھا
آج ایمان نہ ہو دیکھ کے حالت میری
وحشت جلوہ مجھے دعوتِ بے تابی سے
جب بے پردہ کو شاید ہے ضرورت میری
وہ نشتر سا بنے جب دیدہ تر آجاتے ہیں
آئینہ کون کرے گا پھر حیرت میری
بات کل کی نہ کرو کل میں تغیر ہے بہت
جس قدر چاہو ابھی دیکھ لو صورت میری

غیر کی بزم میں جاتے ہو تو جاؤ لیکن
ہے مجھے تم سے محبت بہت زیادہ میری

شب وصل گوہر کی غزل

اگر دل نہ ہو تو شب فرقت میری
ہے سراپا کفِ افسوس حکایت میری
ہی تمنا یہ ہے دست بدعا رہتا ہوں
ہم ہتی میں اگر کچھ ہے تو ہے یہ بے سبی
بزرگانہ مجھے کہتے ہو تا ہے جہاں
یاد دستورِ محبت کی بھلا دے ہے گوہر
شہرت میرزا

جنت پہ فریفتہ ہے حقیقت میری
شیخ نے اس کے بنائی ہے یہ حالت میری
ہر گریباں کو سمجھتا ہوں گریباں اپنا
اب خدا جانے یہ جاتی ہے کدھر لے جائے
مسکراتے ہوئے اس حسرت و جب تنہ میں
ہے عشق نے دیوانہ بنایا مجھ کو
غزل محمد عسکر ناگ پوری

آئینہ دار حقیقت ہے محبت میری
تم دنیا کا مرے ساتھ ہی چل سکتا ہے
اوریت کا سبق دیتا ہوں دنیا بھر کو
کہاں بجھ کی تدبیر ہوتی ہی پٹاں
جگر دل، چاک جگر چاک گریباں ہوں میں
پیر مغاں کی اسے حضر ضرورت کیا ہے
یم عبدالباقی حکیم پوری

شکوہ جور کروں یہ نہیں جرأت میری
آپ کی بزم میں تحقیر نہ ہونے پائے
دیتا ہوں تصور میں تمہارے دن رات
خدا کی بھروسا میں برق تجلی کا شکار
ہے کے حکم کی تعمیل اگر دل سے کروں
دل کے بہلانے کی خاطر میں کہتا ہوں نعیم
حضرت بال تک بندی

مجھ والوں سے کہو دیکھا نہیں قسمت میری
موت بہتر ہے مجھے اٹھ کر دیکھے

بات کرنے کا نہ بولنے کی عادت میری
آشنائے ستم و جور ہے فطرت میری
یہ وظیفہ ہے مرا یہ ہے عبادت میری
کبھی گر ہوگی زمانے کو ضرورت میری
کتنی دلچسپ ہے اے دوست یہ شہرت میری
شرکت غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری

نقش ہے دل پہ فرشتوں کی بھی عظمت میری
اب تو پہچانی بھی جاتی نہیں صورت میری
اب ترقی پہ نظر آتی ہے وحشت میری
بانا سے ہوئے نقش وفا ہے قسمت میری
جنس کے بھاؤ سے بھانپ لیتے ہیں قیمت میری
آپ کے غم سے زمانے میں ہے شہرت میری

تم کو فرصت ہو تو سمجھو کبھی فطرت میری
ہوگی اک روز زمانے کو ضرورت میری
بندۂ حسن ہوں میں عشق ہے فطرت میری
کہاں کرتے نہ ہوتی کبھی قسمت میری
یہ بنا دی ہے ترے عشق نے حالت میری
مشعل راہ سے کچھ کم نہیں الفت میری

میں وفا کیش ہوں بدلے گی نہ فطرت میری
محفل غیر میں جو یاد نہ ہو وقت میری
یہ وظیفہ ہے مرا یہ ہے عبادت میری
یاد آؤں نہ ہوئی کشتِ محبت میری
یہ جہاں کرنے لگے دل سے ملاقات میری
باعث ننگ ہے میرے شہرت میری

پڑی دشمن کے یہاں آہ بہ وحشت میری
سارے عالم پہ ہے چھائی ہوئی ہیبت میری

سن سکا دل کی نہ دنیا کی شہرت میری
بجھ گئی ہے یہ شب فرقت میری
بر سر جام نہ کروں وہ مرقت پیرو
شرکت غم کی نہیں چاہتی فطرت میری

ہو گئی اصل سے نام سے شہرت میری
آئی کہ بدنام نہ کر دے کہیں حسن میری
بڑھ کے طوفانوں سے ٹکرائی خیر تابی
ہے زمانے کی نگاہوں کو ضرورت میری
نقش پا سے تو ہویدا ہے قوت میری
کوئی سمجھا نہ زمانے میں حقیقت میری

آئینہ بن گئی اُن کے لئے صورت میری
دیکھنا ہو تو کیا رنگ محبت میری
پھر بھی سمجھے نہیں اب تک وہ حقیقت میری
اس سے تو ہوتی ہے تو ہین محبت میری
ہے زمانے کی تشفی تکمیل عبادت میری
رنگ لا کر ہی رہی واللہ عقیدت میری

آپ تک تو مجھے لے آئی محبت میری
آپ کی بزم میں جب بھی ہوئی شرکت میری
سر جھکانے کو ہے بیتاب عقیدت میری
مجھ کو لے آئی کہاں سے کہاں وحشت میری
خون آنسو میں ڈھلے گی محبت میری

شرکت غم کی نہیں چاہتی فطرت میری
میں جو خاموش ہوں تو ہے یہ شرافت میری
کس نے آپ پہ ڈالی ہے طبیعت میری
اٹھ گئے تم تو بگڑ جائے گی حالت میری

ہائے کس طرح غزل ہوگئی پوری اپنی
آہ موزوں نہ ہوئی تھی مری طبیعت پہلے

ہے بیانِ حالِ گفتہ کو زبانی میری
کیا کروں بانیِ اظہار ہے فطرت میری
ہے جنوں کی وہ ثنا سنجی کہ میں بھی جس پر
تو اگر جوہرِ فرشتہ ہے طبیعت میری
چرخ چمرخ کچھ اسے زیادہ جو گی
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری
اس سے پہلے کہ کوئی اُن کا نشاں پوچھتا تھا
اُن کی شہرت کا ذریعہ ہے محبت میری
مسکراتے ہیں چمکتے ہیں صاف و منکسر
غم کا آئینہ ہے ہر ایک مسرت میری
منکسر رکاں

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری

شکوۂ جور و جفا کی نہیں عادت میری
اذنِ اجازت ہی نہیں دیتا ہے صاحب میری
بانہ جو ہے میں نظر آتا ہے ، مستانہ پنے
پھر بھی حیرت ہے کہ جاتی نہیں حیرت پیسا
کبھی مسجد کبھی میخانہ کبھی دیر میں
اب گرانے کو گرائے کوئی قیمت میری
میں سمجھتا ہوں فقیری میں ہے عزت میری
ہے پاکر گی تو ہے فقر و غنا کی تقسیم
ایک دُنیا ہے کہ کرتی ہے شکایت میری
مست مجھ کو تو گلہ ہے نہ کسی سے شکوہ
صدقہ تاڈی مانگاں

پرسشِ غم کے لئے تم پہ پریشاں لیکن
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری
آئینہ پاپ نہ دیکھا کریں چپکے چپکے
آئینہ پیش نہ کر دے کہیں صحت میری
خنجر و گل وہ چڑھانے کے لئے کیا آئے
بارِ احساں سے دبی جاتی ہے قربت میری
کچھ پہر وقت قصیدیں رہا کرتے ہیں
قابلِ رشک بنی جاتی ہے خلوت میری
وہ پہ عیش و طرب کی ہیں اُداکیں محفلیں
راحتِ جاں ہے اگر سوزِ مصیبت میری
عادل ۔ چالیگانوی (مالیگاؤں)

جو نہیں سنتے ہیں وہ روداد محبت میری
اُن کو محسوس کبھی ہوگی ضرورت میری
آستاں خود ہی مرے پاس چلا آئے ہے
کتنی بے توشہ لے دوست عبادت میری
اپنے ہمراہ مجھے زیبِ مشقت لے چل
ہو نہ جائے کہیں جنت میں فراغت میری
کیوں ہیں وہ میری پریشانیٔ خاطر پہ اداس
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتا فطرت میری
مذکرہ ہو نہ بھری بزم میں میرے کا عادل
آ نہ جائے کہیں رنگیں طبیعت میری
عزیز ناگ پوری ۔ مالیگاؤں

کیا گئی آئے کہاں شورشِ وحشت میری
اُن کی صورت میں نظر آتی ہے عظمت میری
اشک فرقت میں بہا کرتے ہیں جب آنکھوں سے
کہیں بہہ جائے نہ طوفاں میں محبت میری
خود چلے آئیں گے کہتا کہ وہ مرجع اس کی
کام کر جائے گی بڑھتی ہوئی وحشت میری
جانے کیا سوچ کے بیٹھے تھے جو کل بزم میں وہ
آج ٹھکرا کے گئے پاؤں سے قسمت میری
یہ سُنا کرتا ہوں کل شام و سحر فرشتوں سے
جو کیا کرتے ہیں پیغمبروں سے شکایت میری

مخمور فرشتوی الٰہ

جب کبھی وہ بزمِ قسمت یاد کبھی آتے ہیں
چاند کا ٹکڑا ہے یا ہے چاند کا ٹکڑا ہے وہ
تیری نظروں سے گرا ہوں تو کوئی غم نہیں
مجھ سے بخت پہ جب اُن کی عنایت ہوگی
وقت کے ساتھ بدل جائے گی قسمت یہ
پھول کے ساتھ ہیں کانٹے بھی کبھی کی زینت
اس لئے آپ کو بھی ہوگی ضرورت یہ
جن کی قدرت نہیں مقصود گوارا مجھ کو
جانے کیوں ان کو برا کہتے ہے قدرت یہ
روشن لکھنوی

امید مجھ کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
مجھ کو رسوا نہ کہیں کر دے محبت میری
آتشِ عشق بھڑک اُٹھے گی جب بجھا دل
پھر نہ بجھے گی وہ کتنی ہی نہ جائے پانی
سر پہ گر ڈھا کے گرے کوہِ الم تو کیا غم
وہ جب آجائیں گے منجائے گی قسمت یہ
آپ نظروں سے گرائیں نہ خدارا مجھ کو
تاکہ دُنیا کی نظر میں ہے وقت یہ
مجھ سے وہ آکے چھپیں پھر کہ یقیں ہے روشن
کھینچ لائے گی انہیں بڑھ کے محبت یہ
گوہر ۔ بھنڈ

اب تو فرقت میں بہت غیر ہے حالت میری
اب تو آجا کہ سنبھل جائے طبیعت میری
غیر نہ کر دیں رسوائے زمانہ اُن کو
وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہے شرارت میری
مرضیِ عشق بہانوں سے بتائے نہ بنے
جب وہ آئیں گے سنبھل جائے گی حالت یہ
مجھ سا جانباز نہ ملے گا کہیں جب تم کو
زندگی بھر نہیں بھولے گی الفت میری
لاکھ روکے کہ ستاتا ہوں مگر اے گوہر
کوئی سنتا نہیں یہ روداد محبت یہ
چھوجی شمیم دنیلوفر ۔ بھنڈ

بڑھ گئی اور جفاؤں سے محبت میری
لاکھ بدلی نہ بدل پائے طبیعت یہ
وہ زمانے سے مرا حالِ زبوں پوچھتے ہیں
کاش سنتے وہ مرے منہ سے حکایت یہ
آہ جی بھر کے ستم ڈھاؤ ستاؤ مجھ کو
کل نہ ہوں گا میں تو پھر کس کی اذیت یہ
تیری الفت میں ہم گر تڑپے کو بچے کے سوا
کہیں گفتہ نہیں کم بخت طبیعت یہ
نام سے اُن کی محبت سے ہر اک سہم گیا
دیکھ کر راہِ محبت میں مصیبت یہ
لعت اللہ خاں لعت

اک زمانے سے جُدا گانہ ہے فطرت میری
شکرِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری
بھر مُردوں کہیں رسوا نہ ہو الفت میری
یاد رکھنا تمہیں لازم ہے حدیث یہ
شدتِ غم سے کہیں آنکھ سے آنسو ٹپکیں
بے گوارا نہ کرے گی کبھی غیرت
وقتِ آخر مری باہیں سے نہ اُٹھ کر جانا
لکھ رہی ہے تمہیں حسرت سے محبت

تم کو اللہ نے قدرت وہ عطا فرمائی
تم جو چاہو تو زمیں و زماں بدل جائے

ہے بیانِ حالِ گفتہ کو زبانی میری
کیا کروں بانیِ اظہار ہے فطرت میری
ہے جنوں کی وہ ثنا سنجی کہ میں بھی جس پر
تو اگر جوہرِ فرشتہ ہے طبیعت میری
چرخ چمرخ کچھ اسے زیادہ جو گی
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت یہ
اس سے پہلے کہ کوئی اُن کا نشاں پوچھتا تھا
اُن کی شہرت کا ذریعہ ہے محبت میری
مسکراتے ہیں چمکتے ہیں صاف و منکسر
غم کا آئینہ ہے ہر ایک مسرت میری
منکسر رکاں

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری

شکوۂ جور و جفا کی نہیں عادت میری
اذنِ اجازت ہی نہیں دیتا ہے صاحب میری
بانہ جو ہے میں نظر آتا ہے ، مستانہ پنے
پھر بھی حیرت ہے کہ جاتی نہیں حیرت پیسا
کبھی مسجد کبھی میخانہ کبھی دیر میں
اب گرانے کو گرائے کوئی قیمت میری
میں سمجھتا ہوں فقیری میں ہے عزت میری
ہے پاکر گی تو ہے فقر و غنا کی تقسیم
ایک دُنیا ہے کہ کرتی ہے شکایت میری
مست مجھ کو تو گلہ ہے نہ کسی سے شکوہ
صدقہ تاڈی مانگاں

پرسشِ غم کے لئے تم پہ پریشاں لیکن
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری
آئینہ پاپ نہ دیکھا کریں چپکے چپکے
آئینہ پیش نہ کر دے کہیں صحت میری
خنجر و گل وہ چڑھانے کے لئے کیا آئے
بارِ احساں سے دبی جاتی ہے قربت میری
کچھ پہر وقت قصیدیں رہا کرتے ہیں
قابلِ رشک بنی جاتی ہے خلوت میری
وہ پہ عیش و طرب کی ہیں اُداکیں محفلیں
راحتِ جاں ہے اگر سوزِ مصیبت میری
عادل ۔ چالیگانوی (مالیگاؤں)

جو نہیں سنتے ہیں وہ روداد محبت میری
اُن کو محسوس کبھی ہوگی ضرورت میری
آستاں خود ہی مرے پاس چلا آئے ہے
کتنی بے توشہ لے دوست عبادت میری
اپنے ہمراہ مجھے زیبِ مشقت لے چل
ہو نہ جائے کہیں جنت میں فراغت میری
کیوں ہیں وہ میری پریشانیٔ خاطر پہ اداس
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتا فطرت میری
مذکرہ ہو نہ بھری بزم میں میرے کا عادل
آ نہ جائے کہیں رنگیں طبیعت میری
عزیز ناگ پوری ۔ مالیگاؤں

کیا گئی آئے کہاں شورشِ وحشت میری
اُن کی صورت میں نظر آتی ہے عظمت میری
اشک فرقت میں بہا کرتے ہیں جب آنکھوں سے
کہیں بہہ جائے نہ طوفاں میں محبت میری
خود چلے آئیں گے کہتا کہ وہ مرجع اس کی
کام کر جائے گی بڑھتی ہوئی وحشت میری
جانے کیا سوچ کے بیٹھے تھے جو کل بزم میں وہ
آج ٹھکرا کے گئے پاؤں سے قسمت میری
یہ سُنا کرتا ہوں کل شام و سحر فرشتوں سے
جو کیا کرتے ہیں پیغمبروں سے شکایت میری

مخمور فرشتوی الٰہ

جب کبھی وہ بزمِ قسمت یاد کبھی آتے ہیں
چاند کا ٹکڑا ہے یا ہے چاند کا ٹکڑا ہے وہ
تیری نظروں سے گرا ہوں تو کوئی غم نہیں
مجھ سے بخت پہ جب اُن کی عنایت ہوگی
وقت کے ساتھ بدل جائے گی قسمت یہ
پھول کے ساتھ ہیں کانٹے بھی کبھی کی زینت
اس لئے آپ کو بھی ہوگی ضرورت یہ
جن کی قدرت نہیں مقصود گوارا مجھ کو
جانے کیوں ان کو برا کہتے ہے قدرت یہ
روشن لکھنوی

امید مجھ کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
مجھ کو رسوا نہ کہیں کر دے محبت میری
آتشِ عشق بھڑک اُٹھے گی جب بجھا دل
پھر نہ بجھے گی وہ کتنی ہی نہ جائے پانی
سر پہ گر ڈھا کے گرے کوہِ الم تو کیا غم
وہ جب آجائیں گے منجائے گی قسمت یہ
آپ نظروں سے گرائیں نہ خدارا مجھ کو
تاکہ دُنیا کی نظر میں ہے وقت یہ
مجھ سے وہ آکے چھپیں پھر کہ یقیں ہے روشن
کھینچ لائے گی انہیں بڑھ کے محبت یہ
گوہر ۔ بھنڈ

اب تو فرقت میں بہت غیر ہے حالت میری
اب تو آجا کہ سنبھل جائے طبیعت میری
غیر نہ کر دیں رسوائے زمانہ اُن کو
وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہے شرارت میری
مرضیِ عشق بہانوں سے بتائے نہ بنے
جب وہ آئیں گے سنبھل جائے گی حالت یہ
مجھ سا جانباز نہ ملے گا کہیں جب تم کو
زندگی بھر نہیں بھولے گی الفت میری
لاکھ روکے کہ ستاتا ہوں مگر اے گوہر
کوئی سنتا نہیں یہ روداد محبت یہ
چھوجی شمیم دنیلوفر ۔ بھنڈ

بڑھ گئی اور جفاؤں سے محبت میری
لاکھ بدلی نہ بدل پائے طبیعت یہ
وہ زمانے سے مرا حالِ زبوں پوچھتے ہیں
کاش سنتے وہ مرے منہ سے حکایت یہ
آہ جی بھر کے ستم ڈھاؤ ستاؤ مجھ کو
کل نہ ہوں گا میں تو پھر کس کی اذیت یہ
تیری الفت میں ہم گر تڑپے کو بچے کے سوا
کہیں گفتہ نہیں کم بخت طبیعت یہ
نام سے اُن کی محبت سے ہر اک سہم گیا
دیکھ کر راہِ محبت میں مصیبت یہ
لعت اللہ خاں لعت

اک زمانے سے جُدا گانہ ہے فطرت میری
شکرِ غم بھی نہیں چاہتی فطرت میری
بھر مُردوں کہیں رسوا نہ ہو الفت میری
یاد رکھنا تمہیں لازم ہے حدیث یہ
شدتِ غم سے کہیں آنکھ سے آنسو ٹپکیں
بے گوارا نہ کرے گی کبھی غیرت
وقتِ آخر مری باہیں سے نہ اُٹھ کر جانا
لکھ رہی ہے تمہیں حسرت سے محبت

تم کو اللہ نے قدرت وہ عطا فرمائی
تم جو چاہو تو زمیں و زماں بدل جائے

مانی نیں۔ جیں پیدا

ہانہ کی فلم میں ہے [illegible] میری — تھیں پا پہ تہ ہوتی ہے جدا ت میری
ہیں ہیں سے مجھے جاتے ہیں ہم کو جانب — کو ہم نہ ہیں سے آتی ہے لمت میری
ہ جہاں مقصد میں چلے آتے ہو — ہو نہ جائے کہیں بدنام محبت میری
ہ اگر ہا سا کر دیں ہو اشارہ ماتی — ٹھہر ہو جائے گی دم بھر میں حیثیت میری

ہز آس کا لی۔ مانیگانوی

ام ہو جائے گی اس بزم میں چاہت میری — رنگ لائے گی کسی روز محبت میری
یا اٹھائے گا کوئی خنجر مری راہ میں سر — یا محبت نے جو کی کچھ بھی حمایت میری
یا یہ معلوم نہیں آپ کو یا اہل چمن — خنجر و کل بھی چمکتے ہیں بدولت میری
ہم حضرت کا آل کی بدولت فانوس — سارے عالم میں نمایاں ہوئی شہرت میری

اوان انصاری۔ سلطان پوری (مانی گانوں)

چاہ داں ہے مرا اور یہی حسرت میری — کو چہ یار میں اے کاش ہو تربت میری
جس سے امید تھی کچھ لطف و کرم کی مجھ کو — دیکھ کر چل گئے افسوس وہ صورت میری
ہے کرو اور کوئی شیخ سنو اور پہلے — بعد میں دیکھنا تہذیب لیا ت میری
دعا میں تیری جفاؤں کا وفاؤں کا جواب — آزمائے گا کہاں تک تو شرافت میری

نیم اسعدی۔ بھاگلپوری

ہاد صدی اگلی روداد محبت میری — رنج و غم اور اٹھائے گی طبیعت میری
تو نے زنجیر جو پہنا دی سر بزم مجھے — اس سے تو اور فزوں ہو گئی شہرت میری
مجھ کو پھر کوئی مسرت کی تمنا نہ رہی — آشنا ہو گئی جب غم سے طبیعت میری
یوں نہ جذبیت کی آنکھوں سے مجھے تھی تکیم — اُن کے گیسو سے جو وابستہ ہے قسمت میری

شیہ یلی بھیتی

فیر ہم سے کبھی بھرتی نہیں نیت میری — پھر تجھ کو گانہ مرے شوق سے فطرت میری
ہا محبت پہ مجھے فیر کا ہوتا ہے گماں — تیری چاہت نے بنائی وہ بُری گت میری
ڈ حسن بنا دیتا ہے سیماب مجھے — رہنے دیتی نہیں بے حسن مجھے مطرب میری
جذبہ حسن سے بے ثانی دل ہے شیدا — نغمہ ساز اسکوں سے ہے الگ گت میری

اصغر۔ پیلی بھیتی

سب جہاں آپ کو ہو جائے گا آئینہ میں — دیکھئے دیکھئے پھر خود سے صورت میری
طا ہو گی ہو آپ کی فرقت میں مرا — آپ نے دیکھ تو لی ضبط کی طاقت میری
ہتا کار نہیں آپ کی الفت مجھ سے — دل مضطر کہے کیوں دیکھ کے صورت میری

ہت ہو آج زمانے سے وفا کی اصغر
مجھ سے اے دوستاں ہو گی نہ شکایت میری

نڈر اجراوی۔ کلکتہ

گوش کرتا ہے سر بزم شکایت میری — رنگ لائے نہ کہیں دوست حکایت میری
دیکھئے پہ چھتے ہیں آج وہ سبھے ہے سے — کیوں ضروری ہے تری بزم میں شرکت میری
دل کے ہر گوشے میں طوفان اٹھا لیکن — شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
سمجھو گے تم تو کوئی بیگانہ و دیوانہ آخر — دوستو! تم نہ بتانا کہیں ترتیب میری
محبت رنج بلا۔ لے

ہن کو بانے کی تمنا تھی فضا فت میں — دل میں گھٹ گھٹ کے گرہ گئی حسرت میری
جن کی خاطر سے محبت کے ستم سہے — دو مرے ہو نہ سکے اہ یہ قسمت میری
راز دل غیر کے آگے نہ عیاں ہو جائے — شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
حشتی جونپوری۔ کلکتہ

تم توجہ سے اگر دیکھ لو صورت میری — دور ہو جائے گی ہر ایک مصیبت میری
خاک چھنوائے گی در در کی محبت میری — اک جگہ رہنے نہ دے گی کبھی وحشت میری
تم نہ جب آئے تھے تو دل کو سکوں تھا حاصل — اور جب آگئے تم بڑھ گئی وحشت میری
فائدہ ایسے گلستاں میں سمجھا رہنے سے — جس جگہ تنکے برابر نہیں قیمت میری
نذیر احمد تپشی۔ مانی گانوی

مطمئن آج بھی یہ سوچ کے ہو جاتا ہوں — رنگ لائے گی کسی روز محبت میری
لے کے آیا ہے کہاں مجھ کو جنون الفت — فرق حیرت ہے جہاں دیکھ کے حیرت میری
مجھ کو اب توبہ کی تلقین جفا ہے زاہد — دیکھ کے منہ کو بدل جاتی ہے نیت میری
جب زمانہ ہی محبت کا ہے دشمن فہمی — کیا سنے گا کوئی روداد محبت میری
وکی پیلی بھیتی

کس قدر غیر سے خود دار ہے فطرت میری — شرکت غم کی نہیں چاہتی غیرت میری
کیوں نہ دنیا کی نگاہوں میں ہو عظمت میری — دونوں عالم کی نعمتیں ہے بدولت میری
کچھ تمہیں بڑھ کے سہارا دو تو ہم دم چل — آگے بڑھتے نہیں دیتی مجھے قسمت میری
ہدو دقی اوفی خادم شہ معراج سفر — فرش تا عالم لاہوت ہے شہرت میری
تشہر جودھپوری

فاصلے دور سے کترا کے نکل جاتے ہیں — غالب عزم سفر رہتی ہے جرأت میری
یہ مرے ناکہ بہت ہیں مری سننے والے — کیا گوارا کرے گی اسے غیرت میری
قیمت حشتی بڑھی، زلف ہوئی جب برہم — مانگی اور بڑھتی ہوئی قسمت میری
مجھ سے محشر میں خدا پوچھے تو کہدوں تم ہو — دعا میرا، تمنا مری، حاجت میری
ضیاء الحق قمر۔ پرتاپ گڑھی

ہیں پہ کل بات سر بزم حقیقت میری — اس سے لگی ہی کہاں [illegible]

ہے بڑی بات سے فرصت نہیں دل کو ذرا بھی
ہمسا اس کا سبب وہ بہت تھا یہ نہ تھا یہ
کھل گیا آج بھرم ان کی محبت کا ضیاء
دل کے دامن میں خزاں ہے صورت میری
دامن چھپا لیا

ہائے من ہے بچپن سے طبیعت میری
آپ دیکھیں تو سہی دل کی طرف کر کے نظر
آپ کے دل میں نظر آئے گی صورت میری
ہاتھوں ہی آنکھوں میں ہم جاتی ہے اکثر بیتی
نسیم باغ رنگون

شکلیں بھر کی کچھ اور بھی مشکل ہوں گی
شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
کہہ دو اس سے کہ کرے ظلم وہ جتنا چاہیں
جب سے ہوگئی مانوس طبیعت میری
باد صرصر نہیں ہو سکتی ہے جب باد نسیم
کیسے ممکن ہے بدل جائے گی فطرت میری
محمد حسین گوڑ گڑ صدیقی۔ حیدرآباد

اچھے اچھوں کو ٹھکانے سے لگایا میں نے
کوئی اکڑ فنا دیکھے تو شرافت میری
سر تو کہدے ہیں مگر دل ہے خدا نادیدہ
اس طرح ہوتی ہے لے شرع عبادت میری
تم جو دیکھے کے چلے دور تو چا سکتا ہوں
آزمائش فنا دیکھو تو محبت میری
اثر لکھنوی

پیت نہیں سلطان کسی بیدرد دل کو
تیری فرقت میں جب جو گئی حالت میری
جان دی جاتی ہے مر مٹنے میں عاشق کیونکر
امتحان سے کبھی ڈرتی ہے جرأت میری
نقد جان کیا جان گیا دی دل بھی دیا
اب نہ کہنا کہ نہیں قدر کو محبت میری
ذکیہ بانو ذکی۔ کلکتہ

اس کے دل میں نہیں گر آہ محبت میری
ایک دن ہو گی مگر ان کو ضرورت میری
ہر کہ بیتاب مرے سامنے وہ آئیں گے
رنگ لائے گی کسی روز محبت میری
نظم پڑھ دیجئے ہے آپ کی شہرت اخوں
ہر زباں آپ ہوں اب آپ میں قوت میری
بدا ظفر نیشی۔ ورنگ

اک طرف سنگ دلی ایک طرف مظلومی
تا بکے اور رہے گی یہی حالت میری
سب تو کہتے ہیں سبھی پر حقوق انسانی
کوئی کہتا نہیں اور وقت ہے حالت میری
حوصلہ بادل نہ کہے بند تو یہ حالت ہے
دوستوں کو نہیں محفل میں ضرورت میری
حامد صہرائی سکتہ (ایم۔ پی)

کیا گناہ ہے کہ دل پہ تو ہے حکومت میری
جس کو دیکھا ہے ہیں جو رکھتی ہے طبیعت میری
اس کے جلوے تو ہر اک سمت نظر آتے ہیں
پھر کو حیران نظر رکھتی ہے حیرت میری
کچھ فغاں میری نہ جائے گا بالی حامد
سن سبھی لیں گے مگر کون ہے سنتا میری

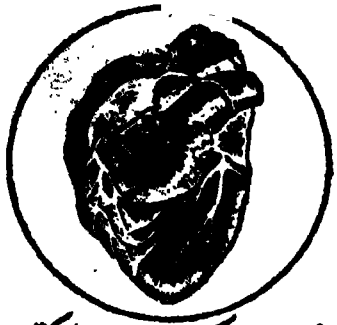

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے، خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

[redacted]

دہلی — کانپور — پٹنہ

ستمبر
۱۹۶۳

جلد ۱۴
شمارہ ۹

فہرس

۱	غزلیں ہوئی غزل نعت میں	آبا اصفی گنوری	۳
۲	دربہ کلاں دہلی کا ایک گمشدہ نشین شاعر	فرحہ قریشی	۴
۳	جذبی افریقہ	جوش ملسیانی	۱۳
۴	دو غزلیں	میکش اکبرآبادی - منیار فتح آبادی	۱۴
۵	غزلیات	تاذک اصفی - منزل رہا شیوری	۱۵
..		جلیل بہار صدیقی	۱۶
۶	افکارِ نو	تسخیر احمد فنی - ظہیر عظمت - مسلم سنگری	۱۷
۷	غزل	ظہور احمد سرور	۱۸
۸	میری مطربہ	کوکب شہیری	۱۹
۸	کاروان آزادی	رؤف پرویز	۲۰
۸	جلال و جمال	علامہ سیاک بند بندی - عادل ادیب	۲۱
۹	"	منظر نقاش - فرشی انصاری	۲۲
۹	"	محی الدین محی - صدیق شبنم	۲۳
۹	اندھا کنواں	عادل رشید	۲۴
۱۰	پیچھے ادھورے رہ گئے	منظر بھاگلپوری	۲۵
۱۱	پندرہ اگست	بدر القریشی	۲۶
۱۲	مشاہدات و سطور	منظر حسنی ہمدمی	۲۷
۱۳	جھوٹ کی عادت نہیں مجھے	ش نذیر الدین ساز	۲۸
۱۳	پھر اس کے بعد	حبیب اشرف ساحل	۲۹
۱۵	طرحی مشاعرہ نمبر ۳۸ (فہرست شعرا و کلام)	مرتبہ شفا گوالیاری	۳۰

ہفتہ وار
دربہ کلاں - دہلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصہ نظم
حضرت مولانا آبا اصفی گنوری
ناظم مشاعرہ
حضرت شفا گوالیاری
ایڈیٹر
بلبل جین
معاون خصوصی
بہر ہاشمی
خرد فروش پوری

قیمت
۳۱ نئے پیسے

قمر احسن گلوری

نواب دہلوی منزل نعت میں

[illegible] شاعری کی زبان سے تعلق ہو اور اس سے [illegible] ہے۔ پڑھنے والے شعرا کرام [illegible] سے گئے۔ انقلاب [illegible] اور [illegible] کی [illegible] ہے۔ اگرچہ انقلاب [illegible] کا [illegible] دہلی [illegible] ہے [illegible] اب کم ہیں مگر [illegible] ہے [illegible] اپنا [illegible] ہے۔

انقلاب [illegible] کے [illegible] تک [illegible] کیا۔ لکھنؤ (یوپی) میں قدم رکھنے کے چھ ہی سال بعد [illegible] پہنچے یہاں ان کی [illegible] دانی ہوئی اور [illegible] کے بعد [illegible] مرکز ادب اور شعر کی [illegible] گیا۔ یہاں لکھنؤ کی شعر و ادب اور اس کی تمام لطافتیں [illegible] تھیں۔ اس سرزمین نے وہ [illegible] پیدا کئے جو کا [illegible] ہوا اور [illegible] شعر کی [illegible] اس سرزمین کو [illegible] حاصل [illegible] کہ یہاں انقلاب نہیں آئے یا کم از کم [illegible] ہیں اس کی ادبی و شعری روایات [illegible] بلکہ ترقی پذیر رہا [illegible] کہ [illegible] لکھنؤ کا شعر و ادب اسی زبان سے سرچشمہ اور [illegible] یہاں متقدمین کی [illegible] ہیں۔ ملک [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] کا [illegible] ہوا [illegible] کا [illegible] لکھنؤ کے [illegible] کا سلسلہ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] گیا لکھنؤ کے [illegible] نظام شعر و ادب کے [illegible] ہیں۔

یہاں ایک [illegible] بات یہ [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] ہے اور لکھنؤ میں کوئی دوسری [illegible] بات نہیں۔ مجموعی نظام [illegible] ایک [illegible] ہے [illegible] کی [illegible] ہیں۔ مگر قدرت کا اصول یہ ہے کہ ہر [illegible] تبدیل ہو جاتا ہے۔ [illegible] بدل جاتا ہے۔ ایک دور [illegible] میں فرق پڑ جاتا ہے۔ [illegible] دہلی اور لکھنؤ کا [illegible] ہونے کے باعث کچھ [illegible] سے کچھ الفاظ کچھ تذکیر و تانیث میں فرق ہے جو قدرتی ہے شعر کے انداز بیان میں فرق ہونا بھی قدرتی ہے اس کے سوا دہلی، لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں کوئی فرق نہیں۔ وہ لوگ نادان ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کو [illegible] کہتے ہیں [illegible] ہوا [illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible] دہلی اور لکھنؤ کی یکساں عزت و عظمت کرنی چاہئے کیونکہ ایک کا [illegible] دوسرا کی [illegible] ہیں۔

نواب [illegible] جیسا کہ دہلوی کی نسبت سے [illegible] ہے دہلی میں پیدا ہوئے، اسی ماحول میں پلے بڑھے اور جو [illegible] تھے پیدا ہوئے تو [illegible] کے [illegible] حضرت [illegible] میں جگر نے [illegible] سے [illegible] کیا [illegible] کر سکتا۔ [illegible] نے [illegible] کر [illegible] سے [illegible] کیا۔ [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] نے [illegible] کی [illegible] کا [illegible] بنا [illegible] کے [illegible] وہ [illegible] شاعری کا [illegible] نقش [illegible]۔

لکھنؤ کا [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] شعر [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] تمام [illegible] ذوق کو [illegible] سے [illegible] ہے [illegible] شاعر [illegible] کہ [illegible] ہے۔ [illegible] پریشیں [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] ہے

[illegible] نہیں بلکہ [illegible] کے [illegible] رہتا۔
حضرت آرزو سے تلمذ کے [illegible] دل [illegible] میسر [illegible]
حاصل نہ کرتے کیونکہ [illegible] چھ ایک گروہ [illegible]
سے فیض حاصل کرتا تھا۔

انھیں خوش نصیبوں میں نواب دبیر الدولہ [illegible]
پر گئے۔ شاعرانہ [illegible] ہی سے [illegible] کر آسمان [illegible] یہاں
[illegible] کمال کی [illegible] اثر قبول [illegible] خوبیوں کو [illegible] چمکایا
کرنے کو سلطان سخن بنا دیا اور آغا نواب دبیر الدولہ [illegible]
ہم شاعری پر ناز [illegible] اور [illegible] اعلیٰ [illegible] استاد
سے حاصل کی تھی اپنے تلامذہ پر صرف کر رہے ہیں۔

بہر آئینہ یہ ہے کہ انسان کو قابلیت کم اور عقیدت
زیادہ مقبول و معزز بنایا کرتی ہے۔ جو لوگوں نے اپنے [illegible]
[illegible] سے بھی عقیدت (نمائشی نہیں) کا تعلق رکھا وہ یقیناً
عزت، شہرت اور مقبولیت کی کرسی پر بیٹھے اور خدا کا وہ
وعدہ جو اس نے قرآن میں کیا کہ "حقیقت خدا پیمبر کا دل
اور [illegible] کے ساتھ ہے" پورا ہوا۔ مجھے علم ہے کہ نواب
دبیر الدولہ کو اپنے استاد سے یہ پناہ عقیدت ہے اس نے
خدا بھی ان کو معزز بنایا ہے اور ان کے ساتھ ہے۔

نواب دبیر الدولہ صف متقدمین غزل کے خوش گو اور بہتر
شاعر ہیں۔ ان کا [illegible] و [illegible] کلام ان کے [illegible]
پسند کرتے ہیں اور یہی ان کے کمال کی سند ہے۔ مگر میں اس
وقت ان کی غزل کی بابت کوئی ذکر کرنا نہیں چاہتا، وہ تو
ان کا طرۂ امتیاز ہے ہی، میرے سامنے ان کا ایک نہایت
مختصر مجموعہ نعت ہے جس کا نام طلوع سحر ہے جو ۳۵
صفحات پر مشتمل ہے قیمت [illegible] ہے اور [illegible]
رفیع الدین قدوائی روڈ، لکھنؤ [illegible] سے مل سکتا ہے۔
اس میں [illegible] غزلیں، قطعات وغیرہ ہیں، اہل نظر
[illegible] جانتے ہیں کہ نعت کا [illegible] [illegible] بہت کٹھن
گھاٹیوں کی وجہ سے [illegible] [illegible] اور
شاعر [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

یا تھا کہ ہم کتنے گمراہ انسان کے ضمیر کی
تھی اور کا نظر آ رہا تھا کہ ایمانی
ہدایت کے پیمانہ میں تو [illegible]
ہے کہ انسان کی [illegible]

سلام اس پر کہ جو آئینہ جس نے حقیقت کا
دکھایا اس پہ جو راستہ جس نے ہدایت کا

اس بند میں نواب دہلوی نے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جب رسول اللہ کی بعثت ہوئی تھی اور دنیا پر جاہلیت کے حکام کو بھلا بیٹھی تھی۔ انسان شیطان کے پیچھے تھا۔ شیطان ایمان بیچ چکا تھا۔ جہالت ایک رسم بن گئی تھی۔ اور اس رسم کے پردے میں ہر وہ عمل ہوتا تھا جو انسانیت کے لئے داغ بد نما ہو۔ شرک کا زور تھا۔ بندے بندوں کے خدا بنے ہوئے تھے۔ خدا کی حکومت کہیں نہیں رہا تھا۔ ایسے ہی وقت رسول کی بعثت ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم دنیا میں تشریف لائے اور ان کے نام خدا ہی بندگی جڑ گئی۔ بندے اور خدا کا رشتہ پھر قائم ہو گیا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جو حالات اس وقت تھے کیا وہی بلکہ اس سے زیادہ بدتر حالات آج نہیں ہو گئے ہیں؟ کیا یہ وہی زمانہ جس میں نہ ہندی اور مسیحا کی آمد کی دیر ہے اور دین کو تازہ کرنے کا مژدہ

۹۴ ——— دوشعر سنئے ۔

بیک کے قدرے ہیں مستوں کی زبانوں پہ
گھیروں سے گونجا ہے توحید کا خانہ
سیراب ہی محشر تک توحید کے متوالے
اک جام بھرا پایا ہے مے خانے کا خانہ

اس والہانہ انداز، مستانہ روش اور جوش عقیدت کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ توحید کے مستانے مانگیں اور اللہ اکبر کے نعروں سے پوری دنیا جس کو ہم شخصیت بعد تعبیر دے سکتے ہیں گونج رہی ہے اور ان نعروں کی طاقت دیکھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو گا جب ہر وقت ہر جگہ کے مسجدوں سے پانچ بار اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے، سبحان اللہ یہ

تھے۔ ان بندوں نے کہ جن کے سر خدا کے آگے جھکا
دیئے تھے اور جو جام صہبائے محبت کے پی کر مست الست
ہو چکے تھے۔ ان کی قدر دنیا نہ کرے تو کیا کرے
ہے۔ چرخ مشہ۔

ایک نظر ہے محبوب خدا۔ ازل سے آخر تک کیسا
لکھا ہے۔ ماضی کا نقشہ اس بہتر کھینچا ہے کہ دور آغاز
رسالت کا نقشہ نگاہوں میں کھنچ جاتا ہے۔ حکایات کی
اچھی نقشہ کشی کی ہے۔ اس کے تین بند ملاحظہ ہیں۔

وہ دور جہاں دور جہالت جسے کہئے
وہ دور جہاں دور خباثت جسے کہئے
وہ دور جہاں دور ہلاکت جسے کہئے
وہ دور جہاں دور قیامت جسے کہئے

انسان کا انسان گلا کاٹ رہا تھا
بدکار شرافت کا لہو چاٹ رہا تھا

وہ دور کہ دن رات ریا کرتی تھی ان بن
وہ دور کہ صدق جاک تھا اور صاف کا دامن
وہ دور کہ ہر گام تھا تہذیب کا مدفن
وہ دور کہ پامال تھا اخلاق کا گلشن

جھوٹے سے کہیں ذکر نہ تھا شرم و حیا کا
بدرنگ تھے ایسے کہ نہ تھا خوف خدا کا

جس وقت کہ انسان تھا شیطان سراپا
جس وقت برائی ہی برائی کا تھا چرچا
جس وقت کہ ہر سمت تھا باطل کا اندھیرا
کافور تھا جس وقت صداقت کا اجالا

لگی وہ کلی پھوٹ کے نکھرنے مہکنے
ہر ذرہ چمکنے لگا انوار خدا سے

واقعات کے لحاظ سے ہر مصرع صداقت کی تصویر ہے
محمد کی شاہد صادق تاریخ ہے۔ پہلے بند کا چوتھا مصرع
"وہ دور جہاں دور قیامت جسے کہئے" نواب صاحب
نے کس معنی میں کہا ہو۔ لیکن یہاں قیامت کا حقیقی
معنی مراد ہے۔ [illegible]

کہنے کی ضرورت نہیں ہوتا ہے کہ [illegible]
ہونے کا مظہر ہے۔ آیات متشابہات میں سے ہے
جس کے متعلق خدا خود کہتا ہے کہ میرا نبی بھی ش
کا کوئی نہیں جان سکتا۔ میں خدا ہی جانتا ہے کہ قیامت
مطابق کب آ جائے گی۔ لیکن اس کی [illegible]
یہ واقعات بتائے اس کی تصدیق زمان و مکان کی گ
ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ میں مردوں
زندہ کروں۔ میں قیامت ہوں۔ یہ میں نے انجیل کی آ
ثبوت میں پیش کی ہے

(۸۲) رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک
نے پوچھا حضور قیامت کب آئے گی؟ حضور نے انگ
خباثت سے ڈرکر پوچھا کہ آخر کیا کرنا ہے کہ قیامت جلد
نزدیک ہے۔

(۸۳) یہی سوال دوسرے موقع پر کسی صحابی نے
آپ نے فرمایا قیامت مجھ سے کئی ہوئی ہے۔ اب ان دو
حدیثوں اور ایک آیت انجیل سے اس کے صحابہ ثابت
ہے کہ پیغمبر کا وجود ہی قیامت ہے جس کے ساتھ نئی اور
اچھی ہے اور ضلالت و گمراہی نیز برائی کا خاتمہ
توحید کے ڈنکے از سر نو بجتے ہیں

تیسرے بند کا تیسرا شعر بھی گرفت کا شعر ہے
یہ گرفت اتنا خوبصورت، اتنا گہرائی ہے کہ روح جھو
ہے سبحان اللہ اور پھر زور بیان کے ساتھ حسن بیا

"لگی وہ کلی پھوٹ کے نکھرنے مہکنے"
ہر ذرہ چمکنے لگا انوار خدا سے"

اس نظم کا آخری بند پیش کرنے کے قابل ہے
کہ لذت بخشنے سے زیادہ فکر کی دعوت دیتا ہے
اگر بات سمجھ میں آ جائے تو پھر عمل کی۔ فرماتے ہیں۔

تعلیم یہ جس کی کہ سب انسان ہیں برابر
آدم ہی کی اولاد ہے ہر خاک کا پیکر
[illegible]
[illegible]

یفیت ہے قیامت اس آخر کرم کا
باقی نہ رہا فرق عرب اور عجم کا

آیئے پھر اصلی کی تلاش پر غور کریں، کیا پہلی دنیا اور آج کی دنیا میں کوئی فرق تھا؟ کیا آدمی کے آدمی کے ظلم کی کوئی نئی طرح ایجاد ہوئی تھی؟ کیا فلسفوں سے دماغ خالی تھے؟ کیا آقا خوش یہ اختیار نہ رکھتا تھا کہ غلام کو جان سے مار ڈالے؟ وقت نسبی پوچھا نہیں کیا جاتا تھا یہ سب کی عادتیں تھیں۔ یہ کیا حقیقت تھی۔ خود رسول کے زمانہ میں بول کو ایمان لانے کی پاداش میں ان کے مالک یہود کیا کیا طرح کے آزار نہ دیتے؟ اور ایک بلال کیا متعدد غلام صحابیوں کے ساتھ یہ بدسلوکی اور عذاب سہا۔ اس کا بہت کچھ آج بھی ہماری دنیا اور ہمارے ملک ملتا ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔

کسی ایسی خرابی کا انسداد جو مستقل ہو چکی ہے قدرت نہیں کیا کرتی۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے فتنے شدت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا فساد کو زمین سے مٹاتا ہے نہیں کرتا۔ لا تفسدوا فی الارض کا یہی ہے۔ رسول کے زمانے میں خدا نے بالکل غلامی کا نہ نہیں کیا۔ البتہ ایسے قانون رسول کے ذریعہ سے ئے۔ جس نے آقا اور غلام کی سطح برابر کر دی۔ غلام اور زوجہ کا خاتمہ ہو گیا اور پنج پنج کا قانون توڑ رات کا معیار تقویٰ کو ٹھہرایا۔ ان اکرمکم اتقکم زول ان رسول سے سنوایا اور اسی طرح کے دیگر قانون قرآن جاری کر کے بڑی حد تک اپنے بندوں میں برابری کر دی۔ اگرچہ ہم آج بھی اس خدا کے قانون کو توڑنے ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ آج بھی شریف اور کمین پانچ کا سوال ہمارے معاملات سے۔ مگر چیز جس اس کر دی گئی کہ خدا کے نزدیک کوئی پنچ نہیں ہے تقویٰ کی اور قانون کے توڑنے

کو قیامت ہے یہ اس آخر کرم کا
باقی نہ رہا فرق عرب اور عجم کا

رسول اللہ نے اس آخری خطبہ میں جو حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا کہا تھا کہ جاہلیت کے سارے طریقے میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اور بیشک کیسے کیسے قرن خدا نے مٹا دیئے۔ اور انسانیت کو کتنا اونچا اٹھا دیا۔ پھر دیکھئے کہ کیا ہماری سرکشی خدا کے ساتھ سرسبز ہو سکے گی اور اس میں تو بتایا تھا فقر و ذلت نہ ہوگی۔ نہ ٹھکیل ہوگی جیسا کہ آج ہمارا نقشہ ہمارے سامنے ہے۔

ایک فلسفہ کے دو شعر کہتے ہیں

خدا ہے خالق عالم محمد رحمت عالم
زمانے میں احد کے بعد احمد ہی کا نام آیا

اور حقیقت یہ ہے۔ خدا جب اپنے مخصوص بندوں میں سے اپنے امر کی تبلیغ کے لئے چن لیتا ہے تو صرف اسی کے ذریعہ دنیا کی تاریکی شاکی ہوتی ہے۔ روشنی ہوتا ہے۔ لیکن ازل سے ابد تک کے تمام علوم اسے پڑھا دیئے جاتے ہیں وہ ان تمام خرابیوں کو دور کر دیتا ہے جو نوع انسان کی ذلت، تباہی، بربادی کا سبب ہوا کرتی ہیں اور امن کے قائم ہونے پر دنیا امن و راحت کے ساتھ تنے آسان آرام خوشی اور نیکی سے زندگی گزارتی ہے۔ دنیا بھی سنورتی ہے اور دین بھی۔ خدا کے جلوے اس ذات اقدس میں جگمگاتے ہیں وہ سراپا رحمت، سراپا کرامت اور پیکر محبت ہوتا ہے وہ۔ دیکھ تا ہے جو طاقت بشری سے ممکن نہیں اور یہی طاقت دیکھ کر بعض لوگ اسے خدا یا خدا کا اوتار مان لیتے ہیں۔ یہ عقل انسانی کا فریب ہے۔ وہ خدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ خدا کی ذات جسمانیت۔ اور پیدا ہونے نیز مرنے سے پاک ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں طاقت و عظمت کے لحاظ سے وہ خدا کا سایہ ہوتا ہے اور بندۂ دنیا پر اس زمانہ میں اس سے بہتر و برتر انسان کوئی نہیں ہوتا۔

یہ شان حضور خاتم پاک کی ہے اپنے اسلاف میں
نہ بھیجے سے کوئی طرح نہ آیا ختم آیا

خود قرآن میں ہے کہ ہم نے خدا کے [illegible]
[illegible]

نگینے کے بعد "قرینے"

آہ آسمانی کی غزلیات کا دوسرا دیوان جس میں ۲۰۰ غزلیں ایک نظم اور متروکات کی لمبی فہرست ہے عام دیوانوں سے ۳ گنا ضخیم ہے قیمت صرف 3/26 ہے۔ غزل کا سچا مذاق رکھنے والوں کے لئے یہ قرینے کا مطالعہ ناگزیر ہے کا بتایا۔ ایڈیٹر احسنی۔ گونڈہ ضلع بہرائچ۔ (یو۔پی)

مکتبہ شعلہ و شبنم کی دو خصوصی پیش کش

گردِ راہ

حضرت حیدر خانی آبادی کا تیسرا مجموعہ کلام بہت جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آرہا ہے۔ قیمت — تین روپے

حضرت خورشید پوری کا پہلا مجموعہ کلام

رنگ و بو

عمدہ کاغذ۔ معیاری طباعت۔ قیمت ڈھائی روپے

مکتبہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں۔ دہلی ۶

ماہنامہ شمع ادب سلطان پور

شفا نیر

جس میں ہندوستان کے مقبول و ہر دلعزیز شاعر اور مشہور و مستند فن کار حضرت شفا گوالیاری کی معرکہ آرا ادبی و شعری، فکری و فنی اور اصلاحی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ بیسویں صدی کے مشاہیر سخن متقدمین اساتذۂ فن اور ہمعصر شعرا کے تبصرے، تاثرات اور خطوط شائع کئے جائیں گے۔ شفا صاحب کے کلام پر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے لکھے ہوئے مضامین اور مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا جائے گا۔ شفا صاحب کی نعت گوئی پر ایک مستقل گوشہ ہوگا۔ ہر شعبہ کے ماہر فن حضرات سے مضامین کی درخواست کی جا چکی ہے۔ قیمت صرف دو روپے

منیجر ماہنامہ شمع ادب سلطان پور (یو۔پی)

بچائی محلوں کے جھوٹے وقار سے نجرانی

اور زندگی میں طوفان آگیا.....

پنجدیپ چترا کی پیش کش

گیت ——— ساحر

موسیقی ——— روی

ہدایت ——— وسنت جوگلیکر

ستارے

اشوک کمار۔ سنیل دت

نندہ ۔ تنوجہ اور آغا

آج اور کل

ہزاروں لوگ دیکھ رہے ہیں

ریگل۔ منروا پلیس

ناز۔ سدرشن

ایس۔ ایم سلور (52) رجسٹرڈ

ودربھ (ناگپور) کا ایک گوشہ نشین شاعر

ظفر صاحب کی عمر ابھی تیس برس کی ہی تھی کہ ان کے بزرگوار حضرت مرزا امیر بیگ صاحب پنشنر کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے اپنی یادگار میں تین بیٹے مرزا مجاہد حسین۔ مرزا ظفر حسین اور ایک بیٹی چھوڑی منجھلے بیٹے مرزا مجاہد حسین جن کی یادگار فرحت نام کی ۲۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو بعالم شباب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ بڑے بیٹے مرزا آغا حسین جو اپنے بہن بھائیوں کے سرپرست و مربی تھے ۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کو بھی حضرت مولانا شاہ گلشن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آغا شخص فرماتے تھے، بڑے مخلص اور کتب بینی کے بڑے شوقین تھے۔

ظفر صاحب کی تعلیم و تربیت آغا صاحب کی سرپرستی میں ہوئی۔ مرحوم نے اردو، ہندی، عربی، فارسی گھر پر اور انگریزی تعلیم انجمن ہائی اسکول ناگپور میں حاصل کی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۰ء میں فرمایا۔ [illegible]

[illegible] پہنچنے کے بعد ایک [illegible] ہو گئے اور کچھ عرصہ ریاست رکھی میں تعینات رہنے کے بعد [illegible] فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر [illegible] میں سکونت اختیار کر لی۔

فطرت کی [illegible] نے ظفر صاحب کو [illegible] عطا فرمایا ہے۔ ہر صنف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، ہائیکو، ماہیا، ہر صنف میں ان کا کلام موجود ہے۔ ان کی غزل کا انداز بیان بالکل منفرد ہے۔ ان کی غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی روانی اور بہاؤ پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی روانی اور بہاؤ پایا جاتا ہے۔

ظفر صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک سچے فنکار ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔

ظفر صاحب کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔

[illegible] کے ساتھ بلند مقام کا شاعر حضرت مولانا ناطق
[illegible] کے خاص عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ناطق
[illegible] استاد محترم کی تعریف و مدحت مرزا صاحب سے کی اور
[illegible] حضرت داغ کے ساتھ حضرت ناطق کو یاد کیا جاتا
[illegible] انھیں کا حصہ ہے۔ اُستاد کی عظمت میں مبالغہ نہ کرنے کے
[illegible] زبان سے زیادہ مواقع مرزا صاحب ہی کو نصیب ہوئے۔
[illegible] ہندوستان کی حاضری نے قبلہ کی بیت کی ادبی و نسانی
[illegible] بیوں کا نظر صاحب کو واقف بنا دیا ہے — زبان کی
[illegible] صحت، لفظوں کا برتاؤ، نحو کی پابندی زیادہ سے زیادہ
[illegible] مرزا صاحب ہی کے حصے میں آئی ہے۔

اس خصوصیات کے پیش نظر اگر یہ کہوں کہ وہ
اپنے مقامی خواجہ تاش بھائیوں میں ایک ممتاز و منفرد
حیثیت رکھتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اپنے اُستاد کے انداز
بیان کی زیادہ سے زیادہ تقلید نظر صاحب ہی نے کی ہے
اور اس خصوص میں وہ مقامی طور پر اپنے استاد کے جانشین
کہلانے کے مستحق ہیں۔ گو حیدرآباد نے ابھی کسی کو اپنا جانشین
مقرر نہیں کیا ہے۔

تقلید بُری چیز نہیں ہے۔ اس سے مقلد جلدی
ترقی کرتا ہے اور انھیں خطوط پر چلنے کے بعد ایک مقام
ایسا بھی آتا ہے جہاں سے اس کے لئے انفرادیت کی ایک
راہ نکل آتی ہے۔ جلیل نے امیر کی اور تجمل نے
داغ کی تقلید کی ہے۔ اسی تقلید کی برکت تھی کہ جلیل، امیر
اور تجمل، داغ کے جانشین قرار دیئے گئے۔ ان مثالوں
سے ثابت جلیل، تجمل اور نظر کا مقابلہ نہیں ہے
بلکہ یہ مقصود ہے کہ صحیح تربیت یافتہ شاگرد اپنے
استاد کے زیر سایہ اور فنی بیان کو کس قدر اپنا لیتا ہے

حضرت مولانا ناطق گاؤں والوں کی شاعری کا بھی
حضرت نے فائنل نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ
ان کی شاعری کی بنیاد کن چیزوں پر ہے اور فنی
کمزوریاں کس قسم کی ہیں۔ ان کی

قادر الکلامی ہے۔ شعر کہنا کوئی ان سے سیکھے اور
ان کے معاملات و معاملہ بندی کو دیکھے۔ اسی کے ساتھ
ان کی صنعت تضاد کے تو وہ بادشاہ ہیں۔ بکثرت غزلوں کے شعر
میں حسن و جاذبیت پیدا کرنے کا حصہ ہے

یہ تمام خوبیاں مرزا نظر کے کلام میں بخوبی طور پر نظر
آتی ہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل میں اگر تھوڑی سی کچھ نمونے پیش
کرتا چلوں۔ تو خود فرمایئے اندازہ کیجئے کہ نظر صاحب اپنے
اُستاد حضرت مولانا ناطق کی تقلید میں کس قدر کامیاب ہیں

کچھ کہا نہیں کرتے ہیں تو کچھ کم نہیں کرتے
وہ کام وہ کر جاتے ہیں جو ہم نہیں کرتے

تم آتے آتے گی تھی محبت کی ان کو
میرے بہتے ہوئے لہو میں جاتے جاتے

سرد مہری سے تری سرد ہوئی ہمت عشق
تجھ گئی دل کی گئی آتشِ اُلفت کی قسم

یہ نہ کہئے وعدہ فردا کا دھوکا کھا گئے
بات رکھنی تھی جو ہم باتوں میں ان کی آ گئے

تمہیں سوچو کہ تم کو کیا کہیں گے دیکھنے والے
تمہیں دیکھیں، تمہیں دیکھا نہیں یہ بے رخی ہم سے

نہیں چلتا نہیں چلتا وفا کا بس نہیں چلتا
نہیں نبھتی نہیں نبھتی بتوں کی دوستی ہم سے

خدا نے جلوہ پا اور رکھی تو اس میں پھر ذات ہی رہی کیا
مزا تو جب ہے کہ ان بتوں سے ہمیں خدا سب کر دے

وہیں ہے قافلۂ زندگی جہاں سے چلا
نہ پوچھ کچھ کہ کس واسطے کہاں سے چلا

کیوں نہ تھا عالم بھی تھا اک عیش و عشرت کا مقام
کیوں نہ تھا، ایسا بھی تھا ہم تم بھی جب یارانہ تھا

دل کی تابش عیش میں گم گشتگی نہ پوچھ
جی بھی نہیں رہا اسے جینے بھی نہیں دی

عشق کا ذکر چھڑ کے دشمن کی
بیچ میں کیوں ہیں وہ بھی نہیں دی

مرنے پر بھی تم نہ آئے کہ دو گھڑی
کچھ جی نے پھر کہا کہ ابھی وقت نہ ہوا

زندگی کیا پوچھتے ہو تیری گلی سے
ہے یہ وہ بستی جہاں اس کو جنازہ چاہیئے

دیکھا آپ نے مرنا بھی ساتھ ہی کا تھا۔ جی ہاں یہ تھا
شعر کے صداقت اور روایت کس قدر ہیں۔ ترجمہ اس
پہلو پر ان کس قدر جاذب توجہ ہے۔

لفظوں کی تراش، محاورہ کی استواری، زبان کی
صحت اور بیان کی سلاست شعر کو جان پڑتی ہے اور وہ
شعر زندہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جس میں یہ
باتوں کا التزام رکھا گیا ہو۔ اب ذرا مرزا نظر کے
اشعار ملاحظہ فرمایئے جس کے لفظ کی بنیاد محاورہ پر

ساتھ چھوڑا ہے جب سے کسی نے
جی نے منہ بھی نہ پھیرا کسی نے

نہ آئے وہ ہمارے گھر نہ جائے
اُدھر بھی ہو گئی دنیا اِدھر کی

خدا کا نام لے اے چارہ گر ہم بھی کہیں گے
دعا کر اب دوا جانے کیا چرخ دغا ہے

ہم ناتواں کیوں ہیں یہ غم خود سے جائے گا
خاک وہی خود ہے کیوں کہیں

ہے پریشاں خود ہے حال
کہتے ہے اب بگڑ کر دشمن بھی پوچھتے ہے

گھر دل جلے ہے آج کل ابر بہار کی
کہیں پانی نہ پھر جائے ہمارے یار کی

دشمنوں سے کچھ بنا بگڑا نہیں
منہ پہ آئے منہ کی کھا کر رہ گئے

آیا جاتا ہے کوئی موت کا پیغام لیے
ایڑیاں اور رگڑ لے دل ناکام لیے

اٹھنے کو اٹھ تو آتے ہیں محفل سے ہم مگر
ہر بار موت پر نکلتا ہے جی ہزار آہ

[illegible] آپ کی تو اسکول کی ابتدا ہی خصوصیت
[illegible] خصوصیت پسندی نے اس جماعت کو انفرادیت
[illegible] دیا ہے۔ اس سے کا خیال
[illegible] اس اسکول کے افراد کہتے ہیں۔ دوسرے
[illegible] کہ نہیں۔ ظفر صاحب کی
[illegible] قطعہ سے

صورت تصویر تھے خامشی اُن کی بزم میں
ظلم ہے جانے بزموں کے ہم کو گویا کر دیا
داغ ہے بجلی کو میرے ذکر غیر
کچھ ہوا ہوں میں خدا کرے جو یاد خدا کردوں

ہر کسی کا ہے ایسے قہر کی بجلی اک ادا
اُس کا کوئی کیا ہے ہر بات کا امکان ہے

شامت آئی ہو تو ایسوں سے رکھیں ہم واسطہ
کہ سلامت وہ گئے بیٹھے جو قاتل کے قریب

بگڑ گیا سلم کا یہ تو دستور زمانہ ہے
جو ہوا نقد یہی وہ کہ زر پیدا کہتے ہیں

دیکھتے دیکھتے لوگ آئے بھی کچھ لے بھی گئے
ایک ہم بیٹھے ہیں پر تیرے ناکام ابھی

ذکر یاران بہ قصۂ ایام نشاط
اب تو سب بھول گئے کچھ بھی نہیں یاد نہیں

کفر ہے عشق تو واعظ سے مذہب کو سلام
کرلی کافر اب آئے گا مسلماں کے قریب

تم آ جاؤ تو اس مکان سے اٹھ آنے کو تو ہے
پھر جو دھوکا کہیں یہ پھر ہو زندگی ہم سے

گفتگو میں مصیبت ہے کہ لڑتی نہیں تم
اس جگہ میں کہا تا ہے شکست آنکھ ظفر کی

مذکورہ خصوصیات کے لحاظ سے اگر یہ کہا جائے
[illegible] ظفر صاحب اپنی اسکول کی بانی تھے تو بجا
ہوگا ——

[illegible] کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے
کے ہر ایک شعر میں ایک آہنگ ہے کہیں سے ٹوٹا ہوا
کی ایک لہر رواں آتی ہے۔ اسی وجہ سے کہ ثبت ہی
مرزا ظفر کی شاعری کا وہ حصہ بھی جو خطوط میں ہے
تنقید کی آمیزش کم اور تعلیق الکرام زیادہ ہے

زبان کے شاعر تھے اور اپنی زندگی کے مندرجہ
امور پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ ہر شعر میں آپ کو انسانی
زندگی کا کوئی نہ کوئی سیاسی، سماجی، اصلاحی، اخلاقی
پہلو اس شکل میں نظر آئے گا کہ آپ آبدیدہ ہو جائیں
ہو جائیں گے خیالات کی ندرت، فکر کی بلندی اور طرز
لب و لہجہ کے اعتبار سے یہ اشعار اُن کی شاعری کا
شاہکار سمجھے جا سکتے ہیں ؎

اے حرص کچھ تو بات بھی ہے کہیں
یہ تو بتا حیات کے دنیا کہ کیا کروں

ہر رنگ کے گل برے کھلتے نہ چمن میں
ترتیب عناصر کو جو برہم نہیں کرتے

ہو گئے اک نگہ لطف کے احسان ہزار
عمر بھر ہم نے وفا کی تو کوئی نام نہیں

یہ بھی کچھ کم نہیں دشمن کی عداوت کے لئے
ہم کو مل جائے تو شرمندۂ احساں کر دیں

کرم کر اتیاز اہل الفت چاہئے ورنہ
عدو کا نام بھی ہے آپ کے امیدواروں میں

گزر رہی ہے مرے سامنے سے غیر عزیز
تماشا دیکھئے حسرت سے تک رہا ہوں میں

ملاتی ہے انساں کو تقدیر سب کچھ
مگر چاہئے طرز حسن طلب کچھ

اپنے خیال خام کی وحشت کو دور کر
غافل سکون قلب کا ساماں کہاں نہیں

دل بے طلب اس شوخ کی محفل میں گیا کیوں
کہہ دے کوئی اس بت سے خدا جانے خدا آج

ہے کس کا یہ جلوہ ظاہر ترے دیدار سے
آئینہ کہ ہے فکر کی ہر نگہ ترے

[illegible] ہم [illegible]
تم فرض جانتے ہو جو ادائے فرض کے
کہے یاد آتا نہیں جب دیکھ کے تم کو
ہم نہ کچھ کہے بیٹھے بیٹھے بیت آئے تھے گھر سے
تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ کس کام کو چلے
یہ تو جانتا ہوں میری ضرورت کہاں نہیں
یہ تو ہے حسن کا گزارا تبسم کی بہار
جس کا قرض خدا سے بھی ادا نہ ہے

افسوس کہ ظفر صاحب کے شعر و سخن اور بالکمال
شاعری کی قدر نہیں کی اور آج ہے گو شہ نشین جو شعر پر مجھ کو کڑا
فیروں کا ذکر کیا خود اپنوں نے خواص کے ساتھ عوام کا سا
سلوک نہیں کیا۔

حکمراں کے عہد انقلاب ۱۹۴۷ء نے جہاں عمومیت میں
خصوصیت اور خصوصیت میں عمومیت کر دیا وہاں اس نے
اخلاق پر بھی بُرے اثرات ڈالے۔ نہ صرف یہ بلکہ ذہنیت بدل
صحافی بدلے، صحافت بدلی اور اُردو صحافت کا تو حال
ہوا کہ بس ۔!

تقسیم ملک سے پہلے جو معیاری رسائل و اخبارات
نکلتے تھے اور جن میں ظفر صاحب کا کلام عزت و قدر کے
ساتھ چھپتا تھا مثلاً عالمگیر، نیرنگ خیال، نرالی دنیا
خیام، ایڈیٹر، الاصلاح، سروش، آئینہ، احسن
منزل، شاعر، رہنمائے تعلیم، شعلۂ شبنم، مدینہ، فیرو
گا ہیں اب انہیں دیکھنے کو ترستی ہیں مذکورہ قدیم رسائل
میں سے اب صرف مدینہ، شاعر، رہنمائے تعلیم اور شعلۂ شبنم
رہ گئے ہیں جن میں موصوف کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

نتیجہ مشاعرہ نمبر ۵۵

نمبر اول غزل — نقی صاحب ناگپوری
نمبر ۲ " — داور میر صاحب ناگپوری
نمبر ۳ " — نقی صاحب بدایونی

طرحی مشاعرہ ہوگا
بعنایت اللہ صاحب ناگپوری کی غزل بہترین قرار دی گئی

جنوبی افریقہ

کیپ کالونی کے فرعونوں تمہیں کیا ہو گیا
تم کو گورے رنگ پر کیوں ناز اتنا ہو گیا

عرش سے اترے ہو یا باغِ جناں سے آئے ہو
دور ماضی جانتا ہے تم کہاں سے آئے ہو

تم وطن سمجھے ہو جس کو وہ وطن اوروں کا ہے
تم چمن سمجھے ہو جس کو وہ چمن اوروں کا ہے

آگ لینے کے لئے آئے پیمبر بن گئے
روشنی مانگی کے کرا بو انور بن گئے

بوالہوس بن کر تمہیں نے گھر اجاڑا غیر کا
تم نے لوٹا دونوں ہاتھوں سے اثاثہ غیر کا

اس سے اتنا بھی نہ پوچھا اب ترا کیا حال ہے
تم نے اتنا بھی نہ سوچا یہ پرایا مال ہے

میزباں کے گھر پہ قبضہ کر لیا مہمان نے
یہ صلہ مہماں نوازی کا دیا مہماں نے

خیر اس جھگڑے کو چھوڑو یہ پرانی بات ہے
آج جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی شر کی بات ہے

ایشیا والوں سے بھی اب تم کو نفرت ہو گئی
تم کو ہر ہندوستانی سے عداوت ہو گئی

چار ٹرا اقوام عالم کا ہے سب کے سامنے
منہ تو دیکھو ہے یہ آئینہ تمہارے سامنے

رنگ پر اتنا تعصب نسل پر اتنا غرور
کیا حکومت کے نشے سے ہے دماغوں میں فتور

تم نکالا چاہتے ہو رنگ دار اقوام کو
وہ بھی غیرت مند ہیں سوچو ذرا انجام کو

رنگ دشمن تو نہیں ہوتا سیہ ہو یا سفید
اس سفیدی نے تمہارا خون کر ڈالا سفید

تم سمجھتے ہو کہ حق رکھتا نہیں ہندوستاں
خانہ بربادی سے کرتے ہو ہمارا امتحاں

رنگ لائے گا کسی دن یہ تعصب رنگ کا
ساری دنیا میں بھڑک اٹھے گا شعلہ جنگ کا

دو غزلیں

کہانی اُس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی
نقاب اُس نے سنبھالی مگر سرک بھی گئی

کبھی وہ طرزِ ستم بھا گئی مرے دل کو
کبھی وہ شانِ ترحم مجھے کھٹک بھی گئی

نہ آئی ہے شاید گلے لگا کے اُنھیں
کہ میرے پاس تو آئی مگر جھجک بھی گئی

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر آبروئے شک بھی گئی

وہی چراغِ تمنا، وہی پیامِ اجل
جو برقِ راہ کو چمکا گئی، کڑک بھی گئی

وہ اک نظر مری عقل و جنوں کا حاصل ہے
جو اُس نظر سے ملی اور پھر بہک بھی گئی

نگاہِ دوست سے دل میرا خوں ہوا میکش
نگاہِ دوست سے میری غزل چمک بھی گئی

نسیمِ صبح کے لب پر پیامِ خوش گوار آیا
گلوں پہ تازگی آئی، گلستاں پر نکھار آیا

مرے ساقی اُٹھا دے تُو کردِ میخانہ وا کر دے
مئے و مینا کو تھا جس کا ازل سے انتظار، آیا

خبر بھی ہے گنوا کر کچھ، بہت کچھ پایا جاتا ہے
وہی جیتا یہاں بازیِ محبت کی جو ہار آیا

شبِ غم لاکھ بہلایا اُمیدِ صبح نے، لیکن
کسی پہلو نہ قابو میں دلِ بے اختیار آیا

مسلسل کش مکش میں تھا فریبِ زندگی ساماں
اجل آئی تو میں سمجھا مرے دل کو قرار آیا

جو ہنستے تھے وہ روتے رہ گئے یہ کیا تماشا ہے
وہ دُنیا سے گیا ہنستا ہوا جو اشک بار آیا

فنا میں نے غمِ جاناں کو ٹھکرا تو دیا لیکن
کروں اب کیا غمِ دوراں مجھ کو سازگار آیا

بیکل اتساہی، اسکول آباد

سکونِ غم

عندلیب اک چمن سے جائے گی
روح یہ گلبدن سے جائے گی؟

یادِ احبابِ رفتگاں اے دل
کس طرح انجمن سے جائے گی؟

سوچتا ہوں یہ برہمی آخر
گیسوئے پرشکن سے جائے گی؟

سہل ہے کیا بدلنا فطرت کا
رہزنی، راہزن سے جائے گی؟

ایک سے ایک بڑھ کے ہے ناداں
یہ کمی علم و فن سے جائے گی؟

زندگی جس ادا سے آئی ہے
یہ اُسی بانکپن سے جائے گی؟

میری میت پہ خود وہ آئیں گے
اُڑ کے یہ جب کفن سے جائے گی؟

فصلِ گل پر ہی کچھ نہیں موقوف
خود خزاں ہر چمن سے جائے گی؟

لطفِ اردو زباں ہے جب شامل
چاشنی کیا سخن سے جائے گی؟

غم کی منزل میں رکھ قدم نازک
ہر جلن اس تھکن سے جائے گی؟

منزل دیا کھیری

جنہیں اپنی سمجھ پہ ناز تھا وہی بے نیاز اٹھ گئے
تری جن پہ چشمِ کرم ہوئی وہ سنبھلنے پار اتر گئے

مرا حشر کچھ بھی ہوا مگر مرے غم کی قدر تو ہو گئی
سب اٹھا اس پھول بہار کے مرے آنسوؤں سے نکھر گئے

اُسے کوئی کیسے نہ ہدیہ سکا یہ خدا بخشی کی بات تھی
کہ تمہاری محفلِ ناز تک ہمیں سب لٹے دو کا گر گئے

مرے نامہ بر کو خبر نہیں کہ ہے یہ حقیقتِ معتبر
وہ کسی کنارہ نہ پا سکے جو بھنور کے نام سے ڈر گئے

ہوئیں اپنی عمر کی بارشیں کہ فضا دہر کی ہنس پڑی
وہ چمن پہ ٹوٹ کے جب گرے تو ہزار دل پھول بکھر گئے

مرے ہم زباں سے مرا وہ یہ کہیں ہم سفر کو
کہ اس عبرت میں نہ جانے کہاں کہاں تم بھٹک کے مر گئے

مرا زخمِ عشق ہرا کبھی نہ ہوا مگر اسے کیا کہیں
شبِ غم تمہارے ہی شعر تھا وہ جسے پڑھا کہ نکھر گئے

جمیل بہنڈ صدیقی بدایونی

ہم سے اُلفت کے نفرت ہو گئی
کتنی دنیا بے مروت ہو گئی

جھک گیا سر قبلۂ پائے محبت پہ
آج تکمیلِ عبادت ہو گئی

آپ جب سے میرے دل میں آ بسے
ہر خوشی اس گھر سے رخصت ہو گئی

جان دی الفت میں اس کا غم نہیں
تم سے ملنے کی تو صورت ہو گئی

اُن کو روٹھے اک زمانہ ہو گیا
دل کو ٹوٹے ایک مدت ہو گئی

ذکر ہاتھ اک فسانہ ہو گیا
داستاں غم کی حقیقت ہو گئی

دیکھ کر زخمِ جگر کو اے جمیلؔ
ساری دنیا محوِ حیرت ہو گئی

افکارِ نو

نصیر احمد ناصر (بہاولپور)

جب کھا چکے شکست غمِ زندگی سے ہم
یہ دل ہیں ٹھان لی ہے گزر جائیں جی سے ہم

حل کوئی مل نہ مسئلہ ختم ہو سکا
تکتے ہیں رہنما کو بڑی بے بسی سے ہم

کرنا ہی پڑے گا محبت میں ایک دن
کرتے ہیں چاک اپنا گریباں ابھی سے ہم

پایا ہے دل کو ان سے لگا کر یہ مرتبہ
پھرتے ہیں اپنے شہر میں اک اجنبی سے ہم

پھر کیا ہے نام اس کا جو دیوانگی نہیں
کرتے ہیں آج اس کی شکایت اسی سے ہم

جوشِ جنوں کا وہ بھی اڑاتے ہیں جب مذاق
اچھا ہے پھر یہی کہ گزر جائیں جی سے ہم

آئے ہمارے آئے نہ جو وہ خلاوت
تو یہ ہزار بار کریں بے کشی سے ہم

فکرِ رضائے دوست محبت میں شرط ہے
بخشا ہے اُسے غم تو سہیں گے خوشی سے ہم

نسیم ساگری

اشکوں کے نظر آئیں تری آنکھ میں سائے
لیکن غمِ دوراں مجھے وہ دن نہ دکھائے

محدود نہیں فیضِ جنوں لالہ و گل تک
کانٹوں کو بھی آدابِ چمن ہم نے سکھائے

اے زلفِ معنبر تو بکھرتی ہی چلی جا
جب تک نہ سمٹ جائیں شبِ تار کے سائے

یہ کون سا عالم ہے کہ میرا دلِ مضطر
بے چین بھی ہو جائے ہے تسکین بھی پائے

اللہ رے حالاتِ زمانہ کا تقاضا
ہو کوئی شکایت بھی تو ہونٹوں پہ نہ آئے

مانا کہ ہر اک شب کے مقدر میں سحر ہے
ہاں۔ نازِ امیروں کے مگر کون اٹھائے

وہ شورِ حوادث ہے ہر اک گام پہ عظمت
آواز بھی دے کوئی تو آواز نہ آئے

مسلم سارگری

تم لطف لے رہے ہو جو فصلِ بہ
حاصل وہ ہو رہا ہے مجھے خارنا

اعجازِ حسنِ یار تری عظمتیں تو
خورشید و ماہ بھی ہیں مرے آنچ

بیٹھا ہے داغ داغ تمنائے
یہ کیا ہوا ہے دل تجھے فصلِ بہ

مسلم فریبِ حسن کی گلکاریاں
کیا کیا نہ میرے دل پہ بنی انتظا

...ر سرمد سلطان پوری

غزل

...کے جاؤں تیرا دکھ میرے بس کی بات نہیں
درد کی کھاؤں ٹھوکر میرے بس کی بات نہیں

...بھا دوں اے دلبرِ جانِ حزیں کی بات نہیں
مجھ کو تو مجبور نہ کر میرے بس کی بات نہیں

...ی سمجھانے سے باز میں آؤں اپنے سے
چھوڑ دوں مے خانے کا در میرے بس کی بات نہیں

...ا کو آسودہ، عیش و طرب میں آلودہ
جل بھن کر ہوں خاکستر میرے بس کی بات نہیں

...ں اُس کے ناصح میرا جانا خوب نہیں
ہے تو نصیحت خوب مگر میرے بس کی بات نہیں

...ے رشتہ میں جو غلط اُس کا دامن چھوڑوں
ناکامی سے تنگ آ کر میرے بس کی بات نہیں

...بانوں میں تم کو کیا ہوگا روزِ محشر
شیخ سے پوچھو تم جا کر میرے بس کی بات نہیں

آجرت پر لکھوا کے غزل اُستادوں سے اے سرمد
دادِ سخن لوں میں پڑھ کر میرے بس کی بات نہیں

...شیری بہاروی

میری مطربہ

...طرہ خدارا چلی آ کہ ہوں پریشاں
تیرے سازِ حسن پہ ہے مری آفرینِ غزل خواں

...ہرا رہا ہے نغمہ سرا ترا ہر نفس ترانہ
اسی سوز و ساز پر ہے دلِ کائنات رقصاں

...ر نظر خیاباں، وہ نفس نفس گلستاں
وہ قدم قدم پہ جس کے ہے فدا بہارِ رضواں

...چشمت سے ہے مئے اور خواں میں مستی
اسی کیف و کم سے حاصل ہے سرورِ بزم رنداں

...سکراہٹوں سے ہے بہار کا تبسم
تری گنگناہٹوں پر ہے بہار محوِ رقصاں

...ب کے کنول سے اُسی روپ کے دیئے سے
مری کائنات ہنگی، ہوئی زندگی درخشاں

...طرب سے ہے خوش سازِ فطرت
تری لے سے مست دیجور کبھی نے رکھی نیستاں

...انہ آنکھیں، یہی دلگداز آنکھیں
یہی خلتوں کا مسکن یہی جامِ آبِ حیواں

تری راہ تک رہی ہے مری چشمِ شوق کب سے
تری منتظر ہے آجا مری حسرتِ فراواں

کاروانِ آزادی

ہم سے شانِ آزادی، ہم سے شوکتِ آزادی
کارواں ہمارا ہے، کاروانِ آزادی

وقتِ امتحاں آیا، حامیانِ آزادی
آؤ خوں سے لکھ دیں داستانِ آزادی

یہ پلٹ کے بھی دیکھو اب ہمیں نہ دیکھیں گے
ڈر کے بھاگ جائیں گے دشمنانِ آزادی

فتح کا نشانِ پرچم آگے بڑھتے جائیں گے
کون روک سکتا ہے کاروانِ آزادی

حرص و آز کا پیکر ٹوٹنے کو نکلا ہے
باغ کو سلامت رکھ باغبانِ آزادی

بجلیوں کے سائے میں ہم نے گھر بسایا ہے
اب اُجڑ نہیں سکتا آشیانِ آزادی

یہ تو شغل ہے اپنا کھیلتے ہیں شعلوں سے
دار پر بھی ہنستے ہیں عاشقانِ آزادی

سُرخ چین کے شعلے خون سے بجھائیں گے
ہم وطن کے شیدائی خادمانِ آزادی

ختم کر کے دم لیں گے سرحدوں کے جھگڑوں کو
آج جاگ اُٹھے ہیں رہبرانِ آزادی

مادرِ وطن تیرا دودھ قرض ہے ہم پر
لے نثار ہوتے ہیں جانشینِ آزادی

ڈوب ہی نہیں سکتی کشتیٔ وطن پرویز
بہنے خوب اذعانِ باغبانِ آزادی

سید ضیاء الحسن بندی

دل اول جب تجھ پہ خوش ہوں کس بات کا جو کہتا ہے
پھر اس سے تل کر دل میرا بے اختیار اُن کی آتا ہے
تم شوق سے کہیں دل سے مرے پر یہ کہہ کر قرار دل چلے
یاد تم کو نگر یاد رہے یہ دل نہیں پھر کٹ کا ہے
کہنا نہ پھر وہ سارے دکھ تم دیش کے لیے بھگتوں پر
صورت ہے شریفوں کی جن کی کردار مگر جھوٹ کا ہے
ساقی نے کہا ہے پھر تم کو یاد آہ نہیں پینے کو تی
اے شیخ چلا تو آخر یہ آپ کا منہ کیوں ٹ کا ہے
اگھڑ کی بیٹھ منہ کھولے کہتی ہے یہ ہنس کر محفل میں
یاں سب ہیں اپنے گھر والے کیا کام یہاں گھونگٹ کا ہے
دل کھول کے ساقی مجھ کو پلا میں آج پیوں گا جی بھر کے
تو نکڑ نہ کر پیمانے کی جب ہاتھ میں میرے مٹکا ہے
جب مکتب عدم میں جاؤں گا اللہ سے یہ کہہ جاؤں گا
شاعر نہ کبھی ہرگز بننا یہ کام بڑے جھنجھٹ کا ہے
افسوس وہی پھر اب مجھ سے لڑنے پہ چڑھا ہے آمادہ
بیباک سپہ میداں جس کو سو بار اُٹھا کر پٹکا ہے

مشتاق احمد خلش ۔ ایڑ کوڑی

عشق اور حسن کے سوا کس کو
دارِ فانی میں پائداری ہے
عشق نزدیک ناشناسوں کے
شوقِ ذلت ہے ذوقِ خواری ہے
پھر دھویں چرخ کے اڑادوں کا
پھر وہی رنگِ آہ و زاری ہے
پھر وہی ہائے ہائے ہے لب پر
پھر وہی شوقِ جاں سپاری ہے
کیوں یہ سرکار حسن سے مجھ کو
رغم و حسرت کا حکم جاری ہے
رغم و آفت ہے اور قہرِ غضب
بس یہی زندگی ہماری ہے

مظہر قادری

محبت سہل بھی دشوار بھی ہے
کبھی ساحل کبھی منجدھار بھی ہے
کسے رکھوں کسے بڑھ کر اٹھاؤں
نظر میں جام بھی تلوار بھی ہے
ہمیں ہیں باعثِ تزئینِ صحرا
ہمیں سے رونقِ گلزار بھی ہے
کوئی پوچھے خدایانِ وطن سے
کسی میں جذبۂ ایثار بھی ہے
نصیحت نیک ہے ترکِ محبت
مگر ناصح کوئی تیار بھی ہے
بہت مخلص ہے مظہر ہم نے مانا
مگر کہتے ہیں وہ خوددار بھی ہے

جلال و جمال

عرشی انصاری ۔ رتلام

نئی ہے شب تجھے ہے فکرِ یارِ غزل
جگی ہے جب سے رہینِ نگاہِ یارِ غزل
کسی نشاط نے پھولوں میں نئی کلیاں
مچل رہی ہے بن کر نئی بہارِ غزل
عروس فکر نے کی خوب کار فرمائی
نکھار آئی ہے تصویرِ حسنِ یارِ غزل
تراش خلق کمل نہیں ابھی عرشی
کچھ اور شیشۂ سخن سے ابھی سنوار غزل

محی الدین محی

صلائے عام اُس شوخ کی سبھی جانتی ہے
ہر زباں مائلِ نغمہ و یاد ہوئی جاتی ہے
آہ و فریاد تو نہیں تھمتے نہیں آنسو لے دوست
حاصلِ ضبطِ تری یاد ہوئی جاتی ہے
تیرے گیسو کے نثار آج سرِ دار و رسن
زیست ہر قید سے آزاد ہوئی جاتی ہے
ہے یہ اعجازِ فنِ عشق محی ! جو اپنی
زیست ہو کر سے آزاد ہوئی جاتی ہے

صوفی شبنم شکوہ آبادی

کوئی بتائے کہ ہم اُن کی کیوں نہ چاہ کریں
وہ کس سے کم ہیں جو ہم اور پر نگاہ کریں
کسی کی آپ سے بس التجا ہی اتنی ہے
ہمیں نہ بھولئے شاید ہمیں نباہ کریں
یہ کہہ کے اور بڑھا دی ہے گتھیاں تم نے
کہ تجھ کو پیار کریں ہم نہ تیری چاہ کریں
نہ دیکھیں وہ شبنم بہ شکِ شبنم سے
وہ اپنی چشمِ کرم ہو اگر نگاہ کریں

عاصل رشید

اندھا کنواں

ن میں کوئی دوست کا مذاق سے یہ بات
یں کوئی کی جگہ بن گئی تو خوشی کے مارے اس کا
ا حال ہو گیا۔ اسے پورے سال کی مسلسل جدوجہد
ے وصول ہونے والی تنخواہ کے بجائے تین کی بڑی
دیت زیادہ خوشی تھا۔ اس کی بڑی بیوی ان خوشی تھی
اس کا بوڑھا باپ خوش تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی
بہنیں خوش تھیں۔ اس کے بوڑھے اور کمزور ماں باپ نے
ورکت شکرانہ کی نماز پڑھی تھی۔ اس کی بڑی بیوی
ے ایک روزہ ماں رکھا تھا اور چھوٹی بہنوں نے نفل
مرہ کے رکھ لیا تھا اس لئے کہ گھر کا کوئی کمانے
قریبی کچھ نہیں تھا۔

اس کی چھوٹی بہنوں اور بچوں نے بھائی
نے بھی اس کی اس قربانی کے سلسلہ میں کچھ نہ کچھ روزہ رکھا
تھا اور اب وہ اپنی اپنی منتیں پوری کر رہے تھے۔

اس کا باپ انتہائی ایماندار قسم کا مسلمان
مسلمان تھا اور ایماندار اور مسلمان ساہوکار قسم کا انسان
ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وہ دولت سے اپنا گھر
نہیں بھر سکتا کہ وہ پیسا اور پیسے کا ازالہ ہوا اور پیسہ
اس کے بڑھاپے میں کام آئے ——!

وہ ساہوکار بھی تھا چاہتا تو ٹھیکیداروں
سے رشوت لے کر اپنا گھر بھر لیتا۔ شراب، چرس، بھنگ،
گانجہ اور افیون کے ٹھیکے لاکھوں روپے وہ رشوت سے
لے سکتا تھا۔ لیکن رشوت تو اس کے مذہب میں گناہ ہے
اس نے رشوت کی ایک پائی بھی اپنے اوپر حرام کر لی تھی اور
اپنی تنخواہ میں اپنا اور اپنے خاندان کا گزر بسر چلاتا رہا
تنخواہ اسے بھی خاصی ملتی تھی۔ ساڑھے تین سو
روپیہ ماہوار۔ اور اس زمانہ میں ساڑھے تین سو روپے
ماہوار کے بہت اچھے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ رہتے تھے بلکہ
کچھ بچتے بھی تھے۔

اسے اپنے ہونہار بیٹے پر بڑا ناز تھا۔ اس کی
اور اس کے بیٹے کی بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں
خاندان کو پالنے والا تھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا جو اس
سے اس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے کی
ڈگری دلوائی تھی اور جس کی شادی بھی اس نے اپنے
پیسے سے کی تھی۔ وہ اس سے الگ جگہ تھا۔ وہ بھی
بیوی اور ایک بچے کے ساتھ علیحدہ رہتا تھا۔ وہ بھی اپنے
باپ کی طرح ساہوکار ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے
باپ کی ایسی شوخ گرگٹ بیوی کو پسند کرتا تھا نہ ہی شوخ
ایسا تھا اور نہ ہی کرتا تھا۔ اپنے بھائی اور
بہنوں، اپنے چچا زاد اور اپنے شفیق باپ کو وہ کون
نہیں پوچھتا تھا کبھی کبھی آتا جاتا تھا اور بس —— وہ
اپنے باپ کو صرف پچاس روپے مہینے دے دیا کرتا تھا
اور بس ——

عزیز کے باپ کو اس کے چچا کا پچاس روپے ماہوار
بھی گوارا نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی بیوی کی ضد کے آگے
مجبور تھا کہ اپنے اس نالائق بیٹے کے چچا کو پچاس روپے ماہوار
بھروا دیا کرے اور اس نے ایسا کرتا تھا۔

عزیز کے بعد اس کے چھوٹے بچے اور تھے۔ حبیب تیسرے
اور حفیظ چوتھے نمبر پر تھے۔ اور نگہت، زبیدہ اور ساجدہ
تین بیٹیاں تھیں اور ان کے بعد تین اور تھے۔

حبیب نے ایف۔ اے تک اپنی تعلیم پوری کر لی تھی
اور اب وہ اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے حکومت
کی کوشش کر رہا تھا۔ حفیظ اور حفیظ نہیں اور اگر کوئی
جماعت میں فیل ہو سکتے ہیں تو حفیظ اور نگہت

اپنے والد صاحب کی پڑھائی ہوئی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کی
تعلیم کا خرچ کبھی کبھی دوسرے بیٹے یا بھائی بہن کے
ذمہ پڑا ہوتا تھا۔

ایک دن حبیب کو ایک ٹیلی گرام ملی جس میں لکھا تھا کہ
بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی فوراً
اسے کئی ہزار روپیہ کی ضرورت تھی اس لئے وہ
سنا رہے تھے اور کہتے تھے کہ چراغ بجھنے جا رہے ہیں۔

بڑے بیٹے کے انتقال حادثہ سے سارے خاندان کے ساتھ اپنے
بیٹے کے بھی اپنے بڑے بیٹے کے انتقال پر بے انتہا صدمہ ہوا
تین دن تک کے پندرہ خاندان کو روکر کر بوڑھے باپ کی
آنکھوں میں خوشی کا نشہ چھا گیا۔ اسے اس نے اپنے
سعادت مند بیٹے حبیب کی پیٹھ تھپکی اور بھرائی ہوئی
آواز میں کہا:۔

"جیتے رہو بیٹے۔ خوش رہو۔ خدا تمہیں اپنے بھائی
بہنوں کی دیکھ بھال اور پیار و محبت کے ساتھ ہمیشہ
زندہ رکھے۔"

اور پھر حبیب کی اس بچی تو اس کے بعد ہی اس
نے سب سے پہلے فاتحہ کے لئے مٹھائی خریدی گئی اور
اس میں سے چار مسکینوں کو کھانا کھلایا گیا۔

اس لڑکے رفعت نام کا ایک آدمی تھا۔ بدصورت
بدسیرت اور بدخصلت قسم کا آدمی۔ اس کی بیوی شکل
ہی کے مطابق تھی۔ ان کے کئی بچے تھے

[illegible] کے ساتھ [illegible] کا نام [illegible] کا [illegible] کا [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

جب سے آنکھوں کی تمہاری شراب دیکھی ہے
کوئی شے اس کے برابر نہیں دیکھی ہے

کل تمہیں دیکھ کے ہر شخص یہ کہتا نکلا
آج تک ایسی حسیں کوئی نہیں دیکھی ہے

کیا بتائیں کہ تمہیں دیکھ کے کیا یاد آیا
ایک تصویر بہت دل نشیں دیکھی ہے

ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
پر تمہاری ہی طرف بار بار دیکھی ہے

ہم نے اس واسطے دیکھی ہے تمہاری تصویر
کہ تمہارے سوا دنیا میں یہی دیکھی ہے

ہم نے دیکھی ہے تمہاری یہ جو تصویر اے دوست
اس میں ہر چیز سے بڑھ کر یہ حسیں

...ں جو تمہیں ...ہ ...ہ ...ہ

[illegible] کر بیٹھ جاتے ہیں۔

حبیب کو یہ اس سب سے بڑے اور اپنا کی حقیقت حاصل ہوا تو اس کے دل میں ایک بڑے زلزلے کا گھونسہ پڑا۔ اس کا دماغ جیسے کہ ماؤف ہو گیا ہو۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس کے پاؤں کے نیچے کی زمین سرک گئی ہو وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اس کے منہ پر بیسیوں تھپڑ جوتے مارا تھا۔ اس نے اس بیچارے اور غریب کے وہ اپنے بھائی کے منہ پر تھے کر دی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو مارا اور اس کی غربت پر لعنت بھیجنے والے نشے کے عالم کو دیا تھا ——

اس نے اس خبر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ جب اپنے گھر پہنچا تو اس کے گھر میں اس قسم کا سناٹا تھا ایک اس قسم کی بھیانک خاموشی تھی جو کسی کی بربادی اور بے وقت موت کے بعد پیدا ہو جاتی ہے

اس نے اپنے دونوں ہونٹ بھینچ کر اپنے بھائی سے کہا "تم نے اتنا بڑا ستم مجھ پر کس طرح ہونے دیا بھیا"

اور یہ کہہ کر وہ اپنے سے چھوٹے بھائی قدیر سے اپنا سر پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔ اس کی بہن ہاجرہ جو کہ بہت دیر کے بعد کی تھی اپنے بھائی کا سامان کھولنے لگی، اس کے سوٹ کیس سے ایک پیکٹ نکلا۔ اس نے انتہائی کرب اور بے چینی سے اس پیکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے تم چولھے میں جھونک دو باجرہ۔ یہ میں نے اس بدنصیب بچت کے لئے خریدا تھا۔ اس میں نادر ہیں اور اس کے لئے فراک ایک کوٹ ہے"

اس نے اپنی بہنوں کی طرف انتہائی یاس اور بیچارگی سے دیکھا۔ وہ جیسے کہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "بہنو تم ہی بھی اپنے اپنے ارادوں سے مجھے آگاہ کر دو تاکہ تم دونوں کا خاتمہ پڑھنے سے پہلے ہی میں زہر کھا کر سو رہوں"

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

"اب میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا۔ اور اس وقت میں کسی اور کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں کہ میں موت مرنا چاہتا ہوں۔ جس دن کہ اس بدنصیب کو وہ کمینہ طلاق دے کر اور جوتے مار کر اپنے گھر سے نکال دیگا"

وہ اپنے جرم چھپانا چاہتا تھا اور ایک سرد آہ بھر کر بولا "وہ بدنصیب نا سمجھ ہے" وہ نہیں سمجھتی کہ وہ دن بہت جلد آجانے والا ہے"

اس نے کرب و اذیت کے ساتھ کہا:

"اس بدذات کے بچے نے تو مجھے محض نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے کے لئے اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلا ہے"

وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ مسوس کر رو پڑا ——

"زندہ درگور کر دے گا وہ اس بدنصیب کو۔ میرا جی اس کے لئے تڑپ رہا ہے وہ اذیتوں، مصیبتوں اور غلاظتوں کا شکار ہو کر رہ جائے گی"

اس نے ایک حسرت بھری نگاہ اپنے بھائیوں اور بہنوں پر ڈالی اور پھر وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ وہ اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ چھوٹ چھوٹ کر رو رہا تھا وہ اور یہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے، وہ منہ تک رہے تھے ایک دوسرے کا۔ وہ اپنی جان کھو رہا تھا رو رو کر پاگل ہو رہا تھا وہ اپنی ناعاقبت اندیش بہن کی اس جانی پہچانی موت پر اس کے دل کا کرب انگیز بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا

وہ یکبارگی بستر پر سے اٹھا۔ وہ لگا چیخ چیخ کر چلانے "کیا میری قربانیوں اور میری محبتوں کا یہی انعام ہے جو اس بدبخت لڑکی کی طرف سے مجھے ملا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہے"

اس نے بے اختیار۔ اللہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

"رحمت ایک اندھے کنوئیں کے سوا اور کچھ نہیں ہے"

اور پھر وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کہ اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کی بہنیں اور اس کے بھائی اسے اپنی اپنی چھلکتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ——!

بقیہ نقاب ہائے رنگ سے آگے

تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ جو ہم سب کچھ ہے اور جو عقل سلیم اور انسان کی عقل سلیم کا کام نہ ہو۔ انسان تو اپنے سوا عقیدہ کی بنا پر ہی تشنہ خداوندی کے خلاف چیخ

خدا قرآن میں فرماتا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ایسے لوگوں پر ہم باہمی مخاصمت کا عذاب نازل کرتے ہیں۔ تو یہ بھی سوچنا ہے کہ کیا ہم خدا نے چھوڑ تو نہیں دیا اور کیا ہم پر عداوت باہمی کا عذاب تو نازل نہیں کر دیا۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا حل یہ نہیں ہے جو مصلحین اتحاد، ایڈ اور شاعر کر رہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں بے عمل ہو گئے اور ہم سے کیا ہوئی جو مبتلائے عذاب ہیں۔

کتاب میں بہت کچھ لکھنے کے قابل رہ گیا بعض کی تفاصیل بڑھ گئی۔ سوچا تھا اتنا لمبا مضمون کون چھاپے گا۔ لہٰذا مجبوری مضمون کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کے کمالات شاعرانہ کو حسن فزوں تر فرمائے اور ان کے ذریعہ بہت سے طالبان حق منزل پائیں۔ ایک بات کہنے کے قابل یہ ہے کہ دو جگہ نواب نے اپنا تخلص نواب برزن فعول نظم کیا ہے یہ صحیح نواب مفعول کے وزن کا لفظ ہے۔ ایک جگہ واں کی جگہ لکھا ہے یہ تسرو کی غلطی ہے۔

مصرع طرح طرحی مشاعرہ نمبر ۵۸

دل جو کہتا ہو مسلماں کیوں ہوا انساں کیوں نہ ہو
مسلماں، انساں قرآنی — کیوں نہ ہو ردیف

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء اپنی غزل کے ہر دو ٹکڑوں طرحی مشاعرہ ۵۸ کے تحت روانہ کرنا نہ بھولئے منہ آپ کی طرحی مشاعرہ میں شرکت نہ ہو سکے گی۔

نادرن ریلوے

نوٹس

ڈیمرج ریٹس میں اضافہ

مورخہ یکم اگست ۱۹۶۳ء سے مندرجہ ذیل اسٹیشنوں پر ڈیمرج ریٹس میں بطریق ذیل نظر ثانی کی جائے گی :-

نام اسٹیشن	ڈیمرج ریٹس
دہلی ڈویژن	
حضرت نظام الدین۔ صاحب آباد۔ اوکھلا۔ تغلق آباد (شمول تغلق آباد جنرل سائڈنگ)۔ دہلی صفدر جنگ	(i) 0.06 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ یا اس کے حصہ فری ٹائم گزرنے کے بعد پہلے 24 گھنٹوں میں (ii) 0.12 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ اگلے 24 گھنٹوں میں (iii) 0.30 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ اس کے بعد اگلے 24 گھنٹوں میں۔
فیروز پور ڈویژن	
امرتسر۔ بھیرہ۔ جگاتہ والہ۔ بھاٹنڈہ جنکشن۔ پٹھان کوٹ۔ فیروز پور چھاؤنی۔ لودھیانہ اور ہیرکہ	ایضاً
مراد آباد ڈویژن	
رام پور۔ ہاپوڑ۔ مراد آباد۔ سیتا پور سٹی۔ شاہجہان پور۔ بریلی۔ بدایوں۔ کوٹ۔ بدایوں۔ ڈیرہ دون ہردوار۔ نجیب آباد۔ چندوسی۔ بتھا بیس گنج سائڈنگ۔ لکھی۔ امروہہ اور ہردوار گنج۔	ایضاً
لکھنؤ ڈویژن	
بارہ بنکی۔ فیض آباد۔ اکبر پور۔ شوراپور۔ جون پور۔ وارانسی کاشی۔ بھدوہی پرتاپ گڑھ پرتاپ گڑھ۔ فافامؤ۔ رائے بریلی۔ اناؤ اور گھنٹہ گھر	ایضاً
الہ آباد ڈویژن	
کان پور سنٹرل گڈس شیڈ۔ فیروز آباد۔ الہ آباد۔ اناؤ۔ جھانسی گوالیار۔ باندہ۔ کانپور قلعہ شکوہ آباد اور ہاپرشس گنج	ایضاً

کان پور سنٹرل گڈس شیڈ پر ڈیمرج ریٹس برائے ٹینک ویگنز پر نظر ثانی بطریق ذیل ہوگی :-

0.10 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ یا اس کے حصہ پر فری ٹائم گزرنے کے بعد پہلے 24 گھنٹوں کے لئے۔

0.30 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ یا اس کے حصہ پر اگلے 24 گھنٹوں کے لئے

0.50 نیا پیسہ فی ٹن یا اس کے جزو پر فی گھنٹہ یا اس کے حصہ پر اس کے بعد۔

نوٹ :- مذکورہ بالا اسٹیشنوں کی مکمل تشریح کو جہاں کہ ریاستی اسٹیشنوں پر حسب معمول جاری رہیں گے۔

پیچھے ادھورے رہ گئے ۔۔۔!

[illegible]

[illegible] کے ساتھ جہاں وہ ادبیات سے [illegible] تک!

[illegible] کی طرح [illegible] چند ساعت کے [illegible] اور پھر [illegible] اور ساعت [illegible] فوراً اس کا خیال [illegible] کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے جہاں [illegible] اور [illegible] کے بعد اس کی یاد اس کے [illegible] دیتی ہے۔ وہاں ایک [illegible] خلوص اور [illegible] پاتی ہے۔ وہ [illegible] کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ۔۔۔؟

اس کے پریشان خیالات [illegible] کی طرف [illegible] کی طرح آن کھڑی ہوتی ہیں جو سمان کے [illegible] ظلم و [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] آنسو [illegible] اپنی زندگی تباہ و برباد کر دی ہے۔ اس کے دل میں [illegible] کے خلاف نفرت و حقارت کے [illegible] غیر منصفانہ سلوک کا [illegible] انتقام اٹھا۔!

اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔۔!

ساون کے دن تھے ۔۔!

آسمان پر کالی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب برسیں گے تب برسیں گے۔ سائیکل مشاق سائیکلسٹ پرساتی ناتھ، ہاتھ میں کتابوں کا ایک [illegible] چلا جا رہا تھا۔ کالج کی طرف جاتے ہوئے کبھی کبھی مڑ کر آسمان کی جانب دیکھ لیتا اور پھر سائیکل کی رفتار تیز کر دیتا تھا۔ شہر سے کالج تین میل کے فاصلے پر تھا۔ یوں تو کالج جانے کے راستے اور بھی تھے۔ لیکن جس راستے سے وہ جاتا تھا سب سے نزدیک کا راستہ تھا۔ [illegible] کہ [illegible] اور [illegible] کے [illegible] آسمان کا رنگ اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ چوراہے سے گزر رہا تھا تیز تیز پیڈل مارتا ہوا لیکن دیکھتے دیکھتے پانی کی تیز بوند گری جس سے وہ پرساتی پہننے کا فیصلہ کر چکا تھا ۔۔۔ اپنے اور کچھ دور دل طرف نظر دوڑائی۔ سامنے ایک [illegible] نظر آیا۔ فوراً اتر پڑا۔ سائیکل ایک [illegible] کی اور برساتی میں [illegible] ہو گیا۔ سر سے پیر تک [illegible] تھا وہ [illegible] اس نے سر پر چڑھا لیا [illegible] کیا اور اس کی نگاہ پیڈل پر لگی ہوئی برساتی پر پڑی جو [illegible] چکی تھی۔ اس نے برساتی کو اٹھایا اور پھیلا کر پھر [illegible] دیا۔

ٹپ، ٹپ ۔۔۔ ٹپ!

پانی نیچے گرنے لگا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ ہوا زور شور سے چل رہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔۔۔ وہ چلنے لگا کہ دفعتاً ٹھٹک گیا۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔

وہ بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھیں اس کی جانب تک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک محو حیرت بنا دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جھجک اور شرم کے مارے وہ خاموش رہا۔ کسی غیر کے مکان میں یوں بلا اجازت چلا آنا خلاف تہذیب ہے ۔۔۔

شاید وہ کچھ کہنے آئی ہے۔ وہ سوچنے لگا اور پھر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا ۔

"معاف کیجئے گا ۔۔۔ پانی برس رہا ہے۔ اس لئے یہاں ٹھہر گیا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں چلا جاؤں؟"

"جی نہیں۔ بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ یہاں برساتی میں کئی بوچھاڑ آتی ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اندر تشریف لا سکتے ہیں۔ بارش ختم ہو جائے تو چلے جائیے گا۔"

سرتاپا اس نے اس مجسمہ حسن کا جائزہ لیا۔ برآمدے سے باہر نکلی ہوئی گوری گوری بانہیں، نقرئی گلوبند، گلابی رنگ، میانہ قد، سڈول جسم، سیاہ دراز زلفیں، آسمانی رنگ کی ساڑھی۔ بڑی بڑی خمدار آنکھیں جن سے شوخی اور معصومیت یک وقت جھلکتی تھی۔ ایک ساتھ ہی گویا سراپا حسن و جمال تھی ۔۔۔

یوں تو کالج میں اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ شیلا، نرملا، سنیدہ اور آشا۔ جنہیں اپنے حسن و خوبصورتی پر بے حد ناز تھا لیکن اس کے سامنے سب کی خوبصورتی ماند دکھائی دینے لگی۔

وہ منزل کھو بیٹھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ایک طرف بیٹھنا مناسب سمجھا اور خود اس کے متعلق کچھ سوچنے لگا۔ وہ قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ دفعتاً پھر وہ چونک پڑا۔ کمرے کا سناٹا ہوئی اور ایک چھوٹا سا ہاتھ میں ایک بچے کا سر نمودار ہوا۔

"آپ کا رومال بھیگ گیا ہے اس کو سکھا لیجئے"

ر چھ ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ اگر کل موسم خراب رہے تو
م ہو جائے گا۔"

"ان آپ میرے بارے میں خواہ مخواہ پریشان
ہیں۔" کہتے ہوئے اس نے رومال نکالا۔
ل لیتے لیتے ایک نظر نوجوان نے اس کی طرف ڈالی۔
یاہ آنکھیں اب بھی اسے گھور رہی تھیں۔ اس
ں ہی اس نے کسی معصوم بچے کی صداقت اور
بازی کی تھی ——

"آپ کا شبھ نام پوچھ سکتا ہوں ——؟" اس
فرش پر نگاہ گڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ویسے تو میرا نام کمل کشور ہے۔ لیکن مجھے
ور کہتے ہیں ——"

کشور نے دیکھا، اس کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے
رت سے چمک رہا تھا۔ اس پر اداسی کے بادل چھا
ر۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا اس اچانک تبدیلی کو ——
اس کی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا

"آپ نے مجھ سے تو سب کچھ پوچھ لیا۔ لیکن
نا تعارف ابھی تک نہیں کرایا ہے۔"

"میرا نام کملا ہے۔" کہتے کہتے وہ چپ
ہو گئی ——

"آپ کو موسیقی سے بھی شوق ہے ——؟"
شور، اڈ موسیقی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"پہلے ضرور تھا، مگر اب مجبوری ہے۔"

"کیوں ——؟"

"انسان اپنی ہی مرضی سے سب کچھ نہیں کرتا
کبھی کبھی مجبوری بھی اس سے سب کچھ کرا لیتی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے پر بنی ہوئی گھڑی
کو دیکھا تو ایک بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ بادل بھی
صاف ہو چکا تھا۔ کچھ کچھ دھوپ بھی نکل آئی تھی قریب
آدھ گھنٹہ ہو گیا تھا اسے یہاں بیٹھے ہوئے۔

"اچھا کملا جی! اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ مجھے
اجازت دیجئے۔ آپ کا قیمتی وقت میں نے ضائع
کیا ——"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف سر نیچے
کر کے کشور کے ساتھ آ گئی۔

"پھر کسی دن آئیے گا کشور بابو ——!" اداس
کر دینے والی آنکھیں کشور کی آنکھوں سے ٹکرائیں ——۔ وہ
انکار نہ کر سکا۔

"اگلے سنیچر یا اتوار کو ——"

"آئیے گا کشور بابو! میں تو کبھی کہیں آنے کی بات
بھولی نہ گئی ہوں۔ ورنہ آپ کھڑے دیکھ رہے ہیں ——؟
بیٹھئے نا۔" کملا زیر لب مسکراتی ہوئی بولی۔

"جب وعدہ کر لیا تھا تو کیسے نہ آتا اور پھر آپ کا
رومال بھی تو واپس کرنا تھا۔" اس نے جیب میں اپنے ساتھ
——!"

"کیوں —— کیا میری اتنی سی چیز بھی آپ نہیں رکھ
سکتے۔ مجھے اتنا گرا ہوا تصور کرتے ہیں آپ ——؟"
اس کی خمار آلود نگاہیں کشور کے سیاہ گھونگھریالے
بالوں میں اُلجھ گئیں ——!

کشور اس کی اس شوخ کلامی سے کٹ گیا اور کچھ
جھینپ سا گیا۔

"نہیں، یہ بات نہیں کملا جی! میرے متعلق آپ اپنے
دل میں اس قسم کا خیال کبھی نہ لائیں۔ میں اتنا گیا گزرا انسان
نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ گرا ہوا انسان کبھی اٹھ سکتا
ہے۔ اگر اسے سہارا مل جائے ——!"

"سچ کہتے ہیں آپ ——! لیکن گرے ہوئے کو
سہارا کون دیتا ہے۔ یہ دنیا ہے کشور بابو۔ دنیا والے
اسے اور زیادہ ٹھوکر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ بالکل
ہی مٹ جائے۔ آپ جیسے سنجیدہ انسان بہت کم دیکھنے
میں آتے ہیں کشور بابو ——!"

"میں چلتا ہوں کملا جی! کشور نے کارخانے
جاتے ہوئے کہا۔ "آپ سے مل کر بہت
خوشی ہوئی۔ اگر آپ کا قیمتی وقت یونہی ضائع
ہوا ہو ——"

"اس میں ہرجا کی کیا بات ہے؟ بھلا آپ سے
مل کر آپ کا کیا نقصان ہو جائے گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں کملا جی! اپنے منہ میاں
مٹھو بننا۔ میرے پاس تو فضول وقت کچھ بھی نہیں۔ پھر میں پان کھاتا
ہوں اور نہ پائے پیتا ہوں۔"

"کیسی بات کرتے ہیں آپ —— میں پیسے کی بھوکی
نہیں۔ مجھے تو ہمدردی کے دو لفظ چاہئیں۔ بس!
آپ تک دنیا والوں نے مجھ غریب جلی سے ہمدردی کا ایک
آدھ جملہ بھی نہیں کہا۔ آپ جیسے انسان میرے گھر
میں آئیں، میں تو اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں —— لیکن
آپ مجھے اب بھی غلط سمجھ رہے ہیں۔"

کشور اس کے برجستہ جواب سے لاجواب ہو گیا
اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ گلا صاف کیا اور پھر ایک
دم بھرا ہوا گلا خفا خفا سے لہجہ میں لہرانے لگا۔

"ٹپ ٹپ کر لرز لرز کر گذرا دل بیتاب و نہاں کب تک
غم دہر کا ظلم سہوں کہاں تک کہ ہوں خموش بداماں کب تک"

گاتے گاتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور رقص کرنے لگی
کشور بیٹھا اس کی جانب ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ پائل کی
رم جھم اور اس کی مترنم آواز نے اسے بے خود سا
بنا دیا تھا۔ کبھی اس کے رقص کرتے پاؤں کی طرف دیکھتا
کبھی اس کے چہرے کی طرف اور کبھی اس کی آنکھیں کملا
کی مستی خیز آنکھوں سے ٹکرا جاتیں۔

دونوں ایک دوسرے میں جذب ہوتے جا رہے
تھے۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کی دلی کیفیات کا
جائزہ لے رہی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں پیام محبت
ادا ہو رہے تھے۔ کملا کا دل جیسے پکار رہا تھا

"کملا! تو آج اپنے فن کا کمال انتہا کو پہنچا دے
جو کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے اپنے دیوتا کو خوش کرنے کا ——
رقص نے جادو کا اثر کیا تو تمام دنیا کے انسان تیرے
ہے گی یہاں کی بات کملا کو خوش کر

... چند منٹ میں پہنچ جائیں گے ۔۔۔
... پہنچ کر ٹرین کے ڈبے کی کھڑکی سے
... کشور نے اُسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ اُس کی آنکھیں
... ساون بھادوں بن گئیں۔ اُس نے ہاتھ کا پسینہ صاف کیا
... اُس کے ماتھے کا پسینہ صاف کیا
... ہو گئی۔ چند منٹ بعد اُس نے آنکھیں
... تو دیکھا کشور بیٹھا اُسے تک رہا ہے۔ وہ اس
... کہتے ہوئے بولی:

"آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں ۔۔۔ نوکر کو
... دیجئے!"

"کیا کچھ آج ہی ادھیکار نہیں کہ تمہیں پنکھا
... کروں۔ میری ہی خاطر تم کو اتنی تکلیف اُٹھانی پڑی"
اس جملے کو کہتے ہوئے کشور "تم" سے ایک عجیب
... ایک عجیب مٹھاس تھی جس کا ہر ہر جرم گواہ
زندگی میں پہلی مرتبہ سنا کہ کسی نے اس کی زبان
سے اس قدر پیار بھری، محبت کے الفاظ نکلے تھے۔ اُس
کی آنکھیں نہ جانے کیوں بھیگ گئیں۔ وہ کسی کے
سامنے رو نہیں سکتی تھی۔ دور رہ کر بھی اس کا دل
جانتا تھا، خاص طور پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔ کشور نے
اپنے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کملا! تم دکھی ہو۔ کیا تکلیف ہے تمہیں، بولو اگر
... کشور تمہارے دکھ کو دور کرنے
... کوشش کرے گا۔"

کملا نے اپنا ہاتھ کشور کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی
"... آپ نے مجھ بہت کچھ دیا ہے کشور بابو! آپ

... پنکھا جھلتا رہا ہے۔ کملا کی آنکھیں
... ہوئے کہا۔

"... کا سہارا ہے کملا! اب تم جلد ہی
... پڑو میں پہنچ جاؤ گی۔"

اور کشور نے اُسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ جذبات
محبت سے مغلوب ہو کر ۔۔۔! دو دلوں کے جلے ہوئے ہونٹ
ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ۔۔۔!

× × × × ×

سکے کے دن جاتے دیر نہیں لگتی ۔۔۔!

اسی طرح ایک برس بیت گیا۔ کشور کے امتحان کا
نتیجہ نکلا، وہ پاس ہو گیا۔ مگر کوئی نمایاں درجہ حاصل
نہ کر سکا۔ کملا نے کشور کی کامیابی پر بھاگوان دیوی
مگر وہ خلاف معمول دلگیر و ملول نظر آ رہا تھا۔ کملا نے کشور
کو خاموش دیکھ کر پوچھا:

"کیوں، کیا بات ہوئی ۔۔۔؟"

"نہیں کوئی بات نہیں ۔۔۔ پتا جی ۔۔۔!" اتنا
کہہ کر کشور خاموش ہو گیا۔

"کیا ہوا آپ کے پتا جی کو ۔۔۔؟"

"کچھ ہوا تو نہیں، کشور دھیمی آواز میں بولا۔
"پتا جی کا تار آیا ہے، لکھا ہے "فوراً چلے آؤ" لیکن
میں جانا نہیں چاہتا۔ تمہیں اس بے سروسامانی میں
چھوڑ کر ۔۔۔!"

"نہیں، نہیں، آپ ضرور جائیے، تکلیف دہ ہے
جانا کیا بات ہے۔ کچھ قدرے سنجیدگی سے خود کو
سنبھالتے ہوئے بولی۔ "سمجھ کر ان کہے کوئی ایسی
ویسی بات نہ ہو!" وہ دل پر صبر کا پتھر رکھ کر کہنے کو تو
کہہ گئی۔ مگر کشور کی جدائی کا خیال آتے ہی اس کے
نازک دل پر غم و فراق کی خوفناک گھٹائیں چھا گئیں!

* * * * *

دو ہفتہ تک کشور کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ روز
برآمدہ میں کھڑی ڈاکیہ کی راہ دیکھتی۔ کبھی کبھی اس کے
پاؤں تھک جاتے اور مایوس ہو جاتی۔ وہ انتظار کی گھڑیاں
... بے چینی اور اضطراب میں گزار رہی تھی کہ ایک
... ڈاکیے نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا۔ وہ
... نے ہر روز کی طرح سمجھا تھا، جلدی سے لفافہ کھولا
... کھا تھا:

کلکتہ، ۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء

میری کملا!

تمہیں خط لکھنے میں خلاف امید تاخیر ہوئی
... کو شکایت تو ضرور ہو گی۔ کیا کروں، چند وجوہ
... بنا پر میں تمہیں حسب وعدہ خط نہیں لکھ سکا۔

میرے یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ پتا جی نے
میری شادی ایک بڑے گھرانے میں ٹھہرائی ہے لڑکی
نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے اسباب
نہ معلوم انہیں کس نے ہم دونوں کے تعلقات کی بھی
اطلاع دے دی ہے لیکن میں نے بھی صاف کہہ دیا
ہے کہ شادی کروں گا تو کملا سے، نہیں تو سدا کنوار
رہوں گا۔ تم مجھ پر صبر و سبر کرتی ہونا کملا، اپنے کو
... پر ۔۔۔؟ تو ایک بات کہوں۔ وہ یہ کہ دو سال کی
ایک ٹریننگ ہے، سوچتا ہوں کہ اس کو پاس کر
لوں اس کے بعد ایک اچھی سی ملازمت مل جائے گی
ہم دونوں پُر مسرت زندگی بسر کریں گے اور ہمارے پیار
کا رشتہ دنیا حقیقت بن جائے گی ۔۔۔ زیادہ کیا لکھوں
... اپنے دل میں میرے متعلق کسی قسم کا خیال نہ لانا
دو سال ہی کی تو بات ہے ۔۔۔ اور بس!

تمہارا ہی ۔۔۔ کشور

کملا نے خط پڑھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار
بار بار پڑھتی رہی۔ دو سالی کا وہ طویل عرصہ
سوچتی اور اپنے دل کو ہر لمحہ بہلانے اور خوشی
کی ناکام سعی کرتی۔ لیکن دل پر ایک نامعلوم
ہر وقت چھایا رہتا ۔۔۔ ایک عرصہ تک کشور
کا کوئی خط نہیں آیا۔ دن بیتے جا رہے تھے
انتظار میں ... دن کا ایک ایک

پڑی تھی وہ ۔۔۔ کشور کی طبیعی ناسازی سے
ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے
وہ سوچنے لگی ۔

کہیں اسکول نے تجھے بھلا تو نہیں دیا ۔ نہیں نہیں وہ
ایسے نہیں ۔ نصیب دشمناں کہیں کوئی ایسی ویسی بات
نہیں ہو گئی ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ موسم کی تبدیلی ہو
خدا جانے ۔ تو نہیں کہتے وہ سے کے کچھ کیفیت معلوم ہو ۔
طرح طرح کے پریشان کن خیالات اُس کے دل میں اپنے
گھر کہیں شادی تو نہیں کر لی اُنھوں نے ۔ لیکن
اس کے دل نے اُسے دھتکار تو جھٹ کہا ۔

"کیوں اس قدر پریشان ہوتی جا رہی ہے ۔ اگر کشور
نے شادی بھی کر لی تو کیا ہوا ۔۔۔ ؟ محبت کا دوسرا
نام "محبوب" ہے ۔ محبت میں استقلال نہیں
ہوتا ۔ قرار نہیں ۔ بے چینی و بے قراری ہی محبت
کا اصل منزل ہے ۔ اگر تو اس منزل پر پہنچ گئی ۔ اگر اپنے
محبوب کی طرف سے بدگمان ہو گئی تو سمجھ لے کہ تیری محبت
نہایت کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ دل نے اس جواب پر
وہ خاموشی اختیار کر لی ۔ مگر اس کی تشویش روز بروز
بڑھتی گئی ۔ اس کے دماغ پر خیالات کا لاتعداد سلسلہ
چھا گیا ۔

× × × × ×

کملا کی صحت روز بروز گرتی گئی ۔۔۔ !

"مریضہ کا تپ ابھی پہلی منزل پر ہے ۔ کوئی
دل صدمہ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔" ڈاکٹر بولا "انھیں
تبدیلی آب و ہوا کے لئے کسی پُر فضا مقام پر لے جانا
چاہیے ۔۔۔"

خادمہ نے تمام باتیں جو ڈاکٹر نے کہی تھیں
کملا کے سامنے من و عن دہرا دیں ۔ لیکن کملا نے کہیں
باہر جانے سے صاف انکار کر دیا ۔

وقت کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ بڑھتا گیا ۔
مریضہ کی نزاعی کیفیت ۔۔۔ قریب تر ہوتی جا رہی

تھی ۔ اب امید تھی اور نہ امید کے اس کنارے ایک
نہ ایک دن آئے گا ۔ اور ضرور آئے گا

× × × × ×

آسمان پر کالی گھٹائیں امنڈ رہی تھیں ۔۔۔
بندا یا ندی چھوڑ چکی تھی ۔ کشور کا تانگہ آ کر رکا ۔ وہ
تانگہ سے اُتر کر سیدھا کملا کے کمرے میں داخل ہوا
لیکن وہ دہلیز پر پہنچ کر ٹھٹک گیا ۔۔۔ اُسے
اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔

"یہ اس کی کیا حالت ہے ۔۔۔ ؟"

"کیا یہ وہی کملا ہے ۔۔۔ ؟"

لیکن اب تو وہ پہچاننے کا اختیار کھو چکی تھی
وہ بے اختیار اُس کی طرف بڑھا ۔ اور پھر پکارا ۔۔۔
"کملا ! یہ تم نے کیا حالت بنا لی اپنی ۔۔۔ ؟ تم بیمار
تھیں اور مجھے خبر بھی نہ دی اپنی ۔۔۔ دیکھو میں
آ گیا ہوں تمہارا کشور ۔۔۔ کملا ۔۔۔ میری کملا ۔۔۔ !
کیا بھول گئیں اپنے کشور کو ۔۔۔ ؟"

کشور کی آواز شدتِ رنج و غم سے حلق میں گھٹ
کر رہ گئی ۔

"اب تمہاری کملا اس عالم میں نہیں ہے
کشور بابو ۔۔۔ ! آج تک وہ تمہارا انتظار کرتی رہی ۔
لیکن تم دیر سے آئے ۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تمہارا نام
لیتے لیتے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی ۔ تم جب سے گئے
اس کی سدھ ہی بھول گئے ۔ تمہارے نام ایک چٹھی دے
گئی ہے بھیا دی ۔۔۔ !"

بڑھی نوکرانی نے اپنی ساڑھی کے آنچل سے آنسو
پونچھتے ہوئے کشور کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے دیا ۔

کشور کو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین ہل رہی ہے
آندھیاں اُٹھ رہی ہیں ۔ طوفان آ رہا ہے ۔ وہ ایک
سانس میں ساری چٹھی پڑھ گیا ۔۔۔ !

میرے دیوتا ! آخری پرنام ۔۔۔

میں جا رہی ہوں ۔ اس دنیا سے ۔ اس کشمکش
اور ہلچل سے جہاں ہر چیز ۔ اور ہر ہستی ۔ ہر وقت
تم مجھے زندگی میں نہیں ۔ پا سکتے ہو ۔۔۔ !

تمہارا ہزار ہزار احسان !

تم میرے جیون میں آئے ۔ مجھ گمراہ کو نئی زندگی
کا پتہ دیا ۔ تم نے مجھ بے سہارا و بے کس کو اپنا سہارا دے کر اپنا لیا ۔ تم نے
میری زندگی کے پچھلے واقعات کو بھلانے کی ہر ممکن کوشش
نہیں کی ۔ تم سچے پجاری تھے ۔ اس لئے اپنے دیوتا کے
سامنے سب باتیں صاف صاف بتا دی ہیں

میرے پتا جی ایک وکیل تھے ۔ ان کی محبت و شفقت
کا سایہ عالم طفولیت ہی میں میرے سر سے اٹھ گیا تھا
پتا جی نے مجھے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا اور بڑا کیا ۔
اور انھوں نے بہت کوشش کی کہ ماں کی یاد مجھے نہ
ستائے

بچپن کی لاشعوری عمر سے نکل کر آگہی و جوانی
کی درمیانی فضاؤں میں سانس لینے لگی ۔۔۔ تب
میں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی کہ اچانک حرکتِ قلب
بند ہو جانے کی وجہ سے پتا جی سورگباش ہو گئے

میرے چچا کے ہاتھ ساری جائداد لگی میرے اور
کوئی بھائی بہن نہیں تھے ۔ وہ مجھے پالنے کی کوشش
میں لگے تھے ۔ میری تمام جائداد پر قابض ہونے کے
انھوں نے میری شادی ایک پچاس سال کے بڈھے
سے کر دی ۔ اس بوڑھے کے پانچ لڑکے تھے ۔ جن میں سے
تو پہلے ہی مر چکی تھیں ۔ چوتھی میں تھی ۔۔۔

میری نوکرانی جو میرے ساتھ رہتی تھی ۔ اُس سے
یہ سب باتیں مجھے معلوم ہوئیں ۔ ایک رات میں اپنی نوکرانی
کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑی ہوئی ۔ تب سے
سماج کی قربان گاہ پر کبوتر کی طرح تڑپ رہی ہوں
بے رحم سماج ۔ ظالم دنیا ۔ میں کہاں جاؤں
کیا کروں ۔ میں نہیں جانتی ۔ میں نے
کیا ہے ۔ ان کی سزا

پندرہ اگست

دیپک جلائیں دل کے کہ پندرہ اگست ہے
خوشیاں منائیں مل کے کہ پندرہ اگست ہے

بہار آج ہے آئی بشکلِ آزادی
مگر وہ قید ہے دولت کے قیدخانے میں

ہنسی خوشی کے خزانے بھی ساتھ لائی
مگر سمجھ سے دور ہے اگر مرے زمانے میں

سجی ہوئی ہیں یہ اونچی عمارتیں کیسی
ہزاروں گھر ہیں جہاں روشنی کا نام نہیں

یہ قمقمے ہیں کہ محلوں میں کوندتی بجلی
کہ جس کے نور کی قسمت میں فیضِ عام نہیں

جسے نصیب ہیں اشکوں کے جھلملاتے چراغ
انھیں سے آج غریب اپنا گھر سجائے گا

سکون پائے گا کس طرح آخر اس کا دماغ
جو بچہ بھوک کی شدت سے بلبلائے گا

یہ حکم ہے کہ زیادہ اناج اگاتے جاؤ
تمہاری ملک میں تعداد بڑھتی جاتی ہے

سبھی کو تھوڑا کھلاؤ خود آپ تھوڑا کھاؤ
کہ قوم بامِ ترقی پہ چڑھتی جاتی ہے

امیر لوگ تو دن بھر خوشی مناتے رہیں
مگر غریب! کہ اک بار مسکرا نہ سکے

دیئے شگفتہ دلوں کے تو جگمگاتے رہے
بجھے دلوں کے چراغ آہ! ہم جلا نہ سکے

خوشی کے نور سے محفوظ دل ہمارے ہوئے
مگر غریبوں کے دل اُن سے کچھ بہل نہ سکے

ہمیں تو راج ملے آج ہو گئے برسوں
مگر دلوں میں خوشی کے چراغ جل نہ سکے

چلو منائیں خوشی ہر طرف چراغ جلیں
ہم اپنی سعی سے اس سب کو ضو فشاں کر دیں

بجھے پڑے ہیں یہ حسرت سے تک رہے ہیں ہمیں
ہم ان کے نور کو اے ہمدمو! جواں کر دیں

کچھ تو ہوتی ہیں نباتیں، یہ ساتھی ہے ساتھی اور کہنے نہ سننے پر چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے ہر مرتبہ محبت و دوستی کا سودا کر جاتے تھے۔

میں علم و سیقوں سے پہلے ہی سے باہر تھی جب کوئی پریشانی دیکھتی تو اسے محبت کی سوغات کا سہارا بنا لیتی یہ باتیں سب کچھ کہنا اچھا ہے۔ سنگیتا کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ میں اب تک گوتم بدھ کی طرح پوتر ہوں۔ صرف تمہارے پیار بھرے ہاتھوں نے میرے جسم کو مس کیا ہے۔!

تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں مسکراتی ہوئی ملوں، میں اپنی ہمجولیوں میں تمہارا ہی نام لے لے کر مسکراتی رہی۔

اب میرا یہ آخری خط ہے اسے ٹھکرانا نہیں تم شادی کرنے جا رہے ہو، میں نے جو چوڑیاں اور سلک رومال شادی کے لئے منگوا رکھا تھا وہ میری چھوٹی بہن کے ہاتھ اسے میری طرف سے نہایت خلوص دل کے ساتھ تحفتاً دے دینا! میرے لئے غم نہ کرنا، ہمجولیاں تمہیں سکھی رکھے۔ الوداع

تمہاری ـــــ کملا

خط تمام ہوتے ہی کشور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــ "کملا تم چلی گئیں، میری دنیا ڈوب گئی۔ میرے سب سپنے ادھورے رہ گئے ـــ!"

اس کا گلا رندھ گیا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دانہ کی جانب لگی تھیں جیسے کسی کے انتظار میں ہوں ـــ!!

باہر پرندوں سے بادل چہچہا رہی تھی۔ بھگی کوئل کوک رہی تھی بادل گرج رہے تھے۔ ہوا کی شائیں شائیں کی آواز آ رہی تھی۔ اس ہنگامہ عظیم میں ہی کشور کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کملا کا ہی وہ اس کی مترنم آواز اب بھی گونج رہی ہے ـــ

اہل مفاد کر رہے ہیں تم کو یہ کہہ کے نذرِ حسرت شاید یہ نہ آئیں لوٹ کر وہ نہ آئیں لوٹ کر مگر ہم انتظار تک

یہ کام اپنے شہری شعلہ نظم کی کسی دوست سے بہت سے تعاون کرنے میں امداد فرمائیے نیز جب کی اس کا

مشاہداتِ ارسطو

دھکے

ارسطو نے چھوکرے کو بلا کر پوچھا
"اس جوتے میں تلوا لگانے کے لئے کتنے پیسے لوگے؟"
"آٹھ آنے حضور!"
"چل نکل، سالہ کہیں کا۔ لوٹنے آیا ہے!"
اس نے دھکے مار کر چھوکرے کو باہر نکال دیا اور جوتوں کی اصلی دکان پر پہنچا۔
"اس جوتے میں سول لگانے کا کیا لیجئے گا؟"
"ساڑھے تین روپے"
"کچھ کم نہ ہوگا۔۔۔؟"
"بوڑھے کو اندر آنے کو۔۔۔"
اور ایجنٹ نے دھکے مار کر ارسطو کو باہر نکال دیا!

اولاد

پروفیسر ڈارون کا فلسفہ سمجھا رہا تھا
"انسان بندر کی اولاد ہے۔"
ارسطو بولا:۔ "جی ہاں آپ کے صاحبزادے یہی فرماتے تھے۔"
پروفیسر جھلا کر اس کی طرف لپکا لیکن ارسطو بندر کی طرح چھلانگ لگا کر دور کھڑا ہو گیا۔

آلو کی قدر

اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا
"آپ ملک کے مشہور شاعر، مؤرخ، مکالمہ نویس ہیں۔"
ارسطو مسکرا کر بولا۔ "مجھے تو چند نظر آتے ہیں"
اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "ہونہہ! تمہیں فلم کب پہچاننا ہے؟"
ارسطو مسکرا کر بولا۔ "جی ہاں قصہ آلو کی آلو پہچانتا ہے!"

خلوص کار

ارسطو نے لپک کر اس سے بغل گیر ہوا۔
"مزاج کیسے ہیں آپ کے؟"
"فرمائش ہے آپ کی۔۔۔"
"بال بچے تو اچھے ہیں۔۔۔؟"
"اللہ کا کرم ہے۔"
"کہاں تشریف لے جایئے گا؟"
"ذرا کانجی ہاؤس تک جانا ہے۔"
"اچھا تو پھر اجازت دیجئے میں جانب گھر تک جاؤں گا۔۔۔"
اور پھر رخصت ہوتے ہوئے ارسطو نے آواز دبا کر کہا:۔
"معاف کیجئے گا، آپ کے پیسے وقت پر ادا نہ کر سکا کل ضرور پہنچا دوں گا۔۔۔"
"اوہ! وہ تو میں بھول ہی چکا۔ تین روپے چودہ آنے گیارہ آنے ہوتے ہی کتنے ہیں؟"
ارسطو بھر پور قہقہہ لگا کر بولا۔
"خبیث ایک پیسہ کا تو نہیں بھولا۔۔۔!"

دیا دھرم

تین فرلانگ جانے کے بعد ارسطو اپنا ہینڈ بیگ گردی رکھنے چلا۔ بنیا اس وقت چاہ پانی پی کر مونچھیں مار رہا تھا۔
ہینڈ بیگ دیکھ کر بنیے سے چیخ چیخ کر کہنے لگا۔
"رام رام! ایسا چمڑے کی چیز نہیں چھو سکتے۔ جیو ہتیا کے بھاگی ہو جائیں گے!"

ساختہ بے ساختہ

"کون کہتا ہے، اردو جنتا کی بھاشا ہے؟"
ایک بھاشن جی تقریر فرما رہے تھے۔ "یہ ایک جاتی کی بھاشا ہے جو بدیش سے آئی گئی ہے اور۔۔۔۔۔"
تب تک ارسطو کا چپراسی کے منہ پر پہنچا تھا۔
"ٹھہر تو بیا! حرامزادے، ناٹا فن دیکھنے!"
وہ اس کی طرف لپکا۔ ارسطو یہ کہتے کے بھاگ کھڑے ہوا۔ کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگا۔۔۔
"بولا۔۔۔ اور بولا!"

لوک سماج

ارسطو سیٹھ کے پاس چندہ مانگنے گیا۔ "دینے نہیں، انہیں کے لئے۔۔۔"
سیٹھ نے انکار کر دیا۔
دوسری بار گیا۔ سیٹھ نے برکی طرح جھڑک دیا۔
تیسری بار گیا۔ سیٹھ نے دھکے دے کر نکلوا دیا۔
لیکن چوتھی بار گیا تو سیٹھ انکار نہ کر سکا۔ اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے منشر، ڈپٹی کمشنر اور [illegible] صدر کی طرف دیکھتے ہوئے تجوری کھول دی اور دو سو روپے ضیافت نکال دیئے۔۔۔

عملی تعلیم

ماسٹر پڑھا رہا تھا

"زندگی کی مشکلیں کیا ہیں گھبرائیں کیوں اصل مشکل یہ ہے جو ہم مستقل کہتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اسی سلسلے میں ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ کوئی کام شروع کرنے سے قبل کبھی ہم دل توڑ کر کام کو ناکام نہ شروع کریں کیونکہ ایسے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے"

چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماسٹر نے کتاب بند کردی ایک لڑکے نے کہا۔ "ماسٹر صاحب! ابھی سبق پورا نہیں ہوا"

"باقی کل دیکھیں گے۔!"

سوال وجواب

پاگل ڈنڈے سے کسی کا کھوپڑا پیٹ رہا تھا۔ ایک لیڈر آدمی آکر پاگل کو پیٹنے لگا

"کیوں مارتے ہو مجھے؟" پاگل نے پوچھا

"تم کیوں پیٹ رہے ہو؟"

"میں تو پاگل آدمی ہوں —!"

"میں پولیس کا آدمی ہوں!!"

تصویر زمانہ

"دو مفلوک الحال کسان پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے کسی دیہہ کے متعلق بحث کر رہے تھے۔

"دیکھو نا! کیا زمانہ آگیا ہے۔ شاہراہ عام پر اس قسم کے عریاں مجسمے نصب کرنا کہاں کی تہذیب ہے؟"

"اے صاحب! کیا عرض کروں؟ ابھی کل ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!"

اسی دوران قریب سے گزرتی ہوئی بس نے کچل دیا!

یک سوئی

ایک طرف مندر تھا، دوسری طرف مسجد اور گھنٹہ گھر دونوں کے درمیان تھا۔

ارسطو گھنٹہ گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا شاگرد سے کہہ رہا تھا "تم بند کرو یہ ناقوس"

اسی لمحہ مندر میں اور مسجد میں چاروں نے ناقوس بجانے شروع کئے۔

"بند کرو یہ ناقوس!"

"کیوں بند کردیں؟"

"ہماری یک سوئی میں خلل پڑتا ہے"

"ہم تو بجائیں گے"

اور فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔

ارسطو نے کام سے فراغت پاکر سر اٹھایا تو چند لاشیں ادھر پڑی تھیں چند اس طرف۔ اس نے ایک زخمی سے پوچھا —

"یہ کیا ہوا —؟"

زخمی بولا "آپ اتنی دیر سے تو یہاں بیٹھے ہو۔ تمہیں پتہ ہی نہیں؟"

"نہیں بھائی! میں اپنے کام میں محو تھا!"

پیمانے

مسافر خانے کے لئے چندہ کیا جارہا تھا

سیٹھ الف نے پانچ سو روپے دیئے کیونکہ انھیں سفر میں پانچ ہزار ملے تھے۔ سیٹھ ب نے ایک ہزار عطا فرمائے۔ انھیں ایک مارکیٹ سے دس ہزار کی بچت ہوئی تھی۔ ارسطو نے اٹھنی دینی چاہی سو وقار کے ساتھ واپس کردی گئی — ارسطو بے حد خوش تھا "چلو اچھا ہوا، صندوقات کو فاقہ کرنا پڑتا۔

اپنے

"بیٹے! انھیں سلام کرو"

"یہ کون ہیں ابا؟"

"ارسطو ثانی، تمہارے استاد!"

بیٹے نے سلام کیا

"بیٹے انھیں اپنا سبق سناؤ"

"کون سا ابا — ؟"

"پندرہ اور بیس والا —"

بیٹے نے سبق سنایا۔ ارسطو بہت خوش ہوا۔ اور جب اس نے اپنا سمجھ کر بیٹے کو اٹھنی دینا چاہا تو —

"نہیں جی! یہ کیا کہتے ہو بیٹے! دوستوں سے پیسے نہیں لیا کرتے!"

انسان اور برہمن

ایک پنڈت جی ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کر رہے تھے

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مذہبی دیوانگی میں مبتلا ہو کر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ انسان پہلے ہیں اور ہندو یا مسلمان بعد میں۔ آخر خون تو سب میں ایک ہی جیسا ہے۔ مذہب نہیں سکھاتا کہ ہم میں ۔۔۔۔۔۔۔ وہ بھی خدا یا خدا —"

ارسطو نے ایک کرپانی کا گلاس پیش کرنا چاہا پنڈت جی اس کی بڑی داڑھی دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئے

"ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"جی میں صرف انسان ہوں"

پنڈت جی نے برہم ہو کر فرمایا:

"اے بھئی جلسہ میں کیا کوئی برہمن نہیں ہے؟"

خود غرض

"جان تمنا! میں روح کی تمام تر گہرائیوں سے ساتھ تم سے پیار کرتا ہوں"

"لیکن میں بہت غریب ہوں"

"محبت غریبی اور امیری میں کوئی فرق نہیں سمجھتی"

"لیکن میں ۔۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟ اگر تم حکم دو تو میں تمہارے لئے تارے توڑ لاؤں ۔"

تھوڑے پندرہ منٹ کے لئے خاموش ہو گئے اور جب روشنی ہوئی

"پیارے! مجھے ملاقات کے لئے پندرہ روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"دور ہو جا! میری نظروں سے۔ کمینی، خود فروش، محبت کو روپیوں سے تولتی ہے۔"

دوسرا رُخ

ٹرین چھوٹنے سے پہلے ۔

"اس شہر کے عوام آپ کو مدت العمر نہ بھلا سکیں گے۔"

"اور آپ نے مجھ پر جو ذاتی احسانات کئے ہیں وہ مجھے جیتے یاد رہیں گے۔"

"بخدا آپ جیسا رحم دل حاکم نہ کبھی اس شہر کو نصیب ہوا نہ ہوگا۔"

"آپ سے رخصت ہو رہے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا افسر نہیں، باپ ہم سے جدا ہو رہا ہے۔"

اور ٹرین چھوٹنے کے بعد ۔

"خس کم جہاں پاک۔ کم بخت کتنا روپیہ اور دولت تھا۔"

پڑوسی

"اتنی رات گئے کون ہے بھئی!"

"جی میں ہوں آپ کا پڑوسی۔"

"خدا! کہئے کیا خدمت کروں ۔۔۔؟"

"میرا بچہ بہت بیمار ہے۔ تھوڑا سا دودھ ہو تو دیجئے۔"

اس نے دودھ بھجوا دیا۔

دوسرے دن کا واقعہ ہے کہ اسے پڑوسی کے گھر سے بچہ کے رونے کی آواز سنائی دی۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ اس کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے۔

"میں رات کے تین بجے کیوں دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں؟"

"مجھے میں جس آپ کا پڑوسی ہوں! دودھ لینا ہوں بچے کے لئے۔"

کان سے تین موٹے تازے دوسرے پڑوسی نکلے اور اسے پیٹنے لگے۔

"کمینے آدھی رات کو پرائی عورت کے گھر میں گھستا ہے!"

شریف آدمی

اندھیری رات پارک میں جب وہ پھر اس کے سامنے سے سسکتی ہوئی نکلی تو اس سے نہ رہا گیا، اور اس نے ایک گلاب کا پھول حسینہ پر پھینک مارا۔

حسینہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جھوم جھوم کر گانا لگا۔

"آیا کدا ادھر بھی مری جان کبھی کبھی"

حسینہ نے قریب آکر پوچھا:۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔؟"

"جی میں کہہ رہا تھا آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے اک خدا....."

حسینہ آنکھیں مٹکا کر بولی ۔

"صاف صاف بات کیجئے۔ میں ایک بات کے لئے پچیس روپے لیتی ہوں ۔"

اور اس نے چونک کر کہا "معاف کرو بابا! میں شریف آدمی ہوں!"

چھوکرا

آجکل ایک اجنبی کا تعاقب ہے بھاگا۔ لوگوں نے پکڑنا چاہا۔ تو اجنبی نے تشنج کر دیا۔

"جانے دو بیچارے کو ضرورت مند ہوگا"

کچھ اچھا تھوڑی دیر بعد ہی دیکھا کہ اجنبی سے معافی مانگنے لگا:۔

"بخدا، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی میرے بھائی ہیں۔ مجھے آپ کی جیب کترنے کی خبر نہیں!"

اور اجنبی جوتوں سے آنکھ کی جوت نکالتے ہوئے بولا ۔ "کمینے! اپنے ساتھی میرے بھائی کہو تو سہی۔"

پاگل شماری

ارسطو نے جنیرا بدلا اور چاند کو منہ چڑانے لگا دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد بھیڑ اکٹھا ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟"

"معلوم نہیں کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔"

ارسطو بولا "میں پاگل نہیں ہوں۔"

"پھر کیا حرکت ہے؟"

"میں اس شہر کے پاگلوں کی شمار کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر ۔۔۔۔؟"

"معلوم ہوا کہ کافی تعداد حرکتوں سے دیکھ کر اور اپنا وقت ضائع کرنے والے بے شمار پاگل یہاں موجود ہیں گنتی مشکل نہیں!"

عقل مند ترین

ایک بیت زیادہ عقل مند آدمی نے ایک کو پکڑ لیا اور بولا:۔

"لوگ تمہیں شہر کا عقلمند ترین آدمی کہتے ہیں لیکن سب سے زیادہ عقلمند میں ہوں۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس ۔۔۔؟"

عقل مند بولا:۔ "ہر شخص کے لئے الگ الگ کام ہے اب تمہیں بتاؤ کہ تم یہ سمجھ کر کہ میں عقلمند ہوں کہ سکتے ہو یا اپنے ہی کہنے میں آ کر کہ تم عقلمند ہو۔"

"نہیں ۔۔۔"

"لیکن میں یہ دونوں حرکتیں کر سکتا ہوں۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"ثابت ہوا کہ میں تم دونوں سے عقلمند ہوں۔"

تھیٹر پہلے کیا ہے جب سے کہ خرچا کم ہوا اور پیسے
خرچ کرتے ہیں اسی طرح ہم تم سے زیادہ قابل ضرورت
دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔
"یہ بیوقوف اپنا کام کرنے سے زیادہ عقلمندی حماقت کی
دلیل ہے!"

سیاست

دوستوں کی شوخ چشمی کا آشیانہ دیکھ کر دوست
نے اپنے ساتھی سے کہا۔
"یہ بلبل شاید حال ہی میں کمیونسٹ ہوئی ہے"
آگے چل کر شیخ کی بنا تعمیر ہوئی ہوئی نظر آیا تو ساتھی
نے پوچھا۔
"اس کے متعلق کیا خیال ہے استاد؟"
"کوئی پرانا کانگریسی معلوم ہوتا ہے۔"

داد بیداد

دوست نے بڑا حسین سا شعر سنایا۔ حاضرین پر نظر
ڈالی تو بڑی بینک دوست کے فقروں سے پشتال گونج
رہا۔ دوست نے جھوم جھوم کر کے اور بار بار شعر سنا
کر داد لی۔ خدا خدا کر کے شور تھما تو دوست نے دوسرا
شعر پڑھا تو ایک گوشے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز
سنائی دی۔ لوگ جوتے لے کر مارنے دوڑے تو دوست
نے روک دیا۔
"خدا اسے ستا رہا ہے۔ مجھ بغیر سلام کئے ہوا
جا رہی ہے۔"

بلی اور گھنٹی

شہر میں اردو ہائی اسکول کے اجراء کی تحریک پر
میونسپل کمیٹی کے ممبران اسکولوں کے معائنہ کے لئے ایک
کمیٹی مقرر کی۔ ممبر صاحب کی سواری آئی تو ہیڈ ماسٹر
بھی چپڑاسی کی طرح ساتھ ہو لئے مگر جب معائنہ کام

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کا مسئلہ
سامنے پایا تو سب ممبران نے سر ہلا کر کہا۔
"ہم میونسپل کمیٹی کے ملازم ہیں، ایسی کوئی فیصلہ کن
حرکت نہیں کر سکتے۔"

تہذیب

وہ ہوٹل کے کیبن میں داخل ہوا تو کھانا کھاتے
ہوئے چند اصحاب میں سے ایک نے کہا۔
"آیئے تشریف فرما ہوئیے۔"
"جی شکریہ، میں کھا چکا ہوں۔" فرمانروا نے کہا
اور وہ لوگ کھانا ختم کر چکے۔ تو جھوٹے برتن اور خلال کا
اٹھا کر باہر چلا گیا۔ چند لمحے لوگ پہلے تو ایک دوسرے کی
صورت دیکھتے رہے، پھر زور سے ہنسنے لگے۔
"ارے یہ تو ہوٹل کا بیرا تھا!"

بقیہ جہالت کی علامت نہیں مجھے (صفحہ ۲ سے آگے)
پڑھا تھا) بھائی صاحب تھوڑی سی جگہ دے دو
ریل چھوٹنے ہی والی ہے۔"
پہلا مسافر۔ (اپنا پچھلے اسٹیشن کی حالت بھول
کر آنے والے مسافر کے صندوق کو پیر سے دھکیلتے ہوئے)
"جاؤ، جاؤ ریل چھوٹنے والی ہے۔ تو ہم کیا کریں۔ یہاں
تو پہلے ہی سے بھرا ہوا ہے۔"

سگریٹ

تھیٹر میں پردے کے بائیں جانب جلی حرفوں میں
لکھا ہوا ہے۔
"کلکٹر کے حکم سابق تھیٹر میں بیڑی سگریٹ پینا
منع ہے۔"
ایک تماشائی نے دوسرے باکس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) "پیچھے کوئی صاحب بڑی شان سے سگریٹ
پی رہے ہیں۔"
دوسرا تماشائی۔ "ہاں! پی تو رہے ہیں۔
مگر کلکٹر ہیں!"
پہلا۔ "اچھی بات ہے۔ میں بھی پیتا ہوں
کون پوچھتا ہے۔"
سگریٹ منگا کر پیتے ہے اسے سگریٹ پیتے
کر ایک کانسٹیبل اس کی طرف آتا ہے۔
کانسٹیبل۔ "تمہیں مسٹر تھیٹر میں سگریٹ
پینے؟ چلو میرے ساتھ۔"
تماشائی۔ "تم نے اس شخص کو کیوں نہیں
پکڑا جو پیچھے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔"
کانسٹیبل۔ "اسے آہستہ اور نہیں تو
لیں گے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، وہ یہاں کے
شاید تم نے بورڈ بھی ٹھیک سے نہیں پڑھا۔ وہ
ہے کہ "بیڑی سگریٹ پینا منع ہے۔ لیکن کلکٹر
تو نکار پی رہے ہیں!"

شاعر

ایک سیوک، ایک شاعر سے
سیوک۔ "ڈیفنس فنڈ کے لئے آپ کچھ نہیں
شاعر۔ (ایڈیٹر سے) "ایڈیٹر صاحب!
ڈیفنس فنڈ میں کیا دیا ہے؟"
ایڈیٹر۔ "میں نے اپنے رسالہ "گنگا" کی
کاپیاں ڈیفنس فنڈ میں دی ہیں۔"
شاعر۔ (سیوک سے) "دیکھئے صاحب
نے گنگا کی ایک ہزار کاپیاں دی ہیں، جس میں میرا
کا حصہ ہے۔"
سیوک۔ (حیرت سے) "وہ کیسے؟"
شاعر۔ "اس پرچے میں میری نظم "آگے
شائع ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر کر فوجوں کے

جلد ہی ہم شائقین کے لئے ایک دلچسپ
ضرورت ہے جس میں حضرت خط و کتابت کا
سوال کے جوابات دیئے جائیں گے۔

سش، تذیر الدین ساغر۔ کیلی

جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

بھکاری

(ایک بھکاری ہاتھ پھیلائے ہوئے ایک شخص سے کہتا ہے)

بھکاری:۔ "صاحب! کیمونسٹ پارٹی کو ووٹ دیجیے، کیونکہ کیمونسٹ پارٹی اور صرف یہی ایک پارٹی ہے جو غریبوں کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو ہمارے متعلق کچھ سوچتی ہو۔"

(ایک راہگیر یہ مشورہ سنتا ہوا گزرتا ہے۔ اس میں ایک شخص دوسرے کو بلاتے ہوئے اس کے سامنے آتا ہے)

شخص:۔ "صاحب! آپ بھی کچھ مدد کیجئے۔"

راہگیر:۔ "ارے بھائی! یہ بھکاری چھوڑو اور کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دے دو، تمہاری غریبی ختم ہو جائیگی۔" (پھر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے) "کہا ہے کمیونسٹ پارٹی کے دورِ حکومت میں کوئی بھکاری نہیں ہوگا۔"

شخص:۔ "اچھا صاحب! کل کمیونسٹ پارٹی کا جلسہ ہوگا، میں اس کے لئے ضرور چندہ عنایت کروں گا۔"

پہلا پڑوسی:۔ "کہیں دوسرے جنم میں ایسی کوئی بات ہے؟"

دوسرا پڑوسی:۔ "دوسرے جنم میں آپ نے مجھے 'بھائی' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔"

پہلا پڑوسی:۔ "تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

دوسرا پڑوسی:۔ "بہت فرق پڑتا ہے صاحب، جیسے ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھائی ہی کہا تھا!"

دوستی

"پڑوسی آپس میں کسی بات پر لڑ پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ایک کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ دوسرے کے پاس جا کر کہنے لگا:۔

پہلا پڑوسی:۔ "دیکھئے کچھ دیر پہلے میں آپ سے جھگڑ پڑا تھا۔ مگر اب مجھے اس بات پر ندامت ہو رہی ہے، اس لئے اب سے صاف چاہتا ہوں۔"

(دوسرا پڑوسی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

پہلا پڑوسی:۔ (دوسرے کو خاموش دیکھ کر) "میرا کہا سنا معاف کر دیجئے بھائی! میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔"

دوسرا پڑوسی:۔ (ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر) "بھائی! آپ نے مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اب میں آپ سے کبھی نہیں لڑوں گا۔"

بندر اور انسان

راستے پر ایک بھکاری کی لاش پڑی ہوئی ہے جس کے سامنے ایک میلا کچیلا کپڑا لپیٹے دوسرا بھکاری کھڑا ہوا ہے۔ ایک سیٹھ کو آتے ہوئے دیکھ کر مُردہ بھکاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

بھکاری:۔ "سیٹھ صاحب! اس کا کوئی نہیں ہے۔ بے چارہ کل رات مر گیا۔ اس کی دفنانے کا انتظام ہے کچھ مدد کیجئے۔"

سیٹھ:۔ (حقارت سے) "دفعہ ہو جا، میں تیری کی، صبح صبح سارا ستیاناس کر دیا۔ کم بخت کہیں کا۔"

(آگے بڑھ جاتا ہے)

تھوڑی دیر بعد سیٹھ کے کندھے پر ایک چھوٹی سی دولت کی چوٹی ہے جس پر بھکاری کا مُردہ پڑا ہوا ہے اس کے سامنے کچھ لوگ ڈھول بجا رہے ہیں۔ بھکاری کو دیکھ کر سیٹھ رک جاتا ہے۔

سیٹھ:۔ "ہری اوم، ہری اوم! صبح صبح کس پاپی نے یہ پاپ کیا، سجگ ہو اس کا ستیاناس کرے۔" (جیب سے ایک روپیہ نکال کر) "لو بھائی اس کی ارتھی بنا لو۔"

مسافر

ریل ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دو منٹ کے لئے رکتی ہے۔ ایک مسافر ایک ڈبے کے پاس آتا ہے، اچھا خاصا بھرا ہوا ہے۔ دروازے پر بہت سے مسافر کھڑے ہیں۔

مسافر:۔ (دروازے میں کھڑے ہوئے مسافروں سے) "بھائی تھوڑی سی جگہ دے دو۔ ریل چھوٹنے والی ہے۔"

ایک مسافر:۔ (پیچھے آنے والے مسافر کا بستر دیکھتے ہوئے) "بیڈنگ، بیڈنگ لے کر چڑھنے والے کو جگہ کیا کریں۔ بیڈنگ پہلے ہی سے بھرا ہوا ہے۔"

کچھ منت و سماجت کے بعد اس مسافر کو [illegible] میں بٹھانے کے لئے تھوڑی سی جگہ مل جاتی ہے۔

دوسرے اسٹیشن پر ایک عورت ہے، ایک اور مسافر آتا ہے

دوسرا مسافر:۔ (اس مسافر سے) [illegible]

(باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

مجیب اشرف ساحل

پھر اس کے بعد۔۔۔!

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے کالج میں ہر سال ایک میلاد منعقد ہوتا ہے۔ اس میلاد کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف لڑکیاں ہی حصہ لیتی ہیں۔ لڑکوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میلاد کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر سال ایک نئی لڑکی کو میلاد کا صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کے ذمے یہ کام ہوتا ہے کہ وہ میلاد کے لئے ایک مقرر کا انتظام کرے۔ اس کے علاوہ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ میلاد کے لئے ایک مقرر کا انتظام کرے۔ اس کے علاوہ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ میلاد کے لئے ایک مقرر کا انتظام کرے۔

اس سال میلاد کی صدارت کا سہرا میری ایک دوست کے سر بندھا۔ اس کا نام ثریا تھا۔ ثریا بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ اس کے بال بہت لمبے تھے۔ اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ اس کے ہونٹ بہت سرخ تھے۔ اس کے دانت بہت سفید تھے۔ اس کی ناک بہت تیکھی تھی۔ اس کے کان بہت چھوٹے تھے۔ اس کی ٹھوڑی بہت گول تھی۔ اس کے گال بہت ملائم تھے۔ اس کی گردن بہت صراحی دار تھی۔ اس کے ہاتھ بہت نازک تھے۔ اس کی انگلیاں بہت لمبی تھیں۔ اس کے ناخن بہت گلابی تھے۔ اس کی کلائی بہت پتلی تھی۔ اس کی بانہیں بہت سڈول تھیں۔ اس کا قد بہت لمبا تھا۔ اس کا جسم بہت متناسب تھا۔ اس کی چال بہت دلکش تھی۔ اس کی آواز بہت میٹھی تھی۔ اس کا انداز بہت دلربا تھا۔ اس کا لہجہ بہت شیریں تھا۔ اس کا طرز بہت دلنشین تھا۔ اس کا سلیقہ بہت عمدہ تھا۔ اس کا قرینہ بہت اچھا تھا۔ اس کا ڈھنگ بہت نرالا تھا۔ اس کا ڈھب بہت نیارا تھا۔ اس کا رکھ رکھاؤ بہت اچھا تھا۔ اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ اس کا رہن سہن بہت اچھا تھا۔ اس کا طور طریق بہت اچھا تھا۔ اس کا چلن بہت اچھا تھا۔ اس کا ڈھنگ بہت اچھا تھا۔ اس کا ڈھب بہت اچھا تھا۔ اس کا سلیقہ بہت اچھا تھا۔ اس کا قرینہ بہت اچھا تھا۔ اس کا طرز بہت اچھا تھا۔ اس کا لہجہ بہت اچھا تھا۔ اس کا انداز بہت اچھا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس کا جسم بہت متناسب تھا۔ اس کی چال بہت دلکش تھی۔ اس کی ٹھوڑی بہت گول تھی۔ اس کے گال بہت ملائم تھے۔ اس کی گردن بہت صراحی دار تھی۔ اس کے ہاتھ بہت نازک تھے۔ اس کی انگلیاں بہت لمبی تھیں۔ اس کے ناخن بہت گلابی تھے۔ اس کی کلائی بہت پتلی تھی۔ اس کی بانہیں بہت سڈول تھیں۔ اس کا قد بہت لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ اس کے بال بہت لمبے تھے۔ اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ اس کے ہونٹ بہت سرخ تھے۔ اس کے دانت بہت سفید تھے۔ اس کی ناک بہت تیکھی تھی۔

ثریا کے میلاد کی صدارت کا سہرا بندھا تو اس کی سہیلیوں نے اس کو مبارکباد دینا شروع کر دی۔ ہر لڑکی اس کو مبارکباد دیتی تھی۔ ہر لڑکی اس کو مبارکباد دیتی تھی۔ ہر لڑکی اس کو مبارکباد دیتی تھ

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۶

مصرع طرح

دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی

غزل کے ساتھ رقعہ طرحی مشاعرہ یا اس کے قبول ہونے کے متعلق ضروری اطلاعات نہ دیجئے

منصفین
حضرات
مولانا ابو احسنی گنوری
شفا گوالیاری

نازکی احسنی بھوپال شکوہ آبادی

دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی
یاس سے بڑھ کے ہوئی کیا جستجو کی
اپنی کاوشوں میں وہ دلبری کہاں ہے
اللہ رے بیچارگی ہم نے کیا کیا
اللہ رے یہ حسرت اللہ رے یہ ارماں
جو بن کے رہ گیا ہے یہ تشنگی بھی
کیا کہوں دل ناتواں ہوا ہے آرزو

نسیم شکوہ آبادی

تیرے پرتو کی ہے بات کہ نہ آمد کی
کہاں تک آمد کی کب تک کی جستجو کی
اس کے سامنے ہے دونوں پیمانہ
نیشے سے کچھ شیریں نے فرہاد
انعام عاشقی کا اس سے بھی بہتر
دل سے سنا ہوا ہو اسکا ہو نفع حاصل
نسیم مہ پوچھتے ہیں کیا تو یہ قوۃ ذاتی
اسماعیل ذبیح ایلگانوی

اس بانی لب نے جب مجھ سے گفتگو کی
محمد بھی اس جہاں کا آدم دست آمد کی
یہ ماجرا ہیں یوں تو لاکھوں حسین لیکن
اس کا سفینہ یا ساحل پہ آ کے ڈوبا
فطرت کے کچھ کرشمے ہیں اس میں
ڈوبے بشر نہ کیوں ہو اس بحر بیکراں سے

محبوب جوشی

یوں بھی ہوتا ہے اکثر تفسیر آمد کی
یہ سوچ سوچ کر اب پچھتا رہے ہیں کتنا
وہ ماہ پارہ لڑکی یہ بیاں تمہیں ہیں
وہ کاش یہ آخر پوچھتا کہ کیسے ہم
تھا منتظر یہ آنکھ جن کو دیکھ کر ہم خود کو
جب اس کی آمد کی اپنی بھی آمد ہے
دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی
جب اس سے بات کرنا کمال فن نہ آیا
محبوب یہ بتا کیں اپنی ہی خود خطا ہے

علامہ میاں محمد بندی ناظم کاندی

وہ آئے اور مجھ سے ہنس ہنس کے گفتگو کی
موجود کی میں میری غیروں کو یوں نہ دیکھ
کوئی ملا نہ مجھ کو جب لائق محبت
ناصح ہر گئے ہیں اے دل وہ مجھ سے بہتر
جب مل گیا میں یار دشمن ہوئے ہیں سب میں
یہ کہہ کے چل دیئے وہ آمد کا صاحب وہ
کس کس کا کروں میں شکوہ کس کی کروں شکایت
اطہر فضا ملی سلطان پوری

ہر سمت پا کے تجھ میں نے گفتگو کی
کیا راہ تھی حقیقت الفت میں آمد کی
نظروں سے ان کی پی کر وہ جوش جو چھلکا
ایسا بھی وقت مجھ پر گزرا ہے زندگی میں
نیلام کر چکے ہیں جو اپنی آبرو کو
معصوم جب یہ ہوتا تو ہے رگ رگ میں

خود ہی کو ہم نے پایا جب آپ کی جستجو کی
کیوں آپ کو نہ پاتے پایا کیوں آپ کو آمد کی
یہ نگاہیاں تو دیکھو دنیائے رنگ و بو کی
ملتوفاں میں جو رہے ساحل کی آمد کی
جب اس کی آمد کی اپنی بھی آمد ہے
دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی
دل کے چمن میں پھیلے ہیں جو نظر چرچے

دل نے بن دیئے پھر میری نظر چرچے
حالت یکاں دوں کا صدیوں ہر عہد میں
دل بن کو بنا دل ہی سے گفتگو کی
آئینہ ہیں یہ تکمیل آمد کی
آپ ہی تجسس کرتے نظر ہو کی
لو شش نہ کیجئے گا اب میری جستجو کی
جیا کہ ساری دنیا ہے حال دل کی میرے

ہمت ہوئی نہ لیکن اظہار آمد کی
خود اپنی جستجو کی جب تیری جستجو کی
صابت نہیں ہے ساقی جام اور سبو کی
دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی
وہ فکر کیا کریں گے فیروز کی آبرو کی
کیا شیشہ بھی ذکر کرتے ہیں جستجو کی

اطہر جاتے کیوں وہ محفل ہوئی ہے کیونکر
جھوٹے کی اپنے دل میں افسوس آمد کی

تنہائیوں کی شب میں اکثر فیاض میں نے
دل ہی کو بنا دل ہی سے گفتگو کی

پیامِ آمد بہار (نظم)

نیا نغمہ ہے سرگوشی کی آمد کی
نئی ہے ساز میں ساقی کوئی نہیں تھا
مئے گل رنگ میں ہے کیف و ضو کا عکس جیسے
کلی جاگی کہ جیسے جلوہ گہ کا پایا
نمو بیدار ہے ذرّے ذرّے جیسے جاگا
تمام عالم آدم ہے نوبہار کی

ہوئی ہے نو دنیا جب شمیم آمد کی
بہم ہے راز یہ گلشن کی ہر کلی سے
یہ ہر سو کہہ رہی ہے اُس جہاں آمد کی
جو ہر دم مستقل ہے اس بہار کی
ہر غنچہ ہے حقیقت دنیا کے گلشن کی
ثبات بدلی ہے انسان کے لہو کی

ہمایوں فانوس کا لیا فانوس

یہ کیوں کانپ کیا آجا ہے خدا دا
یہاں گلستاں کو شاید خبر نہیں ہے
ہوا بھی وقت کا تنہا یہی ہے اکثر
تاریکیوں سے ہو کے چلتے تیز ہو کے
فانوس کس گئے ہیں اسرار زندگی کے
حاصل کا ہی۔ چالیس کا نوی

جلتے ہے اور جلے گی طوفانوں میں آمد تک
آئینہ ہو گیا ہے اپنی حیات یا دو
جاتا ہے جس طرح بے پروا نظر سے
یہ ہو گزار دی ہے شام فراق میں نے
آئیں گے بزم میں وہ تو کیا ہو گی حاصل
سوز تمنا شدی (دل تمنا)

محبت جب کی تیری آمد کی
تجھے بتائیں اہل وفا بتائیں
شام ہم کہہ جب چھٹ گئے
یہ کائنات کو کیا پتہ نہیں ہے

ہندا قریشی

ہم نے تو اپنے دل میں ہیں اس کی جستجو کی
ہنگامہ ہو رہا ہے اس خاک کی حکومت
شاہی و طن کی فرد و حرمت پہ ہو خدا کے
گلزار آرزو میں شبنم ہے اور نہ کرنیں
یاد ہیں انجمن سے ہو گر، کہ ہم نے اکثر
اپنا تو بندہ اب بھی پیشہ وفا گری ہے

جی بھر کے پی لیا ہے ہاں ہوں نظروں کی تو بہ کی
جیسے ہیں تم نے بعد نہ وہ مجھ کو
بھولے کیا زمانہ فلیں نے وہ اس کو
کرتی رہی ہمیشہ دنیا گریز اس سے
بھولے ہو تم جب دنیا بدل نہ پائی
کاش چھیڑ دی

ایثار عشق ہے یہ ہے بات آبرو کی
یہ جانتے تھے پھر بھی ماہ و ثبات مشعل
حاجت نہیں ہے مجھ کو اب تیرہ بختیوں کی
تنہا ہیں سے آخر عید ہوئے ہم تو
پایا نہیں نہ اب تک ان کا نشان کا تاں
ملے نہ گزر بڑ سدیقی و عدیم

ملنے کی تجھ سے میں نے جب جب بھی جستجو کی
وہ بڑھ کے ہاتھ میرا اور قاش پر تن کر
وہ پوچھ کر کبھی تجھ سے زخموں کی سرخیوں
جو پوچھ جاتے ہیں کس ہاتھ سے دیا ہے
دولت یہ ناز ہے کہ تو فرق نہ اس کو چاہو
حکیم عبدالباقی حکیم۔ پوچھی رہے کھیر

وہ سوز ان کو زد سے سر فخر سے اونچا
یہ تھے کہ میکدے سے جاتا چھوڑ کر کہاں میں
ہر سکوت لب پہ اپنی وفا ہے
تاثیر ہے دعا میں یہ تیرے ہی نام کی ہے
محفل کا پاسبان زیادہ کی نہیں ہے

تیرے نہ ہونے کی تنہائی آمد کی
آمد زباں کی ہم نے بات تجھ کی
یہ حال ہیں رکھیں گے مرنے تک اپنے
اب کیا کریں گے رخصتی تو تم کی
دل ہی کو بیت بنایا دل ہی سے گلشن کی
دل پاک ہائیں حاجت ہے کی زر کی

حاجت نہیں ہے مجھ کو اب خود سپر کی
بھولے ہو تم مرنے کی آمد کی
آن کی فضا میں ہم نے زندہ ہی جستجو کی
جس نے انھیں صلا کر دنیا کی آمد کی
میں نے سرشت بدلی گفت سے کہنہ تو کی

لکھے بتائیں کیوں کر مرنے کی آرزو کی
یہ جان کر ہی ہم نے اس بیت کی آمد کی
پاؤں کا اپنی نشاں ہو دل سے جستجو کی
دل پارہ پارہ بنا دل ہی سے گلشن کی
ملنے کی پھر بھی ہم نے پھر بار جستجو کی

تجھ کو نہ پا سکا تب دل بہت تلاش کی
بھولے ہو مرنے کی آمد کی
ہر حال میں رکھیں گے مرنے تک اپنے
اب کیا کریں گے رخصتی تو تم کی
دل ہی کو بیت بنایا دل ہی سے گلشن کی
دل پاک ہائیں حاجت ہے کی زر کی

کیا بات چیز ہے یہ وہ میری آمد کی
سجدے میں ہو کے مرنے کی آمد کی
جب سے ہوئی ہے تجھ سے اس بیت کی آمد کی
جب سے ہوئی ہے تجھ سے اس بیت کی آمد کی
سنتے ہیں ہو کے مرنے کی آمد کی
نغمہ ہے یہ سنت کل پر یا چھوڑ چکے ہو کی

طرحی مشاعرہ

طرح: بیک بیدل

کیوں اس طرح ہی ہوتی ہے پیدا امنگ کی
جب میں سر جگایا اداسی نے گھر کی
جب بات آپڑی ہے گھٹن کی ابر کی
منزل اسی مقام پہ جس نے کی جستجو کی
مرجھا گئی ہیں کلیاں سب میری آرزو کی
کیا چاہتی ہیں آخر آنکھیں مرے عدو کی

ڈھونڈا کہاں نہ تجھ کو کس جا نہ جستجو کی
کھلتی نہیں حقیقت دنیائے رنگ و بو کی
تیرا ہی آئینہ ہے ہر شکل ماہرو کی
ہیں ہوں ازل سے تشنہ ہے تشنگی سبو کی
مجھ کو نہیں ضرورت پیمانہ و سبو کی

چھانی ہے خاک ہم نے دنیائے رنگ و بو کی
ہم نے بھی گرد اڑائی صحرائے آرزو کی
کیا اعتبار اس کا اک بوند ہے لہو کی
آباد تیرے دم سے دنیا ہے رنگ و بو کی

دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے کفر کی
بادی ہوئی ہے حالت دنیائے رنگ و بو کی
بے کار مرا سجدہ بے آرزو نہ تھی
واجبتہ نہیں ظفر کو پیمانہ و سبو کی

یہ نے تو اے جفا جو تیری ہی جستجو کی
جس نے بھی تیرے غم کی اے دوست آرزو کی
کشتی ہیں زندگی ہے اک موج رنگ و بو کی
سب کہتے ہیں چھپے دل اک کوہ ہے لہو کی

مرجھا گئی ہیں کلیاں ارمان آرزو کی
تیری ہی جستجو کی تیری ہی آرزو کی
دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے کفر کی

بھوپال شمیم و شفیق فرید بھوپالی

جب جب نے آرزو کی تیری ہی آرزو کی
دنیا کو جس نے دیکھی تصویر کی نظر سے
اب شعر و شاعری سے مطلب نہیں کسی کو
انجم علوی۔ کھنڈوہ

مجھ کو نہیں ضرورت دنیائے رنگ و بو کی
پایا نہ کوئی ایسا جیسا کہ چاہئے تھا
کوئی نہ تھک جہاں میں اس کے سوا مرا
گیا پر سارا فرضی۔ ہنگامہ

یادِ صبا یہ کیسا پیغام لے کے آئی
کب تک بنا رہے ہم تنہائی سے رشتہ
آپ ہی گئی زباں پر آخر خود ہی شکایت
محمد احمد شیدہ۔ پیلی بھیتی

منزل کا اپنی ہم نے اس طرح جستجو کی
سرشار کر چکی ہے بس اک نگاہ ساقی
دشمن جو ہو چکی
ہر جا تجھی کو ڈھونڈا تیری ہی جستجو کی
فرقت کی رات میں نے کچھ اس طرح گزاری
محمد اصغر اصغر پیلی بھیتی

کچھ اور بڑھ گیا جب تیری جستجو کی
اپنوں نے ساتھ چھوڑا اغیار کام آئے
قمر نگ پوری

دنیا ہی بن گئی جب گلشن میں آرزو کی
اُلفت میں قدر اُلٹی ایسا بھی وقت آیا
حامد صحرائی بسکتی۔ ایم۔ پی

خاموش چل رہا ہے دل کی لگی سے حامد
اس نے کبھی کسی سے تقاضا نہ آرزو کی

نوکن شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۵۶

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اگست ۱۹۶۲ء

مصرع طرح مرحوم گل بدنام ہے۔ ذیل فارم پُر کر کے بھیجئے۔

نام ... ...

پتہ ... ...

مکتبہ شعلہ و شبنم دتی کی خصوصی پیش کش

صاحب طرز کہنہ مشق نامور شاعر حضرت ضیا فتح آبادی کا نیا مجموعہ کلام

گردِ راہ

قیمت ——— تین روپے پچاس نئے پیسے

دو آرار ملاحظہ فرمائیے

ضیا صاحب کی شخصیت کو ان کے احساس اور وجدان میں تلاش کیا جا سکتا ہے وہ جذبہ کو موزونیت اور سلیقے سے الفاظ کے پیرہن میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کشتۂ رومانیت نہیں۔ ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی حنابندی کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے، نفاست اور نزاکت ہے اس لئے ان کے لہجہ میں دل آرائی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پرکاری اور ہشیاری سے زیادہ سادگی اور سرشاری ہے۔

(ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی

ضیا معمولی شاعر نہیں ہیں۔ وہ ہر بات بلندی سے کہتے ہیں، ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے۔ ان کے خیالات لطیف ہیں۔ دل میں جذبۂ ہمدردی انسانی بے پایاں ہے اور ایسا ہی شاعر ملک و قوم کے لئے باعث فخر ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا۔

آبر احسنی

گردِ راہ ——— آج ہی طلب فرمائیے

مکتبہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں۔ دتی نمبر ۶

شعلہ و شبنم

اکتوبر
۱۹۶۳ء

نو سالانہ
چار روپے
شش ماہی
دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۱۰

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں۔ دہلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصہ نظم و ناظم مشاعرہ
حضرت مولانا امیر احسنی گنوری

ایڈیٹر
بمل جین

معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	بزم ادب کوٹہ	مفتی نگارش	۵
۲	بہادر صدیقی بدایونی کی غزل پر	امیر احسنی کا اصلاح	۹
۳	کوٹہ اور اس کے مشاہیر	سلطان احمد	۱۱
۴	آل انڈیا مشاعرہ بمقام بڑودہ	مخصوص بڑودوی	۱۳
۵	غزل	رفیق انیس ساحر	۱۶
۶	دو غزلیں	نشتر امروہوی	۱۶
〃	〃	فرحانہ قریشی	۱۷
۷	رویۂ فطرت	روشن چپاروی	۱۸
〃	غزلیات	ظہور ناظم	۱۸
〃	〃	شوکت جلالی	۱۸
۸	افکارِ نو	خرد غوث پوری	۱۹
〃	〃	قیصر امروہوی	۱۹
〃	〃	جودت رائے پوری	۱۹
۹	جلال و جمال	واحد پریمی ۔ نسیم بانو نقاش	۲۰
〃	〃	کشمیر میں طوفان ۔ بے حس الہ آبادی	〃
〃	〃	انجم علوی ۔ عبدالحکیم قاصد نقاش	〃
۱۰	فوٹو اور کیمرے	جوگندر پال	۲۱
۱۱	کلی جو مسکرا نہ سکی	مسعود شادانی	۲۲
۱۲	انگاروں میں	بشیر نصرت ناگپوری	۲۶
۱۳	تذکرہ	صمد حیدری	۲۸
۱۴	طرحی مشاعرہ نمبر ۵۷	مرتبہ حضرت مولانا امیر احسنی گنوری	۳۰

باہتمام شری کمل پرشاد جین پرنٹر و پبلشر دہلی پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی سے شائع ہوا

مفتون کوڈی

میرا ماحبستان رشکِ خطۂ کشمیر ہے

(حافظ عبدالرحیم خان ساکن قنبر)

راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر

بزمِ ادب کوٹہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

آخری قسط

[illegible] شاعروں [illegible] سب کوٹہ [illegible] ستہ [illegible] شاعر [illegible] ساتھ [illegible] تعلق [illegible] ہے۔ اس [illegible] کا [illegible] زیادہ [illegible] ہے۔ اس [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] ۱۹۶۱ء میں ایک [illegible] نشستیں ہوئیں اور پھر [illegible] تک [illegible] سکوت طوفان کی آمد کا سبب بنا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۱ء سے پھر [illegible] شعر سے مشاعرے شروع ہوئے [illegible] ۱۹۶۲ء میں تمام سال ہفتہ واری نشستیں ہوتی رہیں۔ [illegible] رہبر۔ خانم حسین قمر۔ فدا محمد نسیم۔ عبدالرشید [illegible] تنہا [illegible] گرم جوش اور سرگرم عمل شاعروں سے [illegible] کے جوش و خروش میں کمی نہ آسکی۔ کوئی محفل کے لئے [illegible] اکمل وکیل دو شاعروں میں حریفانہ چھیڑ [illegible] شعروں اور مقطعوں میں چوٹیں ہوتی تھیں ہر [illegible] کے چند اشعار وقت کی یادگار ہیں۔ ایک صاحب [illegible] تھے۔

دار فانی میں نہیں کوئی بھی اپنا اکمل
ایک دو دوست ہیں وہ بھی ہیں بیگانے سے

صدمے دادِ ندوے دردی تو کیا اکمل
بندے ہیں خوب مضامین تو کہہ سکنے کے لئے

بے وجہ کی خلش لئے پھرتے ہیں قلب میں
اکمل ہمارے درد سے دشمن سے کم نہیں

[illegible] بسمل صاحب کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے۔

کہتے ہے خامہ تیغ دو دم سے ہیں کم نہیں
کس پر رواں ہوں میں، کسی کا قلم میں دم نہیں

کوئی کہے گا ایک تو ہم دس سنائیں گے
نہ میں زبان ہمارے بیانی سے کم نہیں

بسمل صاحب کی یہ غزل دس شعر کی تھی۔ بات جب [illegible] بڑھنے لگی تو معاملہ گرما گیا۔ جگر کا ایک چھوٹا قصہ [illegible] اس زمانے میں سامعین کی کثرت سے شامل [illegible] شاعر تھے اور یہ [illegible] کا مختصر خاکہ [illegible] آخری کی بدولت اس سال چند نئے شعراء کا اضافہ [illegible] حافظ فہم حسین۔ قمر تھے ہی آزاد ہو گئے۔ حاجی محمد بخش۔ حاجی کا بالا۔ ناتا کر ڈم ڈم کی شکل میں خوار ہو چکے تھے۔ اپنی ڈفلی خود بجانے لگے۔ ان شاعروں کے باعث اجتماع میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا اور کوٹہ کے ادبی حلقوں کو نئے رنگ کے تجربہ کا موقع مل سکا۔ اس زمانہ کے جوش و خروش کا منظر پیش کرنا مشکل ہے۔

ہوا مصدق حسین کوٹہ مزاح نگاری کے ساتھ کھڑے ہوئے کوٹہ ان کی ظرافت تھی۔ کوٹہ نے اسی طرف میں تخلص کی نذر تیں بھی بھر لیں۔ نمونہ کلام انتخاب میں مل جائے گا۔ البتہ یہاں یہ بات قابل اظہار ہے کہ طرحی غزل جو حاضرین پر کبھی ہوتی تھی ہر مشاعرہ میں یہ کاغذ نیا ہوتا تھا۔ کبھی بیان کی فلسل والے کاغذ پر۔ کبھی چٹے جیسے کاغذ پر جو تین اینچ چوڑا اور تین فٹ لمبا ہوتا۔ کبھی نزاین کی طرح کے پٹے ہوئے کاغذ پر۔ ان دنوں مظفر حسین طالب بھی مزاح نگار شاعر شامل مشاعرہ ہوتے تھے ان کی غزل کاغذ کے مختلف پرزوں پر تحریر ہے۔ سر ورق پر ایک شعر لکھا ہوا ہے۔ کوٹہ کا قد لمبا جسم دبلا پتلا تھا۔ ایک شعر یہاں سن لیجئے ؎

توڑوں گا سر قیصر کے کوٹہ کے ان پہ میں
ہے میرا جسم خود ہی عصا دیکھ تو سہی

یہ غزل ایسی چلی کہ مظفر حسین طالب بھی اسی انداز میں چھکنے لگے تھے۔

حافظ فہم حسین۔ قمر تھے ہی آزاد ہو گئے۔ حاجی محمد بخش۔ حاجی کا بالا۔ ناتا کر ڈم ڈم کی شکل میں خوار ہو چکے تھے۔ اپنی ڈفلی خود بجانے لگے۔ ان شاعروں کے باعث اجتماع میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا اور کوٹہ کے ادبی حلقوں کو نئے رنگ کے تجربہ کا موقع مل سکا۔ اس زمانہ کے جوش و خروش کا منظر پیش کرنا مشکل ہے ؎

ہو بزم شاعری یا محفلِ علم و ادب مفتوں
ہمیشہ آپ ان باتوں میں محمود کو پیش پیش دیکھیں گے

سابقہ شاعروں میں عبدالشکور رحیم۔ عبدالشکور قمر
امیر محمد اختر۔ منشی خاں ساحر۔ بنواری لال ستی۔ سید ارشد
سائل۔ یسین محمد نحیف۔ ظہیر حسین ظہیر۔ نصیر الدین احمد
کا اضافہ اور ہوا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

یہ وہ ناچیز جوں یا زار جہاں میں ہے بہر
مفت بکتا کبھی جو چاہو تو قیمت ہے نہیں ہے بہر

سرد مہری کا تری رفع نہیں ہے ہمدم
اس کا رونا ہے کہ آہیں بھی شرر بار نہیں مفتوں

دیکھنا قیس کبھی مجنوں نہ کہیں ہو جائیں
اُس کے کوچہ میں پھرا کرتے ہیں دیوانے سے قیس

ہائے افسوس نشانِ رہ منزل نہ ملا
جان لینے کے بھی قابل کوئی قاتل نہ ملا تفتہ

حرفِ مطلب نہ کہا اس کی زباں پر آئے
ہم کو اس طرف کا لیکن کوئی سائل نہ ملا اکمل

کانپے تیرے سر کی جوں سنے قلم بات
پایا نہ دلوں میں بھی مزا دیکھ تو سہی کوٹہ

کوٹہ کے ماتھے جو تو جوتیاں سدا
کہتے ہیں سب تجھی کو بڑا دیکھ تو سہی

نام کو میرے پڑھتے ہیں کہتے ہیں بار بار
شاید سامنے صرا کوئی یاد دلم نہیں نسیم

شیدا تو جیسی کرتا خوشامد پھرتا ہے کوچہ
دلبر میں بے جا نہ دیکھا تو سہی شیدا
کیا جانے کو مرنے دیں گے وہ کہ حاشیدا
کی کوئی ہونے لگی جب سے عیادت میری شیدا
کھلی گل کے دیکھنے ترے بہار پھر میں
اُلفت کا بے طلب صلا دیکھ تو سہی (بیتاب)
پاؤں پھسلا جو تری گلی میں اے شوخ
شیر دانی ہو تو سب چکھتے لب پت میری کلرک
سو کہ کی خاطر پھاٹیں چراغیں کو ناز
تن کے چھلکا جب خار نیلاں دیکھا کلرک
سیاہ لاد بیچ کر مجھے منحوس کلرک
اس نے گھر میں بھرے کوئی نہ سامان دیکھا
تیر میں کلرک کو رکھ کر یار نے کلرک
اس پہ مٹی پانچ بس میں ٹال دی
قاتل قتل کرنے کو مقتل میں آگیا
اور گھر میں آپا دھاپی میں شیشہ رہ گئی کلرک
کلرک کو دیکھ کے کہ شہر میں
آپا کی ٹوٹی چپلی سی جاگیر رہ گئی کلرک
گھونسلا ٹوٹ کے پیری وہ چل دیئے
بستی ہوئی اُدھر مرے گلشن رہ گئی غلام حسین اثر
پھل تو بہتوں کے لگے وہ ، ناماض پھر بھی
جب سے آقا اپنی یہ تقدیر رہ گئی منظر حسین ثاقب
دولی کھڑی کوئی نہ دن سیر طالب
ہیں آنکھ ہی جو میں نے نیا جہاں دیکھا ؎
وہ بوٹی پکا کہ ذوے ساتھ جیسے کے
فرہاد نے کی خوب رفاقت میرے جرات
قصہ تو پرانا روشن دیئے پاک سے
آنکھ کی پتلی میں جو نور آیا آپ کا قمر
کچھ اور تو کہو ما اللہ
دہر میں ہم سا پارسا نہ ہوا شیدا
وفا نے صدیوں کے قابل قسم ، دبیر

کہ ایک دم بھی کبھی دل سے یہ جدا نہ ہوا دبیر

۱۹۳۵ء میں باقاعدہ بزم ادب کا کوئی اب نوجوان طالب علموں کے ہاتھ میں ہے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۳۵ء کو یہ ایس دبیر نے ایک اطلاع نامہ جاری کیا جس میں ساتویں سے دسویں جماعت تک کے طالب علم مدعو تھے۔ اصول و قواعد بنے۔ شرائط جلسہ، آداب محفل اور ضوابط انعقاد مرتب ہوئے چند ماہ نشستیں ہوا۔ عدم شرکت پر جرمانہ قرار پایا۔ مدت اطلاع تین دن مقرر ہوئی۔ تقریروں کا پروگرام بھی جزو جلسہ رکھا گیا۔ اور مشاعرہ کے برابر ہی سے اہمیت دی گئی۔ صدر منظر حسین طالب ہی۔ سکریٹری یہ ایس دبیر، روداد میں ظاہر کرتی ہیں کہ جوش و خروش سے کام جاری رہا۔ مئی کہ ۱۹۳۹ء میں اقبال کی یاد میں انھیں طالب علموں نے مصرع طرح

اقبال ساجد ہیں سخن وہ نہیں رہا

پر ایک بڑا سا مشاعرہ منعقد کر ڈالا۔ کئی ہندی داں اصحاب اور مبصرین مشہور ہو گئے۔ اردو کے متعلق بڑی گرم تقریریں ہوئیں۔ جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

کوئی تحریک بذات خود پائدار اور جاں دار ہوتی ہے تو وہ اپنے پرستاروں سے گھری رہتی ہے۔ خواہ انقلاب زمانہ اور دقت حوادث قدرے قلیل و دو دل کر دیں۔ اس رجحان اور ادبی تحریک نے وقت مشکلات کا مقابلہ کیا۔ مشکلات بدلتے رہے، اجتماع بدلتے رہے، رجحانات و میلانات بدلتے رہے۔ سامعین کا اجتماع کبھی زیادہ رہا کبھی کم۔ شعرا کبھی آنت سے جی چرا گئے۔ کبھی قلت سے۔ رنگ قدیم و جدید، عشقیہ شاعری والے۔ نعت گو حضرات، رنگ جدید کے علمبردار، طنز گو، مزاح نگار، اپنے اپنے جذبات و تاثرات لے کر اس بزم میں شامل ہوتے۔ پھر ادب اپنی جگہ ہے۔ طائران خوش نوا اپنی اپنی بولیاں بول کے اڑ گئے۔ اسی کا نام زمانہ ہے۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ بزم ادب کو ۲۰ سال کے پرانے خدمتگار اپنی صاحب ضرورتوں سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ اداسی کب خالی ہاتھ سے پھرنے والے۔ نئے آئے یہ بزم بھی اپنے پرستاروں اور خدمتگاروں کے جوہر سے تیز رفتاری و سست خرامی سے چلتی رہی۔ ۱۹۴۰ء کے مشاعرہ میں محمد عثمان ہنر۔ برکت علی فیروز۔ شرکت علی شرکت۔ سید ارجمند سید۔ عبدالکریم خاں وحشت کا اور اضافہ ہوا پرانے شعراء میں سے وحشی و قیس رحمت و اکمل و فیروز کے بزم اب اب خالی ہے۔ نئے ارکان اب موجود ہیں۔ کلرک۔ اثر اور طالب معلوم نہیں کہاں گئے۔ ان دنوں کے ایک مشاعرہ کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

کلرک اس خوشی میں کہ ہوا بزم ادب کا جلسہ
دل کے ہر قطرہ کو دیکھا ہے غزلخواں میں نے شرکت
اک فسانہ بڑا دلچسپ لکھا ہے لیکن
تیری مرضی پہ فقط چھوڑا ہے عنواں میں نے "
اضطراب دل بیتاب میں آئے نہ کمی
دل میں رکھ دیجے تجھے ناوک مژگاں میں نے فیروز
دل کی بے چینی کا اے سید کہوں کیا عالم
شب کو دیکھے ہیں بہت خواب پریشاں میں نے سید
نہیں محتاج قاصد کا پیام دوستی میرا
مری فطرت سنا دیتی ہے اپنے حال دل اپنا وحشت
اداسی چھا گئی ہے اور ہمارا سر
یوں اپنا کام کرتا ہے ڈم ڈم
آؤ ہم میکشوں کی ڈم ڈم سے
کیسا بنتا ہے کیا سنورتا ہے ڈم ڈم

دارالاخبار کوٹہ، گنبد شکر بازار میں جہاں قائم تھا ۱۹۳۶ء میں وہاں بزم ادب کے مشاعرے خوب ہوئے۔ مشاعرہ کی تعداد زیادہ، سامعین کی تعداد کثیر۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک بزم ادب کے مشاعرے بڑی رونق و شوکت سے چلتے رہے ماسٹر بگھ بیٹی پرشاد "دین"۔ منشی عبدالطیف، قتیل عبدالستار فقار۔ منشی خلیل احمد نجمی کے مکانوں پر مشاعرہ کی نشستیں ہوئیں۔ ایک صاحب نے مضمون لکھا کہ

ملک کے جواں فکر شعراء کی تخلیقات کا مرقع جمیل

فکرِ نو

اس مشترکہ مجموعۂ کلام میں مختلف شعراء کا چیدہ چیدہ کلام یکجا کیا گیا ہے جو کہ زندہ اور متحرک فن کا وہ شاہکار ہے جس کی تخلیق کے لئے زندہ ادب کے خالقوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے اور اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ ادب میں قابل قدر اضافہ کرتے رہیں گے اور ایک دن آسمان ادب پر درخشاں ستاروں کی مانند چمکیں گے — مرتب۔ جوہر ہاشمی

ناشر

کوآپریٹو پبلشرز ۲۰۶ دونتاڑا اسٹریٹ بمبئی ۹

حضرت خرد غوث پوری کا پہلا مجموعہ کلام

رنگ و بُو

عمدہ کاغذ معیاری طباعت قیمت 2/50

مکتبۂ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دلی ۶

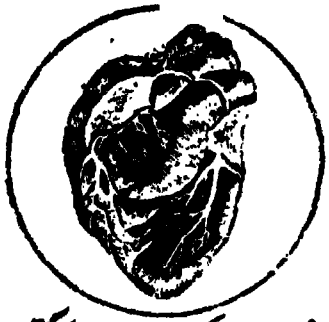

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

دلی — کانپور —

مصرعہ طرح دیا۔ اس کے
مگر مرتبہ ہے کہ ہر مشاعرہ کی نشست دلچسپ
نہ ہو سکی۔ دوسرا مشاعرہ کسی صاحب کے
لئے فال بد ہوا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ کس کے
صاحب خانہ میں نشست کی زحمت گوارا کی جائے
صاحب کے پاس کی فال دیگ جاتی تھی۔ نسیم صاحب
کے پاس کی فال بگڑ جاتی۔ آخر طے یہ ہوا
ہوا کہ ایک تاریخی ریکارڈ تھا محفوظ رہنا چاہئے
سے ہر نشست ڈالی جائے تھی۔ کم از کم ہر مشاعرہ کی انتخاب
غزلیں مشاعرے کے سرپرست تاریخ کا ذخیرہ ہو سکتا تھا
وہ بھی ہے اکثر شعراء اب نظروں سے اوجھل ہیں کچھ تقسیم
کی نذر ہو گئے۔ کچھ کو موت کھا گئی۔ کچھ اب وطن اور
جوش و خروش کی معیشت کی نذر کر بیٹھے۔ ۱۹۴۷ء
سے بیشتر شکیل صاحب کی کوٹھی پر تقریباً ہر ہفتہ
مشاعرے پڑھے جاتے تھے۔ اس نے ریکارڈ کی عدم
دستیابی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ حافظ جالندھری
حافظ محمد بخش مجروح، حاجی محمد بخش بزم اس زمانہ کے
نامور شاعر تھے۔ اور اس میں شک نہیں تھے بزم
رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء کے طرحی مشاعروں پر کچھ ہلکی نوٹ
کے چند منتخب اشعار جناب نسیم کرنال کے عدم کر رہا ہوں
انہیں طرحی مصرعوں پر ہی اپنے اشعار بھی صاف کرتا تھا
جو شعر کچھ مناسب نہیں سمجھا۔ نسیم صاحب فرماتے ہیں ؎

نسیم وہ نام دیراں ہوں کہ بزم دہر سے
پتہ پتہ رہ گیا ہوں نقش اس تصویر کا
یہاں تو شکایت اور بھی تھے مگر مگر
گام سے کئی میں آکر ٹھہر گیا
جب طرف تماشا ہے جو جاں دل مٹا ہوں
وہ کہتے ہیں یہ میرا دیوانہ معلوم ہوتا ہے
شاداں نسیم کیا ہے وہ سوز عشق یا رب
کھولی ہے کھرچ جس نے وہ زخم نہ ہم نکلے

۱۹۴۹ء کے مرکزی مشاعرے میں کہ مصرعہ

حضرت چھوڑ کر ہے ہاں ہر مصرعہ پر اس وقت کی
کیفیت کی ترجمانی کی تھی کہ چند غزلیں پیش کر رہا ہوں
جو شاید اس وقت کے حال کی کچھ ترجمانی کر سکیں ؎

وقت رخصت جذبۂ بے اختیار اپنا کچھ نہ پوچھ
دل پہ کیا گزری تھی کہ جب اس نے کہا کچھ نہ پوچھ
تجھ سے رخصت کا یہ معنی ہے کہ جنت چھوٹ گئی
تجھ سے بچھڑے ہے پھر خدا ہی خیر کچھ نہ پوچھ
تیری محفل جیسے جیتے کر گئی، زاہد کو حسرت
دل نوازی اہم لمحاتی کیف باری کچھ نہ پوچھ
مٹ گئیں، ہر الفت کی بہر ہوتا بشیں
مٹ گئیں ہر طرف یادیں ہماری کچھ نہ پوچھ
مرحبا، اخلاص باہم کا فسانہ کیف بار
دشمنی داری دوست داری پاسداری کچھ نہ پوچھ
معنی الفت کی نقطوں سے عیاں بے پردگی
معنی الفت کی پیکر کی پردہ داری کچھ نہ پوچھ
جانتا ہوں ہر شریک بزم کا رنگ نفاق
میرا دل ہے خود بھی وقف بے قراری کچھ نہ پوچھ
کون دیکھے میرے اشک غم کی یا ماں یاں
سینہ کوبی، اشک باری، دل فگاری کچھ نہ پوچھ
کوکا روبار دنیا ہو کے کیوں کر بھول جاؤں
آہ وہ کیف محبت جو تری محفل میں ہے
نام رخصت سے کلیجہ منہ کو آتا ہے مرا
عزم تکمیل فرائض پھر بھی میرے دل میں ہے
مجھ کو ہونے دے گوارا تلخیٔ زہر فراق
صرف امید وصال تجھ سے دل بسمل میں ہے
اخر شی رہنمائی دل پہ خود کرتا ہوں میں
لے سلام آخری میرا کہ اب جاتا ہوں میں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، حالات و انقلابات
سے ٹکراتی ہوئی بزم ادب کو ۱۹۴۷ء میں تیز خزاں نے
اپنا نشانہ بنایا ہے۔ اراکین قافلہ تتر بتر ہو گئے، جوش
جوش و خروش کی گرمی بزم کی پیدا ہوتی رہی۔ بقول شاد

مظفر نگری ۱۹۴۷ء میں وہ جب پاکستان آئے تو اول
سرد مہری خروش تھا۔ انہوں نے پھر اس میں حرارت
پیدا کی۔ مشاعرے تازہ ہوئے۔ شاعر نگر اٹھے۔ بساط
سخن پھر بچھائے گئے۔ کچھ نئے چہرے آئے۔ کہنہ مشق
شاعروں کے سنجیدہ مشورے، نوجوان قلمکاروں کے گرم
گرم اذہان سے پھر محفلیں جاگ اٹھیں۔ خوش
خدمت گزاروں کی کمی نہیں قدیم اور نئے پرستاروں
کا کمی۔ بحمد اللہ بزم ادب کی خدمت اور اس کا سفر جاری
ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں مقامی پریشانیاں پیچھے سے
پنجے گڑی ہوں اور مہنگائی کا سرکاری پھیر اوپر سے بار
دے رہا ہو اور دوری کی جانب سے عام بے رحمانہ عدم
التفاتی کی دیواریں توڑ کر بزم ادب کی کوششوں سے
اردو کا ذوق اور تقاضا بسا غنیمت ہے۔ ان دنوں جناب
پرکاش چند جائے مظفر نگری صدر بزم ادب ہیں، جو
۱۹۴۰ء سے مسلسل منتخب ہو رہے ہیں اور بھی کئی عہدہ دار
ہیں۔ دستور مرتب ہو گیا ہے۔ قواعد چھپ چکے ہیں۔ پندرہ
روزہ نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یوم بھی منائے
جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ادبی تقاریب کے
سلسلہ میں مقامی اخبارات میں گرما گرمی بھی پیدا کی جاتی ہے
شاد کوٹوی۔ جوہر کوٹوی، ادیب، توقیر، توفیق، لطیف
قمر، گوہر، عزیز، دیگر ہم شرکائے بزم ادب ہیں
خدا ان کا جوش ادبی قائم رکھے۔ بزم ادب زندہ باد۔
اردو ادب پائندہ باد ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم صد شب
حشق کارے است کہ بے تابہ و فغاں نیز کند

بزرگوار بھائی حضرت شفا گوالیاری صاحب
مدیم النرصتی کی وجہ سے طرحی مشاعرہ کی ترتیب سے
دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کی عنایتوں کا شکریہ و شکر
کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ امید ہے حضرت
شفا علیحدگی کے باوجود اپنے خصوصی مشوروں سے شکریہ و شکر
کو نوازتے رہیں گے اور حسب سابق اصلاح فرماتے رہیں گے

(ادارہ)

بہار صدیقی بدایونی (حال کوٹہ) کی غزل پر آبرو حسنی کی اصلاح

وہی ناکام در سوائے جہاں ہے	جفائے دوست سے (مشیت سے تری) جو بدگماں ہے	کس کی مشیت؟ غزل کو جلد نہ بناؤ
جھکا جاتا ہے سر خود بہر سجدہ	خدا جانے (مرے ہمدم) کس کا آستاں ہے؟	کیا ہم ہر سفر میں ہر وقت ساتھ رکھا جاتا ہے؟ یہاں ہونا کافی نہیں
جسے کرنا تھا گلشن میں اُجالا	وہ اب (وہی) بجلی چراغ آشیاں ہے	بجلی جب چراغ آشیاں ہوگی تو آشیاں جلائے گی۔ آپ چراغ آشیاں کے معنی بجلی کو رات رساں شہر لفظ کے لئے ہیں یہ غلط ہے پھر دعویٰ بے دلیل ہے۔
بہت ہی (جسے اک شوق سے دیکھا کئے ہیں)	مری بربادیوں کی داستاں ہے	اک شوق کیا ہوتا ہے؟
کبھی زیبا نہیں توہین ہمدم کی	نشاط نیست کا یہ رازداں ہے	مصرع بجائے انگوروں کی زبان
ضرورت اب نہیں برق تپاں کی	فغاں (ہی آسماں دار آسماں) ہے کافی برائے آشیاں	آسماں دار آسماں کی بات ان سنی ہے مصرع بے ربط ہے برق کا محل آشیاں پر ہوتا ہے۔ آسمانوں پر نہیں ہیں۔ اگر آسمانوں پر بجلی گرا دی تو آسمانوں پر اجالا کیا تو برق کی ضرورت کیا رہی نہ رہا۔
وہی ہے بے نیاز عقل و دانش	جسے ہستی جنوں بار گراں ہے	خبر بے روح ۔ بے ترکیب ۔ بے مصرف
منزل منزل بھٹکتا ہے ابھی منزل بہ منزل	خدا جانے مقام دل کہاں ہے	منزل کا نہیں محفل کا محل تھا۔ دل منزلوں میں نہیں محفلوں میں ہوتا ہے
ایسے میرے ہیں اتنے داغ تابناک دل میں روشن	کہ جیسے آسماں پر کہکشاں ہے	اب یہ بھی مشق تجنیس معنوی ہے۔ جیسے کا محل تھا جیسے کے متقاضی ہیں
شورِ بختی بہار اس کم نصیبی کے تصدق	ہر اک سانس مسلسل نالگاں ہے	ہر سانس نالگاں ہے تو پوری بدنصیبی ہوتی، کم نصیبی نہیں ہوتی

نوٹ: باقی اشعار یہاں نہیں دکھائے گئے، صرف دو بیش ہیں جن پر اصلاح ہوئی۔

اُردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد "قرینے"

آبر احسنی گنوری کی غزلیات کا دوسرا دیوان جس میں ۲۴۵ غزلیں، ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے۔ عام دیوانوں سے ۳ گنا میٹر ہے اور قیمت صرف 25-3 ہے۔ غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا

ملنے کا پتہ۔ آبر احسنی۔ گنور۔ ضلع بدایوں (یو۔پی)

معاون اداکاران پران۔ آغا۔ نذیر حسین اور لیلا چٹنس
ڈائرکٹر۔ پی۔ ایل سنتوشی اور سی۔ ایل راول

آپ کے پسندیدہ ستارے
زبردست قہقہے، دلگداز رومان، سنسنی خیز گیت
ایک عظیم تصویر میں

راج کپور — نوتن

راول فلم کا شاہکار

دِل ہی تو ہے

عظیم افتتاح شکردار ۲۰ ستمبر
ریگل۔ جگت۔ امبا۔ امپیریل
نٹراج۔ ایروس۔ سدرشن
ساتھ ہی کاروشا پدرہ۔ جوبن چترلوک غازی آباد
ماں سرودالتآباد۔ دل شاد مراد آباد۔ نادلٹی علی گڑھ
۱۹ ستمبر سے سندر، کان پور — لکشمی دہرہ دون

۵۱ شری پکچرز پرائیویٹ لمیٹڈ ریلیز

سلطان احمد فی۔ اے

کوٹہ اور اس کے مشاہیر قلم

کوٹہ کی ایک علمی جگہ ہے۔ اس غیر معروف خطہ کے لئے اکثر یہ کہتے سنا گیا ہے۔ جب آنکھ قریب ہندوستان (راجستھان) کے شعبۂ فارسی میں تراجم کے سلسلہ میں میری اور تحقیق پر مامور تھا۔ یہ موضوع اس وقت سے میرے ذہن اور تجسس کا مرکز بنا رہا۔ ابتدا سے میرا یہ نظریہ تھا کہ کوئی خطہ جب تک اپنی تہذیبی و علمی روایات کو اپنے ماضی میں محفوظ نہ کرے اس کا حال بے سود ہے۔ کہیں یہ شاہجہاں آباد کے علماء و صوفیا کی کثیر تعداد کہیں لکھنؤ کی عیش پرستی اور نیز نیکیوں کے حضور میں دوڑا رہا۔ کہیں دکن اور علی گڑھ کے سنجیدہ حلقۂ درس میں اس کی سنجیدگی پر وقار متانت، فلسفیانہ روش اور اخلاقی قدروں کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ ایک محبوب تھا اور ہزاروں عاشق نثار۔ گیسوئے اردو جب منہ سنوارتے تھے کہیں اس کی پھبن اور بانکپن دلوں کو لبھا لیتی تو کہیں جنسی تلذذ، اور نفسانیت کی پردہ دری ہوتی رہی۔ اردو کے انشا پردازوں سوانح نگاروں نے خاکہ نویسی کے کہیں نئے رجحانات کا یہ عالم ہے کہ زندگی کے خطوط و نکات ابھارے ہیں۔ ادب برائے زندگی۔ "ادب برائے ادب" (آرٹ، کلچر اور تہذیب کے معیار موضوع بحث بنے۔ یہ احساس تھا کہ کوٹہ سے گمنام خطہ ارضی میں کوئی فوراً نہ نمودار نہ سایا ہوگا۔ ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور میں جبکہ شمع حیات جیلا رہی تھی، قومی کے اعلیٰ فن کار، ماہرین فن ترک سکونت پر مجبور ہوئے۔ جیسٹ انتقال آبادی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ عروس البلاد دہلی ان کے وجود سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ مگر جب شیرازۂ ہستی منتشر ہوا تو اس کی چنگاریاں دور دور تک پہنچیں۔ اس سے ایسٹ ایک فائدہ ضرور ہوا کہ علم و حکمت کے کئی چراغ اور فروزاں ہو گئے۔ ان شخصیتوں کے ادبی کارناموں پر گمنامی کا ایک ایسا غلاف پڑا ہوا ہے کہ ہم صفحۂ قرطاس ہستی و فطرت کی خلعت سے محروم ہو گئے۔ تاریخ کے ان دھندلے نقوش کے ہم چند خاکے پیش کرتے ہیں۔

(۱) **باقر حسین اشرف خاں** المتخلص بہ جہان سنگھ کے عہد میں ۱۸۵۵ء میں ریاست کوٹہ میں بود و باش اختیار کی۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ پیشہ طبابت تھا۔ ریاست کے پولیٹکل ایجنٹ کے طبی مشیر تھے۔ ریاست کے طبیب خاص تھے۔ افسوس کوٹہ ریاست کے والیان اپنے علمی اور تاریخی گراں مایہ ملفوظات فارسی کی حفاظت نہ کر سکے۔ صرف فرد کے واقعات پر چار ہزار خطوط ملے ہیں جن میں سے میں نے ۲۰۰ پر لکھا۔

(۲) لالہ جے دیال منوہر

ریاست کے وکیل ریاستوں کے نمائندہ تھے جو قریباً ہر ریاستوں میں حیثیت نامہ نگار کے ہوتے تھے۔ وہی انگریز رجسٹ پولیٹکل (ریذیڈنٹ) مقرر تھے اور مقدمہ کے سیاسی حالات پر، ریاستی اور مرکزی نظام سے متعلق اپنی متعلقہ ریاستوں کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ مستند عالم اور انشا پرداز تھے۔ بچے کی چھاتی (خصوصاً بیٹے) کے قتل ظالم سنگھ سے مرہٹوں کے معاہدہ اور مختلف بغاوتوں کے احکامات کے ترجمے اور تفصیل اس بات میں فوقیت ہے۔ انیسویں صدی کے بعد کی چند شخصیتیں جن کی ادبی دنیا جو متعارف کئے جانے کے قابل ہیں۔ علوم کا اجمالی طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کبھی ہم ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور حال کی تعمیر اور مستقبل کے استقرار پر اداسی کے ساتھ گامزن ہو جاتے ہیں۔ کوٹہ کی چند ادبی شخصیتیں اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر ان کے عصر کے لوگوں کے ساتھ کیا جائے۔ کیونکہ وہ تحقیق اور دسترس کے مرد میدان تھے۔ ان کا شمار شبلی اور الطاف حسین حالی کی صف میں کیا جانا چاہئے۔ ایسے لوگوں نہیں ہیں جو زمانہ کی بدقسمتی کہہ لیجئے یا زمانہ کی ناقدری یا ان کی طبیعت پسندی، بہر حال کچھ بھی کہہ لیجئے۔ اس آباد دنیا میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا ہوئیں جو اپنے عہد کی قدر زمانہ نہیں تھیں، لیکن ان کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ میں ایک محقق ادب اور مورخ کا اولین فرض ہے کہ وہ گم نامی میں پڑے ہوئے جواہر پاروں کو نکالے اور ادبی دنیا کو روشناس کرائے۔ ماتم یزدی شاعر گرامی نے اپنی شہود نظم "مرثیہ خونشاں" کے خطاب میں جس کا ترجمہ مولانا طباطبائی صاحب بھی فرما چکے ہیں۔ گم نامی میں ابدی نیند سونے والی ہستیوں کے بارے میں کہا ہے

"بہت سے انمول جواہر سمندر کی گہری اور تیلی سطح میں روپوش ہیں، جہاں بہت سے خوبصورت پھول جنگلی لالہ کی طرح کھلتے ہیں اور صحرا کی ہوا ان میں ان کی خوشبودار پنکھڑیاں بکھیر کر ان کے وجود کو ختم کر دیتی ہیں" ان بزرگوں کی سوانح اور ادبی کارنامے ہماری نگاہ نظر کے لئے چراغ راہ کا کام دیتے ہیں

ڈاکٹر حامد حسین رضوی

مولانا الطاف حسین حالی کے ہم عصر تھے۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے۔ اس وابستہ میں خواجہ غلام الثقلین سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مصر جدید تھا۔ اس جریدہ میں خواجہ غلام الثقلین مشہور مترجم، فلسفہ، تعلیم، مصنف، مبرز، انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن کرامت حسین بار ایٹ لا مصنف فلسفۂ اقبال، ابوالکلام آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی اور ڈاکٹر ضیاء احمد کے سیاسی، اصلاحی اور تاریخی مضامین چھپتے تھے۔ غلام الثقلین مرحوم کی شخصیت کا اندازہ خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے بزرگوں کو رکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے حامد حسین رضوی کے مضامین پر ایک مختصر سا ریویو لکھا اور ان کے یہاں سے نئی تحقیقات اور تخلیقی کاوش تحریر کی توقع ظاہر کی تھی، جو شاید خواجہ صاحب تو نہ دیکھ سکے۔ مگر ان کی یہ توقع کافی حد تک پوری ہوئی۔ حامد حسین صاحب نے "اسلامی لغت" کے نام سے ایک لغت اردو زبان میں مرتب کی جو علمی معلومات اور تحقیق کا گراں مایہ سرمایہ ہے۔ یہ مستند ہے۔ ڈرامہ پر ایک نظر، ڈرامہ موسیقی کی مرکز الگا کتاب ہے۔ اس میں ڈرامہ کے ارتقاء، ڈرامہ کے عناصر اور کلاسیکل ادب۔ مغربی لٹریچر اور ڈرامہ اور یونانی اور انگریز نقادوں کے اقوال سے بحث کی گئی ہے۔ اردو ادب میں الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو زبان پر احسان کیا ہے مگر اس کا زاویۂ نگاہ شاعری اور اس کے جزئیات پر تحقیق تھی۔ حامد حسین رضوی نے ڈرامہ پر تصنیف لکھ کر اردو کو کم مائگی کی شرمساری سے بچا لیا۔ دونوں اردو ادب کے محسن اعظم ہیں

ہر آں گروہ کہ از سافر دفا مستند
سلام ما بر سانید ہر کجا ہستند

حامد حسین صاحب کی پیدائش جہاں آباد میں ہوئی تھی تعلیم کا ابتدائی حصہ (آخری حصہ) کوئٹہ (بھائی) میں گزرا۔ سائنس کالج پٹنہ میں شرکت فرمائی تھی

مولانا مظہر الہادی

امروہہ کے رہنے والے تھے۔ بغرض ملازمت ریاست کوٹہ چلے گئے تھے اور آخری عمر تک وہیں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ نوابی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے اچھے شاعر اور بلند پایہ انشاء پرداز تھے۔ ہیئت کے فلسفۂ جدید پر معرکۃ الآرا تصنیف کئی جلدوں میں مصنفات پر مشتمل ہے۔ میں نے ابوالفضل کے ہیئت کے ترجمے دیکھے ہیں۔ ابوالفضل نے توجہ ہی پر اکتفا کیا، مگر مولانا نے فلسفہ اور حکمت پر بڑا تنقیدی کام کر ڈالا۔ دیوان عبدالعلیم شاہ آپ ہی کی نظر عنایت کا شاہکار کہا جاتا ہے جو پاکستان میں شائع ہوا۔ کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے بہت بڑے فقیہ، محدث، بلند پایہ انشاء پرداز اور محقق تھے طبیعت نہایت سادہ تھی۔ لباس بھی کیا کرتے تھے مگر اس کا مطلب وہ نہ تھا جو آج کل ہے۔ دین مدرسہ تھے۔ خدمت خلق اپنا فریضہ انسانی سمجھتے تھے۔ دوا نسخہ لکھواتے اور پھر کہتے حکیم صاحب یہ دوا تو کر دی ہے۔ اور حکیم صاحب ہی کے اصلاح فرمائے ہیں۔ آپ نسخہ عربی زبان میں لکھتے تھے۔ مولانا کے معتقدین امروہہ کی کوئی طوائف تھیں جو پیشہ سے پہلے ہی آپ کے نکاح میں آگئی تھیں۔ مولانا کو ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ مولانا کے فیض صحبت سے وہ اس قابل ہو گئی تھیں کہ مولانا کے تجویز کردہ نسخوں میں اصلاح فرمایا کرتی تھیں۔ یا کبھی مولانا سے سہو ہو جاتا تو اس طرف اشارہ کر دیا کرتی تھیں۔ وہ تسلیم فرما کر خاموش رہ جاتے۔ لوگ تعلیماً ان صاحبہ کہتے تھے

ع ۔ ہیں کرامت بت خانہ مرا سے شیخ

مذہب شیعہ، دجیہ و شکیل خوبصورت، گندمی رنگ، چھڑی پیشانی، قد درمیانی مونچھیں، چہرہ پر ہلکی شیروانی اور ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انگریزی، فارسی اور فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ میرٹھ کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے آپ کے ہم عصر کالج کے اساتذہ میں پروفیسر محمد مجیب جیسی علمی شخصیت تھی۔ مزار صاحب عبدالماجد دریابادی کے بھی استاد رہے تھے۔ ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تقسیم سے پہلے کوٹہ آتے جاتے رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ اور صاحب زادیاں یہیں مقیم تھیں۔ مزاحیہ صاحب خوش فکر شاعر بھی تھے۔ شیعہ مجالسوں میں مرثیہ خوانی پڑھتے تھے۔ بالطبع رجحان طبیعت علم کی طرف تھا۔ والد کی وضع فلسفیانہ تھی، اور سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شاعر یا فلسفی ہیں۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ اکثر بیماروں کے گھر میں یا گاؤں کے کنارے سڑک پر کاڑیاں لئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں اور فراغت میں مستغرق ہیں۔

مولانا مظہر الہادی کے بھتیجے

مولانا یاسین

مولوی مقرر حسین، مولوی عالم اور فاضل کی ڈگریاں اور منشی کامل کی لاہور سے حاصل کیں شیر پور شاہ ڈاکٹر کلکٹر ڈاکٹر کمشنر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی نے ترقی کی خواہش ظاہر کی تو ڈاکٹر نے فارسی میں کہا "مولانا ترقی پر ہی خون بلا کرتی ہے اس کے مزید قابلیت چاہئے"۔ اس فقرہ نے تاریخ کا رخ آپ اپنی طرف پھیر لیا اور مولوی صاحب کو ماسٹر کر کے اوپر چلے گئے اور لاہور سے انگریزی ادب میں بی اے کیا۔ مگر افسوس مولانا کی زندگی نے وفا نہ کی، ۳۰ سال کی عمر میں جبکہ وہ مرض میں مبتلا ہو کر علم جاماں سے دل تائی کو سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر غلام جیلانی کو عربی کی ابتدائی کتاب "اصلاح الادب" مولانا نے ہی پڑھائی۔ ان ہی کے گھرانے میں ایک اصلاح ساز ہستی اٹھی۔ یہ مرزا حامد بیگ تھے جو حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کی تھی۔ باقاعدہ طب حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس پڑھی کوٹہ ریاست کے دواخانہ میں طبیب ہو گئے ایک جید عالم تھے کم گو اور کم سخن تھے۔ دہلی کی تمام سوسائٹی اور اجمل خاں صاحب

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

نقوش شمارہ ۱۳۲

معصوم بڑودوی

بزم محبان ادب بڑودہ کا
آل انڈیا مشاعرہ

فرشتہ پکتری بنگلور تحریر جناب عبدالکریم صاحب شاکر اندھی کی وساطت سے بغرض اشاعت موصول ہوئی تھی۔ قبل ازیں شاعر میں اسے بھی اشاعت میں شامل کیا جا چکا ہے۔ مگر واقعات کی صداقت کی ذمہ داری ناظم مشاعرہ نگار پر ہے۔ نیز اشعار کی صحت کا بار خود شعراء کرام پر ہے۔ (ادارہ)

بزم محبان ادب (بڑودہ) کی جانب سے بتاریخ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء بروز اتوار شب کو ۹ بجے بتعلیم نیائے مندپال بڑودہ، ایک آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے لوگ ذوق و شوق سے تشریف لا رہے ہیں۔ اس مشاعرے کا اعلان بڑودہ میں پہلے ہی سے بڑے بڑے پوسٹروں کے ذریعے کیا گیا تھا۔ اس لئے شروع سے ہی لوگوں میں بیرونی شعراء کرام کو سننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے کافی سے زیادہ تعداد میں سامعین نے مشاعرے میں شرکت فرمائی۔ یہاں تک کہ لوگوں کو بٹھانے کے لئے کرسیاں کم پڑ گئیں اور بہت سے حضرات کو کھڑے ہو کر مشاعرہ سننا پڑا۔ ٹھیک شب کے نو بجے مشاعرہ شروع کر دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن ٹھیک ساڑھے نو بجے تلاوت قرآن شریف سے مشاعرے کا افتتاح ہوا۔ تلاوت قرآن کریم محمد حسین صاحب نے فرمائی اس کے بعد آج کے مشاعرے کے لئے، جناب معصوم بڑودوی سکریٹری بزم محبان ادب اور شرر القادری نے شاعر کے نام نسرین کی ذمہ داری سنبھالی اور صدارت کے لئے جناب منصور قریشی صاحب کا نام گرامی جناب عاشق بڑودوی نے پیش کیا اور جناب اختر لطیف نے تائید فرمائی۔ صدر صاحب نے مسند صدارت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے بزم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی بعد اپنی تقریر میں بزم کے اراکین اور دیگر احباب کو اس مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ اب ۹ بجکر ۴۰ منٹ پر مشاعرہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے آنے والے شعراء کرام صبا اخلاقی۔ بیتاب اتاوی۔ آمنہ شاہین اور گرامی جشتی کسی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے

نظامت کے فرائض حضرت شرر قادری، معصوم بڑودوی سے جناب نسیم رشادی، جناب فاخر رتلامی، جناب اختر گوالیاری، جناب کاشف اندوری، جناب کاشف بھوپالی جناب بیکس دھارودی، جناب خدمت رتلامی، اور جناب نور عثمان آبادی یو۔ پی سے جناب شکیب ہاشمی اور ہوشیار جناب تبسم الہ آبادی، جناب حیدر قریشی آبادی، جناب عشق گلشنوی، جناب منصور رودھوی، جناب کوثر گلشنوی اور جناب قمر الہ آبادی بمبئی سے جناب شاہد الہ آبادی صاحب۔ پاکستان سے جناب اختر لطیف اور گجرات سے رونق احمد آبادی، احمد سعید، حضرت اثر بہت تک تشریف فرما ہیں

پہلے اب آپ کے سامنے مقامی نوجوان شاعر ناز بڑودوی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ترنم پڑھتے ہیں

خوشی دائم نہیں رہتی ہمیشہ غم نہیں رہتے
ہماری زندگی کو وقت نے یہ بات سمجھائی

مناسب داد حاصل کرنے کے بعد ناز صاحب تشریف لے جا رہے ہیں اب اعلان "بزم محبان ادب" کے نوجوان شاعر اور سکریٹری بزم جناب معصوم صاحب بڑودوی کا نام پکارا جا رہا ہے۔ آپ نے ترنم سے پڑھنا شروع کیا ہے یہ ہی دل نشین ترنم ہے۔ آپ بھی سنئے

جیتے کیسے ہیں آپ ہم تو رکھتے ہوں میں

ان کے دل میں وہ کسک اپنی کہ مدت سے ہے
مطلع کے بعد ایک اور شعر فرما رہے ہیں اور مسکراتے ہوئے ہر طرف سے داد لے رہے ہیں۔

رعنائیوں میں پرتو صد حسن ہے نثار
دل میں بسی ہے خوبصورت آرزو رکھتا ہوں میں

اور یہ ہیں ایک اور نوجوان شاعر جناب صادق بڑودوی، دیکھئے کتنی صداقت ہے آپ کے شعر میں ؎

جا رہا ہے خلاف منزل کے
مقصد کا وہاں نہیں معلوم

مقامی نوجوان شاعروں کا دور چل رہا ہے ایک نوجوان کہنہ مشق شاعر جناب شور بڑودوی کو بلایا گیا ہے ترنم میں غزل پڑھ رہے ہیں

شکوہ سنج غم دوراں نہیں دیکھے جاتے
ہم سے روتے ہوئے انساں نہیں دیکھے جاتے

اب بزم محبان ادب بڑودہ کی نئی پیشکش مسلسل رتلامی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک شاعر تنظیم سیاست عالم کا تبسم چھپتے چھپتے چھوڑ گئے ہیں یہ شاعر ہیں ہوشیار بھوپالی۔ مناسب داد حاصل کرنے کے بعد آپ ایک اور نوجوان شاعر ہاشمی امروہی مائک پر آ چکے ہیں۔ ترنم میں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جلادے خانۂ ویراں کا مطلع ذرا ڈاؤ
کہ خندہ زن ہے یہ ایوان بادشاہی پر

شکیب صاحب کے بعد بڑودہ کے نوجوان شاعر اور بزم توفیق کے سکریٹری جناب انجم کو بلایا گیا ہے اپنے مترنم شاعری سے سماعت فرمائیے۔

ہر چیز چمن کی آشنا خاطر ہے دل ہے
پھولوں کی مسرت ہے تو کانٹوں کا بھی غم ہے

مسرت اور غم کی اس کشاکش میں آزاد نسر کی نگاہ انتخاب کے جواب میں جناب احمد سعدی صاحب آئے ہیں اور ترنم سے غزل فرما رہے ہیں

ملتا ہے جہاں بھی ہمیں کچھ کہنے کا موقع
اے دوست حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہتے
تہذیب دلوں کا گلا گھونٹ گیا لیکن
تہذیب دلوں کے خدا کچھ نہیں کہتے

اور یہ ہیں جناب بڑودوی بزم توفیق کے صدر وقت میں غزل فرما رہے ہیں۔

خوشی کی چھاؤں بھی اک روز ڈھل ہی جائے گی
غموں کی دھوپ میں کچھ دن اگر گزارے گئے

جناب صاحب کے بعد ایک خاتمہ شاعر جناب شاطر بڑودی کا نام پکارا گیا اور شاطر صاحب کے آتے ہی نشست ختم ہونے سے پہلے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا شاطر صاحب ایک قطعہ فرما رہے ہیں۔

جب بھی موقع ملا دانے دانے کو
پیٹ بھر کر نہیں ہے کھانے کو
جس کے بھوکوں کو کھا گئے شاطر
کون روئے گا اب زمانے کو

پورے مجمع پر جنس کا دورہ پڑ گیا ہے ساس کے بعد اکا انداز کی ایک غزل شروع کی ہے ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

کبھی کا تھا حسیں کی شادی ہے شاید
یہ سب، یہ پشاں کیا دیکھتا ہے

غزل ختم ہوئی اور جناب شاطر بڑودوی کو پیش کیا گیا۔ آپ اپنے مترنم شاعر ہیں ؎

ضبط سے کام لے دل ناداں
مند گھبرائے ہوئے چھٹنے کو
لے کے دل آہ کہاں دل بیٹھے
دل دیا تھا تمہیں بدلنے کو

اور اب شروع صاحب نے جناب اختر گوالیاری کا نام پیش کیا وہ بھی اختر صاحب سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے کہ دشمن ساتھ رکھتے ہو دنیا کی تم اڑا لزام دیتے ہو تقدیر پر وقت رفتار یہ بدل نے بھلا تم نے زلفوں کو اپنی سنوارا نہیں

کافی سے زیادہ داد حاصل کر کے جا چکے ہیں۔ اب آپ کے سامنے بڑودہ کے ایک نوجوان شاعر قمر بڑودوی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک قطعہ آپ بھی سنئے ؎

وہی ہے اپنا چمن اور وہی اندھیرا ہے
چراغ لالہ و گل سے بھی روشنی نہ ہوئی
سنے ہوئے ہیں بس اتنی سی بات پر کافر
کہ ہم سے جھوٹے خداؤں کی بندگی نہ ہوئی

اور یہ ہیں جناب کاشف صاحب اوجینی، ایک مقامی شاعر کی ادائے خاص سے تحت میں پڑھ رہے ہیں سنئے ؎

دل انساں ہے حریف غم کونین مگر
کوئی دنیا میں حریف غم انساں نہ ہوا

اس کے بعد جناب قیصر صاحب سے عرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں آپ کے ترنم غزل کا سماں سا باندھ دیا ہے۔

اس میں تو بس ہے آپ کے حسن کی
آپ کو جانتہ کہتا خدا کی قسم
کاروان محبت گزرتا رہا
دیکھتے رہ گئے اہل درد و حرم

اور اب میں بڑودہ کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب گلشن بڑودوی صاحب اپنے مترنم شاعری سے معقول داد حاصل کر رہے ہیں۔ اگر شعر و غزل میں آپا کوئی مشروط نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ ہیں کچھ بات گجرات کے ایک نوجوان شاعر سید اسمٰعیل صاحب اظہر سنئے۔

بتوں کا جرم کیا کی بت پرستوں نے
سنبھالے ان آذر مشرب بت خانے چھنیں کے

مجلس مشاعرہ پورے رنگ پر آ گئی ہے۔ ہال تالیوں سے گونج رہا ہے، آخر بات کیا ہے، اجی جناب علاؤ الدین صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ آپ پورے ہال کے شاعر ہیں اور کہتے بھی خوب ہیں۔ فرما رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

ہوا ہے جلوہ کبھی ہے ہوا ہے جنت بھی ہے
ہوا ہے رحمت بھی ہے ہوا ہے جہنم بھی ہے
وہ کھدا کے قبر سے تو ڈرتے نہیں
اب حکومت کا ڈر ہو تو میں کا کروں

پورے ہال تالیوں سے گونج رہے ہیں اور محفل میں ہے مشاعرہ اپنے پورے شباب پر ہے ہے وقت ناظم مشاعرہ نے ندوت دقاق سے اپنا کلام سنانے کی گزارش کی ہے آپ بھی ترنم سے غزل پڑھ رہے ہیں سنئے ؎

اس طرح سامنے کا آئینہ دکھاتا ہے دل
خود مصور کے لئے تصویر بن جاتا ہے دل

نشست صاحب کے بعد شاطر صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے۔

کفر الحاد و مذہب سے کیا واسطہ
تیرا در چاہئے بندگی کے لئے
چاند کی سمت کچھ بھی بھری پرواز ہو
میکدہ میں منتظر ہے تشنگی کے لئے

اور یہ ہیں جناب فدا گشن آبادی سنئے کتنی مرصع غزل ہے۔

خوشی دو رفتہ صنم ہو گئی ہے

ہنسی پھولوں کی مستبنم ہو گئی ہے
وہ عالم کی حدوں سے آگے بڑھ کے
بجت خود اک عالم ہو گئی ہے

اور فرد صاحب کے بعد گجرات کے مشہور و معروف شاعر جناب اختر ہشت نگری سے فرمائش کی گئی کہ وہ اپنی مشہور نظم "بندھن" سنائیں۔ ایک بند پیش خدمت ہے

وہ محبت وہ لطافت کو بنائے آئینہ
وہ محبت ہی تو ہے آخر بنائے آئینہ
زیبد اخلاص سے کیوں نہ کہے آئینہ
من ہی جب میلا ہو کیا صورت دکھائے آئینہ
سب کا درشن جس میں ہوتا ہے وہ درپن اور ہے
دل کا بندھن اور ہے دھن کا بندھن اور ہے

اختر صاحب کے بعد کاشف زیدی صاحب اسٹیج پر تشریف لائے۔ آپ بہت اچھے مترنم شاعر ہیں غزل بھی مشق بھی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دوستی خود ہے خلوص و نیت پر مبنی یہ نظارے میں گے
پھول کے پاس بھنورا نے گا، چاند کے پاس تارے ہیں گے
حسن کیا چیز ہے، عشق کیا ہے ایک دن دو میں کر لے
اک نیا موڑ تا بنا نے گی، جب یہ دونوں کنارے ہیں گے

اب ایک اور پیروی شاعر جناب عزیز اکبر آبادی کو دعوت غزل سرائی دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

وہ حادثات بھی قلب و نظر پہ گزرے ہیں
جہاں خوشی میں جن کی کوئی مثال نہیں

اور یہ ہیں جناب رونق احمد آبادی دلنواز ترنم سے غزل شروع کی ہے۔ ایک شعر آپ کا بھی سنئے۔

ڈوبے گئے وہ دن شب و روز شام کا سورج بجھا بجھا سا
اُن بچھڑوں کی تو نہ ڈھونڈ ہم کی قسم لگ اور اشارا

ان کے بعد شمس افسری صاحب نے اپنا کلام پیش کیا اور پھر فرمانروائے حضرت صفر اجیری نے تحت میں ایک مرصع غزل پیش کی سنئے کیا خوب فرماتے ہیں آپ کی آنکھ کھل گئی ہیں بنیاد میں جن ہوں مرجیں

ساتھ دے جیار کا یہ ساتھ چھٹتے جیسے

اور یہ ہیں جناب ساحب انوری صاحب حقانی

(باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

(بقیہ افسانہ نگاروں میں (صفحہ ۲۰ سے آگے)

سے بھاگ اور میرے ہاتھ کی ماں کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑی چبھتم یا نگار کے طور پر ایک بار لے گئے تھے اسے بھی کہیں ضائع کر دو۔ کہ اسے تم کبھی نہ دیکھ سکو۔ ہاں میں جانتی ہوں کہ یہ تم کام تمہارے لئے کس قدر مشکل بلکہ محال ہے لیکن تم وعدہ کر چکے ہو۔ تمہیں ہر صورت میں یہ کام کرنا ہوگا میں نے کئی طرح پر غور کر لیا ہے کہ میں تمہاری بے اطاعت سے اپنے پاؤں کا ہر پر قفس مٹا دینا چاہتی ہوں تاکہ پھر تمہیں کبھی یاد نہ ستائیں۔ اس لئے میں ہر اس چیز کو قربان کر دینا چاہتی ہوں جو اس راہ میں حائل ہو اور شکیل اس ارادہ کی تکمیل کے لئے مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے جاؤ شکیل اب جاؤ۔ ان تحریروں کو آگ کے سپرد کر دو۔ میں ان سے ایک آگ دائش کرنا چاہتی ہوں۔ میرے اپنے شکیل! میرے ارمانوں کی دنیا اندھیروں میں کھو جانے والی ہے اُسے اجالوں کی ضرورت ہے۔ شکیل ان دہکتے شعلوں میں میرے ارمانوں کی میت اور میری آخری دیرینہ تمنا لپٹ شعلہ ہے۔ جاؤ شکیل۔ بہت کرو۔ اپنے ہاتھوں سے چتا سجا کر انہیں جلا دو۔ ان بھی تحریروں میں آگ لگا دو شعلے بھڑکا دو۔ میری خاطر۔ اپنی محبت کی خاطر۔ خدا کے لئے جاؤ۔ اب جلدی کرو۔ مجھ پر ایک اور احسان کرو۔ اگر تم نے میری زندگی میں ایسا نہ کیا۔ تو میری روح تم سے تمہارا سکون ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لے گی بتیں سدا آپنے کے لئے مجبور کر دے گی۔

تم پر تمہاری زندگی پر بہاریں حرام ہو جائیں گی، تم سدا کی فگر تھے ہو گے اور میں تا حشر۔ آہ! میرے شکیل، میری آخری تمنا کو ٹھکرا نہ دینا تم مجھ سے نہ بچھڑو۔ میرے ایسے اچھے شکیل۔!

شکیل نے جیسے کانوں سے تڑپ اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے ڈاکنیں اڑ رہے اس کے جسم سے لپٹ گئے ہوں۔ وہ فرط جنون میں اپنے ہی سر کے بال نوچنے لگا۔ اور پھر تیزی سے کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دونوں ہاتھوں کو بازو سے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی مغموم و حسرت زدہ نگاہیں اس کی اپنی تحریروں سے اٹھتے شعلوں کو بے بسی سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ تحریریں جو اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھیں۔ یہ ان قرطاس کے ٹکڑے جو اس کے آئینۂ حیات محبت تھے۔ آج چکن چور ہو گئے۔ اس کی محبت بھری نگاہوں کا حسین رنگ محل ایک ہی تیلی سے جل اٹھا۔ اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ارمانوں کی چتا روشن کر دی اور پھر زندگی کے حسین تر یادوں کو اس طرح جھونک دیا اس وقت یوں لگ رہا تھا۔ وہ جیسے کسی اپنے ہی عزیز کو اپنے ہاتھوں سے دفنا رہا ہو۔ پھر وہ ناتواں لرزتی ٹانگوں سے اٹھا۔ اس کے لرزیدہ لرزیدہ قدم بالکل سے دور ہو گئے تھے اور پھر اس کے قدم لمحوں کی مسافت پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں کرسیوں کی گہرائی میں خنجر کے ہاتھ کی ٹوٹی چوڑی بھی چھپا تھی۔ اس کی آنکھیں خشک و ویران تھیں گرجوں کے پیچھے آنسوؤں کی آبگینت موجیں بہا رہی تھیں۔

اس کا دماغ شل ہو گیا تھا۔ وہ اب کسی چیز کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خنجر کے متعلق بھی نہیں۔ بس اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی تحریروں سے اٹھتے ہوئے شعلے تھے جن میں اس کے ارمانوں جذبات اور احساسات و زیست کی بہاریں جل رہی تھیں

باوجود بہت سے کرم فرماؤں نے زور مطالبہ اور انہیں کیا ہے۔ تاہم ان تمام حضرات کی اسمائی بندکہ کے نادہندگان کی فہرست میں نام شائع کرنا پڑے گا۔ لہذا مطالبہ جوں پہنچ ڈاک مرحمت فرمائیے تاکہ مزید ازاں زحمت نہ ہو۔

بگیرو ساحر (سیالکوٹی)

غزل

پھر اب جو دے رہے ہیں فریبِ وفا مجھے
حیران ہوں کہ آپ سمجھتے ہیں کیا مجھے

برباد کی سکوں کا نہیں کچھ گلا مجھے
ہوتا ہے یوں بھی عشق میں یہ علم تھا مجھے

دیر و حرم سے کچھ بھی نہ تھا واسطا مجھے
سن کر تمہارا نام ٹھہرنا پڑا مجھے

کافر بتوں نے مائلِ ایماں کیا مجھے
آتا ہے بات بات پہ یاد اب خدا مجھے

دیکھا تھا ایک دن کہیں محوِ دعا مجھے
وہ بے وفا بھی کہتا ہے اب باوفا مجھے

ناکامیوں کی وجہ کوئی اور ڈھونڈھ لوں
یہ کیا کہوں کہ آپ نے دھوکا دیا مجھے

پیدا کروں گا اپنی جبیں ہی میں اب کشش
ملتا نہیں کہیں بھی ترا نقشِ پا مجھے

کس ڈھب سے کہہ گیا کوئی افسانۂ حیات
معلوم ہو رہا ہے حقیقت نما مجھے

دنیا میں تو یہ شکوۂ دنیا ہے بے محل
محشر میں کچھ کہوں گا جو کہنا پڑا مجھے

وارفتگیٔ عشق میں کھلتا نہیں یہ راز
دھوکا دیا کسی نے کہ دھوکا ہوا مجھے

وہ سامنے ہیں اور نظر دے گئی جواب
اے آرزوئے دید یہ کیا ہو گیا مجھے

ساحرؔ نگاہِ خلق میں ہوں رندِ بادہ نوش
ہر رند جانتا ہے مگر پارسا مجھے

نوٹ:- تو پھر غزل بھی خوش بیانی کی سند ہے۔ مگر ان دو شعروں کی لطافت کا کیا کہنا۔ آبرو حسنی

نشتر امروہوی

دو غزلیں

فرد قریشی

(بقید یک قافیہ)

آپ اُٹھے ورق حقیقت کے
لاکھوں فقرے ہیں آدمیت کے
ایک بم میں جہاں تباہ کرو
اُف یہ منصوبے آدمیت کے
اب یہ اڑ کر فلک پہ پہنچے گا
پر نکل آئے آدمیت کے
کتنے حیرت زدہ فرشتے ہیں
دیکھ کر کام آدمیت کے
آدمیت تباہ ہونے لگی
دیکھے اوصاف آدمیت کے
اختلافاتِ آدمی کے سبب
کھل گئے راز آدمیت کے
کر رہے ہیں ترقیاں ہر خوب
آدمی کام آدمیت کے
خوب ابھریں گے اس زمانے میں
جو بھی جوہر ہیں آدمیت کے
پورے کرنے پڑیں گے وہ اے دوست
جو تقاضے ہیں آدمیت کے
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
معجزے ہیں یہ آدمیت کے
باعثِ شرم بن گئے نشتر
واقعات آج آدمیت کے

کبھی چاند کی شکل میں
کبھی طلعتِ مہتاباں بنے ہم
کبھی ٹیس بن کر رگ و پے میں بیٹھے
کبھی دردِ فرقت کا درماں بنے ہم
کبھی ظلمتوں پر ضیا بن کے چھائے
کبھی شوق میں ابرِ نیساں بنے ہم
کبھی دردمندوں کو دارو عطا کی
کبھی چارہ سازِ غریباں بنے ہم
کبھی خاک چھانی بیاباں کی ہم نے
کبھی وجہِ تزئینِ بستاں بنے ہم
کبھی ہم نے کھولے زلیخا کے گیسو
کبھی طلعتِ ماہِ کنعاں بنے ہم
کبھی ہم کو لوگوں نے منبر پہ دیکھا
کبھی ساقیِ بزمِ رنداں بنے ہم
کبھی عاشقوں کی صفوں کو سجایا
کبھی صدرِ بزمِ حسیناں بنے ہم
کبھی ذرہ ہونے کو دل نے ابھارا
کبھی رنگِ خونِ شہیداں بنے ہم
کبھی ہم نے کھینچا ہے تشنہ جبیں پر
کبھی سجدوں کے نگہباں بنے ہم
کبھی عرش پر نورِ مطلق کو دیکھا
کبھی فرش پر شمعِ عرفاں بنے ہم
کبھی پڑھ کے لاحول شیطاں کو روندا
کبھی مظہرِ ذاتِ یزداں بنے ہم
ہماری محبت کا حاصل نہ پوچھو
محبت کے صدقے میں انساں بنے ہم

روحِ فطرت

زندگانی نے جو کی بے وفائی — جو تھی اپنی ہوئی وہ پرائی
فصلِ گل ایسا پیغام لائی — ہر کلی باغ میں مسکرائی
جب کسی کی مجھے یاد آئی — زندگی جھوم کر مسکرائی
میری قسمت میں ناکامیاں تھیں — کوئی بھی آرزو بر نہ آئی
کر دیا مجھ کو رسوائے عالم — میرے دل کی لگی رنگ لائی
قیدِ ہستی سے نکلوں میں کیوں کر — سخت مشکل ہے اس سے رہائی
وائے حسرت کہ اک بار جا کر — پھر پلٹ کر جوانی نہ آئی
ہو گئے دل کے ٹکڑے ہزاروں — ہم نے ایسی بڑی چوٹ کھائی
ہم نے شمعِ محبت جلا کر — زندگی اپنی روشن بنائی

شوکت جلالی

غزلیات

نظور ناظم

پلکوں پہ میری شعلۂ تر کا ظہور ہے
بزمِ نظر میں حسنِ نظر کا ظہور ہے
نازاں ہے غنچہ غنچہ جواں ہے کلی کلی
جاگو کہ گلستاں میں سحر کا ظہور ہے
رقصاں ہے چشمِ شوق میں دنیائے میکدہ
ساقی یہ تیرے لطفِ نظر کا ظہور ہے
ہے رہروانِ شوق میں سرگرمیٔ سفر
شب ختم ہو چکی ہے سحر کا ظہور ہے
وہ بے نقاب آئے ہیں بزمِ خیال میں
اب شہرِ تیرگی میں سحر کا ظہور ہے
ظلمت کی سانس ٹوٹ رہی ہے ہر نفس
تاریکیوں میں نورِ نظر کا ظہور ہے
ناظم یہ کس دیار میں لایا جنونِ شوق
پیشانیوں میں شمس و قمر کا ظہور ہے

تیرے بغیر میرے یہ موڑ زندگی
ایسے ہیں جیسے حیرت چہرے پہ اجنبی
گو ہے نظر میں اس کے انجام کار
ارماں ہے ہنسی کا داں میں لگی کلی
منزل کی سمت چل کر کچھ دور مڑ گئے
گر خوب رہبروں کو ملا یار رہزنی
یادِ حزیں نے تیری آ کر دیا
پائے ہیں ہم نے غم میں آثار جب کو
دل کر سکا نہ جرأت جب ان سے عرض
افسانے کہہ دیئے ہیں آنکھوں نے بے
گر موت خوں فشاں ہو لے ساتھیو!
لیکن ہمارے لب پر ہوں گیت زند
اخلاص اہلِ فن کی نسبت سے آج
ہیں خوب یاد تجھ کو جو گر ہیں شاعر

فرد فرخ پوری

رقص میں روز و شب ہیں پیمانے
اور بھر تشنہ لب ہیں مستانے
رک سکیں گے نہ چارہ سازوں سے
زندگی کے چھلکتے پیمانے
جب وطن مقتل بن گیا تو کہوں
ملتے ہیں ہر قدم پہ ویرانے
وہ مجھے کس لئے ستاتے ہیں
کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے
کانپ اٹھے ہیں اہلِ بزم کے دل
بزم میں یوں جلے ہیں پروانے
کتنی شہرت ہے آشیانے کی
بجلیاں آ رہی ہیں ٹکرانے
چل سکیں گے نہ اب خرد کے فریب
سامنے آ گئے ہیں دیوانے
ہنس رہے ہیں یہ اشک شبنم پر
پھول انجام سے ہیں بیگانے
مشکلیں راہ میں نہ حائل ہوں
رکنے والے نہیں ہیں دیوانے
ملتی ہے جب خبر وہ آئیں گے
دل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے
سننے والے فرد کی باتوں پر
ہنس نہ جائیں خرد سے بیگانے

قیصر انصاری

محبت[1] کی پرستش میں اگر کچھ بھی کمی ہوتی
جو دنیا ہے ابھی قائم کبھی کی مٹ گئی ہوتی
اگر راہِ وفا میں ہم نے اپنی جان دی ہوتی
تو شمعِ زیست گل ہو کر بھی پیدا روشنی ہوتی
سنبھلنے کا مجھے پھر تو بہت کچھ وقت مل جاتا
مرے افسانۂ غم پر اگر تنقید کی ہوتی
ہوائے یاس سے بچتے اگر امید کے پردے
سحر سے پہلے ہی خاموش شمعِ زندگی ہوتی
بہت اچھا ہوا آنکھوں نے آنسو پی لئے ورنہ
تمہاری دل دہی تو اک مصیبت بن گئی ہوتی
جو تم سوئے فلک نظریں اٹھا کر مسکرا دیتے
زمیں پر چاند ہوتا آسماں پر چاندنی ہوتی
دمِ اظہارِ غم قیصر انھیں صدمہ بہت پہنچا
ذرا سی بات ہی تو تھی سمیٹے ہی سے کی ہوتی

افکارِ نو

جودت ابدی رائے پوری

آؤ توصیف چھیڑیں عشق کے افسانے کی
لوگ کیوں کرتے ہیں باتیں یہ بہار آنے کی
شمع سے سوز مگر اس کا نہیں کم اے دوست
ڈھونڈنے ہیں کو تیرے ساتھ چلا تھا میں شیخ
تم نے تسکین کی خاطر اٹھائی تھی نقاب
الجھنیں اور مگر بڑھ گئیں دیوانے کی
اے مری تشنہ لبی! ہوش میں آ کر چلنا
راہ پُر پیچ بہت ہوتی ہے مے خانے کی
اصلیت کیا دلِ انساں کی بتاؤں جودت
اہمیت اس میں ہے کونین پہ چھا جانے کی

[1] یہی حقیقت ہے اس مطلع میں۔ ادارہ

ناصر بیابی

ہماری ہمت جو اس شوخ کی نظر آئی
تو جھک کے دل کی ارتقب تا جگر آئی
اسی کو میں نے بنایا ہے ماہیر اپنا
غبار بن کے جہاں گرد رہگذر آئی
یہ کون مہ کش خورشید وضو فشاں آیا
کہ رات سو گئی اور چونک کر سحر آئی
شب فراق کئی بار گوشۂ دل سے
اٹھی تو آہ، مگر آہ بے اثر آئی
کسی کے رنگ تغافل سے روشنی پا کر
شبیہ حسرت دل اور بھی نکھر آئی
جہاں جہاں ترے جلوے بکھر گئے ہے
ہماری چشم تمنا جدھر جدھر آئی

نسیم فاروقی

جو دل ٹوٹے تو زباں اشک ہو کر نکلتے ہیں
بڑی جد و جہد ہوتی ہے تب گوہر نکلتے ہیں
تمنا کے آشیانے پہ ہو گیا ہے یوم کا قبضہ
کہاں کے رہنے والے تھے کس کے گھر نکلتے ہیں
نگاہ یاس یہاں کیا اگر ہو خار اور گل پر
تو کانٹے بھی لہو کے پھول بن کر نکلتے ہیں
محبت کا فریضہ ہے سر تسلیم خم کرنا
وہ اک ناپاک جذبہ ہے جہاں خنجر نکلتے ہیں
نہ ہونا چاہئے تفریق کچھ اپنے پرائے میں
یہ فتنوں کی جڑ ہے اور یہیں سے شر نکلتے ہیں
نسیم اس ملک فانی میں جنہیں ہے پاس عزت کا
بلند و پست عالم سے وہ خود بچا کر نکلتے ہیں

کشور عزیز

یہ رہے گا بے فیر انجام تک آغاز سے
دل کبھی واقف نہیں ہوگا جنوں کے راز سے
ہائے وہ ٹوٹے ہوئے تاروں کی فریاد رسی
ہائے وہ نغمے جو نکلے ہیں شکستہ ساز سے
تھیں کہاں حاصل ہمیں الفت کی یہ رنگینیاں
آشنا جب تک نہ تھے لطف نگاہ ناز سے
آج پھر دل کے سیہ خانے منور ہو گئے
آج پھر اس نے ہمیں دیکھا عجب انداز سے
کس طرح خود کو بتا دنیا سے بے گانہ کروں
سینکڑوں آوازیں ملتی ہیں مری آواز سے

جلال و جمال

بے نس الآبادی

تری آنکھ کا کر شمہ بھلا کیا سمجھ میں آئے
یہ اسرار بندہ سے کیسی بجا ں کرائے
ترے حسن فتنہ گر میں بھی عجیب خوبیاں ہیں
مری زندگی بھاتے ہی زندگی بنائے
یہ طلسم زاد دنیا دیئے جا رہی ہے لوری
سر راہ چلتے چلتے کہیں نیند آ نہ جائے
ترا راہ پہنچی ہے جو نگاہ شوق میری
کہیں گمرہ ہو نہ تو پھر ترا کچھ پتہ نہ پائے
مری بیکلی پہ جس ہر کسی کو کیوں تعجب
ہے جنوں کا یا اسیراں ہوں مجھے کیسے نیند آئے

انجم علوی (کیل)

شب فراق میں یاد اُن کی آئی جاتی ہے
اک آگ سی مرے دل میں لگائی جاتی ہے
شراب عشق کو حاجت نہیں ہے ساغر کی
یہ شے ہے وہ جو نظر سے پلائی جاتی ہے
نہیں ہے طور کے دامن پہ انحصار اس کا
یہ آگ عشق کی دل میں لگائی جاتی ہے
ضرورت اس کی ہے تم بھی شریک ہو جاؤ
کسی غریب کی میت اٹھائی جاتی ہے

عبدالحکیم قاصد رشادی

خودکشی جرم ہے مجھ سے نہیں ہوتی
اس سے شان حیات جاتی ہے
جام بھر بھر کے جلد دے ساقی
میرے رندوں کی بیت جاتی ہے
کیا گزرتی ہے اہل گلشن پر
جب بہاروں کی رات آتی ہے
ایک کم ظرف ہو اگر شامل
ساری محفل کی بات جاتی ہے
یہ پیمانا ہے سلسلہ قاصد
موت آئی حیات جاتی ہے

ف شکست نارسا سے ہیں پیرہنی ہے چاک جنہیں
ل بیکلی اور بیکلی دونوں ہندی کے لفظ ہیں۔ اردو میں بیکلی کا لفظ مستعمل نہیں ہے۔ مرتب

جوگندر پال ایم اے (نیویارک)

فوٹو اور کیمرے

"۔۔۔ ؟"

"نہیں، بی بی جی۔"

"اس الماری میں دیکھا؟"

"ہاں۔"

"الدان صاف ہیں؟"

"دیکھ چکی ہوں بی بی جی۔"

"آخر گیا کہاں؟"

"بڑا پیچھا ماما ہے، کہیں ٹوہ ہی نہیں آتا۔"

"ذرا اور دھیان سے نظر مارو، امرو۔ وہ ذرا سی چیز ہوتا ہے۔"

"ہاں ہوگا تو وہ ذرا سی۔"

"ہاں پلنگ کے نیچے دیکھو۔"

"بی بی جی، پلنگ کے نیچے تو صفائی سے ۔۔۔ دیکھ لیا ہے۔ پتہ نہیں ۔۔۔"

"کیا ہوا؟"

"ہوگا کہاں بی بی جی۔ آج کی تصویریں ہی ۔۔۔"

"تم نہیں جانتیں امرو، وہ میری شادی کا فوٹو ۔۔۔"

"ہمارے ساب کا بیٹا جاگتا پھوٹو بجا رہا ہے۔ بی بی جی، ان نے ہمارے ساب سے پوچھا کیا ۔۔۔ ہے؟"

"اوہ جگی، شادی کوئی روز روز تو نہیں ہوتی نا۔ فوٹو ہماری شادی کے تھے، وہ بھی سون نے ۔۔۔ جانا ہوگا سون کیا ہوتا ہے؟"

"ہوگا سون ۔۔۔ مجھے کیا پتہ بی بی جی۔ آن اپنے بچے سے پوچھیں گی ۔۔۔"

"تو اور تیرا کچھ! ۔۔۔ اچھا چھوڑ یہ باتیں، اور اچھی طرح کر ۔۔۔ پورے پندرہ برس دیکھنے سے لگا کہ ہوگا ہے۔"

"اچھا ہی ماما بی بی جی، جو تم گم ہو گیا ۔۔۔ ساب ۔۔۔ کہ ۔۔۔ ہے۔ ہم ۔۔۔ ہے۔ ہم ۔۔۔ ہے۔ ہم

سچ جاؤں ؟ اپنے منہ سے کہنا، اگلے جنم میں وہ بھی نصیب نہ ہو جائے گا۔"

"یہ باتیں کوئی نہ کرے بی بی جی، میرا تو ہے چار ہ آنا بھولا ہے کہ اگلے جنم تک بھی اس سے دور جا نہیں پاؤں گی۔ وہ تو زبانی ہے۔ آپ کو کوٹھی کی کھاس کاٹنا کہا کہ اب بیچ پیاز بھی کرتا ہے تو حاضروں کی جانی ——"

"تیرہ صاحب کے دانت تو نصف سے زیادہ جھڑ چکے ہیں۔ لیکن جب ہماری شادی ہوئی تھی تو وہ عالم جوانی تھا۔ ہنس ہنس کر موتی پروتا تھا۔ تو ہوٹل کے سوئمنگ پول ——"

"سوئمنگ پول ؟ ——"

"نہانے کا تالاب، —— ہم دونوں ہر روز سویرے باہوں میں باہیں ڈالے تالاب میں اتر جاتے ——"

"او —— میا! آپ دونوں پانی میں اکٹھے اترتے جاتے ؟"

"تم کیا جانو، پگلے بے وقوف ؟ وہاں اندر کئی کئی فیٹ پانی ہوتا ہے۔ کئی کئی میل اندر کے مرد ——"

"او —— میا! میں تو سرم سے پانی میں ڈوب جاؤں۔ میرا تو بچپنا بڑا بے سرم ہے۔ میں نہاری بی بی ہوں، تو وہ بھی سر پھیر کر اپنا منہ گھٹنوں میں دے لیتا ہے۔"

"تم تو کنوارا لڑکا ہو، ہم وہاں کئی کئی گھنٹے تالاب میں نہاتے رہتے، تمہارے صاحب نے وہاں میرے کئی فوٹو اتارے تھے ——"

"م —— یا! آپ نہاری ہوتیں اور صاحب آپ کے ——"

"ہاں، صاحب میرے فوٹو اتارتا رہتا بڑے شوق سے۔ اگر وہ فوٹو نہ ہوں تو کوئی دوسرا تو کیا، کچھ خود ان بہاروں کا یقین نہ آئے ——"

"اگر ایم نہ ہو تو میری یادداشت کو جانے کی کیسی کھلی تمہارے صاحب کہ وہ فوٹو دکھاتی ہوں تو اس کے ہونٹوں پر میرا وہ بھولا بھالا نام آجاتا ہے —— بھیلی، ورنہ کئی کئی دن مجھے میرا نام تک نہیں آتا۔ بس ساری ساری رات اپنے کاروبار کے کاغذوں پر ہی منہ گھسائے رکھتا ہے ——"

"یہ پڑھنا لکھنا ہے تو بڑے کام کی چیز —— میرا تو جی بھی کہتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر بڑی بڑی نوکریوں پر لگا دیں گے۔ پر بی بی جی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی پڑھ لکھ کر دل کی بات بری کیا کچھ ہو جاتی ہے ؟"

"تم بڑی جاہل ہو ——"

"وہ تو ٹھیک ہے ایم بی بی۔ پر دیکھو نا، صاحب دفتر کے کاغذوں سے پیار کرتے ہیں۔ آپ بچوں کے کاغذ کے لئے پاگل ہو رہی ہیں، ہے تو یہ آخر ردی کے کاغذ ہی کھوٹے سکے کا سانس بھر تو ہوا ڈھانچہ تو نہیں ——"

"تم سمجھا کر کیا جانو اندو ؟"

"میں تو سمجھ یہ جانوں بی بی جی، کہ میرا بچپنا اگر مر جو جائے تو سویاں کھوب کھوب کر بھی ہاتھ آتی ہے"

"بھیلی —— مجھے اس ایم کے بغیر یوں لگ رہا ہے کہ میری شادی ہی نہ ہوئی تھی۔ میں کبھی ماں بن ہی نہ تھی۔ مجھے تو تیرے صاحب کی وہ شکل بھی بھول رہی ہے اور جب وہ دو ماہ بعد کے ہمارے گھر آنے کا —— وہ بھی بھول رہی ہے۔ اگر مجھے ایم نہ ملا، تو میں سب کچھ بھول جاؤں گی —— سب کچھ بھول جاؤں گی اندو! ——"

"آپ کی آنکھوں میں سنجو، بی بی جی ؟ جرا سانتی سے کام لو ——"

"اس میں ہمارا ایک گروپ فوٹو ہے، ہم سب کا ——— ہم سب کا ؟ —— کون کون سے تھے بھلا ؟ —— کون کون —— فوٹو دیکھو، سارے پیچھے دفنا سے اتر گئے ہیں —— کوئی سامنے آتا ہی نہیں۔ یوں لگ رہا ہے —— یوں لگ رہا ہے، جیسے وہ سارا زمانہ خلاؤں سے اوجھل ہو گیا ہو! —— اندو ——!"

"بی بی جی —— تالا کھل گیا!"

"دیکھو —— ے —— کھو! ضرور یہیں رکھا ہوگا ——"

"ے —— یہ ہے بی بی جی! یہ لو!"

"ہے —— ہی —— ہاں! یہی ہے! لاؤ! —— یہ دیکھو —— دیکھو! یہ میں تمہارے صاحب کے گلے میں ہے ہار ڈال رہی ہوں۔ میں یہ کہتی تھی ان دنوں تمہارا صاحب سالم جوان تھا ؟ —— اور یہ دیکھو، یہ ہم دونوں ہنی مون پر پھیرے لے رہے ہیں! یہ ہم لوگ دفتر کی طرف چڑی چڑی تک رہے ہیں۔ تمہارے صاحب کی آنکھوں میں کتنی شوخی ہے! ہائے کتنی پیاری شوخی! یہ پشت پر بیٹھی گرہستی آشرم کی دیوی مسکرا رہی ہے —— اور یہ دیکھو، یہ ہے وہ شملہ کا میونسپل گارڈن —— بھیلی! —— بھیلی! —— یہ تمہارے صاحب کی بھیلی تیر رہی ہے —— یہاں آ گئی —— یہاں سیدھی —— اب میں غوطہ کھا رہی ہوں —— اب یہاں آ گئی ہوں —— اب —— او دیکھو، میں کتنی خوش ہوں! یہ لو بی بی جی

یہ تمہارا خیال ہے! اری پگلی، تم بھی اپنے گنجے کے ساتھ ایک خوش خیال ہو۔ ان دنوں کی کوئی یاد گار باقی رہے گی تو بڑھاپے میں کچھ جی بہل جائے گا۔"

(۳)

"گنجے!"

"ہاں، امری!"

"ہماری شادی کب ہوئی تھی؟ کچھ یاد ہے؟"

"اری پگلی، شادی کی گھڑی ہے، کوئی ساب کی تاریخ تو نہیں، جو دوسرے پل ہی دماغ سے اُتر جائے۔"

"نہیں، بتاؤ بھلا ہماری شادی کا دن کیا تھا؟"

"بدھ والے پورہ کی پورن ماسی، اگیارھا ماگھ یا رات کے دوسرے پہر، پہلی گھڑی کے شروع ہوتے ہی پنڈت جی امام نے ہماری گانٹھ پکی کر دی تھی — اور پھیرا!"

"ارے، تمہیں تو سچ مچ سب کچھ یاد ہے۔"

"اور تمہیں؟"

"مجھے بھی، گنجے!"

"اور تمہیں یاد ہے، جب چھوارہ کھانے کے لئے تم نے اپنی انگلیاں میرے منہ کی ترپھ کی تھیں تو چھوارہ نیچے آن گرا تھا اور میں نے تمہاری انگلیاں منہ میں ڈال لی تھیں —"

"اور تمہارے بابا نے دور سے پکارا تھا۔ اُڑ دشٹ، جورو کی انگلیاں کیوں چبا رہا ہیں، چھوارہ کھا!" — اور میں نے جھٹ اپنی انگلیاں باہر کھینچ لی تھیں۔"

"اور میری بل بل کر ہنستی ہوئی موتیوں کی ترپھ دیکھ کر مر گئی تھی —"

"گنجے —!"

"ہاں، امری —!"

"اچھا بی بی کی شادی کا چھوڑ — کیا کہتے ہیں؟ — وہ! میم گم ہو گیا۔"

"ہم ہو گیا تو کیا ہوا؟ چھوڑ کا کیا ہے؟ چھوڑ ہی تو ہے!"

"نہیں گنجے! وہ تو رو رہی تھی۔ جب تک وہ میم نہ ہو اسی وقت تک ہماری جان نہ چھوٹے۔"

"کیوں —؟"

"کہتی تھی پھیرے کے بغیر مجھے سب کچھ بھول گیا ہے، یہ بھی بھول گیا ہے کہ کبھو میری شادی ہوئی تھی۔"

"چھوڑ ان کاگج کے بندروں کی باتیں — جرا سر چڑھی —"

"گنجے —!"

"ہاں، امری —!"

"چلو، کل ہم بھی ایک چھوڑ بنوا لائیں —"

بی بی کی کہنی تھی۔ بڑھاپے میں پوتے دیکھ دیکھ کر جی جان ہو جاؤ گی —"

"سب بچے کھچے بکواس ہے امرو"

"پر اس میں ہرج بھی کیا ہے، جرا جادو گری ہی رہے گی —"

"اچھا، پہلے جرا اپنی آنکھیں میچو —"

"لو —"

"اب تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟"

"تم!"

"پھر اور؟ —"

"ہاں رتی رتی، چھوا!"

"میں کیسا لگ رہا ہوں؟"

"بڑا سندر سلونا!"

"کاگج کے چھوڑ سے کچھ چھوٹا؟"

"ہاں —!"

"اب آنکھیں کھول دو"

"لو —"

"اور جرا سوچو، آنکھیں بند کر کے تمہارے من میں میرا چھوڑ کیسے بنے گا —"

"کیسے بن گیا —؟"

"سنگ مرمر کی پری، ہری، سنگ یشم کی لیلا! گھر میں کے من میں ہی چھوڑ بنانے کی چاہ ہوتی ہے!"

بیتے کوشہ اور اودھ کے مشاہیر قلم صفحہ سے آگے

کے فیض صحبت میں وہ کر دنیا داد نہ دے سکتی اور پھر بھی قلم تھے شعر و ادب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آہستہ بات کرتے تھے لحاظ علم یہ وہ ہستیاں ہیں جن پر علم کو ناز ہے، اب کوشش ہے۔ مگر ایک یہ عالم ہے کہ انجمن ترقی اردو جیسے ادارے کا صدر اردو زبان تک سے واقف نہیں

ہے ایں قصہ دراز نفس، باید گریست

مولانا محمد علی ضا

ہر بیت کاگج کوشہ میں انٹرمیڈیٹ تک کلاس کو فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ بدایوں کے رہنے والے تھے عربی صرف و نحو اور عروض کے ماہر تھے۔ علمی اعتبار سے ان ہستیوں کی آخری نشانی تھے جن کے علم پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ شعر کا شوق متعلق نہ تھا۔ بالکل سادہ مزاج تھے۔ تقسیم کے بعد جب کبھی کبھی گپ بیٹھا کرتی تھے اب ہندوستان کا کیا حال ہے؟ ہندو مسلم فسادات کیا کیا ہوئے ہیں اکثر اخباروں کی خبریں پڑھ کر جاتا کیں پروفیسر صاحب سوال نہ کریں۔ مگر خود ہی گویا ہوتے، اردو اور مسلمان کا خدا حافظ۔ تقسیم ملک سے وہ خوش نہیں تھے موجودہ حکومت کے رویے سے بھی کچھ کچھ رہتے تھے۔

فضل حسین ثابت کھنوی کا تذکرہ اخباروں میں آچکا ہے وہ بیرکھنوی کے تلمیذ تھے۔ جوانہ اتنیں وقت میں بیرکو انہیں پر ترجیح دی ہے۔ کوشہ کی یہ بھی یادگار اور علمی شخصیت تھیں۔ رام بابو سکسینہ جیسی شخصیت یہاں ریاست دیوان تھی اور موصوف اپنی مشہور و معروف کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے۔ ان کا ایک حلقہ تھا تو کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کیا کرتا تھا۔ یہ کتاب جلد ہی ان کی مالی کی شہرت کا باعث

مسعود شادانی کیمبل پوری

کلی جو مسکرا نہ سکی

شانتی بچپن سے ہی حساس تھی۔ اس کے چہرے کی جاذبیت اور سادگی اور روپ کی دلفریبی انتہائی کشش رکھتی تھی۔ شانتی جب کسی سے بات کرتی تو آنکھوں کے نشیلے انداز اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے تھے۔ وہ بچپن کی دیوالی اور شام کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے اس کی طبیعت میں شاعرانہ رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جس طرح کسی پھول کی پنکھڑی کو جدا نہیں کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح شانتی کو اس کے ماحول سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے ماحول سے جڑی رہتی تھی۔ اس کی ہر ہوس بھری نگاہ اپنی جانب اٹھتی ہوئی دیکھ کر بپھر جاتی تھی۔ وہ ایک پاکیزہ اور شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔

شانتی اپنے باپ گوبند رام کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اپنے باپ کی زندگی کا سہارا تھی اور گوبند رام بھی اسی کے سہارے اپنی بقیہ زندگی گزار رہا تھا۔ وہ شانتی کو اپنے گھر کی لکشمی اور زینت سمجھتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کی روشنی اور خوشی تھی۔ جب بھی شانتی اداس اور غمگین ہو جاتی تھی تو گوبند رام کی پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ جب کبھی شانتی غم زدہ صورت میں ہوتی تھی تو اس کی آنکھوں کی اداسی بڑھ جاتی تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر شانتی کو اداس اور غمگین دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ شانتی جب کم سن اور ناشعوری کی حالت میں تھی تو اس کے سر سے ماں کا پیار بھرا سایہ اچانک ہی گم ہو چکا تھا۔ ماں کی محبت نے اس کے ننھے سے دل کو کافی چوٹ پہنچائی تھی۔

ماں کی محبت کے بعد گوبند رام نے اس کی پرورش و پرداخت کی بڑی گہرائی و نگہبانی کی تھی۔ اس نے اسے گاؤں کے اسکول میں کچھ حد تک پڑھایا لکھایا بھی تھا۔ اسے دنیا کے نشیب و فراز کی تجربات سے آشنا بھی کیا تھا۔ اسے حیا و شرم کا لحاظ بھی سکھایا تھا اور ہر طرح سے اس کی حفاظت و نگہداشت کرتے ہوئے اسے اس کی جوانی کی سرحد پر لا کھڑا کر دیا تھا اور اب وہ جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہی تھی۔

شانتی کو اپنے اطراف اور ماحول سے اسے اپنی بھرپور جوانی کا احساس تک نہ تھا۔ اسے اپنی دوشیزگی کا خیال تک بھی نہ تھا۔ وہ معصوم اور نادان تھی۔ زمانے اور حالات کے ٹیڑھے میڑھے راستے سے انجان اور ناواقف تھی۔ زمانے کی نزاکت سے ناآشنا تھی۔

جگدیش اپنے گاؤں کا بااثر شخص تھا۔ اس کی زندگی عیش و نشاط کے ساتھ گزر رہی تھی۔ وہ غریب تھا اور نہ ہی ایسا لا وسط درجے کا انسان تھا۔ زندگی کو ہنسی خوشی کے ساتھ گزارنے کے لیے اس کے پاس سبھی کچھ تھا۔

گاؤں زیادہ تر شریف گھروں سے آباد تھا۔ لیکن یہ تو ضرور ہے کہ جہاں شریفوں کی بستی ہوتی ہے، وہاں رذیل کا پایا جانا بھی اشد ضروری ہے۔ جس کہ شریف اور رذیل میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس شریفوں کی بستی میں ایک رذیل اور شہدا رام شرو بھی تھا۔ جس کے شر سے گاؤں والے بے حد تنگ آ چکے تھے۔ ساتھ ہی وہ بد معاش، غنڈہ اور بڑے رعب والا بھی تھا۔ اس کے رعب اور اس غنڈہ گردی سے گاؤں کے بھلے لوگ سہمے ہوئے تھے اور خوف زدہ رہتے تھے۔ وہ لوگوں سے اس کی بے حیا اور بے شرم نظریں شانتی کے حسن کا سراپا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی بیمار اور بھوکی نگاہیں شانتی کو بھنبھوڑ رہی تھیں۔ وہ شانتی کو اپنے دل کی ملکہ خیال کرتا تھا۔ اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

اسے جب بھی موقع ملتا وہ راہ چلتے شانتی کے جذبات کو ٹھیس لگاتا۔ اس کی اٹھلاتی جوانی کو دیکھ کر اس پر گندے قسم کے فقرے چست کرتا۔ اس کی طرف مسکرا مسکرا کر ہوس بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اور شانتی انتہائی نفرت اور گھن کے ساتھ اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ رام سروپ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غصہ اور غضب کی لہریں ابھرنے لگتیں۔ اس کی آنکھیں خشم آلود ہو جاتیں۔ اور چہرے پر شدید قسم کی نفرت و حقارت کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ اس کی طرف ایک بھی نگاہ نہیں کرتی تھی

شانتی قریب کے ہی ایک مکان میں ہیتو کی مدد کرتی تھی۔ ہیتو کی بھری آنکھوں میں دکھ اور بے بسی چھائی تھی۔ وہ ہیتو کی زندگی پر سانس لیتی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تھی اس کی روح تھی۔ اس کی زندگی تھی، اس کی زندگی کا سہارا اور روشنی تھی۔ شانتی کو ہیتو سے ایک گہرا اور اٹوٹ پیار تھا۔ وہ ہیتو کی زندگی کی پگڈنڈی میں داخل ہو چکی تھی اور ہیتو بھی اس کا سب کچھ بن چکا تھا اور دونوں کی جدائی دونوں کی زندگی کی مسکراتی ہوئی موت ہوتی ——!

شانتی نے ہیتو کی طرف پیار بھری نگاہوں سے اس وقت دیکھا تھا۔ اس کے دل میں پیار کے جذبات اس وقت جاگے تھے جب وہ اس کی طرف اچانک متوجہ ہوئی تھی۔ اس وقت کھنچی گئی تھی جب کہ وہ ایک دن رام سروپ کی چیرہ دستی کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہو رہی تھی۔ اور

تنہا ملتے ہیں اسے پا کر رام سروپ اس کے گالوں کی سرخی چھین لینے پر تلا ہوا تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کی فریاد کی دردبھری چیخوں کی آواز نے ہیتو کے کان کے پردے کو ہلا ڈالا تھا۔ ہیتو بے تحاشا آواز کے رخ پر دوڑ پڑا اور اس کی اس دوڑ نے شانتی کو رام سروپ کے ظالم پنجے سے چھڑا دیا۔

اس نے رام سروپ کے منہ پر ایک زوردار گھونسہ مارا اور اسے زمین پر گرا کر متواتر گھونسے لگاتا رہا یہاں تک کہ رام سروپ گھونسوں کی بارش سے بے ہوش سا ہو کر زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اور ہیتو نے اس کی قاتل نظر حرکت پر اسے خوب سزا دی

شانتی وہیں کھڑی لرز اور کانپ رہی تھی۔ وہ نفرت کے ساتھ رام سروپ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں اچانک ہیتو کی صورت سما گئی۔ اس کے دل میں ہیتو نے جیسے کہ گدگدی پیدا کر دی۔ اس کے دل میں محبت جاگی اور پھر ہمیشہ کے لئے جاگی رہ گئی۔

ہیتو کی اس غیر متوقع آمد پر شانتی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی اور ہیتو کی طرف پیار بھری نظر یا سے دیکھنے میں محو تھی کہ ہیتو کی آواز اس کے کانوں کے پردے سے جا ٹکرائی۔

"شانتی! بھلا تمہیں اکیلے نکلنے کی کیا ضرورت تھی اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم کہاں جا رہی تھیں ——؟" ہیتو نے پوچھا

"وہ اپنی سہیلی ہے "گوتو" اس سے ملنے جا رہی تھی کہ کمینہ رام سروپ پیچھے لگ گیا اور مجھ سے چھیڑ خانی ....." شانتی کہہ کر شانتی نے ہیتو کی طرف دیکھا اور شرما کر نظریں جھکا لیں۔

"اوہ! وہ تو خیر ہی ہوئی کہ میں وقت پر آ پہنچا۔ چلو میں تمہیں تمہاری سہیلی گوتو کے پاس پہنچا دوں" ہیتو نے شانتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

بھلا شانتی کو کیا انکار ہو سکتا تھا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت اس کے دل میں پیار خاموش گیت

رہی تھی کہ ہیتو سے اس کی زندگی کی آخری سانس تک پیار رہے۔ وہ اس کی زندگی کا محافظ بنا رہے ——!!

دونوں گاندی کی پگڈنڈی کے ٹیڑھے میڑھے راستے کو طے کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جب کبھی شانتی لڑکھڑا جاتی تھی تو ہیتو اپنے بازو کا سہارا دے کر سنبھال لیا کرتا تھا۔ اور شانتی جب اس کی باہوں میں ہوتی تو وہ شدت سے یہی چاہتی تھی کہ ہیتو سے زندگی بھر اسی طرح سہارا دیتا رہے اور وہ اسی طرح قدم قدم پر لڑکھڑاتی رہے، یہاں تک کہ راستہ طے ہو گیا اور گوتو کا گھر نظر آ گیا اور ہیتو اسے الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا رخصت ہو گیا لیکن وہ اس کے خیالوں کے تانے بانے میں الجھی ہوئی کھو سی رہی۔

اور اسی دن سے وہ دونوں ایک دوسرے کے پیار کی بندشوں میں جکڑ گئے تھے۔ دونوں پیار کی ڈوری سے بندھے چلے گئے تھے۔ شانتی ایک بے پناہ جذبے کے ساتھ ہیتو کے دل اور اس کی آنکھوں میں بستی گئی تھی اور ہیتو بھی اسے اپنی روح، اپنی زندگی سمجھتا آیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے یہاں تک کہ دونوں نے ایک دوسرے کا زندگی بھر ساتھ دینے کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

دونوں رات کی تنہائی میں باغ کی خاموش جگہ پر ملتے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوتیں۔ زندگی مسکراتی! پھول کھلتے، بھیاں بجتیں۔ آنکھوں میں زندگی بھر ساتھ دینے کا ایک معجزن پیغام لہریں لیتا۔ اور عہد و پیمان کے پیمانے چھلکتے ——!

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ شام ہوتی اور ہیتو اپنی کشتی پر بیٹھ کر ندی کے اس پار آتا اور شانتی کو اپنا منتظر پاتا۔ دونوں ملتے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چاندنی راتوں کی سیر کرتے رہتے اور جب تارے گردش کرتے رہتے اور یہ دونوں پیار کے ان بھرے جذبات کو پیچھے چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف پیچھے کی کوشش اور جدوجہد کرتے رہتے!

شانتی کی اداسی اور غم ختم ہو چکا تھا اور اب سر تا سر ہر گھڑی خوشی و شادمانی رہا کرتی تھی لیکن اس کے دل میں اس کے چھپے ہوئے محبوب کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ اس کی خوشی کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔

جگدیش رات دن شانتی کی شادی کی فکر میں جلتا رہا کرتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلی آرزو یہ تھی کہ وہ اس کی شادی کسی دولت مند گھر میں کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ شانتی کسی دولت والے محل کی زینت بنے۔ دولت..... دولت!۔ دولت ایک ایسی شے ہے کہ جو انسان کو اندھا، گونگا اور بہرہ سب کچھ بنا دیتی ہے۔ اور اسی دولت نے جگدیش کو بھی وہ سب کچھ بنا دیا تھا جس نے شانتی کی زندگی میں سسکیاں بھر دی تھیں! جس نے اس کی خوشی چھین لی تھی جس نے اس کے ارمانوں کو جلا کر راکھ بنا دیا تھا اور جس نے اس کے دل کے محبوب کو اس کے خوابوں کے شہزادے کو پردیس کے ساتھ چھین لیا تھا ——!

جگدیش دولت کا پجاری تھا۔ وہ دولت کا شدت سے عبد کا اور پجاری سا تھا۔ اس کے دل میں دولت کا بت تھا۔ اس کی للچائی نگاہوں میں دولت کی کوشش تھی۔ وہ ہر صورت اور ہر قیمت پر دولت کو پانے کے لئے شانتی کی شادی کسی دولت مند گھر میں کرنے کی کوششوں میں سرگرداں تھا اور اسے شدت سے ایسے رشتے کی تلاش تھی۔

محلوں کے دوسرے لوگ جگدیش کو شانتی کے جوان ہونے کی بات کہتے رہتے۔

"بھائی جگدیش! زمانہ نازک ہے، جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھنا، محلوں والوں کی نظروں سے اپنے آپ کو گرانا ہے، جہاں تک ہو شانتی کے ہاتھ پیلے کر دو ——!"

جگدیش ان کی باتوں کو سنتا اور سن کر لاپرواہی کے ساتھ ٹال دیا کرتا تھا۔ بھلا وہ شادی بیاہ کی

ہی ہے۔ اب وہی دیکھ۔ سکھ کی بات! قسمت میں شانتی کی شادی کسی غریب گھر میں کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو خود کسی اچھے اور دولت مند گھرانے کی تلاش میں ہوں۔ آہ نہیں کل تو مرد قسمت کا پانسہ پلٹنے والا ہی ... !"

جگدیش نے شانتی کی شادی کے سلسلے میں گاؤں بھر میں اپنے من کی خواہش کے مطابق شوہر کی تلاش کی لیکن وہ اپنے من کی تلاش میں مایوس رہا۔ ویسے تو گاؤں میں بہت سارے نوجوان لڑکے موجود تھے اور شادی پر راضی بھی تھے لیکن ان سبھوں کی ایک ہی بدقسمتی تھی کہ وہ سب جگدیش کے من کے مطابق دولت مند نہیں تھے۔ اور جگدیش کی چاکاٹ نگاہیں دولت مند شوہر کی تلاش میں کوئی دولت والا سمایا ہوا تھا۔

جگدیش قسمت کا دھنی تھا۔ اس کی دولت کی تلاش کامیاب ہوئی اور اسے اپنی دلی خواہش کے مطابق شانتی کا دولت مند شوہر مل چکا تھا۔ اس کی بھائی ہوئی نگاہوں نے آخر اپنے شوہر کو ڈھونڈھ ہی نکالا۔

وہ شانتی کا منتخب شدہ شوہر ایک پچاس سالہ معمر انسان تھا۔ وہ گاؤں کا عزت دار تھا، دولت مند تھا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور جگدیش کو تو صرف دولت مند شوہر ہی کی ضرورت تھی۔ اسے شانتی کو سکھ کے ساتھ رکھنے والا دولت مند شوہر مل گیا تھا۔

دولت کے لالچ نے اسے بالکل اندھا بنا دیا تھا۔ دولت پانے کی ہوس نے اس کی آنکھوں میں سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ اس کی بے رحم آنکھیں اور ظالم پتھر سے دل نے کبھی بھی سوچنا گوارا نہ کیا کہ اس کے اس دولت پن کی دیوانگی سے شانتی کی زندگی کا کیا بنے گا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ شانتی خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ شانتی کے دل میں کوئی اور آ چکا ہے شانتی کا جیون ساتھی کوئی اور ہے اور اسے آتی ہوئی سمجھ نہ آئی کہ شانتی اسے کتنا ظالم اور بے رحم باپ سمجھے گی۔ وہ اس سے کس قدر نفرت کرے گی۔ اس کے ضمیر میں ذرا بھی شرمندگی نہ آئی۔ اس کا دل کشور اور سنگدل سا بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دولت کی ہوس سمائی تھی۔ وہ صرف شانتی کی شادی امیر سے کی خواہش رکھتا تھا۔

اس نے شانتی کی شادی اس کے دولت مند شوہر سے طے کر دی۔ اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی لیکن اس کا پتھر دل نہ پگھلا۔ اس کے ضمیر نے اسے ذرا بھی ملامت نہ کی۔ اس کی آنکھیں ذرا بھی نہ شرمائیں۔ اس کا پیشمان سر ذرا بھی گریبان تک نہ پہنچا۔

اور جب شانتی کو اپنی سہیلی کمو سے اپنے بے رحم باپ کے تمام کرتوت معلوم ہوئے اور جب اس کے باپ کی سنگدلی کا راز منکشف ہوا تو ..... تو شانتی لرز اٹھی کانپ گئی۔ ایک لمحہ خون کی بوچھار نے اسے بے ہوش سا بنا دیا۔ وہ بچھاڑ کر بستر پر گر پڑی۔ رات بھر اپنی قسمت کو روتی رہی۔ اسے اپنے باپ سے سخت قسم کی نفرت اور گھن ہونے لگی اور اس کی نفرت کی شدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ ابھرا۔ اس نے اپنے باپ کی بے رحمی اور سفاکی پر غور کیا۔ لیکن سمجھ سے قاصر رہی کہ آخر اس گناہ کس قصور پر یہ کرب انگیز اور سخت سزا دی جا رہی ہے۔

اس کی شیریں آرزوئے حیات بھائی جا چکی تھی۔ اس کی تمناؤں کی کشتی سیلاب کی زد میں غرقاب کی جا چکی تھی۔ اس کا کنول سا شاداب چہرہ مرجھا چکا تھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں کی رعنائی چھینی جا چکی تھی۔ اور وہ چیختی رہی مسلسل چیختی رہی، روتی رہی اور آنسو گراتی رہی۔

اس نے اپنے دل کی گہرائی سے اپنے محبوب مہتو کو آواز دی لیکن مہتو اس سے بہت دور تھا اور نوکری پر دوسرے شہر جا چکے تھے۔ شانتی کی آنکھوں میں انگنت سوال کر انتظار کی بے قرار گھڑیاں گزارنے کا پیغام دیتا گیا تھا لیکن وہ کیا کہ تاریک راہوں کو تکتی رہی ــــ!

آخر اس نے ایک تاریک رات میں تنہا گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس کا ذہن وہ انتقام لینا چاہتا تھا۔ اپنے کے آخری تدبیر تھی۔ وہ گھر سے نکل کر ایک بار پھر اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت و حقارت کا شدید جذبہ ابھر آیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بے قرار سے پر جا پہنچی جہاں کہ جوانی اور روپ کا سودا ہوتا ہے جہاں کہ جوش بھری نگاہیں جوانیوں سے کھیلتی ہیں ــ جہاں کہ پائل کے گھنگھرو بجتے ہیں، جہاں کہ مشتاق آرزو کا بازار دن رات فروز ہوتا ہے اور جہاں پائل کی جھنکار مست دیوانے خود بخود آتے ہیں۔

شانتی کی جوانی نے اس کا بہکتا ہوا قدم روکا۔ شرم نے اس کا دامن پکڑ لیا اور شرافت نے اس کا دامن تھام لیا وہ ٹھہر گئی۔ لرز گئی اور اس کے ضمیر میں کچھ طوفان سا بپا ہونے لگا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھی اور بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ موت کے دروازے پر جا پہنچی ــــ وہ حسرت بھری نظروں سے دریا کے سیاہ زدہ آثار پڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے دل میں ممتا کی یاد ابھری اور پھر یاسیت میں ڈوب گئی! وہ تاریک راہوں پر تاریکی چھائی رہی ــــ وہ زیادہ ضبط نہ کر سکی اور اپنی فرسودہ و یاس زندگی کو پناہ کی گود میں دینے کے لئے دنیا کے موجزن ظاہر میں کھو گئی! اور وہ فنا کی گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی!

دوسری صبح گاؤں والوں نے دریا کے تیز بہاؤ میں دیکھا کہ ایک نوشگفتہ کلی، جو کھل نہ سکی تھی، جو کے سہارے دنیا کی بے رحمیوں سے رہائی پا کر دریا کی لہروں کی پناہ اور آغوش میں ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی ــــ!!

مصرع طرح طرحی مشاعرہ نمبر ۵۹

چلا تُو جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
روشنی ۔ آگہی فانی ــــ معلوم ہوتی ہے ردیف
غزل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء

بشیر نصرت ۔ ناگ پور

انگاروں میں...

آج جب وہ ڈاکٹر ہاسپٹل سے لوٹ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموشی۔ چہرے پر اداسی و شرمندگی اور نبضوں میں عجیب طرح کی لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ بجھے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہی آرام کرسی پر بے جان لاشے کی مانند گر پڑا اور پھر آنکھوں کو بند کئے تصور کی دنیا میں گم ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ کی وادیوں میں تخیلات ماضیہ کے بے شمار منظر ابھرنے لگے۔

جب اس کا چمنستان دل بہاروں کی کلیوں سے محروم تھا۔ جب اس کی آنکھیں نہ میل دل کے ہنگامے و شورشیں۔ لیکن اس کی زندگی میں نغمہ بیلی بار بہاروں کی بہاریں لے تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ نغمہ کی آمد سے اس کی مرادوں کی محفل میں نکھار ہی نکھار پیدا ہو گیا۔ اس کے امنگ و جذبات کے سرچشموں میں تیز تر دریاؤں کی روانی پیدا ہو گئی۔ اس کے احساسات کلیوں سے زیادہ نرم و نازک اور بہاروں سے زیادہ حسین ہونے لگے۔ اس کا محروم بہار چمن تمناؤں اور مرادوں کی کلیوں سے مہک اٹھا۔ اس کی بے کیف صبح و شام صبح بنارس اور شام اودھ کو شرمانے لگیں۔ وہ اپنے تمام تر اتفاقوں کو نغمہ کی نایاب سنگی ہر بریات اور اپنے دل کی کیفیات کو لفظوں میں قید کیے قرطاس پر بکھیر دیتا۔ اس کے ہجر و وصال کی نازک گھڑیوں کی یہی روداد میں اس کی زندگی کی حسین تر اور قیمتی سرمایہ تھیں، وہ ایک ایسا آئینہ تھیں جس میں وہ اپنی زندگی کے ان لمحوں کا لطیف ترین عکس بھی دیکھ لیتا جو نغمہ سے متعلق ہوتا۔

اکثر راتوں کی جاں گسل تنہائیاں، چاند ستاروں کی کنواری مسکانیں اس کے فرط غم کو گدگدا تیں، اس کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ ڈالتیں، وہ تڑپ اٹھتا۔ بے خود سا ہو جاتا، جب تصوراتی پیکروں پر نغمہ کی انگشت یا دیں انگڑائیاں لیتیں، وہ بے خیالی میں قریب پڑے کاغذ قلم سنبھال لیتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا خود سر قلم غیر معمولی رفتار سے کاغذ پر رینگنے لگتا۔ جب وہ اُمڈتے ہوئے جذبات کو لفظوں میں سمو دیتا۔ اس کا دل قدرے سکون محسوس کرتا۔ پھر وہ لفظوں میں جکڑے ہوئے جذبات کو حد درجہ احتیاط و حفاظت سے رکھ دیتا۔ اس طرح ہر روز وہ صحیفہ محبت مرتب کرتا رہتا۔

ہر صبح کے بعد شام اور ہر شام کے بعد ایک نئی صبح جنم لیتی رہی۔ تا فلک وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا حالات کی گرد اڑتی رہی۔

آج وہ ڈاکٹر ہاسپٹل میں ایک بستر کے جوف نغمہ سے ملا تھا۔ نغمہ کے چہرے سے حسن و جاذبیت کی ساری لکیریں اس کی مہلک بیماری نے کھرچ ڈالی تھیں۔ اس کے معصوم، سفید سُرخی مائل چہرے پر خزاں کی مریضانہ زردی منڈلا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے پڑ گئے تھے۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ اس کے جسم میں روح تو ہے مگر وہ سسکی گھٹی گھٹی۔ وہ زندہ ہے مگر بہار زندگی سے کوسوں دور۔

ایک مہیب ناکامی کے ساتھ بادل کی گرج، پھر سکوت کی وادی میں گم ہو گئی۔ اس کا مرغ تخیل پھر تیزی سے پرواز کرنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے نغمہ کی گزری محبت رقص کرتی محسوس ہونے لگی۔ پھر اس کی خاموش اور اداس کے بعد اس کی جفاؤں پر بے اختیار یاں نگاہوں میں جھوم گئیں، وہ تڑپ اٹھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہاسپٹل میں نغمہ نے اس سے کہا تھا "شکیل! تم مجھے صبر سے اپنے کی کوشش کرو اور میں تمہاری کوشش کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں، میری دعائیں، میری دعائیں بلکہ یہاں تک کہ تم مجھے ہی سرے سے بھول جاؤ، اچھے شکیل اب پھر مجھے چھونے یا میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ تو تم بھی جانتے ہی ہو کہ سماجی اعتبار سے بھی میرے کفن پہنے کو دیتے ایک عرصہ ہو گیا، اس نے مجھے جانتے جانتے "بیوی" بنا دیا ایک ایسی بیوی جو زندگی بھر اپنے شوہر سے پیار و محبت — جذباتی تسکین کی بھیک مانگتی رہی۔ مگر..... خیر چھوڑو، تم تو سماجی نظریے سے ابھی کنوارے ہو۔ ابھی تو تمہارے سہرے کی کلیاں کھلنی ہیں۔ جن کے رنگ و بو تمہارے اعزار و اقربا کی دیرینہ تمناؤں کا چمن مہک اٹھے گا۔ مگر میرے شکیل! تم اپنی شادی کی اس تیرہ بخت کو بھول جانا۔ میں نے اپنی زندگی کے بچے کھچے دنوں میں یہی ایک تمنا کی ہے۔ بلکہ..... ہاں شکیل تمہیں ایک بہت بڑا کام کرنا ہے۔ ایک بہت بڑی قربانی — میں آج تم سے اپنی وفاؤں کی قیمت، اپنے حسن و شباب کی قیمت طلب کر رہی ہوں، بولو — بولو شکیل دو گے نا! بولو — بولو —!"

"ہاں —!"

"تو پھر سنو، تمہیں کیا کرنا ہے، دیکھو شکیل، تم وعدہ کرچکے ہو مکر نہ جانا، تم نے آج تک مجھ سے خلاف کر کے جتنے بھی خطوط لکھے ہوں یا تمہارے پاس میرے متعلق جتنی بھی تحریریں ہوں ان سب کو اپنے ہاتھوں

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

تذکرہ ۔!

صمد حمیدی

جنید علی بلڈنگ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

شہر بانو جبیں نے اپنے ماتھے کے پسینے کو پونچھا وہ شراب جو ہر بجلی کے یکایک فیل ہو جانے سے ہر پنکھا، طرف تاریکی کا راج ہو گیا تھا۔ موم بتی جھلمل جھلمل کر جل رہی تھی۔

"اکی ۔۔۔ ابھی تک لوٹی نہیں حالاں کہ اس مرد کو گئے کافی دیر ہو چکی ہے۔"

شہر بانو جبیں بڑبڑانے لگیں۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اماوس کی کالی راتوں کا گمان گزرتا تھا۔

"دھپ دھپ" سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ اس کے سامنے عارف علی جبیل کھڑا تھا۔ اکی آئی کا لفظ کانوں میں پڑتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں بہوت ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

عجیب عجیب سے خیالات اور وسوسے دونوں کے دلوں میں جاگ اٹھے۔ عارف علی جبیل نے سیڑھیاں طے کر جانے اور شہر بانو جبیں نے دل کو مسوس کر رہ جانے کی میں اپنی غیریت سمجھی۔

باپ بیچارہ تو پرشادنے کیا مصلحت سمجھی کہ مورونی مذہب کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لیا۔ لڑکے لڑکیوں کے ناموں نے بدل کر رکھ دیئے۔ ایک بھائی کو لیڈی کے شوق نے لبھی کا نہ رکھا۔ دھن، دولت سب اس پر نچھاور کر کے بیٹھ رہا۔ بڑا بھائی ہونے کے ناتے انھوں نے اس کو بہت سمجھایا لیکن جوان پر بڈھوں کی بات کا اثر کب ہوتا ہے جو کہ اس پر ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے ڈھب پر اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔

فیروزہ بانو جبیں اور شہر بانو جبیں کی شادی انھوں نے خان بہادر جنید علی صاحب کے صاحبزادے مکرم علی اور عارف علی سے کر دیں۔ بقیہ ایک لڑکی کی بات چیت جو ابھی سب سے چھوٹی تھی اپنے ہاتھ میں رکھ

خان بہادر جنید علی نے ٹھیکے داری میں کافی روپیہ اور نام کمایا تھا ایک انگریز افسر کی مہربانی سے بڑے بڑے آفیسروں سے ملنا جلنا۔ ان کے درمیان اٹھنا بیٹھنا تھا وزیر گورنر سب سے میل ملاقات تھی۔

اپنی سوجھ بوجھ اور عقلمندی سے اس درجہ ان کو خوش کر دیا کہ سرکار گورنر بہادر نے ان کو خان بہادر کا گراں قدر خطاب مرحمت فرمایا۔ جنید علی ایمان بہادر جنید علی تھے۔ شہر میں ان کی دو سو بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ زمین جائداد تھی۔ تانبے کی طرح ان کا چہرہ برابر تمتمایا رہتا ہر کہہ و مہ ان کے سامنے جانے میں اب خوف کھاتا۔ البتہ ان کا منہ چڑھا نوکر بنواتی کبھی خوف نہیں کھاتا لڑکے سب کوئی نہ کوئی ڈگری نہ لے سکے۔ میٹرک اور آئی اے سے کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ پتہ نہیں کیوں؟ حالاں کہ روپوں کی کمی نہ تھی۔ خان بہادر کے پڑھانے کی لگن۔ شاید باپ کے مالی زندگی نے بے جا گھمنڈ میں مبتلا کر کے اطمینان کی سانس لی۔ بڑا لڑکا کفیل الرحمٰن کفیل قانون پڑھ رہا تھا۔ خان بہادر جنید علی اس پر لٹو ہو گئے اور اپنی بیٹی نخشب کے لئے اس کو مانگ لیا۔ چھوٹا لڑکا وجیہ الرحمٰن وجیہہ ابھی بہت کم سن تھا اس لئے اس کی ابھی چنداں فکر نہ تھی۔ پڑھ لکھ کر فارغ تو ہو لے، پھر دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اس فکر میں گھلنے سے فائدہ؟ انھوں نے سوچا۔

بڑے بھائی نے کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور کچھ کرنے کی ٹھان کر کچھ کر دکھایا۔ مجھلے نے اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اور خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آئے۔ چھوٹے نے جائداد کی دیکھ ریکھ میں اپنی فراوانیٔ کو لگا دیا۔ لیکن آزادیٔ ہند کے بعد زمانے نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ بڑھتے ہوئے اخراجات خود کفیل کے منہ پر طمانچہ مارتے نظر آئے۔ نتیجتاً زمین و جائداد بکتی چلی جاتی اور پریوار دن بدن بڑھتا چلا جاتا۔

خان بہادر یہ سب دیکھ کر کچھ نہیں کر سکتے چہرے کا رنگ اب بھی تانبے کی طرح دمکتا تھا۔ لیکن اس میں اب وہ ملاحت اور دلکشی باقی نہ رہی تھی۔ گھٹیا نے تو اور جان پر بنا دی تھی اور وہ چارپائی پر لگ سے لگ گئے تھے۔

فیروزہ بانو حسین اور شہر بانو جبیں جب اپنے ننھے بچے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے آنسو روکتے ہوئے کلثوم، مکرم علی اور عارف علی نے بہلا دلا کر ان کے سب زیور میاں جنوں کے یہاں پہنچا دیئے تھے۔ بچی کھچی پونجی سے علی انڈسٹریز" قائم کر کے شاندار پنشن اور جان گنتے رہتے۔

فیروزہ بانو آگ بھبھوکا ہو رہی تھی۔ جرأت نہ تھی کہ عارف علی جبیل کا منہ کھسوٹ لیتی جس نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔

شہر بانو حسین بھی کم اپنے شوہر کو صورت نہیں دیکھتی ہے۔ بے چارہ بھیگی بلی بنا سب باتوں کو سنتا، اور ہوں ہاں کرتا رہتا۔ بڑا شریف، نفیس اور نیک طبیعت انسان تھا۔ لڑائی جھگڑے سے دور ہی دور رہتا، حتیٰ کہ اپنے چھوٹے بھائی کی بدباتیں خاموشی کے ساتھ سن لیتا، لیکن منہ نہیں لگاتا۔ بڑا ہونے کی حیثیت سے جو ٹھہرا۔

کبھی کبھار دونوں بہنوں میں وہ تند و تیز ٹکر ہوتی کہ ہنگامہ اور لڑائی بھڑکا کر بچے سب اگل منہ لگتے رہ جاتے۔ سوچتے ہاں۔ بچی اماں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم جھوٹ کر میاں میں بھی ہیں۔

عاشق علی بیل نے جب بریسلیٹ کی جوڑی شہر بانو حسین کی خدمت میں پیش کی تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ اسی کی ہے یا غیر زندہ بانو حسین کی۔؟

تعجب انہ نظروں سے وہ عاشق علی کو دیکھتی رہی، سوچتی رہی "عاشق علی کتنا بھلا آدمی ہے۔ میرا کتنا خیال رکھتا ہے"

عاشق علی بیل نے اپنا قرآنہ چھیڑ دیا۔

شہر بانو پسینے پسینے ہو گئی۔ خوبصورت چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا سن رہی ہے اور عاشق علی کیا بک رہا ہے۔؟

لڈن بیٹا دوڑتا دوڑتا آیا اور ماں کے آنچل کو کھینچنے لگا:۔

"اماں اماں نیچے چھوٹے ابا اور چھوٹی اماں میں خوب زور کی لڑائی ہو رہی ہے، چل کر چھڑا دیجئے نا"

غیر زندہ نے دیکھتے ہی کچھ کہنا شروع کر دیا:۔

"ابا میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ ایسا کریں گی، دنیا سے انسانیت اور شرافت نام کی چیز کا بالکل خاتمہ ہو گیا شاید"

غیر زندہ بکتی جھکتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ بکتی رہی اور پھر اکڑا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

"آخر کون سا جھوٹ سے قصور ہوا جو غیر زندہ مجھے بلا وجہ الزام ٹھہرا رہی ہے۔"

کرم علی گل نے اندھیرے کمرے میں تڑپ رکھی اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ صبح ان کے جانے کا تھا کہ شہر بانو حسین نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں، نہیں، اس طور ٹھیک ہے روشنی نہ کیجئے۔ مجھے روشنی کی نہیں، تاریکی کی ضرورت ہے"

کرم علی گل کو شہر بانو کی گفتگو سمجھ میں نہ آ سکی گھپ اندھیرے میں اپنی بیوی کے طباق سے چہرے کو کھوجنے لگا۔

شہر بانو کتنی حسین ہے اور میں کتنا بدصورت ہوں چہرے پر بڑا سا زخم کا نشان اور بھی میری بدصورتی میں اضافہ کئے دیتا ہے"

اکی آئی اور کچھ عورتوں کے آنے کی اطلاع دے کر غائب ہو گئی۔ وہ اٹھی اور بادل ناخواستہ ان سے ملنے کو چل دی۔

گفتگو کا سلسلہ جو شروع ہوا وہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ باتیں بھدی تھیں لیکن کوکا اور چھوڑ نہیں رہا تھا۔ خاصی رات گئے عورتیں رخصت ہوئیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اکی نے کھانے کے لئے پوچھا، لیکن وہ ناسازیٔ طبع کی شکایت کر کے آرام کرنے چلی گئی۔

کافی رات گئے اس کی نیند ٹوٹی۔ کرم علی گل پلنگ پر دراز خراٹے بھر رہا تھا۔ میاں لڈن بیچ میں لیٹے میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ وہ اٹھی اور اکی اکی کی آوازیں دیتی غسل خانے میں جا گھسی، جھنجھلاہٹ کی آواز الجھری اور کسی نے اس کو اپنے پہلو میں زور سے کھینچ لیا اپنے حواس مجتمع کر کے دیکھا، وہ دوسرا کوئی نہیں عاشق علی بیل تھا۔

بھوکے بھیڑیئے کی مانند عاشق علی اس پر ٹوٹ پڑا، اکی آئی اور دونوں کو دست بگریباں دیکھتی رہی شہر بانو نے بالآخر گلہ پھاڑ لیا۔ صبح ہر خاص و عام کی زبان پر شہر بانو حسین کی فراخدلی کے تذکرے تھے

بقیہ آل انڈیا مشاعرہ (صفحہ ۱۵ سے آگے)

کہنہ مشق بزرگ شاعر۔ ایک شعر آپ بھی سنئے

کوہ کو گلشن بہ گلشن جس کی شہرت ہو مدام
دل کے آئینے میں ایسا ماہرو رکھتا ہوں میں

آپ ہیں بڑودہ کے ایک اور کہنہ مشق شاعر حضرت عاشق القادری صاحب۔ سنئے ؎

آئینہ نگاہ میں مانا کہ تم نہ تھے
لیکن تمہاری شکل کا کوئی ضرور تھا

عاشق صاحب کے بعد اپنے بزم اثر کے (بزم اثر نوساد) صدر اور کہنہ مشق شاعر جناب مصور صاحب تڑیا دوی سے التجا کی گئی ہے۔

اس وقت رات کے تین بج چکے ہیں۔ لیکن ثمر اختر گوالیاری کا شعشہ اندوری۔ اثر ہمت نگری اور علاؤ الدین صابر کو دوبارہ سننے کی فرمائش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ کاشف اندوری اور اختر گوالیاری کو بار بار پڑھوایا جا چکا ہے اور علاؤ الدین صابر بھی دو مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے تا قم شاعر نے حضرت مصور صاحب قریشی پروفیسر ڈگری کالج بڑودہ سے درخواست کی کہ اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین اور شعراء کرام کو محظوظ فرمائیں۔ سنئے کتنی مرتبہ غزل فرما رہے ہیں۔

اس کو بھی تیری یاد نے دل کش بنا دیا
کرنے لگیں نہ پیار کہیں زندگی سے ہم

اب قریب ساڑھے تین بج چکے ہیں اور مصور صاحب کے پڑھنے کے بعد ناظم مشاعرہ شرر صاحب نے مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان کیا اور سبھا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا لیکن اب بھی بیرونی شعراء کو سننے کا اشتیاق تھا مگر طلب کے باوجود کسی کو نہیں پڑھوایا گیا اور بزم ادب بڑودہ کا آل انڈیا مشاعرہ خیر و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۷

مصرع طرح

موسم گل ہے نہ اب جوش ہے دیوانوں میں

غزل کے ساتھ ڈاک طرحی مشاعرہ واپس کے متبادل چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں۔

ثالث طرحی مشاعرہ
حضرت مولانا ابو احسنی گنوری

قیصر انجمنی

ڈوب جاتے ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
مشق کے ساتھ حیا بھی ہے پریشانوں میں
ہم تو گلشن میں بھی گلشن ہے بیابانوں میں
تشنگی کا ہے گلہ آج بھی میخانوں میں
اب درندوں کے کہاں ہیں انسانوں میں
دیکھ تعمیر کی اک جان ہے ویرانوں میں
مسکرا دیں تو کھلیں پھول بیابانوں میں
کتنے افسردہ ہیں دیوانے مگر اے قیصر

ہدایت اللہ ہادی ناگ پوری

گریباں جم گئیں جن جن کی بھی ایوانوں میں
ہوئے وحشت نہ جب انسان کا سامان بہا
شیخ کیا مے کشی سے کوئی نسبت ہے تو بہ
شب کو میخانوں میں جو امید ہے کچھ رشوت کی
کون کافر کو مسلماں تو کوئی ہے بے دیں
نیچے منبر ہیں اب دین متیں کے حامل
تا بکے مرثیہ آپ ہی کا پڑھیں گے ہادی

حافظ تسہر ناگ پوری

ناخدا اہل جنوں کم نہیں انسانوں میں
التجا اب کوئی باقی نہیں انسانوں میں
حلق یک طرفہ عدالت کا طرفدار نہیں
چھلکاتے ہیں یہ فیضانِ نگاہِ ساقی
خوش کے ذروں کو بھی عرش دکھا سکتے ہیں
ایسے کتنے ہیں جنہیں آتا ہے پینے کا شعور

ہاتھ دھو لو کہ نگاہوں کا تبسم ہے تسہر
بجلیاں بھوکی ہیں کس نے مرے ایوانوں میں

تسنیم احمد فہمی اورنگ آبادی

ڈھونڈھے سے بھی نہیں اخلاص ایسے انسانوں میں
دل بہلتا ہے حرم میں نہ صنم خانوں میں
عقل و دانش کی زمانہ میں کوئی پوچھ نہیں
پھر بدلتا نظر آتا ہے گلستاں کا نظام
سوزِ دل سوز جگر آج فزوں ہے ساقی
اپنے دامان دگریباں کی حفاظت کر لو
جھانکنے کے لئے ہستی کو سنایا فہمی
عاقبت قدر کی سیمابی بھٹکے

خبر موسم گل آئے گی جب کانوں میں
پیتے پیتے ہی بکھر جاتے ہیں پینے والے
جب اڑے جذبہ تعین سے پرے جا پہنچے
مے پرستی کا یہ عالم ہے الٰہی توبہ
رات دن جھگڑتی رہتی ہے یہ خانوں
رات دن جھگڑوں بکھیڑوں سے فرض ہے انکو
وہ جو ہاتھوں سے پلاتے ہیں تو پی لیتا ہوں
وہ اٹھاتے رہے اپنے رخ تاباں سے نقاب
علامہ بیباک تک بندی

تفرقہ ڈالتے رہتے ہیں جو انسانوں میں
مسجدوں میں نہ ہے گا نہ صنم خانوں میں
سو کے یہ بات مجھے آج بڑا رنج ہوا
پارسائی کا سبق آج کے دیتے ہیں ہمیں
ایک دن اُن کو بتا دیں گے یہ ظالم انساں
اچھے اچھوں کو کئی بار پچھاڑا ہم نے
آپ کے سر کی قسم حلق کے پیمانوں

ساقیا لاکے کشتری لگا دے منہ سے
تاکہ مجھ کو بھی ہو جینے کا پیمانوں میں

نیر خان کی نعتیہ

جنونِ وحشت تو نہیں ہے ترے دیوانوں میں
دیکھ لی کیسی یہ لُو تُو نے بیابانوں میں

آ شبِ وصل دکھائے گی جب کچھ ہے خانوں میں
خونِ بلبل کو نہ دے گرمیٔ برق کی پیمانوں میں

ہی کے قہرِ مرے عیبوں پہ نکلنے والے
صدقہ اس بات کا کہ تجھ سے ہیں پردہ والے میں

دورِ ظلم و ستم ہی گئی انسانوں کو
آدمیت کی کمی رہ گئی انسانوں میں

ہر طرف دشت و بیاباں کی طرح ذاکر اڑے
خونِ فرہاد جو شامل نہ ہوا بانوں میں

ان کا شیرازۂ ہستی نہ پریشاں ہو جائے
اُن کی زلفوں کا نہ ہو ذکر جو پریشانوں میں

حق نہیں خار کا کیا کوئی گلستاں پہ نہیں
صدقہ کیا پھول ہی رہتے ہیں گلستانوں میں

نظر سوختی

مشورے ہونے لگے پھر ترے دیوانوں میں
بستیاں پھر نظر آنے لگیں ویرانوں میں

مسکرا کر تجھے اُس شوخ نے دیکھا جیسے
اک شعاعِ صبا پیدا ہے مرے ارمانوں میں

وحشتِ دل کی قسم اہلِ خرد میرے بعد
خاک چھنتی نظر آئے گی گلستانوں میں

یہ بھی جام سے مدہوش ہیں بیگانوں میں
کوئی تمیز مے و خوں ہی نہ اے ساقی

دل جلانے کی روشِ شمع سے بدلی نہ گئی
آج بھی شانِ وفا ہے یہی پروانوں میں

خون مظلوم سے ہے آج چراغاں جن میں
تیرگی چھائے گی اک دن انہیں ایوانوں میں

شیخ سلیم سوختی

حل نہیں ہوتے مسائل کبھی ایوانوں میں
تجربے زیست کے ہوتے ہیں بیابانوں میں

آج ہر حرمتِ آزاد کے رہبر ہیں یہی
زندگی بھر جو مقید رہے ایوانوں میں

دیکھ کر خندۂ گل اے دلِ گلچیں تم یاد آئے
بڑھ گئی وحشتِ دل اور گلستانوں میں

اس طرح آج ہے برپا جہادِ دنیا کا نظام
آدمیت نظر آتی نہیں انسانوں میں

دل میں اپنی خود شوق سے ہے اگر
آج بھی اہلِ جنوں بستے ہیں ویرانوں میں

غیر ممکن ہے حدیں اس کی سمجھ کر تا
سجدوں ہی میں ہے سجود و بتِ خانوں میں

سیوکی نازکی احسنی شکوہ آبادی

(۱)

تو ہر رنگ کی موجود ہے پیمانوں میں
ظرف جو چاہئے باقی نہیں انسانوں میں

مرفرست جو نام اپنا سجا دیوانوں میں
ہیں سبھی اپنے کو سمجھنے لگے فرزانوں میں

جو کہ بدنام ہوئے ہیں ترے دیوانوں میں
ہستیاں ایسی کہاں ملتی ہیں انسانوں میں

کینۂ و بغضِ تعصب کے اگر تخم پڑیں
خاک اڑنے لگے سرسبز گلستانوں میں

ہر شکن ہے یہ جبینوں سے شکایت مجھ کو
چلتے اوقات تھے اپنے وہ ہیں بے گانوں میں

رنگ لاتی ہے بہارِ عدل میں وحشت ناز کی
موسمِ گل ہے نہ اب جوشِ ہے دیوانوں میں

گیا پہ ساد خوندی (رنگ)

بھر گئے زخم خود بخود جا کے بیابانوں میں
پڑ گیا فرق جب سے ترے مستانوں میں

نزہتِ بادۂ الست جو تری آنکھوں سے ملی
بعد ساقی وہ کہاں ہے مے و پیمانوں میں

ذکر تجھ کو نہ دیا فرصتِ دو جس سے ہٹ کر
تجھ کو اپنے ہی نظر آئیں گے بیگانوں میں

کیا زمانہ ہے کہ فرمانِ الٰہی ، تو یہ ہے
سسکیاں لیتے ہے پیغامِ ہدیٰ زندانوں میں

ان کا مرجانا ہی بہتر ہے خودکشی جینے سے
زندگی جیتے کی بسر ہوتی ہے احسانوں میں

اسماعیل نوریؔ مالی کاغوی

موسمِ گل ہے شباب جوش ہے دیوانوں میں
ذکر اُلفت ہے ہر اک بات گلستانوں میں

دوستو حق کے لئے جان جوکھوں کرنے
آج ایسا کوئی انسان ہے انسانوں میں

اہلِ گلشن ہو مبارک تمہیں گلشن کی بہار
مطمئن آج بھی کچھ لوگ ہیں ویرانوں میں

ظلم پر ظلم مسلسل جو کیا کرتے ہیں
ہم سمجھتے ہیں انہیں اپنے نگہبانوں میں

قیامت اور بپا اور بپا اور بپا
ہوش باقی ہے ابھی کچھ ترے دیوانوں میں

ہر خوشی دے کر جو کر دیتے ہیں فیروں پہ نثار
دین انسان تو انسان ہیں انسانوں میں

خضر ناگ پوری

اب تو ہوتا ہے مرا ذکر بھی فرزانوں میں
مجھ کو کہنے لگی دنیا مرے دیوانوں سے

جس سے پاک زمانے میں ہے کسی کا دامن
دیکھیں ہستی ہے ابھی اپنے گریبانوں میں

غم کے ماروں کو محبت نے بصیرت دے دی
زندگی ان کو نظر آئی بیابانوں میں

ساقیا آج تو اٹھتا ہے دھواں بھی اردو
تو نے کیا آگ لگا دی مرے میخانوں میں

نصیر گلچن کا تو فقط نام ہے ورنہ اے دوست
کار فرما ہے وہ گل اندامِ گلستانوں میں

خضر کہتے ہیں اسے ذوقِ ادب کی تکمیل
آ گیا نام ہمارا بھی سخن دانوں میں

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتح پوری

مے کا گل رنگ نظر آتی ہے پیمانوں میں
مستیاں جھومتی رہتی ہیں مے خانوں میں

شرفِ خونِ شہیداں ہے جو عنوانوں میں
گل بھی شامل ہیں ترے چاکِ گریبانوں میں

وحشتِ دل مجھے لے چلی کہیں انسانوں میں
دل بہلتا نظر آتا نہیں ویرانوں میں

دل کی جو بات ہے رہ جائے گی دل میں آخر
کوئی سمجھے گا نہ اپنوں میں نہ بیگانوں میں

اب محبت ہی محبت کے لیے چرچے ہر سو
ایک ہی رنگ نظر آتا ہے انسانوں میں

ڈوبنے والے ہیں وہی ناخدا بھی طوفانوں کا
ڈوب جاتے ہیں جو بڑھتے ہوئے طوفانوں میں

محمود عباسی دیوانہؔ

جھانک کر دیکھئے تہذیب کے ایوانوں میں
کوئی انسان بھی ہے آج کے انسانوں میں

جب سے بدلا ہے نظام مئے و مینا ساقی
اک بصیرت سی نظر آتی ہے میخانوں میں

جن کو دیکھا نہ سنا تھا کبھی افسانوں میں
کتنے افسانے ہیں ویسے ہی ان انسانوں میں

قدرِ عافیت ساحل وہی کرتے ہیں فقط
زندگی جن کی بسر ہوتی ہے طوفانوں میں

ں سرِ شام خیالِ رخِ دوست
جل گئیں شمعیں تخیل کے شبستانوں میں

ا پھر کوئی محمود بہادے دل سے
کتنے صیاد ہیں گلشن کے نگہبانوں میں

ہ مروت نہیں الفت نہیں انسانوں میں
اب تو اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانوں میں

وش بدوش نہیں ہوتا ہے پیمانوں میں
حسرتِ مرگ ہوا کرتی ہے دیوانوں میں

وت کی باغ میں کل تک جو تھے فرِ گلشن
آہ وہ خاک بسر پھرتے ہیں ویرانوں میں

ہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے
خاک اڑتی سی نظر آتی ہے میخانوں میں

کوئی کیا کچھ سیاست کرتی اے ساقی
خلشِ دل ہے کہ مٹائے سے نہیں جاتی ہے

آدمی سینکڑوں ملتے ہیں جہاں میں لیکن
کوئی انسان نہیں ملتا مگر انسانوں میں

مقصد دلشتری - اندور

ہرا فتا ہے دیوانوں کو دیوانوں میں
دیں فرحت کا نہیں نام شبستانوں میں

شمع جلتے ہی پتنگے آ ہی پہنچے سوئے محفل
جذبۂ عشق ہے وہ کون سا پروانوں میں

دیکھا ے ساقی مے خانہ تغافل نہ بہت
تیرِ عفلت کو بھی کچھ دخل ہے پیمانوں میں

ناخدا ہنس کے ڈبو دے مری کشتی تو دنا
مجھ کو اک خاص مزا آتا ہے طوفانوں میں

گردشِ وقت سے گھبرائیں یہ ناممکن ہے
عشق کے ساتھ عجب لزم ہے دیوانوں میں

یں نے سو اوصاف عجائب بھی سنائی ان کو
ہنس کے فرمایا یہ مقصود بھی پروانوں میں

محمود نشتری اندور

لطف کیا آئے گا اس دور کے انسانوں میں
غم الفت کا پتہ تک نہیں انسانوں میں

لطف دیوانوں میں حاصل نہ گلستانوں میں
کچھ کمی ہو گئی جذبات کی دیوانوں میں

پہلے بسمل کو تڑپتے ہوئے سے ہر دم
اب تو آرام ہی آرام ہے پیمانوں میں

دیکھ کر تم میں وہ دیرینہ نظر سے دل کو
تم نے پل بھر ہی بھلا دی مرے ارمانوں میں

جس کو طوفانِ حوادث کا کبھی خوف نہ تھا
اُن کی کشتی بھی نظر آئی ہے طوفانوں میں

آزما شوق سے اے گردشِ دوراں اس کو
آہ شامل ہے یہ تھوڑی سی دیوانوں میں

صدیق شبنم شکوہ آبادی

دیکھ لے چاہے کوئی جا کے گلستانوں میں
موسمِ گل ہے نہ اب جوش ہے دیوانوں میں

اپنی توبہ کو سنبھالوں تو سنبھالوں کیسے
کیف و مستی ہے ترے نام سے پیمانوں میں

زندگی ان سے ہیں وابستہ نظر آتی ہے
جن کو ہم بھول سے سمجھا کئے بیگانوں میں

جو یہاں آ کے جلتے ہوئے اُس کو دیکھا
ہے شمار اپنا بھی دود و دمد کے جھانوں میں

قیس و فرہاد نہیں ہیں نہ سہی اے شبنم
دیکھیاں آہ بھی کیا کم ہیں گریبانوں میں

شیر علی آور کان پوری

نگ محفل ہیں نہیں اور نہ ایوانوں میں
بات جو ہوتی ہے اُجڑے ہوئے کاشانوں میں

یہ بھی کیا خلوتِ رفتہ کا اثر ہے شاید
نام کو بھی نہ کوئی ہے نہ کوئی ہے میخانوں میں

ہے سبب عام تو کچھ نہیں پر دل ہے دوست
ہے کوئی ہے کوئی مل کے بھی ویرانوں میں

شدتِ تشنہ لبی شوق کا عالم توبہ
ہیں کہ تصویر اتر آئی ہے پیمانوں میں

فیضِ شعر و سخن اب بھی ہے لیکن اندر
صاحبِ طرز نہیں کوئی سخن دانوں میں

اندر کی دہلوی

کیف وہ کیوں نہیں ساقی ترے میخانوں میں
یکسو کی دہی ہے دہی محفل ہے
جذبۂ ایثار کا لیکن نہیں پروانوں میں

شمع محفل ہے وہی اور وہی محفل ہے
کوئی خوبی ہی نہیں آج کے انسانوں میں

ذاخت ، نہ خوت ، نہ مدارا ہے
روشنی بجھ گئی کیا سارے ہی ویرانوں میں

ہر طرف ایک اندھیرا سا نظر آتا ہے
تیرگی ہے مگر اے قدر خداوندوں میں

روشنی بھیجنی ہے بت خانوں کلیساؤں میں

کریم اسعدی بھاگلپوری

ل گیا لطف کچھ ایسا ترے افسانوں میں
ہوگیا ناصح ہشیار بھی دیوانوں میں

جو نہ بے گانۂ عشم ہائے دو عالم کر دے
وہ بھی رندو کوئی پیمانہ ہے پیمانوں میں

زندگی کہتے ہیں یہ شمع پہ مر مٹنے کو
کس قدر رنگِ وفا پختہ ہے پروانوں میں

کشتیِ دل کو عجب ہوتی ہے لذت حاصل
عدل پر شور میں گر داب ہیں طوفانوں میں

دل جو گھبرائے ہے سنگامۂ گلشن سے کریم
اٹھ کے خاموش چلا جاتا ہوں ویرانوں میں

بدا الجبار ناگ پوری

اب وہ پہلی سی کہاں باتیں ہے فرزانوں میں
چھوڑ کر صحن چمن پھرتے ہیں ویرانوں میں

داستانِ غم دل اچھی ہوتی رنگین
اس کا بھی نام جو آتا مرے افسانوں میں

پیہم جستجو میں مستی ہے نہ ہے لطف و سرور
کیف ہی کیف ہے ساقی ترے پیمانوں میں

اب تو پہلو میں ہے دل نہ ہے خود پر قابو
آگ لگ کس نے لگا دی مرے ارمانوں میں

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کسی بت نے اسے تاج
زندگی ہم نے گزاری ہے صنم خانوں میں

سفر ٹانڈوی

اہلِ دانش میں نظر آئی نہ فرزانوں میں
وہ تجلی جو نہاں ہے ترے دیوانوں میں

لوگ ساحل پہ تھے آسودۂ عشرت لیکن
ہم تھے بیدار جو کھیلے کئے طوفانوں میں

یہ مگر تشنگیٔ شوق کا شاید ہے اثر
آج شعلے جو بھڑکنے لگے پیمانوں میں

جو خدائی کا کیا کرتے تھے دعویٰ اے دوست
بہہ گئے کیسے کہ وہ حالات کے طوفانوں میں

سوزِ دل سوزِ جگر سوزِ نفس سوزِ نہاں
سوز ہی سوز ہے اب سخن کے فسانوں میں

بدا القریشی درگ

اب تو وہ نظر آتی نہیں مے خانوں میں
پی کے اک جرعہ جسے ہوتے تھے سیکش سرشار
ان کا کچھ ذکر بھی آتا نہیں افسانوں میں

بابا تاریخ کے جو تھے کبھی زریں عنواں

بزمِ شاہد و اخوت سے خلل گر یارب
ہر فرد ہے گئے تھے جس پہ عمل کر کے سلف
ہر فرد میں ملت ہیں لیکن کوئی کردار نہ شان
سید محمود آفاق بھوپانی

بے سے زاہد کے قدم آتے ہیں مے خانوں میں
شمعِ ایماں نہیں دل کے سیہ خانوں میں
خود فنا ہونے کا جوش اٹھتا ہے پروانوں میں
کون کہتا ہے ترے غم کے شبستانوں میں
گونج اٹھتا ہے صدا آج یہ ویرانوں میں

شمیں خود ہو گئیں بے تاب سی ایوانوں میں
دیکھے آتے ہیں نظر آنکھوں کو ویرانوں میں
جو تھی شیشوں میں ڈھلکائی وہ پیمانوں میں
کافرِ عشق بھی ہوتا ہے مسلمانوں میں

داخل اب ہو گئے افسانوں میں
شیخ ہی جاتے ہیں ہر گھر سے مے خانوں میں
میں بھی شامل کہیں ہو جاؤں جو دیوانوں میں
شاعرِ زیست جو ٹھہرا ہے سخن دانوں میں

ڈھال دے نور کو ساقی انہیں پیمانوں میں
کوئی ایسا نظر آتا نہیں فرزانوں میں
اس قدر ہوش ہے باقی ابھی دیوانوں میں
پھول کھلتے ہوئے دیکھے ہیں بیابانوں میں

جے سکوں ملتا ہے واعظ مجھے مے خانوں میں
وہی ہر وقت نظر آتے ہیں مے خانوں میں
کہ نہ سمجھانے کی طاقت ہی رہی شانوں میں
زندگی رقص کناں ہے مرے افسانوں میں

شمع توحید جلائی جو سیہ خانوں میں

جو پہاڑوں میں نظر آجائے ڈاکہ باتا ہی ہے
جس کو دیکھو نظر آتا ہے فرض کا بندہ
پاسداری وفاداری و الفت یارب
طعنہ اس بات کا اب دیتی ہے دنیا دو گنی
کرامت

موسمِ گل ہے نہ اب جوش ہے دیوانوں میں
شیوۂ پیر مغاں زینتِ بے خانہ سہی
کاوشِ غم وہ قیامت ہے، الٰہی توبہ
نشۂ عشق کی یہ کوئی کرامت دیکھے
کوشش عمل وفا بیگن گھائی

میری روداد محبت پہ گریزاں گوشی نہ ہو
اہلِ ساحل مجھے ساحل سے اشارہ نہ کرو
قصہ بربادیٔ گلشن کا سنائیں گے کسے
اٹھ گئی رسمِ وفا جیسے زمانے سے وفا
اختر حمید الحفیظ ہوشیارپوری

رات ہو جاتے ہیں یہ ویرانوں میں
چین سے ان کو فرض ہے نہ خوشی ہے مطلب
اپنی ٹھوکر سے ہی مرنے کو جو کر دیں زندہ
حسرتِ دید پہ یہ کہہ کے مجھے ٹال دیا
ستار جودھپوری

عقل بانٹی گئی جس وقت بھی فرزانوں میں
آج بھی یہ تو بتا کیا کروں تذکرۂ وحشت
یہ یقیں ہے کہ بہت جلد پہنچ جائیں گے
کس لیے رکھتے ہے وفاؤں کی تمنا ستار
وحید شمسی

جن کی خاطر مجھے سمجھا گیا دیوانوں میں
آ ہی جاؤ کہ کچھ سے دھواں اٹھتا ہے
عقل آجائے گی پی لے گا جو اس کو واعظ
مصلحت کا یہ تقاضا تو ذرا دیکھو وحید
فانوس کالی پالیگانوی

اب تو اخلاق ہے اپنوں میں نہ بیگانوں میں
بے غرض کوئی نہیں آج کے انسانوں میں
آگ اپنوں ہی میں باقی ہے نہ بیگانوں میں
جذبۂ شوقِ شہادت نہیں دیوانوں میں

پھرتے ہیں خاک اڑاتے ہوئے ویرانوں میں
حسرتِ رند کا ہے خون بھی پیمانوں میں
شیوۂ رند کہ طوفان ہے میخانوں میں
ان کی صورت نظر آئے گی پیمانوں میں

کچھ حقیقت بھی ہوا کرتی ہے افسانوں میں
کشتیٔ عمر رواں آگئی طوفانوں میں
بو دکی نہیں گلشن کے نگہبانوں میں
اب تو اخلاق ہے اپنوں میں نہ بیگانوں میں

انہیں کعبہ میں کاشی کے صنم خانوں میں
جو ترے شوق میں پھرتے ہیں بیابانوں میں
ایسے دیوانے بھی ہیں آپ کے دیوانوں میں
آگ لگ جائے گی گر ہو ترے افسانوں میں

وحشتیں دھڑکے خوشی کی ہیں بیابانوں میں
ایک بھی تار نہیں میرے گریبانوں میں
نرگسیں دیدۂ بیدار ہیں ویرانوں میں
جو بچے تھے وہ داخل ہیں بیابانوں میں

اب وہی مجھ کو سمجھنے لگے دیوانوں میں
آگ یہ کس نے لگا دی مرے افسانوں میں
جن کو سمجھے تھے وہ داخل ہیں بیابانوں میں
کہیں اپنا ہے نہ اب تک یہ بیابانوں میں

اس کی ٹھوکر کا جھکا سے پیار کرتے ہیں
آگ لگ جائے اے ساقی ترے پیمانہ میں

اہل ساحل کو کہاں اس کی خبر جب تک
زندگی پلتی ہے شعلے ہوئے طوفانوں میں

ابر دہ عالم ہے کہاں تیری نظر کا ہمدوست
اب وہ ستی ہے کہاں چاک گریبانوں میں

کس نے چھلکا دیا پیمانۂ ہستی خاموش
فوری فوری نظر آتا ہے مے خانوں میں

عزیز نگ چڑکا

پہلے تقویٰ پہ ہنسی آتی تھی اب دوست
آج وہ غرق نظر آتے ہیں پیمانوں میں

موسم گل نے کھلائے ہیں وہ گل اب کے برس
ہوش والے بھی نظر آتے ہیں دیوانوں میں

آپ آیا نہ کریں رخ سے الٹ کر پردہ
آگ لگ جائے گی سرسبز گلستانوں میں

غزل عشق ہے دشوار بہت جاؤ فکر
خاک اڑتا ہوا بھی کچھ رہتا ہے بیابانوں میں

علی سجاد۔ رسوا ڈوگ

ربط قائم رہے کس طرح پھر افسانوں میں
جب خود ہی نہ رہی آگ کے فرزانوں میں

میری روداد محبت کو یہ حاصل ہے کمال
داستاں میری بیاں ہوتی ہے افسانوں میں

حل کے خود دیتی ہیں وہ آیتیں اس دنیا کو
حوصلہ کہتا ہے اللہ رے پروانوں میں

یہ بھی کیا کم ہے عدم عشق میں رسوا ہو کر
ہوگیا نام مرا آپ کے دیوانوں میں

انور ندیم رتلامی

موسم گل ہے شباب پہ ہے دیوانوں میں
خاک اڑتی نظر آتی ہے گلستانوں میں

اپنے مطلب کے جو دیوانے ہوا کرتے ہیں
کب شمار ان کا ہوا کرتا ہے دیوانوں میں

اس لئے روح ناداں میں خون کے آنسو روتا ہے
رنگ آجائے مرے خون کا افسانوں میں

انور ندیم سلطان پوری

موسم گل ہے شباب پہ ہے دیوانوں میں
گلستاں ہوگئے تبدیل بیابانوں میں

ماسوا شکوۂ محبوب و شکایات جہاں
اور کیا رکھا ہے عشاق کے افسانوں میں

ایک دن آگ کی بن جائے گی اہل خاکنشیں
آج جو لوگ رہا کرتے ہیں ویرانوں میں

مسرور

جب کہ خنجر ہے ملائک تو ہیں آمادہ مگر
آدمیت ہی نہیں اب کہیں انسانوں میں

شمع تو رنج میں مدت سے فروزاں ہے مگر
سوز عشق ہی باقی نہیں پروانوں میں

سارا دن دنیا میں دھونڈا ہے مسرور نے جنس الفت
جنس الفت ہے بھلا کون سے بیگانوں میں

خاجہ بیگن گھاٹی

راز کی بات نہ کہئے کبھی افسانوں میں
جوش دیوانے کو بھی ہوا کرتے ہیں دیوانوں میں

یہ زمانہ کا گلہ بزم جہاں میں بے سود
فیر تو فیر یہاں اپنے بھی بیگانوں میں

محمد صفدر۔ اصغر پیلی بھیتی

اب کہاں اتنی ہے وہ آگ کے افسانوں میں
فرق اتنا نہیں کچھ اپنوں میں بیگانوں میں

یہ بھی ویرانی خیالوں میں نہ ڈھل جائے کہیں
جب تک آباد ہیں کچھ لوگ مسلمانوں میں

ایک گلشن کو جلا کر ہو گلستاں کی بہار
عمر اپنی بھی گزر جائے گی ویرانوں میں

ہو گئے وقف بیاباں سے سبک دوش انساں
شیخ کیا ڈھونڈتے پھرتے ہیں مسلمانوں میں

ہم ہی خاک پا تھے پہ بیدار نہیں اے ہمدم
وہ بھی ہے چین نظر آتے ہیں کاشانوں میں

اختر اجمادی۔ دبھنگہ

عافیت جب کہ نہ ساحل پہ نہ ہوگی اس نے
آگیا کھینچ کے سفینہ مرا طوفانوں میں

حامد صحرائی سکتی۔ یم، پی)

کچھ تو ہو جاتی ہے تسکین مگر اے حامد
غم غلط کرنے کو جاتے ہیں جو مے خانوں میں

محمد شفیع جنگن کھائی

سنتے آئے ہیں یہ تاریخ کے افسانوں میں
شرک موجود تھا کعبے کے نگہبانوں میں

شہرت میرٹھی

ایک جدت ہے نیا جوش ہے ارمانوں میں
فصل گل آئی ہے یہ شور ہے ویرانوں میں

بدلیاں کرنے لگیں رقص فلک پہ ہر سو
چیخنے والے نظر آنے لگے خانوں میں

شمع کی لو سے لپٹ جاتے ہیں جل بجھتے ہیں
عشق کی آگ بھڑکتی ہے جو پروانوں میں

ہم نے خاروں کو پلایا ہے لہو تلووں کا
ہم نے گل لاکھوں کھلائے ہیں بیابانوں میں

شیخ مایوس نہ ہو، ڈھونڈو ادھر بھی آکر
کچھ تو تب نہیں مل جائے وہ بتخانوں میں

ماشہ رنگ کے قریں آپ نہیں رہتے ہیں
کس کی آواز بھر آئی ہے مرے کانوں میں

جن کو ہر بات میں ملتا چال چھپی ہو شہرت
وہ گئے بانٹے ہیں اس دور کے فرزانوں میں

نکہت رفیع۔ رائے پور

مجھ کو خود نے نہ پہچانا تو شکوہ کیا ہے
تم بھی تو ہو گئے شامل انہیں بیگانوں میں

ٹوکن شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۵۸

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

مصرع طرح ۔ دل جو رکھتا ہو مسلماں کیوں ہو انساں کیوں نہ ہو

مسلماں ۔ انساں ۔ قرآں ـــــ کیوں نہ ہو ردیف

نام ... ...

پتہ ... ...

براہ کرم اپنا طرحی و غیر طرحی کلام براہ راست حضرت مولانا آباد حیدرآباد

محترم صنیع بدایونی کو ارسال فرمایئے

ایڈیٹر

25 OCT 19

نادرن ریلوے

نوٹس

مندرجہ ذیل تبدیلیاں یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء سے جاری کردہ نادرن ریلوے ٹائم ٹیبل آفیشل ایڈیشن میں مندرجہ ذیل طباعت کی غلطیاں نوٹس ہیں جو کہ اگلی ترمیم تک کی اطلاع کے لئے مشتہر کی جاتی ہیں :-

صفحہ	ٹرین نمبر	اسٹیشن	اس کی بجائے	پڑھئے
xxx iii	31	بمبئی وی ٹی	روانگی 15 — 15	13 — 10
xxx iv	1	گوہاٹی	روانگی 22 — 40	22 — 10
"	7/4	منماڈ	آمد — 0	0 — 2
xxx v	7/4	جبل پور	روانگی 23 — 5	18 — 5
xxx viii	2	بروٹی	روانگی 21 — 5	1 — 55
xL	ٹرین نمبر 6 میل کے نیچے 1- ایس، ایچ کی بجائے ٹرین نمبر 42 ایکسپریس پڑھئے			
xLii	328	بردوان	روانگی 13 — 13	16 — 13
	(44 ہونا چاہئے)			
Liv	26	انبالہ چھاؤنی	روانگی 10 — 32	10 — 23
"	82	بھوپال	آمد 17 — 50	22 — 60
	(33 ہونا چاہئے)			
"	67	ناگدا	روانگی 15 — 26	15 — 20
"	67	اوجین	آمد 16 — 50	16 — 56
A	28	کرنال	آمد 18 — 49	18 — 39
7	10	دائے سی	روانگی 18 — 51	18 — 41
			روانگی ———	21 — 42
		بالا دانی	روانگی 21 — 42	21 — 56
		چنڈوک	روانگی 21 — 56	—
37	571	سہارن پور	آمد 0 — 00	1 — 60
62	57	دیرکا	روانگی 22 — 8	20 — 9
66	10 بے ایچ	نصراللہ	روانگی 14 — 54	15 — 45
67	2 بے ین	شنکر	روانگی 6 — 21	6 — 31
76	335	قبر داغ	روانگی 11 — 22	17 — 22
91	2 ڈے ڈی	پریاگ	روانگی 9 — 52	9 — 32
109	4 بی ایس ایچ	ڈیلانا	روانگی 5 — 42	5 — 44
12	2 بے بے پی	اوسیہ	روانگی 12 — 29	12 — 39
118	2 بی بی بے	مگوال	روانگی 14 — 53	13 — 53

اس انجمن میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی

شعلہ و شبنم دہلی

نومبر ۱۹۶۳ء

زر سالانہ چار روپے
ششماہی دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۱۹

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں دلی نمبر 6
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصۂ نظم و ناظم مشاعرہ
حضرت مولانا آبر احسنی گنوری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	حرف اوّل	آبر احسنی گنوری	۵
۲	فرحت القادری کیادی کی غزل پر اصلاح	ابر احسنی	۶
۳	ادبی ذوق کی تربیت	ڈاکٹر عندلیب شادانی	۷
۴	جنت ہندوستان	طرفہ قریشی بھنڈاروی	۱۰
۵	دو غزلیں	نواب دہلوی ۔ تسخیر احمد فہمی	۱۱
۶	افکار نو	حامد گلشن آبادی ۔ سہیل ناروی	۱۲
۷	غزلیات	عشرت دہلوی	۱۲
		داغ ہمسر ناگپوری ۔ ندرت رکنی	۱۳
		وحید شمسی	۱۴
۸	جلال و جمال	محمود نشتری ۔ ضیاء الانجم پرتاپ گڑھی	۱۴
		آزاد رشیدی ۔ اسمٰعیل ذبیح	۱۵
		عبداللطیف سرحدی ۔ شمیم آزادی	۱۵
۹	دوست (نوپاسان)	ترجمہ روشن پٹیالوی	۱۶
۱۰	شادی کے کارڈ	مجیب اشرف ساحل	۱۷
۱۱	چپا	آفتاب اختر	۲۳
۱۲	اگر آدمی جیتے رہتے	شمس ضیاء الدین ساز بہلی	۲۶
۱۳	انسان پاگل	رشید ہستی پوری	۲۸
۱۴	آنسو ہی آنسو	ذوالدین قریشی پانس وائی	۳۰
۱۵	طرحی مشاعرہ نمبر ۸۸	مرتبہ حضرت مولانا آبر احسنی گنوری	۳۲

حرف اول

آبرو احسنی گنوری

شعراء کے لئے ضروری و مفید باتیں

ہر زبان دوسری زبان سے پہلے صرف الفاظ ہی حاصل کرتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے محاورے، ضرب المثل، تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع بھی آنے لگتے ہیں۔ الفاظ کی صحت کی طرف بھی توجہ کی جانے لگتی ہے اور اس کی تکمیل میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اس دوران بہت سی چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں، بہت سی نئی چیزیں اس میں شامل کر لی جاتی ہیں، مذاق بدلتا رہتا ہے، ترقی ہوتی رہتی ہے، قبول کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہتا ہے۔

اردو زبان نے جب ادب و شعر کے میدان میں قدم رکھا تھا تو قلی قطب شاہ اور ولی وغیرہ کا کلام اٹھا کر دیکھئے آپ کو حیرت ہوگی کہ اردو شاعری کے باوا آدم یہ کہتے تھے؟ ہر قسم کی خرابی اور غلطیاں اس کلام میں موجود ہیں، حتیٰ کہ وزن کی پابندی نہیں تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ زبان اتنی نکھر گئی ہے کہ اگر ابتدائی کلام سے آج کے کلام کا تقابلہ کیا جائے تو ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ اسی زبان کے شعر ہیں جو ولی کے زمانہ کی زبان تھی۔

آج ہم اردو شاعری کے دور کو انتہائی ترقی کا دور کہتے ہیں۔ بات ٹھیک بھی ہے لیکن باوجود اس انتہائی ترقی و دور کے آج بھی اس میں بہت سی باتیں قابل توجہ پائی جاتی ہیں۔ انھیں میں ایک لفظ طرح ہے بہت سے لوگ اس کے دو تلفظ ہیں اور دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ ایک تلفظ ہے طَرَح بروزن ہر، دہر، جبر وغیرہ۔ ط پر زبر ہے اور باقی دو حرف (ر۔ح) ساکن ہیں۔ اس کے لغوی معنی بنیاد کے ہیں جیسے اس نے ایک نئے مکان کی طرح ڈالی۔ یعنی بنیاد ڈالی۔ اس مشاعرہ کا مصرعا طَرَح یہ تھا۔ جو طرحی مصرع ہونے والے مشاعرہ کی بنیاد ہوتا ہے جس پر تمام شعراء اپنی غزل کی عمارت قائم کرتے ہیں۔ اس لئے اس کو طَرَح کہا جاتا ہے دوسرا تلفظ ہے طَرْح یعنی ط اور ر پر زبر ہے اور ح ساکن ہے اس کا معنی ہے کرم، ستم وغیرہ، اس کے معنی ہیں مانند، مثل

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ پہلے طَرَح اور دوسرے طَرْح کو شعراء نے ہم معنی سمجھ لیا ہے اور طَرْح یعنی مانند کے محل پر طَرَح یعنی بنیاد کو یعنی چند کو بھی بے دھڑک بول پڑتے ہیں اور پاکستان کے شعراء تو بکثرت استعمال کرتے ہیں مثلاً حضرت غالب لکھتے ہیں۔

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا

تلفظ تو طَرْح یعنی بنیاد کا ہے، لیکن معنی مانند کے لئے گئے ہیں۔ حضرت غالب پر ہی منحصر نہیں۔ اس دور کے شعراء بھی جو غالب کے زمانہ کے مقابلہ میں بدرجہ تحقیق بہت آگے بڑھ چکے ہیں ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہو سکے شاعر کے علاوہ صحت تلفظ کا ذمہ دار کوئی نہیں ہوتا اس لئے شاعر کو اس طرف بہت زیادہ توجہ دینی چاہئے اور شعلہ و شبنم کے ناظرین اور شعراء کو آئندہ طَرَح یعنی بنیاد کو طَرْح یعنی مانند کے محل پر استعمال ترک کر دینا چاہئے جیسے۔

میری طَرْح کوئی بھی ستمگر نہیں

لفظ طرح کے یہ دو تلفظ بدولت اپنی اپنی جگہ درست۔ اگر بنیاد کے معنی میں لکھنا ہو تو طَرَح لکھئے جیسے

طرح انداز بت کم ہی کہاں تھی تو تھا

مگر اس طرح کے استعمال میں اچھے اچھے شعراء ایسی فاش غلطیاں بھی کرتے ہیں جو دونوں لفظوں کے تلفظ سے جداگانہ ہوتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کوئی بے گانہ

غور کیجئے یہ طَرْح ہے۔ نہ طَرَح ہے بلکہ صرف "طر" ہے ح قطعی گر گئی جو کسی تلفظ کی تائید نہیں کرتا اور قطعی غلط ہے۔

ایک تلفظ کترا کر دیکھنے میں آیا جیسے

میرا کا طرح نامے تو گر دو

یہ طَرْح۔ طرحا ہو گیا جو ہر طرح غلط ہے۔

پس طرح کے استعمال کرتے وقت پہلے سوچئے کہ کیا یہ ہم نے بنیاد کے معنے میں لکھا ہے یا مانند کے، اگر بنیاد کے معنے میں لکھا ہے تو مصرعہ میں طرح کہنا گرہ دسل، رکھ کر پڑھئے۔ اگر مصرع کی بحر نہ بگڑے تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے صحیح لکھا۔

اور اگر مانند کے معنی میں لکھا ہے تو تلفظ طاء کو مصرعہ سے نکال کر لفظ گرہ رکھئے اگر مصرع کی بحر میں خرابی واقع نہ ہو تو سمجھ لیجئے صحیح نظم ہو گیا۔ لیکن اگر بحر بگڑ جائے تو سمجھ لیجئے غلط نظم ہوا۔ اور پھر سے مصرعہ کہئے۔

ضروری اطلاع

بعض صاحب نے کلام منظوم میرے پاس بھیجنے کا اعلان کیا ہے میری ذمہ داری میں اضافہ کر رہا ہے، اب میرا فرض ہے کہ ہر جواب طلب بات کا جواب دوں، اس کے لئے آپ ہر جواب طلب بات کے لئے جوابی خط بھیجیں۔

(۲) ہندی اور متوسط مشق کے شعراء اپنا کلام ۴

۴ نیز اپنے مصرعے کو کاٹنے چھیلنے کی زحمت نہ کریں۔ آبرو احسنی گنوری۔ گنور ضلع بدایوں

فرحت القادری گیاوی کی غزل پر آبر احسنی کی اصلاح

گزشتہ ماہ ایک فرمائش کے تحت ایک مبتدی کی غزل پر اصلاح شائع ہوئی اس کی اشاعت کے بعد ناظرین رسالہ کی فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا کہ یہ مفید سلسلہ مستقل جاری رکھا جائے۔ کوشش کی جائے گی کہ فرمائشوں کا احترام تا بمقدور کیا جائے۔ دیگر حضرات بھی اپنے اساتذہ کی اصلاحیں برائے اشاعت روانہ کریں ــــ آبر احسنی

عدوے جان محسوس	غیر	
پہلے بہت گھٹن ہوئی معلوم راہ غم لیکن، وقت آیا	جب چل پڑے تو ہو گئے ہم خوگر غم	سب خواہ بے معنی بات ہے۔ خیر خواہ بنانے کے بعد جانا نہ مناسب تھا جان بنا پڑا معلوم سے محسوس کا محل توی ہے
اک وقت وہ بھی آیا جب شادمانیوں بشر	گھبرا کے ہم کو لینی پڑی جب پناہ غم	کچھ روانی بڑھ گئی بات وہ بھی ٹھیک تھی۔
فکر و نظر جلے چلے داغ و دلِ جگر سونے لگا ہے ہم کو ابھی احساسِ زندگی	سارے کے سارے آج ہیں آ جاگزیں غم چبھنے لگی ہے ہم پہ بھی شاید نگاہِ غم	جگر پر غم کا کیا اثر ہوتا ہے ؟ ابھی اس کی بابت یہ بیچاروں نے کوئی بات نہیں بتائی۔ بظاہر شعر بے عیب تھا۔ مگر میرے خیال میں "شاید غیر یقینی صورت پیش کرتا ہے۔ جب احساس زندگی یقینی ہونے لگا تو غم کی نگاہ بھی یقینی ہی اٹھنے لگی۔ شاید نہیں۔
ملتے ہیں قہقہوں میں بھی نالے پسے ہوئے میری فریب خوردہ ہنسی پر نہ جائیے	آنسو ہی صرف ہوتے نہیں ہیں گواہِ غم	"فریب خوردہ ہنسی" یہ وقت وہ معنی ادا کرتی ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ ہنسی غیر مرئی (بے جسم و جان) چیز ہے وہ فریب کیسے کھا سکتی ہے
رحمت نے دی سزا میں مسرت کی روشنی بخشش کا بن گیا وہ سہارا بروزِ حشر	پنہاں روشن تھا میرے دل میں جو داغ گناہِ غم	دل میں داغ گناہ نہیں تھا بلکہ غم کے گناہ کا داغ تھا۔ بخشش کا عطیہ صرف گنہگار پر ہوتا ہے۔ نہ کہ اس پر جس کے دل میں داغ ہو۔ پس محشر میں بخشش کے سہارے کی بات بے جوڑ ہو گئی۔ چوں کہ گناہ کی سزا دی جاتی ہے اور غم کا بدلا خوشی چاہے اس لئے پہلے مصرع میں سزائے خوشی لایا گیا۔ داغ گناہ چھپایا جاتا ہے لئے روشن کی جگہ پنہاں کر دیا۔
سنا رہا ہے دو اشک بے دریغ آخر تو کھیلتا ہے دو اشک خون سے	اس کی کیا پوچھتے ہو اس کو وہ ہے بادشاہِ غم	"دو اشک خوں" یعنی خون کے آنسوؤں کے موتی۔ موتی سفید ہوتا ہے اور خون سرخ۔ لہٰذا موتی کی خون سے تشبیہ غلط ہے اشک خوں کو لعل کہہ سکتے ہیں۔ موتی نہیں "دو اشک خوں" جب مضاف الیہ معطوف علم ایسا لفظ ہو جس کا حرف آخر نون ہو تو نون غنہ ہو جاتا ہے "اس کو" کی جگہ اس کی چاہئے یعنی اس کی بات کیا پوچھتے ہو۔ ایسے ہی اہل زبان بولتے ہیں۔

نوٹ:۔ صرف وہی شعر دکھائے گئے جن پر اصلاح ہوئی۔ صحیح شعر چھوڑ دیئے گئے ــــ آبر احسنی گیاوی

ڈاکٹر فدیب شادانی

ادبی ذوق کی تربیت

ادب ایک نہایت عام لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ہر چیز کے معیار اندازہ کی نگہداشت، محفل آداب، خوش اطواری، تہذیب، شائستگی۔ اخلاق، تمیز، شعور یا تعلیم و تعلم۔ مجلسی نکتہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ادب کے ایک اور خاص معنی کئے جاتے ہیں۔ شاعری، داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تنقید وغیرہ کو بھی ہماری زبان میں ادب کہتے ہیں۔ بظاہر لفظ ادب کے ان دو معنوں میں بڑا تفاوت ہے۔ لیکن درحقیقت ان کے درمیان نہایت گہرا اور ناگزیر تعلق ہے۔ ادب کا مطالعہ کرنے والا عموماً ان تمام یا اکثر خوبیوں سے متصف ہو جاتا ہے جو لفظ ادب کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہ تو ادب کی فوقیت۔ رہا ادبی ذوق، تو غالباً اکثر لوگ اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ مطالعۂ ادب کے شوق اور مطالعۂ ادب سے لطف اندوزی اور ذہنی مسرت کا دوسرا نام ادبی ذوق ہے۔ ادیب بننے کی خواہش اور اس کے لئے عملی کوشش بھی ادبی ذوق کا ایک پہلو ہے۔

پیٹ کی بھوک اور جنسی اشتہا کا ذکر تو ہر وقت سننے میں آتا ہے۔ لیکن روحانی یا ذہنی بھوک کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ صحت مندی کے لئے ذہنی اشتہا کی تسکین بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا پیٹ اور نفس کی آگ بجھانا۔ ادب کا ذوق، زندگی کی بنیادی اور فطری دلچسپیوں میں سے ہے اور کم و بیش ہر شخص میں پایا جاتا ہے۔ جو شخص تیرہ و خاکیہ کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ بھی ادنیٰ درجہ کے مشاغل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اگر نثر یا شاعری سے اس کے ذہن کی رسائی نہیں تو وہ جاسوسی ناول پڑھ سکتا ہے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے ڈراموں کا مطالعہ اس کے لئے دشوار ہے تو وہ بازاری تھیٹر دیکھتا ہے۔ یہ تمام دلچسپیاں اور سرگرمیاں اس کے ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ ہر چند کہ اس کا ادبی ذوق صحت و سلامتی سے دور ہے کیونکہ صحیح طور پر کبھی اس کی تربیت نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود وہ ادب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

ادب کا مطالعہ اگر صحیح طور پر کیا جائے تو اس سے آدمی کے اندر خود شناسی، حقیقت پسندی، کشادہ ذہنی اور وسیع النظری پیدا ہوتی ہے اور زندگی میں جن چیزوں کی جس قدر ضرورت اور اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ادبی ذوق کی تعلیمی اہمیت کو سمجھنے کے لئے پہلے خود تعلیم کے بنیادی مقاصد کو جان لینا ضروری ہے تعلیم کا اساسی مقصد انسانی ذہن کی تنظیم و ترتیب اخلاق کی تہذیب اور کردار کی تعمیر ہے۔ الفاظ دیگر تعلیم کا مقصد انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانا ہے تاکہ وہ انفرادی اور اجتماعی فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔ اور زندگی کے اعلیٰ ترین اخلاقی کردار کے کارنامے کر سکے۔ اس مقصد کو ادب جس حد تک پورا کر سکتا ہے کسی اور واسطے سے ممکن نہیں ہے۔

ادب میں سائنس کی ترقی اور صنعتی انقلاب نے زندگی کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر ہی بدل دیا ہے آج انسانی ترقی کا وہ مفہوم نہیں رہا جو چند سو سال پہلے تھا۔ آج جسمانی آسائشوں کے حصول میں مدد دینے والے مادی وسائل کی ایجاد کا نام ترقی ہے نہ انسان کی شرافت کا معیار اس کے مکارم اخلاق اور حسن کردار نہیں بلکہ اس کا تکنیک مہیا ہے۔ اپنی درس گاہوں سے ہم ایسے افراد کی ترقی نہیں دیکھتے جو بنی نوع انسان کی بہبودی اور خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات سمجھیں۔ بلکہ علم و فضل کی دنیا میں وہی لوگ مایۂ ناز سمجھے جاتے ہیں جو کسی ملک کی مصنوعی خوش حالی اور مادی ترقی کے ذمہ دار ہوں۔

ان حالات میں پس ماندہ قوموں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ بھی ترقی یافتہ قوموں کے نقش قدم پر چلیں۔ سائنس میں ترقی کریں اور صنعت و تجارت کی دوڑ میں آگے بڑھیں۔ لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ ہم اخلاق اور روحانی اقدار سے بے نیاز ہو کر مہذب، باشعور اور حساس انسان بننے کے بجائے صرف ایک حیرت انگیز مشین بن جائیں آنکھ میں مروت نہ ہو۔ دل میں دوسروں کے لئے درد نہ ہو بے غرض خدمت کا جذبہ نہ ہو یہ افسوسناک صورت حال اس وقت تک بدلی نہیں جا سکتی جب تک ہمارے تعلیمی ادارے ادب کی قدر و قیمت کا صحیح احساس پیدا نہ ہو اور ہم ادبی ذوق کو اپنی انفرادی اور اجتماعی بہبود کے لئے ضروری نہ سمجھیں۔

نئی تعلیم کے فیض یافتہ نوجوانوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ دور سائنس کا دور ہے۔ اس زمانہ میں شعر و ادب ہمارے کس مرض کی دوا ہے۔ یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے کالجوں میں ادب، شاعر ہر جگہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور قوم کے سچے

نیا دور کے افراد ہیں۔ سائنس کے طلباء، کامرس کے طلباء، ڈاکٹری، انجینئری اور زراعت کے طلباء یہ سب کے سب اور آرٹس کے جملہ طلباء ادب کے مطالعہ کو کسر بے سود اور تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ طلباء اور اساتذہ دونوں کی نظر میں اپنی زبان اور اپنے ادب کی کوئی وقعت نہیں۔ عوام اور خواص دونوں اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں بیشتر طلباء صرف اس لئے اردو لیتے ہیں کہ محنت کئے بغیر اردو میں پاس ہو جانا یقینی ہے۔ پھر مطلب یہ کہ اردو میں فیل بھی زیادہ تر ہوتے ہیں۔ ادبی ذوق کی تعلیم و تربیت کو سمجھنے کے لئے سرے سے ادبی ذوق کی تربیت کا سلسلہ ہی موجود نہیں ہے۔ گھر میں بھی اور گھر کے باہر بھی خصوصاً ہماری درس گاہوں میں خواہ وہ پرائمری اسکول ہوں یا ڈگری کالج اور یونیورسٹیاں کہیں بھی منتقی سے ہمارے گھرانہ ہماری درس گاہیں دانستہ رفتہ رفتہ ادبی ماحول سے خالی اور محروم ہوتی جا رہی ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ ادب کا محض زبان کی بنیادوں پر تدریس ہوتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمارے لئے اپنی زبان کا جاننا اور اس سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنا ضروری ہے۔ بچے کا سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتی ہے اس لئے زمانہ شناس بزرگوں نے تعلیم نسواں پر زور دیا تھا۔ لڑکیوں نے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی اور یہ تعلیم یافتہ لڑکیاں جب مائیں بنیں اور بچوں کی تربیت ان کے سپرد ہوئی تو انھوں نے ان معصوموں کو وہی سکھایا جو خود سیکھا تھا۔ جب یہ اسکول جانے کے قابل نہیں ہوتا وہ گھر ہی میں ون، ٹو، تھری، فور اور ڈیڈی ممی کہنا سیکھتا ہے۔ ایک دوست کے بقول بچے کا ماں کی گود میں گنگنا اور ابا جان کہنا تو بڑی گھٹیا بات ہے پھر شریفوں اور رذیلوں میں فرق ہی کیا رہا۔ رخصت ہوتے ہوئے نیا بچہ مہمانوں سے "بائی بائی"

یا "ٹاٹا" کہتا ہے تو خوشی کے مارے ماں کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ چلتے وقت بڑوں کو سلام کرنا اور "آداب" کہنا دقیانوسی باتیں ہیں۔ "ٹاٹا" میں جو مزا ہے وہ خدا حافظ میں کہاں۔

پھر جب بچہ اسکول میں داخل ہو جاتا ہے، تو اسے انگریزی کی گٹھلیاں یاد کرائی جاتی ہیں۔ بک ایندھل اور بک کیسے سے اس کی ملاقات ہوتی ہے لیکن خدا اور رسول کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب بچوں کو اس قسم کی نظمیں یاد کرائی جاتی تھیں۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

ہم میں سے نہیں خدا نے: ستاوت دی ہے وہ اپنے بچوں کو ہمیشہ (انگلش میڈیم اسکول) ایسے اسکولوں میں بھیجتے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور یہ معصوم بچے اپنے والدین کی غلط اندیشی کی بدولت اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہم میں بعض والدین کو اس بات پر فخر کرتے دیکھا ہے کہ ان کے بچے اردو بالکل نہیں جانتے اور گھر میں بھی ماشاء اللہ انگریزی ہی بولتے ہیں۔

ادبی ذوق کی تربیت کا پہلا مرحلہ ہے جب اس مرحلے پر بچے کو اپنی زبان سے واقفیت حاصل نہ ہو سکے تو ادبی ذوق کی تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک بہت بڑی تعداد ان تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے جو انگریزی اور اردو ملا کر کچھ اس قسم کی گنگا جمنی زبان بولتے ہیں

"اب تو کافی سردی پڑنے لگی ہے"

But you know it was
quite warm yesterday

کئی دن ہوئے ہماری بیگم صاحبہ نے فریج کا پلگ بند کر دیا ہم نے پھر چلایا۔

you see idm so used
cold water ican not
help it

کچھ زمانہ ہوا ایک دوست سے سر راہ ملاقات ہوئی۔ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "خیر ہے" کہا "ہائے کاٹیل کرام آیا ہے۔ ہاورکیر میرے لس ہو گیا ہے ڈاکٹر کہتا ہے کنڈیشن سیریس ہے" اس قسم کی زبان ہم بلا تکلف بولتے اور سنتے ہیں یہ تو ہوئی تقریر تحریر کا حال ہے کہ اردو والے آپس میں ایک دوسرے کو انگریزی میں خط لکھتے ہیں۔ بڑا ہی احساس کمتری کا کہ ہم اپنی زبان کے رائج اور مستعمل الفاظ کو چھوڑ کر بلا تکلف انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ آپ کی اے جی کیا ہے، آپ کا پے Pay کتنا ہے۔ آپ کی کلاس میں نام کیا ہوا؟ آخر ایک کی جگہ عربی یا کوئی اور زبان "آصف نام کی جگہ وقت کہنے میں کیا قباحت ہے؟ ان چند لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں واقعی اردو سے لگاؤ ہے بڑے باقی تعلیم یافتہ لوگوں کو انگریزی اس درجہ چڑھ گئی ہے کہ اردو کی کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنا یا اردو کے اخبار کو پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی ذوق کی تعلیمی اہمیت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی موجودہ حالات میں جو ادبی ذوق کے لئے نہایت ناسازگار ہیں۔ ادبی ذوق کی تربیت کس طرح کی جائے۔ کسی زبان کے ادب سے علاقہ پیدا کرنے کے لئے پہلے اس زبان کا جاننا اور اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ گھرانوں کا حال جیسا کچھ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے آنے والی نسلوں سے یہ توقع بے سود ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ایسا ماحول پیدا کر سکیں گی جن کی بنا پر بچوں کو اپنی زبان سے پختہ واقفیت اور گہری دلچسپی پیدا ہو سکے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنی کوششوں کا آغاز اسکول سے کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ انگریزی ہر گز نہ ہو جو ساری دنیا کے لئے ذریعۂ تعلیم ہے اس پر اتفاق ہے اس سے زیادہ غیر فطری غلط اور مضر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ کسی غیر زبان کو ذریعۂ

تعلیم بنایا جائے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں تو پہلے ہی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا چکا ہے، پھر اس سوال کے کیا معنی؟ یہ سچ ہے شاید ہمارے اکثر اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے لیکن ہمارے یہاں اینگلو میڈیم اسکول بھی تو ہیں۔ جن کی تعداد خاصی ہے اور جو زیر ذریعۂ تعلیم پائے جاتے ہیں وہ اسکول ہیں جنھیں میاری اور شانی اسکول سمجھا جاتا ہے اور اہل استطاعت اپنے بچوں کو لازمی طور پر انھیں اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ انھیں اسکولوں کے طفیل اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی زبان سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور یہی بچے آگے چل کر حاکم، افسر اور قوم کے رہنما بنتے ہیں اور ہماری مجلسی زندگی پر بے حد اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ اسکول تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنے اثر کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ میٹریکولیشن کی حد سے گزر کر اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ جن بچوں نے اسکول میں اردو کے ذریعہ تعلیم پائی ہے۔ کالج میں پہنچتے ہی انھیں جملہ مضامین انگریزی میں پڑھنے پڑتے ہیں۔ اچانک ذریعۂ تعلیم بدل جانے سے انھیں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نہ وہ پورے طور پر استاد کا کچھ سمجھ سکتے ہیں، نہ انگریزی تحریر میں اپنے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ذریعۂ تعلیم کے بعد دوسرا مرحلہ اسکولوں میں نصاب کا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسکولوں کی نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے جو کورس مرتب کئے جاتے ہیں ان میں نظم کا حصہ کسی طرح بھی چودہ پندرہ برس کی لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ اس کم سنی میں انھیں عشق و عاشقی کے تمام معاملات نظری طور پر سمجھا دیئے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض طلبا کچھ بھی نہیں سمجھ پاتے اور بعض نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو کر ہمیشہ کے لئے بیمار ہو جاتے ہیں۔ اردو کے اساتذہ میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ جب انھیں کلاس میں اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھانا پڑتا ہے کہ ؎

تیرات نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

تو انھیں سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے اور وہ گریم مثل نہ گریم مثل کے مصداق ہوتے ہیں۔ میر اور غالب کی قادر الکلامی بزرگی مسلم لیکن ان کی بزرگی سے فائدہ اٹھانے کا یہ موقع نہیں۔ اور واقعی یہی مناسب اور مکمل رائے ہے کہ چودہ پندرہ سال کی لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے نظم کا ایک ایسا انتخاب مرتب نہ کیا جا سکے جو ان کم سن طلبا کی ذہنی نشوونما کے لئے مفید ہو اور ان میں صحیح ادبی ذوق پیدا کر سکے۔

تیسرا مرحلہ اساتذہ کے انتخاب کا ہے۔ یہ خیال بقیناً گمراہ کن ہے کہ اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہر فن حدیث دانوں کی ضرورت نہیں۔ بلکہ معمولی استعداد کے معلموں سے کام چل سکتا ہے۔ درحقیقت اسکولوں میں خصوصیت کے ساتھ ایسے استادوں کی ضرورت ہے جو ایک طرف اپنے فن میں ماہر ہوں اور دوسری طرف ادب کا بھی صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ تاکہ اپنے شاگردوں میں بھی مطالعۂ ادب کی رغبت اور ذوق پیدا کر سکیں۔ علامہ اقبال اور ان کے استاد مولانا میر حسن کا واقعہ مشہور ہے کہ علامہ نے سفارش کی کہ مولانا کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے پوچھا گیا کہ مولانا کی علمی اور ادبی تحقیقات کیا ہیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ مولوی صاحب کی علمی و ادبی تحقیق میں خود ہوں، چنانچہ مولانا کو شمس العلماء بنا دیا گیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ علامہ کے اندر ادبی ذوق کی نشوونما میں مولانا میر حسن کی حسن تربیت کو بڑا دخل ہے۔ جب تک ہمارے اساتذہ میں یہ صلاحیت نہ ہوگی کہ وہ اپنے طلبا میں ادبی ذوق پیدا کر سکیں، اس وقت تک اچھے سے اچھا نصاب تعلیم اور اردو کا ذریعۂ تعلیم ہونا کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوگا اور اسکولوں کے لئے اردو کے ایسے معلم جیسے میں مدعا ہیں اسی وقت تک میسر نہیں آ سکتے جب تک کہ ان کی تنخواہ اور ان کا احترام دوسرے اساتذہ کے برابر نہ ہو۔

ادبی ذوق کی تربیت کے سلسلہ میں ایک خطرہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ طلبا میں یہ غلط فہمی ہرگز پیدا نہ ہونا چاہئے کہ ہر شخص کے لئے شاعر اور ادیب بننا (خواہ وہ ہو سکے) لیکن ادب کا ذوق رکھنا ہر حیثیت سے انسان کے لئے ناگزیر ہے۔ صحیح ادبی ذوق کی بدولت انسان نہ صرف تہذیبی اور نفسیاتی فائدے ہی نہیں پہنچتے بلکہ مادی اور معاشی خوش حالی کے حصول میں بھی ادبی ذوق قدم قدم پر ہماری مدد کرتا اور ہماری کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

بقیہ افسانہ دوست (صفحہ ۱۰ سے آگے)

کا کردہ ایک صنعتی کام کے سلسلہ میں باہر جانا پڑا۔ اور افسوس سخت افسوس ہے کہ اس کی واپسی تک عمر سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ان کی جیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب جنت نے پریشان ہونے کی بجائے یہ کہہ کر جواب دیا "اچھا ہوا تم آ گئے تم واپس نہیں جاؤ گے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہیں یاد ہے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بات نکلنے سے پہلے ہوں تم جانتے ہو کہ دوستوں کے درمیان کسی تکلف کی ضرورت کبھی نہیں ہوتی۔

میرجل اور میڈم میبل اگلے دن باہر چلے گئے۔ احسان کا دوست جنت اب شکستہ کی واپسی کا منتظر ہے۔

نوٹس شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ ۵۹

غزل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ نومبر ۳۸ء
مصرع طرح پڑھ کر آپ جہاں تک مدعا سمجھے ہیں
واضح، اگر قافیہ ۔ معلوم ہوتی ہے ردیف:

نام .....
پتہ .....

طرفہ قریشی سہسوانی

جنتِ ہندوستاں

خطۂ کشمیر جولاں گاہِ حورانِ جناں — خطہ رُخ معصومیت آرا، فرشتوں کا جہاں
مظہرِ حسن و لطافت، گہوارۂ عشرت کا این — کیف سامانِ مشامِ دل سرور افروزِ جاں
مُرغزاروں کا مناظر، آبشاروں کا نفیر — غیرتِ فردوس، رشکِ خلد جس کی وادیاں
عطر میں ڈوبی ہوئی ہر صبح، عنبر بار شام — جس کے دن مخمور، راتیں جس کی مے خانہ جاں
جس کا ہر منظر طرب انگیز و فردوس نگاہ — جس کے دامانِ طلائی پر نقوشِ زعفراں
بہتے چشمے، جاگتے سوتے خراماں آبشار — رقص فرماتی ہوئی نہریں، مچلتی ندیاں
دعوتِ نظارۂ فردوس دیتے ہیں مدام — گنگناتے سبزہ زار اور لہلہاتی کھیتیاں

ہر چمن، ہر گلکدہ گہوارۂ موجِ شمیم
گوشۂ "کشمیر" ہے یا جنتِ ہندوستاں

اُف یہ "گلمرگ"، یہ "مانسبل" یہ "شالیمار" — ترجمانِ "پرگ" کے اک فرماں روا کی یادگار
صاف و شفاف، ہر رستہ لطیف آبِ رواں — ہر روش جس کی خنک، ہر رہگزر خیمہ بکار
خوش نما جھیلیں، حسیں لالیں، نشاط افروز باغ — سبزہ دامانِ چراگاہیں، نظر کش، کوہسار
تتلیوں کا رقص، پتہ پتہ، پھول پھول — جھینگروں کی دل کشا تانیں، بہ فرقِ شاخسار
دور تک سبزہ و خنک کوہِ گراں کا سلسلہ — کھیلتی ہے جس کے دامن میں، خود سر فوجِ بہار
خوش نما مرغانِ خوش الحان، رنگیں بوقلموں — شعریت آرا لب، سحر آفریں نقش و نگار
برف کے تودوں پہ "اسکیٹنگ" کی مشقِ لایعنی — دل کشا تفریحِ ناداں، گرمی افزا ہر دیار

صبح سے تا شام سیاحوں کا شوقِ آفریں ہنگامہ
ہر نظر حیرت بدیدہ، ہر لبِ حیرت گزار

پُر فضا و روح افزا، دل کش ہر مقام — مامنِ تسکین و راحت، "سونامرگ" و "پہلگام"
خوبصورت پارک، آئینہ صنعت بام و قصور — ہر مقام اک مرکزِ اعجازِ خاص و عام
اُگتے فواروں میں سینہ دوں کا عکسِ دلفریب — طلعت آرا سینۂ ذرات میں شمسی نظام
ڈالیوں میں جگنوؤں کی دن ڈھلے سحر آفریں — صبح کی تنویر سے معمور پیشانیِ شام
نقرئی سڑکوں پہ لرزہ تاب برقی قمقمے — جیسے موجِ بحرِ دیا پہ ستاروں کا خرام
جذبۂ ہر شکل، ہر تصویر، تصویرِ حیات — ہر قدم اک کیف، اک رومان اک حسنِ تمام
ذرہ ذرہ ہے یہاں جانِ کشش، ہا آئینہ — وا رے فیضانِ قدرت تیرا حسنِ انتظام

کس کو دیکھیں، کون سی تصویر پر ایمان لائیں
ہر نظر میں اک نظارہ، ہر نظارے میں دوام

(بدوی (کلکتہ)

دو غزلیں

ناکامی ساقی میخانے میں چھوڑے جاتا ہوں
قربان ترے نظریں نہ بدل میں جام کو توڑے جاتا ہوں

نازِ غرورِ حسن اُدھر اور خوئے نیازِ عشق اِدھر
وہ توڑے جاتے ہیں شیشۂ دل میں ٹکڑے جوڑے جاتا ہوں

شکِ درِ جاناں کو گھس دینا تو مشکل کام نہ تھا
لیکن یہ غرور ہے جس سر میں اس سر کو پھوڑے جاتا ہوں

ڈالا جنوں میں جو چاہا اور دل کا راز ہے دل ہی میں
اظہارِ تمنا جس سے ہو اس لفظ کو چھوڑے جاتا ہوں

دیرِ محبت میں اپنی کچھ رنگ وفا کا بھرنا ہے
جو جذب ہے دل کے دامن میں وہ خون نچوڑے جاتا ہوں

جتنا بھی گھٹتا جاتا ہے میعادِ اسیری کٹتی ہے
زنجیرِ حیات کا اک حلقہ ہر سانس میں توڑے جاتا ہوں

نواب ہے نازک کشتیٔ دل اور بحرِ محبت طوفانی
تدبیر کے بس کا کام نہیں تقدیر پہ چھوڑے جاتا ہوں

خیر احمد فہمی اوجھاروی

کیوں بنا دیتی نہ دنیا ایک افسانہ مجھے
آپ نے فرما دیا جب سب کے دیوانہ مجھے

جام و مینا کی مجھے حاجت نہیں ساقی کوئی
تیری آنکھوں نے بنا رکھا ہے دیوانہ مجھے

یہ چمن تیرا مبارک ہو تجھے اے باغباں
روز آوازیں دیا کرتا ہے ویرانہ مجھے

جان کرنی ہوگی نذرِ دوست بے چون و چرا
یہ ہدایت کر گیا ہے جل کے پروانہ مجھے

توبہ کرنے کے لئے جاتا تو ہوں میں شیخ جی
راہِ مسجد میں اگر مل جائے میخانہ مجھے

اب مری دیوانگی بالکل مسلّم ہو گئی
آج اس نے کہہ دیا ہے اپنا دیوانہ مجھے

یہ ملا برباد یوں کا مجھ کو اے فہمی صلہ
آ گئے وہ بھی سنانے میرا افسانہ مجھے

ہیں ساتھ مرے وہ بھی پریشاں کئی دن سے
بے ربط ہیں افسانہ و عنواں کئی دن سے

حائل ہے مری راہ میں آشفتہ نگاہی
حیراں ہے بہت جلوۂ جاناں کئی دن سے

اللہ غنی گرمیٔ برقِ نگہِ دوست
ہیں دیدۂ و دل شعلہ بداماں کئی دن سے

آپ اس میں کبھی پھول کترتے ہوئے آجائیں
محرومِ بہاراں ہے گلستاں کئی دن سے

یہ کس نے دیئے خونِ کفِ پا سے جلائے
ہر جادۂ منزل ہے فروزاں کئی دن سے

کیا بیچ میں آیا ہے محبت کا سفینہ
ہے کشمکشِ ساحل و طوفاں کئی دن سے

آئی ہے تپِ عشق کی بات آہ سمجھ میں
اک آگ تھی سینے میں فروزاں کئی دن سے

ہیں چھائے ہوئے اہلِ جنوں، اہلِ خرد پر
بیدار سا ہے فتنۂ دوراں کئی دن سے

اللہ رے وارفتگیٔ شوق کہ حامدؔ
ہم اُن کے تصور میں ہیں حیراں کئی دن سے

افکارِ نو

سہیلؔ نادری۔ نواسہ حضرت فرحؔ نادری

حسن وہ کیا عشق ہما کچھ جس سے یارانہ نہیں
بے ضیا وہ شمع جس کے گرد پروانہ نہیں

پہلے سنئے شوق سے پھر غور بھی فرمایئے
یہ ہماری داستاں ہے کوئی افسانہ نہیں

رسم و راہِ مے کدہ کو بھول جاؤں کیا مجال
چشمِ ساقی کی قسم میں یہ مستانہ نہیں

عشق بھی میرا جُدا مسلک جُدا مشرب جُدا
جس کے دیوانے ہیں سب میں اُس کا دیوانہ نہیں

خاص رندوں کو تو ساقی دے رہا ہے بھر کے جام
عام لوگوں کے لئے کہتا ہے پیمانہ نہیں

جس جگہ بھی لے گئی پینے سے رکھا میں نے کام
واسطے میرے کوئی مخصوص مے خانہ نہیں

بے تکلف مجھ کو چلو ہی میں دے ساقی شراب
پاس تیرے جب کوئی موجود پیمانہ نہیں

ہر جگہ ہر گھر میں شانِ اُس کی نمایاں ہے سہیلؔ
جلوہ گاہِ حق حرم ہی اک بت خانہ نہیں

عشرتؔ دیوری۔ گونڈیا

نشاطِ فصلِ گل باغِ جہاں میں کس کو حاصل ہے
فریبِ رنگِ گل کھایا ہے انساں خود سے غافل ہے

یہاں نکلے کوئی تعمیر کا پہلو تو کیا شئے
نہ میں دُنیا کے قابل ہوں نہ دُنیا میرے قابل ہے

مجھے ہو اجتباءِ رہنما و راہبر کیوں کر
مرے ہمراہ جادہ ہے مری ٹھوکر میں منزل ہے

مذاقِ کورچشمانِ جہاں کو رویئے کب تک
اُسے سب چاہتے ہیں زر کی پتلی میں جو مائل ہے

خیالِ خاطرِ اربابِ گلشن چاہئے گل ہو
چمن میں جو کلی ہے بلبلِ آشفتہ کا دل ہے

کہاں ہو آبروئے آدمیت کے نگہباں تم
یہاں عصمت کی دیوی کا سفینہ غرقِ ساحل ہے

لہو سے اپنے سینچا ہے وطن کے باغ کو عشرتؔ
یہاں کی جانفزا بیت میں ہمارا خونِ شامل ہے

غزلیات

سرشار پوری

بے رنگیٔ سرو و سمن دیکھ تو لیتے
دُنیا کی دورنگی کا چلن دیکھ تو لیتے
اے کاش وہ زُلفیں رخِ تاباں سے ہٹا لیں
ہم چھٹتا ہوا چاند کہن دیکھ تو لیتے
بیداریٔ احساسِ غریب الوطنی توبہ
غربت میں کوئی خوابِ وطن دیکھ تو لیتے
دیتا وہ کوئی جام نہیں یا کہ نہ دیتا
مے خانہ میں ساقی کا چلن دیکھ تو لیتے
اس در پہ نہیں زیست نہیں موت ہی ملتی
ہم دستِ حنائی میں کفن دیکھ تو لیتے
یہ پاکے رہائی نہیں لذت پہ یہیں پھر بھی
اے ہم قفسو! اک بار چمن دیکھ تو لیتے
تم تابِ منصور و ہوائے دورِ کے لیکن
کچھ اور بھی ہیں دار و رسن دیکھ تو لیتے
ہوتے وہ خفا ذکرِ وفا پر تو مزہ تھا
اک چاند سے ماتھے پہ شکن دیکھ تو لیتے
کیف و اثر شامِ غزل ڈھونڈنے والے
ہنگامِ سحر "پہلی کرن" دیکھ تو لیتے
وہ بیرِ عیادت ہی سہی آتے تو ہمدم
ہم ان کی محبت کا چلن دیکھ تو لیتے

وحید شمسی

آج ہاتھوں میں جام لینا پڑا — زیست سے انتقام لینا پڑا
ترکِ الفت کے باوجود اے دوست — پھر مجھے تیرا نام لینا پڑا
تیری آنکھوں کی بات جب نکلی — میکدے کا بھی نام لینا پڑا
مصلحت تھی جو بے وفائی کا — اپنے سر اتہام لینا پڑا
جب کٹھن وقت تھا تو آپ کا نام — مجھ کو ہر صبح و شام لینا پڑا
اللہ اللہ یہ لغزشیں میری — خود انھیں مجھ کو تھام لینا پڑا
میری آنکھوں میں دیکھ کر آنسو — ان کو میرا سلام لینا پڑا

بھڑکا لہرا گئی رگوں میں وحید
کس ستم گر کا نام لینا پڑا

ندرت رحمانی

گرمی سے یوں عرق ہے رُخِ پُرشباب پر
شبنم کے جیسے قطرے ہوں برگِ گلاب پر
وہ رند ہوں کہ بادۂ اُلفت سے مست ہوں
کچھ منحصر نہیں مری مستی شراب پر
موجیں بھی مضطرب ہیں ستارے بھی مضطرب
کونین مضطرب ہے مرے اضطراب پر
ہو دیکھنا تو دیدۂ عبرت سے دیکھ لو
تحریر ہے فسانۂ ہستی حباب پر
ایمان تازہ ہوتا ہے ایمان کی قسم
پڑتی ہے جب نگاہ خدا کی کتاب پر
کہتے ہیں جب حال جنھیں اہلِ عقل و ہوش
نغمے وہ گا رہا ہوں غزل کے رباب پر
ندرت ہر ایک شعر میں ندرت ہے اس لئے
آنے لگی ہے شاعری اپنی شباب پر

محمود نشتری اندھا

ہر بار فریب خندہ ہنس ہنس کے اٹھاتا ہے
یوں اپنی وفاؤں کا احساس دلاتا ہے
پھولوں کو بہاروں کا ہم راز بناتا ہے
کلیوں کو تبسم کا انداز سکھاتا ہے
ہم حد حرم سے بھی منکر تو نہیں لیکن
خود دار نظر لے کر پھر طے ہو جاتا ہے
ہر سمت اداسی ہے کیوں ماہ گلستاں پر
ماحول کدر کو پر نور بناتا ہے
جس جذبۂ الفت سے گلشن کو سنوارا تھا
اس جذبۂ الفت کو اب کام میں لاتا ہے
محمود سیہ بخت ان سے یہ کوئی کہہ دے
محمود نگاہوں سے پھر جام پلاتا ہے

ضیاء النجم پرتاب گڑھی

جس پر روح کی پیروی دستی رہی
زندگی موت پر طنز کستی رہی
ماہ ہستی میں جیتی رہی پھر بھی تنہا تھی
روح سایۂ کی طرح ترستی رہی
چھٹ گیا جان دے کر غم دہر سے
زندگی سے مجھے موت سستی رہی
بے وفائی نے وہ عشق ہموار کی
اب بندی رہی اور نہ پستی رہی
گلستاں آتش گل سے جلتا رہا
رات بھر چشم شبنم برستی رہی
ہم ضیاء خون دل اپنا پیتے رہے
مے کدے میں یہی مے پرستی رہی

آنند رشید کاشیاری نگری

باقی ہیں جو الفت کے اسیر کہیں اب تک
موجود ہے ان کے لئے دار و رسن اب تک
ہر روز نیا رنگ ہے اس بزم جہاں کا
لوگ اٹھتے ہیں قائم ہے گماں یہ اب تک
کس وقت خدا جانے وہ میت پہ مری آئیں
دیدار کی حسرت میں کھلا ہے کفن اب تک
بے وقت جو غربت میں مجھے شام ہوئی ہے
روتے ہیں مرے واسطے اہل وطن اب تک
یہ سچ ہے کہ تم جور و ستم سیکھ گئے ہو
ہاں رحم کا لیکن تمہیں کیا نام فن اب تک
وہ بر سر رحم آئے ہیں جس روز سے آزاد
اس روز سے ہے تاک میں یہ چرخ کہن اب تک

جلال و جمال

اسمٰعیل ذبیح بالیگانوی

یا الٰہی جس شخص کی شہ مندگی بڑھتی گئی
اس پہ رحمت کی فراوانی اور بھی بڑھتی گئی
اس خلوص دوستی پر کون ایماں لائے گا
دوستی گھٹتی گئی اور دشمنی بڑھتی گئی
آگئے باطل بھی کچھ راہ حقیقت کی طرف
جب فریب آرزو کی چاندنی بڑھتی گئی
دیکھ کر ہر شے میں جلوہ تیرا اے پردہ نشیں
روشنی ایماں کی دل میں اور بھی بڑھتی گئی
جتنے وہ چھپتے ہے میری نظر سے اے ذبیح
داغ دل میں اور میرے روشنی بڑھتی گئی

عبداللطیف سرور بارانوی

ان سے تقدیر آزمانی ہے
آج ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے
غم سے لبریز زندگانی ہے
بات یہ آج انھیں بتانی ہے
جان دے کر ہمیں منانی ہے
ان کے لب پر جو بدگمانی ہے
اب تو مجھ پر ستم کی ٹھانی ہے
یہ گلا اک ان کی مہربانی ہے
بر مصیبت میں مسکراتے ہیں
ان کے قدموں میں کامرانی ہے

شمیم آنولوی۔ مکتہ

یقیں ہے آسماں ہوں گی مجھ کو یہ زندگی کی اندھیری راہیں
تمہارے شب رنگ گیسوؤں میں اگر مجھے مل گئیں پناہیں
یہ ایک ارادہ بدل کے رکھ دیں ستم کشان جہاں جو چاہیں
یہ گردش روز و شب کے تیور، یہ وقت کی پرستم نگاہیں
مذاق الفت کا حاصل ہیں میری تشنہ کی زندگی میں
کسی کے گیسو، گداز باندھ، شکیل چہرہ حسیں نگاہیں
غریب دل کی کہانیاں ہیں حطائے غم کی نشانیاں ہیں
یہ گرم گرم آنسوؤں کے جھرمٹ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سی آہیں
گھٹائی آنکھوں سے پی رہا ہوں شراب الفت کے جام رنگیں
پڑی ہوئی ہیں مرے گلے میں شمیم ان کی گداز باہیں

مترجمہ روشن پٹیالوی

دوست

موپاساں کا ایک شاہکار

کالج چھوڑنے کے بہت سال بعد جب وہ گزشتہ سال موسم سرما میں پیرس میں دوبارہ ملے تو ان کی دوستی پھر گہری ہو گئی۔ اس وقت ان میں سے ایک شادی شدہ تھا اور دوسرا کنوارا۔

میرول سال کا نصف حصہ پیرس میں گزارتا تھا اور نصف قریب دیہات کے کسی دیہات میں اخراجات کے لحاظ سے وہ گاؤں کا باشندہ ہونے کی وجہ سے خود کسی معاملے پر بھی آزادانہ طریقے سے غور کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ اور اس کی بیوی پرانی روایات اور رسم و رواج کی دل کھول کر تعریف کیا کرتے تھے۔ ان نیک لوگوں کے خیال کے مطابق بادشاہ اور پوپ کسی صورت میں بھی غلطی کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ فرانس میں پھر سے جلد بادشاہت قائم ہو جائے گی وہ دونوں اور نیک خو تھے۔ گویا انہیں اس بات کا غم گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا کہ کوشش بسیار کے باوجود بھی ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔

میرول اور جوزف اس دوبارہ ملاقات سے ازحد خوش ہوئے۔ کیونکہ کالج کے دنوں میں ان کے گہرے تعلقات رہے تھے اور یہ مراسم تھے بھی بہت خوشگوار اور برادرانہ۔ جوزف صاف گو اور دلیر تھا۔ وہ سخت طبیعت تھا، اور جمہوری نظام کا طرف دار بھی۔ اس کے باوجود میرول اور اس کی بیوی اس سے محبت کرتے تھے۔ خیالات کا تضاد ان کی دوستی کی راہ کے درمیان حائل نہ ہوا تھا انہوں نے اسے اپنے دیہاتی مکان میں چند روز قیام کرنے کی دعوت دی۔

"یہ واقعی قابل افسوس ہے"، میڈم میرول نے کہا کہ ہمارے دوست جوزف سا سلجھا ہوا نوجوان ترقی پسند خیالات کی پیروی کرے، تم اس سخت قومی نقصان اور اضافت کے مجرم بن رہے ہو جوزف!" میرول نے تمانت سے کہا۔

"اور تم ایک کھجوے کی طرح ہو" اس کے دوست نے جواب دیا جس طرح ایک کھجوے کا علم اس کی کھوپڑی تک ہی محدود رہتا ہے۔ اسی طرح تمہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، تم اس سے قطعی بے نیاز ہو گئے ہو۔"

مگر جوزف نے اس طنز کے باوجود اپنے دوست کے مکان، باغ۔ اصطبلوں غرض کہ ہر چیز کی بہت تعریف کی جسے سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں اور اس کی خوش طبعی اور پر لطف صحبت سے وہ بہت ہی محظوظ ہوئے ان کے خیالات کا اختلاف ذرہ بھی کمی لڑائی کی حد تک نہیں پہنچا، اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جوزف بہت ہی ہنس مکھ تھا اور اس کا دوست اور اس کی بیوی انتہائی متحمل مزاج اور رواداری کے قائل تھے۔

"تم بیحد کام سے ہو جوزف!" میرول نے کہا

"میرول تمہارا فکر یہ! میری یہی پختہ خیال تھا کہ تم اسی طرح بیہاں رہنے کی سرگرم دعوت دو گے۔ مجھے تکلف اور ظاہر داری سے سخت نفرت ہے دوست! اور خصوصاً جب ان کا اظہار قلبی دوستوں کے درمیان کیا جائے۔"

اس نے قدیم دنوں کے مطابق لباس زیب تن کیا۔ جس سے میرول اور اس کی بیوی کو قدرے حیرت ہوئی، مگر وہ اس کے حسن سلوک کے قائل ہو گئے۔ کیوں کہ اس نے نکیتوں میں کام کرنے والے دوستوں سے بھی باہر کے آدمیوں کی طرح ہی گفتگو کی۔

ایک روز میرول اپنے دوست کے اعزاز میں ایک ڈنر کا انتظام کیا۔ جس میں اس نے اس علاقے کے پادری کو بھی مدعو کیا۔ پادری ایک موٹا عمر شخص تھا۔ زیادتی کی وجہ سے وہ کافی فربہ اندام ہو گیا تھا۔

جب پادری نے جوزف کی طرف دیکھا تو وہ منہ بنائے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

ذرا ہی دیر بعد جوزف نے ڈنر کے دوران میں ایسی کہانیاں سنائیں جو ایک دیہاتی کی موجودگی میں بیان کی جانی قطعی ممنوع تھیں۔ جوزف نے توہم پرستی کی سخت مخالفت کی اور پادری کو کہہ کر سخت پریشان کیا۔ "جناب آپ کہ خدا کی ہمیں عزت کرنی چاہیئے ضرور۔ مگر کبھی کبھی اس سے خوف بھی ہونا چاہیئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا خدا عقل اور دلیل کا ہی دوسرا نام ہے۔" میرول نے گفتگو کا موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی اور پادری بادل نخواستہ اس سے پیچھا چھڑا گیا۔

پادری کے چلے جانے کے بعد میرول نے تلخی بھرے انداز میں کہا: "جوزف تم پادری کی موجودگی میں حد سے تجاوز کر گئے۔"

جوزف نے گویا اس کی تذلیل کر دی ہو کہا: "نہیں میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ کبھی کبھار ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ انہیں اپنے سے برعکس خیالات سننے کا گوارا کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس نئے خیال سے متفق نہ ہوں اور اپنی مرضی کے مطابق ہی کام کریں

جیسے وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنے لگیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی وقعت بھی
رکھنے لگیں۔

اگلی بار جب میڈم میرول ڈریسنگ روم میں داخل ہوئی تو اس نے میز پر تین
اخبارات "دا ٹیلیگراف" فرنچ ویکلی پیپر "لا ویجیٹس" پڑے ہوئے دیکھے۔ اس نے کبھی ان
اخبارات کے نام بھی ٹھیک طرح نہ پڑھے تھے کہ جوزف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ان
میں سے ایک اخبار اٹھا کر کہا "اس میں" بلیک فوٹ کا لکھا ہوا ایک بہت اچھا مضمون
ہے۔ بہت مشہور اخبار نگار ہے۔ وہ اس مضمون کو بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ وہ
جب پڑھ چکا تو اس قدر محو تھا کہ اس نے میرول کو اندر داخل ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا
تھا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے لئے "گرنڈسلے" اور "کلیرن" نام کے اخبارات لیا کرتا تھا
اس مشہور مضمون نویس کے شان دار فقروں کو حیرت اور استعجاب سے سنتا رہا۔
نپولین بوناپارٹ اور ان کی حکومتوں کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ جوزف کی زبان
سے فرنچ اخبار میں چھپے ہوئے لفظ گویا پھسلنے لگے تھے۔ سامنے کاؤنٹر پر جوزف اخبار میز پر رکھ کر کہنے
لگا "اس مضمون کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اخبارات میں اس قسم کا مفید مواد دیا جانا چاہیئے"
اس نے ان اخبارات کی طرف اپنی چوڑی نظر ڈالی جو میرول لایا تھا۔ اس نے قطعی
مغرورانہ لہجہ میں کہا "تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

میرول نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرے اخبارات ہیں..... اور تمہارے
اخبارات....."

"مگر تمہیں میرے پسندیدہ اخبار تنوع اور جدت خیالات کے پیش نظر ضرور
پڑھنے چاہئیں۔ اگر تم اچھے مضامین پڑھو گے تو تمہیں بہت فائدہ ہوگا اور تمہارے اخبارات
میں اس مسودہ کے حق دار ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے سمجھاتے اس نے ان کے اخبارات
میں کوڑے کی بالٹی میں باہر پھینک دیئے۔

میرول اور اس کی بیوی آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ انہوں نے اخبارات کو
نکالا نہیں۔ گویا کہ وہ کوئی بھنگی نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے خیالات ایک
جھٹکے میں بدل سکتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ اور اس حوصلے کے بعد وہ یقیناً گھر کا مالک
بن گیا تھا۔ اس نے پادری کا داخلہ گھر میں ممنوع قرار دے دیا۔ میڈم میرول اب خفیہ
طور پر گرجا میں جا سکتی تھی۔ دونوں دقیانوسی اور پرانے خیالات کا پرچار کرنے والے
اخبارات کا مطالعہ بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ فوکرات کے وقت چپکے سے کسی دوست
کے ہاں سے یہ اخبارات لانے لگا اور وہ انہیں فالیچے کے نیچے چھپا دیا کرتے تھے۔
جوزف انہیں کہیں دیکھ نہ لے۔ جوزف نے اس سلسلے کا ہر ممکن انتظام بڑے احتیاط
سے کیا۔

جوزف کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے میرول اور اس کی بیوی نے ایک دن

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

25 OCT 1963

مجیب اشرف سائی

شادی کے کارڈ

زندگی بظاہر ایک بہت ہی حسین اور دلچسپ تصویر ہے جس میں پیار و محبت، خوشی و مسرت اور عیش و عشرت جیسے خوش نما رنگ بڑے خوبصورت انداز میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں تمنا، ناکامی اور امیدوں کی تکمیل کا پہلو بہت نمایاں ہے لیکن زندگی کو درحقیقت اتنا خوبصورت سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو زندگی میں درحقیقت شیرینی اور تلخی پیار اور نفرت، خوشی اور غم، آس اور نراسی، امید اور حسرت کی ایک مسلسل کشمکش نظر آتی ہے اور اسی کشمکش کا نام زندگی ہے ——

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے کچھ دن بعد ہی ہمندر کے سر سے اُس کے والد کا سایہ بھی اُٹھ گیا اور اب گھر میں ہمندر کے سرپرست اس کے بڑے بھائی ہی رہ گئے تھے۔ لیکن وہ بیچارے ایک پرائمری اسکول کے ٹیچر تھے۔ تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ ان کا اپنا ہی گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ اس لئے اب ہمندر کی تعلیم آگے جاری رہتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ والد صاحب کسی قسم کی جائداد یا پونجی بھی نہیں چھوڑ گئے تھے جس سے کام چل سکتا۔ بڑے بھائی نے ہمندر کو نوکری کرنے کا مشورہ دیا لیکن نوکری ملنا کوئی آسان کام تو نہیں ——؟ دوسری طرف ہمندر کا خیال تھا کہ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے صرف میٹرک ہی ہونا کافی نہیں ہے۔ اس کے دل میں اور زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کس طرح جاری رکھا جائے؟ اس لئے ہر پہلو پر غور کرنے کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ پہلے دو ایک سال کہیں نوکری کی جائے اور پھر کچھ پیسے کما کر تعلیم کمر کی جائے۔

موسم گرما کی پوری چھٹیاں تلاش معاش میں گزر گئیں۔ جولائی اور اگست کے مہینے بھی گزر گئے۔ لیکن نوکری کہیں نہ مل سکی۔ آخر وہ کہاں سے تجربہ کی سند لاتا، اور یہ بھی نہیں تو کالجوں سے سفارشیں فراہم کرتا؟ اسا تو کالجوں میں داخلے بھی اکثر پابند ہو گئے تھے۔ اسے یہ سال ضائع میں بے کار جاتا ہوا نظر آیا۔ خدا خدا کر کے بڑی کوششوں کے بعد ایک نواب صاحب کے یہاں دو بچوں کو پڑھانے کا کام ملا اور ۵۰ روپیہ ماہوار پر ٹیوشن کرنے لگا۔ ہمندر نے سوچا، ۵۰ روپے اس کے گزارے کے لئے کافی ہیں۔ ٹیوشن پڑھانے کے بعد وہ بالکل خالی رہا کرے گا کیوں نہ وہ کسی کالج میں داخلہ لے لے۔ بھاگ دوڑ کر کے ایک کالج میں داخلہ بھی مل گیا۔

دیر سے داخلہ لینے کی وجہ سے ہمندر کلاس میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اُسے اپنے تمام نوٹس پورے کرنے تھے۔ کچھ دن تک تو وہ خاموشی سے کلاس میں جاتا رہا۔ اور غور سے دیکھتا رہا کہ کون کون سے طلبا کلاس میں ہوشیار ہیں کچھ دن میں ہی اُسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ لڑکوں میں کندن اور لڑکیوں میں شیلا کلاس میں سب سے اچھے طلبا سمجھے جاتے ہیں۔ ایک دن ہمندر نے کندن سے نوٹس مانگے۔ لیکن کندن نے بڑے روکھے پن سے نوٹس دینے سے انکار کر دیا۔ فطرتاً ہمندر لڑکوں سے کچھ کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ اس نے اس کا شیلا سے نوٹس مانگنے کی جی نہیں چاہ رہا تھا اور جب کہ اسے ایک طرف سے مایوسی بھی ہو چکی تھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ بھی صاف انکار نہ کر دے۔ بے کار میں خفت ہو۔ اس نے کسی سے نوٹس نہ مانگنا ہی بہتر ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کا خیال یہ بھی تھا کہ لڑکیاں فطرتاً خوش دل اور خوش اخلاق ہوتی ہیں اور خاص طور سے شیلا کے چہرے کی شگفتگی سے تو کبھی یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ انکار کر دے گی۔ چنانچہ ایک دن اس نے کلاس کے پیریڈ کے بعد ہمندر نے شیلا سے نوٹس مانگے۔ شیلا نے بڑی ترنم ریز آواز میں ہمندر سے کہا:

"ہمندر صاحب، میرا خیال ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا ——"

ہمندر بھنا اٹھا، "بڑبڑیا، یہ مجیب لڑکا ہے کوئی کو آپریٹ کرنے کو تیار ہی نہیں ہے، کوئی بدمزاج معلوم ہوتا ہے۔ تو کوئی خوبصورت بہانے تراشتا ہے ——"

شیلا اس کے غصے کو دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی "ہمندر صاحب میں بہانہ تو نہیں تراش رہی۔ یہ حقیقت ہے، آپ شاید برا مان گئے، آپ کو کل ہی اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ کل آپ مجھ سے تمام نوٹس لے لیجئے گا ——"

ہمندر کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے متشکرانہ نگاہ سے شیلا کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ شیلا کی نگاہیں ہمندر کی نگاہوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔ شاید دونوں کی نظروں نے کندن کے پیغام کو سمجھ لیا تھا ——

شیلا کالج کی حسین ترین لڑکی تھی۔ جھیل جیسی گہری آنکھیں شراب کے ساغر، صراحی اور گردن، نرم و نازک لب، جن کو دیکھ کر ہمندر کو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے آخر ہمندر کا دل کوئی پتھر کا دل نہیں تھا۔ کالج میں یہ واقعہ گزرے ہفتے بھر کا تھا۔ ہمندر نے بھی نہایت

کا سکہ جما نا شروع کر دیا تھا۔ ہندہ ذہین ہونے کے ساتھ سنجیدہ مگر خوش مزاج لڑکا تھا۔ اپنی ذہانت، حاضر جوابی اور خوش مزاجی کی بنا پر اس نے گھر والوں اور طلبا میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔

اور جب ایک سال بعد کالج میں انٹر کا ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا تو اس میں فرسٹ آنے کے بعد سے اس کی شہرت اور بڑھ گئی کھیلوں میں بھی وہ پیش پیش رہتا تھا۔ خاص طور سے کرکٹ میں وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کالج کی ہر ایکٹیوٹی میں وہ پیش پیش نظر آتا، چنانچہ دوسرے سال لڑکوں نے ہندہ ہرکر کندن کے خلاف یونین کی صدارت کے لئے اسے کھڑا کر دیا۔ کندن کی بڑی شرمناک ہار ہوئی۔ پتہ نہیں وہ کون سے چار پانچ ایسے لڑکے تھے جنھوں نے اسے ووٹ دیئے تھے۔ کیونکہ سب لڑکے ہندہ کو بدھائیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم نے آپ کو ووٹ دیا ہے۔ ممکن ہے وہ بھول میں اس کے نام پر نشان لگا گئے ہوں۔

ہندہ نے یونین میں آکر طلبا کی ایکٹیویٹیز میں جان ڈال دی۔ بہت سے نئے کلب بنوائے۔ غریب طلبا کو وظیفے دلوائے اور بھی وہ کچھ کر سکتا تھا کیا۔ اب اس کی مقبولیت میں چار چاند لگ گئے تھے۔ کالج کی لڑکیاں اس سے بات کرنے کی بڑی مشتاق رہتی تھیں۔ لیکن ہندہ فطرتاً ڈرپوک تھا۔ کچھ لڑکیوں نے اظہار بھی کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ان سے براہ راست ملنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ البتہ شیلا سے ہونے اور بات کرنے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتا تھا۔ شکل سے اس کے من جلے دوست اس کو متاثر کیا ہوا یا وہ شیلا کے پہلے احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہو۔ بہرکیف بات کچھ بھی ہو، شیلا اور ہندہ کی ملاقاتیں روز بروز بڑھتی گئیں اور دو معصوم دل محبت کے اندھے دیوتا کیوپڈ کی زد سے نہ بچ سکے اور ایک دن ان دونوں کی محبت کے چرچے پورے کالج میں ہونے لگے۔

بی۔ اے میں آنے تک ہندہ اور شیلا سارے ... اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کبھی کبھی شیلا پر غصہ سے اکثر کرتی میں

جا کر بیٹھ جاتے اور دونوں کہیں دور پارک میں بیٹھنے نکل جاتے جہاں اکا دکا لوگ جیسے خنک معدن کی جانب جستہ کے دلچسپ اور رنگین باب پڑھے جاتے۔ دونوں ہری ہری گھاس پر لیٹے ہوئے ایک دوسرے کا زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کرتے۔ چہ دماغ باد داشتے۔

اور پھر ایک دن ہندہ نے شیلا کے صدر کرنے پر اسے بتا دیا کہ ہم دونوں بی۔ اے کر لیں اور اس سے کوئی معقول نوکری مل جائے تو پھر میں اپنی دلہن کو بیاہ کر لے جاؤں گا۔

شیلا نے کچھ ایسے حسرت بھرے انداز سے کہا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو "سچ ہندہ تم مجھے اپنی دلہن بنا سکو گے؟"

اور پھر جھلا کر ہندہ نے کہا "ہاں ہاں شیلا تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ اگر تم راضی ہو تو مجھے تم سے شادی کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ شادی کرنا چاہوں تو میں اب بھی کر لوں۔ لیکن میرے دل میں کچھ امنگیں ہیں، کچھ تمنائیں ہیں، جن کو میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہوں اور شیلا وہ تمنائیں یہ ہیں۔ شادی سے پہلے ایک خوبصورت چھوٹا سا اپنا ذاتی مکان۔ تھوڑے سے مناسب اور بنیادی ضروری قسم کے زیورات اور پھر شادی کی ہر رسم بلکہ ہر رسم اس دھوم دھام سے منائوں گا جس کو یہ موجودہ نسل تا بد یاد رکھے گی۔"

ہندہ کی گفتگو حالاں کہ شوخی کے انداز میں چل رہی تھی لیکن اس کے جذبات کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں تھا اور شیلا نے اپنی مزید تسکین کے لئے اور پکا ثبوت حاصل کرنے کے لئے ایک طنزیہ تیر پھینکا اور مسکراتے ہوئے کہا "ہندہ سنا ہے جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ——"

ضروری نہیں کہ انسان کی سوچی ہوئی ہر بات پوری ہو جائے"

اور پھر ہندہ اس پر بری طرح بگڑ اٹھا "شیلا تم ہمیشہ ایسی منحوس باتیں کیوں کرتی ہو۔ تم تعلیم یافتہ ہوتے ... اگر انسان میں ہمت ہے قوت ارادی ہے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔"

ہندہ بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا اور شیلا بھی سیکنڈ ڈویژن میں نکل گئی۔ ہندہ نے ان چھٹیوں میں کئی درخواستیں دیں۔ انٹرویو کال آئے۔ اور خوش قسمتی سے کئی جگہ انتخاب ہو گیا اور ہندہ نے کافی غور و خوض کے بعد ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی نوکری منظور کر لی اور پھر چند ماہ کی ٹریننگ کے بعد باقاعدہ میں تعینات کر دیا گیا۔

شیلا اور ہندہ کی ملاقاتیں جاری رہیں لیکن زیادہ تر خطوط کے ذریعے۔ کبھی کبھی ہندہ مل کر جاتا اور شیلا کے ساتھ خوش گوار لمحے گزار کر چلا جاتا۔ اور اب تو شیلا نے بھی اپنے والدین کو اس بات پر راضی کر لیا تھا۔ والدین معقول تھے سوچا لڑکی تعلیم یافتہ ہے اپنی اچھائی برائی خود سمجھتی ہے۔ چنانچہ شروع میں تو مخالفت کی بھی کہ پتہ نہیں ہندہ کس ذات اور گھرانے کا لڑکا ہے لیکن بعد میں لڑکی کے زیادہ ضد کرنے پر وہ بھی راضی ہو گئے ایسا صرف ہندہ کے فیصلے کا انتظار تھا۔ ہندہ کو دو سال نوکری کرتے گزر چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اس نے شادی کرنے کی تاریخ کا فیصلہ ہی نہیں کیا تھا۔ ادھر شیلا کی بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی

جب ہندہ کا تبادلہ ملی گڑھ ہو گیا تو شیلا اور ہندہ کی ملاقاتیں اور زیادہ ہونے لگیں اور پھر ایک دن ہندہ نے شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ وہ مکمل تیاری کر چکا تھا۔ ایک چھوٹا سا مگر خوبصورت مکان بنوا لیا تھا شیلا کے لئے اوسط درجہ کے جدید فیشن زیورات بنوا لئے تھے اور گھر میں آرام اور ضرورت کی ہر چیز خرید لی تھی دونوں طرف تیاریاں شروع ہو گئیں۔

حالاں کہ ہندہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور چاہتا تو بڑی سادگی سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن دل کی امنگیں ہی تو تھیں۔ کیا ہوا جو اس کی ماں نہیں تھی کیا ہوا۔ جو اس کا باپ گزر چکا تھا۔ لیکن ماں باپ اشکوں کے علاوہ میں زندہ تھے۔ ان کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

ناردرن ریلوے

نوٹس

یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء سے نام ٹیبل میں عام تبدیلیاں ہوئی ہیں اور چند ایک تھرو گاڑیوں کی رفتار بڑھا دی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

(۱) نئی گاڑیاں جو جاری کی گئیں

(i) 55 اپ / 54 ٹاؤن ایکسپریس مابین دہلی اور لکھنؤ بواسطہ کان پور

(ii) 1 ایم، ڈی، ایف / 2 ایم، ڈی، ایف مابین نئی دہلی اور فرید آباد

(iii) 3 ڈی، پی / 4 ڈی، پی مابین دہلی اور پانی پت

(iv) 5 ایس یو مابین سہارن پور اور انبالہ چھاؤنی

(v) 2 ایس یو مابین انبالہ سٹی اور سہارن پور

(۲) گاڑیاں جو بڑھائی گئیں

(i) 3 ایم، ڈی، ایس / 3 ایم، ڈی، ایس شٹلز جو مابین دہلی صفدر جنگ اور نئی دہلی چلتی ہیں کو بڑھا کر غازی آباد تک اور سے کر دیا گیا اور کا دوبارہ نمبر 1 ڈی، ایس، جی / 2 ڈی، ایس، جی کر دیا گیا ہے۔

(ii) 1 ایم، ڈی، ایس / 4 ایم، ڈی، ایس شٹلز جو مابین دہلی صفدر جنگ اور نئی دہلی چلتی ہیں کو بڑھا کر دہلی کنٹونمنٹ تک اور سے کر دیا گیا ہے اور کا دوبارہ نمبر 4 ڈی، ایم کے / 3 ڈی، ایم، کے کر دیا گیا ہے

(iii) 2 کے، بی پی ڈیزل ریل کار جو مابین پانی پت، جیند، دہلی کنٹونمنٹ چلتی ہے کو بڑھا کر دہلی تک کر دیا گیا ہے۔

(iv) 1 کے، ایس، بی ڈیزل ریل کار جو مابین دہلی کنٹونمنٹ اور شکوہ بستی چلتی ہے کو بڑھا کر دہلی تک کر دیا گیا ہے۔

(v) 1- ایم، بی / 2- بی، آر سی پسنجر جو مابین انبالہ اور سہارن پور چلتی ہے کو بڑھا کر سنڈیلہ تک اور سے کر دیا گیا ہے۔

(vi) 1- بی، آر، سی / 2 بی، آر، سی پسنجر جو مابین ریواڑی اور پٹودی چلتی ہے کو بڑھا کر رتن گڑھ تک اور سے کر دیا گیا ہے اور اس کا دوبارہ نمبر 3 بی، آر، آر / 4 بی، آر، آر کر دیا گیا ہے۔

(۳) جن گاڑیوں کا رخ بدل دیا گیا

(i) 353 اپ / 354 ڈاؤن نئی دہلی سیکشن پر بلاک نمبر 1 ایف، ٹی، ڈی / 2 ایف ٹی، ڈی مابین فرخ آباد اور دہلی چلے گی

(ii) 4 اے، ٹی، ایف / 5 اے، ٹی، ایف جو آگرہ چھاؤنی اور فرخ آباد کے درمیان چلتی ہیں۔ مابین آگرہ چھاؤنی کان پور سٹیشن گی ان گاڑیوں کے مقامات ہی، ٹی، ڈبلیو اور سی، این، پی کے درمیان ہی ہیں گے جو اب پی ای / 2 سی، پی، ای کے ہیں جو گاڑیاں کہ اب منسوخ کر دی جائیں گی۔

(۴) گاڑیاں جو منسوخ کر دی گئیں

(i) 351 اپ مابین سہارن پور اور انبالہ

(ii) 352 ڈاؤن مابین انبالہ سٹی اور سہارن پور

(iii) 353 اپ مابین لکھنؤ اور دہلی

(iv) 354 ڈاؤن مابین دہلی اور لکھنؤ

(v) 1 سی، پی، ای مابین کان پور اور ایٹاوہ

(vi) 2 سی، پی، ای مابین ایٹاوہ اور کان پور

(vii) 3 اے، ٹی، ایف مابین فرخ آباد اور آگرہ چھاؤنی

(viii) 4 اے، ٹی، ایف مابین آگرہ چھاؤنی اور فرخ آباد

(ix) 9 کے، ایس مابین کالکا اور شملہ

(x) 10 کے، ایس مابین شملہ اور کالکا۔

(۵) نئے کنکشن جو مہیا کئے گئے

(i) 2 این، بی سمہ 6 بجے این، ایل دہرانا 4 بجے، این ایل واقع نکودر

(ii) 1 ایل، بی 4 ایل، ایس واقع لدھیانہ

(iii) 9 بجے، ایچ سمہ 350 ڈاؤن جالندھر چھاؤنی پر

(iv) 347 اپ سمہ 4 ایل، بی ایف واقع فیروز پور چھاؤنی

(v) 1 ایس، ایف سمہ 7 اپ واقع شکوہ آباد

(vi) 1 بی ایم، بی سمہ 3 بی، بی، بی واقع بیکانیر

(vii) 354 ڈاؤن اور 361 ڈاؤن سمہ / پی، ڈی، بی واقع دہلی

(viii) 351 اپ سمہ 19 اپ واقع لکسر

۶۔ گاڑیوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

(i) نمبر 60 ڈاؤن سری نگر ایکسپریس نئی دہلی پر بجائے 8 گھنٹے 40 منٹ کے 6 گھنٹوں پر پہنچے گی

(ii) نمبر 28 ڈاؤن فلائنگ میل (پرانا نام امرت سر میل) نئی دہلی پر 21 گھنٹے 20 منٹوں کی بجائے 21 گھنٹے 5 منٹوں پر پہنچے گی۔

(iii) نمبر 27 اپ فلائنگ میل (پرانا نام امرت سر میل) امرت سر پر 22 گھنٹوں کی بجائے 21 گھنٹے 35 منٹوں پر پہنچے گی۔

(iv) نمبر 18 اپ سماس جنتا، دہلی سے 11 گھنٹے 45 منٹوں کی بجائے 11 گھنٹے 35 منٹوں پر روانہ ہوگی

(v) نمبر 37 اپ پنجاب میل فیروز پور پر 6 گھنٹے 55 منٹوں کی بجائے 6 گھنٹے 35 منٹوں پر پہنچے گی۔

(vi) نمبر 38 ڈاؤن پنجاب میل فیروز پور سے 20 گھنٹے 50 منٹوں کی بجائے 21 گھنٹے 10 منٹوں پر روانہ ہوگی۔

(vii) نمبر 1 بی ڈی، بی دہلی جنکشن فاسٹ پسنجر دہلی سے 14 گھنٹے 5 منٹوں کی بجائے 15 گھنٹوں پر روانہ ہوگی اور ٹھنڈہ ایک گھنٹہ 55 منٹوں پر پہنچے گی۔

(viii) 12 ڈاؤن دہلی ہوڑہ ایکسپریس دہلی سے 22 گھنٹے 10 منٹوں کی بجائے 22 گھنٹے 5 منٹوں پر روانہ ہوگی اور مغل سرائے 15 گھنٹے 50 منٹوں پر پہنچے گی۔

(ix) 93 اپ جودھپور میل دہلی سے 19 گھنٹے 30 منٹوں کی بجائے 20 گھنٹے 10 منٹوں پر روانہ ہوگی۔

(x) 213 اپ دہلی۔ اجمیر پسنجر دہلی سے 20 گھنٹے 5 منٹوں کی بجائے 19 گھنٹے 20 منٹوں پر روانہ ہوگی۔

(xi) 2 بی بی، آر۔ بیکانیر ریواڑی پسنجر بیکانیر سے 8 گھنٹے 5 منٹوں کی بجائے 9 گھنٹے 20 منٹوں پر روانہ ہوگی اور ریواڑی 22 گھنٹے 20 منٹوں پر پہنچے گی۔

(xii) اے، ایم، بی بیکانیر مرشار روڈ پسنجر بیکانیر سے 3 گھنٹے 45 منٹوں کی بجائے 7 گھنٹے 40 منٹوں پر روانہ ہوگی۔

(xiii) 11 اپ ہوڑہ دہلی ایکسپریس دہلی پر 6 گھنٹوں کی بجائے 6 گھنٹے 20 منٹوں پر پہنچے گی

(xiv) 67 اپ ہوڑہ بمبئی بالا ڈیلی جنتا ایکسپریس مغل سرائے سے 0 گھنٹے 42 منٹوں کی بجائے 3 گھنٹے 7 منٹوں پر روانہ ہوگی اور الہ آباد 5 گھنٹے 55 منٹوں پر پہنچے گی روانگی 6 گھنٹے 15 منٹوں پر ہوگی۔

(xv) 48 ڈاؤن حیدرآباد ایکسپریس الہ آباد پر 7 گھنٹے 25 منٹوں کی بجائے 10 گھنٹے 25 منٹوں پر پہنچے گی اور 10 گھنٹے 50 منٹوں پر روانہ ہوگی اور حیدرآباد 14 گھنٹے 45 منٹوں پر پہنچے گی۔

(xvi) 42 ڈاؤن مسوری ایکسپریس دہلی پر 6 گھنٹے 15 منٹوں کی بجائے 6 گھنٹوں پر پہنچے گی۔

(xvii) 9 اپ دون ایکسپریس ڈیرہ دون 6 گھنٹے 15 منٹوں کی بجائے 9 گھنٹے 50 منٹوں پر پہنچے گی

(xviii) بے، ایم، بی بدایوں۔ میرٹھ روڈ پسنجر بدایوں سے 17 گھنٹے 5 منٹوں کی بجائے 5 گھنٹے 30 منٹوں پر روانہ ہوگی اور میرٹھ روڈ پر 9 گھنٹے 45 منٹوں پر پہنچے گی۔

(xix) 4 بجے ایم۔ بی میرٹھ بدوامی پیسنجر میرٹھ سٹی سے 10 گھنٹے 10 منٹوں کی بجائے 12 گھنٹے 40 منٹوں پر روانہ ہوگی اور بدوامی 8 گھنٹے 16 منٹوں پر پہنچے گی۔

(xx) 108 پ کلکتہ جی ٹی پیسنجر کلکتہ سے 20 گھنٹے 20 منٹوں کی بجائے 19 گھنٹے 15 منٹوں پر روانہ ہوگی۔

7-(اے) گاڑیوں سے ایئر کنڈیشنڈ اکومڈیشن واپس لے لی گئی

(i) 91 ڈبہ اور 92 ڈاؤن بیکانیر میل جو مابین دہلی اور بیکانیر چلتی ہے ایئر کنڈیشنڈ اکومڈیشن واپس لے لی جائے گی (کم اکتوبر 1963ء سے)

(ii) 41 ڈبہ اور 42 ڈاؤن مسوری ایکسپریس مابین دہلی اور ڈیرہ دون سے ایئر کنڈیشنڈ اکومڈیشن واپس لے لی جائے گی (16 اکتوبر 1963ء سے)

7-(بی) تھرو سیکشن کیریجز کا اجرار

	گاڑی نمبر	کلاس آف اکومڈیشن	تعداد بوگیاں
(i)	کلکتہ پوسٹل دہلی	84 اور 85	I اور III ایک
(ii)	ایسٹرن	39 اور 40	III ایک
(iii)	الٰہ آباد دہلی	11 اور 12	I ایک

7-(سی) مہیا کرنا I اور II کلاس اکومڈیشن

دہلی ایریا میں چلنے والی مندرجہ ذیل مقامی شٹل گاڑیوں پر I اور II کلاس جگہ کا انتظام کیا گیا ہے

ٹرین نمبر	اسٹیشن مابین
(i) 1 ڈی۔ ایس بی / 2 ڈی۔ ایس جی	دہلی۔ صفدر جنگ ۔ غازی آباد
(ii) 1 ڈی۔ این کے تا 4 ڈی۔ این کے	دہلی۔ صفدر جنگ
	دہلی ۔ کشن گنج
(iii) 1 ڈی۔ کے۔ ایس / 2 ڈی۔ کے۔ ایس	دہلی۔ صفدر جنگ۔ شکوربستی / روہتک
(iv) 1 ڈی۔ ایچ۔ ڈی / 2 ڈی۔ ایچ۔ ڈی	دہلی صفدر جنگ ۔ دہلی

چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ

چمپا

آفتاب اختر

چمپا حسین تھی۔ یہ شہری عورتوں کی طرح مصنوعی خوبصورتی سے سنورا نہیں آتا تھا، اگر وہ سنورنا بھی چاہتی تو اس کے لئے اُس کا بوڑھا باپ اپنی تنگ دستی کے باعث، بیسیوں کریم، پاؤڈر اور غازہ وغیرہ کہاں سے لا کر دیتا؟ وہ تو ایک کسان تھا اور کسان بھی کیسا غریب۔ وہ ایک معمولی سے خس پوش مکان میں رہتا تھا۔ دو بیل اور ایک گائے اُس کی زندگی کی کل کائنات تھی۔ بیوی مر چکی تھی۔ اولاد میں صرف ایک لڑکی چمپا اس کی زندگی کا سہارا تھی۔

وہ چمپا کے کہنے پر بھی اُسے ہوا میں ایک نئی دھوتی اڑا نہ دے سکا تھا لیکن پھر بھی اُس کے حسن و شباب کا یہ عالم تھا جیسے جوانی نے اپنے حسن و رعنائی کا سارا زیور اسی پر صرف کر دیا ہے۔ جس سے نگاہیں لذت اندوز ہو جاتی ہیں۔ ماں کی چال کی مستی ندی کی مستانہ روی کو بھلا سکتی تھی۔ بات کرتی تو آواز سے موسیقی برستی۔ بھلے بھلے سننے والے اس کی متنوع آواز سے مسحور ہو جاتے لیکن وہ اپنی ان خوبیوں سے واقف نہ تھی۔ وہ ایک بہاتی دوشیزہ تھی۔ الھڑ، قطعی الھڑ۔

ایک دن وہ اپنے مویشی چرا رہی تھی۔ بارش موسلا دھار برس کر تھم چکا تھا۔ کبھی کبھی سی سی گرگرا ہٹ کے ساتھ بجلی چمک جاتی تھی۔ بادل ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے تیزی سے آگے کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سست ہوا چل رہی تھی۔ قریب ہی تالاب تھا۔ جہاں سے مینڈک ٹرٹر کئے جا رہے تھے۔ جانور جنگل کی ہری ہری گھاس چرنے میں مشغول تھے۔ مناظر فطرت سے مجبور ہو کر وہ ایک گیت الاپنے لگی۔ فضا سے گیت و مستی کی بارش ہونے لگی۔ جنگل کے پتے پتے سے آثار بے خودی نمایاں ہونے لگے۔ ا ۔ ۔ ۔

ٹھیک اُس وقت چمپا موسم کی سرمستی سے مدہوش ہو کر کوئی تان لگا رہی تھی۔ اسی علاقہ کا تھانیدار گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ چمپا کی مسحور کن آواز سے مدہوش ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب کچھ نظر نہ آیا تو آواز کی طرف چل دیا۔

چمپا تالاب کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ اس وقت چمپا بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ تھانے دار چمپا کے حسن کا جادو چل گیا۔ وہ اس کے حسن کی تاب نہ لا سکا اور گھوڑے سے اُتر پڑا۔ چمپا اپنے ناگن جیسے بال منہ سے ہٹاتے ہوئے اُس کے چہرے پر ایک عجیب انداز سے نظر ڈالی۔ فضا خاموشیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور اُس سے پوچھا ــــ

"آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں؟"

"حسن کی دیوی کو"

چمپا نے پھر کہا "لیکن یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں"

"تم کس قدر بھولی ہو۔ مجھے جس چیز کی تلاش ہے وہ تم ہی میں جلوہ گر ہے"

چمپا نے ماتھے پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا "لیکن آپ کا مطلب؟"

"مطلب تو کچھ نہیں"

"تو پھر آپ یہاں سے جائیے" چمپا نے منہ بھا کر جواب دیا۔

وہ جانے کی بجائے اُس سے پھر بولا "کیا تم اپنا نام بتا سکتی ہو؟"

پہلے تو چمپا جھجکی پھر مسکرا دی اور بولی "میرا نام چمپا ہے اور میرے باپ کا نام ہے سودھ سنگھ۔ میں سامنے والے گاؤں میں رہتی ہوں" گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ چمپا نے پھر دریافت کیا۔

"کیا آپ پولیس والے ہیں۔ اگر آپ پولیس والے ہیں تو یہاں کیوں آئے۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے؟"

وہ کچھ سہمی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ تھانیدار نے اس کے اُسے دلاسا دیا۔

"تم فکر نہیں۔ میں تو ادھر سے جا رہا تھا اچانک تمہارے گانے کی آواز سن کر رک گیا۔"

لیکن اس سے چمپا کی کچھ تسلی نہ ہوئی۔ وہ ڈنڈا اٹھاتے ہوئے بولی "اگر آپ کو میں تو میں اپنے بوائیفرینڈ کو بلا لے جاتی ہوں" اور جانوروں کی طرف چل دی۔

اس کی چمپائی ہوئی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ چمپا کو مرعوب دیکھ کر اس کی آتش شوق بھڑک اٹھی۔ اُس نے پیچھے سے چمپا کا دوپٹہ پکڑ لیا اور گھوڑے پر سوار کرنا چاہتا تھا کہ چمپا کا شکاری خون جوش میں آگیا اور ایک بھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ کر اُس نے تھانے دار کے ایک مونچھ کا بال نوچ لیا اور چھلانگ جا کر کھڑی ہو گئی۔ غصہ سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ چیخ پڑی۔

"اور کہئے، ذلیل! تو بڑی طاقت کے نشے میں میری آبرو لینا چاہتا ہے۔ لیکن یاد رکھ جب تک مٹھا کی نسل کا ایک قطرہ بھی میرے جسم میں باقی ہے تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اب اگر تو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سوچ لے میری پہلی ہی آواز پہ سیکڑوں سر دھڑ کا ساتھ دیں گے، اور پھر تجھے بھاگنا بھی موقع نہ دے گا۔"

چمپا کے بگڑے ہوئے تیور اور موقع کی نزاکت کا بخوبی اندازہ لگا کر کہیں واقعی آدمی نہ آجائیں، وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گھوڑے پہ سوار ہو گیا اور آنکھ مارتے ہوئے چل دیا۔ لیکن چلتے وقت بولا "اگر تیری ہیکڑی نہ بھلا دی ہو تو تھانیدار نہیں۔"

وہ دن بھر اس معصوم لڑکی کو پھانسنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ کافی غور کے بعد اس نے اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعہ اس کے گاؤں میں نقیب قرار دی۔ دوسرے ہی دن سورج سنگھ کو مشتبہ قرار دے گرفتار کرا لیا۔

چوکیدار اور نمبردار کے بیان لئے گئے۔ دونوں نے بتایا کہ رات سورج سنگھ اپنے مکان سے غائب تھا۔ زمیندار نے شہادت دی کہ انھوں نے علی الصبح اسے پچھم سے آتا ہوا دیکھا تھا اور وہ ان کو دیکھ کر راستہ کترا گیا تھا اس کی بغل میں کچھ دبا ہوا بھی تھا۔ یہ سب بیان تھانے دار کی مرضی سے دیئے گئے تھے۔ چوکیدار، نمبردار اور زمیندار صاحب کے بیانوں سے سب حیران تھے، اس لئے کہ رات اکیرتن تھا اور بے چارہ سورج اس میں شریک تھا۔ لیکن کسی میں ہمت نہ تھی کہ تھانے دار کو جھٹلاتا۔ چمپا نے مگر دان کے بیانوں کی تردید کی لیکن تھانے دار نے ڈانٹ بتائی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی رحم و کرم کی التجاؤں پر کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔ سورج سنگھ کا دل بھر آیا۔ اس نے چمپا کو دلاسا دیا۔

"تو مت گھبرا۔ ایشور کی لیلا بڑی بلا ہیں۔ وہ تمہاری رکشا کرے گا۔ نہ جانے پچھلے جنم میں کون سے برے کرم کئے تھے جن کا آج بھوگنا پڑ رہا ہے۔"

سورج کی آنکھیں بھر آئیں، وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن بول نہ سکا۔ چمپا تھانے دار کا اشارہ پا کر اسے لے چلے گئے۔ وہ دور تک قیدی کو بڑھتا ہوا دیکھتا رہا اور چمپا کے غم کی کہانی حد تک جنوں میں تبدیل ہو گئی۔ گاؤں کی عورتیں اسے سمجھا کر واپس گھر لے آئیں۔ لیکن گھر میں اسے خوشی کے کوئی آثار نہ نظر آئے۔ وہ گھر جس کے کونے کونے میں خوشی ناچتی تھی اب ویران معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ابھی کوئی جنازہ یہاں سے نکلا ہو۔ ہاں اس کے کھرے اس کے پتا کی زندہ ارتھی نکل رہی تھی۔

شام ہو گئی، لیکن چمپا نے گائے کی سانی بھی نہ کی اور بیلوں کو چارہ بھی نہ ڈالا، غم کی فراوانی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اس کے دماغ میں تھانیدار کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "اگر تیری ہیکڑی ....."

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گردش کرتے اور ہر خیال دوسرے خیال کو روکتا ہوا اُمڈ جاتا ——

گاؤں کی عورتوں اور مردوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس کی بے کسی پر سب کو رحم آرہا تھا۔ لیکن جب وہ یہ کہتی کہ میرے باپو کو چھڑا دو تو سبھی کانوں پہ ہاتھ رکھتے "ناگی نا، یہ ہمارے بس کی بات نہیں، ہم بھلا سرکار دربار کیا جانیں۔"

ایک طویل بحث کے بعد سوچکر بھیر سنگھ چمپا کو زمیندار کے پاس لے گیا۔ اور اس معاملے میں سفارش کرنے کی درخواست کی۔ وہ پہلے تو پینے پھر حقے کا دم لگایا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے

"سورج سنگھ چوری میں پکڑا گیا ہے جرم بہت سنگین ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹے ہو تم! میرا باپو چور نہیں ہے۔ میرے باپو نے کبھی چوری نہیں کی۔" وہ چیخ چیخ کر خاموش ہو گئی۔ لیکن بھیر سنگھ کے کہنے سے چمپا نے پھر خوشامد کی۔ زمیندار صاحب بولے "اگر دو چار سو خرچ کرنے کے لئے ہوں تو البتہ کچھ ہو سکتا ہے۔ شاید سورج چھوٹ جائے، اس کے سوا اور تو کوئی اُمید نہیں۔"

اسی دوران میں گاؤں کا نمبردار بھی چوکیدار کے ساتھ آگیا اور کڑک کر بولا:۔

"دو گائیں بڑے دیا دو ہیں، اگر سو روپئے سو دے کر اُن کے پیر چھوٹ جائیں تو وہ جرمانہ سُود کو چھوڑ دیں گے۔" اور چلم پہ آگ رکھتے ہوئے پھر بولا "اگر دیر ہو گئی تو پھر قرقی نا، کچھ نہ ہو گا۔"

چلم اب چوکیدار کے منہ میں مگن ہو چکی تھی، دھواں بل کھا رہا تھا۔ زمیندار صاحب مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جیسے کچھ سوچ رہا تھا شاید قرقی سے شادی کرنے کے متعلق اور نمبردار مظلوم آنسوؤں کا روپ بدل رہی تھی۔

وہ دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی

"مگر میں اتنے روپے لاؤں گی کہاں سے؟ میں نے اتنے روپے تو کبھی سپنے میں بھی نہیں دیکھے۔" چمپا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، آخر کار طے یہ پایا کہ چمپا اپنے بیل اور گائے بیچ ڈالے اور زمیندار صاحب کو دے کر اپنے باپو کو چھڑانے کی کوشش کرے ——

صبح کا وقت تھا، گاؤں میں فیر معمولی چہل پہل تھی۔ گھروں میں چکیاں چل رہی تھیں۔ بلوائے ہوئے بیل کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ عورتیں گھروں کا کوڑا باہر پھینک رہی تھیں۔ کوئی سر پر

رکے پانی بھر گیا تھا۔ اور کوئی پانی لینے کنویں
رہی تھی۔ لیکن چیچا اس تمام چہل پہل سے الگ ایک
میٹھی رو رہی تھی۔

کل سے اس کے منہ پر ایک مکھی تک نہ لگی تھی۔ اس
نے پنڈتائن کے کہنے سے شربت پینے کو تیار ہوئی تھی۔
وہ منہ ہاتھ دھو ہی نہ پائی تھی کہ ایک سپاہی مکھیا اور
سردار کے ساتھ آدھمکا اور چیچا سے تھانہ چلنے کو کہا۔
مکھیا کے پیروں پر گر پڑی اور بکنے لگی۔

"مکھیا دادا مجھے بچالو۔ ایشور کے لئے مجھے تھانے
نہ بھیجو، نہیں تو میرے ساتھ چلو۔" لیکن وہ راضی نہ ہوا
چیچا کو بیچارہ اکیلی وہاں جانا پڑا۔

داروغہ جی بیٹھے ایک ملزم کو اٹھا بٹھا رہے تھے
منشی جی بے دردی سے کسی کو اپنے زور سے پیٹ رہے تھے
کانپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بجلی ایک لمحہ کو گھوم گئی۔
اس کا بوڑھا باپ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو کر گر
... جیسے وہ مر گیا۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رک گئی۔
... اور وہ بیہوش ہی گئی۔

چیچا پر داروغہ جی کے چہرے پر ایک ہلکی سی
مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے کوئی مشاق شکاری آسانی سے
... والے شکار کی طرف دیکھ کر مسکرائے، اور
... نگاہیں پھیر لے۔ وہ اپنے گوارٹر کے اندر چلا
... اور ملزم دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا، نہ جانے کتنی
... دی ہوں گی اس نے چیچا کو۔

سپاہی تھانے دار صاحب کے سگنل کو سمجھ گئے
... کے پیچھے وہ چیچا کو بھی اندر لے گئے۔ اپنے آپ کسی
کام سے باہر آگئے۔ اب صرف چیچا ہی بچا اور داروغہ
کا ساتھ دینے کے لئے اندر رہ گئی۔

اب وہ بولے

"اب تم سمجھ گئی ہوگی۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔
... ایسے آدمی کو بند کر دینا تو ذرا دہنی کا کام ہے اگر
... تو بڑوں بڑوں کو پھانسی دلا دوں۔"

"ایک داروغہ ہی، سمجھ دار نے آپ کو بڑا بنایا
ہے تو آپ کو نیائے کرنا چاہئے۔ اگر میرے باپ نے چوری کی
ہے، تو بھگوان ضرور اسے سزا دے گا، نہیں تو اس کے
یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ کسی دن یہ کسور چھوٹ جائے گا"
اس پر اس نے بہت زور کا قہقہہ لگایا۔

"یہ تمہارا بھولا پن ہے یا پھر غلطیں کسی نے بہکایا
ہے۔ ورنہ پولیس کا مار کبھی جیلے ہے۔ اب بھی سچ کہنا مانو
کل ہی تمہارا باپ چھوٹ جائے گا" وہ بولا "تمہارے یہ
ظالم ہاتھ اس قابل نہیں کہ تم ان سے گوبر... ڈورو۔"

وہ یوں ہی کہتا رہا۔

"تمہارا چہرہ اس قابل نہیں ہے کہ دھوپ میں جھلسے
تم میرے یہاں رہو۔
میں تمہارے ہاتھوں کو زیور سے لاد دوں گا
تمہارے جسم کو زرق برق ساڑھیوں سے ڈھانک
دوں گا۔

یہ بیوقوف لڑکا تم پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
بولو تم میرے ساتھ شا... دی..."

وہ ایک دم اس پر جھپٹ پڑا۔ اس کی آنکھوں میں
عجیب چمک تھی۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا، جسم میں ہلکی
لرزش پیدا ہو گئی اور وہ پسینے میں تر ہو گیا۔ وہ اس کا ہاتھ
پکڑ کر اپنے سے قریب کرنا ہی چاہتا تھا کہ چیچا دیں پڑی
ہوئی گنڈاسی تان کر صحیح ہو گئی۔ داروغہ جی نے ہاتھا پائی
کی۔ لیکن اس نے سانپ کو ڈسنے سے پہلے ہی ختم کرنے کی
کوشش کی، وہ بھوکی شیرنی کی طرح ان پر جھپٹی۔ گنڈاسا
اس کی ران کو چیرتی ہوئی ہڈی تک اتر گئی۔ وہ گر پڑا۔
چیخ کی آواز سے سپاہی اندر آگئے۔

چیچا حوالات میں بند کر دی گئی۔ اس سیکڑوں چیچاؤں
کی طرح جو ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے ہوئے، اپنی عصمت و
عصمت کو بچانے کے لئے سب کچھ کر جاتی ہیں، اپنی جان تک
کی بازی لگا دیتی ہیں۔ لیکن ہندوستانی تہذیب کا سر نیچا
نہیں ہونے دیتیں ——!

ملک کے جواں فکر شعراء کی تخلیقات کا
مرقع جمیل

فکرِ نو

اس مشترکہ مجموعۂ کلام میں مختلف
شعراء کا چیدہ چیدہ کلام یکجا کیا گیا
ہے جو کہ زندہ اور متحرک فن کا وہ شاہکار
ہے جس کی تخلیق کیلئے زندہ ادیب کے خونِ
نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے اور اس
بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ ادب میں
قابل قدر اضافہ کرتے رہیں گے اور
ایک دن آسمانِ ادب پر درخشاں
ستاروں کی مانند چمکیں گے۔

مرتب —— جوہر ہاشمی

کوآپریٹو پبلشرز ۶/۴
دوستارا اسٹریٹ بمبئی نمبر ۹

حضرت خواجہ غریب نواز کی پیدائش سے وصال تک کے حالات

زادِ راہ

عمدہ کاغذ معیاری طباعت قیمت 2/50

مکتبہ شبنم۔ حدیبہ کالج دہلی ۶

مشی تذیر الدین سلیم

اگر اور جیتے رہتے.....!

اس نے البم کا پہلا ورق اُلٹ دیا۔ دوسرے ورق پر ایک بے حد خوبصورت تصویر تھی۔ تصویر کو دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔

"یہ تم ہو۔" اس نے البم میرے طرف بڑھا دیا۔

تصویر پر کسی لڑکی کی تھی۔ کٹ دار جینس پہنے، قمیض کی آستین چڑھی ہوئی تھیں۔ انگلیوں میں کسی پرانی کا احساس صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ چہرہ حسین اور معصوم تھا۔ جیسے دسمبر کی کوئی سرد یخ رات ہو یا شفاف کہر کا گیا ہوا کوئی ٹھنڈا گیت۔ ہونٹ مسکراتے ہوئے اور نہ ہی غصہ۔ اور خوف سے بند تھے۔ بلکہ ایسے لگ رہے تھے جیسے گلاب کی ادھ کھلی کلی ہو جو صبح شبنم کے گداز سے کھلتے کھلتے ایک دم شرما گئی ہو۔

تصویر کے نیچے یہ شعر درج تھا۔

چہرہ ویراں، دل پریشاں، زلف درہم، لب خموش
پھر تو وہ کچھ اور بھی پیارے نظر آنے لگے

بے اختیار اس کا ہاتھ مسکرا اٹھا اور سنی خیز نگاہوں سے بادل کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ موم گرما کی دوپہر کی طرح سپاٹ تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بے پروائی سے دھواں میری طرف اچھال دیا۔ اس کے ہونٹ بے تحاشا کپکپانے لگے تھے۔ اس نے سگریٹ کو ٹیبل پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں بے دردی سے مسل دیا۔ اس کا احساس کئے بغیر کہ کچھ دیر پہلے وہ اسی کی آگ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔!

"تم اس کی پیشانی پر بل کھائی ہوئی زلفوں کو دیکھ رہے ہو؟" دفعتاً اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ان گھنگھریالی لٹوں میں ابھی تک میری انگلیوں کا لمس باقی ہوگا۔ نہ یہ! ان اُلجھی ہوئی زلفوں کو میں نے اپنے ہاتھوں سے کئی بار سلجھایا ہے۔ ان الجھی ہوئی لٹوں پر میرے ہونٹوں کا لمس ابھی تک ہے۔ ہونٹوں پر میرے ہونٹوں کا لمس ابھی تک ہے۔"

آسمان پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کی طرح اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہو چکا تھا۔ میرے لبوں پر تلخی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لیکن میں نے اس وقت تمہارے ہونٹوں پر تمباکو کے ذائقے کا پتہ چلتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"اوہ! مذاق مت کرو نذیر۔ مجھے تو اب سگریٹ کے نام سے بھی متلی ہوتی ہے۔ میرے ہونٹوں کا لمس تو اب تمہارے کیسے بھلا جاؤں؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"بالکل اسی طرح بھول جاؤ جس طرح کچھ دیر پہلے تم نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔" میں نے کہا، وہ تقریباً جھلا گیا۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ کیا محبت بھی سگریٹ ہے؟"

"سگریٹ کے دھوئیں میں جب تم محبت کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے ہو تو سگریٹ میں محبت کو کیوں نہیں محسوس کرتے۔" وہ اور جھلا گیا۔

"تم سے اب کون بحث کرے؟"

"نہیں جمال! میں خفا نہیں کہہ رہا ہوں، کچھ دیر پہلے تم جس سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اس کے ختم ہونے پر تم نے اسے بے دردی سے مسل دیا تھا۔ اسی طرح کچھ دن پہلے تم اس عورت کی محبت سے سرد تھے اور اب وہ تم سے جدا ہو گئی ہے تو اس کی یاد کو ایک ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کی طرح مسل کر اس کی جگہ کسی اور کو دے سکتے ہو؟"

"لیکن کس طرح ــــ؟"

"بالکل اسی طرح جس طرح ایک سگریٹ کے ختم ہونے پر دوسرا سلگا لیا جاتا ہے۔"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر یہ لڑکی تمہیں مجھ ایسی لگی؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔ اس نے ٹیبل پر رکھے ہوئے ڈبے سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"تم نے مجھے دھوکا دیا۔ پہلے تو وہ مجھ سے پیار کا دعویٰ کرتی رہی۔ بعد میں کسی اور سے شادی کر لی ــــ خیر چھوڑو اسے یہ دیکھو ــــ" اس نے البم کا دوسرا ورق اُلٹ دیا۔ تیسرے ورق پر ایک اور تصویر تھی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا

"بقول تمہارے دوسرا سگریٹ۔ مگر میں نے اسے سلگایا ہی نہیں۔ اس کا نام شبنم ہے۔" اس نے البم میری طرف بڑھا دیا۔

یہ بھی ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی ریگستان میں کوئی مسافر چلتا چلتا تھک کر بیٹھ گیا ہو۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ شکیبائی کا کوئی بوجھ اٹھائے محو سفر رہا ہو۔ لیکن اس تمام ویرانیت کے باوجود چہرہ حسین نظر آ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچے کی پیدائش کے وقت بے انتہا تکلیف سہنے کے باوجود عورت کا چہرہ

ہی کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھتا ہے ۔!

اس قصبہ کے بچے بچے کی ایک شخص کو تھا ۔
وہ جو دوست بنے گروش ایام بھی دیکھ
پیار ہی پیار نہ کر ۔ پیار کا انجام بھی دیکھ

"اس لڑکی کی آنکھوں میں جو پانی ہے تم دیکھ رہے ہو۔
..... " اس نے شبنم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ..." وہ اس لئے ہے کہ میں نے انھیں اپنے بوسوں سے تر نہیں کیا ۔ یہ میری طرف بڑھتی رہیں اور میں پیچھے ہٹتا رہا ۔ اس نے مجھ سے محبت کی ۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا ۔ اس لئے کہ میں ایک بار دھوکا کھا کر پھر دھوکا کھانا نہیں چاہتا ۔ مجھے عورت کی محبت پر اعتماد نہیں رہا ۔ پھر بھی محبت کی یاد ابھی تک میرا کلیجہ مسوس رہی ہے ۔" وہ مگ زور زور کے سگریٹ کے کش لینے لگا ۔

"یہاں تم غلط کہہ رہے ہو ۔ پانی کی بوندیں برابر نہیں ہوتیں ۔ ایک بار دھوکا کھانے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ تم دوسری بار بھی دھوکا کھاتے ۔ ہو سکتا ہے اس لڑکی کی محبت سچی ہو ۔" میں نے کہا ۔

"نہیں ، عورت کا وجود ہی مکاری اور بے وفائی پر قائم ہے ۔ اگر وہ خود سے دھوکا نہیں دیتی تو اپنی مجبوری کا روناروتے ہوئے سماج کو الزام دیتی ہے ۔" اس نے سگریٹ کی راکھ انگلی سے جھٹکتے ہوئے کہا ۔

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی ۔ میں نے انکار کر دیا ۔"

"عجیب بات ہے ۔ جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے تھے وہ تمہیں دھوکا دے گئی اور جو لڑکی تم سے شادی کرنا چاہ رہی ہے اسے تم ٹھکرا رہے ہو ۔ ہو سکتا ہے تم ٹھکرانے کے بعد وہ اس قسم کو برداشت نہ کر سکے ۔ اور خودکشی کر لے ۔ عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے ۔ اگر وہ ایسا کر لے تو کیا ایک معصوم لڑکی کی موت کی ذمہ داری تم پر نہیں ہوگی ؟" میری اس بات پر وہ ہنس دیا

"یہ تو نہیں ہوا ۔ اگر اس لڑکی کو مجھ سے محبت ہوتی تو میرے ٹھکرانے پر اسے سخت صدمہ پہنچتا ، اور وہ کچھ کر بھی گزرتی مگر اس کے برخلاف آج اس کی شادی ہو رہی ہے ۔"

"شادی کس سے ؟" میں نے پوچھا ۔

"اشفاق سے ۔ جس کی شادی میں شرکت کے لئے تم آئے ہوئے ہو ۔" کافی کی پیالی ختم کرتے ہوئے اس نے کہا ۔ میری نگاہیں دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال پر جا پڑیں ۔ دونوں سوئیاں گھڑیال کے دو برابر حصوں میں منقسم کرنے جا رہی تھیں ۔

میں وہاں سے چلا آیا ۔ شام آٹھ بجے اشفاق کا نکاح تھا ۔ اشفاق میرا دوست تھا جس کی شادی کے سلسلے میں آج میں یہاں آیا ہوا تھا ۔ جمال بھی اسی گھر میں رہتا تھا ۔

شام آٹھ بجے قاضی صاحب نکاح پڑھانے آئے ۔ اشفاق سے تین بار "قبول کیا" کی گردان کرانے کے بعد یہ الفاظ دلہن سے کہلوانے کے لئے زنان خانے کی طرف چلے ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد سارے گھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا دلہن نے نکاح قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ سارے لوگ پریشان تھے کہ دلہن نے انکار کیوں کیا ؟ اور میں سوچ رہا تھا ۔ کہ دلہن نے یہ کیا کیا ۔ اچھا یا برا ۔ میں یہ نہیں جانتا کہ کس نے صحیح کیا اور کس نے غلط ۔ ہاں یہ جانتا ہوں کہ جمال نے ٹھوکر کھا کر ٹھوکر ہی کھائی تھی ۔۔۔۔

اس بات کی خبر جمال کو دینے کے لئے میں اس کے مکان کی طرف چلا ۔۔۔!

میری آنکھوں میں آنسو تھرتھرا رہے تھے اور میرے ہاتھ میں جمال کی تحریر تھی

"میرے دوست تصویر ! صبح تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے ۔ اس وقت جب بہت دیر ہو چکا ہوگا ۔ شام چھ بجے تمہارے جانے کے بعد سے جانے کیا کیا ہو گیا ۔ بعد کو شبنم کی معصوم صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی اور میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا ۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا ۔ میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونک کر اس کے ہونٹوں کا لمس حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ۔ مگر ان ہونٹوں کے لئے جن کا مجھے احساس کیسے جاتے میں نے ٹھکرا دیا تھا ۔ پھر میں نے سگریٹ کو چھوڑ کے اعتیاد خواب آور گولیوں کی شیشی کی طرف بڑھا اور تھوڑے ہی وقفہ میں پوری شیشی خالی ہو گئی ۔ اس وقت مجھے چکر سا آ رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ شبنم کا نکاح اشفاق کے ساتھ ہو گیا ہوگا ۔۔۔"

تمہارا ۔۔۔ جمال

میری آنکھوں سے لڑھکتے ہوئے آنسو اس تحریر پر گر کے پھیل گئے ۔ چند حروف اپنی ہستی کو کھوتے ہوئے ایک نئی شکل اختیار کر چکے تھے ، اس زخم کی طرح جو بھر جانے کے بعد بھی اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے ۔ رات کہاں سے جمال کے دل میں ابھر کر اسے اپنی زیادتی کا احساس دلایا تھا ۔ اور اب لوگ اس کا جنازہ اٹھا رہے تھے ۔

بقیہ طرحی مشاعرہ ۔۔۔ صفحہ ۳۴ سے آگے ۔

رکھ دیا آپ نے سر جب ان کے پائے ناز پر
عشق جاں پرور ہوا ہے عشق جاں پرور ہوا

چشم دل روشن جبیں اس کی درخشاں کیوں نہ ہو
انساط زیست کا پھر ساز و ساماں کیوں نہ ہو

وہ چلے آئیں تو محفل میں چراغاں کیوں نہ ہو
خلوت دل میں مرے اگر وہ بس جائیں اگر

پرتو حسن کامل ان کا تو ہو جس پر فگن
پھر تو ذرہ ذرہ خلد جاوداں کیوں نہ ہو

آپ کی نظروں میں ہو جب عشق کا پیمانہ چھلکا ہوا
شادماں دل کیوں نہ ہو ، غم تو پریشاں کیوں نہ ہو

اک کرم انجم پر جھکا
قسمت خورشید ہو شب ماہ تاباں کیوں نہ ہو

پھر تو ہر فرش جہاں ہو جب ہر انساط زندگی
عشق جب پورے تو وہ بت جز و انساں کیوں نہ ہو

پھر تو دل لذت کش آزار پیکاں کیوں نہ ہو
ہر خوشی جس کی ہو وہ بھی انساط زندگی

انتہائے غم ہی جب انسان شاداں کیوں نہ ہو
انتہائے شادمانی میں جب کہ آتے ہیں اشک

حل ہو اجرام زمان کیوں نہ ہو
کہ مسلسل گردش جب ہے مقصود ہستی

پھر سفینہ حل کا لذت گیر طوفاں کیوں نہ ہو
زورق ساماں کی نہیں انجم تمام سے نجات

رشید مستی پوری

انسان یا کتا

رائے بہادر اوم پرکاش کو کون نہیں جانتا۔ شہر میں ان کی بڑی ساکھ ہے۔ ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے حکام ان کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ پولیس کے بڑے آفیسروں سے کرادفا چیرا سی تک ان کے نمک خوار ہیں ——— بھگوان نے عزت و شہرت کے ساتھ ساتھ دولت کی بھی گھر کی لونڈی بنا دیا ہے۔ دولت و ثروت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے کاروباری اور معمولی قسم کے لوگ بھی ان کے یہاں قرض لینے نظر آتے ہیں۔ شہر کا جیئر اور پرمار تقریباً ان کا احسان مند ہے ———

آئے دن ان کے یہاں بڑی بڑی اور شاندار پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں اور شہر کے نئی حیثیت اور عزت دار لوگ مدعو کئے جاتے ہیں۔ حاکموں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ لوگ تو ہر وقت پانی لگتے کتے کی طرح ان کی کوٹھی "اوم نواس" میں دم ہلاتے نظر آتے ہیں اور جب دیکھئے ان کی شاندار اور فلک بوس کوٹھی میں حاکموں کا ایک اچھا خاصہ جمگھٹا لگا رہتا ہے ان کے لئے ان کی کوٹھی کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور ان کی ضرورت کی چیزیں انھیں ہر گھڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن غریب کی آہیں اور سسکیاں رائے بہادر کی بڑی لمبی اور اونچی دیواروں کو عبور کر کے ان کے کانوں تک نہیں جا سکتی ہیں۔ غریبوں اور آفت کے ماروں کا ان کی کوٹھی کے دروازوں تک پہنچنا بھی محال ہے

ایسے یہی رائے بہادر ہیں جو کچھ عرصہ قبل صرف اوم پرکاش تھے اور شہر میں ان کی ایک چھوٹی سی بساطی کی دکان تھی لیکن جیلا جو اس کنڑول کا جس نے اوم پرکاش کو آج اتنا بڑا کاروباری اور متمدد عوں کا مالک بنا دیا، شہر میں گرانی بڑھ رہی تھی۔ چیزوں کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کھانے کی اشیاء اور کپڑوں پر کنٹرول ہو چکا تھا۔ لوگ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے گوکھن اور چوکھی قیمتیں دے کر چیزیں خریدتے تھے اور اس طرح سیٹھوں اور کالے بازار کا دھندا کرنے والوں کی تجوریاں لوگوں کے ناجائز روپوں سے بھر رہی تھیں۔

کالے بازار کی ہر جگہ دھوم تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاروباری اور معمولی بیوپاری تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلوں کو طے کرتے جا رہے تھے۔ کل کا معمولی اور ادنیٰ کاروباری آج اچھا خاصہ سیٹھ بن چکا تھا۔

اوم پرکاش نے بھی اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے حاکموں کو اچھی خاصی رشوت دے کر کپڑے اور گھی کی کئی دوکانوں کو اپنے نام کرا لیا۔ اب کیا تھا۔ وارے نیارے ہو گئے۔ اس نے خوب دل کھول کر غریبوں اور لاچاروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ دنیا کی ساری مصیبتیں اور صعوبتیں صرف غریبوں ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور وہ بے چارے صدا سے ہی اس کا شکار ہوتے چلے آ رہے ہیں ———

اب اوم پرکاش کے یہاں لکشمی کی ورشا ہونے لگی دولت اُن کے قدم چومنے لگی۔ کالے بازار کے دھندے نے اتنا زور پکڑا کہ انھیں لاکھوں کروڑوں کا مالک بنا دیا۔ دولت کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و وقعت بھی بڑھنے لگی اور سرکار نے انھیں رائے بہادر بنا دیا۔ رائے بہادر جیسے باعزت خطاب سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی شان اور بھی چمک اٹھی۔ بڑھتی ہوئی دولت کے ساتھ ساتھ اُن کی بھی اصلیت خواہشیں پھر سے جوان ہونے لگیں۔ اور جوانی کی امنگیں ان کے دل میں کروٹیں لینے لگیں ——— ان کی راتیں نئے نئے خیالات اور نئی نئی جوانیوں کے خواب دیکھتے کٹ جاتیں۔ دولت اپنے ساتھ کیا کچھ لاتی ہے اس کا اندازہ رائے بہادر اوم پرکاش کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے ہو سکتا تھا۔

ان کی کوٹھی دن عید اور رات شب برات کا منظر پیش کرتی۔ ہر رات ناچ رنگ اور ہر دن کیف و سرور اور شاندار پارٹیوں کی نذر ہو جاتا تھا

معصوم اور پاکیزہ جوانیاں چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض ان کی فسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھ جاتیں۔ ان کے آدمی نئی نئی کلیوں کی تلاش میں لگے رہتے انھیں چن چن کر رائے بہادر کی سیج کی زینت بناتے۔ رائے بہادر شراب کے نشہ میں دھت اور اڑ کھڑاتے قدموں اپنے مخصوص کمرے میں جاتے اور ان ادھ کھلی کلیوں کو اپنے دست ہوس سے نوچ نوچ کر اپنی تشنگی بجھاتے

میرا نیا نیا تعلق اس شہر میں ہوا تھا رائے بہادر کی شہرت میں نے بھی سنی۔ مذہب کے کاموں میں وہ سب سے آگے۔ باکرتے۔ انھوں نے کئی مسافر خانے اور دھرم شالائے۔ لوگ ان کے مذہب پرست ہونے کی بڑی تعریف کرتے۔ مہینہ میں ایک آدھ بار ان کی عالی شان کوٹھی میں ست نرائن کی کتھا بھی ہوا کرتی۔ کچھ بڑے بڑے تلک دھاری اور بہت قسم پنڈتوں کی خاطر داری بھی ہو جایا کرتی۔ انھیں پنڈتوں اور مہنت کے حلیہ خوروں کے بل بوتے پر ان کی گاڑی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھلا ان کی خاطر داری نہ کرتی ہیں کے نتیجے اور فائدے جب کہ بڑے بڑے

گو میں نے کبھی ان کی شہرت اور مذہب پرستی کے متعلق بات چیت کی تھی لیکن اب تک ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سوچا کرتا تھا کہ شاید کبھی کوئی ایسا موقع نکل آئے اور ان سے ذرا دیر کے لئے ملاقات حاصل ہو جائے۔

آج صبح سے فضا ابر آلود تھی۔ گھٹائیں گھر گھر کر آتی تھیں اور برس کر چلی جاتیں۔ ہوا سرد اور نم آلود چل رہی تھی۔ دوپہر ہوا اپنے پورے شباب پر تھا۔ لوگ گھروں میں گھسے بیٹھے آگ کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کالج کا دن آرام سے گزارا جائے اور گرم گرم لحاف اوڑھ کر چائے کی گرم گرم پیالی چڑھائی جائے۔ موسم اتنا سرد اور خوش گوار تھا (خوش گوار بڑے لوگوں کے لئے) کہ اپنی بھی طبیعت چاہتی تھی۔ لیکن ایک کلرک کی زندگی ہی کیا ہوتی ہے کیا کیا ہے فائلوں اور کاغذوں کی موٹی موٹی گڈیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔۔۔!!

مجھے جب کام کی زیادتی کا پتہ چلا اور یہ معلوم ہوا کہ آج بہت سارے کام انجام دینے ہیں تو آرام کے خیال کو ترک کرنا پڑا۔ اور بادل ناخواستہ دفتر کی طرف چل پڑا۔ تانگہ جا رہا تھا کہ دیر ہو جاتی۔ اس نے تو تانگہ کا راستہ چھوڑ دیا اور کچی کوٹھی کے بغل سے جانا تھا میں نے اسے بند کیا۔

جب کوٹھی کے نزدیک پہنچا تو آنکھیں خیرہ ہو گئیں کیا کوٹھی تھی نئی نویلی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اس کی بناوٹ اور ساخت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج کلکٹر صاحب کی دعوت ہوئی ہے اور اسی سلسلہ میں یہ انتظامات کئے جا رہے تھے۔۔۔ میں کوٹھی کی سجاوٹ اور خوبصورتی کے پرکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ آس پاس کی مطلق خبر نہ رہی۔

اور میرے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ایک بچکانہ کی دردناک آواز میرے کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی میرے دل میں اتر گئی۔

سامنے رائے بہادر اپنی جوان اور خوبصورت دوم بیوی (جس سے حال ہی میں انھوں نے شادی کی تھی) کے ساتھ کئے کو بھوجن کھلانے میں مشغول تھے۔ کتے کے آوارہ اور خارش زدہ کتے ان کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔

بچکانہ نے پھر اس اکڑ اپنے ذہین اور معصوم بچے کا واسطہ دیتے ہوئے کہا

"ماں جی یہ بڑا بھوکا ہے اسے کچھ کھانے کو دیجئے سچ مچ آپ کا بھلا کرے گا۔ یہ بیچ کے مارے تڑپا دیا آپ مجھے بھلے ہی کچھ نہ دیں۔ لیکن اسے تو کچھ دے دیجئے۔ تاکہ یہ ننھی سی جان بھوک کے خونخوار پنجے سے بچ سکے۔"

رائے بہادر نے گرجتے ہوئے اپنے نوکروں کو آواز دی کہ اس کم بخت کو ان کی نگاہوں سے دھکے دیا جائے ان کی نگاہیں اس منظر کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔۔۔"

ان کے نوکروں نے آگے بڑھ کر بچے کو پکڑ لیا اور رائے بہادر یہ کہتے ہوئے "کم بختوں نے جانوروں کو بھوجن کھلانے کا حال کر دیا ہے" روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا ان کتوں کی طرف پھینک دیا جو ان کے سامنے دم ہلا رہے تھے۔ کتے روٹی کے ٹکڑوں کے لئے آپس میں چھینا جھپٹی کرنے لگے اور وہ کلرک بچکانہ حسرت و یاس سے ان ٹکڑوں کی طرف دیکھتی رہی۔۔۔!

اُردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد "قرینے"

ابر احسنی گنوری کی غزلیات کا دوسرا دیوان

جس میں ۲۴۵ غزلیں ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے۔ عام دیوانوں سے ۳ گنا ضخیم ہے

قیمت صرف تین روپے ۲۵ نئے پیسے

غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے۔ یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا۔

ملنے کا پتہ:۔ ابر احسنی گنور ضلع بدایوں (یوپی)

فرحانہ ترنم بانو، حیدرآباد

آنسو ہی آنسو

"کون ہے ڈرائنگ روم میں؟" کس نے جانے کو کہا تھا؟" بیگم نواب کی آواز بلند تھی۔

"میں نسیم ہوں" جواب میں بیگم کی بیٹی نسیم نے کہا۔

"عجیب بے تمیز لڑکا ہے جب سے آیا ہے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ لڑکے ماں کے لاڈلے ہوتے ہیں۔ میرے دادا مرحوم تو ہر وقت مجھے گود ہی میں لئے رہتے تھے۔" نسیم نے جواب دیا۔

"خدا کا شکر قریب تیس سال کے ہوئے ہیں مگر مجال ہے جو کبھی تمہیں آٹھ بجے سے پہلے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔" بیگم نواب نے سوال کیا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں نے کل ایک کتاب میں پڑھا ہے جو لوگ صبح چار بجے بیدار ہو جاتے ہیں، خدا ان کے ہاتھ میں چستی اور صحت کی مزدوری انہیں دیتا ہے۔" نسیم بولی۔

"کتاب میں پڑھا ہے یا ریاض کے تار میں۔" بیگم نواب نے طنزیہ کہا۔

نسیم اوہ! اتنا کہہ کر ہاتھوں کے بچے ٹوٹے کو دباتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ہندوستانی لڑکی کے سامنے اس کے خاوند کا نام لیا جائے۔ تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ پھر نسیم کیوں نہ شرماتی، وہ بھی تو کھنڈ میں پیدا ہوئی تھی اور اس کی منگنی ریاض کے ساتھ بچپن ہی سے ہو گئی تھی۔ نسیم ڈرائنگ روم سے نکل کر چھت پر پہنچی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان ستاروں کو دیکھنے لگی جو تمام رات پہرہ دی آفتاب سے ٹکنے کے بعد اب چھپنے پڑ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے نسیم فطرتاً شاعرانہ طبیعت کی لڑکی تھی۔ وہ بھی ان ستاروں کی طرح آفتاب کی نہریں کرنوں سے فرار ہو کر پردہ عالم پر چھپنے لگیں۔ دھیرے دھیرے کہر کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے آفتاب کی صورت اختیار کر گیا۔ آفتاب کے فرار ہوتے ہی وہ بھی بالکل خاموش ہو گئی۔ جو گھڑی چار بجے سے دنیا والوں کو آفتاب کے آنے کی خبر دیتے رہے تھے

نسیم چھت سے اتر کر ہاتھ روم میں پہنچی، غسل سے فارغ ہو کر جیسے ہی باتھ روم سے نکلی گیارہ بجتے کو تھا جاوید جو پورے گھر والوں کے لئے کھلونا تھا اپنی توتلی زبان سے کہہ رہا تھا

"آپا دان جلدی تلدتا یا ض بھائی دان تو لینے تیسن جانا ہے"

نسیم بغیر کچھ جواب دیئے مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

اصل بات یہ ہے کہ ریاض آج پورے آٹھ سال کے بعد ولایت سے آ رہا تھا۔ وہی ریاض جس کی منگنی نسیم کے ساتھ ہوئی تھی۔ نسیم کے والد عبید اللہ خاں گھنٹہ کے مانے ہوئے رئیس تھے۔ بادہ داری کے ٹھیک صاحب خاں کی حالی شان کو تھی جنہیں کے ہر چھوٹے بڑے ان کا ادب کرتے تھے

ریاض نواب صاحب مرحوم بھائی احمد علی بیگ کی نشانی تھا۔ احمد علی بیگ ریاض کو چھ برس کا ہی چھوڑ کر ملک عدم روانہ ہو گئے تھے۔ اور والدہ تو دو برس کا ہی چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ اس لئے ریاض کی پرورش نواب صاحب کے یہاں ہی ہوئی تھی۔ اور ریاض کی منگنی احمد علی بیگ کے خصت ہونے سے دو گھنٹے قبل ہوئی تھی احمد علی بیگ کے انتقال کے بعد بیگم نواب نے ریاض کو ماں کا پیار دیا۔ نواب صاحب نے باپ کا۔ پڑھا لکھا کر ولایت بھیجا جہاں سے اب وہ ڈگری لے کر لوٹ رہا تھا۔ نسیم کے ساتھ نواب صاحب اور بیگم نواب کو بھی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ ان کے دیکھے ہوئے خواب اب پورے ہونے والے تھے

نسیم ریاض سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ جب سے اس نے ریاض کے آنے کی خبر سنی ہے۔ اسے خوشی کے مارے کھانا نہ ملتا تھا۔ نہ پیاس بجھتی تھی۔ نہ برابر ہنستی تھی۔ اسی کی بھوک پیاس سب کچھ اڑ گئی تھی۔ اور کیوں نہ اڑتی۔ مستقبل اسے روشن نظر آ رہا تھا اور ریاض اس کی زندگی میں ایک نئی بہار لے کر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی ریاض آ جائے پھر وہ اسے کو بتائے گی کہ اس کی خالہ زاد بہن تھی اور ہر وقت اس سے کہتی تھی۔ ریاض اب نہیں آئے گا وہ تو تجھے بھول گیا ہوگا۔ اس نے تو کسی کی شادی کی ہوگی۔ سنا ہے ولایت میں لڑکیاں مردوں کے پیچھے پڑ جاتی ہیں اور خاص طور پر ہندوستانی مردوں کے چکر میں پھنس کر کوئی بھی نہیں نکلتی ہے۔ اور یہ باتیں سن کر نسیم کا معصوم دل بیٹھ جاتا۔ اور وہ گھنٹوں ریاض کے بارے میں جانے کیا کیا سوچا کرتی تھی۔ مگر آج وہ ریحانہ کو بتا دے گی کہ ریاض ایسا نہیں ہے جیسا تو سمجھ رہی تھی۔ ٹرین کا وقت قریب آ گیا اور ریاض کو لینے اسٹیشن جانے کی تیاریاں ہونے لگیں

بیگم نواب۔ "ریحانہ، او ریحانہ"

ریحانہ ۔ "آئی خالہ جان"

نواب بیگم ۔ "جاؤ نسیم سے کہو کہ جلدی کرے ٹرین کا وقت قریب آگیا ہے"

ریحانہ (ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے) "میری اچھی پیاری بیگم۔ خالہ جان فرما رہی ہیں جلدی کیجئے ٹرین کا وقت قریب آگیا"

نسیم ۔ "بس خدا کسی کو دل کی نہ لگی نہ الجھن۔"

ریحانہ ۔ "نسیم الجھ گئی ہیں یا تمہارے خیالوں میں الجھ گئی ہو"

نسیم ۔ "تمہیں مذاق بالکل پسند نہیں"

ریحانہ ۔ "میں کہاں مذاق کر رہی ہوں۔ جو دیکھ رہی ہوں وہی تو کہہ رہی ہوں"

نسیم ۔ "میں اور دیکھ رہی ہے"

ریحانہ ۔ "یہی کہ ریاض بھیا کے خیالوں میں تم کھو گئی ہو"

نسیم ۔ "میں کہتی ہوں خدا کے لئے اپنی اس بے لگام زبان کو روک۔ ورنہ ۔"

ریحانہ ۔ "ورنہ کیا؟"

نسیم ۔ "ابھی معلوم ہو جاؤں گی تب پتا چلے گا"

ریحانہ ۔ "قید ہی کیا کسی کو قید کر سکے گا"

نسیم ۔ "کیا مطلب ہے"

ریحانہ ۔ "مطلب یہ کہ ریاض بھیا کے خط ہی سے ریاض بھیا کے ہاتھ میں دے دیئے گئے ہیں تم کیا میرے کان پکڑو گی"

نسیم ۔ "تو بہت شرارت کرنے لگی ہے"

ریحانہ ۔ "مگر میں نے کس سے شرارت کرنا ہے"

نسیم ۔ "کس نے سکھایا ہے"

ریحانہ ۔ "مجھ سے کیا پوچھتی ہو، پوچھو اپنی ان اداؤں سے جو یہ شرارت ڈھا رہی ہیں اور جو شرارت کر رہی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں یہ نگاہ کر ریاض بھیا کی طرف نہ بہک جائے"

نسیم ۔ "کہ کر فقرے ایسے خوبصورت انداز سے کہتی ہے کہ کہتے ہوئے دفعتاً رک کر ریحانہ کی طرف دیکھنے لگی ریحانہ بھاگ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی اور نسیم دانت پیس کر رہ گئی"

یکایک نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا "نسیم بیٹی جلدی کرو وقت برق رفتاری سے قریب آرہا ہے اور تم ابھی تک یہیں ہو"

نسیم ۔ "میں بالکل تیار ہوں۔ چلئے"

نواب صاحب اور نسیم صحن کو عبور کر کے برآمدے میں پہنچے گئے جہاں بیگم نواب، ریحانہ اور چند ملازمہ کھڑے ہوئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی کاریں سے باتیں کرنے لگی۔ اور کچھ ہی دیر میں یہ لوگ اسٹیشن پر پہنچ گئے وہاں پہنچنے پر پتہ چلا ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ پھر یہ لوگ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ بیگم نواب تھکے ہارے سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور بیچ میں ریحانہ بھی لقمے دے رہی تھی۔ نواب صاحب اخبار الٹ پلٹ کر رہے تھے ریحانہ دو بار باہر ویٹنگ روم سے نکل کر سگنل دیکھ بھی آئی جو ابھی تک سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ جس کے جھکنے کا نسیم کو بے چینی سے انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے سگنل جھکا۔ ٹرین آئی۔ مگر ان لوگوں کو اس وجہ سے کہ قلی نہیں ملا کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ کوئی قلی نہیں آیا تھا۔ مگر پہنچ کر یہ لوگ ریاض کے نہ آنے کے بارے میں اپنے اپنے خیالوں کا اظہار کرنے لگے۔ نسیم بھی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ریاض کے نہ آنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات اس کے ذہن میں جنم لے رہے تھے۔ جب زیادہ پریشان ہو گئی تو اٹھ کر ریڈیو کا کان مروڑ دیا۔ ریڈیو کے کان مروڑتے ہی یہ آواز ریڈیو سے نکل کر پورے ڈرائنگ روم کا گشت کرنے لگی۔ اب آپ آکاش وانی سے سماچار سنئے۔ کل صبح ایک بجے جو سات مسافروں کو لے کر لندن سے بمبئی کے لئے روانہ ہوا تھا۔ بمبئی سے تقریباً تین میل دور فضا میں خرابی پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوا میں گر کر غرق ہو گیا۔ پائلٹ کے ساتھ غرق ہونے والے مسافروں کے نام یہ ہیں (۱) ہز ایکسیلنسی آنریبل (۲) مسٹر ایچ چترویدی پٹنا اس سے سوار ہو کر امرتسر پنجاب سے کماری آشا دیوی (۳) جناب مسٹر جہان آباد (۴) رابندر کمار شرما بی اے (۵) نواب ریاض الحسن خان کے بھتیجے اور اس حادثہ کی خبر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نسیم کی زندگی میں تاریکی اور نہ ختم ہونے والی اداسی بھر دی ہے ۔۔۔!

بقیہ شادی کے کارڈ صفحہ ۱۸ سے آگے

شادی والے دن صبح سے بہت بڑی دعوت کا انتظام ہو رہا تھا۔ بڑے شامیانے اور قناتیں دن چڑھے لگنا شروع ہوئیں اس کی یہ تین قناتوں کی تشہیر کر رہے تھے شادی والے مہمانوں نے شادی کے کارڈ بڑے اہتمام سے اور بڑے خوبصورت انداز میں چھپوائے تھے۔ عزیزوں اور دوستوں کو کارڈ بھیجے جانے لگے۔ شادی سے دو دن پیشتر شادی کے کارڈ لے کر وہ تمام دوست بہت خوش ہوئے اور خاص طور سے شادی کے کارڈوں کی بڑی تعریف کی کہنے لگے "یار مہندر تم نے کمال ہی کر دیا۔ تو تو چھپا رستم نکلا شادی کے کارڈ بھی ایسے خوبصورت ہیں تو بھابی کو بھی کہاں سے ڈھونڈ لایا ہے"

مہندر نے کہا "یار بھگوان کی باتیں کیوں کرتے ہو بھابی کو دیکھنا ہو تو میرے گھر آکر دیکھ لینا اور ساتھ میں ہو سکے تو کارڈ کی دعا بھی لیتے آنا"

اپنے دوستوں سے جانے کہہ کر مہندر گھر واپس آنے کے لئے گاڑی کی طرف روانہ ہوا۔ گاڑی پیٹرول بھروا کر روانگی کی تیاری کر چکی تھی۔ مہندر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ مہندر نے گاڑی پر سوار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ وہ سیڑھی پر سے پھسل گیا اور دیوار کی پتھر پر اس کا سر ٹکرا گیا۔ ایک دم لوگ اور حضرت لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر مہندر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے مہندر نے جو کارڈ پڑھے تھے وہ اس طرح منتشر شادی کے کارڈ والیت کی سرحدوں

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۸

مصرع طرح

"نوحہ جدکتاہے ۔۔۔ کیوں نہ انساں کیوں ہو"

غزل کے ساتھ ہی طرحی مشاعرہ یا اس کے تبدیل پانے کے بعث ضرور ارسال فرمائیں۔

نشانِ طرحی مشاعرہ
حضرت مولانا ابراہیم صاحب

آئینہ حشانی گورکھپوری

شدتِ آلام و غم سے بے پریشاں کیوں نہ ہو
اضطرابِ دل ہو جب جاتا ہے پیغامِ سکوں
ٹوٹنا فطرت میں جب دونوں کی شامل ہو چکا
خود کو پا کر جب فنا فی العین بات ہے
سچی ہستی در والفت سنتِ نبھے معاش
مرتبہ جب عشق کا بھی حسن سے کچھ کم نہیں
اس کا غم جب بن گیا ہے زندگی میری مدتوں
سیکھ کر نالے اسی شکوہ آبادی

مصیبت وقت دیکھ کر کوئی مسلماں کیوں نہ ہو
وہ بیاباں کیوں نہ چاہے وہ زمستاں کیوں نہ ہو
آدمی سے آدمی تک اپنی نہیں کی جستجو
اس کے ہی دم سے ہے باقی زندگی مخلوق کی
کوئی گنجائش نہیں جس کی خوشی کے واسطے
حقیقت یہ جگہ ہے کہ قابل ہی نہیں
حق پسند ہوں کے لئے ناوک یہ صرصر خوب ہے
ہر زمانہ شہرت میر تقی

ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہیں ناداں کیوں نہ ہو
وہ ہے یا محمود اس کی روشنی محمود ہے
قوتِ مذہب کی زیر دل کو کہ دم توڑ دے
اس کو کس سے نسبت ہے اس کی ہستی انسیت
آنکھ نے گر تیرے یہ وہ کے جس کی یاد میں
صدق دل سے جو وہ محبوب پر بھروسا کرے

ان کے دل کا عکس ہے آئینہ دل میں مرے
شامِ تنہائی مری غمزہ درخشاں کیوں نہ ہو

الطاف انصاری سلطان پوری

پریشانی رنج و الم سے دل پریشاں کیوں نہ ہو
ماسوا اس کے دمن راحت نہ جس کو نصیب
آڑے وقتوں میں جو آتا ہو جہاں والوں کے کام
ناخدائی سے جو ناواقف ہو کوئی ناخدا
موسمِ گل میں اچانک بادِ صرصر جب چلے
آپ ہیں جب صبر و قدرت کے انوکھے شاہکار
جب فرماتا ہے خدا نے اپنے لطفِ خاص سے
محمد عبدالقیوم صدیقی رستم۔ فتح پوری

حیرت افزائی میں یکتا گوہرِ عرفاں کیوں نہ ہو
ہو فقیرِ حسن پر احساسِ غم کا جب اثر
کوچۂ محبوب کی رنگینیاں ہوں کی کہاں
سیمتا ہو فیضِ دل سے جس چمن کو باغباں
قولِ مقصود رب کی ایک راہیں مختلف
آسمان کہکشاں چاند اچیز ذرہ خاک کا
مست کی نظروں میں جب تیرے کوئی ارماں نہیں
ماہ جبیں

ملتفت میری طرف وہ فقہ سامال کیوں نہ ہو
وقت تھا جب جیسے کہنے کو فنی مرنا کی
میرے مرنے کی دعائیں مانگ کر تا تھا جو
کالے بازاروں میں جس کا چل رہا ہو کاروبار
آہ جب انساں کو خود انساں ہی سمجھا نہ کرے
جب کہ ہو ہر شاخ گل پر آندھیوں کا گھونسلہ

میر تمکین واقعی ہے یہ بڑا نازک سوال
دل جو رکھتا ہو مسلماں کیوں ہو انساں کیوں نہ ہو

جو بشر غربت میں ہے حسرت کا خوگر
زندگی سے اپنی وہ آخر کیوں پریشاں کیوں
صورتِ خورشید مکاں وہ درخشاں
وہ منش اس کا سفینہ نذرِ طوفاں
درہم و برہم بھلا نظمِ گلستاں کیوں
دیکھ کر پھر آپ کو آئینہ حیراں کیوں
پھر یہ اضطرابی حزیں آخر فغاں کیوں

آئینہ دل عشق شش در آنکھ حیراں
عشق برہادی پہ اپنی خود غزل خواں
لاکھ شادابی ہیں کیا باغ و بہار
ذرہ ذرہ اس چمن کا گل بداماں
جب یہ پیدا ہے اتحاد کثرت میں کا
عرش کا تارا نے اسکا بھی امکاں
آہ تاباں کیوں نہ ہو وہ ماہ کنعاں
ماہ جبیں

دام خاکی میں بشر آکر پریشاں کیوں نہ ہو
آنکھ پھر جاوداں کی تابانی سے حیراں کیوں نہ ہو
دل جو رکھتا ہو مسلماں کیوں ہو انساں کیوں نہ ہو
دل پہ جب چوٹیں پڑیں تو آنکھ گریاں کیوں نہ ہو
آستانوں کے پوچھنے کی اس کا ارماں کیوں نہ ہو
اس کی قسمت کا ستارہ پھر درخشاں کیوں نہ ہو

محمد کریمی اکبر بنانے کا وہ خواہاں
پھول کر اک روز وہ انساں بنا
میرے مرنے پر وہ اپنے دل میں شاداں
ملت کا تارا کیوں ہیں وہ درخشاں
فارغ البالی پہ اپنی شاد شیطاں
وہ ستون محفل میں شمع بیاباں

صدیقی شبنم شکوہ آبادی

سوزشِ غمِ جگر سے آنکھ گریاں کیوں نہ ہو
آپ جب چاہیں تو پھر فرحت کا ساماں کیوں نہ ہو
آدمی کو آدمی کا اُنس فطرت کی چیز ہے
جن رنگوں کے تخیل ہی سے نشہ گر پڑیں
تم سے ملنے کے لئے جب سب جہاں بے چین ہے
زیرِ لب شبنم مجھے وہ مسکرا کر دیکھ لیں
کیا کہا سعدی نے گل پوری

تیرہ و تشنہ کے لئے ہر سو بیاباں کیوں نہ ہو
آبرِ باراں سے ہوں جب چار سو گل کاریاں
گور میں ساحل کی جب حاصل نہ ہو آسودگی
راحتِ قلب و جگر ہو جب کہ رنج و غم کا دور
جس کے ہوں بدلے ہوئے تیور جبیں ہو پُرشکن
جب نگاہِ لطف ساقی ہی نہیں ہے مے کشو
فصلِ گل میں اس جنوں انگیز موسم میں کریم
حکیم عبدالباقی حکیم پوری

دل کا میرے آج ہر اک زخم خنداں کیوں نہ ہو
سیر کو آیا کوئی رشکِ چمن مدتوں بعد
ہجر کی شب یاد تجھ کو کیا نہ رشکِ قمر
جن کو فرقت و محبت سے ہوس سے بیر ہے
تابِ فریادِ یزداں جب کوئی انساں نہ لا
قبلۂ سے تشنہ لب ہیں تیرے در کے ساقیا
کشتیٔ امید ساحل آشنا ہوگی حکیم
محمد حسین مبشر جودھپور

جانِ تپاں دلِ شیدائے حسنِ جاناں کیوں نہ ہو
بانکپن بدل میں جھلک ہی جاتی ہے جبیں
بڑھاپے قصبہ بات ہے گفتگی
رونا کال ہی اٹھاتا ہے سالے لوگ غم
گزرتے انوار جو ہونے کیا محروم دید

اے مبشر پردۂ دل میں چھپے رہتے ہیں وہ
کشف ان پر ہو ترا ہر زانہ پنہاں کیوں نہ ہو

محمود مشتری اندوری

دل میں نہ گلستاں میں پھر چرا غاں کیوں نہ ہو
جس کو فرقت پر غرور ہو گل اعتماد
تا خدا گھبرا کے جس کو خود صحرا میں چھوڑ دے
بانہاں کی شکل میں گل جیں ہو جس کا پاسباں
درحقیقت مذہبِ عشقِ خدا کے واسطے
جستجوئے فن میں اے محمود جو محنت کرے
مقصود مشتری اندوری

جس نے دل دیا ہے اس سے دل ستاں کیوں نہ ہو
جذبِ الفت کی صداقت سے وہ شاداں کیوں نہ ہو
واعظِ مشفق میں رندوں میں مرا کامل ندیم
گلستاں میں غنچہ و گل پر اُداسی دیکھ کر
عصرِ حاضر میں مجھے دیکھو پریشاں حال ہے
گردشِ دوراں نے اے مقصود ہر انسان کو

وحید شمسی

سوزِ دل جذبِ محبت سے نمایاں کیوں نہ ہو
رشکِ آئینہ بنا ہے دل ہمارا ان دنوں
آپ کی نظریں جو دیتی ہوں پیامِ شعریت
میرے شعروں میں تڑپ ہے سوز ہے اے ہم نشیں
اب یہ اندازہ ہے آنے کی نہیں فصلِ بہار
دستِ قاتل جب خدا لاوے ہے تو لے وحید
اسماعیل ذبیح مالی کانوری

تو جو ہو پنہاں تو دل آئینہ حیراں کیوں نہ ہو
رنگ لاکر رہا خونِ شہیدانِ وفا
جب تری محفل میں ہو محوِ نظم زندگی
خلقی کے بعد بھی دل کے جو ہیں وہ حوصلے
اپنے سینے میں ہے باقی اک دلِ درد آشنا
اپنے سینے میں دلِ زندہ و طرح کتنے ذبیح
سید محمد خلق بھوپالی

وحشتِ دل بڑھ گئی تو چاک داماں کیوں نہ ہو
لطفِ غم میں ڈوب کر بھی مسکراتا جا وحید

اس پہ شعلہ ہر طرف جشنِ بہاراں کیوں نہ ہو
پھر وہ غنچہ ہر جگہ ہر در خنداں کیوں نہ ہو
کیسا ساحل ایسی کشتی ناخدا داں کیوں نہ ہو
وہ گلستاں پھر بہاراں ہی بہاراں کیوں نہ ہو
دل جو رکھتا ہو مسلماں کیوں ہو انساں کیوں نہ ہو
محفلِ شعر و ادب میں وہ درخشاں کیوں نہ ہو

ملتفتِ چشمِ کرم ہے پھر یہ احساں کیوں نہ ہو
شمع کے چاروں طرف پروانہ تصدق کیوں نہ ہو
ان کے آجانے سے محفل میں چراغاں کیوں نہ ہو
جس کے دل میں حوصلہ ہے پریشاں کیوں نہ ہو
عقلِ انساں اپنے نظارے سے حیراں کیوں نہ ہو
کر دیا وقفِ الم چاہے وہ شاداں کیوں نہ ہو

راکھ جو دل میں دبی ہے وہ فروزاں کیوں نہ ہو
اس میں تصویرِ وفا تصویرِ جاناں کیوں نہ ہو
آپ ہی کہہ دیجئے کوئی غزلخواں کیوں نہ ہو
سب کے جس کو مستِ مے گل پیراہن کیوں نہ ہو
وا کہ گلشن میں مری جانِ گلستاں کیوں نہ ہو
زخمِ دل کھل کر گلستاں در گلستاں کیوں نہ ہو

غنچہ غنچہ میری نظروں میں درخشاں کیوں نہ ہو
اضطرابِ رنگ شوخیٔ رنگِ گلستاں کیوں نہ ہو
تیرِ محفل سے ہر انساں بہرِ گریاں کیوں نہ ہو
گردشِ دوراں بھلا تجھ سے حیراں کیوں نہ ہو
ہوں مسلسل رقصِ غم تو دل پریشاں کیوں نہ ہو
سارِ مشکل ایک دن خود کار آساں کیوں نہ ہو

اپنے ہی ہاتھوں میں اب اپنا گریباں کیوں نہ ہو

نہ کہہ کہ کیوں ہو زندگی کے واسطے
جذبۂ صادق اگر ہو ہم دماں کیوں نہ ہو

نسل آدم سے تعلق سب ہی انسانوں سے ہے
دل جو رکھتا ہو مسلماں کیوں ہو ہندو کیوں نہ ہو

جب مٹے جب چاند تاروں کی ادائیں
تیرگی شب کی شریک محفل جاناں کیوں نہ ہو

جب کبھی ہم خود اتفاق دیوانہ کہیں
زیر لب اس میں کوئی مجھ پہ خنداں کیوں نہ ہو

روشنی کا کچھ بھروسہ
جب بہار نہ تو ویرانہ پریشاں کیوں نہ ہو
ایسے عالم میں بھلا وحشت کا ساماں کیوں نہ ہو

میں نے دیکھا ہی نہیں بڑھتے ہوئے ارمان کو
وہ تو ظلم خیز طوفاں سے ہراساں کیوں ہو

جگنو ہے شمع سے وابستہ اس کی زندگی
شمع بجھ جائے تو پروانہ پریشاں کیوں ہو

عیش و راحت میں کٹی ہو جس کی ساری زندگی
مشکلات زندگی سے وہ گریزاں کیوں نہ ہو

جو غم دوراں کو اپنا غم سمجھ کر
بیکسوں کے کام جو آئے وہ انساں کیوں ہو

اتفاقاً ہی سہی رونق چلا آیا ہے جب
آپ کی محفل میں پھر وہ رونق کا ساماں کیوں ہو

ظفر لکھنوی

وہ جفا سے پھر رہا ہے کہ پریشاں کیوں نہ ہو
جل چکے پروانہ جب تو شمع گریاں کیوں نہ ہو

بھر میں ان کے دل جیتا ہے تاکہاں
ضبط کا یارا نہ ہو جب آنکھ گریاں کیوں نہ ہو

یاد جب آجائے اگلی دل پہ طوفاں کیوں نہ ہو
پھر ہر اک ذرہ چمن وحشت بداماں کیوں نہ ہو

جو گئی رفعت نشاں سے جب نشیمن پھر
تم بتاؤ وہ فرق پھر فصلیاں کیوں نہ ہو

جب نہ تھم سکتا تلف رقصاں نہیں گزرے میں
کہ رہو دنیا موج محتاج تھی لکھوم تھی

پھر بہاں ہو جائے خود محبوب جس کے حال پر
آہ دنیا میری بربادی پہ خنداں کیوں نہ ہو

آزمائش کرنے والا ذرہ جب محبوب ہو
ایسے دیوانے کی پھر قسمت درخشاں کیوں نہ ہو

اور علی آفور دارثی

جو مریض عشق ہے محتاج درماں کیوں نہ ہو
ہر اذیت پر بھلا دیوانہ خنداں کیوں نہ ہو

حسن یہ کہتا ہیں وہ خوبی جو انسانی میں ہے
جس کو ہے احساس فرقت وہ پریشاں کیوں نہ ہو

عرشیہ زیدی

عرشیہ زیدی ہے پابند پرستش وہ نہیں
میرے دل میں ان کو اپنا دوست کا درماں کیوں ہو

جن کی آنکھیں ہیں وہ اس کو دیکھتے ہیں بے حجاب
حاشیہ صادق کے مرقد پر چراغاں کیوں نہ ہو

یہ حجاب اٹھ جائے وہ میرے سامنے
جو میں محروم بصیرت آج پنہاں کیوں نہ ہو

اس طرح آنکھوں میں میری بر قد قصاں کیوں ہو

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

The Little Doctor
Recommends

سعالین

کھانسی کی مزیدار دوا

فوری تسکین کے لیے سعالین کی ڈوڈکیاں منہ میں رکھ کر چوسیئے۔ یہ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہیں۔ کھانسی زکام اور گلے کی خرابیوں کو دور کرتی ہیں اور خراش کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں سعالین آپ کے سانس کو بھی خوشگوار بناتی ہے۔

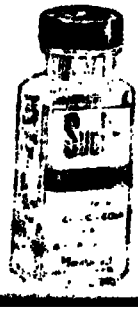

کا نچوڑ ... پتہ

شعلہ و شبنم

سمبر
۱۹۶۶

فی رسالہ
چار روپے
شش ماہی
دو روپے

جلد ۱۴
شمارہ ۱۲

ہیڈ آفس
بیہ کلاں۔ دلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگران حصہ نظم و ناظم مشاعرہ
حضرت مولانا ابر الحسنی گینوری

ایڈیٹر
بسمل جین

معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
چھ نئے پیسے

آمر صدیقی

غزل

ہم نے مانا یہ حقیقت ہی سہی
عشق حسرت ہے تو حسرت ہی سہی

کوئی ہوتا ہے جفاؤں کا بدل
ان کو احساس ندامت ہی سہی

بات کرنے میں برائی کیا ہے
اہل دل سے تمہیں نفرت ہی سہی

دیکھئے شوخی رفتار کی داد
روز اک تازہ قیامت ہی سہی

وقت مجبور وفا کر دے گا
بے وفائی تری فطرت ہی سہی

فرض ادا کرنے کی فرصت تو ملے
اولیں فرض محبت ہی سہی

ظلم تو چھٹ نہ سکے گا تم سے
آہ کرنے کی اجازت ہی سہی

لگتی ہے بے غم دل موج سراب
زندگی زندہ حقیقت ہی سہی

اہل دل پھر بھی ہیں محروم سکوں
ان کی آنکھوں میں مروت ہی سہی

ظاہری حال نہ دیکھ اے ناصح
ہم کو وحشت ہے تو وحشت ہی سہی

ہم بھی فریاد کہاں کرتے ہیں
آپ کو ظلم کی عادت ہی سہی

کھلتی کب ہے نگہ ناز آمر
عشق میں کشف و کرامت ہی سہی

بابتہ شعلہ و شبنم پرنٹر و پبلشر بسمل جین بمقام پریس دلی میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم بیہ کلاں دلی سے شائع ہوا

یائے نسبتی

[illegible] کے معنی دیتا ہے جیسے
مولانا ہی مراد آباد والا یا [illegible]۔ نسبتی
[illegible]۔ احسنی۔ احسن والا یعنی مولانا احسن [illegible] کی اولاد
یا خاندان۔ غرض یہ ہی۔ ایسے ہی معنی دیتا ہے جس سے
نسبت و تعلق خاص کا اظہار ہوتا ہے۔

اساتذہ نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جس لفظ
یا اسم کا حرفِ آخر الف ہو یا ی ہو یا واؤ ہو
ان کو چھوڑ کر باقی اسمائے سالم کے آگے حرفِ ی بڑھا
دی جائے، جیسے کپا سے کپائی۔ پاپ سے پاپی۔ فوج
سے فوجی۔ فوج سے فوجی۔ فرخ سے فرخی۔ جنون سے
جنونی وغیرہ۔

جس اسم کا حرفِ آخر الف ہو اس کے لئے یہ قاعدہ
ہے کہ خالی ی نہیں بلکہ ہمزہ اور ی بڑھائی جائے جیسے
ضیا سے ضیائی۔ رسا سے رسائی۔ نوا سے نوائی۔
وغیرہ۔

جس لفظ کا آخری حرف ی ہو اس کے لئے یہ قاعدہ
مقرر کیا ہے کہ اس اسم کے آگے و + ی کا اضافہ کیا جائے
جیسے ڈبائی سے ڈبائوی۔ کھاڈ کٹی سے کھاڈ کٹوی وغیرہ

جس اسم کا حرفِ آخر ہو اس کے متعلق یہ قاعدہ
مقرر کیا ہے کہ جب ایسے اسم سے نسبت یا لگاؤ ہو تو اس
کے حرفِ آخر کو حذف کر دو اور و + ی کا اضافہ کر دو
جیسے مارہرہ سے مارہروی سایٹہ سے ایٹوی۔ بلدہ سے
بلدوی وغیرہ

جس اسم کا آخر حرف واؤ ہو اس کے لئے یہ مقرر
کیا ہے کہ اسم سالم کے آگے ہمزہ + ی کا اضافہ کر دو۔
جیسے آرزو سے آرزوئی۔ ہسوے سے ہسوئی وغیرہ

یہ ہیں اساتذہ کے مقرر کردہ قواعد یائے نسبتی سے
متعلق۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسماء میں بعض الفاظ ایسے
آجاتے ہیں جن کا استعمال مقررہ قاعدوں کے مطابق کیا
جائے تو نسبت مضحکہ خیز بن جاتی ہے اور بڑے بھیانک
معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے کاس گنج کے آگے مقررہ
قاعدہ کے مطابق اگر حرفِ ی بڑھائیں تو کاس گنجی بنے گا
گنج کے معنی خزانہ کے سہی۔ مگر گنج ایک مرکب مرض بھی ہوتا
ہے جس میں سر کے بال گر جاتے ہیں اور سفید سفید مادہ
اجھر آتا ہے اور ایسا شخص قابلِ نفرت بن جاتا ہے۔
ایسے شخص کو گنجا کہتے ہیں اور اگر عورت کو یہ مرض ہو تو
اسے گنجی کہتے ہیں۔ کاس گنجی کہتے ہی دماغ اس طرف رجوع
ہوتا ہے۔ گویا کوئی گنجی عورت ہے

یا کسی قرتلغس والے شاعر کا شاگرد اپنے استاد
سے نسبت قائم کرے تو قمری بن جاتا ہے اور قمری میں یہ
قُری بھی پڑھا جا سکتا ہے جو ایک مخصوص چڑیا کا نام ہے

یا استاذ الاساتذہ حضرت داغ کے تلامذہ
کو اور اہ مزاج لوگ داغی کہتے ہیں جو نہایت توہین آمیز
لفظ ہے اور ایسی توہین کی خاطر لوگ داغی کہتے بھی ہیں۔

یا فرض کیجئے کوئی شہر خطا کا رہنے والا ہے اس
کو آپ خطائی کہیں تو صوتی اعتبار سے یاں خطائی کی قسم
میں اسے داخل کر دیں گے۔

کہ اور مکہ کے رہنے والے کو آپ مکی اور مکی کیں
کہتے ہیں۔ مدینے کے باشندے کو مدنی کیوں کہتے ہیں۔ جب کہ
یہ سب قاعدہ مقررہ کے خلاف ہے۔ مکوی۔ مدینوی کہنا چاہئے۔

اہل ہی ہمیشہ خود کو بہاری کہتے ہیں بہاوی نہیں
بہاری کہنا چاہئے

مولانا ناطق غازی پوری ہمیشہ گاؤ کھوی لکھتے ہیں
جب کہ یہ سے قاعدہ گاؤ کھی ہونا چاہئے۔

یہ بعض اجانب میرے منش کے خلاف خود
ابہری لکھ دیتے ہیں۔ مجھ سے کئی دوستوں نے دریافت
کیا یہ لوگ خلاف قاعدہ زبان ابہری کیوں لکھتے ہیں۔ جی
ابہری لکھنا چاہتے ہیں نے بطور مزاح انھیں جواب دیا
کہ یہ خود کردہ رنگین کاغذ نہیں بنانا چاہتے جو کتاب
جلد میں استعمال ہوتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جن مقرر کردہ قواعد
ذکر کیا گیا وہ اساتذہ نے (جو انسان تھے اپنے خیال
اپنی ضرورت کے مطابق مقرر کر دیئے۔ خدا نے یہ قاعد
بنا کر نہیں بھیجے جو میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت باقی
اگر آج ہماری ضرورت ہمیں اس پر مجبور کرتی
کہ ایسی نسبتیں جو کریہہ اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں ہم
ان میں ترمیم و اضافہ کریں۔ اس لئے کہ ترک و قبول کا سلسلہ
ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔
باب اجتہاد بند نہیں ہو گیا۔ نہ زبان کے یہ مسائل یا
احکام ہیں جن پر عمل نہ کرنے سے آدمی گنہگار ہوگا۔
حالت میں ضرورت ترمیم کا عمل جاری رکھنا
پس میں ان قاعدوں کے اضافہ کی ضرورت محسوس
کرتا ہوں کہ ایسے اسماء جن میں حرف ی کا اضافہ مضحکہ
خیز معنی پیدا کرے ان کی نسبت واؤ ی سے کی جائے

ی گئی ہے گاگو ۔ قرے قرائی ۔ یہ ہے بڑی، ذاغ ہے داغی، زاغ
ی زاغی۔!

اور ایسے الفاظ جن میں مقررہ قاعدہ کی نسبت لکھنے سے الفاظ ناموس
علوم ہونے لگیں اداں کے ادا کرنے میں زبان پھٹے کھانے لگے جیسے برسیوی
از مشیری۔ ان میں لفظ کی آخری ی کو حذف کر کے برسوی اور گاگو کھانا ہی
کہا جائے اور اس کو خلاف قاعدہ جان کر غلط نہ کہنا چاہئے۔ کہے لگی۔
ینے سے مرنی۔ بکے سے لگی کا واؤ لکھی، مرنی، لکھی اڑا دینا چاہئے۔ کیوں کہ
ستعمل الفاظ ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں اور بآسانی زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔

اطلاع ضروری

طرحی مشاعرہ کی جو تاریخ مقرر کی جائے۔ اس تاریخ تک تمام غزلیں ماہنامہ
یرے پاس ضرور پہنچ جانی چاہئیں۔ چوں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے نظام
یں ابتری پیدا ہوتی ہے۔ آئندہ جو غزل مقررہ تاریخ سے بعد کو آئے گی
شائع نہ ہوگی۔

اکثر احباب جواب طلب کرتے ہیں۔ مگر جوابی خط یا لفافہ نہیں بھیجتے۔
بندہ اگر اسے خطوط کا جواب نہ لکھے تو ہمارے لکھنے کی جگہ اپنے اصول کا تقاضہ
ہے خاموش ہو جائیں۔

ا۔ بعض حضرات ناقص و عیوب کلام بھی کہ اصلاح کے بعد چھپنے کی زائش
ہتے ہیں۔ اداہ یہ اصلاح کا کوئی بندوبست نہیں ہے یہاں تو جو صاف و بے
عیب ہوگا۔ انتخاب کر لیا جائے گا ـــــ اکبر اصلی

نوکِ شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۶۱

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

مصرع طرح ـــ ٹھہر جا نہیں اے گردشِ دوراں ٹھہر جانا

ٹھہر، اثر قوانی جانا، روایت

نام ... ...

پتہ ... ...

مصرع طرح مشاعرہ نمبر ۶۱

بجلیوں سے آشنا ہے، بجلیوں کا آشنا ہے

الف۔ آستاں قوانی ـــ سے روایت

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء

بقیہ طرحی مشاعرہ

ہنسی ہی ہنسی میں پلکوں پہ تارے جھلملاتے ہیں
چھپائے چھپ نہیں سکتے دلِ پُر درد میں طوفاں کا
حالی پانی پتی

جہاں تشنہ لبی پر شبنم بھی طوفان ہوتی ہے
وہ الفت ہی نہیں جس میں نہ منزل نظر آئی
وہی انسان زاہد ہیں ہمیشہ کامراں دیکھا
بڑی تاثیر پیری تم نے ہر اک شعر میں حالی
محمد اکرم اعجم برجگی بی۔اے

بظاہر میرے ہونٹوں پر ہنسی معلوم ہوتی ہے
یہ ماہر طرف سیلاب سناٹا ہے انساں کا
خدا یا تم کہاں کی اٹھ کر نہ جاؤ میرے پہلو سے
ترے فیضِ جگر کا یہ بھی اک اعجاز ہے اعجم
اکبر اجداوی۔ کلکتہ

زمانہ جرم الفت کی سزا دینے لگا ہے یوں
نگاہیں اس نے جب پھیریں تو دل انقلاب آیا

صفحہ ۲ سے آگے

پلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
کہ طوفاں میں سفینہ زندگی معلوم ہوتی ہے

اجل بھی اس فضا میں زندگی معلوم ہوتی ہے
ہمارا غم ہی کی آگہی معلوم ہوتی ہے
جسے آغوشِ غم میں بھی خوشی معلوم ہوتی ہے
تمہاری شاعری بھی ساحری معلوم ہوتی ہے

گریبہ چاکگی ہنستی ہوئی معلوم ہوتی ہے
گرانِ خاں کی پسپائی معلوم ہوتی ہے
ابھی تاروں میں کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے
برگشتہ میں بہار آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے

مجھے بانگِ درا اب زندگی معلوم ہوتی ہے
مجھے دنیا کی ہر شے میں کمی معلوم ہوتی ہے

ملک کے نوجوان فنکار شعراء کی تخلیقات کا مرقع جمیل

فکرِ نو

اس مشترکہ مجموعۂ کلام میں مختلف شعراء کا چیدہ چیدہ کلام یکجا کیا گیا ہے جو کہ زندہ اور متحرک فن کاروں کا شاہکار ہے جس کی تخلیق کے لئے زندہ ادب کے خالقوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے اور اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ کرتے رہیں گے اور ایک دن آسمانِ ادب پر درخشاں ستاروں کی مانند چمکیں گے۔

مرتب: جوہر ہاشمی

ناشر

کلاسیک پبلشرز ۶ دستگیر اسٹریٹ، مین روڈ

حسن

نذرِ غالبؒ

بیٹھا ہوں غرق ہونے کا ساماں کئے ہوئے
ہر اشک سے تہیہ طوفاں کئے ہوئے

حاصل تھا کیا جو پھرتا نمایاں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں زخم زخم کو پنہاں کئے ہوئے

نکلا ہوں آج عزم بیاباں کئے ہوئے
گذری ہے زیست سیر گلستاں کئے ہوئے

تسکین دل کہاں سے ہو مدت گزر گئی
تیر نگاہِ ناز کا ارماں کئے ہوئے

اب میری زندگی سے خزاں بھی ہے مطمئن
بیٹھا ہوں خود کو نذرِ بہاراں کئے ہوئے

ہوتا ہے وہ ضرور ارادوں میں کامیاب
اٹھ بیٹھے عزم کوئی بھی انساں کئے ہوئے

میں دے رہا ہوں داد ستم گر کو جور کی
ہر زخم دل حریف نمک داں کئے ہوئے

اُڑ اُڑ کے دے رہی ہیں پتا آج وحشیاں
پھرتا ہے کوئی چاک گریباں کئے ہوئے

ہر زخم دل سے خون کی بوندیں ٹپک پڑیں
اک عرصہ ہو گیا تھا چراغاں کئے ہوئے

تاریکیٔ لحد کا مجھے کیوں خیال ہو
لایا ہوں دل کے داغ فروزاں کئے ہوئے

اکثر گذر گیا ہوں تری رہ گذر سے میں
دشواریٔ حیات کو آساں کئے ہوئے

کتنے ہیں دل پہ داغ جگر پر ہیں کتنے داغ
ہر اک چراغ ہوں تہِ داماں کئے ہوئے

نازک نگاہِ ناز کی حسرت ہے دل کو پھر
کچھ دن ہوئے ہیں دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

خاص اہمیّت کی باتیں

یہاں جو باتیں درج کی گئی ہیں وہ سوچ بچار کرنے والے ہر بھارتی کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ باتیں آپ کے اور آپ کے کنبے کے لئے بہت اہم ہیں، کیونکہ چینی جارحیتوں سے مُلک کی حفاظت پر ہی ساری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہماری قوم اَمن پسند اور ہمارے عوام صلح دوست ہیں، لیکن ہم کبھی کسی جارحیت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔

چینی خطرہ

حالانکہ لڑائی بند ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ ہماری سرحدوں پر چینی جارحیت اب بھی جاری ہے۔ لداخ میں ۔۔۔ ہم اُمریع میل بھارتی علاقے پر اب بھی چینیوں کا قبضہ ہے۔ وہ ہماری سرحدوں پر برابر بڑے پیمانے پر فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر نئی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا ہے۔ آیئے ہم اپنا عہد پھر دوہرائیں کہ جب تک ہم اپنی دھرتی سے حملہ آور کو پُوری طرح نکال باہر نہ کریں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

بھرپُور تعاون

جب ہمارے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے قومی دفاعی فنڈ میں عطیے دینے کی اپیل کی تو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق عوام نے بڑے شاندار ڈھنگ سے اُن کی اس اپیل کا جواب دیا۔

ہم نے بڑی فراخدلی سے ۔۔۔ دِل کھول کر عطیے دیئے، کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ آزادی کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی بڑی نہیں۔

پختہ عہد

آیئے ہم پختہ عہد کریں کہ جب تک آزادی کو درپیش خطرہ ختم نہیں ہو جاتا، ہم اسی طرح امداد دیتے رہیں گے۔ آیئے اپنا سونا دیں۔ اُگر کل ہم سب آہنی زنجیروں میں جکڑے گئے تو پھر یہ طلائی چوڑیاں کس کام آئیں گی۔ ہمیں روپیہ بھی دینا چاہیئے۔ ہماری لگاتار امداد سے ہی ہمارے دفاعی انتظامات مضبوط ہوں گے۔

تین اچھی وجوہ

۱۔ اپنے اور اپنے بچّوں کے مستقبل کی حفاظت کے لئے دیجئے۔
۲۔ مادرِ وطن کی بھلائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے دیجئے۔
۳۔ بھارت اور دُنیا بھر میں اَمن قائم رکھنے کے لئے دیجئے۔

اِن سوالوں پر بچار کیجئے

کیا ہم اپنے فرض میں کوتاہی برتیں گے اور اپنی آبرو کو خطرے میں ڈالیں گے؟ کیا ہم چاہیں گے کہ ہمارے جوان ہمارے لئے سرحد پر لڑائی لگائیں اور ہم اُن کے ہاتھ مضبوط نہ کریں؟ کیا ہم آج خود غرضی سے کام لیتے ہوئے اُن سب چیزوں کو خطرے میں ڈال دیں گے جن کی ہم بڑی قدر و قیمت سمجھتے رہے ہیں؟ کیا ہمارے نزدیک ذات مُلک سے، حرص حوصلے اور اشیاء آزادی سے زیادہ اہم ہیں؟

اِن باتوں پر سوچ بچار کیجئے

قوم کی تیاریوں میں ہاتھ بٹایئے

DAGV/64

تری ہر بات ناصح بے تکی معلوم ہوتی ہے
بہار آتے ہی منڈلانے لگی ہے سر پہ گلشن پر
یہ سچ ہے زندگی میں کوئی بھی پیرا سدا نہیں ہوتا
نہ گھبراؤ مقدر کے اندھیروں سے نہ گھبراؤ
کچھ اس انداز سے مجھ پر ستم کرتے ہیں وہ ظاہر
ہدایت اللہ ہادی۔ ناگ پور

شعاع مہر و الفت میں کمی معلوم ہوتی ہے
ڈھلی فیشن کے سانچے میں کچھ ایسی آج کی عورت
چلا تھا جانب مسجد پکڑ لی راہ مے خانہ
جناب شیخ تم اور ہے تمہارا راہ ہی جنت
کبھی رندوں کو بہکانا کبھی زاہد کو سمجھانا
بہائے تھے کبھی ہادی خیال تار میں آنسو
سید محمود آفاق بھوپالی (رنگ)

کبھی فرحت فضا میں اک خوشی معلوم ہوتی ہے
دیوانوں کو کھلونا تھا گریباں کی ردا میری
مرے چہرے سے کیوں بے چارگی معلوم ہوتی ہے

جناب شیخ کی یہ خودکشی معلوم ہوتی ہے
نظر کی بنا پر سرسری معلوم ہوتی ہے
ہمیں کچھ اس میں فی سبیل اللہ گی معلوم ہوتی ہے
گھڑا ڈوبے تو پیاسے سے گھڑی معلوم ہوتی ہے
کسی نیتا کے گھر کی روشنی معلوم ہوتی ہے
سنی میں بھی اُسے دنیا ہری معلوم ہوتی ہے
کھڑی بولی بھی اک فارسی معلوم ہوتی ہے

بہت دلچسپ جن کی شاعری معلوم ہوتی ہے
اگر برق تپاں تجھ کو بری معلوم ہوتی ہے
تو نظروں میں سحر بھی شام سی معلوم ہوتی ہے
ہماری بات تو ان کو بری معلوم ہوتی ہے
گلستاں میں یہ کیسی روشنی معلوم ہوتی ہے

زمانہ ہو گیا ترکِ محبت کو مگر شبنم
محبت کی خلش دل میں ابھی معلوم ہوتی ہے

محبت کی یہاں ہر سو کمی معلوم ہوتی ہے
محبت کی فراوانی کے افسانے نہ چھیڑو تم
یہ دنیا جانتی ہے تجھ میں میرے خانہ
نصیحت تم نہ لے ناصح کہ دل کی بات کہی کیوں
امیر کارواں کا حکم، افسر قافلہ والا
وہ ہے مقصود فرمانے گئے اظہار حالت پر
محمود عباسی ریوڑی

ترے رُخ سے نقاب اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
جسے دیکھو وہ ہے بتلائے گریبانِ دوراں
ہزاروں عقل کی شمعیں جلائیں اہل دانش نے
جانے کہاں میں کیا کہنا یا ہے پھول نے کھل کر
یہ کوئی اور ہی عالم ہے پیدا چمن میں سیر گلشن کو
اسی خوشبو کو محسوس دوست ہے آرام دل مجھ سے
شکیلہ قاضی

ترے غم میں کچھ ایسی دلکشی معلوم ہوتی ہے
تری ہر بات ناصح بے تکی معلوم ہوتی ہے
بہار آتے ہی منڈلانے لگی ہے سر پہ گلشن پر
یہ سچ ہے زندگی میں کوئی بھی پیرا سدا نہیں ہوتا
نہ گھبراؤ مقدر کے اندھیروں سے نہ گھبراؤ
کچھ اس انداز سے مجھ پر ستم کرتے ہیں وہ ظاہر
ہدایت اللہ ہادی۔ ناگ پور

شعاع مہر و الفت میں کمی معلوم ہوتی ہے
ڈھلی فیشن کے سانچے میں کچھ ایسی آج کی عورت
چلا تھا جانب مسجد پکڑ لی راہ مے خانہ
جناب شیخ تم اور ہے تمہارا راہ ہی جنت
کبھی رندوں کو بہکانا کبھی زاہد کو سمجھانا
بہائے تھے کبھی ہادی خیال تار میں آنسو
سید محمود آفاق بھوپالی (رنگ)

کبھی فرحت فضا میں اک خوشی معلوم ہوتی ہے
دیوانوں کو کھلونا تھا گریباں کی ردا میری
مرے چہرے سے کیوں بے چارگی معلوم ہوتی ہے

جناب شیخ کی یہ خودکشی معلوم ہوتی ہے
نظر کی بنا پر سرسری معلوم ہوتی ہے
ہمیں کچھ اس میں فی سبیل اللہ گی معلوم ہوتی ہے
گھڑا ڈوبے تو پیاسے سے گھڑی معلوم ہوتی ہے
کسی نیتا کے گھر کی روشنی معلوم ہوتی ہے
سنی میں بھی اُسے دنیا ہری معلوم ہوتی ہے
کھڑی بولی بھی اک فارسی معلوم ہوتی ہے

بہت دلچسپ جن کی شاعری معلوم ہوتی ہے
اگر برق تپاں تجھ کو بری معلوم ہوتی ہے
تو نظروں میں سحر بھی شام سی معلوم ہوتی ہے
ہماری بات تو ان کو بری معلوم ہوتی ہے
گلستاں میں یہ کیسی روشنی معلوم ہوتی ہے

زمانہ ہو گیا ترکِ محبت کو مگر شبنم
محبت کی خلش دل میں ابھی معلوم ہوتی ہے

تجھ سے کہی میں اپنا بھلا معلوم ہوتی ہے
کچھ اور سوچیے تو کمی معلوم ہوتی ہے
پہنچا جانا ہوں لیکن کشش معلوم ہوتی ہے
جو شے کبھی حد سے بڑھ جاتی ہے بری معلوم ہو
یہ عادت آپ کی مجھ کو بری معلوم ہوتی ہے

زمیں سے آسماں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
جہاں میں نام کی آسودگی معلوم ہوتی ہے
گماں تک جہاں میں تیرگی معلوم ہوتی ہے
تبسم ہائے گریزاں ہر کلی معلوم ہوتی ہے
ہر سو چاندنی بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے
اسی خوشبو میں کمی معلوم ہوتی ہے

خزاں بھی تو بہارِ زندگی معلوم ہوتی ہے
تجھے دل کی لگی بھی دل لگی معلوم ہوتی ہے
یہ تیغ برق کی نیت بری معلوم ہوتی ہے
یہیں مردوں ہی قدر آدمی معلوم ہوتی ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
کہ ان کی دشمنی کی دوستی معلوم ہوتی ہے

محبت کی یہ بھی آخری معلوم ہوتی ہے
لگا گر اسنو لاریوڑی پری معلوم ہوتی ہے
تری نیت میں زاہد بھی معلوم ہوتی ہے
عبادت بھی تمہاری مطلبی معلوم ہوتی ہے
طبیعت محتسب کی دوغلی معلوم ہوتی ہے
ابھی تک میری آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے

کبھی گھبرا نہ فرحؔ زندگی معلوم ہوتی ہے
مرے چہرے کشش میں کچھ کمی معلوم ہوتی ہے

علامہ کہاں گیا ساقیٔ شراب خانہ ۔ یہ بات بات میں کیا تیرگی سی ہوتی ہے
نثار شمع ہو کر خود فنا ہوتے ہیں پروانے ۔ انھیں تو موت میں بھی زندگی سی ہوتی ہے
وہی محفل وہی ساقی وہی مے خانہ وہی ساغر ۔ مگر کچھ ہے کہ جس کی کمی سی ہوتی ہے
طلسم جس کو کہ آفاق خود سے ہیچ تھا ۔ یہ ساحل وہ کشتی ڈوبتی سی ہوتی ہے
بہ تشنہ جوش لبی

جہاں ہر آرزو دم توڑتی معلوم ہوتی ہے ۔ وہیں قسمت کرتی زندگی معلوم ہوتی ہے
نگاہِ دوست میں کچھ برہمی معلوم ہوتی ہے ۔ جبینِ دہر پہ دل کی کشتی ڈوبتی معلوم ہوتی ہے
خبر کیا کون آیا ہے گئی ہے محبت میں ۔ کہ ہر سو زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے
کسی کا آخیاں جلتا ہے یا تم جلوہ آرا ہو ۔ گلستاں میں یہ کیسی روشنی معلوم ہوتی ہے
محبت کو خدا سمجھے محبت کرنے والے کو ۔ محبت ہی بری شے بھی بھلی معلوم ہوتی ہے
نہ ہو ذوقِ عمل جس میں نہ ہو جو مائلِ جنبش ۔ اسے تو روشنی بھی تیرگی معلوم ہوتی ہے
محبت کی یہ کس منزل پہ آ پہنچے ہیں ہم دمشقی ۔ کہ ان کی دشمنی بھی دوستی معلوم ہوتی ہے
علامہ میاں اکبر مالی گاؤں

جہاں اپنی نظر کو تیرگی معلوم ہوتی ہے ۔ وہاں اندھوں کو اکثر روشنی معلوم ہوتی ہے
طبیعت میں اچانک گرمیٔ بڑی معلوم ہوتی ہے ۔ قریبِ انجم شاید زندگی معلوم ہوتی ہے
نہ بات دور نظر پن کی کبھی انسان کی تھی مجھ کو ۔ مگر اب ساری دنیا دوغلی معلوم ہوتی ہے
سیلوں سے جو چیل کھا کے بھی ہنستے ہی پتھر میں ۔ بہت صنعت گران کی کھوپڑی معلوم ہوتی ہے
بہانا نہ دے جیا کہ تو پکا بات میں کہہ دوں ۔ تمھاری شاعری باسی کڑھی معلوم ہوتی ہے
سعید احمد سعید بارانوی

نظامِ مے کشی کی بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ مجھے اب دوستی میں دشمنی معلوم ہوتی ہے
بدلتے زمانے کے اپنے ہوں زمانے میں مرے ہمدم ۔ جو کچھ بات ہو سب کو بری معلوم ہوتی ہے
المیۂ دوراں ہو تم ہے زمانے کی نگاہوں میں ۔ بشر میں جب شرافت کی کمی معلوم ہوتی ہے
بہار نو میں پنپاں ہیں ہزاروں غنچہ تیں لیکن ۔ خزاں آثار پھر بھی ہر کلی معلوم ہوتی ہے
جو کھیلا کرتے ہیں طوفانِ غم سے روز شب کو ۔ انھیں کی زندگی تو زندگی معلوم ہوتی ہے
شہاب الدین فاضل ۔ ناگ پوری

محبت جب بھی جز و زندگی معلوم ہوتی ہے ۔ تبھی کچھ زندگی میں جان سی معلوم ہوتی ہے
خزاں گزری، بہار آئی، ہوئی مدت گلو بے تک ۔ چمن میں ہر طرف افسردگی معلوم ہوتی ہے
مقامت سے نہ دیکھیں ہم غریبانہ کو جہاں والے ۔ اندھیروں کی تہوں میں روشنی معلوم ہوتی ہے
کسی کافر نے چھیڑا تھا کبھی مضراب ہستی کو ۔ صدائیں دیں ابھی تک نغمگی معلوم ہوتی ہے

کہیں خانہ دلی نے نگاہیں پھیر لیں فاضل
مجھے اب ساری دنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

ہوائیں نازش ۔ ملی گاؤں

مذہبی رات دلکش چاندنی معلوم ہوتی ہے ۔ یہ بے حالی بھی اپنی زندگی معلوم ہوتی ہے
کسی تنزل میں اپنی عاشقی معلوم ہوتی ہے ۔ کہ ہر تنکا آشیانہ سا معلوم ہوتی ہے
سکونِ زندگی حاصل کسی پہلو نہیں ہوتا ۔ محبت اب وبالِ زندگی معلوم ہوتی ہے
مزین ہے فلک تاروں سے شبِ دل کی روشنی سے ۔ چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
سکوں نازش کی سکتا نہیں ہرگز زلفمیں ۔ تلاطم آشنا ہر زندگی معلوم ہوتی ہے
عبد الحمید حیرت ۔ ورگ

فضا بہت کی ہوں تو کبھی معلوم ہوتی ہے ۔ نہیں ہو تم تو کتنی تشنگی معلوم ہوتی ہے
قفس میں آ کے دھڑکے سنگ کے سینے تو دم بھر کے ۔ تری آنکھوں سے اب زندگی معلوم ہوتی ہے
بھٹک جاتا ہوں راہِ منزلِ مقصود میں اکثر ۔ مقدر میں مرے کچھ تیرگی معلوم ہوتی ہے
فلک پہ چاند تارے بھی بہاروں کے تقاضے بھی ۔ برستے ہیں جب تیری کمی معلوم ہوتی ہے
کبھی راحت میں اک کلفت، کبھی کلفت میں اک راحت ۔ عجب طرفہ تماشہ زندگی معلوم ہوتی ہے
عبد الحفیظ ۔ ورگ

یہاں ہم رات بھر تارے شمار کرتے ہیں فرقت میں ۔ وہاں تاروں میں ہو کر دیکھئے معلوم ہوتی ہے
وہ آئے ہیں تو شاید کچھ بہاریں ساتھ لائے ہیں ۔ گل و غنچہ میں بھی اک زندگی معلوم ہوتی ہے
اندھیرے کیا بڑھیں گے جبکہ دامانِ سحر روشن ۔ چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
تمھاری زلفِ برفرقت کی آہ سرد ہے شاید ۔ فضا میں جو ہر سو چاندنی معلوم ہوتی ہے
سعید احمد سعید بارانوی

غم کا غم، خوشی ان کی خوشی معلوم ہوتی ہے ۔ ہمارا ایسا ہی اپنی زندگی معلوم ہوتی ہے
گزرتا جا رہا ہے نوک خنجر تابہ تابہ سے ۔ پرانا دل میں جب تک روشنی معلوم ہوتی ہے
بھٹکتے دل کی ہے منزل کے غنچے میں بیاباں میں ۔ چمن میں پھر بھی کچھ افسردگی معلوم ہوتی ہے
کہاں شکوہ میں ہے کانٹوں سے منہ سے بھی نہ نکلے گا ۔ مجھے جب خود مری قسمت بری معلوم ہوتی ہے
علی سجاد رسوا ۔ ورگ

غزل ہی بھی مجھے اب تو خوشی معلوم ہوتی ہے ۔ محبت ہی بہار زندگی معلوم ہوتی ہے
وہ شاید بے نقاب آئے ہیں میرے گھر میں ۔ گھٹا میں اک نور پھوٹتا معلوم ہوتی ہے
نہ حاصل اور کا ارمان، نہ میری متاعِ کارواں ۔ مجھے یہ کاش کمتر زندگی معلوم ہوتی ہے
پھر اک نظر نہ پھیر ۔ نگاہ مست سے ساقی ۔ پیالا جو بھرا ہے یہ تشنگی معلوم ہوتی ہے
گلوں کے رنگ و نکہت میں کیا نگاہِ قہر گلچیں سے ۔ چمن میں ہر کلی ہر کلی معلوم ہوتی ہے
نورخاں نور ۔ گلبرگوی

پریشاں زلف آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے ۔ غرورِ حسن کی بھی زندگی معلوم ہوتی ہے
میرا یہ وہ مقدر ہے میری محبت کو ۔ خوشی دل میں مگر جاتی معلوم ہوتی ہے

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

مکتبہ شعلۂ و شبنم دہلی کی خصوصی پیش

صاحب طرز کہنہ مشق نامور شاعر حضرت حاجی آبادی کا نیا مجموعہ کلام

گردِ راہ

دو آرا ملاحظہ فرمائیے

(۱) میرا، صاحب کی شخصیت کو ان کے احساس اور دھیان میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ جذبہ کو صداقت اور سلیقے سے الفاظ کے پیکر میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ کشتۂ رومانیت نہیں۔ ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی خانہ بندی کا تلازم بھی احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گہن گرفتہ نہیں اور نہ فکر ہے۔ اس لئے ان کے لہجہ میں دل آویزی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پرکاری اور پیشکاری سے زیادہ سادگی اور سرشاری ہے۔

(ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی

(۲) میرا، معمولی شاعر نہیں ہیں وہ بڑی بلندی سے کہتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے اور خیالات لطیف ہیں۔ دل میں جذبۂ ہمدردی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے اور ایسا ہی شاعر ملک و قوم کے لئے باعث فخر ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا۔ ابر احسنی

قیمت۔ تین روپے پچاس نئے پیسے — گردِ راہ — آج ہی طلب فرمائیے

مکتبۂ شعلۂ و شبنم۔ دریبہ کلاں۔ دلی نمبر ۶

اردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد "قرینے"

ابر احسنی گنوری کی غزلیات کا دوسرا دیوان

جس میں ۲۲۵ غزلیں، ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے۔ عام دیوانوں سے ۳ گنا بڑا اور قیمت صرف تین روپے ۲۵ نئے پیسے ہے۔ غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا۔

(پتہ)

ابر احسنی۔ گنور۔ ضلع بدایوں۔ (یو۔پی)

اس رسالہ کو تعلیم بالغان میں شریک کیجئے

شعلہ و شبنم دہلی

زرسالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

جنوری
۱۹۶۴ء

1 DEC 1963

JAMIA LIBRARY

فہرس

۱	ثابت لکھنوی مرحوم کی داغ نگاری	عفون کوٹوی	۵
۲	حادثہ	آبر احسنی	۷
۳	ہر یم ناگ پوری کی نعت پر طرفہ بھنڈاروی کی اصلاح	طرفہ بھنڈاروی	۸
۴	توجیہہ	آبر احسنی	۸
۵	طرحی مشاعرہ نمبر ۶ (مختلف شعرار کرام)	مرتبہ آبر احسنی ناظم مشاعرہ	۹
۶	ارشادات	نوح ناروی مرحوم	۱۱
۷	دو غزلیں	ساحر بیالکوٹی - طرفہ بھنڈاروی	۱۲
۸	افکار نو	نانک وجینی محمد علی شریف جوہر	۱۳
		تنویر احمد کیفی	۱۴
۹	غزلیات	اسماعیل صدیقی - مست فتح پوری	۱۵
		امین جعفری	۱۵
۱۰	جلال و جمال	حکیم پوربی - سلیمان ایرانی	۱۶
		گوہر کوٹوی - آزاد ہشیارپوری	۱۶
		فارس کالی - مقصود نشتری	۱۶
۱۱	نئے سال کا تحفہ (دوہا سان)	شریمہ بدھ شن پیڑاوی	۱۸
۱۲	ملاقات کرنے والے کا نشان چہ	گلنار شرما	۱۹
۱۳	ہم نے لڑکی دیکھی	شمس نذیر الدین ساز	۲۳
۴	روپے کی حمت	نور پیکار - بانکوٹی	۲۷
۱۵	نشان منزل	امین بشیر سودائی	۲۸
۱۶	غم میں مسکرانے	اختر عابد نوگانوی	۳۲

جلد ۱۵
شمارہ ۱

ہیڈ آفس
بیہ کلاں - دلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

حصہ نظم و ناظم مشاعرہ
مولانا آبر احسنی گنوری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونین خصوصی
آر ہاشمی
رد غوث پوری

قیمت
۲۱ نئے پیسے

نام گوپال پرشاد جین پرنٹر و پبلشر دہلی پرنٹنگ پریس دلی میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم دیہ کلاں دلی سے شائع ہوا۔

حرفِ اوّل

فارئین شعلہ و شبنم

کو

نیا سال

مُبارک ہو

مفتوں کوڑی

ثابت لکھنوی مرحوم کی واقعہ نگاری

مرحوم اپنی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین واقعہ نگار تھے۔ لیکن اس کا انداز بیان سادہ اور سپاٹ ہوا کرتا ہے۔ کے نزاعی کے مدنظر اس کا یہ اسلوب مناسب بھی ہے اس کے لئے نامزد بھی۔ لیکن بیان میں دلکشی اور اظہار دل ربائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادبیانہ طرز و طریق میں داخل انداز ہوں۔ جزئیات کا ذکر۔ پختگی مشاہدہ کے ساتھ پختگی مشق بھی چاہتا ہے۔ تاہم واقعاتی توجہ و انہماک بیان واقعہ سے سامعین و ناظرین اگر اتنے متاثر ہو جائیں کہ اس واقعہ کا تماشائی سمجھنے لگیں اور نگاہوں کے سامنے وہ واقعہ حقیقت کی شکل اختیار کر لے تو واقعہ نگار بہترین کامیابی ہے۔

مولوی افضل حسین ثابت لکھنوی مرحوم ۱۸۸۶ء بمقام سالمی معاشی ضرورتوں کے تحت اپنے مولد و وطن سے کوچ و استعفا کر کے اور تمام علاقوں سے سلسلہ نسبت بھی توڑ کر بسلسلہ وکالت یہیں بس گئے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں ظہور پذیر ہوئیں "حیات دبیر" "حیات انیس" "سیر جمیل" وغیرہ ان کی تصنیفات یہیں پیدا ہوئیں۔ ۷۹ سال کی عمر ۱۹۶۵ء میں ان کا انتقال ہوا کر یہیں سپرد خاک کئے گئے۔

مرحوم نے کئی مرثیے لکھے ہیں۔ واقعہ نگاری، مرثیوں کی بھی جزو ہے۔ لیکن اس موقع پر میں دیگر واقعہ نگاریوں کا ذکر نہ کر کے ۱۹۱۸ء میں طاعون کا ذکر کروں گا۔ اس زمانہ میں عوام نے ایک مشورہ شیطانی تصنیف کیا جو حضرت قاسم کے حال پر ہے۔ دو سو پانچ اس کے بند ہیں اس کا مطلع ہے ؎

سکر دوں ہے منہ جماعت کا دہر میں

مرثیہ ۱۹۱۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کی ابتدا میں مرقوم فرماتے ہیں:

"یہ مرثیہ جنگ چھپنے کے واسطے مطبع اثنا عشری میں بھیجا ہوں۔ ۱۹۱۸ء میں حیضہ نے کیا تھا۔ جنگ تا ماشیکہ ہوئی۔ شہر طاعون سے بھرا ہوا تھا۔ ہر روز گھر کے گھر کے گھر ساکنان گھر کی طرح صفائی کر رہے تھے ایک مکان (سکن میرا لطاف حسین خمار) میں مقیم تھا۔ ..... مجھے اس طاعون کی شدت کے زمانے میں اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اور گھر کے مکانوں سے مرنے اور ان کے وارثوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ میں نے اسی زمانے میں اس مرثیہ کو تمام کیا ــــ"

اس مرثیہ کے اختتام میں تقطیع کا یہ بند ہے ؎

ثابت بس اب کہ سننے کی دل کو نہیں ہے تاب
گزری ہے آدھی رات اجابت کا وا ہے باب
جو مانگنا ہو مانگ دعا ہو گی مستجاب
کر عرض کبریا سے کہ اے مالک الرقاب
طاعون سے امان بحق حسینؑ دے
بے چین تیرے بندے ہیں ان سب کو چین دے

وقت مستجاب میں مرحوم حالات سے متاثر ہو کر طاعون سے نجات کی دعا اس واقعہ کی مظہر ہے کہ اس مرثی کے دل و دماغ کو بھی کیسا متاثر کر رکھا تھا۔ اس زمانہ کی کبھی ہوئی مرحوم کی کچھ رباعیات بھی ہیں۔ ان میں کوئی واقعہ تسلسل سے جو بیان نہیں ہوا۔ البتہ اس زمانہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان جزئیات سے اصل واقعہ تصور ذہن میں آجاتا ہے ؎

کس جوش میں مشک گرم پیک آتے ہیں
گھبرائے ہیں کہ نعرہ ہائے یک آتے ہیں
ہے ذاکروں کی آگے آگے چٹھی
ہٹ جاؤ کہ ذوالجناح پیک آتے ہیں

یارب کس جا ہے اپنی عالم پناہیں
کس سمت کو مکان جہنم جائیں
طاعون سے بھاگے ہیں جو یہ بندے
کاش اپنے گھروں سے بھی کم جائیں

طاعون میں ذاکر بھی طب بھول گئے
معروف جو تھے وہ بھی کے بھول گئے
چھوڑیں چھوؤں کی جان میں اپنی فکر
اولاد کے بھی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے

ذہنی کی رباعیات میں بھی واقعات کی منظر کشی ہے شاعرانہ انداز بیان کی بنا پر حالات، واقعات اسی کا پیکر مختلف رنگ کے نظاروں کے ساتھ پھر جاتے ہیں ؎

ہوں کر قسم دم نے مشیرہ اژدہا گھیرا
اعمال کی زشتی نے مظفر گھیرا
تو سے پانی خدا خدا کر کے نجات
یہ پانی کے بادلوں نے آکر گھیرا

برپا کرتی ہے نقد طوفان ہوا
ہے پیر تماشہ بیں، حیران ہوا
دل اور پریشان ہوتا جاتا ہے دم
وہ دور کے بعد پھر ہے طوفان ہوا

کیوں جلتا ہے یہ دوزخ گھبراتی ہے
جوش میں اور گرم ہوا آتی ہے
بھولے سے کبھی جو آنکھ ہے ادھر
بادل کہ جھما جھما کے بے جاتی ہے
[illegible]
[illegible]
بادل یہ نہیں ہیں کالے کالے ثابت
چھائی ہوئی ہے سر پہ فلاکت اپنی
گھر گھر کے گھٹا بہار دکھلاتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی آتی ہے
دیتا نہیں تیرا حکم گرنے کا جو حکم
بجلی بچ تڑپ تڑپ کے رہ جاتی ہے
چاہے جو گھٹا کہ بات پوری رہ جائے
اٹھ اٹھ کے ہزار بار آندھی رہ جائے
گرنے کا نہ دے حکم جو تیری رحمت
کیوں کر یہ تڑپ تڑپ کے بجلی رہ جائے
یارب مریم اب تو بارش ہو جائے
ہیضہ ہو رفع، دور خارش ہو جائے
کھل جائے کبھی برسے جو ابر رحمت تیرا
بیمار کے حق میں وہ جوارش ہو جائے
ٹھنڈی آہیں یہ چشم نم بھرتے ہیں
دریاؤں کو جب ابر کرم بھرتے ہیں
خالی دل کس کا تیری الفت سے ہے ؟
بادل بھی تہی چاہ کا دم بھرتے ہیں

شاعرانہ انداز بیان اور لفظوں کی رعایت ملاحظہ فرمائیے۔ اس قطعہ کے بیان میں ان کا التزام شاعر کی [illegible] کا مظہر ہے۔ ٹھنڈی آہ، چشم نم۔ دریا، ابر، بادل اور چاہ یہ سب خود طالب ہیں، دم بھرنے کا محاورہ ٹھنڈی آہ بھرنے کے مقابل ہے۔

اور رباعیات پیش خدمت ہیں۔ لفظی و معنوی خوبیاں زندگی قربان ہے بہت کچھ [illegible]

رحمت تری عام ہے خدائی کے لئے
تو بہر سزا تو ہم گدائی کے لئے
بادل وہ بھرتا چلا آتا ہے
بجلی بے چین ہے رہائی کے لئے

صنعت حسن تعلیل کے جواب رعایت لفظی اور محاورہ قابل نظر ہیں ؎

بادلوں کو پریشان ہوا کرتی ہے
ٹھنڈک ہے مگر نیند اڑی جاتی ہے
بادل کے فراق میں یہ ہے صورت و فہم
سراپا ہوا، ہوا سے ٹکراتی ہے

پریشان ہوا۔ اس کے ساتھ نیند کا اڑنا، ہوا سے ہوا کا سر ٹکرانا۔ ان محاوروں کے استعمال نے انداز بیان کو شاعرانہ بنا دیا ہے ؎

آثار قحط کے اب سارے ہیں
مضطر حیوان غم سے بے چارے ہیں
آنکھیں ہیں ضعیفی سے دکھاتا ہے فلک
کب رات ہیں چھٹکے ہوئے یہ تارے ہیں

آنکھیں دکھانا محاورہ ہے۔ مصرع ثانی کے ساتھ صنعت حسن تعلیل ہے۔ چوتھے کے ساتھ "بے چارے" کا استعمال زور معنویت لئے ہوئے ہے۔

واقعہ نگاری کی جاری ہے، لیکن لفظی و معنوی خوبیوں کے ساتھ، یہ شاعرانہ کمال اور استعارانہ اعجاز ہے ؎

اے چرخ یہ کیسی تری بے دردی ہے
چہروں پہ اداسی ہے کہیں زردی ہے
تیرنگیٔ سرد و گرم عالم دیکھو
دن بھر گرمی ہے رات بھر سردی ہے

یارب کب تک تمام خلقت ترسے
بارش ہو جائے زندگی اب جینے پر ہے
رونے والے بھی اب نہیں ہیں ایسے
برسا دیں دو بوند جو کہ چشم تر ہے

آنکھیں ہیں نہ پوچھ فیضِ گریہ کیوں
رات آئی تو کھینچ شب محشر
ایجاد جسے ہیں نت نئے اب یہ
رحمت بھی لباس فر بدل

گردوں نے بھی سر پہ نئی تو
بادل کا پتہ نہیں زمیں و
کہتے ہیں جسے مسلمان
ساون کا مہینہ ہے مگر

ہر زبان میں لفظی صنعت [illegible]
کے تخصیص طوائف کا سبب ہو جائے
گردوں۔ بادل سر بادل مذہبی محاورے،
ہم قبیل الفاظ ہیں۔

مسلمانوں کے ایک مہینہ کا نام
کے درمیان ہوتا ہے، ہندو مسلمان سے
کہ اگرچہ ساون کا مہینہ ہے لیکن یہ با
خالی کے دو معنی پہنچتے ہیں "ساون
ہے "خالی" ہیں مسلمان کی۔

ثابت مرحوم کی ایسی شاعرانہ
آپ کو کرنا تھا۔ دانتوں اکر لیجئے پا
اس کا بھی بیان ادیبانہ ہے ؎

جب سرد ہوا گھٹا کی طا
جان تازہ میاں ثاقب
گرمی تھی غضب کی کھل کے
رحمت تیری غضب پہ فا
اس گرمی و سردی کے بعد پانی برسنے
زمزمہ کی آپ کی صحت کا باعث ہو
بارش میں بہار رنگ
پہنے ہے زمیں لباس
رنگ رنگ میں رنگوں ہو
بہتا ہوا چھروں سے پا
واقعہ نگاری کے تحت لفظی و
باقی صفحہ پر دیکھئے

حادثہ

میرے عزیز اور تلمیذ با اخلاص جناب انیس عثمانی گنوری کی اہلیہ جو میرے عزیز دوست کی لڑکی اور معزز گھرانے کی خاتون تھیں، ولادت کے سلسلے میں الجھن پیدا ہونے کے باعث ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو رانچی کلنک بھیجی گئیں۔ صبح کو زچہ کی لاری چڑھی بیاسی ۸۲ کلو سے جا گیا۔ یہاں کی براعتوق لیڈی ڈاکٹر نے نہایت بری اور سخت بری سے کام لیا۔ مریضہ کی جان کے لالے پڑے تھے، وہ اس پر خفا ہو رہی تھی کہ تم اتنے سویرے مریضہ کو کیوں لے آئے کہ ہمیں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ افسوس ہے حکومت ایسی ظالمہ عورت کو اپنی ذمہ داری پر رکھے ہوئے ہے۔

بجبوراً دوسری لاری کرایہ کی اور مراد آباد لے جایا گیا۔ یہاں کی لیڈی ڈاکٹر نے نہایت شریفانہ اور ہمدردانہ سلوک کیا۔ ولادت تو ہو گئی، مگر بچی نے فوراً ہی اور زچہ نے دو گھنٹے بعد دم دے دیا۔ لاش گنور لائی گئی۔

پورت گنوری بہت اہم موت تھی۔ مرحومہ نہایت سلیقہ شعار، نیک دل، خدمت گزار، منتظم اور خوش اخلاق تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے۔ سب کا تمام نظام خانہ داری درہم برہم ہو گیا۔ بچوں کو دیکھا نہیں جاتا، دعا کیجئے خدا مرحومہ کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آبر احسنی

اس خبر سے بڑا دکھ ہوا کہ بھائی نازک احسنی کے والد وسیع شاگرد جناب عمر شمر آبادی کئی مدت بیمار رہ کر فیروز آباد اسپتال میں راہی بقا ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نازک صاحب کو اس موت کا بڑا غم ہے، انھوں نے ذیل کا قطعہ کہا ہے

رفت ایں عالم سوئے دار البقا — کرد نازک بے عمر ایں سخت رہ
از سروش آمد بگوشِ من ندا — یک ہزار و سہ صد و ہشتاد و سہ

۸۳ ۱۰۳ ۳

خدا مرحوم کو داخل جنات اور پس ماندہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آبر احسنی

مصرع طرح طرحی مشاعرہ نمبر ۶۲

ہوش جاتے رہے آیا جو خدا ہوش مجھے۔
ہوش: جوش قوانی ——— مجھے: دو لیٹ

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳ فروری ۱۹۶۳ء

شکروار ۱۳ دسمبر کو
عظیم الشان افتتاح
گلچہ پلازہ، امپیریل۔ لبرٹی
ویسٹ اینڈ، نٹ راج۔ ایروس
نیز رادھو شاہدرہ، موہن چترلوک غازی آباد

ایک نہایت دلچسپ گھریلو تصویر
چار جوڑوں کی کہانی جو گھر کے سکھ کی تلاش میں تھے
(۱) منوج کمار اور راج شری (۲) محمود اور ساوتری
(۳) سدیش اور شیاما (۴) جانی واکر اور مینو ممتاز
رتن دیپ پکچرز پیش کرتے ہیں
ساوتری۔ راج شری، منوج کمار، سدیش۔ محمود
لتا پوار۔ مینو ممتاز اور جانی واکر
گھر بسا کے دیکھو
ڈائرکشن: کشور ساہنی — موسیقی: چترگپت — راجندر کرشن
پروڈیوسرز:۔ بال چندر شکلا اور ترلوک بھائی ٹھٹھی
کاسٹ:۔ منجو شری، مکھرجی، فیر اور بریم کمار
میرٹھ۔ آگرہ۔ مراد آباد۔ متھرا۔ الہ آباد۔ وارانسی
فتحپور۔ بھارت۔ کنور کشی۔ مانسہرہ۔ پرکاش
امرت سر۔ چترا۔ جموں نیا تاج۔ سری نگر ایمبائش
ڈسٹری بیوٹرز:۔ راج شری پکچرز۔ پرائیویٹ لمیٹڈ

جناب ہمدم ناگ پوری کی نعت پر ابوالمختار طرفہ بھنڈاروی کی اصلاح

(۱) عقیدت کی ڈالی محبت کی کلیاں صداقت کی پتی عنایت کی ڈالی — نظر آ تو جائے مزار محمدؐ کا ستارا دل و جاں لٹائیں گے ہم بھی

(۲) کبھی تو ملے گا گنہگاروں کو موقع درِ پاک پر جبہ سائی کا موقع — سلامت رہے آستانِ محمدؐ کسی دن وہاں سر جھکائیں گے ہم بھی

(۳) ہمیں بھی دکھا دو مدینے کی گلیاں وہ کیف آفریں بادیے کے نظارے — یہ سوز و تپش کو جو جنت بنا دے کہاں تک ملال و الم زندگانی کا اسباب جنت بنائیں گے ہم بھی

(۴) ہر اک سمت ہیں شاخسانِ محبوب داور ابوبکرؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و حیدرؓ — ہمیں بھی وہاں اے صبا لے چلے تو چل فرشتوں کی دنیا میں جائیں گے ہم بھی

(۵) کبھی تو کھلیں گی مرادوں کی کلیاں کبھی تو لگا ہوں میں گلکشتِ جاں — منائیں گے جشنِ بہاراں کبھی تو مقدر دکھائے گا وہ دن گلوں کی طرح مسکرائیں گے ہم بھی

(۶) محمدؐ کی سرکار میں جانے والو! سخاوت کے دربار میں جانے والو! — درِ انبار کسی دن تمہاری طرح اُس فضا میں پہنچ کے مرادیں پائیں گے ہم بھی

(۷) سُنا ہے بڑی ہی کٹھن ہے وہ منزل مگر خوف کھاتے نہیں صاحبِ دل — بچکھاتے خدا ہم کو توفیق دے گا تو ہمدم قدم سوئے بطحا اٹھائیں گے ہم بھی

راستے اور رستے کی تحقیق کی گئی ہے۔ دونوں طرح صحیح ہے ـــــ طرفہ

توجیہہ

(۱) ہمدم نے پہلے ڈالی پھر کلیاں لکھا۔ ڈالی بڑی چیز ہوتی ہے۔ کلیاں چھوٹی۔ طرفہ صاحب نے پہلے کلیاں پھر گجرے بنا کر پختگی سے بتدریج کی طرف لے جانے کا سبق بھی دے دیا اور گجرے نے ڈالی کی بات بھی صاف کر دی کیونکہ ڈالی میں گجرے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسا خالص کلیاں اور پھولوں کی بات رہ گئی۔ دوسرے مصرع میں ہمدم نے مزار لکھا تھا۔ طرفہ صاحب نے روضہ بنایا جو عمارت ہونے کے سبب دور سے نظر آ سکتا ہے۔ مزار تو نشانِ قبر کو کہتے ہیں۔ ایسا کہ طرفہ صاحب جائز رکھتے ہیں، مولانا سیماب بھی اس کو جائز جانتے تھے کیا اچھا ہو کہ احتیاط کریں۔

(۲) ہمدم کے یہاں گنہگاروں کو موقع تھا۔ طرفہ صاحب نے رسائی بنا کر عمل اور رد عمل میں تیزی کر دیا۔ یہ ان کی دست نظری ہے

(۳) کیف آفریں کی جگہ سرد و خنک۔ خلد کی جگہ خلد مترنم ہر عمل سے ترقی یافتہ تبدیلیاں کی ہیں۔ ملال و الم زندگانی کی جگہ بازسماعت ترکیب بھی تھا۔ الم ملال میں ایک اضافہ

(۴) ہر اک سمت کی جگہ یہاں۔ شاخسان محبوب داور کی جگہ شاخسانِ محبوب داور۔ صبا لے چلے تو چل میں تقاضائی گرفت ہو گئی ہے۔

(۵) نگاہوں میں گلکشتاں ہونا بے معنی بات بھی ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے تو گلکشتاں ہو سکتا ہے تو یہ سوال ہے کہ کون سا گلکشتاں مراد ہے۔ ہمدم کے ذہن میں ہے۔ مگر یہ ظاہر اثبات نہیں ہوتا۔ اصلاح میں یہ احتمال ہے کہ کشمر کو قریب تر کر دیا جائے۔

(۶) سخاوت کے دربار کو کاکروچ انبار بنا دیا یہ تو بہت ہی اچھی تبدیلی ہے۔ اس سے مضمون

(۷) خوف کھانے سے پختگی بہت زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ قدم اٹھانا نہ تھا۔ مگر بڑھانا کی صورت میں بہت بہتر ہے

آپ حسنی گنوری

طرحی مشاعرہ نمبر ۱۰

مصرع طرح

ٹھہر جانا یہیں اے گردش دوراں ٹھہر جانا

ناظم مشاعرہ

حضرت مولانا امیر احسنی گنوری

قواعد کے ہمراہ ٹکٹ طرحی مشاعرہ یا اس کے متبادل چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیے۔

سلسلہ گوہر کوٹی

شب کا ہر دور کا کیوں نور بکھر جانا
خفا ہے ہم سے یہ کس کا نگاہوں پہ زلفوں کا بکھر جانا

خدا الفت پہ بھی انعام پہ جانا
دلوں کا غیر ممکن ایک مرکز پہ ٹھہر جانا

ہوں جانے والے ہم تو چکے جیتے جیتے
حریم ناز میں ہے دل میں اتنا سوچ کر جانا

بتا جانا ستا گیا ہے ایسا منزل ناں
جہاں کچھ سر جھکا اس کو بھلا ایک سنگ در جانا

ہے ہنسنے پہ دشت کرنا جیسے کا شکوہ ہے
ہو الفت میں وفا کا مجھ کو تنہا چھوڑ کر جانا

کہ ذلت حوصلے کی ہوتی ہے ظاہر
غم دنیا کا یہ داشت کی حد سے گزر جانا

ہے کہ ہر گوہر کسی کے ارفع ذہانت سے
ہنر کی قدر کب دنیا میں کوئی ہے ہنر جانا

صدیقی یاد الوفی (کوٹہ)

ہے بہم جانا بیر کی آفت سے ڈر جانا
ہمیں زیبا نہیں پڑ کر مصیبت سے گزر جانا

نکلا ہے دل پہ نقش ہے وہ منظر ماضی
مرا پھر دل بنانا وہ تمہارا روٹھ کر جانا

ہے نام سے پایا سکون زندگی ہم نے
ہمارے تذکرے کو تم نے اکثر دوسرا جانا

یا صورت اس میں ہے کوئی دوا کی درد
دعا کا ہی ہے اور اتنا ہے اثر جانا

دل زندگی کی یہی آتی ہے حقیقت ہے
تمہارے نام سے جینا تمہارے غم میں مر جانا

ہی دوست میں یہ جنون شوق کا کام
تجسس کرتے کرتے دشت ہستی سے گزر جانا

بہار اک دن نے تھے ہم اسی فصل بہاراں میں
اب اس کی یاد سے لازم ہے اشکوں میں بھر جانا

گوہر نظامی

اگر چند زندہ زیست کو جانا اگر یہاں
بہت نادان ہے وہ جس نے یہی اس کو معتبر جانا

انام پر بڑھ سکے نہ جس کو اپنی ہیت پہ
خط گیا ہے اگر ساحل کو بھی اس نے سمندر جانا

اس سے بڑھ کر کیا ہوگا ثبوت اپنی فنا کا
قفس میں رہ کے بھی ہم نے قفس کو اپنا گھر جانا

فلاں کو بھروسا کیجئے تو کیجئے کس پہ
وہی نا معتبر نکلا جسے بھی معتبر جانا

محفل یاراں میں آج اور وہ ہے کہ ہم تجھ میں
ٹھہر جانا یہیں اے گردش دوراں ٹھہر جانا

تمنا کیوں ہے وہ خوش اس قدر شرمندۂ فردا
شریفوں کا تو شیوہ نہیں کہہ کر مکر جانا

نظام اب منظر کیوں ناداں ہے ماضی میں
کہ ہے خود ابتر کو بھی تو اپنا سا بسر جانا

کریم احسنی بھاگلپوری

پیام صبح عشرت ہے تو کیوں مسرور جانا
فریب شام غم ہے صبح پر مجبور جانا

پتہ صاف دیتا ہے کہ اجالا کوئی ڈھونڈے
دل بے تاب ہے اگر پر آنکھوں میں بھر جانا

شب غم کچھ تو ہو جائے نظارا صبح ازماں کا
ذرا اے اشک خونیں دل سے فرقت میں ٹھہر جانا

یہ کام ابلہ جنوں کا ہے نہ کچھ کوئی سہل اس کو
گزرنا اس کے کوچے سے ہے محشر سے گزر جانا

وہ کیا جانیں خبر ہے جو کہ لے بر الفت کے
کہ اس میں خندہ کی حقیقت ہے ابھر جانا

ہے آہ نا رسا جیسے کہ کوئی ہستی ہے اے ہمدم
غبار نا وہ ہوں ام سر سے گزر جانا

جہاں کو نامہ اجس نے بنایا محبت ہستیاں
کریم اس کے لئے آساں ہے طوفاں سے گزر جانا

نشتر

نہیں ممکن نشتر کا ایک مرکز پہ ٹھہر جانا
یہ چکر عمر بھر کا ہے ادھر آنا ادھر جانا

ذرا دیکھ کر، مگر بھر پور دل پر وار کر جانا
بڑی اچھی روش ہے اک چپکے سے گزر جانا

خطا ہے آشیاں بر عزلت نے ڈالے ہیں
یہ پتے شکوں کی فطرت دیکھا ہر کر بکھر جانا

عجب ہے کار ہے اُن سے محبت میں تغافل کا
مزہ دی تھا ہیں بھی زندگی کے بعد مر جانا

خلوص طبع عاشق میں اگر ہوتا ہے شامل
نہیں ممکن کسی صورت وفا کا بے اثر جانا

نہ اپنا حوصلہ ہے اپنی فولادی پہ فرقت ہے
کہ ٹوٹے وہ ہے مرا اور طوفاں ہی ابھر جانا

تڑپ جاتے ہیں نشتر لاشعوری طور پر اکثر
قیامت ہوگیا ہر کا کسی کا چھوڑ کر جانا

شہرت میرٹھی

ہمیشہ راحت جاں راحت قلب و جگر جانا
تسے تیرے تغافل کو ہم نے کب تیر نظر جانا

محبت کرنے والوں کو ستم دیتا ہے وہ کر کر
پشیماں کی دعا سے یہ ہر دانوں کا مر جانا

جھکایا سر اسی در پر اسی در پہ کئے سجدے
تقاضے دل کو میں نے اپنا کعبہ عمر بھر جانا

اسیروں کی بھی کوئی زندگی ہے کوئی جینا ہے
عقوبت ہے کہ جینے سے کہیں بہتر ہے مر جانا

یقیں ہے اس سے کم ہوگی دعا کی رسائی محشر کی
خطا بھی ہو شب فرقت کریں نے مختصر جانا

جنوں نے مار رکھا ہے جس طرف بھی چل پڑا ہوں میں
پتہ اس کا نہیں ہوتا کہ ہے کدھر جانا

کسی دن بھی نہ آئے اپنے وعدے پر وہ اے شہرت
مگر میں نے ہر اک وعدے کو ان کے معتبر جانا

شہر تمنا ہوئی

سید کمال نگار اسمٰعیل شکوہ آبادی

جب کبھی بے نازکِ کلیل ہستی سے گزر جانا
تجھے اے رہنمائے کوئی تیرا مسہل ہو جانا

خود و دیگر کا باقی نہیں رہتا نشہ دائم
مصائب جاں ستاں میں حیات کا مزا جینا ہے

کبھی اس کی کہانی ہے خموشی اور کبھی اس کی
یہی مطلب ہے دنیا کا یہی مفہوم ہستی کا

نم ناکی نہ بن جائے کہیں پھر اپنے قدر کرنے
تو ہنسا ہنسا کے مجھ کو نہ رلا اے گردش دوراں

گھٹا بن کے سمائے گی کبھی برق و شرر جانا
ہجوم بیخودی کے کوئی سمجھائے تو کیا سمجھے

وہ کیا جانے کہ ساحل پر ہوں طوفانِ تلاطم میں
خوشی کا کیا خوشی تو چار دن کی چاندنی ٹھہری

معاذ اللہ مری وارفتگیٔ شوق کا عالم
یہ شرما دفا ٹھہری ہے اے تخلیقِ الفت میں

آزاد بارہ بنکوی

بہت سے راز ہیں جاں، نہیں کچھ بھی مگر جانا
مری ناچیز ہستی کا جو مقصد ہے تو بس یہ ہے

وہاں ہے کاروانِ زندگی تنہا ایک رہبر لیے
مرے ہمدم قبولیت کی باتیں فکر ہاتیں ہیں

قلق نے قدر خوشیوں کی دو چند چین ہم سے
جو پوچھا نارسا آزاد اس کے گیسوئے خم سے

اسمٰعیل ذبیح الیگانوی

وہ الفت میں جیا اور وہ الفت میں مر جانا
اسی نے زندگی بے شک بتا دی زندگی میری

وہ پرسش کے لئے آئے ہیں میری لاش پر جب وہ
اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اب لے ہم

وہ بے گانہ کر دیں زمانے کی زبانوں پر
کبھی عید کی آنکھوں سے جب آنسو نکل آئے

صبیح شکوہ آبادی

یہ مر جانا، زمانے سے گزر جانا
یہ موت ہے، قیامت ہے، قیامت ہے قیامت ہے

تمہارا ہی خیال ہے یہ سمجھتے ہیں کہ لے رہنما
عبدالستار ضیاء، ستارہ جو وہ ہے

سمجھ لیجے یہ جینا زندگی مرنے سے بڑھ جانا
حریم خاص کے پردے سے پھوٹی ہے پکار آئی

سعید احمد مسعود بارہ بنکوی

سمجھ جائے گا پھر تو خود بخود میرا عقیدہ بھی
ہوئی موضوعِ الفت پر اداں میں گفتگو ایسے

نثر اجراوی

یہی انجام ہے کہتا ہوں نہ فرہاد کی دکھ کر
مجھے وہ جرمِ الفت کی سزا اب دینے والے ہیں

جناب اختر قریشی۔ دہلی

ہے جس کا نام ہر آفت سے دنیا کو گزر جانا
دعا والوں کو جو دیوانگی کا کیف ہوتا ہے

ہجومِ غم سے کہہ دیجیو ہو جائے اگر جانا
جو اب سائل کے پھر آگے سے سفر جانا

تمہیں فرصت نہیں تو فکر تم پھر بھی نہ کیا کرنا
ہمیں اور کیا کرنا ہے آگے دیکھئے کیا ہو

خلاصہ ہے اک حسن اندیشہ
مری فطرت نہیں ہے شعر کے شہرت کو پا جانا

دعا کا نام ہے دراصل زندہ جاوید ہو جانا
بھرا بیٹھا ہے ہر اک رند اور خطرے میں ساقی ہے

بھروسا اس کے وعدوں کا کہ یہ کیا کوئی آخر
نہ ہو پائیں ادا جب میں وفا کے بھی جو ناواقف

الطاف انصاری سلطان پوری

مری برباد یوں کی لے کے جب تک خبر جانا
مری فکروں میں پیشہ نہیں ہر گز شر پسندی کا

کوئی مانے نہ مانے مگر ہے دست قدرت میں
مجھا چھوں سے لگا کر آگ میرے خانۂ دل میں

مری معصوم فطرت کا ہے یہ اعلان کیا کہنا
مل سجاد رضوا ایرانی ورنگ

ترس آیا انہیں شاید ہمارے حالِ مضطر پر
تمہاری ہی خوشی سے ہم جیا بیٹھے تھے یوں نہ

کبھی سوچا بھی ہے تم نے کسی کے دل پہ کیا گزرا
ہماری ہی خطا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ لے رہنما

عبدالستار ضیاء، ستارہ جو وہ ہے

حقیقی زندگی ہے وہ الفت میں مر جانا
حریم خاص کے پردے سے پھوٹی ہے پکار آئی

سعید احمد مسعود۔ بارہ بنکوی

اگر منظور فطرت یار ہو تجھ کو سنور جانا
نہ کچھ ہم نے اور سمجھا یہ کچھ اس نے دھر جانا

مقامِ امتحاں ہے تو جھک جھک کے گزر جانا
ٹھہر جانا یہیں اے گردشِ دوراں ٹھہر جانا

اسی کو کامراں سمجھا اسی کو معتبر جانا
تمہاری ہر نظر کو ہم نے الفت کی نظر جانا

اندھیری رات کا عالم ہے رہزن کا بھی ڈر جانا
کہیں کو دستورِ دنیا میں نے معتبر جانا

ٹھہر جانا ذرا اے گردشِ دوراں ٹھہر جانا
مقدر کا بگڑ جانا، مقدر کا سنور جانا

کسی کا ظلم کرنا اور میرا صبر کر جانا
خدا شاہد ہے میں نے اپنا ہی خونِ جگر جانا

کسی کو یہ بھی ہے معلوم ہم کو ہے کدھر جانا
ہمارا سخت سے سخت تر ہوئے ان کا گزر جانا

ارشادات

نافذائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی مرحوم

کام یہ کرتے پڑے شام سویرے مجھ کو
ہوں مبارک در محبوب کے پھیرے مجھ کو

رنج و غم روز ملے شام سویرے مجھ کو
راس آئے نہ اُجالے نہ اندھیرے مجھ کو

کیا ہوا انجام محبت کا خدا خیر کرے
ڈھنگ اچھے نظر آتے نہیں تیرے مجھ کو

اک مری جان پھر اس جان پہ اتنے صدمے
سینکڑوں رنج و الم رہتے ہیں گھیرے مجھ کو

اس تمنا میں کہ مرجائے تو مل جائے نجات
دیکھنے آتے ہیں وہ شام سویرے مجھ کو

انتہا ہوگئی یہ تیری طرف داری کی
دھوکے دینے لگے احباب بھی میرے مجھ کو

ہے یہ مطلب کہ نہ میں شکوۂ بیداد کروں
ڈانٹ جاتا ہے کوئی شام سویرے مجھ کو

غمزہ و ناز سے محفوظ رہوں گا کب تک
تاکتے رہتے ہیں ہر دم یہ لٹیرے مجھ کو

تیرہ بختی بھی ہوئی جاتی ہے اب ان میں شریک
مار ڈالیں گے شب غم کے اندھیرے مجھ کو

رات دن میں تو کوئی وقت ہو عقبیٰ کا خیال
درس ملتا ہے یہی شام سویرے مجھ کو

آپ کیوں ترک محبت کے لئے کہتے ہیں
کم نہیں اس کے لئے دوست ہی میرے مجھ کو

دل تو میں جوش محبت میں دیئے دیتا ہوں
کیا خبر اس کی وہ پھیرے کہ نہ پھیرے مجھ کو

پاؤں کے رکھتے ہی اے خضر یہ معلوم نہ تھا
لوٹ لیں گے رہ اُلفت میں لٹیرے مجھ کو

نوحؔ دُنیا میں بُری چیز ہے فیضانِ سخن
میرے شاگرد نہ کیوں کر ہیں گھیرے مجھ کو

(بلبیر داس ساحر سیالکوٹی) جالندھر

دو غزلیں

کھنچ آئی روح تن سے تحریک جستجو کی
تو نے بھی کس کی اے دل دنیا میں آرزو کی

جب میرے جذب دل کو حسرت ہوئی نمو کی
پلکوں پہ تھرتھرا کر بوند آگئی لہو کی

پیرایہ تمنا بوسیدہ ہوچکا ہے
اے بخیہ گر خدارا زحمت نہ کر رفو کی

حسن، اور ناشناسی شیریں تکلم
صورت رہی نہ باقی اب ان سے گفتگو کی

چھایا ہوا ہے اب بھی میرے دماغ و دل پر
وہ پیرہن کہ جس میں دنیا ہے رنگ و بو کی

اب بھی نہ لائے گا رنگ افسانۂ غم دل
بوندیں چھلک پڑی ہیں آنکھوں سے کچھ لہو کی

گرداب ہے کہ کوئی نادیدہ چشم پرنم
افسانے بن رہی ہے ہر موج آب جو کی

ناقدریوں کا یارب کیسا یہ دور آیا
پانی سے بھی ہے ارزاں قیمت مرے لہو کی

راس آیا کب کسی کو کم ظرف کا تقرب
آنتیں نکال لی ہیں پیمانے نے سبو کی

کیا کچھ نہ ہوگا آگے، کیا کچھ نہیں ہوا ہے
اب خیر مانگو طرفہ تم اپنی آبرو کی

نالہ و آہ پر بجا آپ کی برہمی نہیں
نغمہ سرا ہو کس طرح دل ہے یہ بانسری نہیں

حد و قصور کے سوا شیخ کا مدعا ہے کیا
یہ تو ہوس ہے اے خدا یہ کوئی بندگی نہیں

دل کے زیاں کا ذکر کیا یہ تو ابھی ہے اور ہو
جان کی فکر کیجئے عشق ہے دل لگی نہیں

فطرتِ حسن و عشق میں، فرق وفا کا ہے فقط
حسن میں یہ کمی تو ہے، عشق میں یہ کمی نہیں

آپ پر اعتماد کر اور خدا کو یاد کر
اب نہیں کوئی راہبر، اب کوئی رہبری نہیں

عشق کے امتحان میں جان کی شرط ہے مگر
اپنا تو یہ خیال ہے شرط کوئی کڑی نہیں

حسن کی اب عنایتیں ہونے لگی ہیں بے حساب
مل گئی اس کی بھی سزا میں نے خطا جو کی نہیں

آن کی یہ خوبی دیکھئے، میں نے جو یاد وفا
کہنے کو تھے وہ "ہاں" مگر منہ سے نکل گئی "نہیں"

بات کریں کسی سے کیا بیٹھے ہیں بن کے سب خفا
اب تو بھرے جہان میں کوئی بھی آدمی نہیں

ساحر زار ہوشیار تجھ سے وہ بدگماں رہے
وقت ہی پر سنبھال لے بات ابھی بڑھی نہیں

مکتبۂ شعلۂ و شبنم دہلی کی خصوصی پیش کش

صاحب طرز کہنہ مشق نامور شاعر حضرت ضیاء فتح آبادی کا نیا مجموعہ کلام

گردِ راہ

دو آرار ملاحظہ فرمائیے

(۱) ضیاء صاحب کی شخصیت کمال کے احساس اور جدان میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ جذبہ کو موزونیت اور سلیقے سے الفاظ کے پیرہن میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کشتۂ روایت نہیں۔ ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی حنا بندی کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے۔ لطافت اور نزاکت ہے۔ اس لئے ان کے لہجہ میں دل آرائی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پرکاری اور ہشیاری سے زیادہ سادگی اور سرشاری ہے

(فگار) خواجہ احمد فاروقی

(۲) ضیاء صرف شاعر نہیں ہیں، وہ بریات بندی سے کہتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے اور خیالات لطیف ہیں دل میں جذبۂ ہمدردی انسانی بے پایاں ہے اور ایسا ہی شاعر ملک و قوم کے لئے باعث فخر ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا ——— ابر احسنی

قیمت ——— تین روپے پچاس نئے پیسے

گردِ راہ ۔ آج ہی طلب فرمائیے

مکتبۂ شعلۂ و شبنم ۔ دریبہ کلاں ۔ دہلی نمبر ۶

اُردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد "قرینے"

ابر احسنی گنوری کی غزلیات کا دوسرا دیوان

جس میں ۲۲۵ غزلیں، ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے۔ عام دیوانوں سے تین گنا میٹر ہے اور قیمت صرف تین روپے ۲۵ نئے پیسے ہے

غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے۔ یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا۔

(ملنے کا پتہ)

ابر احسنی ۔ گنور ۔ ضلع بدایوں (یو پی)

سیدہ نازک آصفی بشکوہ آبادی

افکارِ نو

جب بھی وہ نیکیوں کا والی ہوا جاتا ہے
عالم ہے کہ نیکیوں سے خالی ہوا جاتا ہے

کیا حسنِ زمانہ ہے کیا رنگ چمن ہمدم
صیاد جسے کہئے "مالی" ہوا جاتا ہے

جاہل ہے وہ جاہل عالم ہے وہ عالم
اونی بھی کہیں آخر عالی ہوا جاتا ہے

انسان بھی آیا ہے پودوں کی لچک لے کر
جھکنے پہ جب آتا ہے ڈالی ہوا جاتا ہے

موسیٰ کا عصا لاؤ ڈس لے جو گرانی کو
قاروں کا خزانہ بھی خالی ہوا جاتا ہے

اللہ ہی والی ہے دنیا میں غریبوں کا
منعم کا بھی تو کیسہ خالی ہوا جاتا ہے

سیلاب کی تیزی ہے، تیزاب کھنچے پر
چھلنی ہوا جاتا ہے جالی ہوا جاتا ہے

پھولوں کی جگہ کانٹے چن لے تو وہ ہے مالی
گل ہیں بھی کہیں آخر مالی ہوا جاتا ہے

تلقین و ہدایت سے بھر پائی مراد اے دل
کیا غم جو دماغ اپنا خالی ہوا جاتا ہے

کہتا ہو کوئی قابلِ نازک یہ کہیں ممکن
شبلی ہوا جاتا ہے، حالی ہوا جاتا ہے

نسیم احمد فہمی اوجھاروی

کیوں بنا دیتی نہ دنیا ایک افسانہ مجھے
آپ نے فرمایا جب ہنس کے دیوانہ مجھے

جام و مینا کی مجھے حاجت نہیں ساقی کوئی
تیری آنکھوں نے بنا رکھا ہے مستانہ مجھے

یہ چمن تیرا مبارک ہو تجھے اے باغباں
روز آوازیں دیا کرتا ہے ویرانہ مجھے

جان کرنی ہوگی نذرِ دوست بے چون و چرا
یہ ہدایت کر گیا ہے جل کے پروانہ مجھے

توبہ کرنے کے لئے چلتا تو ہوں میں شیخ جی
راہِ مسجد میں اگر مل جائے مے خانہ مجھے

اب مری دیوانگی یا الحکم مسلم ہوگئی
آج اس نے کہہ دیا ہے اپنا دیوانہ مجھے

یہ طاہر بادیوں کا مجھ کو اے فہمی صلا
آگئے وہ بھی سنانے میرا افسانہ مجھے

محمد علی شریف جوہر۔ کولاری

مجھ پہ کرم کریں وہ، یہ اب آسرا نہیں
اب میری زندگی میں کوئی بھی فرا نہیں

ہر گام پہ ہوئی ہیں مجھے ٹھوکریں نصیب
منزل کا خیر سے ابھی کوسوں پتا نہیں

دل میں نے بڑھ کے آپ کے قدموں پہ رکھ دیا
جانِ وفا! وفا کی مری انتہا نہیں

آنکھیں کھلی رہیں وہ پسِ مرگ بھی مدا
موقع تمہاری دید کا جن کو ملا نہیں

ساحل پہ اب سفینہ خدا ہی لگائے
دریائے غم میں کوئی مرا ناخدا نہیں

صدمے دیئے ملال دیا رنج و غم دیے
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں تجھے کیا دیا نہیں

تو نے مٹا دیا مرا سرمایۂ حیات
"پھر بھی ترے سلوک سے کوئی گلا نہیں"

معیارِ زندگی پہ ہماری نگاہ ہے
احساسِ کم تری میں نظر مبتلا نہیں

جوہر جو ہیں حقیقی ہے حق و صداقت سے آرا
ہر گام ان کے واسطے کیا کربلا نہیں

حکیم جہانیاتی حکیم پوینی

زمانہ بدگماں ہے اور میں ہوں
مخالف سب جہاں ہے اور میں ہوں
فلک پر کوندتی ہے برق پیہم
لرزتا آشیاں ہے اور میں ہوں
عجب ہے کشمکش کا یہ بھی عالم
نگاہ بدگماں ہے اور میں ہوں
خزاں کا خوف کیوں مجھ کو ستائے
بہار گلستاں ہے اور میں ہوں
وفا کا پاس ہے شکوہ کروں کیا
نگاہ دوستاں ہے اور میں ہوں
چھڑا ہے زندگی کا ساز ہمدم
حکیم خوش بیاں ہے اور میں ہوں

سلیمان ہیانی معمدی

کیا مخالف گردش ایام ہے
صبح اپنی ہے نہ اپنی شام ہے
جلوۂ زلف و رخ جاناں کو دیکھ
کفر کے آغوش میں اسلام ہے
تابع فرماں نفس کا بن گیا
آدمی ناواقف انجام ہے
ہنستے ہنستے راہ ہستی سے گزر
زندگی زندہ دلی کا نام ہے
منزل مقصود آئی زیر پا
یہ تجسس کا مرے انعام ہے
وہ لگائے گا پری وش کا پتا
ایک شاعر ہے سلیماں نام ہے

شمشاد علی گوہر کوٹوی

اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہوتی
کہ محبت میں کرامات نہیں ہوتی
وہ خیالوں میں تو دن رات ملا کرتے
ہاں مگر ان سے کبھی بات نہیں ہوتی
ان کے جلووں سے فروزاں ہے مری بزم خیال
دل کی دنیا میں کبھی رات نہیں ہوتی
ابر غم گھیر لیا کرتا ہے میرے دل کو
دیدۂ تر سے جو برسات نہیں ہوتی
بھیج دو موت کو آنا نہیں جب تم کو
ہجر میں اب بسر اوقات نہیں ہوتی
حوصلہ جس کا نظر میں نہیں آتا غم
زندگی اس کی پر آفات نہیں ہوتی
بند ہو جاتے ہیں لب سامنے ان کے
جب وہ ملتے ہیں تو کچھ بات نہیں ہوتی

جلال و جمال

آزاد شہباز نگری

نظر اس شوخ سے جس دم ملی ہے
ہمارے دل پہ اک بجلی گری ہے
جناب شیخ کتنی آگ پی ہے
جو حالت آپ کی بدلی ہوئی ہے
نظر اٹھتی ہے شام غم جدھر بھی
ادھر اک تیرگی چھائی ہوئی ہے
خدا جانے پڑی ہے کیسی افتاد
جو افسردہ چمن میں ہر کلی ہے
بچا کر مجھ سے کہتے ہیں وہ آزاد
کوئی تو آدمی میں آدمی ہے

فانوس کاظمی مالیگانوی

دور جب ہم سے کنارے ہو گئے
نذر غم ارمان سارے ہو گئے
جب اشارا ہو گیا تقدیر کا
خود بخود پیدا سہارے ہو گئے
اشک جو چھلکے مری آنکھوں سے وہ
مطلع غم کے ستارے ہو گئے
خوب ہے یہ سازش لیل و نہار
ہم نوا دشمن ہمارے ہو گئے
کیا بیاں فانوس ہو اس دل کا حال
سیکڑوں جس دل کے پارے ہو گئے

مقصود نشتری - اندور

اندازۂ نگاہ و نظر کر رہے ہیں
ہر تی تجلیات میں گھر کر رہے ہیں
پہلے تو چکے ہیں متاع دل حز
اب اپنی جان پیش نظر کر رہے
اک نامراد دل کی تمنا کے وا
قربان اپنے جان و جگر کر رہے
الٹا دے جنون محبت کی گرد
غم کے سمندروں میں سفر کر رہے
ہے میکدے کا کتنا بھیانک یہ ا
جام و سبو بغیر گزر کر رہے

مسز سید روشن جہاں

نئے سال کا تحفہ

موپاساں کا ایک شاہکار

جیکوس ریندل نے کہا تھا کہ اپنے خاندان کو ذلت و رسوائی سے خود بچائے گا۔ بیشتر خطوط میں نئے سال کی مبارکباد اور نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ اپنے دوستوں کو خط لکھتے وقت وہ اکثر انہیں گزشتہ سال کے واقعات پر خط کھنے کا مشورہ دیا کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ آئندہ سال کے دوران دونوں نے جو منصوبے وغیرہ کئے تھے ان کے متعلق پیشگوئیاں بھی کیا کرتا تھا۔

وہ میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے میز کی دراز سے ایک محبت کا خط نکالا۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد اس نے اسے بڑی محبت سے چند مرتبہ ہونٹوں سے لگایا اور پھر اس نے اس خط کو چوم کر میز پر رکھ دیا اور خط لکھنے لگا۔

"جان من! ایرینی۔ تمہیں میری وہ نشانی مل گئی ہوگی جو میں نے بھیجی تھی۔ میں تمہیں آج یہ خط یہ بتانے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ ۔۔۔

جیکوس نے اپنا قلم دفعتہ میز پر رکھ دیا اور کرسی پر سے اٹھ کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ ایرینی سے محبت تھی۔ یہ عورت عام عورتوں کی طرح نہ تھی۔ میں اور قحبہ خانوں و تھیٹروں کی شہ نشین تھی۔ وہ ایک باعزت تھی جسے اس نے اپنی محبت کا اہل سمجھا۔ وہ اب بے کار نوجوان نہ رہا تھا۔ بلکہ اب لوگوں کی اصلیت اور قدر و قیمت معلوم کرنے کا ڈھب آ گیا تھا۔ وہ ہیرا جسے وہ نہ سمجھا کرتا تھا اس سے اس قدر شدت سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی اسے کیوں بے حد پیار کرتی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ وہ کتنے عرصہ تک اپنی زندگی اس طرح سے بسر کر سکیں گے؟

یکایک وہ دھماکے پر بھی چونکی نہیں نہ ڈری۔ وہ دروازہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ نئے سال کی شام وہ کسی سے ملاقات کرنے سے انکار کرنے کا عادی تھا۔ اس لئے اس نے ایک دم نرم پڑ جانے اور باہر کا لیٹ روم میں آ گیا۔

اس نے چاہا کہ دھماکے کی زنجیر آہستہ سے کھولے تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کی محبوبہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا رنگ فق تھا اور وہ غم و پریشان اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لئے ہوئے کھڑی تھی۔

"خدا خیر کرے!" وہ بڑبڑایا "کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔!"

"کیا تم گھر میں اکیلے ہی ہو؟"

"ہاں۔!"

"کیا باہر تو نہیں جا رہے تھے!"

"نہیں۔!"

وہ اطمینان سے اندر آ گئی۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

ریندل اس کے قریب فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور کہا کہ اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے لگا۔ "ایرینی! جان من! آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی مجھے!"

سسکیوں سے روندے جانے کے ساتھ اس نے کہا "میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی!"

ریندل اس کے اس جملے کا کچھ بھی مطلب نہ سمجھا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے ایرینی! صاف صاف بتاؤ!"

"میرا مطلب یہ ہے ریندل! میں موجودہ صورت حالات سے بیزار ہو گئی ہوں۔ اور میں اب اپنے خاندان کے مفاد کو مزید عرصے کے لئے برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے بہت ہی ناواجب سلوک کرتا ہے۔ ابھی ابھی اس نے مجھے بہت بری طرح سے مارا۔"

"کس نے مارا؟ تمہارے خاوند نے۔۔۔"

"ہاں۔! ۔۔۔ آہ!"

اسے یہ کہنے کی امید نہ تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اس کا خاوند شریف اور بردبار انسان تھا۔ ایک کھلاڑی۔ خوش طبع اور بہادل عزیز۔ گو وہ ذہین نہ تھا ظاہر تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو نہایت ہی اچھا رکھا ہے۔ وہ اپنی بیوی پر فدا تھا اور اسے دل سے چاہتا تھا ریندل کو یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ اپنی بیوی سے اس قسم کا وحشیانہ سلوک بھی روا رکھ سکتا ہے۔ وہ ایرینی کی باتیں سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔

"مجھے مفصل طور پر بتاؤ ایرینی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہوئی؟"

اس نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا "اس نے آہستہ آہستہ میری طرف توجہ دینی کم کر دی۔ حتیٰ کہ اس کی کوئی بھی بات مننا چھوڑ دیا۔ وہ ہر شام باہر جاتا تھا۔ مگر اسے کبھی بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتا تھا۔ اس نے میرا کپڑوں کا الاؤنس بھی کم کر دیا اور اب وہ ریندل سے چڑنے لگا تھا۔ اس روز ریندل کا ذکر چھڑنے پر اس نے ایرینی کو بہت زدوکوب کیا۔

تفصیل بیان کرنے کے بعد ایرینی نے ریندل

کہا ۔ "میں اب اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گی تم جو مناسب سمجھو کرو ۔" اس نے یہ بات پورے غرور اور خشونت سے کہی تھی ۔

جیکب رینڈل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ اور اس کے ہاتھوں کو محبت سے اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولا :۔

"جان من! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یقین کر لو کہ تم کسی بڑی غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہی ہو۔ اگر تم اپنے خاوند سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہو تو پہلے اسے تصور دار طلاق کر دو۔ ایسا کرنے سے تم جہاں اپنی شہرت اور پوزیشن کو محفوظ کر سکو گی، وہاں اس سے آرام سے علیحدگی اختیار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ گی۔

"تب میرے لئے کیا کرنا بہتر ہوگا رینڈل۔"

"اس کے پاس واپس چلی جاؤ اور اس وقت تک اس کے ساتھ رہو جب تک جنگ میں فتح حاصل کرنے کی طرح تم اس سے طلاق حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤ۔"

"مگر کیا یہ طرز عمل بزدلانہ نہ ہوگا ۔ ؟"

"نہیں ۔ ہرگز نہیں، بلکہ یہ قدم قطعی دانشمندانہ ہوگا۔ تمہارے والدین اور دوست ہیں۔ شہرت اور پوزیشن رکھتی ہو، تمہیں ان سب باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ اگر تمہیں وقت گزارنا مشکل نظر آ رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے والدین اور دوستوں کی زندگیاں بھی تلخ بنا دو اور انہیں اپنے خلاف کر لو ۔"

"مگر میں موجودہ حالات میں گزارہ نہیں کر سکتی ۔ یقیناً نہیں ۔ رینڈل! میں کیا کروں ۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتی ۔" پھر ایرینی نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر اور میرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ۔ "کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو ۔ ؟"

"ہاں کیوں نہیں ۔" وہ بولا

"تب تم مجھے یہاں ہی رہنے دو، وہاں نہ بھیجو ۔!"

"تم کو یہاں ہی رہنے دوں ۔ اپنے ساتھ، تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو، اس طرح تم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاؤ گی!"

اس نے نرمی سے کہا ۔ "میں تمہیں ہمیشہ یا غیر معینہ عرصہ کے لئے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میں نے تمہیں خاوند کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ میں اب مزید شرمندگی اٹھانا نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ کسی کا دباؤ برداشت کرنا چاہتی ہوں، یا تو تم مجھے اپنے پاس رہنے دو یا پھر مجھے ..... "

"میں تمہیں اس وقت تک اس کے ساتھ رہنے کا مشورہ دوں گا جب تک تم طلاق حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤ ۔"

"اس میں تو کم از کم دو سال لگ جائیں گے کیا تمہاری محبت اس طویل عرصہ تک برداشت کر سکے گی، کیا تم بے چین نہ ہو جاؤ گے ۔!"

"اگر تم اس طرح میرے ساتھ رہنے لگو گی تو تمہارا خاوند تمہیں ڈائورس کر سکتا ہے ۔ یہ اس کا قانونی اور اخلاقی حق ہے ۔"

"یہ تو ضروری نہیں کہ تم مجھے یہاں ہی رکھو، تم مجھے کہیں اور لے جا سکتے ہو، میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور ایسا کرنے سے گریز نہ کرو گے، مگر میرا خیال غلط نکلا ۔ اب میں تمہیں الوداع کہوں گی ۔ اب میں تمہارے ساتھ نہ رہ سکوں گی ۔ !"

"ایرینی ۔!"

وہ دروازے کی طرف بڑھی اور وہ اس کی طرف جھپٹا اور اس کے آگے آ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"مجھے جانے دو ! ۔" ایرینی نے کہا۔

"ایرینی! چونکہ میں تم سے دلی محبت کرتا ہوں اس لئے میں نے تمہیں بہترین مشورہ دیا تھا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے برعکس عمل کرنے سے تم بری طرح پچھتاؤ گی ۔"

"وہ! ہاں ..... میں سمجھتی ہوں ۔"

"اگر تم میری نصیحت پر عمل کرنا نہیں چاہتی تو ٹھہرو ..... اچھا ..... کل آ جانا ۔"

اس نے کرخت انداز میں کہا "نہیں، شکریہ ۔ میں تمہاری طرف سے اب نا امید ہو گئی ہوں ۔"

"شہر دین ۔ میں نے تمہیں دیکھا جو ایک یا دو آدمی دے سکتا ہے اس سے زیادہ خلوص میں رکھتا ہے، اس لئے مجھے اندھا قیاس کر رہی ہے، آؤ ہم اپنے آئندہ لائحہ عمل فیصلہ کریں ۔"

وہ پھر بیٹھ گئی، اس نے گہری فکر انداز میں پوچھا ۔ "تم نے اتنی جلدی اپنا تبدیل کر لیا ۔ ؟"

"میں نے جلدی میں اپنا خیال تبد میں نے تمہیں خطرناک قدم اٹھانے سے باز تحقیق کی ہے اور چونکہ تم بضد ہو، آنے والے خطرے میں حصہ دار بننے کا کیوں کہ میرے خیال میں جو آدمی ایک عورت ہے، وہ ایک نازک ذمہ داری اپنے کندھ خاص طور پر اگر عورت شادی شدہ ہو خاوند سے ناخوشگوار ہو ۔ ایسی صورت اندیشے اہم بن جاتی ہے ۔ کیوں کہ عورت اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے، یہ جانتے اسے کن تکالیف اور مصائب کا سامنا ہو ..... مجھے تم سے مزید کچھ نہیں کہنا ۔ ایک سچے دوست اور ساتھی کی طرح متعلق آگاہ کر دیا ہے ..... اب میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ "آخر تمہارا میں تمہاری خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ

پرجوش محبت کے زیر اثر اس نے اپنی آہستگی سے یہ کہتے ہوئے اس کا منہ بند "یہ بات سچائی پر مبنی نہ تھی ..... میرے خاوند کو تو مطلق کوئی شک و شبہ یہ جاننا چاہتی تھی ..... تمہارا استعفا نئے سال کا تحفہ حاصل کرنا ..... میرا آپ نے ابھی بھیجی تھی، اصل آپ کے دل

"مجھے پیار کی نشانی کے طور پر دیا گیا ہے، شکریہ ! اوہ خدا۔ آج میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں ۔!

کہانی شروع ہوتی ہے۔ چند گھنٹے

ملاوٹ کرنے والے کا نشٹ ہو

چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے جو خیالات دماغ میں ہوتے ہیں وہ طرح طرح چہرے پر چھپا ہوتے ہیں۔ ان کے تاثرات چہرہ پر ضرور نمایاں ہوتے ہیں چاہے کوئی ماہر نفسیات ہی کیوں نہ ہو اور چاہے چہرے پر کسی بھی مصنوعی خوشی یا بشاشت لانے کی کوشش کرے۔ مگر وہ درحقیقت بظاہر ہے تو خوش دلم تاثرات چہرہ پر ضرور نمایاں ہوں گے اور ہزار چھپانے سے نہ چھپیں گے خوشی کے تاثرات کا چہرے سے مظاہرہ تو قدرتاً کیا جا سکتا ہے لیکن پاس دفعہ چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں پہچاننے والے کی نگاہ قلوب کی آئینہ دار ہوتی ہے اندازہ لگا لیتی ہے اور کبھی کبھار ہے اور یہ کہتی کہ چہرے سے یہ سب کچھ عیاں تھا جو کہ ان کے دل و دماغ میں تھا۔

یہ لوگ بھی کتنے خود غرض ہیں۔ اس نے اپنے سے کہا اور اپنی چارپائی پر لیٹ رہا۔ روداد آج بھی بہت تھکان تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔ لیکن نیند نہ آتی تھی کیونکہ دماغ تھا۔ اس نے تپائی پر پڑی چٹھی کو اٹھایا اور پڑھنے میں محو ہو گیا۔ وہ بار بار جھنجلا اٹھتا۔ ایک ایک اس پر عجیب قسم کے تاثرات چھوڑ رہا تھا۔ اس نے سر کو کھجانا شروع کیا اور چٹھی کو پھر دور پھینک دیا۔ دوسرے لمحے اٹھا کر پھر چارپائی پر آ گرا۔

یہ چٹھی ناشر کی تھی جو کہ اس کی پریشانیوں کا سب سے بڑا سبب تھی۔ ناشر نے اس کا ناول چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اب اس کے ناول اس انداز سے نہ چھپ سکیں گے جو پہلے تھا کیونکہ ان لوگوں کو آخر صرف منافع خوری سے واسطہ ہوتا ہے کسی کے ساتھ ہمدردی کیا ہوتی۔ پھر خود ہی خیال بدل دیا۔ ہاں! بھلا وہ کسی کی فضاست کو کیا سمجھیں اور اس کی ذہانت کو کیا جانیں۔ انہیں تو ایسا مال چاہئے جو ہاتھ ہاتھ بکے۔ جلد بک بک کم ہو اور منافع زیادہ ہو۔۔۔!

وہ دنیا کی اس بے رخی سے از حد نالاں تھا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ اس کا کوئی حل بھی ہے کہ سوچ جائے۔ نہ تو اس کے پاس اتنی دولت ہی تھی کہ وہ خود اپنے ناول چھپوا سکتا۔ یا ان کی مناسب تشہیر کے لئے کوئی مناسب کارروائی ہی کر سکتا۔ نہ اتنا قیافیت ہی تھی کہ جس کے بل بوتے پر کامیاب ہو جانے کی امید ہو۔ تجارتی لوگوں پر سفارش بھی تو نہیں چلتی۔ تو پھر کیا ہو؟ اسی ادھیڑ بن میں اس نے پھر کروٹ بدلی۔ اس کا خیال سمندر کی لہروں کی طرح بدلنے لگا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سویرا ہو گیا تھا۔ ساری رات وہ سو نہ سکا تھا۔ پھر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کیا اسے کوئی اور کام نہ سوجھتا تھا کہ یوں بے کام لے بیٹھا۔ اچھا پڑھا لکھا تھا۔ سمجھ دار تھا۔ جوان تھا۔ بھلی چنگی نوکری کی تھی۔ عزت تھی۔ تنخواہ کم تھی لیکن گزر بسر تو ہو ہی رہی تھی۔ لیکن نہ جانے یہ شوق کو کون سی لعنت کی طرح میرے سر پر سوار ہوا۔ نوکری چھوڑ کر اس پیشہ میں قسمت آزمائی کرنے چلا آیا۔ کیا یہاں چوٹی کی حسینہ تھیں؟ سوائے دماغ سوزی کے یہاں کیا رکھا تھا کہ کون سی ایسی آمدنی ہو رہی تھی یا کر رہے تھے۔ سارا سارا دن دماغ کھپاؤ۔ ساری ساری رات جاگتے رہو تو دن کو آرام۔ نہ رات کو چین۔ نہ کھانا اچھا نہ گھومنا اور پھر اگر ایک ناول تیار ہو بھی گیا تو کتنے اترانے! دل مسرت تو تھی کہ ایک اچھے ناول کا خالق ہو گیا۔ لیکن اب چھپے کیسے؟ ناشر چھاپے بھی تو! پھر کھٹنے کا فائدہ؟

نہیں تو دق کا لے کرنے سے کیا حاصل؟ کیا اسی اطمینان پر کہ ایک اچھا ناول تیار ہو گیا؟ ایک مہم سر ہو گئی۔ ہو گئی اور ایسے مرحلے ہیں جن سے ابھی گزرنا ہے کامیابی کی شاہراہ کتنی دکھی ہوئی پُرخار راہوں سے بہت دور ہے۔ یہ شاہراہ کب نصیب ہو سکتی ہے اور کیسے؟ کہاں وہ راستے جس کے لئے وہ سرگرداں ہے لیکن کون جان سکتا ہے کہ دوسرے گلی میں کیا ہے؟ اور اگر اسے گلی تو کب؟ یا وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جانا ہو گا۔ دیکھیں تقدیر کیا رنگ دکھاتی ہے

اس نے پھر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ دن کافی چڑھ گیا تھا۔ لیکن اُسے کوئی کام نہ تھا۔ اٹھنے کو نہ طبیعت ہی کرتی تھی اور نہ ہی وہ کہیں آنا جانا چاہتا تھا۔ سورج کی کرنیں سنہری تاروں کی طرح روشن دان سے ہو کر دیوار پر پڑ رہی تھیں۔ لیکن وہ روشنی کی کرنوں کے تصور میں کھو گیا تھا۔ دالان میں پنچھے چہک رہے تھے لیکن اس کے خیالوں کی بیداری کو ان کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ صحن کے پھولوں پر شبنم کے موتی اپنی حیات فنا پر روتے معلوم دے رہے تھے۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور پھر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔

"کیسے پڑے ہو بھائی، یوں جان پڑتا ہے کہ سویرے ہی سویرے کسی منحوس کا منہ دیکھ لیا ہے؟" وہ جو نہی اندر آتے ہوئے دوست کے الفاظ سنے گا۔ لیکن اس کے چہرے سے واقعی خوشی برس رہی تھی۔

آنکھیں سرخ تھیں اور بال مکڑے کی طرح کھردرے۔ بہت اداس اور تھکے تھکے سے تھے۔

"نہیں یار!" اس نے گھوری کھری آواز میں جواب دیا۔ جیسے بہت دیر کے کوئی اور لفظ نہ سوجھا ہو۔

"تو پھر؟" مات کو سمجھ نہیں ہو گیا؟" موہن نے پھر پوچھا۔

"ہاں بھائی، رات کو نیند کچھ کم ہی آئی" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کرتے رہے؟"

"بس یوں ہی۔ میں فیصلہ نہیں کر پائی"

"کس سودے میں پڑے ہو؟" موہن نے تعجب سے ادھر اُدھر دیکھا کہ کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔ کمرے کو بھاری بھی کی دن ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دیواروں پر میلے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ اس نے کچھ جواب نہ پا کر پھر سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں سے منحوس کا منہ دیکھا ہے۔ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے؟"

"یہاں تو کوئی آیا نہیں اور یہاں آتا بھی کون ہے سوائے تمہارے" اس نے جواب دیا۔

"گویا میں وہی منحوس ہوں، صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟" موہن نے طنزاً کہا اور اس کے چہرے پر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ندامت سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں تو ایسی گستاخی نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے منہ سے ہر فرض لے کیں۔" اس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

"تو پھر سیدھے منہ بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"سیدھے منہ تو بول رہا ہوں اور کیسے بولوں؟"

"اپنے بچانے کا تو خیال رکھا کرو"

"نہیں قبلہ! میں ایسا کیوں کرنے لگا۔ ایک آپ ہی تو میرے غم خوار دوست ہیں۔ آپ سے بھی نہ کہوں تو آپ سے تو میں دل کی باتیں کروں گا۔ بھلا اور ہے ہی کون جس کو میں اپنا غم سنا دوں؟" اس نے نہایت افسردگی سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تلخی اور آنکھوں میں نفرت تھی۔

"اچھا تو کہو اپنے ناولوں کے بارے میں، کچھ کچھ بھی اور ہاں آپ کے اُن نئے ناولوں کا کیا رہا، چھپ گئے کیا؟"

اس مختصر سی بات نے اسے پھر تذبذب میں ڈال دیا وہ پھر اُس سوچ میں مستغرق ہو گیا کہ کیا جواب دے۔ لیکن تبھی اُس نے دیکھا کہ موہن سب کچھ تاڑ گیا ہے، اس سے صاف صاف بتانے میں ہی بہتری ہے، اُس نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"نہیں بھائی، وہ ابھی کچھ نہیں"

"کیوں؟"

"ناشر کمبخت مانتا ہی نہیں، چھاپنے سے صاف انکار کر دیا ہے"

"آخر کیوں۔ کیا ناول اُسے پسند نہیں آیا کوئی اور وجہ ہے؟"

"ہاں تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ پہلے تو کہا فحش کے قابل سمجھتے ہو نہ گی نہیں چھاپتا۔ صاف انکار کر دیا بھائی ان لوگوں کو ناولوں کے اوصاف سے سروکار نہیں جتنی ان کے دل میں کسی اور بات کی اہمیت ہوتی ہے"

"آخر کوئی اور ترکیب سوچی ہوتی؟"

"بس یہی سوچ رہا تھا"

موہن کی نظریں بکھرے ہوئے اوراق پر پڑیں جو ایک نئے ناول کے ابتدائی صفحات تھے جن میں کئی جگہ قطع برید کی گئی تھی۔ کئی سطور حاشیہ میں، کئی ٹیڑھی، کئی سیدھی لکھی ہوئی تھیں۔ اس نے اُن کاغذوں کو اکٹھا کیا اور دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اور شعر پھر خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ وہ اس میدان میں نیا نہ تھا۔ کئی ناول لکھ چکا تھا طرز بیان بھی بُرا نہ تھا۔ قلم میں زور تھا۔ جدت میں روانی تھی۔ خیالات میں تسلسل تھا۔ جذبات نئے تھے۔ نظریات میں پختگی تھی۔ علم و اخلاقیات سے بہرہ کھائے تھے۔ نئے نئے کتابیں اور نئے سے ناولوں کو مرصع کیا تھا۔ لطیف مزاح کی تھیں۔ بڑے بڑے اساتذہ نے حوصلہ تعریف کی تھی بزرگ اور بڑوں نے اُن سے روشن رکھنے کی اُمید بھی باندھی تھی۔ بزرگ دین کا ہر قرار دیا تھا۔ لوگوں نے اسے سے نوازا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے ناولوں نہ بکتی تھیں کی اُسے اُمید تھی یا جس کا کہ ہاں البتہ شہر کے چند شرفاء دین میں کا مولانا عبدالقادر یا دیوار اسکول کے عہد شامل تھے نے صرف حوصلہ افزائی ہی نہ تعریف بھی کی تھی۔ بعض نے تو تعریف کے پُل تھے لیکن خاص شاباشیوں سے تو کوئی نہ اور نہ اقتصادی حالت ہی صدر تھی۔ تسلی کچھ ضرور ہو گئی تھی۔ ان تعریف سے فائدہ اٹھایا، ہاں ایک مصیبت البتہ تھی۔ کہ یہ بڑے آدمی جب گھر پر تشریف آؤ بھگت کیسے ہو۔ اور پھر ان کی تواضع تو تھی یہاں تو ان کو اٹھانے بٹھانے کا بھی اس تجارتی زمانہ میں نہ جانے کون کون سی مدرسہ میں داخل ہو گئی تھیں اور ہر روز اشیاء کا گھر میں جن ضروری سمجھا جانے آج تو وہ پرنسپل عبدالقادر کے خط سے نے خود اُس کے مکان پر آنے کے لئے لکھا تھا اُس کا دل گھبرا رہا تھا کہ کہیں وہ آ گئے تو ہو گا۔ وہ سوچنے لگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کی آمد ملتوی ہو جائے۔ یا وہ اپنا دورہ منسو یکایک اُسے ایک تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ پرنسپل کے دھکے ہی جا کر مل آؤں۔ ایک تو اُن سے گی۔ دوسرے اُنھوں نے اگر پوچھ لیا تو اپنی

پڑھ کر دیکھو؟ اچھا لگے تو پڑھنا۔ نہ اچھا لگے تو نہ پڑھنا بھائی۔ اس میں کیا مجبوری ہے؟ اگر یہ لوگ میرا ایک ناول بھی خرید لیں تو نہ جانے کتنے ناول ایک ہی دن میں بک جائیں۔ پھر ناشر کی کیا مجال کہ میرے ناول چھاپنے سے انکار کرے؟

کیا میں ان کو خود نہیں سمجھا سکتا؟ گھر میں پڑا پڑا کیا کرتا ہوں؟ کیوں نہ یہاں آکر کھڑا ہو جایا کروں اور گاہکوں کو سمجھاتا رہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیا کبھی ایسا ہوا بھی ہے؟" خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوکر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ نوکر گلی کا موڑ مڑ کر دوسری گلی میں ہو لیا تھا۔ وہ بھی ادھر ہی کو مڑ گیا۔ پھر خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس دفعہ خودداری غالب تھی۔ وہ تاثرات کچھ اور طرح کے تھے۔

"نہیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ بھلا میں کیوں ان کی خوشامد کروں؟ میرے فن میں اگر کشش ہو گی تو خود ہی ہزاروں لوگ کھنچے چلے آئیں گے سیکڑوں قدر دان پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن یہ منظر عام پر آئیں کیسے یہ ناشر کم بخت چھاپے تو۔ میں ایک تو ان کو دودھ پلاؤں، اور وہ بھی زبردستی۔ بچوں کو تو خیر زبردستی بھی دودھ پلایا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ بے سمجھ ہوتے ہیں لیکن ناول پڑھنے والا کبھی بے سمجھ نہیں ہو سکتا۔ میرے ناول کیا اتنے گئے گزرے ہیں؟ کیا ان کا معیار اتنا پست ہے؟ پھر میں ان کی منتیں کیوں کروں؟ کسی کو اگر اچھا لگے تو پڑھے۔ کوئی نہ پڑھے تو بھی ٹھیک۔ پھر یہ کوئی دستور بھی تو نہیں کہ ناول نگار، ناول پڑھنے والوں کے پیچھے پیچھے دوڑے اور نہ ہی میں نے کسی ناول نگار کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ میں پھر کیوں ایسا کرنے لگوں؟"

"مکان آ گیا بابو۔" نوکر کی آواز نے یکایک اسے چونکا دیا۔

"دیکھو تو لالہ جی گھر پر ہیں یا نہیں۔" اس نے نوکر سے کہا

"ہاں گھر پر ہیں۔" نوکر نے باہر آ کر کہا۔

"واہ واہ! کتنی خوش قسمتی ہے کہ لالہ جی گھر پر ہیں واقعی ضلالت رحیم دکھا رہے ہے۔ اگر نوکر یہاں دکان پر نہ مل جاتا تو میں کس کس سے لالہ جی کے مکان کا پتہ پوچھتا پھرتا۔ اور اگر دو چار گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں گھر مل بھی جاتا تو تب تک شاید لالہ جی سو بھی چکے ہوتے اور واپس لوٹنا پڑتا۔ خواہ مخواہ اپنا وقت بھی ضائع کرتا اور کام بھی نہ بنتا۔" وہ سوچنے لگا۔

"اجاؤ نا بابو اندر۔ لالہ جی نے یاد فرمایا ہے۔" نوکر نے پھر باہر آ کر کہا۔

وہ گم سم کھڑا تھا۔ نوکر کی آواز سن کر یک لخت اندر داخل ہوا۔ لالہ جی ایک پلنگ پر آرام فرما رہے تھے۔ قمقمے نور کی بارش کر رہے تھے۔ کمرہ ہر طرح کی آرام دہ بیش قیمت چیزوں سے آراستہ تھا۔ ایک سفید مسک کی قمیص اور باریک دھوتی لالہ جی کے بدن پر تھی۔ ناک موٹی تھی، رنگ کالا تھا۔ چیچک کے داغ سارے چہرے پر نمایاں تھے۔ جسم اس قدر موٹا تھا کہ ہلنے سے بھی نہ رہتا تھا۔

"آیئے شرما جی۔ تشریف رکھئے۔" لالہ جی نے کرسٹ پیلتے ہوئے کہا۔ اور اسے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ایک نوجوان سا لیکچرر کے پاس گھسیٹتے ہوئے اور اس کا سہارا لیتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے وہ اس کے آنے کے مقصد کے ساتھ ساتھ، اس کے دل کی کیفیت اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا بھانپ گئے تھے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ لالہ جی نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی بات یہ ہے کہ آپ نے جو ناول لکھے ہیں وہ میں نے خود پڑھے ہیں۔ میرے سے اگر کوئی پوچھے کہ ناول کیسے ہیں، تو میں تو یہی کہوں گا کہ فن کا بہترین نمونہ ہیں؟ لیکن بھئی مجھے فن سے کوئی خاص فرض و غایت نہیں۔ مجھے تو ایسے ناول چاہئیں جو چھپیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جائیں چاہے ان میں فنی لغزشات بھرے پڑے ہوں۔ آپ کے ناول جیسا کہ میں نے پہلے کہا، بہت اچھے ہیں لیکن پھر بھی ان میں وہ سب کچھ نہیں جو مجھے درکار ہے آپ کے ناول بکتے ہیں، دو چار بک گئے تو بک گئے اور بھی...

..... آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے ناول کا سرورق کس قدر رنگین اور دلکش بنوایا ہے۔ لیکن

..... مجھے آپ کے فن کے ساتھ صرف اتنی ہی دلچسپی نہیں بلکہ آپ کے ساتھ ہمدردی بھی ہے لیکن بھائی میں بھی تو اپنا کام دھندا دیکھتا ہوتا ہے اگر ہم لوگوں کے ساتھ ہمدردی جتانے لگیں تو کاروبار چل لیا اب آپ ہی بتائیں کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے لالہ جی کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی اور ترکیب ہی بتا دیں۔ اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کر کے جو تیار کیا تھا۔ وہ سب خیالات ان دا ہمدردی منتشر ہو گئے اس کو کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا وہ لالہ جی کی طرف بے بسی سے تکنے لگا۔ جو سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دینے کے بعد پڑے ہانپ رہے تھے۔ لالہ جی کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لالہ جی اب کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن وہ پھر بھی پُر امید نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ معذور نظر آئے، کوئی تجارتی نکتہ ہوتا تو وہ روشنی بھی ڈالتے۔ اگرچہ ان کو ادبی معاملات میں خاصی دلچسپی تھی، لیکن ان میں اتنی قابلیت اس قدر نہ تھی کہ کوئی راستہ بتا سکتے یا وہ ناولوں کے عیوب پر روشنی ڈال سکتے اور اس کی درستی فرماتے۔

وہ اٹھا اور اجازت مانگ کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ اس کا جی ڈوب گیا تھا۔ سب لوگ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ لیکن وہ ایسے بے آرامی کا شکار تھا۔ اس کا دل مجروح ہو گیا تھا اور وہ داغ مفقود۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے پیروں کی چاپ خود اس کو چونکا دیتی تھی۔ خیالات کی ایک لہر نے اس کو پھر ایک نئی الجھن میں گرفتار کر لیا۔ وہ پھر سوچنے لگا۔

...ں کا منیجر کبھی بات کرنے کی ہمت نہیں پا سکتا تھا منیجر
...ں سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ ——" اس نے سامنے رکھی ہوئی
...ں کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ——!"

کسی وقت اس کی ڈھارس بندھی۔ منیجر صاحب
...ے کرسی آفر کر رہے تھے۔ شاید وہ لڑکی بھنہ نکلا
...ہے۔ منیجر نے انگریزی میں کہا "تشریف رکھئے"

وہ انتہائی قہر کی ذہنی اذیت کے درمیان میز
...ے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی بولا
"میں اپنی اس حماقت اور غلطی کی معافی چاہتا ہوں جناب
...ئندہ ایسی جرأت میں نہ کروں گا سر"

اس نے باری باری منیجر، مالک اور پھر اپنے دوست
...رحمت کی طرف دیکھا ——— رحمت ——— جو کہ منیجر اور مالک
...دونوں کا منہ تک رہا تھا۔ اُسے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں
...سے دیکھ رہا تھا۔

"تم پرلے درجہ کے بیوقوف ہو۔" منیجر نے کہا
..."یہ لڑکی تمہارے لئے کب تھی۔"

"جی ——!" وہ سہم گیا ——— "میں دوبارہ کہتا ہوں
...ہے ——"

"ہم تمہیں اسی وقت سے چھٹی دے رہے ہیں"
...مالک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم آج
...سے کوئی تنخواہ نہیں کرو گے"

"سر ——!" وہ بہت زیادہ گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا
...اسے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین سرکتی ہوئی معلوم ہو
...رہی تھی۔ وہ گڑگڑانے لگا ——— "رحم کیجئے سر ———
...دوبارہ ———"

"تمہیں آج کی تاریخ سے چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ
...ملا کرے گی ——" منیجر نے کہا۔

"جی ——!"

وہ گڑبڑا کر کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رہ گیا بلکہ گر پڑا

"تم نے یہ ڈیزائن آتا خوبصورت بنایا ہے ——
...تم جب اسے بنا رہے تھے تو تمہیں کمپنی کرنے کی
...کیا ضرورت تھی۔ مفت میں تم نے چھ مہینے تک اپنا اور
...دونوں کا نقصان کیا۔"

"جی ——!"

"کیا جی جی تم نے لگا رکھی ہے ——" رحمت نے
...اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا ——— "تم اب اس مل کے
...ڈیزائنر چیف ہو سیٹھ گوں نے اب سے تمہیں پچیس سو روپے
...ڈیزائن بنانے کا کام سونپ دیا ہے ——— سمجھے"

رحمت مسکرایا ———

"اب سے تمہیں چھ سو روپیہ مہینے کا پگھارے گا"

"ہم تمہیں چھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ دیں گے"
...منیجر نے کہا۔ "تم اپنے اس مل کے لئے اچھے اچھے اور
...نادر ڈیزائن بناؤ۔ تمہاری تنخواہ ہم اسی طرح بڑھاتے
...رہیں گے۔ چھ مہینے بعد ہم تمہیں ایک ہزار روپیہ ماہوار
...دیں گے۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے تمہاری تنخواہ چھ ہزار
...روپیہ مہینہ بھی ہو سکتی ہے"

"بالکل ہو سکتی ہے ——" مل مالک نے کہا "یہ
...تو تمہارے ڈیزائنوں کی مقبولیت پر منحصر ہے"

حبیب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب خواب
...دیکھ رہا ہے۔ اس پر سکتہ کا سا عالم طاری تھا، وہ
...بے اختیار پکار اٹھا

"آپ کا بہت بہت شکریہ صاحب"

"تم نے یہ آرٹ کہاں سے سیکھا ——؟" منیجر
...نے پوچھا۔

"کہیں سے بھی نہیں صاحب ——" اس نے
...جواب دیا۔ "میرے پاس اس کا کوئی باقاعدہ سرٹیفکیٹ
...نہیں ہے۔ یہ تو میرا اپنا شوق ہے۔ بچپن سے مجھے اس کا
...شوق تھا۔ میں ہمیشہ اسی قسم کے ڈیزائن اپنے دماغ
...سے بناتا رہتا ہوں"

"ویری گڈ ——" مالک نے مسکرا کر کہا "تم
...کل سارے ڈیزائن کے ڈھیر لگا دو۔ ہم تمہیں بنانے بنانے کا
...کام دیں گے۔ ہم تمہیں بنانے کا کام دیں گے"

اور پھر حبیب کو کچھ اس طرح کا ڈیزائنر چیف
...گیا۔ اس کے بنائے ہوئے ڈیزائن بہت زیادہ مقبول
...ہوئے کہ اس مل کے کپڑوں کی دھوم مچ گئی۔ اب حبیب
...اس مل سے ڈیڑھ سو اور پھر اس کی جگہ چھ ہزار روپے
...مہینہ تنخواہ لے رہا تھا ———

اس نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کو دل کھول
...کر اچھی سے اچھی تعلیم دلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے
...سب بھائی بہن اب اچھی سے اچھی تعلیم حاصل کر رہے تھے
...اور اب وہ ہر لحاظ سے بڑا ہو جانے لگا تھا۔ اس کے
...وہ سارے اقربا اور دوست جو کہ اس سے دور دور
...رہتے تھے جو کہ کبھی اسے اور اس کے خاندان کو پوچھتے
...تک نہیں تھے، اب اس کے اور اس کے خاندان کے
...متوالے بن گئے تھے۔

تین سال بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور پھر
...اس کا باپ بھی مر گیا ——— لیکن مرتے وقت اس کے ماں
...باپ دونوں کو یہ اطمینان اور سکون تھا کہ اس کا بیٹا
...لائق اور ہونہار شریف بیٹا ان کی معصوم بچیوں
...اور ان کے بیٹوں کو باپ اور ماں دونوں کا پیار دیگا
...اور ان کی زندگیوں کو ایک صحیح مقام پر پہنچا دیگا
...کبھی کوتاہی نہ برتے گا اور وہ اسی اطمینان اور پھر
...پرسکون کی موت مر سکے تھے۔

حبیب اپنے ماں باپ کی شفقت اور ان کی محبت
...سے محروم ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دنیا کے ہر شخص
...پیار سے محروم ہوتے ہوئے بھی اپنی بہنوں اور اپنے
...چھوٹے بھائی کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا
...کہ وہ بھی ماں باپ کے [illegible]
...شفقت سے محروم ہو چکے ہیں۔ [illegible]
...ماں باپ دونوں کی طرح [illegible]

یہ ناولیں میں کیا عیب ہیں؟ پھر یہ مقبول کیوں نہیں ہوتے؟ کیا کسی ترمیم کے محتاج ہیں؟ پبلشر نے بھی کچھ ترمیم تجویز نہیں کی؟ یہ ناول اس کی سب سٹاک بک ہیں۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا کسی بہانے سے ضائع کر دیا جائے؟ نہیں، نہیں!! ان کا کیا ضائع کرنا ہے۔ ان کے ناول بکتے تو نظروں سے گرتے ہی ہیں۔ کوئی خاص بات تو نظر نہیں آتی ان میں۔ ویسے ناولوں میں نہ ہو۔ اور پھر ایک بات جو کہ مجھے پسند نہیں وہ البتہ ان میں ہے۔ کیا یہی ان کی کامیابی کا راز ہے؟ میرے سے گر کر کوئی کامیاب ہو جائے تو بے شک ہو جائے۔ لیکن مجھ سے یہ سب کچھ نہ ہوگا۔ میرے سے گر کر کچھ نہ۔ اتفاق سے گر جانا۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ادب میں آ جائیں تو ادب، ادب کہلانے کے قابل نہیں رہتا۔ حسن کی تعریف کون نہیں کرتا؟ اس میں انکار کون نہیں کرتا۔ لیکن حسن کو برہنہ کرنا کہاں کا اخلاق ہے۔ یہ بے تکی باتیں، یہ فحش واہیات گلے بازیاں۔ یہ نیچ پن۔ ہائے توبہ! اللہ توبہ ــــ

گھر آ گیا اور وہ چڑھا۔ صبح اس وقت اس کی نیند کھلی جب دودھ والے نے گھنٹی بجا بجا کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

"کیا دودھ نہیں لو گے بابو جی؟" دودھ فروش نے دروازہ کھلتے ہی سوال کیا۔

"لیں گے کیوں نہیں بھائی۔ دیکھتے نہیں ابھی اٹھا ہوں۔ آنکھیں تو ملنے دو۔ ذرا تھوڑی دیر کو۔ بن ذرا لیٹا مانجھ لوں۔ کم بخت اور کوئی برتن بھی تو نہیں کہ جس میں دودھ ڈالا جا سکے۔"

شرابی نے نیم خوابی حالت میں کہا اور غسل خانہ کی طرف چلے گئے۔ دودھ فروش ایک اسٹول پر بیٹھ گیا جو جوتا پالش کے سرہانے رکھا تھا۔ اس کی نظر سرہانے کے نیچے رکھی ہوئی کتاب پر پڑی جس کا ایک گوشہ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس نے وہ کتاب جھٹ سے اٹھا لی اور غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کتاب اس کی جانی پہچانی لگتی تھی۔

شرابی واپس لوٹے تو دودھ فروش نے کہا۔

"بابو جی۔ کیا یہ ناول آپ نے پڑھا ہے؟"

"ابے پڑھا کیا ہے۔ لکھا ہے؟" شرابی گردن کو اکڑاتے ہوئے بولے۔

"میں نے بھی یہ ناول پڑھا ہے۔ دو تین دن ہوئے لالہ سیتا رام، رادھے شام ناشران کی دکان سے لے گیا تھا۔ مجھے تو بہت پسند آیا یہ ناول۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے لکھنے والے آپ ہیں۔"

"کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا، پانچ سال ہو گئے مجھے دودھ دیتے ہوئے؟"

"ہمارے پاس اتنی فرصت ہی کب ہوتی ہے؟ بابو جی! دودھ دیا اور پیسے لیے۔"

"تم یہ ناول کس وقت پڑھتے ہو؟"

"تھوڑے دن ہوئے مجھے شوق ہوا ناولوں کے پڑھنے کا۔ چکا پڑھ گیا۔ رات کو جب سب لوگ سوتے ہیں میں پڑھتا ہوں۔"

"اچھا ــ!"

"اب کی دفعہ جو یہ ناول لے گیا اور پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں تو بڑی اونچی اونچی باتیں ہیں۔ جو دوسرے ناولوں میں نہ تھیں۔ یہ ناول تو بڑے آدمیوں کے پڑھنے لائق تھا۔ ایک بات کہوں بابو جی۔"

"کہو بھائی بڑے شوق سے کہو۔"

"آپ کے ناول ہیں تو بہت اچھے لیکن ....."

"لیکن کیا؟" شرابی نے انتہائی بے صبری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بابو جی، آج کل ملاوٹ کا زمانہ ہے کھرا مال کوئی نہیں لیتا۔ اگر لیتا ہے تو سو نقص کے نخرے کرکے۔ اگر آپ بھی کچھ ملاوٹ کر دیں تو آپ کے ناول ایسے بکیں جیسے کہ میرا دودھ۔"

"نہیں، نہیں، یہاں ملاوٹ ولاوٹ کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ادب ہے اس میں کچھ ملاوٹ نہ ہونے دوں گا۔ سب کیا کہی ہے، نہیں نہیں!! ہرگز نہیں!"

شرابی جھنجلا اٹھے اور مڑ کر دیکھا تو غسل خانہ خالی تھا۔ دودھ فروش اٹھ کر باہر اپنی سائیکل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ پلک کر باہر آیا۔

"خفا نہ ہوئیے بابو جی۔ آپ مانیں چاہے نہ مانیں لیکن ہے یہ پتے کی بات۔" دودھ فروش نے مڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک بات اور ہے وہ ضرور بکے گا۔" دودھ فروش نے سائیکل کو آگے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے جھلا کر پوچھا۔

دودھ فروش نے کچھ جواب دیا۔ لیکن اس کے الفاظ فضا میں گم ہو گئے۔ وہ دروازے پر کھڑے کھڑے سنتا رہا۔ دودھ والا جا چکا تھا۔

قدر شناسی کی سرخی غمازِ ہوئی چونکہ امید کی کرن نے اس کے چہرے کو منور کر دیا تھا۔ اس نے پھر سائیکل پر نگاہ ڈالی جس کے ساتھ ایک ٹوکری ٹنگ رہی تھی اور جس پر لکھا تھا۔

"ملاوٹ کرنے والے کا منہ کالا"

اس نے اپنی زیر تکمیل ناول کا نام یہی رکھ لیا۔

حضرت خود غوث پوری کا پہلا مجموعہ کلام

رنگ و بو

بہترین کتابت معیاری طباعت

قیمت ــــ ڈھائی روپے

مکتبہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی ۶

ہم نے لڑکی دیکھی!

شوکت تھانوی۔ نذیر الدین۔ ساز

آرکیسٹرا کے سُروں میں بجنے لگا۔ لوگ اپنی اپنی میزوں سے اُٹھ کر فرش پر آگئے اور حسین بل کھاتی ہوئی عورتیں ایکسپورٹ امپورٹ ہونے لگیں۔ جیسے مال ایکسپورٹ امپورٹ ہوتا ہے۔ یہیں ایسے محسوس ہوا جیسے زمین کی طنابیں کھینچ دی گئی ہوں اور ہم مشرق سے مغرب پہنچ گئے ہوں!

رما بل کھاتی ہوئی اٹھی اور ادائے ناز سے شانے کو کہنے لگی۔

"ڈارلنگ! تم میں یہی ایک بُرائی ہے کہ تم ڈانس نہیں کرتے۔" پھر اُس نے لچک کر ہمارا ہاتھ تھام لیا اور التجا بھری نظریں ہماری نظروں سے مس کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو! آؤ ایک راؤنڈ ہو جائے۔"

اُس کی اس حسین التجا پر ہمارے جی میں تو آیا کہ سر کے بل چلے جائیں۔ مگر ہم نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ کہیں سر کے بل چلنے سے سر گنجا نہ ہو جائے۔ پھر بھلا سر کے گنجے ہونے پر ہمارا وہ مقصد کہاں پورا ہوتا جس کے لئے ہم بمبئی سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ ہمارا یہ مقصد زندگی کا سب سے اہم مقصد تھا۔ یعنی ہم یہاں لڑکی دیکھ کر پسند کرنے اور خود لڑکی کی پسند حاصل کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہم ڈانس کی الف بے سے بھی واقف نہیں تھے۔ مگر یہاں ڈانس سے لاعلمی کا اظہار ہمارے جاہل ہونے کی دلیل تھی۔ اس لئے ہم نے ذرا اکڑتے ہوئے ایک تیر چھوڑا۔

"ڈانس تو میں کر لیتا ڈارلنگ! مگر بمبئی کے بڑے بڑے کلبوں میں ڈانس کرنے کے بعد میرا جی اس کلب میں ڈانس کرنے کو نہیں چاہتا۔" ہمارا تیر نشانے پر لگا، اس نے مسکرا کر ہمارا سخت ہاتھ اپنے نرم ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں! وہاں تو بڑے بڑے کلبس ہیں اور وہاں کے لوگ بھی یہاں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔" ہم نے جھکتے ہوئے اُس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"ہاں خاص کر عورتیں مردوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اتنی کہ جسم پر کپڑا بہت کم استعمال کرتی ہیں۔ اور فلسفیانہ انداز میں کہتی ہیں کہ عریانی۔ انسان کا پیدائشی حق ہے، جیسے آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے!"

"پلیز!" ایک نوجوان رما کو رنس بجانے کے سے انداز میں جھکتے ہوئے کہا

"اوہ! میرا پارٹنر آگیا، بائی بائی ڈارلنگ!" وہ دونوں چمکتے فرش پر پھسلتے چلے گئے۔ آرکیسٹرا کی موسیقی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عورت مرد ایک دوسرے سے چپکے ہوئے محو رقص تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ انسان لوگوں کا اصل مقصد ڈانس کرنا ہے تو یہ ایسے ہی ڈانس کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر ایسے ڈانس نہیں کیا جا سکتا اور اس کے لئے دو کا ہونا ضروری ہے۔ تو پھر عورت، عورت کے ساتھ اور مرد، مرد کے ساتھ کیوں نہیں ناچتے۔ کیا ڈانس کے لئے ایک کا مذکر اور دوسرے کا مؤنث ہونا بھی ضروری ہے ۔۔۔؟ ہم اس کے متعلق زیادہ نہیں سوچ سکے کیوں کہ آرکیسٹرا کی موسیقی نے اپنی روش تبدیل کر لی تھی اور رقص کرتے ہوئے جوڑے آرکیسٹرا کی بدلی ہوئی لے پر تھرکنے لگے تھے۔ ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ساری میزیں خالی تھیں۔ ایک ہم ہی اپنی میز پر تنہا رہ گئے تھے۔ البتہ شبلی ہمارے پیروں کے پاس بیٹھی بار بار اپنی دُم ہلا ہلا کر ہمیں تنہائی کے احساس سے بچا رہی تھی۔ ہم نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا، مگر وہ نرم نرم لمس اور پرفیوم و غازے کی مہک سے مانوس تھی۔ اس لئے ہماری گود سے اُچک کر ٹیبل پر چلی گئی اور زبان نکال کر دم ہلانے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو

"کم آن ڈارلنگ۔ ڈانس وانس تھا!" ہم نے آگے بڑھ کر اُسے لینا چاہا۔ مگر وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی جیسے ہم اُسے گلا گھونٹنے کے ارادے سے آگے بڑھے ہوں!

ہم نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنی گود میں بٹھایا، اور ہولے ہولے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ وہ بے بالوں والی لتیا اونگھنے لگی اور ہم سوچنے لگے کہ ایک بیو کو حاصل کرنے کے لئے بھی کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پتا جی نے کہا تھا کہ ہم رما سے گھل مل جائیں جیسے شکر دودھ میں گھل جاتی ہیں۔ ہم یہاں آکر تقریباً بقول پتا جی گھل چکے تھے، مگر ابھی مل نہیں سکے تھے۔ اس لئے ملنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آرکیسٹرا تھمتے ہی رما بھیا لیں گراتی ہوئی آئی اور کتیا کو ہماری گود سے لے کر کہنے لگی۔

"شیلی سویٹی! تم بہت شریر ہو گئی ہو؟" پھر چونکی آواز آئی اور ہم چونک پڑے، کیوں کہ وہ آواز زنانہ تھی۔ اور ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ رما نے شیلی کا نام لیا تھا یا شیلی نے رما کا؟ ہم نے رما کا ہاتھ کتیا کے سر سے الگ کر کے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! تمہاری یہ کتیا بڑی ہی چالاک ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے چھڑا کر کہا۔ "اس کا نام شیلی ہے، کتیا نہیں۔"

"اوہ!" ہم نے سوچا۔ یہاں اس سوسائٹی میں ہر چیز پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ عورتوں کے رخسار، لال پیلے

ہے کا پردہ ہے جو نوٹوں پر لپ اسٹک کا پردہ، مشرقیت پر مغربیت کا پردہ، کوٹوں پتلونوں کا پردہ۔ یہاں عورت کو عورت اسکے کو کتا کہنا ایک گندی گالی ہے۔ یہاں عورت کو رام رام اللہ کے کوشیل کہنا پڑتا ہے ــــ!

"کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ ــــ!" ہم چونک پڑے

"کچھ نہیں، چلو گھر چلیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے ــ!"

کار ہم خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ کیوں کہ ہمارے آنے سے پہلے رمانے ڈرائیور کو چھٹی دے دی تھی۔ رما ہمارے پہلو میں تھی اور کتیا رما کی گود میں ــ!

"گاڑی کتنی سلو چلا رہے ہو ڈارلنگ، فدا تیز چلاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ اسی کا بیمہ ہو گیا ہے ــ" رمانے اپنی بات کو بیچ میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ہم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مگر میرا ایسا نہیں ہوا ہے" اس پر وہ ہنس پڑی

"کتنے نروس ہو ڈارلنگ!"

اس جملے پر ہمیں بہت تاؤ آیا۔ بھلا ایک حسین لڑکی کی زبان سے کوئی مرد اپنے آپ کو نروس کہلوانے گا ــ چنانچہ ہم نے گیر بدلا اور ہمارا پیر ایکسیلریٹر پر بڑھتا چلا گیا۔ کار کی سوئی اسّی کے ہندسے پر کانپنے لگی ــ

"اوہ! مائی گاڈ! تم نے گاڑی بہت تیز کر دی" رما اپنی سیٹ پر اچھلتی ہوئی ہم سے ٹکرائی۔ ہمارا اسٹیرنگ پکڑنے والا ہاتھ کتیا کے منہ سے جا لگا، کتیا یہ ہماری ہمراہت ہاتھ برداشت نہ کر سکی اور اس نے سمجھا کہ ہم پر حملہ کر دیا ــ کتیا کے حملے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہم نے گھبرا کر اسٹیرنگ کو پوری قوت سے داہنی طرف پھیر دیا۔ ٹرنکر کی سیدھ میں نگاہ پڑتے ہی ہمارے فرشتے کوچ کر گئے کیونکہ ہمارے سامنے پیپل کا ایک بڑا پیڑ ہمارے استقبال کے لئے مودب کھڑا تھا۔ ہم نے گھبراہٹ میں اسٹیرنگ کو بائیں طرف گھمانے کے لئے ایک مکا غلط ڈالا۔ تو ہمیں پیپل کا پیڑ ہی غنیمت معلوم ہوا۔ کیوں کہ دوسری طرف بہت بڑی کھائی تھی ــ پھر جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا، مگر ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہم پیپل کے پیڑ کا شکریہ ادا نہ کر سکے۔

جس وقت ہماری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور ہم ایک کمرے میں پلنگ پر پڑے تھے۔ ہمارے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ سنگھوں کی دیوار سے چہرہ ثابت تھا۔ ہمارے پلنگ پر دائیں جانب کتیا بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے اسے ہمارے ہوش میں آنے کا انتظار تھا یا کتیا کے ــ ایک طرف دو نرسیں باادب باملاحظہ بنی ہوئی تھیں۔

ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور یہ دیکھا کر ڈاکٹر سے گھبرا کر

"ڈاکٹر! میں جانوروں کے ہسپتال میں ہوں یا یہ کتیا آدمیوں کے ہسپتال میں ہے؟"

ڈاکٹر نے ہماری یہ کھلاہٹ پر ڈاکٹرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں اس وقت سیٹھ جی کے بنگلے پر ہیں"

ہم نے ذرا غور سے دیکھا تو ہم واقعی سیٹھ جی کے بنگلے پر تھے۔ مگر ہم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کون سیٹھ جی؟"

ڈاکٹر نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "آپ کے ہونے والے سسر اور کون، آپ بڑے خوش نصیب ہیں جو آپ کو رما جیسی لڑکی مل رہی ہے"

ہم نے اپنے قریب بے ہوش پڑی ہوئی کتیا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: "واقعی ڈاکٹر، میں بڑا خوش نصیب ہوں مگر ڈاکٹر، رما کہاں ہے، اس کے چوٹ تو نہیں آئی؟"

ڈاکٹر نے کہا: "نہیں بس معمولی چوٹ آئی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کے ایجنٹ سے باتیں کر رہی ہیں"

ڈاکٹر کی اس بات پر ہم ابھی کچھ سوچنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اتنے میں رما کمرے میں داخل ہوئی

"ڈاکٹر! شیل کو ہوش آیا کہ نہیں..... اوہ! تو تم ابھی تک بے ہوش ہو؟" وہ کتیا کے قریب یعنی ہمارے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ہم نے ڈاکٹر کے لہجے کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ڈارلنگ"

اس نے ہمارے جملے کو ختم ہونے سے پہلے ہی کاٹتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"تم مجھ سے بات مت کرو۔ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے ــ" اور پھر وہ رو دھو گئی۔

ہم نے منانے کے لئے رما اسی کی طرح چیخنا چاہا مگر دوسرے لمحے میں ہمیں یہ کہہ کر اپنی کمر پکڑ لینی پڑی، کیوں کہ کمر پر لگی ہوئی چوٹ چیخنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

وہ پورا دن ہم پلنگ پر پڑے کبھی کتیا کو کبھی رما کو اور کبھی ڈاکٹر کو دیکھتے رہے۔ دوپہر کے بعد ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ آتے اور کہتے۔

"ہم نے سنا ہے کہ تمہاری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور تمہاری شیل کافی زخمی ہو گئی ہے!"

پھر اظہار افسوس کے ساتھ ہی ساتھ اظہار ہمدردی کرتے چلے جاتے۔ ہم انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے کہ ہماری ہونے والی بیوی کے کتنے دوست ہیں۔ جو ہمارے زخمی ہونے پر اظہار ہمدردی کرنے چلے آئے ہیں ہم نے اپنے آپ کو بقول ڈاکٹر بہت خوش نصیب پایا۔ اور سوچنے لگے کہ خواہ مخواہ اتنے دنوں سے لڑکی تلاش میں جھک مار رہے ہے، بھلا اس سے اچھی لڑکی ہمیں اور کہاں ملتی! ہم نے آج ہی اپنے پتاجی کو اپنا فیصلہ لکھ دینے کی ٹھان لی۔ مگر شام اچانک ایک گڑبڑ ہو گئی، وہ یہ کہ کمرے کتیا شام کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی، اور رما خوب روئی، رات بھر روتی رہی اور صبح اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا: "میں ایک خونی سے شادی نہیں کر سکتی۔"

ہم نے کہا: "کس کا خون کیا ہے میں نے؟"

وہ جھلا کر کہنے لگی: "تم نے شیل کا قتل کیا ہے"

ہم نے اسے سمجھایا کہ جب ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح گھل مل گئے ہیں اور تقریباً محبت بھی کرنے لگے ہیں تو تمہارا یہ فیصلہ کرنا محبت اور انسانیت کے خلاف ہے

اس نے محبت اور انسانیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا: "میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا ہونے

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیے

نورپرکاش۔ بانکوٹی

روپے کی موت

کاکی کو اُس کے شوہر کے مرنے کی خبر تیسرے روز ملی۔ محلّے والوں کو یقین تھا کہ اگر یہ خبر اُسے پہلے ملتی تو کاکی بھی اپنے شوہر کے ساتھ چل دیتی۔ تیسرے دن پتہ چلنے کے بعد بھی اُس کے ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ کاکی اپنے سر کو پیٹتی سینہ کوبی کرتی اور اُٹھ اُٹھ کر دوڑتی۔ اور اُس کے دونوں بچے اور ایک بچی ماں کو روتا دیکھ روتے۔ جیسے ایک بھیڑیئے کے پیچھے سارے بھیڑیئے چلانے لگ جاتے ہیں، یا ایک بندر کے ٹوپی پھینکنے کی وجہ سے سارے بندر اپنے اپنے سروں کی ٹوپیاں پھینک دیتے ہیں، بس اسی وجہ سے سارا گھر اور سارے گھر کی وجہ سے محلّہ اور محلّہ کی وجہ سے سارا گاؤں پریشان تھا پریشانی صرف کاکی کی تھی۔ اور کاکی کی پریشانی سب کی پریشانی تھی۔ ایک ایک کر کے سبھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ لڑائی شروع کر دیئے۔ پر کہانی ادھوری ہی رہ جاتی۔ کسی کے گھر شاہ کی دعا کا وقت پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا اور کوئی ہاٹر کی دکان تک پہنچ کر چپ ہو جاتا تھا۔ تو کوئی گاؤں کے قاضی کی دوستی کی بات چھیڑ کر کچھ سوچنے میں محو ہو جاتا۔ کاکی رو رو کر اداس رہ گئی تھی۔ محلّہ بھر کی بوڑھیاں فرش پر بیٹھی پان کی پیکیں تھوک رہی تھیں۔ ایک بار اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر دیکھا تو دیکھا سارے لوگوں کو چپ دیکھ کر پھر سے رونا شروع کیا۔ اُسے چپ کرانے میں پکوڑے کے ٹکڑے نکل گئے پکا کی چُپ نہ ہوئی ــــ تب کہیں سے ایک نے کہا کاکی کو کیا ہوگیا ــــ؟ تو دوسری نے کہا۔ یہ ایک موت کیسے ہوئی ــــ؟ کچھ چلے گئے تھے۔ ابھی کئی سال اور جی سکتے تھے ــــ مگر کاکی کی زبان سے نہیں چھوٹتی تھی ــــ سب خاموش ہو گئے۔ سسکیوں کی آواز مدھم سی پڑ گئی۔ اب پھر سے جان گئیں، کاکی کی آنکھوں کے آنسو سوکھ گئے ہیں، اب وہ کچھ نہ کچھ کہہ کر رو رہی ہے گی، کاکی چھوٹی بھی تو ابتدا سے۔ لوگ تو صرف وجہ جاننا چاہتے تھے جیسے اُس کی زبان کھلی تو جان پڑا کہانی یہیں سے شروع ہوئی ہے ــــ!

وہ موسا کاکی کی دکان میں نوکری کرتے تھے اور مہینے کے آخر میں ساٹھ روپیہ پاتے تھے اور ہم دونوں اس میں خوش تھے۔ مگر ایک روز ایک بچے نے، پھر دوسرے سال دوسرے نے اور تیسرے سال تیسرے نے جنم لیا تو ساٹھ روپئے میں گزارہ مشکل ہو گیا۔ پھر ہم نے دکان چھوڑی، اور تم سے گاؤں چھوٹ گئے۔ یہاں سوا شٹر اور کہاں مہاشٹر مہاشٹر تو یہی بندے، اس سے پہلے نہ جانے کیا نام تھا۔ کوئی بھی ہو۔ کوئی بھی تو راشٹر تھا اور جب راشٹر ہوتا ہے تو قانون ہوتا ہے اور قانون صرف غریبوں کے لئے ہوتا ہے امیروں کے لئے نہیں ــــ! پھر ہم نے بھی شاہ کی درگاہ کے سامنے دوکان کھولی۔ شاہ کو انھوں نے کئی بار رات کے وقت دیکھا تھا سال میں ایک بار وہ عرس کرتے۔ شاہ کی قبر سے ان کو ڈھیر سارا پیار تھا۔ گاؤں کا قاضی پکا مسلمان تھا اور یہ بھی کٹر مذہبی تھے دونوں میں بے حد دوستی تھی۔ قاضی کے چھوٹے بچے تین فرلانگ لمبی سڑک چل کر سامان لے جانے آتے۔ وہ ان لوگوں سے بہت خوش تھے۔ قاضی کی مہربانیاں بڑھ گئیں اور انھوں نے اپنے پاس بلایا۔ اور ایک مکان رہنے کے لئے اور ایک دوکان کے لئے دے کر اپنا فرض ادا کیا اور کرایہ پر سال لیتے رہے۔ بھلے دوستی کسی سے کی ہو، وعدے کی بات ہر جگہ ہوتی ہے، کل جب بھی تو دینا سود سے اور سود کے نہیں ہوتی، وعدہ آخر وعدہ ہے۔ کبھی مہنگا کبھی سستا، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ عجیب ریتیں ہے اور اس ریت میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

اتنے میں پڑوسن نے پان کی پیک دیوار پر تھوک

سے ٹھوک دی۔ اور ایک چھینک کے آنے کا پتہ چلا کاکی آگے نہیں کہے گی۔ پر اُس نے بھی تمباکو کو کچلنے کے لئے ٹھوکا کھایا اور بات جاری رکھی، جیسے مشین کو چلنے کے لئے تیل چاہئے۔ ویسے ہی کاکی کی زبان چلنے کے لئے تمباکو ان تمباکو بے حد ضروری ہے۔ کاکی نے تمباکو کو چونے کے ساتھ مسل لیا۔ جیسے کاکی کہانی کا دوسرا موڑ پیش کرنا ہو واقعی وہ نئے موڑ پر آ پہنچی تھی ــــ

پھر میں نے اپنے دونوں بچوں کی شادیاں کیں پڑوسن بولی اٹھی ــــ پھر دو بچے کہاں ہیں ــــ کاکی زور سے چلائی ــــ بھاگ چھوٹ جائیں نیز کتنے کی بڑے ہوئے، آخر میرے سامنے بچے ہی ہیں ــــ

اتنے میں نانی بول اٹھی ــــ اری کاکی تو کہ آگے بول پڑوسن کے نزلے کی عادت پرانی ہے ــــ بیچاری کیسا تی کہیا نو چے تو کیوں کر ــــ؟

ہاں تو دونوں بیٹوں کی شادی پر بے حد خرچ ہو گیا اور جب روپیہ خرچ ہوتا ہے تو واپس نہیں آتا۔ جیسے بات منہ سے نکل کر واپس نہیں آتی ــــ! جب روپیہ خرچ ہو گیا تو کمانے کا خیال بھی چاہئے۔ دونوں بھائیوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ شاہ کے با کی دوکان بڑے بیٹے کے نام کی گئی اور قاضی کی دی ہوئی دوکان کو چھوٹے بیٹے کے سپرد کیا گیا۔ دن گزرتے رہے۔ شاہ کا عرس ہوتا رہا اور وہ اپنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، اور روپیہ قرائط سے آتا گیا اور حفظ

بچوں کی آواز سے خوش ہوتی گئیں۔ پر بن بی بی جب دیر آنے پر خود لینے بھی جاتے، پھر تو بھاڑ کے دینے والا دیتے تو جھک مارے کی۔ یا "

"اگر وہ دینا ہی بند کر دے تو ۔۔۔ یہ بچوں کی آواز تھی ۔۔۔

"تیرے منہ میں گھی شکر۔ تیرے پیچھے بالے منی پھلکیں" کاکی نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے اتنا بھی یاد نہیں پڑتا وہ اپنے مرنے والے کو کہانی کے گڑھوں کو لیپ دے رہی ہے اور مرنے والا کوئی اور نہیں اس کا اپنا شوہر ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ جب شوہر مرتا ہے تو عورت کی دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ کائنات اندھیرا ہو جاتی ہے۔ زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ پر کاکی کے نزدیک شوہر کا مرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مرتے وقت شوہر کے پاس زیادہ روپیہ نہ ہونا بڑی اور بری بات تھی۔ اگر شوہر مفلس کا ہے، تو اس کی موت دردناک ہے۔ اگر روپوں کی کمی پر مرتا ہے تو اس کی موت ہزار درجہ بہتر ہے جینے سے پھر سیدھا سا اصول کاکی کا تھا۔ کاکی کا شوہر مرا تو کوئی مرگیا تھا۔ اس لئے اسے بہت دکھ ہوتا۔ پھر کئی مرنے والے کئی ہزار پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اتنا جتنا کاکی کے اکلوتے وارثوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ اس لئے کاکی زیادہ دکھی نہیں تھی۔ صرف اپنے غم کا ڈھنڈورا پیٹتی تھی۔

سنے پھر فیض شاہ ایک روز خواب میں آئے اور کہا "ایک بڑی دوکان جہاز میں بھر کر لا، بہت نفع ہوگا"

شاہ کی بات کون ٹالتا۔ شاہ میں کہنے پر دو کانیں ہو گئی تھیں۔ اب تیسری کی باری تھی۔ اس پر گھر میں کہرام مچا تھا۔ بیٹی اپنی چھوٹی سی کے ساتھ نئی دوکان کے نخلستان کے دن جہاز چلی گئی اور دو بیٹیں بس گئی۔ انھوں نے بچوں سے کہا تھا ہفتے میں ایک بار آیا کریں گا۔ بس یہ پہلے ہفتے ہی کی بات ہے۔ ہفتے بھر میں شاہ کی دعا سے تین ہزار کا فائدہ ہو گیا تھا۔ ان کا اندازہ تھا سال بھر میں دو کا فائدہ سے چودہ لاکھ کا فائدہ ہوگا۔

پھر ایک بار اسی فتح سے شاہ کی دعا سے انھوں نے کہیں اور دکان کھولی۔ بس اسی فکر میں وہ اپنے بیٹوں سے لگ گئے۔ مات کے دو بجے تک اسی مسئلہ پر بحث چلتی رہی۔ دو بجے وہ مسرور تھے اور ہی خبر سنانے وہ آئی دور جہاز چھوڑ چکے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا وہ رات بھر سو نہیں پائے۔ کچھ والے کہتے ہیں وہ رات انھوں نے روپوں کی گنتی کی۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف صرف روپیہ دیکھا، اپنے آگے اور پیچھے اندر اور باہر اور وہاں تک جہاں ان کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ صرف روپیہ ہی روپیہ تھا۔ روپوں کے ڈھیر تھے اور وہ تھے ۔۔۔ اور میں سچ کہتا ہوں، روپیہ جب زیادہ ہوتا ہے تو انسان مرتا ہے ۔۔۔۔۔۔

جیتے جیتے ہوتے دو بار انھوں نے میرا نام لیا میرے نام کے ساتھ دوکان کا بھی اور کیا اور صرف اتنا کہہ پائے "کاش! میں دو سو نئی دکان اور چلاتا ۔۔۔!"

ایک ہفتہ کی نئی دکان کو نہیں جانتا۔ وہ کچھ دن اور جینا چاہتے تھے۔ مگر مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بس اتنا کہنے کے بعد ان کا جی ہلکا ہو گیا اور چھوٹے بیٹے اور بڑے نے ان کے نہ پرسیدہ پار و فاتحہ کی اور بڑے نے نذر سے دعا پڑھنا شروع کی۔ ابھی جنازہ اٹھا بھی نہیں تھا کہ دونوں بیٹوں نے بیٹھ بیٹھ اپنا اپنا حصہ لیا۔ مجھے اپنے حصے کی فکر دست نہیں۔ وہ کچھ دن اور ہوتے ان کی حسرتیں دل میں ہی رہیں۔ ورنہ سال بھر میں چودہ لاکھ تھا ۔۔۔"

اتنے میں پڑوسن بولی تھی "چودہ لاکھ کیا چیز ہے؟"

متوفی کیا سوچتی تھی، چودہ لاکھ روپیہ ہوتا ہے انسان مرتا ہے، مگر روپے کی موت کبھی نہیں ہوتی۔ کاکی نے کہا جیسے وہ کہانی کے اگلے گڑھوں سے بخوبی واقف ہو۔ "لگے تم جانتے ہی ہو۔۔۔ کے مرنے کی خبر مجھے تین روز پہلے لگی۔ کاکی کے خبر سے رونا شروع کیا۔ پہلے پہر سے ان کے ساتھ رونے میں مشغول ہو گئے۔

رام داس بڑا صابر چلم بھرے کاکی کی رام کہانی سن رہا تھا۔ اس نے بہت سا فلسفہ پڑھا تھا۔ اس لئے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ لوگ سمجھتے پاگل سمجھتے تھے۔ گھر میں کہرام برپا تھا۔ اتنے میں رام داس چلم بھتے سے ہوتا ہوا بھری حقوں کی محفل میں داخل ہو کر چلایا!

"اے کاکی ۔۔۔ تیرا اشٹا رہا۔ روپے کی موت ہوئی ہے"

ایک دم سناٹا چھا گیا۔ عورتوں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ اور دو مرنے والے کام داس کو باہر نکالنے کے لئے شور کرنے لگیں۔ رام داس جاتے جاتے چھر یک بار چلایا۔ "کاکی تیرا شوہر ۔۔۔ کی موت ہوئی ہے ایک انسان روپے کی موت مرا ہے۔ ۔۔۔ روپے کی موت مرتا ہے۔"

پھر جیسے صف بچھ گئی اور کاکی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ انسان ضد کی ہوئی موت مرتا ہے ۔۔۔ یہ روپے کی موت کیا ہوتی ہے۔ کاکی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اتنے میں عام داس پھر ایک بار کمرے میں داخل ہو کر چلانے لگا۔ "کاکی تو بھی روپے کی موت مرے گی ۔۔۔ سب کے سب منہ تکنے لگے جیسے یکبارگی سکتہ سا چھا گیا ہو۔ اور کاکی روپے کی موت کی فکر میں مری جا رہی ہے۔ وہ مر بھی جائے گی، تو بھی پتہ نہیں چلے گا۔ روپے کی موت کون سی موت ہوتی ہے ۔۔۔ یہ رام داس کا کہنا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے پاگل پن میں بھی کہہ جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی کبھی یہ جان نہیں سکے گا کہ روپے کی موت کیا ہوتی ہے ۔۔۔!

نوکن شاہ شیخ طرحی مشاعرہ ۶۱ء

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۶۱ء
مصرع طرح ۔ جس کے اشعار جس مشاعرے سے
کہاں ۔ آستان قاضی ۔۔۔ سے روانہ ہے
نام ... ...
پتہ ... ...

ابن بشیر سودائی میرٹھی۔ مقیم حال ملیکاؤں

نشانِ منزل

بچی! اسے میری فطرت عجیب حالات میں ہوئی پاکل خلائی انداز میں۔ چونکہ میرے اس افسانہ کا تعلق بچی ہی سے براہ راست ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں ——

یا خدا! پیشین سے اتر کر جب آپ پل پر سے ہوتے ہوئے بائیں ہاتھ کی دکانوں کو عبور کر لیں گے تو نیچے لیٹنے کی ایک گنجان آبادی سے آپ کا سابقہ پڑے گا۔ ان کا بروں تو یہاں کچھ سرمایہ دار بھی ہیں۔ مگر اکثریت انہیں کی ہے۔ اسی بستی میں اس وقت میں موجود تھا۔ اس روز تین دن سے بھوکا تھا۔ بھوک کے مارے چکر آ رہے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر زبان رسیدہ پتاں ہو گئے تھے۔ مسلسل فاقہ کشی سے حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ تین روز کی متواتر دوڑ دھوپ کے باوجود بھی میں اپنی کوئی کہانی فروخت نہ کر سکا تھا۔ کہانیوں کا پلندہ بوسیدہ جیبوں میں ٹھونسا ہوا تھا۔ شاید میں یہاں بھی نہ بکتا۔ مگر اب بکنے کی بات ہی نہیں رہی تھی۔

بچی! پوچھے تو ہندوستان بہت ہی قلاش اور تنگ نظر ملک ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسے ادیب کے حق میں۔ یوں تو موسم نہایت خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی پھواریں برس رہی تھیں جیسے کوئی حسینہ ہلکے سفید آنچل اڑا رہی ہو۔ تمام آسمان کے خیمے دھل دھلا کر نکھر گئے تھے۔ جیسے اپنی معشوقہ سے ملاپ کر چکی ہو۔ موسم کی اور کیا تعریف کروں۔ اس قسم کی دو بیتیں جیسا حسن ناپید ہو چکا ہے ——

اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ صرف زہریلی اور مکروہ چوائیں وفا بازی، کینہ، جھوٹ، عناد وغیرہ وغیرہ۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے کیا دلچسپ افسانہ گفتگو شروع کر دی۔

خیر تو صاحب! جس بچی کے کھیسے سے میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ٹرے سے تھال میں مختلف قسم کے کباب بڑے ہی قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ ذرا دور ہٹ کر ایک بچی کباب

اس سے اٹھنے والی خوشبو حواس پر چھائی جا رہی تھی۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ نظام نے جھوٹوں منہ تو نہ پوچھا کہ اے ہندوستانی تجھ کو گوشت کے کباب چبے گا ——؟

میں دل ہی دل میں اپنے نصیبوں کو کوس رہا تھا کہ میں ہندوستانی ادیب کیوں ہوا۔ اگر ادیب ہی ہونا تھا تو دوسرے ملکوں کا ہوتا

پھر اگر ہو ہی گیا تھا تو اپنا نام یا تخلص کرشن چندر یا دت بھارتی جیسے رکھتا۔ یہ کیا "ابن بشیر سودائی میرٹھی"۔

شاید اسی لئے تین دن سے بھوکا تھا۔ ادیت کیا کرتا خاک!

میری حالت اس وقت کی اس کا اندازہ وہ ناظرین کرام بخوبی لگا سکتے ہیں جنہیں اس طرح کا سابقہ پڑ چکا ہو۔ تین دن کی بھوک، کبابوں سے اٹھنے والی خوشبو اتنی اور اشتہا میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسے ابھی وہ اڑ کر میرے پیٹ میں آ جائیں گے۔

میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر نظارہ کباب میں مستغرق تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے میرے شانے پر زور دار ہاتھ رسید کیا اور میری مدرسہ خانہ ہو گئی کہ کہیں پولیس تو مجھ پر چور کا کیس کر کے پکڑنے نہ آ گئی ہو۔ ویسے بھی صاحبان آجکل کی پولیس بڑی رجعت پسند اور متعصب ہے۔ مگر تعجب ہوتی تھا جناب ایک آوارہ لونڈیا تھی۔ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آوارہ کی تشریح کر دوں۔

ساری جمعہ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ساڑی اس نے پہن ڈھانپنے کے لئے ہے یا دکھانے کے لئے۔ ڈیڑھ بالشت کا بلاؤز بدن کو ڈھانپنے کے لئے کوشاں تھا۔ مگر جناب اس کا یہ بس بھی بھی سے ذرا کچھ ہی مختلف رہی ہو گی۔ ان کو میں آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اسے آوارہ لونڈیا کہنے میں حق بجانب ہوں۔

"کیوں بے کیا گھور رہا ہے" اس نے نہایت بے باکی سے کہا۔

"میں ۔ میں ۔ میں کچھ تو نہیں ۔" میں بوکھلا سا گیا ——

"بھوکا ہے یا کھائے گا۔" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے کبابئے کے پاس لے گئی۔ پہلے تو میں ہچکچایا۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد میں کھانے میں ایسا مشغول ہوا کہ جیسے پہلی مرتبہ محبوب پیارہ محبت میں مشغول ہو جاتے ہیں ——

بزرگوں کا قول ہے بھرا ہو پیٹ تو سنسار جھوٹا ہے۔ بھی بھوکی تو ایمان ڈگمگا گیا ہے۔ اب چوں کہ پیٹ بھر چکا تھا۔ اس لئے مجھے بھی بڑی بھوک لگ گئی۔

"ابے تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا۔ شاید میں نے غصہ کہیں دیکھا ہے ——

"فتی نام ہے میرا" آوارہ لونڈیا نے بڑی دلکشی

...فوں میں دیکھا ہوگا۔" اس نے نہایت ہی دھیمے ...ں دوبارہ کہا۔ اور منہ پھیر لیا۔

اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لڑکا ...نے والا ہے۔ اس کے بعد میں نے نہایت سنجیدگی ...نتی ماما سے کہا "بنتی ماما میرا آپ کا بہت ٹکراؤ ...وں کہ آپ نے مجھ جیسے فاترالعقل انسان کی ...م پر مدد کی یقین رکھو! میری جو گرہ پہلی کہانی فروخت ...ی، اس کے دام سے میں تمہارے پیسے چکا دوں گا۔"

اتنے کچھ کہہ میں وہاں سے چل دیا۔ مگر ابھی تھوڑی ...ھ گیا تھا کہ بنتی ماما نے زور سے آواز دی اور ساتھ ...یزی کے ساتھ میری طرف آئی۔

"تم پہلے انسان ہو جس نے مجھ سے چھٹنے کی کوشش ...ں کی۔" اس نے زور دینے والے انداز میں کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں ...ب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ایک تو ہندوستان کی اتنی ...شہر، پھر وہ اس حلیے میں۔ پھر مجھ جیسے ...ڑی انسان کے ساتھ التفات برتنا۔ صاحب میں ...ی کشمکش میں پڑ گیا۔!

پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بنتی ماما مجھے ...نا کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئی۔ تھوڑی دیر ...لنے کے بعد ہم ایک نہایت ہی پوسیدہ اور خستہ حال جھونپڑے ...ں داخل ہو گئے۔ جس کی ساری زمین سرد ہو رہی تھی۔ ...اس مکان میں صرف ایک لوہے کا صندوق رکھا ہوا تھا۔

یہاں آ کر بنتی ماما نے اپنے اس پوسیدہ لباس پر ...ر اعمدہ لباس زیب تن کیا۔ جو اس لوہے کے صندوق ...کے پیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

میرا سیدھا سادا فاترالعقلی کی کلفت سے اس وقت ...زافت پا چکا تھا نہایت تیزی کے ساتھ بنتی ماما کے متعلق ...چ رہا تھا اور وہ اپنی سوچ میں خاطر خواہ کامیاب ...ی ہوا۔

اکدم میں نے پوچھ لیا "پیدا ہوں اگر تم ...تمہیں دوبارہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔ ایک ماما جیسے ...جس کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

اکثر رات کی تنہائیوں میں وہ مجھ سے گفتگو ...باتیں کیا کرتی۔ اس کی باتوں سے دکھ و افسوس ...شرح ہو کر ٹپکتا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بہت قابل ...رحم ہوا کرتی تھی ـــــ

"میں بہت پریشان رہتی ہوں صوفائی!" وہ ...کہتی "جانتے ہو کیوں؟"

میں نفی میں سر ہلا دیتا۔

"مجھے سکون نہیں ہے" وہ جھلا کر کہتی۔ "کیا تم مجھے کہیں سے سکون خرید کر لا سکتے ہو۔؟"

میں پھر نفی میں سر ہلا دیتا۔

"تم نرے صوفائی ہو۔" وہ میرے بالوں کو ...مٹھیوں میں بھینچ کر کہتی ـــــ اور میں درد کی تکلیف ...سے بلبلا جاتا ـــــ

"تم جانتے ہو میں پیرس کس طرح بنی۔ مجھے کن ...کن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے ـــــ میں نے اپنا کیا کیا ...کھویا ہے ـــــ؟"

میں قریب قریب رو دینے والے انداز میں کہتا ...ہاں ـــ!"

"تم نہیں جانتے!" وہ سسکیاں لیتی۔ "میرے ...سر کے بال ایک فاتحانہ شان سے جھلا دے کر چھوڑتی ...سنو! میں بتاتی ہوں۔" وہ نہایت سنجیدہ ہو کر ...طرف دیکھ کر کہتی۔

"میں نے روح کی پاکیزہ تمناؤں کا خون کیا ہے ...اپنے احساسات سے دغا کیا ہے۔ نقد میں یہ دوشیزگی ...حفاظت سے محفوظ کیا ہے۔ میں نے دنیا کو ایک ٹھوکر ...ہوئی سونا سمجھ کر لیا تھا۔ لیکن دنیا سب سے ...ذلیل، گندی، گھناؤنی اور گناہ آلود چیز ہے۔ ...شرم و ذلت اپنا مفہوم کھو دیتی ہیں۔ یہاں کے ...بھوک کے لعنت زدہ کتے ہیں اور عورتیں ...

صحت فیاض ۔

تنگ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور غصہ سے پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ تنفر تیز ہو جاتا اور وہ ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگتی۔

مجھے یہاں کے کوئی کیوریٹر سے بڑے عہدہ دار کا نام تک یاد نہیں رہتا ہے۔ ان سب کتابوں نے میری روح کو داغ دار اور خطوط کو بے نور بنا دیا ہے۔ جنہیں بھوکے کمبخت پاگل کتوں نے میری بوٹی بوٹی نوچی ہے۔ وہ میں دنیا سے قیمت وصول کئے بے یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور بے سہارے بچے کے دراز بالوں میں اپنے سب آنسو جذب کرنے لگتی اور خود بھی بے حد رو کر ہلکا ہو جاتا۔

یہ حالت میرے لئے بڑی صبر آزما ہوا کرتی تھی مگر اس کے باوجود میرا صبر سے بڑھی ہوئی خودداری نے کبھی تنگ نہیں دیکھا تھا جو میں بہت فخر کرتی تھا۔

اس کے بعد بنتی بالا میری باہوں میں بے حد تھک کر سو جاتی۔ جیسے کوئی معصوم بچہ تھک کر ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر بڑی معصومیت ہوا کرتی تھی۔ پھر میں آہستگی سے اسے اس کے بستر پر لٹا دینے کے بعد اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

دوسرے دن بنتی بالا ہمیشہ سے کچھ اس قدر پریشان رہا کرتی تھی مگر ان دنوں اس کی اداسیاں اور بھی گہری ہو گئی تھیں پر وقت خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ میری حساس طبیعت اس خاموشی کے پیچھے ایک عظیم طوفان پریشان دیکھ رہی تھی مگر میں بھی خاموش تھا۔ اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ میرے سوچنے کی بات غلط ہو۔ اور یہ سب فقط کام کی زیادتی کی وجہ سے ہو۔ کیوں کہ بنتی بالا اس وقت ایک ساتھ کئی محاذوں پر کام کر رہی تھی۔ انہیں محاذوں میں سے ایک کہانی تھی۔ جس میں بنتی بالا کا کردار کچھ کہانی کے پہلے حصہ میں وہ ایک ہیروئن تھی۔ شوخ و شریر۔ جیسے شہر کا ایک مجذوب بدمعاش اپنی ہوس پرستی کا شکار بنانے

ہے اور اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور عصمت و عزت کی خاطر جان دے دیتی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ ایک کاٹ گرل دکھائی گئی تھی۔

میرا یہ کہنا اپنی فوقیت کے اعتبار سے اچھوتی و انوکھی کہانی تھی۔ اپنے سوندوں مکالموں سے میں نے اس میں جان ڈال دی تھی اور کسی بڑی محنت سے کام کر رہے تھے۔ اس فلم کے تمام مناظر لئے جا چکے تھے۔ صرف فلم بلکہ تمام فلمیں جن میں وہ کام کر رہی تھی مکمل ہو چکی تھیں۔

اس منظر کی شوٹنگ رات شب میں ہونے والی تھی اس منظر میں کافی اہتمام سے کام لیا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے سب سے آخر میں فلمایا جا رہا تھا۔

آج دن بھر بنتی بالا بے حد پریشان رہی۔ دن بھر کمرے میں گھستی رہی۔ مجھے بھی کہیں نہیں جانے دیا۔ سر کے بال پریشان ہو کر سارے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ بستر پر ادھر ادھر کے تمام کپڑوں پر بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کبھی بستر پر کروٹیں بدلتی۔ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔

"آخر پریشان کیوں ہو بنتی! یہ گھبراہٹ، بے چینی اور آنسو کس لئے۔۔۔؟" میں نے دن بھر میں پہلی بار پوچھا کیونکہ کیونکہ دن بھر بنتی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔ آخر تو بنتی میری محسن تھی۔

خدا جانے سوداگر میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ بنتی نے درد کے ساتھ کراہتے ہوئے کہا۔ اور آنسوؤں کی دھاریں کچھ اور تیز ہو گئیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ بنتی بالا کو کوئی جسمانی روگ لگ گیا تھا۔ نہیں بلکہ اس کی روح گھٹتی رہا کرتی تھی اور آج یہ کیفیت کچھ زیادہ اُجاگر ہو گئی تھی۔

غرض اسی رات دو بجے میں اور آنسوؤں کی چھاؤں میں اس نے گاڑی شوٹنگ کے لئے لیا دیکھ اور اسٹوڈیو جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بے انتہا سکون پھیلا ہوا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔

مشتعل فرما دیا۔ بنتی بالا نے فرقت کی خاطر کیوں کہ ایک عصمت کی متلاشی حیات اس کا صحیح نیز اس کے دماغ میں گھر کر سکتے ہے۔

دو بجے کے قریب ہم گھر واپس لوٹے۔ بنتی کی حالت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سونا رہی تھی کہ ڈرائیور جی میرے لئے ایک امتحان ہے بارے ہم کسی طرح گھر تو پہنچے، آتے ہی وہ غم سے نڈھال ہو گئی۔ مجھے بھی اپنے قریب کر کے کافی دیر تک سسکتی رہی اور آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں میں نے سوال کیا:۔

"سوداگر تم نے کبھی میرے جسم کی خواہش کیوں نہیں کی؟"

میں چونک کر پریشان سا ہو گیا۔ اس کے کیا جواب دیتا۔ خاموش ہی رہا۔

"جواب دو!" وہ بے بسی سے فریاد کناں ہو گئی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔

میری اس خاموشی پر وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے سر پر خراشیں آگئیں اور اس کا جسم بھی تار تار ہو گیا۔

"بنتی ہوش میں آؤ۔" میں نے التجا کی تھک کر کچھ ہٹ گئی۔ اس لئے تاکہ تم مجھے قابل سمجھو۔ اس لئے تو میرے تقدس کا جواب تم عدم تقدس سے دیتے ہو۔ اس نے چیختے ہوئے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ذلیل و خاکستر ہوں، کیا مجھے جینا چاہئے ہرگز نہیں۔" اس کا جواب تم اپنی کہانی میں صاف جس کی ہیروئن خودکشی کر کے مر جاتی ہے۔ عزت موت کی آغوش میں پناہ لینی چاہئے۔ تم پھر کیا ہیں ہوں۔ اور اگر ہوں۔ تو پھر کیوں ہی ہوں؟"

بیچارے سوداگر بڑی قہقہہ والوں نے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس قدر ڈائرکٹروں نے جو کے

"آپ کو غلط فہمی ہے جو سزا چاہیں دیں۔ میں خوشی سے برداشت کروں گی۔ میں اسے بھی اپنی محبت کی فتح یابی متصور کروں گی۔"

"یہ کیونکر شکست میری ہوگی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔؟"

"کوئی بھی دیکھ کر سمجھے اپنا اچھا برا سوچنے اور سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"اگر آپ کہہ دیتیں تو مجھے اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی کہ تمہیں اس منگنی کی بات میں دیکھ کر ہوتی ہے۔"

"اگر آپ کو یہ بات پسند نہیں تو یا خدا میں اسے ابھی ختم کر دوں گی۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں۔؟"

"نہیں۔ ایک التجا محبت سے۔"

"میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔"

"اور میری۔؟"

"آپ کی قدر تو اسی وقت کر سکتا ہوں جب کہ آپ مغربیت کو مکمل طور سے خیرباد کہہ کر ایک خالص مشرقی بن جائیں۔"

"تو سمجھ لیجئے کہ میں خالص مشرقی بن گئی۔"

"نہیں بلکہ اسی وقت سے میرا طرز معاشرت مغربیت سے مشرقیت میں بدل گیا۔"

"دل سے کہہ رہی ہیں آپ۔؟"

"خدا جانے آپ کو باور کیوں نہیں آتا؟ اور نہ جانے کیوں آپ میری طبیعت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔"

"اب میں آپ کی صحبت سے بیزار کبھی نہ ہوں گا۔ نہ آپ سے اجتناب کروں گا۔ بلکہ جس جگہ آپ کا سایہ پڑے گا۔ میں اس جگہ کو اپنا معبد سمجھ کر سجدہ کروں گا۔"

صادق جذبات بہہ چلا تھا۔

"اور میں بھی آپ کو اپنی مجازی خدا تسلیم کر کے مطمئن ہو جاؤں گی جیسے کہ اب محسوس کر رہی ہوں۔"

وہ جذبات سے ریحانہ کا دل بھر آیا تھا اور جوش فرطِ انبساط سے آنکھیں اشکوں سے نم ہو گئی تھیں۔

"چچا ——۔؟"

"بالکل بچا ——!"

"ریحانہ ..... خادم کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ریحانہ نے ساتھ نہ دیا۔ شدت جذبات سے آواز گلے میں پھنسنے لگی اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے تڑپ کر ریحانہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

ریحانہ کو آج پہلی بار یہ نیک ساعت میسر آئی تھی خوشی سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ حادثہ کیا کر رہے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے تمام دنیا کی دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی گئی ہو۔ آج اسے اس بات کا یقین واثق ہو گیا تھا کہ انسان کی کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ بہت سے کام لے۔ صبر و شکیب کا دامن نہ چھوڑے اور خداوند قدوس کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو۔

بقیہ افسانہ "میں مر جاؤں گا" صفحہ ۲۸ سے آگے

میں ایک خوبصورت لفافہ تھا۔ جسے انھوں نے بڑی نفاست سے مجھے سونپا۔ اور کہا پڑھ لیجئے ——۔ ناہید نے بھیجا ہے۔ میں نے خوش خوش لفافہ چاک کیا۔ مگر جوں جوں پڑھتا گیا۔ ویسے ویسے میرے حواس گم ہوتے گئے ——

"میرے پرویز! آداب و سلام

مجھے بے انتہا دکھ ہے اور حد درجہ افسوس ہے! مگر کیا کروں حقیقت پھر حقیقت ہے چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ مگر کہنی کہ اس سے مفر نہیں —— سب سے پہلی بات جو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ مسلمہ میری عزیز قریب سہیلی بلکہ آپ سے مسلمہ کے اخلاص بھری میں آپ کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ مقصد واضح اور صاف ہے۔ آپ کے ذاتی گھر کا مضبوط اور پائیدار کا اندازہ واقعات۔ مگر اس میں آپ بری طرح ناکام ہیں مسلمہ کی بے پناہ محبت کو ٹھکرا رہے ہیں۔ اب مجھے بھی معاف

اطلاع

اس مرتبہ طرحی کلام کے سلسلہ میں اکثر شعراء نے دس پیسے والے لفافے نہیں لگائے تھے۔ ایسے تمام لفافے ردی ہو کر گئے۔ یہ دفتر سرکاری چیز ہے اور انتہائی خود غرضی بھی آئندہ ایسے تمام لفافے واپس کر دیئے جائیں گے

(۲) ایک صاحب طرحی غزل کے ساتھ ہر مصرع کی تقطیع کر کے بھی اپنے کلام کی اہمیت ثابت فرما گئے ہیں۔ انھیں کون بتائے کہ بحور اشعار کی تقطیع ہی ہوتی ہے مگر کلام نہیں ہو سکتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو کہاں تک داد دیتا رہوں۔ خدا مرحوم نہ فرمائے۔

ہمراہی

غم یوں مسکرائے

اختر جاوید نوگانوی - امروہا

شادی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا اور شارد اسسرال پہنچ گئی تھی۔

زندگی مسکرانے لگی ـــ زندگی مسکراتی ہے تو بہاروں کی تجلیاں سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ شارد کو محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی غیر سا تھی کے ادھوری تھی، جو مکمل تھی تشنہ تھی۔ اور اب ساتھی مل گیا تھا۔

شکر اپنے تصور سے بھی کہیں زیادہ حسین ثابت ہوا تھا، جس پر وہ بجا طور پر فخر کرنے لگی تھی۔

وہ برقی قمقموں سے جگمگاتی، تازہ پھولوں کی مہک سے بسی ہوئی، احساس کو بیدار کرتی ہوئی، جذبات میں تموج پیدا کرتی ہوئی، امنگوں کو بیدار کرنے والی، زندگی کو اصل معنے سے ہم کنار کرنے والی ـــ وہ چاند حسین اور نشیلی رات، جس کا تصور آج بھی اس کی آنکھوں کی حسین وسعتوں میں جذب ہے۔

وہ کھڑکیوں سے دودھ کا کال کوٹھری پر چھا رہا تھا، چاند سے کتنا عجیب سا لگ رہا ہے۔

وہ وہ پہلی بار کا چاند بھی تو کتنا عجیب اور دلکش معلوم ہوا تھا۔ جب شارد دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی پیہم کوشش کر رہی تھی اور شریر چاند سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

"کس طرح گھورے جا رہا ہے شریر ـــ" اس نے دل ہی دل میں اس چھلیے کو کہا تھا۔

اور پھر.....

"آپ اس قدر کیوں شرما رہی ہیں؟" شکر نے شریر چاند کے سامنے یہ فقرہ کہہ دیا تھا۔

وہ سمٹ گئی تھی

"بڑی بھولی لڑکی ہو تم"

وہ خاموش رہی تھی۔

"شارد! کچھ بولو۔ چاند ہمارے دلوں کی باتیں سننے کے لئے بے قرار ہے"

"مجھے شرم آتی ہے" وہ سکوت توڑ گیا تھا۔

اور شکر نے ایک قہقہہ بڑے زور سے لگایا تھا۔ پھر کہنے لگا تھا: "کیا اس چاند سے شرماؤ گی جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا"

"یہ شریر بھی تو بہت ہے ـــ"

"اچھا تو کھڑکی بند کئے دیتا ہوں"

"نہیں!" اس کے چہرے پر عجیب سی معصومیت پھیل گئی تھی۔

"اچھا تو یوں کہئے کہ آپ دل کی باتیں زبان تک لانے میں شرما رہی ہیں"

"میں ایک مشرقی لڑکی ہوں"

پھر وہ دیر تک ایک مستحکم رشتہ استوار کرتا رہا سانسوں اور سرگوشیوں نے اپنا اپنا ایک دوسرے پر اظہار کر دیا تھا۔

وقت گردش بداماں رہا۔ زندگی اسی طرح خوش خوش رواں دواں تھی۔

شارد سے صرف شکر ہی نہیں، گھر کا ہر فرد بے پناہ پیار کرتا تھا خاص طور پر شکر کی ماں اسے بہت ہی چاہنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شکر کا آٹھ لڑکیوں میں سے ایک تھا۔ شکر کی ماں کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ ایک بیٹی بھی ہوتی جس کی وہ دھوم دھام سے شادی رچاتی۔ لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ مگر اب یہ آرزو شارد نے پوری کر دی تھی وقت نے پھر ایک کروٹ بدلی۔

شکر کے والد صاحب جو بیمار چل رہے تھے

ان کی زندگی اب بھی دیش کی حفاظت کرنے میں اور آج بھی جب کہ خدا وہ چیزیں نے ہماری سرحد اپنے ناپاک قدم جمانے کی کوشش کی تھی تو انہوں پیچھے آگے بڑھ کر چینیوں کے ناپاک قدم کاٹ اور وہ تک ان کے شہید ہونے کی شکر نے چینیوں سے بدلہ لینے کی صرف اپنے والد کا ہی غم نہ تھا۔ بلکہ سینکڑوں سینے میں سمٹ آئے تھے۔ اس نے سینکڑوں خون کے آنسو روتے دیکھا کتنے دل ایک کتنی ہی کراہیں بیک وقت فضا میں جذب

اس دن شکر سینے میں نئے جذبات کا والد صاحب کی تصویر کے سامنے کھڑا عہد کر رہا "پتا جی مجھے آشیرواد دیجئے۔ میں بھی دیش کی حفاظت کے لئے جا رہا ہوں اپنے کے خون کا بدلہ نامرد چینیوں سے ضرور یہ میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی رہے گا، نہ بہاؤں گا ـــ"

شارد پیچھے کھڑی سن رہی تھی اس کا تیرنے لگے تھے ـــ

"شارد! تم رو رہی ہو ـــ نہیں شارد کہنا چاہئے کہ تم کو اس قابل ہونا دیش کے پیش کر سکو ـــ"

شارد شکر کے سینے سے چمٹ کر

"شاید تم آج کی ہندوستانی عورت ہو، تمہیں روتا
ہوا چاہئے۔"

"آپ مجھے سمجھ کر جا رہے ہیں۔"

"شاید کتنی بیویوں نے اپنے شوہروں کو مسکراتے
ہوئے رخصت کیا ہے۔ کتنی ماؤں اور بہنوں نے دیش کی پکار
پر مرد کو تیار کر دیا ہے اور تم شاید واقعی کچھ مختلف
ہو۔"

شاردا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

نریندر دیکھ رہا تھا کہ شنکر کی ماں کی آنکھ میں کوئی
نہ نہیں، ہونٹ بھنچے ہوئے تھے کہ جیسے وہ ثابت قدم
رہے دوسرے طوفان کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھی۔

شنکر سینہ تانے ایک سپاہی کی طرح کھڑا تھا
اس نے دیش کی خاطر بلیدان ہونے کے لئے خود اپنے ہاتھوں
سے اپنا بلیدان کیا تھا۔ وہ بلیدان کا پیغام سنانے سے پہلے
ذکر کر رہا تھا اپنے سپنوں کا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "زندہ باد اے دیش کے
بابو۔ زندہ باد اے قوم کے جاہد و!"

شاردا کی آنکھیں آبشار بن گئی تھیں۔ اس کی دنیا
ایک دم تباہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ تنہا تھی۔ زندگی بھی
ایک جادو سے ہم کنار ہوئی تھی اس نے تنہائی کا
احساس شدت سے تڑپا رہا تھا۔ پھر شاردا کے ہاتھ
بندوقوں کے لئے بیقرار ہونے لگے۔ وہ ہر جگہ کی گولی
اپنے سینے پر روکنے کی بیحد خواہش مند تھی۔ وہ ہر وقت شنکر کی
سلامتی کے لئے بے چین رہتی۔

ایک دن شنکر کا خط آیا۔ شاردا تھانوی یاد کے
ہاتھ بیسیوں قدم ہر طوفان کو پیچھے چھوڑ دیتے ہوئے اٹھ
رہے ہیں۔"

شاردا کا دل فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔
اس کے بعد پھر ایک خط۔

"شاردا! تمہارے ہاتھوں کا بنا ہوا سوئیٹر
پہن کر برف سے بھری ایک گھاٹی میں نیا جوش پیدا
ہو گیا ہے۔ ہم نے دشمن چینیوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔
ان کی بربادی کی خبر سن کر تم خوش ہوتے
ہو گے کوئی غم نہیں ہے۔ وہ دن دور نہیں۔ جب تم پھر میری
باہوں میں سمٹ آؤ گی۔"

لیکن آہ شنکر کا خط آئے ہوئے ایک طویل عرصہ
ہو چکا ہے۔ کوئی پیغام نہیں ہے جس کی خدمت کر کے وہ اپنا
دل بہلائے۔ شاید شنکر کی ماں بھی دوسری دنیا میں جا چکی ہے
ایک سناٹا ہر چیز سے گھلتا جا رہا ہے اور یہ چاندنی رات
ایک دیو ہیکل جنین نظر آ رہا تھا شردا تنہا دیکھ رہا تھا۔ آہ
اداس ہے۔ کیا کہنے سے ڈر رہا ہے کہ کوئی غم اس کا
شریک ہے۔

اچانک کہاں ایک سیاہ بدلی نے چاند کو چھپا لیا
چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور اس کی سانسیں کرب کی
شدت و وسعت میں پھنسنے لگیں۔ باہر سے طوفان کی پرجوش
صدائیں آ رہی تھیں۔ "دیش کے پرندہ باد۔ دیش
کے شہید زندہ باد۔ چینی فساد اپنا خاتمہ اور اعلان ہمارا
ہے جاری و ساری سے ناپاک قدم ہٹا لو۔ ہمالیہ ہمارے
دیش کی شان ہے۔"

شاردا کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔ اس کے ہاتھ پھر
دعاؤں کے لئے بلند ہو گئے اور اس قدر کھو گئی کہ اپنی بھی
خبر نہ رہی۔ شہروں شہروں جلوس نکلنے لگے اور فتح نصیب
دلوں میں طوفان اٹھانے لگیں۔ ترنگوں اور بندوقوں کی
گرج فضا فضا میں بس گئی۔ بادل کے زہریلے بادل آسمان
کے سینے پر چھانے لگے۔ چینیوں نے ہماری سرحد کا کچھ
حصہ دھوکے سے اور ناجائز طریقے سے ہتھیا لیا ہے
شاردا سنتی رہی۔ اس کا دل جلتا رہا۔

ہر بات اور ہر واقعہ ایک ناقابل بیان جذبہ کی
شاردا کو شنکر کے خط کا اب بھی شدت سے انتظار تھا وہ
نہیں جانتی تھی کہ کیوں اب کوئی خط لکھنے کو کہاں فرصت
ملتی ہے اس کے سامنے دشمن چھا رہا ہے اور اسے ہر
لمحہ زیر کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور ایک ہندوستانی سپاہی
جس کو جان اور مال سے زیادہ دیش پیارا ہوتا ہے۔
اس کے لئے تمام حرام ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ بھلا دیتا ہے
فرض اس کا ایمان ہوتا ہے۔ اپنی ہر محبوب چیز کو قربان
کر دینا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ دیش
کی خدمت ہی اس کا شوق رکھتا ہے۔

مگر شاردا ایسی ہندوستانی عورتوں میں سے تھی
جو شوہر کو دیوتا سمجھ کر پوجتی ہیں۔ جن کے لئے کائنات کی
خوشیاں بھی شوہر کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں
اس نے شاید اپنی اپنے شوہر کے لئے بے چین تھی۔ پھر اس
خیال کی گھات جو ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیتا۔ ماں باپ
شریک حال بن گئے تھے۔ لیکن وہ محبت اس کے پاس کہاں
تھی جو شنکر سے دے سکتا تھا۔ وہ تو فکر کی وجہ سب
کچھ کھو چکی تھی۔ زندگی کا ہم سفر کتنی کا سہارا۔
ماں باپ تو ہیں ایک کھیل کے درخت کے سائے کی طرح تھے
پھر کیوں نہ وہ محبوب سے دور رہ کر بے چین ہوتی۔ کیوں
نہ اس کی سلامتی اور کامرانی کے ساتھ واپس لوٹنے کی
دعائیں مانگتی۔

آج رات شاردا کو خدا کیوں خلاف معمول نیند نہ آ رہی تھی
برابر والے کمروں میں گھور رہے جا رہے تھے اور خاموشی کے بادل
تاریک ہو گئے تھے۔ جو بے داد دیکھتے بھٹکتیں سو گئی
تھیں، جو اس کا پیغام شنکر تک لے جاتیں۔ پھر کہیں وہ اس
جہاں کا حصہ تھی اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب پھر
اپنی سانسوں کو شنکر کی سانسوں میں ڈوبتا دیکھے گی
اور شنکر فخر سے سینہ تان کر کہے گا۔ "شاردا تمہاری
یہ کہاں محبت کو دل میں چھپا کر میں نے چینی فوجوں سے
دھرتی ماں کے ایک ایک فٹ کا بدلہ لیا ہے۔"

اگلے دن شاردا کمرے سے باہر نکلی تو اس کا جسم
ٹوٹا جا رہا تھا۔ وہ پوری رات نہ سو سکی تھی۔ شنکر کے
گھر کی ہر دیوار، ہر دل کی ہر اینٹ قہقہے بھر بھر کر اس پر
ٹوٹی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چاروں طرف سے نگاہیں
دوڑانے لگی۔ سامنے پڑوسی کی فوجی شنکر کی

تصویر کھانا لے آئے اور اس کا منہ بھی نہ دیکھا پھر وہ تصویر سے مخاطب ہو کر بولی:۔

"میرے دیوتا آپ بھی ناشتہ کیجئے۔ میں ایک گنہگار عورت ہوں۔ لیکن میں کیا کروں....."

"بیٹی رات بھی تو نے کھانا نہیں کھایا۔" بڑھیا اس کی بڑھی ماں نے کہا۔

"ماں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"چل اپنا ناشتہ کر لے۔"

"ماں مجھے اب بھی بھوک نہیں۔"

"بیٹی میں تیرا غم کو جانتی ہوں۔"

شاردا کا محسوس ہوا کہ اسے اب بھوک نہیں رہی جب سے شنکر گیا تھا اس نے ایک دن بھی پیٹ بھر کھانا نہ کھایا تھا۔ ماں نے فریاد اصرار کیا تو اسے مجبوراً ماں کہنا پڑی اور جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھی تو نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اس کی سانسیں دم توڑنے لگی ہیں۔ وہ ناشتہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

چند لمحے بعد وہ پھر شنکر کی تصویر کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی "میرے دیوتا۔ تمہارے بنا کل سب کچھ بھوکا رہ گیا ہے۔" پھر وہ دیر تک تصویر سے باتیں کرتی رہی۔

باہر کسی رکشہ والے کا گزر ہوا اس کی جانب جگیا نے پرجوش آواز دی۔ اس کا دل خوشیوں کا خزانہ نظر آنے لگا۔ وہ سچائی جاگ گئی۔

"خط ہے" ایک بار اس نے وہ جملہ دل کر دہرایا۔ "شنکر مجھ کا پیغام کیا ہے۔ آج یقیناً اندھوں نے یقین خداوں کو منہ کالا کر کے اپنے علاقے سے بھگا دیا ہوگا۔ آج ہماری دھرتی ناپاک قدموں سے پاک ہو گئی ہوگی۔"

اس کے دل و دماغ میں بھی بڑھ گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں خط کانپ رہا تھا۔

"یقیناً وہ کہہ رہے ہیں۔" اس نے خط کو چوم

کر سینے سے لگا لیا۔

چند لمحے بعد ہی اس کی خوشیوں کا ڈھیر ہو گیا۔ بڑھی ماں اور باپ نے سینے سے چٹا لیا اور وہ سارے مار مار کر رونے لگے۔ لیکن شاردا کی آنکھیں خشک تھیں اور لبوں پر ایک عجیب سی فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی پھر وہ شنکر کی تصویر کے سامنے خاموش کھڑی تھی اور باہر ایک بے ہنگم جلوس جوش و خروش کے ساتھ گزر رہا تھا۔ اگر وہ نعرے تھے۔

شہید وطن رام دیال جی زندہ باد۔

شہید وطن شنکر جی زندہ باد۔

بقیہ ثابت لکھنوی (صفحہ سے آگے)

لطائف اور نزاکتیں آپ نے ملاحظہ کیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ واقعات کے اسباب و نتائج میں ظاہر نے اصلاح و فلاح کے جذبے سے کام لے کر کوئی دوسرا پہلو اختیار کیا ہے۔ اب اگر معاشرہ کی درستی اور سماج کی بھلائی میں کام آسکے تو اس اوپر بسر کے لئے یہی مرجب نجات ہے اور اس کا استعمال بھی لائق صد تحسین ہے۔ شاعر نے اس مثال کو کہیں زشتیٔ اعمال کا نتیجہ بتایا ہے کہیں قہر خداوندی سے تعبیر کیا ہے بات کی طلب گاری اکرم کی خواستگاری بہر حال ناظر ہی ہے۔ کفر و ضلالت اور نفرت و فحاشت کا خیال تک کہیں نہیں کہ پاکیزگی سے فائدہ اٹھانے جیسے خاموش گناہوں سے گریز و فرار کی تلقین کی ہے یہ اس کی حق بین خدا شناسی اور مذہب پرستی ہے جس نے اس کو عنان سکوت کو باندھ کا ہے۔ یہ دعا ہمیں بھی طاعت کیجئے ؎

طاعون میں دل مردہ جو خفقت ہو جائے
نفسی نفسی کی کیوں نہ حالت ہو جائے
دیکھے بہ چشم خود یہ محشر یہ نشر
قائل ہر مسکر قیامت ہو جائے

کیڑوں سے بچنے کے جب ڈرتا ہے
موت آنے سے پہلے خوف سے مرتا ہے

وقت سے لگا کہ کوئی نہ ہو طبع جیا
غافل ہو کرتا ہے۔ خدا کرتا

شاعرانہ اختراعیات کی تشریح آپ
ہو جائے گی تاہم کا دیا ہوا یقیناً اس
ہوئی محسوس کرے گا۔ لیکن یقین کا تصور
شاعر کے دل و دماغ میں بھی ہوتا ہے۔ اس
تخلیقات میں آپ کی نظروں سے اوجھل
پہنچے جا پہنچ جائیں۔ شاعر کی یا خواہ اس
اور حقیقی کا تصور چاہے کسی بھی شکل میں ہو ہمارا
فلاح خاص ہے۔ یہ ہماری عقیدت ہیں پہنچ
اور شعور ہندو ہو یا مسلمان کسی وقت
غافل نہ رہے۔ نہ ہمیں بچا سکے۔ ان خطاؤں
سکون بخشا ہے۔ بے راہ روی اور گمراہی
انجام کار خواہ کچھ ہی رہا ہو اور کیسا ہی وقتی
ہنسی حال اور مستقبل کو خوش گوار و پر بہار
میں یہ تخیل کتنا مستحکم اور باخبر ہے غافل

رباعی کے چاروں مصرعوں میں چوتھا
کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مصرع رباعی کا جز
سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا رواں دواں ہے کہ
حیثیت رکھتا ہے۔ مصیبت میں دعا زبان
ہوگی۔ کسی نے آپ کے ساتھ کچھ برائی کی
اس شعر کے ؎

گرچہ تیر انداز کماں ہی گر
اندکماں دار بیند اپنی خر

آپ خود اپنے دل کو تسلیم کیجئے۔ غافل!
کرتا ہے۔ خود ٹھوکر اس حاصل کیجئے۔ خدا
بندھا ہے بڑا معقول مصرع ہے
غافل! جو کرتا ہے خدا کر
صرف یہی مصرع خدا کے مسلک
کر دے گا۔ اور اس کے کمال فن کا بھی کیا
غافل! جو کرتا ہے خدا کر

شعلہ و شبنم دہلی

فروری ۱۹۶۴ء

زرِ سالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

جلد ۱۵
شمارہ ۲

فہرس

۱	حرفِ اول	صورِ اسرافیل	آبرو احسنی	۴
۲	غزالی مدہ میں ثابت گھنوی کی آب و تاب		مفتوں کوٹوی	۸
۳	گردِ راہ پہ ایک طائرانہ نظر		بدر جمالی	۱۱
۴	دو ہم قافیہ غزلیں		بہار صدیقی — گوہر کوٹوی	۱۵
۵	افکارِ نو		اقبال سوزی	۱۶
۶	"		آزاد شہباز نگری	۶
۶	غزل		مست فتح پوری	۶
۷	غزلیات		ماجد القادری - شبنم لوہاٹھیروی	۱۷
۶	"		شاہ صدیقی	۶
۸	جلال و جمال		لدھیانوی دراں - فنی گوالیاری	۱۸
"	"		سلام مچھلی شہری - انسر صہبائی	۶
"	"		فیض الحسن خیال - بقا نظامی	۶
۹	آدم		کرامید بنگلوری	۱۹
۱۰	شیطان	(مہاسان)	مترجمہ روشن چھیالوی	۲۲
۱۱	میرے محبوب		روشن آرا نیر	۲۴
۱۲	ایک آرزو ہزار غم		ظہیر کیفی امروہوی	۲۶
۱۳	طرحی مشاعرہ ۱۹۶۴ء	(صحت شعرائے کرام)	ناظم مشاعرہ حضرت مولانا آبرو احسنی گنوری	۲۷

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں۔ دہلی ۶
فون نمبر
۲۲۰۷۴۵

نگراں حصہ نظم و مشاعرہ
حضرت مولانا آبرو احسنی گنوری

ایڈیٹر
بمل جین

معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
فرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

باہتمام شری بمل پرشاد جین پرنٹر و پبلشر دہلی پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی سے شائع ہوا۔

حرف آغاز

آبرِ احسن

صورِ اسرافیل

سہ ماہی صورِ اسرافیل صفحات ۔ ۲ ۔ بانگ درا کا سائز کاغذ دبیز اور عمدہ ۔ کھائی چھپائی بہتر جلد سادہ مگر اس سادگی میں پرکاری ۔ قیمت درج نہیں ۔ اگر اس کی قیمت مقرر کی جائے تو کم از کم ۱ روپیہ مقرر کی جائے ۔ ملنے کا پتا ۔ صفی روحانی قمی بہائیان ۔ بہائی ہال اردو بازار روڈ ۔ کراچی ۱

یہ نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو دفتر رسالہ اشعۂ قدیم دربہ کلاں دہلی سے ۱۹۶۱ء میں بڑے تبصرہ بھیجا گیا ہے اس کے مصنف سید صفی روحانی قمی اڈیٹر بہائی میگزین بہائی سینٹر بہائی ہال ۱ ہیں۔

علی صاحب بہائی دین کے اور اسلامیات کے صاحب نظر عالم ہیں ۔ آپ کو ایک زبردست محقق کہا جائے تو بجا ہوگا آپ کی دو کتابیں رسالت الٰہیہ اور کتاب قیامت آپ کی علمی تحقیق کی شاہد ہیں۔ دین بہائی کے مخلص مبلغ ہیں اور ۴۰ سال سے خدمت تبلیغ انجام دے رہے ہیں۔ قدرت کی جانب سے آپ کو شاعرانہ دل و دماغ بھی مرحمت ہوا ہے اگرچہ مجموعہ کے بعض مقامات یہ پتا دیتے ہیں کہ آپ نے فن شاعری کے حصول میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا جو کچھ ہے وہ حسبیہ پر ٹکا ہے۔

اس کتابچے کے اشعار کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے دین بہائی کی حسب ضرورت موٹی موٹی باتیں سمجھا دی جائیں۔ تاکہ ناظرین اشعار کا مقصد و مفہوم سمجھ سکیں

بہائی حضرات اس کو ثابت کرتے ہیں کہ آدمی کی پیدائش سے اب تک اور آئندہ ہدایت کا سلسلہ جاری رہا اور جاری رہے گا ۔ اس ہدایت کے لئے خدا اپنے بندوں میں سے کسی کو چن لیتا ہے جو مخلوق گم راہ کو رستے پر لاکر خدا کے سامنے اس کا سر جھکا دیتا ہے۔ دنیا کی اصطلاح میں ان کو نبی پیغمبر رسول اور اوتار کہتے ہیں۔ وہ یہ بات فجوت سے پیش کرتے ہیں کہ ہر دین کی ایک مخصوص عمر ہوتی ہے جب وہ وقت ختم ہوتا ہے تو انسانوں کی حالت جلیت ضرورت اور حالات کے مطابق نئے پیغمبر کے ذریعہ نئی شریعت آجاتی ہے۔ اس لئے کہ پچھلی شریعت کے قانون اس زمانہ میں کام نہیں دے سکتے تمام اہل دین کا یہ مزاج رہا ہے کہ انھوں نے اپنے دین کو آخری دین سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ہر دین کی کتاب میں لکھا گیا ہے کہ نئے پیغمبر اور ایک خاص پیغمبر یا اوتار کی پیشین گوئی موجود ہوتی ہے اور جب وہ اپنے وقت پر آتا ہے تو چونکہ وہ لوگوں کے موہوم عقیدے کے مطابق نہیں ہوتا اس لئے لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں اور خدا کی نئی تجلی سے ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں ۔

بہائی حضرات اس کو ثابت کرتے ہیں کہ اب سے ایک سو بیس برس پہلے ایران میں حضرت باب اور حضرت بہاء اللہ امر ہدایت پر مامور کئے گئے ، جن کی واضح پیشین گوئیاں دید ، گیتا ۔ تری پیٹک (بدھ کی کتاب) اقدیرتا ، انجیل قرآن ۔ احادیث میں موجود ہیں اور اسلامی کتابوں میں ان کو مہدی اور عیسیٰ کی آمد کہا گیا ہے ۔ زرتشتی کتابوں میں شاہ بہرام کہا گیا ہے ۔ توریت میں رب الافواج اور الیاس نبی کے آنے کی پیشگوئی ہے اور مسیح کی بھی ۔ عیسائی مسیح کی دوبارہ آمد کے منتظر ہیں ۔ ہندو کلکی یا کلیوں اوتار کے منتظر ہیں ۔ بہائی دین بتاتا ہے کہ ان سب پیشین گوئیوں کے ٹھیک مقررہ وقت پر جب کہ دنیا میں بہ دینی عام ہو گئی تو حضرت باب اور حضرت بہاء اللہ ظاہر ہوئے ، کہا جاتا ہے کہ کلیگ کی مدت بروئے حساب ٹھیک اسی وقت ختم ہوئی جب حضرت باب نے اپنی داعویت کا اعلان کیا اور طلوع اس بڑے ہادی کا بشارت دی (خوش خبری) دینے والا تھا یا جو تمام پیشین گوئیوں کا مرکز ہے یعنی حضرت بہاء اللہ ۔

اب اس دور میں حضرات کی تعلیم کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔ تاکہ مقصد و مکتب سمجھ میں آسکے ۔ حضرت بہاء اللہ کا کہنا ہے کہ قیامت کے معنے کھڑے ہونے کے ہیں۔ زمین کے گرنے یا پھٹنے کے نہیں۔ پس جب کوئی نیا اصول یا ضرورت وقت کے مطابق دنیا میں آتا ہے تو اس کے کام کا زمانہ قیامت کہا جاتا ہے۔ جس قیامت کا بھی ہر دین کے علماء بتاتے آئے ہیں وہ کچھ نہیں ہے یہ بات کو سب کی دینی کتابوں سے ثابت کیا ہے۔ پس اور حضرت بہاء اللہ کا امر اللہ پر مامور ہونا ہی قیامت اب وہ قیامت نہیں ہوگی جس کے سب لوگ منتظر اس دین کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے ۔

(۱) اس دین میں ہر طرح کی انسانی جنگ کی قطعاً ممانعت ہے جہاد ، مذہبی تعصب ، فساد سب بند ۔ تمام انسان بھائی بھائی کی طرح رہنا ہے ۔

(۲) تمام دین کی دنیا میں سب ایک ہیں اپنے اپنے وقت پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ۔ اس لئے سچے ہیں ، کسی کو نہ غلط کہو نہ برا جانو ۔

(۳) ہر دین وقت اور انسانوں کی حالت کے مطابق آتے رہیں گے ۔

(۴) دین حق ، سائنس اور ضرورت کا ساتھ دے ۔

(۵) دین محبت کا سبب ہونا چاہئے ۔ اس لئے دنیا کے سبھی انسان بھائی ہیں ۔ ان میں کوئی ناپاک نہیں ۔ ناپاکی اضافی ہے ۔

(۳) پوری دنیا میں صبح شام جگہ جگہ میں صلح خون ریزش کرنی چاہئے۔

(۴) مرد عورت کے حقوق برابر ہیں۔ پردہ توڑ دیا گیا۔ ہر عمر کی ہر دین میں شادی جائز ہے۔

(۵) جو بہائی جس حکومت میں بھی رہتا ہو اس کے قانون کی پوری پابندی و وفاداری سے کرے اور امور سیاست میں دخالت نہ کرے۔

غرض ان نئی باتوں میں یہی کتاب سے سابقہ پڑتا ہے یہ شریعت مکمل ہے۔ اس کا لٹریچر دلچسپ ہے۔ ۱۰ زبانوں میں لٹریچر شائع ہو چکا ہے۔ ۳۰ سے زیادہ ملکوں میں یہ دین پھیل چکا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ جاپان، ہندستان میں بھی تقریباً ۲۰ ہزار ہندو سکھ، مسلمان، عیسائی اس دین کو قبول کر چکے ہیں۔ اس دین کی تاریخ عبرت خیز ہے پر جو مظالم اس دین کے بانیوں پر ہوئے ان کی مثال کسی دین کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر ان شدائد پر بھی یہ دین اتنی ترقی کر گیا۔ یہ بات بھی حیرت انگیز ہے۔ اللہ ابہیٰ اس دین کا نعرہ ہے اور یا بہاء الابہیٰ کلمہ۔ بہا کے معنی روشنی کے ہیں اور ابہیٰ کے بھی۔ اللہ ابہیٰ کے معنی روشن و نورانی خدا کے ہیں۔ جس کو اسم اعظم سمجھا جاتا ہے۔

اس کتاب کا نام صور اسرافیل اسی روایت سے لکھا ہے کہ قیامت آئے گی اور اسرافیل نے صور پھونک دیا وہی صور جس کا دینی کتب میں ذکر ہے یعنی حضرت بہاء اللہ کی جنت

پہلی نظم اسم اعظم کے عنوان سے نہایت مترنم بحر میں لکھی گئی ہے جس میں اللہ ابہیٰ کے اوصاف ہیں۔

جانِ جہاں ہے رازِ نہاں ہے
روحِ رواں ہے نورِ جہاں ہے
آوازِ جاں ہے اللہ ابہیٰ
ہر دل زباں ہے اللہ ابہیٰ
صدقِ مجسم قولِ مسلّم
اظہارِ اتم ہو اسمِ اعظم
نغمۂ مکرم اللہ ابہیٰ

ہے اسم اعظم اللہ ابہیٰ

نظم کا انداز ہے کہ ہر دو اشعار کا ایک ٹیک بند ہے اور ہر بند کے قافیے الگ الگ ہیں۔

بشارت میں سعادت کو نداے یوم یوم ظہور کی طرف سے یوں بیان کیا ہے۔

وہ مقصودِ اعظم اتحادِ نوعِ انساں ہے
جس کے لئے پیغامِ دعوت لے کے آیا ہوں
تعصب جس کو کہتے ہیں وہی دوزخ ہے دنیا میں
جس سے نفرت لے کے آیا ہوں جس سے بچانے کے آیا ہوں
مٹا کر تفرقے سارے جہاں کو ایک کرتا ہوں
جس دعوت لے کے آیا ہوں اخوت لے کے آیا ہوں

گویا ندائے یوم ظہور اس دین کا مقصد بیان کر رہی ہے کہ اس دین کا مقصد تمام انسانوں میں اتحاد کرانا ہے ہر قوم کو ایک قوم بنا دینا ہے۔ تعصب کی آگ جو دل و دماغ میں دہکتی ہوا کرتی ہے اور نار جہنم سے کم نہیں اس کو بجھانا مقصود ہے اور محبت کی جنت میں داخل کر دینا ہے۔ باہمی مذہبی تفرقہ مٹا کر، ہر انسان کو بھائی بھائی بنا کر ایک کر دینا ہے

یوں بھی جانتے ہیں کہ اتحاد میں جو خوشی، راحت، اطمینان نصیب ہوتا ہے عداوت اور دوئی میں اس کے برعکس دل و دماغ کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ بے شک آج ہر طرف اتحاد کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور سیاسی طور پر اس کی بیحد کوششیں بھی انفرادی طور پر ہو رہی ہیں لیکن جب یہ سیاسی دین بن کر دلوں پر مسلط ہو جائے تو اس میں بیحد مضبوطی آ جاتی ہے۔ ورنہ سیاسی اتحاد کی تو حسب موقع شکست و ریخت ہو جاتی ہے

نغمۂ حکومت الٰہی کے عنوان سے بھی پہلی بلکش بحر میں ایک نظم ہے اس میں بھی اتحاد بنی نوع کے سلسلہ میں یہ بند قابل قدر ہے۔

سب ایک ہوں گے اب دل کے باہم
جنت بنے گا یہ سارا عالم
ہو کر رہیں گے سب شاد و خرم

سب کو ملا دو یہ اسم اعظم

اللہ ابہیٰ اللہ ابہیٰ

بات وہی ہے جس کا ذکر سلسلہ بالا میں کیا گیا۔ اتحاد باہمی کے لئے نفرت و تعصب اور عبرت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر ہر انسان کو دوسرے کسی عقیدے کسی دین کے انسان سے محبت اور محبت بھی بھائی سمجھ کر کرنا اس دین کا مقصد ظاہر معلوم ہوتا ہے اور اس لحاظ سے یہ دین اور اس دین کے ماننے والے قابل قدر ہو جاتے ہیں

ایک نظم ہے "رسالت الٰہیہ" کے عنوان سے، جس میں بیان کیا گیا ہے رسالت (دنیا میں رسولوں یا اوتاروں) کو انسان کی ہدایت کے لئے اور گمراہی سے بچانے کے لئے ہر دور میں بھیجا گیا اور یہ سلسلہ کبھی بند نہ ہوگا کیوں کہ رسول ایسے وقت آتا ہے جب دنیا ترقی کر جاتی ہے عقل انسانی، ضروریات انسانی اور ماحول بدل جاتا ہے اور پچھلی شریعت کے قوانین اس دور میں نہیں چل سکتے۔ تو نیا قانون لے کر رسول یا اوتار آتے ہیں اور انسانوں کی وہ نئی مذہبی وقتیں جو دین سابق کی پابندی کرنے کی حالت میں پیش آتی ہیں۔ سب دور ہو جاتی ہیں اور چونکہ دنیا برابر آگے بڑھ رہی ہے، انسان کی ضرورتیں، حالات، ماحول بھی بدل رہے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ نئی شریعت آنی بند ہو جائے اور ایک جوان انسان کو اس پر مجبور کیا جائے کہ اس کو وہی لباس پہننا ہوگا جو اس نے دس برس کی عمر میں پہنا تھا۔ ہاں اگر دنیا ایک حالت پر قائم ہو جاتی تو پھر دین بھی ایک ہی کافی ہوتا۔ یہ ہے دلیل بہائی حضرات کی نئی رسالت کے ثبوت میں اور اسی عقیدہ کی تائید میں وہ ہر دین کی مذہبی یا آسمانی کتابوں سے ثابت بھی کرتے ہیں کہ رسالت کے بند ہونے کا کسی کتاب میں ذکر نہیں۔ بلکہ [illegible] رہنے کا بار بار ذکر ہر کتاب میں موجود ہے

کیا اللہ نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری
بنایا ان کو دنیا میں دلیل [illegible]
نہ بھیجے گر شاہ جی کیا [illegible]

عروج کر دیا سارے جہان میں حق پرستی کو
یہ میرے بار بار اگر ہی اعلان کرتے ہیں
کہ ہم جاری خدائے پاک کا فرمان کرتے ہیں

(۱) خدا جو بات کہتا ہے کبھی وہ ٹل نہیں سکتی
خدا کے سامنے ہرگز کسی کی چل نہیں سکتی

(۲) نبوت ختم ہے لیکن رسالت اب بھی جاری ہے
پرانے حکم بدلے ہیں حکومت اب بھی جاری ہے

(۳) الٰہی کیا ہوا اقوام کی فہم و فراست کو
کہ وہ مقبول سمجھتی ہے ترے دست فضیلت کو

نمبر ۱ تا ۳ - کے بارے میں بہائی حضرات کا خیال اور ظاہر کر دینا مناسب ہے۔ یہ بات تو پہلے ہی ہے خدا جب بھی کسی شریعت کے ذریعے پرانے احکام منسوخ کر کے بھیجتا ہے تو لاکھوں مخالفتوں، عداوتوں، رکاوٹوں کے باوجود احکام اسی دن تمام دنیا میں پھیل ہی جاتے ہیں اور مخالفتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ بلکہ مخالفوں کو خدا مٹا کر ہمیشگی کی لعنت ان کے مقدر میں لکھ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ابولہب اور ابوجہل وغیرہ جو مر مٹے۔ دین پھیل کر رہا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جھوٹے نبی یا رسول جتنے بھی ظاہر ہوئے ان کا دین ان کے سامنے ہی یا ان کے مرتے ہی مر کر رہ گیا۔ جیسے اکبر کا دین الٰہی۔

بہائی حضرات کہتے ہیں کہ نبوت ختم ہو گئی رسالت ختم نہیں ہو سکتی وہ سمجھتے ہیں کہ نبی یا رسول کے معنی خبر دینے والا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ موجودہ عہد حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک کا دور نبوت تھا یعنی اس دور کے تمام پیغمبر یہ خبر دینے پر متعین تھے کہ اب دور الٰہی۔ یوم الرب۔ یوم المعبود۔ یوم القیم یوم الدین (قرآن میں اس دور کے سات نام دیئے ہیں)۔ آنے والا ہے۔ اس کے استقبال کو سب تیار رہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ دور آ گیا جس کی خبر کے لئے خدا نے خبر دینے کو متعین کیا تھا۔ لہٰذا حضرت محمد ﷺ آخری نبی ہوئے۔ مگر رسالت اللہ جیز ہے وہ جاری رہی اور جاری رہے گی۔ اسی لئے الٰہی کو ست یگ کہتے ہیں جو کہا جاتا ہے کلیگ کے ختم ہونے کے بعد شروع ہو چکا۔ اسلامی علماء کو بھی بہائی حضرات کے عقیدہ ختم نبوت کی تاویل کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں معاملہ کو سمجھنا سمجھانا چاہیے۔ اگرچہ سمجھنا سمجھانا کبھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ اسی سلسلہ میں علی صاحب کی غزل کا ایک رواں چست اور اچھا شعر سن لیجئے۔

بہت کہتے رہے غافل رسالت آ نہیں سکتی
مگر فرمانِ حق ہر بار آیا اور ضرور آیا

اگر علی صاحب پہلے مصرع کو یوں کر دیتے تو بات واضح اور اہم سابقہ سے مطابق ہو جاتی ؎

کہا ہر ایک امت نے رسالت آ نہیں سکتی الخ

اور بہائی کے عزائم سے ایک شعر سنئے ؎

خدا کے حکم سے دنیا میں پھر دین جدید آیا
نئی تنزیل کی صورت میں قرآن مجید آیا

دوسرے مصرع میں قرآن کا نئی شکل میں نازل ہونے کا بہائی حضرات یہ ثبوت دیتے ہیں کہ جب کسی شریعت کی عمر ختم ہوتی ہے اور نئی شریعت نیا پیغمبر لاتا ہے تو سابق شریعت کے بہت سے احکام نقائص علی حالہ باقی رکھے جاتے ہیں صرف وہ احکام بدل دیئے جاتے ہیں جن کی ضرورت انسانی کے لحاظ سے بدلنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے چنانچہ قرآن پر جو یہ اعتراض ہے یہودیوں اور ہندوؤں کا یہ اعتراض ہے کہ قرآن میں کچھ باتیں اور احکام توریت سے، کچھ انجیل سے کچھ ویدوں اور گیتا سے لے کر جمع کر دیئے ہیں اور اس میں کچھ نہیں۔ مگر بات یہ نہیں ہے۔ ہر نئی شریعت کی کتاب میں پرانی شریعتوں کی وہ باتیں باقی رہتی ہی چاہئیں جن کی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ہر کتاب خدا ہی نے نازل کی ہے۔ بات منسوخ تو وہ کی جائے گی جس کی بنا دوں کو ضرورت نہ رہی ہو۔ یا بندے جس کی پابندی نہ کر سکیں۔

اس تمہید کے سلسلے میں جو علی صاحب نے رقم کیا قرآن کی دو آیتوں سے بھی ثبوت دیئے ہیں۔ وہ آیت یوں ہے :۔ "اور جب ہم اس قرآن کو تمہارے (فائدہ کی) بنا دیں گے" وغیرہ۔ اس نظم کے مقطع شعر اور مقطع سے جو اتحاد کے ثبوت میں لکھے گئے ہیں۔

خدا کے جملہ پیغمبر ہیں اک پیغام کے حامل
کہ امر حق پہ سب بندوں کو ہونا چاہیئے عامل
مساوات بشر کا دور آ پہنچا ہے عالم میں
نئی تنظیم سے اک حشر برپا ہے عالم میں
یہ جتنی مختلف قومیں ہیں اصلاً قوم واحد ہیں
یہ سارے ابن آدم ہیں یہ نسلاً قوم واحد ہیں
جہاں میں جتنے آدم زاد ہیں سب بھائی بھائی ہیں
مگر اس بات کو جو مانتے ہیں وہ بہائی ہیں

مجھے آخر شعر پر کچھ علی صاحب سے عرض کرنا ہے جہاں تک میرے مطالعہ ادیان کا تعلق ہے۔ میں نے ہر دین کے احکام کو دنیا بشر کی بھلائی کے لئے مستند پایا۔ خدا کہ اپنے سب بندے پیارے ہیں۔ کسی دین میں یہ نہیں کہ تم دوسرے دین والوں سے اس جرم میں کہ وہ تمہارے دین کو نہیں مانتے ستاؤ یا غیر سمجھو۔ پھر یہ کہنا کہ اس بات کو صرف بہائی ہی مانتے ہیں کچھ صحیح نہیں معلوم ہوا ہاں یہ بات ماننی پڑے گی کہ بہائی دین میں شرعی حکم کے طور پر سب کو برابر کر دیا ہے اور کوئی فرق نہیں رکھا۔ جنگ اور افتراق باہمی کو اس حد تک مٹا دیا ہے کہ کوئی بہائی کسی پر حملہ تو کر ہی نہیں سکتا اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو وہ صرف دفاع کر سکتا ہے۔

ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "دور چلتا ہے" اس کے چند شعر سن لیجئے۔ پھر اپنی ناقص معلومات کے روشنی تعبیر کروں گا۔

زمانے میں جب آتے ہیں خدا کے پاک پیغمبر
خدائی صور پھنکتا ہے ندا کا دور چلتا ہے
بپا ہوتا ہے محشر فیصلے قوموں کے ہوتے ہیں
جزا کا دور چلتا ہے سزا کا دور چلتا ہے
نظام دہر میں ہر قوم کا اک وقت ہوتا ہے
بقا جب ختم ہوتی ہے فنا کا دور چلتا ہے

اسی دنیا میں لاکھوں بار یوم الدین آتا ہے
نئی شکلیں سے دین خدا کا دور چلتا ہے

تیادت کی جو اصطلاحیں زبور، توریت، انجیل
ان میں ہیں قریب قریب یکساں ہیں۔ بہائی حضرات کا
کہ یہ آیات متشابہات ہیں۔ جن کے معنی آنے والا
(سپیشر سمجھا جاتا ہے) اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا
ہیں خدائی صفت پھیلنے کے وہ معنی نہیں ہیں کہ اسرافیل
کی قسم کا صور پھونکیں گے تو آدمی مر جائیں گے، آسمان
پھٹ پڑے گا وغیرہ۔ یہ صور صرف نئے پیغمبر کا اپنی رسالت
کا اور ہونا اور اعلان کرنا ہے، حشر کے معنی جمع ہونے کے
ہیں جیسے رسول نے بھی فرمایا تھا "انا حاشر" میں
حشر کرنے والا ہوں۔ حضرت عیسیٰ نے بھی فرمایا تھا میں موت
کے بعد زندگی ہوں۔ میں قیامت ہوں۔ جن کتنے پیغمبر
بھیجے تھے وہ اپنے ایمان کے ہر قوم و ملت کے افراد جمع
ہوتے ہیں یعنی دین قبول کر لیتے ہیں۔ یہی حشر ہے اور یہی
ان کے فیصلے اور جزا و سزا ہے کہ جس نے نئے دین کو
قبول کر لیا وہ رحمت خدا کی جنت میں اگر چہ نئے عمل پائے
اور جو انحراف کرے گا، وہ ناخوشی مولا کی آگ کا ایندھن
بنے گا۔

بہائی حضرات بڑی پختہ دلیلوں سے یہ بات کہا کرتے
ہیں کہ ہر دین کی ایک مدت ہوتی ہے جو اس دین کی کتاب میں
درج ہوتی ہے اور مدت ختم ہوتے ہی نیا دین آجاتا ہے، اگر
یہ بات نہیں ہے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا آنا کیا معنی
رکھتا ہے۔ غرض اسی طرح لاکھوں بار یہ دین کا دن، یعنی
پیغمبر کے اعلان پیغمبری کا دن آچکا ہے اور یہ خدا کی سنت
ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ یوم الدین آتا بھی
رہے گا۔

فنی حیثیت سے اس نظم کے کئی اشعار ہیں، جن کی بنا
دلیلوں کا نقص پیدا ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ دور نبوت کے بعد دور الٰہی
کھانے کی بشارت ہے۔ اس سلسلہ میں بھی صفحہ فرماتے ہیں

ہوا دور نبوت ختم یوم اللہ آپہنچا
جو سب ادیان کا موعود ہے وہ یوم دین آیا

نبوت اور بشارت کا زمانہ جب بیتا آخر
ہمارے روبرو یوم قیامت ہو گیا ظاہر

بھی صاحب نے تین شعروں میں ایک تاریخی حادثہ
مسلسل بیان کرتے ہیں۔ واقعی اس میں بڑی صداقت اور
حقیقت ہے اور وہ یہ کہ جب بھی نئے دین کا آفتاب طلوع
ہوا تو سب سے بڑی مخالفت بڑے لوگوں نے کی۔ بڑے لوگوں
میں ارکان حکومت ہوتے ہیں جو پیغمبر کو یہ الزام دیتے ہیں
کہ اس طرح لوگوں کو بہکا کر ہمارا حکومت کو
معطل کرے گا۔ بغاوتیں کرائے گا اور خود بادشاہ بنے گا
دوسرے بڑے لوگ دین کے عالم ہوتے ہیں جن کو نئے دین سے
یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو جاہل افراد پر بیٹھ کر
اپنا کاروبار چلا رہے ہیں اور مرغ بریانی، پلاؤ، حلوہ
مفت کے اڑا رہے ہیں۔ یہ ہماری خدائی چھن جائے گی، اور
ہمیں کما کر کھلانے والے ہمیں دھتکار دیں گے اور ہم ایسے
یتیم ہو کر رہ جائیں گے جنھیں کوئی یتیم خانہ بھی قبول نہ کریگا

حضرت عیسیٰ کو انھیں دو تین قسم کے بڑے لوگوں نے
سولی پر چڑھایا۔ حضرت باب کو انھیں بڑے لوگوں کی عادت
قدیم نے مختلف جیل خانوں میں رکھا اور آخر وہ گولیوں
کا نشانہ بنایا۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر
برسائے، کوڑے ڈالے، تذلیل کی۔ بائیکاٹ کیا اور آخر
گھر سے نکال کر دم لیا۔ وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

حضرت بہاء اللہ کی اتنی بڑی جائداد کو صرف ایک علاقہ
میں ۱۰۰ موضعے تھے سب ضبط کئے۔ ۴۰ سال تک اہل و عیال
کے ایسے ایسے گھناؤنے اور ڈراؤنے تیز آزار دہ جیل خانوں
میں رکھا جہاں قاتل اور ڈاکو رکھے جاتے تھے۔ یہ سب ان
بڑے آدمیوں یعنی ارکان حکومت، ارباب نخوت اور علمائے
عظام کے کارنامے ہیں۔ مگر نتیجہ میں ہمیشہ یہی ہوا کہ
یہ عزت طاقت اور سیاست کے بندے ہمیشہ کی ذلت و
لعنت میں مبتلا کر دیئے گئے اور ان کا نام و نشان مٹ کر رہا

ان کی نسلیں قطع ہو گئیں۔ ہے کوئی جواب کے بڑے بڑے
سرداروں اور عالموں اور جہالت کا جنھوں نے رسولوں
کہتا یا سنا کوئی ان کا نام تک سے لے سکے، یا کوئی
کہہ سکے کہ میرا سلسلہ نسب ابوجہل، ابولہب یا یزید
ملا عنہ سے ملتا ہے۔ ہاں اس دور کے ذلیل لوگ جیسے
حضرت بلال، حضرت سلمان فارسی آج کیا ہیں یہ سوچنے
کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہوتا آرہا ہے۔ شیر علی صاحب کے
وہ شعر سن لیجئے۔

ایسوں اور سرایہ پرستوں کی یہ حالت ہے
ہر اک معزول ہے دنیا میں اور محو بطالت ہے
بڑے لوگوں کو روکا دین سے دنیائے فانی نے
فنا کے جال میں ڈالا انھیں اشیائے فانی نے
ظہور حق جو دیکھا وہ گئے محروم عرفاں سے
انھیں دنیا میں کچھ مطلب نہیں ہے دین و ایماں سے

ایک نظم ہے طلوع بہاء اللہ۔ بہائی حضرات کا
دعویٰ ہے کہ اس ظہور یعنی ظہور حضرت باب و حضرت
بہاء اللہ کا تمام دنیوں میں تذکرہ ہے اور سب دینوں
میں جو آنے والے کی پیشین گوئیاں ہیں وہ یہی حضرت بہاء اللہ
ہیں جو دور یوم الرب ہیں ٹھیک مقررہ وقت پر آئے ان کا
دعویٰ ہے کہ رسول مقبول کی احادیث اور قرآن کی سیکڑوں
آیات میں ان کی بشارت، علامتیں، نشانیاں اور تصدیقیں
تائید موجود ہے اور وہ دعویٰ اس طرح ہے۔

محمد مصطفےٰ اس دن کی خوش خبری سناتے تھے
اسی کا منتظر مشتاق ہر اک کو بناتے تھے
اسی دن کی بشارت میں طرب انگیز قرآں ہے
اسی جلوے کے اعلانات سے لبریز قرآں ہے
اسی دن کے لئے انجیل بھی مژدے سناتی تھی
زبور حضرت داؤد اس کے گیت گاتی تھی

یہ ظاہر بات ہے کہ نظموں میں تو کسی بات کی تفصیل
اشارات ہی کئے جا سکتے ہیں مشروح معلومات تو بہائی
لٹریچر دیکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ ان دعووں میں

(باقی صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

عزائی ادب میں ثابت اور اب باب

مولوی فضل حسین ثابت کھنوی عزائی اصناف سخن میں دبیر سے متاثر تھے، یعنی مرثیہ میں کلام میں انیس سے مستفید تھے۔ غزل گوئی میں حضرت اسیر سے تلمذ حاصل تھا۔ دونوں حیثیتوں سے ادب میں بلند مقام کے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے مشہور ہیں ان کے یہاں عادات و اشغال بڑی صحت کے ساتھ اور الفاظ و مضامین بڑی نزاکت و متانت کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ ثابت مرحوم میں یہ خوبی اور اتم موجود تھی ہے۔ لکھنؤ کی شستہ و شائستہ زبان بڑی تاؤ دانی اور جستگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک شعر میں دعوی بھی کیا ہے۔

ہم حسن معنی سے ملیح بیان ہے
جو سنتے ہو اردو ہماری زبان ہے

نقادوں کی روایت بھی یہ رہتے ہیں اور معنی آفرینی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ سلام "ایسی نازک صنف میں انھوں نے بڑے کمالات دکھائے ہیں۔ اس صنف کا ہر شعر ادب و احترام کا حامل ہوتا ہے۔ کیوں کہ جذبات عقیدت کی نسبت الوہیت سے ہوتی ہے اور یہاں ذرا بھی فروگزاشت کی گنجائش نہیں۔ ثابت مرحوم کے یہاں یہ صنف "ادب" کے دونوں معنوں سے بہرہ ور ہے۔ ان کے سلام میں منقبت و احتیاط بھی ہے اور نوع نوع کے بیان بھی۔ جذبات و فکر مضامین اور انداز خیال میں زبان و بیان کی لطافتیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ جناب حامد فرخی آسمان پر لیٹے ہوئے ہیں۔ نہ تکیہ، نہ بستر جناب ثابت نے اس واقعہ کو کس انداز سے پیش کیا ہے خاک سے اٹھا کر بلندی افلاک تک پہنچا دیا ہے مضمون آفرینی کے ساتھ روایت لفظی بھی نظروں میں رکھنے کے قابل ہے

خاک پر لیٹے تھے حامد قید میں۔ کہتی تھی ماں
ہو ترا بالیں خاکساروں کی یہ بستر چاہئے۔

خاک پر لیٹنے کے لئے خاکسار کی روایت ہی کافی تھی بالیں خاکساری کی نسبت نے اس میں بڑی لطافت ساتھ ہی بڑی لطافت پیدا کر دی۔ ماں کی زبان سے یہ الفاظ کہلوانا بھی اس موقع پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک شعر اور قابل توجہ ہے ؎

خدا سے دور ہوتے ۔ فرد حق سے جدا ہم ۔۔۔
علی سے سیکھتے کھانا شبیر کا۔

"نان شبینہ" پر "مادات حیدری جو نا" اقبال نے ایک خاص رنگ میں کہا ہے۔ یہاں اس تابع جوئی" کی فضیلت دوسرے پیرایہ میں ہے۔ ثابت مرحوم نے اسے قرص آفتاب کی طرح مشہور کر دیا ہے۔ یہ مضمون آفرینی شاعر کی عقیدت و محبت کے ساتھ اس کے کمال فن کی بھی ترجمان ہے۔ مضمون آفرینی اس شعر میں بھی ملاحظہ کیجئے۔

ہوئے ہمراہ جا کر کاتب اعمال بھی زائد
فرشتے کے بھی سر پر ہو اضافہ! احسان تمہارا

کیا بات کہی ہے۔ کس انداز سے کہی ہے۔ انکار و قبول کی جرأت تو نہیں لیکن اس کے نتیجے کا اظہار جس پر خلوص عقیدت اور حسن پر وقار ادبیت سے کیا گیا ہے وہ فن کار کی عظمت شناسی و قدر دانی پر بھی مجبور کرتی ہے منقبتیہ استدلال باب کو اس شعر میں بھی نظر آئے گا۔

ہے بوتراب ساقی، کوثر علی کا نام
اس وجہ سے ہے آبرو مے طہور کی

نقلی روایتیں جو اس شعر کی ظاہری زینتیں ہیں وہ ارباب نظر سے ہرگز مخفی نہیں وہ مسکتیں معنوی ربط کے لئے یہ شعر بھی احتفاظ کا باعث ہوگا۔ لفظی رکھ رکھاؤ ظاہری لطافت اندوزی میں اضافہ کرتی ہے۔

زمیں باطنیت فترت ہے سرشت تری!
مجھے نثار نہ دے، بوتراب دیکھتے ہیں

یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وہ کعبہ ہے دل جس میں جائے علی ہو
اگر حب حیدر نہیں تو کھنڈر ہے

کعبہ ظرف مکانی ہے۔ دل کعبہ کہلاتا ہے۔ کعبہ بو علی ہے۔ کھنڈر بھی مکان و مقام سے نسبت رکھتا ہے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ اس شعر کی یہ ظاہری خوبیاں کتنی پر جستہ و برمحل ہیں۔

کعبہ سے بخت کو بڑھ کر بتایا جا رہا ہے۔ استدلال دیکھئے خدا ستدلال دیکھئے کہ مجال انکار نہیں ؎

تجھ میں ہے اب وہ نور جو پہلے حرم میں تھا
کعبے سے اے نجف! تجھے بہتر سمجھتا ہوں

عالمانہ و فلسفیانہ نکات بیان ہوئے ہیں، ادبی شگفتگی برقرار ہے، نقطوں کی برجستگی اپنی سب دکھا رہی ہے ؎

حق ہے علی کے ساتھ، علی حق کے ساتھ ہے
الحق کہ حق کے اوج سے یہ ظل نہیں بلند

حق کی حق داری پورے طور پر کی گئی ہے۔ علی کی حق پرستی کی دلیل ہے حق صفت معنوں میں استعمال ہوا ہے "حق" پر اس شعر میں بھی نظر رہنا چاہئے۔

سجدے میں سوئے تو فرق حیدر جو خم ہے سر
حقا کہ حق کو جانب حیدر سجدت بود

سبحان اللہ! استدلال اس انداز کا ہے کہ

کی ادائیگی کا حق ادا کر رہا ہے۔

وہ واقعہ سے داخلی جہت ہی اندرونی حصہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اب اس واقعہ کو کہاں منطبق کیا ہے اور کیا نتیجہ نکالا ہے۔ دیکھئے دلیل کتنی مکمل ہے کہ دعویٰ کا ابطال ممکن نہیں ہے۔

علی سے جو نہ ملا کعبہ و بتخانہ میں احمد تک
بجز علی، کوئی علم نبی کا باب نہ تھا

واقعہ ہے کہ دوش رسول پر چڑھ کر حضرت علی نے کعبہ کے اصنام گرائے۔ اب حقیقت شعریت کس شان و شوکت سے نمودار ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

ایک پہلو دوش احمد پہ علی ہیں، شور ہے
آہ امامت سے نبوت مل گئی

دوسرا پہلو علی کو دوش احمد پر فرشتے دیکھ کر بولے
رکاب کے سر پہ صبح صادق کا ستارا ہے

تیسرا پہلو دوش احمد پہ قدم جب کہ علی کا دیکھا
شور تھا فقد کے دو گڑھوں کو کب کا جا دیکھا

چوتھا پہلو بنائے تھے خلیل گھر سے بت اس کی جزا یہ تھی
نہ کعبہ میں معراج امیر المومنین ہوتی

پانچواں پہلو ہوئی کعبہ میں جو معراج علی کو حاصل
دل حساد شکستہ ہوئے اصنام کے ساتھ

"شکستہ" سے دل بھی وابستہ ہیں، اصنام بھی۔ یہ شعر دیکھئے ؎

وصف علی جو کہتا ہوں کٹ جاتے ہیں حسود
اپنے لبوں کو تیغ دو پیکر سمجھتا ہوں

لبوں کا تیغ دو پیکر ہونا ظاہر ہے "کرچ جانے" نے اور لطف دکھایا ہے۔ سناٹا دے گیا ہے اور تیغ کا فعل بھی "جانشیں" نے اس شعر میں، شاعر کی حسیت و قابلیت کو کیا قائم مقامی کی ہے ؎

مطمئن ہیں فرش احمد پہ شب ہجرت علی
جانشین حضرت خیر الانام ایسا تو ہو

وہ بت تھی خانہ کعبہ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے لفظ "خانہ زاد" اور "حق خانہ زادی" کتنا پر مست اور برجستہ ہے ؎

حق خانہ زادی ہے ازل سے، حق یہ اس کا ہے
بتوں سے پاک کر دے گا علی، اللہ کے گھر کو

شعر مندرجہ ذیل میں "عصا" نے مضمون کو کتنا سنبھالا ہے، کتنا سنوارا ہے۔ حضرت موسیٰ سے تخاطب کتنا پر لطف ہے ؎

گرتے گرتے تھم گیا انسان کہا جب یا علی
دیکھ لے موسیٰ عصا، نام خدا ایسا تو ہو

موسیٰ کے پاس ہی عصا، زبان کے لحاظ سے بھی فرد ہے اور معنوی حیثیت سے بھی فرد واد "نام خدا" کی بہار اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ یہی بہار اس شعر میں بھی دیکھئے

خانہ حق میں ہوئے پیدا علی، نام خدا
خوبصورت ہو گئیں ایسا، تو نام ایسا تو ہو

خانہ اور نعمیں کی مناسبت دیکھئے دونوں ظاہر و معنوی ربط رکھتے ہیں۔ یہ شعر بھی تو دیکھا جا سکتا ہے

بلا صراط پہ مانند برق ہم ثابت
زباں سے نام شہ ذوالفقار لیکے چلے

تلوار کی تیزی اور تلوار کی دھار پل صراط ان دونوں اوصاف کا حامل ہے۔ اس لئے نام شہ ذوالفقار بڑا موزوں اور حسب حال ہے۔ تلوار کی معنوی آب و تاب کے ساتھ برق کی چمک دمک جلوہ فگن ہے اس سے آپ کی نظر روشن ہو گئیں نہ لے کے چلے۔ بھی دیکھئے اور لفظ ثابت کے معنوں پر بھی غور کیجئے۔ برق کی چمک پیش نظر ہے تو ثابت کو ثابت و سیارہ کے ساتھ سمجھنا پڑے گا اور اس کی یہ روشنی وہاں سے پرتو فگن کی جائے گی۔

میں کچھ صنعت حسن تعلیل کی خوبصورتیاں بھی دکھائے دیتا چلوں۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وہ زبانیں دکھتی تھی کہنے کو یوں تو ذوالفقار
رعب حیدر سے مگر یارا نہ تھا تقریر کا

بات میں سے بات پیدا کرنا دلیل کی خصوصیت ہے۔ ثابت مرقوم" کہنے کو "کیا برمحل ہے کہ کہنے والے کی ضمیر زبان حال سے بول اٹھتی ہے۔ اچھا کچھ اشعار اور اس صنعت کے اسی خصوصیت کے ؎

کہہ رہے ہیں سیہ پوش فرمانبرداری حسین سے
گھر اب کی بار نہ جائے گا شہ کے غم سے

چمن میں اے سلامی ماتم شہ آشکارا ہے
کھلے ہیں یاں شقائق کے گریباں گل کا پارا ہے

تجنیس و استعارہ کی آب و تاب ان اشعار میں نظروں کو خیرہ کئے دے رہی ہے ؎

یوں علی رہتے تھے ہمراہ نبی کے ہر دم
فتح جیسے علم لشکر اسلام کے ساتھ

شہ نشیں میں تعزیہ، مداحاں میں ناقل میں مطلب
نقطۂ جنات نجری تقتضا الانسان ہے

قرآں کو ہمسری ہے رخ بوتراب سے
منہ چڑا رہے ہے کتاب کتاب سے

فہم حسین میں رہا تو بھر بھی شہ شہید
ظہور برقعی ہوگا اگر سحاب آئے

کہا یہ ماں نے کہ اکبر جیئں لہو سے ہے لال
دکھایا ماتھے پہ سہرا یہ میرے لال نہ پھولے

ہماری چشم کے تارے نہ گر رہا کوئی
ہزار بار برستا جا سحاب کربلا

پچھلے دو شعروں میں استعارہ کی جلوہ فرمائی دیکھئے اور لطف لیجئے کی چیزیں ہیں۔ تیسرے شعر آپ کا مضمون ہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکے ہیں یہاں بھی اس سے لطف لیجئے ؎

علی کو دوش احمد پر فرشتے دیکھ کر بولے
یہ کامل کے سر پر صبح صادق کا ستارا ہے

فرق مراتب ملاحظہ کیجئے۔ پانچویں شعر میں لفظ "ہے" جو سر کامل ہے وہ سر کامل ہے، جو ستارا ہے وہ ستارا ہے۔

فرق مراتب اور لطف استعارہ کے لئے لفظ "ہے"

بھی دیکھتے چلئے ؎

بہکا ہوا کہ تحفہ گویا صنوبر شاہ
قدرہ نظر نہ پھیر سکا آفتاب سے

(۲) دشتِ احمد پہ علی نے جو شہ رکھا
شورِ تقاضہ کے دو ٹکڑوں کو یک جا کیا

(۳) عرشِ احمد پہ علی نے جو شہ رکھا
آج امامت سے نبوت مل گئی

مضمون کی طوالت کا خوف غالب ہے۔ مراۃ النظیر نصاد و نیرہ صناعی آپ ان اشعار میں دیکھتے چلئے۔ طرزِ بیان کے ساتھ حسنِ بیان جلوہ افروز ہے۔ فن کار کی یہ خوبی، مہارت و قدرت، اور پختگی و شائستگی کی آئینہ دار ہے ؎

ہے وہی حق جو بیت اللہ میں پیدا ہوا
بیت ایسی ہو تو مضمون حسب حال ایسا تو ہو
کعبہ میں ہے ولادت جدِ خدا کی شان
مضمون تازہ، بندشِ بیت کہن میں ہے
دیکھو تو دستگیریٔ دستِ خدا کی شان
گردش میں کانپتے نہیں چرخِ کہن کے پاؤں
تاریخِ مزار سے ثابت کر دے نجات
تو ہے تجھی سے شیخ پیمبر لگی ہوئی
بیت جب ہو صاحبِ حسن کا سلام ایسا تو ہو
مطلع دلِ بیت میں ہو مضمون کلام ایسا تو ہو
ہے آہِ حسین کا بیت شن کے حالِ غم
دل آپ آپ ہے کہ نہ ہو بے قرار کیا
کچھ صراطِ مستقیم کو تھا جہنم میں
بچا لیا مرے لالے نے بال بال مجھے
ٹکڑے ٹکڑے ہو مرے دل شاہ کے غم میں ثابت
حرزِ ایماں تو سمجھا، انھیں سی پاروں کو
فرقت پہ چھوٹ چھوٹ کے رہتے تھے آبلے
جلتے ہوئے تھا نوں سے جا کے لپٹ گئے پاؤں
مصحفِ ناطق کے پارے ہوئے جس دم شہید
صورتیں سب پارہ پارہ ہو کے قرآں ہو گئیں

طلب کی شہ سے جیسے نصت تو رحمت خود بخود اٹھی
جہنم سے بھی ہم اے حر، تجھے آزاد کرتے ہیں

۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے معاشی مجبوریوں کے وقت ترکِ وطن پر مجبور ہوئے، اور ۱۹۰۵ء میں بہ عمر ۱۸ سال کوٹہ راجستھان میں تشریف لائے، تمام عمر یہیں گزاری۔ اول بہ سلسلۂ ملازمت، بعد ازاں بہ سلسلۂ وکالت۔

۱۹۴۱ء میں کوٹہ ہی میں انتقال فرمایا، یہیں پر سپردِ خاک ہوئے۔ حیات و سیر، و دیگر حسین ان کی گراں قدر تصنیفات ہیں۔ ان کے عرفانی کلام کا مجموعہ صبرِ جمیل (تاریخی نام۔ برق فرم) سے شائع ہوا ہے۔ یہ گہرپارے اسی گنجینۂ ادب سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اخیر میں ان کا یہ شعر بڑا مزا دے گا جس میں طنز کی تلخی بھی ہے، اور واقعیت کی شیرینی بھی ؎

جو داد نہیں دیتا نا فہم ہے یا حاسد
ثابت تری باتوں میں ہم کو تو مزا آیا

بقیہ افسانہ شیطان (صفحہ ۲۳ سے آگے)

چقاق، چڑیوں کی نقل کرتی ہوئی اور جھاڑو کو ہلاتی ہوئی بوڑھی عورت کے سامنے آئی..... بوڑھی عورت نے خوف زدہ ہو کر ہاتھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کم زوری کی وجہ سے یہ حرکت اس کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی ــــ اور وہ آناً فاناً سر بانے پر گر کر دم توڑ گئی۔

بڑے اطمینان سے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں لاوہیٹ نے کٹا ہی سر سے اتاری اور جھاڑو ایک کنارے رکھ دی پھر پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ اس نے مردہ عورت کی بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کر دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا کرنے لگی جو بار بار دہرانے کی وجہ سے ازبر ہو گئی تھی۔

جب بڑھیا رات کو واپس گیا اور اس نے لاوہیٹ کو دعا کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے حساب لگایا کہ لاوہیٹ

خدا سے وہ شیطان کا نقصان پہنچا یا کیوں کہ اس خلاف امید ایک بڑھیا پہلے مر گئی تھی ــــ !

بقیہ طرحی مشاعرہ (صفحہ ۳۲ سے آگے)

ایم شفیع عاجز قادری دھارواڑ

میدان میں ہی ظاہر ہو گا ہمارا جذبہ
شعلے نکل پڑیں گے ہر اک دلِ جواں سے
گلشن کرے گا پیدا اک قطرۂ لہو
نکلے گا جوش میں جو میرے دلِ جواں سے
انسانیت ذرا بھی باقی نہیں بشر میں
دل میں ہے زہر بھائی کہتا ہے یہ زباں سے

علی سجاد رسوا۔ ایرانی

کیا جانے کس خطا پر رہتے ہیں بدگماں وہ
یارب وہی جو پہلے تھے ہم یہ مہرباں وہ
سو دردوں میں اکثر ہم ہی نہیں ہیں مضطر
وہ بھی تڑپ رہے ہیں صدِ دلِ نہاں سے

محمد رضا مضطر سلطان پوری

وقتِ دعا کہوں میں اب اور کیا زباں سے
بس موت چاہتا ہوں جی بھر گیا جہاں سے
میں شکر ہی کروں گا وہ لاکھ ظلم ڈھائیں
شکوہ نہ ان کا ہو گا ہرگز مری زباں سے

عثمان جودھپوری

پژمردہ گل ہوا ہے نکلا جو بوستاں سے
لاؤں بھلا فضاؤں کو اے باغباں کہاں سے
ہو شیخ یا برہمن وقت فنا کو
دیر و حرم کے جھگڑے رہ جائیں اب یہاں کے

نوکِ شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳ فروری
مصرعِ طرح جوش جانے کیا جذبہ ہو
جوش، جوشِ قوافی ــــ مجھے ردیف

نام .....
پتہ .....

گردِ راہ: ایک طائرانہ نظر

کی تاسیس فرمائی، اس کے مرحومات کو کچھ اصلاحی انقلاب پذیر کرنے کی صلاحیت نیا صاحب ہی ہے۔ بقیہ اقتباس باقی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ان کی پانچ نظمیں ہیں کا طرزِ تحریر ہے۔

جگہ تنگ ہے کہ اردو شاعری میں سیماب نے نظم معرّیٰ دونوں کا ایک نیا مزاج ایک نیا آہنگ اور ایک نیا شعور دیا اور اپنے عہد کے سفر و شعر اور فکر پر جو اثر ڈالا ہے وہ اس وقت زمانہ ہے۔ سیماب اسکول کی خصوصیات نیا صاحب کی شاعری میں ہیں اور ان کے مقام اور عظمت کو متعین کرتی ہیں ساری شخصیت بھی اسی اسکول کی ہے جس میں قدیم و جدید طرز شاعری کے نام زد دعاوی کی جگہ ہے چنانچہ نیا صاحب کی شاعری انفرادیت اور روایت کا حسین امتزاج ہے اگر ایک طرف کلاسیکیت کے عناصر اندرونی فطرت کے مطابق۔ لفظ و بیان، رنگ، اسلوب کے جدید سے قدیم اندرونی ذہنی رشتے کی بنا پر ہمارے ذوق، طرز احساس کی انفرادیت، ہمارے کلچر کے رنگ، شعور و لاشعور سب کا ساتھ ہے اگر ہم کلاسیکیت کے پرستار ہیں تو دوسری طرف ہماری شاعری روایت کی بنا پر تازہ شعور و حسیت کو جذب کرنے کا کام بھی کرتی ہے چنانچہ ہمارا کلام فرد اور اجتماعی زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ہماری شاعری کی ترجمان ہے دوسرے لفظوں میں ہماری شاعری کے اندر ہمارے عہد کے ہماری سوسائٹی کے ہمارے ماحول کے ہمارے

شعور خارجہ، جذبات کی اہمیت، حسن و صداقت کی تلاش اور جدید ذہن و شعور کے بیچ تناسب کی ہے۔

نیا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "گردِ راہ" ہے جو پہلی بار ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت اور ضرورت کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ نگار ہیں "نیا صاحب" اور "نیا صاحب" کے عنوان سے ہمارے شاعر اور ان کی شاعری کا جو تعارف کیا ہے وہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔ نیا صاحب کی شاعری کا ایک نیا مزاج ایک نیا آہنگ اور ایک نیا شعور دیا اور اپنے عہد کے سفر و شعر اور فکر پر جو اثر ڈالا ہے وہ اس وقت زمانہ ہے۔ سیماب اسکول کی خصوصیات نیا صاحب کی شاعری میں ہیں اور ان کے مقام اور عظمت کو متعین کرتی ہیں ساری شخصیت بھی اسی اسکول کی ہے جس میں قدیم و جدید طرز شاعری کے نام زد دعاوی کی جگہ ہے چنانچہ نیا صاحب کی شاعری انفرادیت اور روایت کا حسین امتزاج ہے اگر ایک طرف کلاسیکیت کے عناصر اندرونی فطرت کے مطابق۔ لفظ و بیان، رنگ، اسلوب کے جدید سے قدیم اندرونی ذہنی رشتے کی بنا پر ہمارے ذوق، طرز احساس کی انفرادیت، ہمارے کلچر کے رنگ، شعور و لاشعور سب کا ساتھ ہے اگر ہم کلاسیکیت کے پرستار ہیں تو دوسری طرف ہماری شاعری روایت کی بنا پر تازہ شعور و حسیت کو جذب کرنے کا کام بھی کرتی ہے چنانچہ ہمارا کلام فرد اور اجتماعی زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ہماری شاعری کی ترجمان ہے دوسرے لفظوں میں ہماری شاعری کے اندر ہمارے عہد کے ہماری سوسائٹی کے ہمارے ماحول کے ہمارے

شعور خارجہ، جذبات کی اہمیت، حسن و صداقت کی تلاش اور جدید ذہن و شعور کے بیچ تناسب کی ہے۔

نیا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "گردِ راہ" ہے جو پہلی بار ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت اور ضرورت کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ نگار ہیں "نیا صاحب" اور "نیا صاحب" کے عنوان سے ہمارے شاعر اور ان کی شاعری کا جو تعارف کیا ہے وہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔

جن شاعروں کا پیشہ نہ کیا

جن شاعروں کے کلام نے آج
محبت آمیز و انسان تعلیم، حوصلہ، کوشش
کو اپنے کچھ نہ کچھ پیشہ گوئی کی باتیں ہیں
ضیاء صاحب کی اس بات کا احساس ہے کہ انھوں نے
اپنی غزل کے بہ جائے کہ ہر شعر پر نئی بات کہنے کی
روایت کی غزل میں بھرا ہے بلکہ جدید غزل نے
ضیاء جیسے شعرا میں بھی کوئی نئی بات ہی نہ لے گی
ضیاء صاحب رنگ و نور، بہار و جواں، عزم و حوصلہ
کے شاعر ہیں۔ وہ بڑے رجائی شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں انظلم
نہیں محبت مدغم سے عبارت ہے۔

شاعر رنگ و نور ہوں اس سے مجھ کو کام ہے
پھولوں میں مجھ سے ہم سخن چاندنی ہم کلام ہے
صدقے چمکتے پاؤں کے جاؤں جب لے ضیا مگر
غزل تک پہنچنے وصلہ دل سے آتے ہیں
دنیا سر کا چھین بھی لیں گے
شبِ شب سے ڈرنے والے
جلتے رہیں امید کی شمعیں تمام رات
باہر ہوا میں کچھ تو ضیاء روشنی رہی
آجاؤ کر دھندلے سحر کو کچھ اور
اندھیرا میں رہنے سے کیا فائدہ ہے

انھوں نے آنا دی و دردِ انسانی سے نئی بڑی امید کی
بات کہی ہے: ؎

دنیا غمِ ساقی پر کس قدر تھے گل بدامن
غنچہ ہے آج اپنا دامن گلستاں ہے
جیسا کہ آپ نے ضیاء صاحب سے کہا ہے ہم
محبت انسانی تعلیم ہی پیدا کرتے ہیں۔ انسان اور ہر اچھی
محبت مناظر انھیں دل کر فتہ بنا دیتے ہیں۔

تنہا ہر اک سفر کے دیا ہوں شبِ غم
ہمسفر ہو مسکرا چاہتا ہوں

آؤ پیدا کریں ہم گلگ
جو تشنگی تجھ کو کر رہا ہے
وہ پیاس جو تیرے ہونٹوں کے لب پہ نکلے
پیار اگر نام ہے اسی کا پیار سے کریں کیا گوں گا
ملا تیرگی ہے اپنی نگاہوں میں
تمہارا جیسے ہوتے سے کیا فائدہ ہے
وہ پیم خلوص، مستقل تدبر اور فلسفیانہ فکر کے بہر حال قائل
ہیں۔ تدبر کو تقدیر کا زینہ کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان
کی نجات کا راز اس کے اپنے عمل اور ارادہ عمل میں مضمر ہے۔

ذہن محو اس دل سے ہے جو صدمہ جاں کی شدت میں
تقدیر سے پوچھا کر ہمارے کل تیرا عنواں کیا ہوگا
ان پہ جلے گی مشعلِ کمیں
جادہ پیما، ہے کارواں
یقیں کے پاؤں میں فطرتِ نہ آئے
بدل جاتی ہیں تقدیریں باتیں سے
پریشاں حاصلِ زندگی ہیں
پریشاں ہونے سے کیا فائدہ ہے

جس دل سے ضیاء کا سکہ شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔
ضیاء صاحب نے جس غزل کی داستان اس انداز سے
بیان کی ہے کہ کوئی اس کی داستان کو نہیں پہنچا۔

چاند بجھا کہ چھپ گیا، شمع بجھی کہ کھپ گئی
جس غزل کی داستاں قصہ تمام ہے

وہ جس منصب پہ فائز ہیں اس کا انھیں بدرجۂ تم
احساس ہے۔ وہ اپنی قوم کو ہر ممکن نئی منزلوں کی
طرف لے جانا چاہتے ہیں: ؎

نئے دور، نئی منزل، نیا دل
تجھے ڈھونڈھنا چاہتا ہوں
اٹھو کم ضمیروں کو جھنجھوڑ دو
نئی شمعیں جلانا چاہتا ہوں

ضیاء کا غم بھی کا غم نہیں ہے۔ شاعر نے غم کو دنیا
کے اس طرح محسوس کیا ہے کہ دل ہی ہے اس نازک نام کو

[illegible] ہے
خود ان کے حسرت ہے جو ضیاء کو اپنے تمام ہم عصروں سے
ممتاز کرتی ہے جو ان کو فیض، فراق، جگر، یگانہ کے کارواں
فیضانِ غمِ عالم ضیاء ہے
اپنا گریباں تو بھی بنا لے

وہ ہر غم کو غمِ جاناں بنا دینے کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک
غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ کائنات سب کو سمیٹنے کا گیا ہے
ان کی نظموں اور غزلوں میں غم کے یہ سب اس قدر دل کش
اور دل نشیں پیکر ہم بھی ان کے ساتھ ان غم ہو نہ گئے ہیں

سمجھ میں جانہ گر کی آئے گا کیا
مرا غم کیا، ترے غم کی ادا کیا
دل ہی نہیں تو غم نہیں غم ہو نہیں تو کچھ نہیں
زیست کچھ دال ہے، موت کچھ حرام ہے
دھوپ چھاؤں بارش ہو تو ہے مونس و ہمدم
مجھ پہ تیرا احسان ہے غمِ زماں ہے
ہمسفر جانے کہاں میرے دل سے نہ گیا
کی محسن دہر نے تحریک بہت

ضیاء صاحب کی شاعری میں نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ
ملتا ہے۔ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب کوئی جذبہ اپنی انتہا
پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی ضد کا احساس فروغ ہونے لگتا ہے
ضیاء صاحب نے اسی نکتہ کو کچھ یوں کہا ہے

شبِ غم ہے بڑی تاریک بہت
چاند ہو جیسے ہے نزدیک بہت
ان سے ہیں دور جو ہے غیب ہوا
آگئے وہ مرے نزدیک بہت

یا پھر ؎ موجِ جذبات میں جو پھر نہ سکے
وہ ہے وہ دل کا حال کہ نہ سکے

ضیاء کی غزل میں ندیت فکر کے ساتھ ساتھ نغمگی
جو اپنے ماحول کی ناقابلِ لب و لہجہ کی چیز ہے شعر
گردشِ پیہم طلب آفتاب
مضطرب ذرہ کی بے چینی ہے

بہادر یگانہ چنگیزی (لکھنؤ)

خشاد علی گوہر کوٹی

دو ہم قافیہ غزلیں

عنایت فرمائش کم بھول جانا ستم بھول جانے کی کوشش نہ کرنا
تمہارا الم ہی مری زندگی ہے، مراغم گھٹانے کی کوشش نہ کرنا
گرا کر نظر سے مجھے جانِ الفت، نظر میں سمانے کی کوشش نہ کرنا
مجھے راس آتی نہیں ہے محبت یہ زحمت اٹھانے کی کوشش نہ کرنا
مجھے اپنی رنگین باتوں میں لاکر مسلسل تبسم کی بجلی گرا کر
تم اب میرے سازِ محبت پہ آکر کبھی گنگنانے کی کوشش نہ کرنا
مرے عہدِ رفتہ کے رنگیں فسانے خیالوں میں اب تک جو سوئے ہوئے ہیں
خدا کیلئے میری خوابوں میں آکر انہیں تم جگانے کی کوشش نہ کرنا
ابھی تم مجھے دے رہا ہے زمانہ، کہیں ہو نہ جانا زمانے میں رسوا
ابھی تم کو لازم نہیں مجھ سے ملنا ابھی مجھ کو پانے کی کوشش نہ کرنا
بسرمایۂ عشق ہیں سرد آہیں، متاعِ محبت ہیں یہ میرے آنسو
لرزتے لبوں پہ یہ میری دبے جل رہے ہیں انہیں تم بجھانے کی کوشش نہ کرنا
زمانہ، رکھتی ہے برقِ تپاں کا، ستم سوچ کر ڈھا ستم گر زمانے
ظلوم ہو، بے کس بے نوا ہو، ستم اس پہ ڈھانے کی کوشش نہ کرنا
بدل دفعتہ غم کر دیا ہو خوشی سے اُسے دامنوں سے بہا راب عرض کیا
ان سے جا کر یہ کہدے کہ ہم سے خفا ہو منانے کی کوشش نہ کرنا

کبھی مسکرانے کی کوشش نہ کرنا مرا دل چرانے کی کوشش نہ کرنا
تری ہر ادا میں ہے پوشیدہ بجلی یہ بجلی گرانے کی کوشش نہ کرنا
ہوا پہ تو سینوں میں بھڑکیں گے شعلے بجھا ہوں کہ کہنے کی کوشش نہ کرنا
خدا کا ہے گھر کہتے ہیں سب جسے دل کوئی دل جلانے کی کوشش نہ کرنا
ابھی داستانِ الم ہے ادھوری ابھی مضطرب ہیں ہزاروں ہی ارماں
مجھے محفلِ نورِ عجلت سے اپنی خدارا اٹھانے کی کوشش نہ کرنا
یہ مانا تمہارا تو یہ مشغلہ ہے، بتاؤ جفاؤں کی حد بھی ہے کوئی
ابھی مٹ کے رہ جائیں گے اہلِ الفت ستم اور ڈھانے کی کوشش نہ کرنا
ہماری محبت کو سب مانتے ہیں، ہمیں تیرا ظالم سب جانتے ہیں
ہمیں آزمانے سے کیا فائدہ ہے، ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا
شفق مسکراتی ہے عارض پہ تیرے، بلائیں تری لے رہی ہیں گھٹائیں
بپا حشر ہو جائے گا آج ساقی خیالوں پہ چھانے کی کوشش نہ کرنا
تخیل میں ہے میرے کوئی حسینہ تصور ہے میرا کسی رشکِ جنت
مرے سامنے آکے دورِ زمانہ نگاہیں ملانے کی کوشش نہ کرنا
کہیں بجھ نہ جائے چراغِ تمنا، کہیں روشنی پر نہ چھا جائے ظلمت
کہیں ہو نہ جائے اندھیرا جہاں میں ابھی اٹھ کے جانے کی کوشش نہ کرنا
منانا ہے مجھ کو تو اچھا منا ؤ، گرانا ہے بجلی تو ہنس کر گرا ؤ
یہ دل بھی تمہارا ہے میں بھی تمہارا مگر روٹھ جانے کی کوشش نہ کرنا
سنوارو گے ہم آج زلفِ پریشاں بنائیں گے نظروں کو
اگر رُخ سے پردہ اٹھایا ہے تم نے تو اب گرانے کی کوشش نہ کرنا
زمانے میں بدنام مے خانہ ہوگا اگر ٹوٹ جائے گا ہر
بدل کر نظر اس سے بے باک ساقی تمنا ستم نے کی کوشش نہ کرنا

جسے اقبال سمجھتا ہے اقبال صدیقی

مری آرزو مرا مدعا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا
جو خوشی تری ہو ادا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

جسے ڈھونڈتی تھی مری نظر کبھی دشت میں کبھی کوہ پر
تری رہگزر ترا نقشِ پا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

جو تلاطموں سے گذر گیا اسے ساحلوں پہ ڈبو دیا
کوئی موج تھا کوئی ناخدا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

تجھے کون جس سے خوف آئی ہو مجھے کون جس سے یقین تم
تری آرزو ترا مدعا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

میں بجھا سکا نہ جسے کبھی عدم و وجود کی شکل میں
خوشی آپ کی الم آپ کا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

تری سادگی ترا بانکپن مجھے کر گئے جو اسیرِ غم
میں کہوں گا حشر میں برملا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

ہوئے نظم شدت فکر سے بڑی کاوشوں سے رقم ہوئے
جو ردیف اور جو قافیا وہ یہی تو تھی وہ یہی تو تھا

افکارِ نو

آزاد رشیدی شہباز نگری

کس لئے آپنے امید میں رکھا ہے مجھے
صاف کہدیجئے تجھ سے نہیں ملنا ہے مجھے

کبھی آئے ابھی جانے کی یہ جلدی کیسی
دم ذرا لیجئے کچھ آپ سے کہنا ہے مجھے

آپ کے در کو کس طرح نہ دل میں رکھوں
حاصلِ زیست ہے جو آپ نے بخشا ہے مجھے

دل ناکام کو باقی ہے ابھی حسرتِ زخم
تیر اک اور بھی کھانے کی تمنا ہے مجھے

میری جانب سے خفا آپ نہ رکھیں دل میں
خاکِ پا اپنی اگر آپنے سمجھا ہے مجھے

وہ ادا دل سے فراموش نہ ہوگی تا حشر
آپنے آج جس انداز سے دیکھا ہے مجھے

یہی کہہ کہہ کے بگڑتے ہیں وہ ہر دم آزاد
نہیں معلوم کہ کیا آپ نے سمجھا ہے مجھے

غزل

راہِ طلب میں اہلِ جنوں بیشتر ملے
آشفتہ سر ملے کہیں شوریدہ سر ملے

وہ حسن اتفاق سے جب جلوہ گر ملے
ممکن نہیں کہ پھر مجھے اپنی خبر ملے

افسوس ملے ہوئی نہ کوئی منزلِ تلاش
ایام زندگی کے بہت مختصر ملے

خالی ہے کچھ خلوص میں یا جذبِ شوق میں
جب دل سے دل ملا تو نظر سے نظر ملے

شانہ بہ شانہ راہِ وفا میں نہ چل سکے
یوں تو قدم قدم پہ مجھے ہم سفر ملے

حیرت سے دیکھتا ہے غریب الوطن مگر
اجڑے ہوئے دیار میں کیا اپنا گھر ملے

سجدوں سے اپنے غیرتِ گلشن بنائیں
اے کاش ایک روز تری رہگذر ملے

منزل کا آشنا نہ ملا مجھ کو ایک بھی
ملنے کو یوں ہزار مجھے راہبر ملے

ڈوبے ہوئے ہیں اب بھی انھیں کے خیال میں
یادش بخیر تم ہمیں جس چشم تر ملے

یں جو برباد اگر اس میں کسی کا کیا ہوا — ان کی جانب سے ہوا جو کچھ بھی وہ اچھا ہوا
پنے غم پہ ان کے آنسو دیکھ کر اے ہم نشیں — آج احساسِ الم کچھ اور بھی دونا ہوا
ہرایہ عالم ہے تیرے روٹھ کر جانے کے بعد — جیسے اک گم کردہ منزل راہ میں بھٹکا ہوا
ہو رنگ و نور گلہت، نگاہ سوز و درد و آہ — زیست کا افسانہ بھی ہے کس قدر الجھا ہوا
ہول بن جائے یہ کھل کر مسکرا دو تم اگر — دل کا غنچہ ایک مدت سے ہے مرجھایا ہوا
ڈکر دل سعیٔ تجدید محبت ہے عبث — جوڑ سکتا ہے کوئی یہ آئینہ ٹوٹا ہوا

زندگانی ہے یہی تو اس کو کرتا ہوں سلام
ہر نفس میرا ہے شاعر زہر میں ڈوبا ہوا

غزلیات

شبنم لوہا ٹھیری

ہماری آہ اگر با اثر نہیں ہوتی — تمہاری ہم پہ کرم کی نظر نہیں ہوتی
جو اشک غم سے مری چشم تر نہیں ہوتی — تو دل کی بات کبھی مشتہر نہیں ہوتی
لے تو ہنس کے یہ بولے کہ سن تو لوں لیکن — تمہاری بات کبھی مختصر نہیں ہوتی
خدا کی دیر ہی کو تم اگر چلے آتے — مصیبتِ شبِ غم میرے سر نہیں ہوتی
ہمارے ڈوبتے ہی ناخدا کو ہوش آیا — بھنور کی ورنہ اُسے کچھ خبر نہیں ہوتی
امید سر ہانے تو پھر لے دوست — شبِ فراق کی ہرگز سحر نہیں ہوتی

وہ کہہ رہے ہیں سناتے ہو کیوں مجھے شبنم
وہ داستاں جو کبھی معتبر نہیں ہوتی

ساجد القادری

پھیلے تھے جن کے دامن میں گلستاں
کہاں اب کچھ بھی نظر آئے بیاباں
ضرور اس میں کوئی سازش ہے پنہاں
سفینے کو کہیں کھیتا ہے طوفاں؟
حد آخر ہے پروازِ آدم
بہت نیچے اتر آیا ہے انساں
جفائیں آسماں کی مانتا ہوں
مگر کیا یہ زمیں ہے پاک داماں؟
وہ غم جو روح کو تسکیں بخشے
اُسے ہم غم کہیں یا راحتِ جاں؟
ہماری آستیں پہ ہنسنے والو!
کبھی دیکھا بھی ہے اپنا گریباں؟
جہاں دیکھا کلی کو مسکراتے
وہیں یاد آگیا چاکِ گریباں
کبھی وہ زندہ تصویریں تھیں ساجد
سمجھتے ہو جنہیں خوابِ پریشاں

جلال و جمال

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سحر امید

آدم

بہت سال گزر گئے ــــ!
لیکن نہ جانے کیوں میرے دل کا زخم ابھی تک ہرا ہے!
اے شمع! اے روشنی کے علم!!
پروانے کو جلانا ــ! بے شک تیرا وقار ہے ــ! تیری
فطرت ہے ــ!!

لیکن تو نے پروں کو جلا کر! صرف پروں کو ــ!! آہ!!!
پروانے کو تڑپنے کیوں چھوڑ دیا تھا ــ!؟ اے ظالم ــ!
آج تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے! بے سود ہے!
بیکار ہے! آہ پروانے کے پاس کچھ نہیں ہے ــ!
کچھ بھی نہیں ــ!

اے شمع! کیا تو جانتی ہے کہ پروں کو جلانے کا انجام
کیا ہوا ــ؟

نہیں ــ!! تو نہیں ــ!! ایک پروانے کا دل بھی
جل گیا ــ!!

لیکن وہ آج تک زندہ ہے! کیوں ــ؟ وہ خود
نہیں جانتا ــ!!

وہ کھو رہا تھا، بادل پریشان! آنکھوں میں نیند کا خمار!
ہاتھ میں سگریٹ، ہر چیز سے بے نیاز دیے کا نور ــ وہ سر جھکائے
کھو رہا تھا وسط دسمبر کی ایک سرد رات! دنیا مبہم دھندلکا
بنی ہوئی تھی، شہر کی ساری فضا پر کہری کہر چھائی ہوئی تھی
سارا شہر موت کی سی خاموشی میں مدہوش تھا۔ کبھی کبھار
کوئی کار سڑک پر سے گزر جاتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی
نے کراہ کر کروٹ بدلی ہو۔ لیکن اس وقت بھی شاہد کو
ہاتھا جب کہ دھرتی کی ہر چیز آرام و سکون کی آغوش میں
سو رہی تھی ــ!

دور کہیں گھنٹہ گھر نے چار بجائے! وہ چونکا۔ اس
کی آنکھوں سے بدستور نیند ٹپک رہی تھی۔ ایک دم اسے یاد
آیا کہ اسے کو تحفہ بھیجنا ہے۔ اس کے دل میں ہمدردی کی

پیدا ہوئی ــ!

"کون ــ؟"

"میں شاہد ــ عرفان!" جواب ملا۔ شاہد نے
دروازہ کھول دیا اور عرفان اندر داخل ہو گیا

"کیا بات ہے؟ اتنی رات گئے ــ؟"

"بات کام کی ہے دوست! اس وقت تمہاری ضرورت ہے!
ذرا جلدی سے کپڑے پہن لو۔" عرفان ایک ہی سانس میں
کہہ گیا۔

"آخر بات کیا ہے؟ تم بتاتے کیوں نہیں ــ؟"

"بتاؤں گا۔ تم ذرا جلدی کرو۔ کہیں دیر نہ ہو جائے"
عرفان کی آواز ڈوب رہی تھی۔

"اچھا ٹھہرو!" کہتے ہوئے شاہد نے باتھ روم میں
کیا اور پھر دونوں باہر نکل آئے۔ عرفان نے آگے بڑھ کر کار کا
دروازہ کھول دیا

"اب بتاؤ کیا بات ہے؟" شاہد نے کار میں بیٹھتے
ہوئے سوال کیا۔

"سنو!" عرفان نے کہنا شروع کیا۔ اس کی پلکوں پر آنسو
تیر رہے تھے "یاسمین زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے
اور اس وقت صرف ایک بار تم سے ملنا چاہتی ہے" وہ
خاموش ہو گیا۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ گھوم کر سڑک
پر آ گئی۔ شاہد ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ فضا وہی گھوم
تھی اور جاڑے کی تیزی کے ساتھ آ رہا تھا۔ یاسمین کے گھر

پہنچ گیا ــ!

وہ شام بڑی خوش گوار تھی۔ دن بھر کی دھوپ کے
بعد شفق کی چھاؤں زیست افروز معلوم ہو رہی تھی۔ یاسمین
اور شاہد ٹہلتے ہوئے پارک میں چھوٹے سے خوبصورت حوض
کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ شاہد، یاسمین کا چچیرا بھائی
تھا اور دونوں میں کافی حد تک بے تکلفی تھی۔ شاہد یاسمین
کو پیار سے منّو کہہ کر پکارتا تھا۔ دونوں بھائی بہن کا پیار
سب کی نگاہ کو بھاتا تھا۔ شاہد دو سال شہر چھوڑ کر اس شہر
میں آیا تھا۔ تقریباً دو سال، اس کی تعلیم کے مکمل ہونے تک
وہ یاسمین کے علاوہ اور کسی سے نہ ملا کرتا تھا۔ چار سال
بعد جب وہ ڈاکٹر ہو گیا تو پھر اس نے وہیں ایک دوکان کھول
لی اور اپنے شہر اور والدین کے پاس واپس نہ گیا۔ صرف
اس وجہ سے کہ وہ یاسمین سے دور نہ جا سکتا تھا۔ شاید
بچپن ہی سے وہ اتنے قریب تھے کہ شمیم کی زبانی اکثر کہتے سنا گیا
تھا "بھائی بہن کا پیار ہو تو ایسا ہو۔!" اور دونوں
مسکرا کر رہ جاتے تھے۔

"شاہد! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟" اچانک
یاسمین پوچھ بیٹھی۔

"یعنی ــ؟"

"کسی لڑکی سے ــ؟"

"ہاں ــ! کیوں ــ؟"

"سچ ہے وہ ــ؟" یاسمین کے چہرے پر
شریر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"یہ کون ہم نہیں بتائیں گے۔" شاہد نے جواب دیا
"اچھا بتاؤ کہ کبھی نہیں۔ تو جاؤ! ہم تم سے بات نہیں کریں گے۔" وہ روٹھ گئی۔

"یہ بات نہیں منو! اچھی نہ پوچھو۔" شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یاسمین اب کسی شرط پر بھی نہ مانے گی۔ اس نے ہاں کہہ کر غلطی کی تھی۔

"اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ ہاں!!" یاسمین ضد پر اتر آئی۔

"تم پڑھو گے نہ؟" شاہد نے پوچھا
"نہیں ——!"
"اچھا پڑھو ——!" اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر یاسمین کو دے دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

تو ذکر کرانِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں
بیانِ زبانِ خاموشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج انشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

یکایک یاسمین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں شرافت کی جگہ غصہ اور نفرت نے لے لی۔ وہ کاغذ یوں تھی اس کے ہونٹ لرز رہے تھے!

"شاہد! تم اتنے گندے ہو! اتنے گرے ہوئے ہو! یہ مجھے معلوم نہ تھا ——" وہ کہہ رہی تھی۔

"لیکن منو! یہ حقیقت ——"
"بکواس بند کرو!" وہ چیخ اٹھی "تم نے میری عفت پر دھبہ لگایا ہے! تمہیں شرم آنی چاہئے شاہد! میں نے تمہیں فرشتہ سمجھا تھا لیکن —— اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو ——؟"

"منو! شاہد کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یاسمین اس کی محبت کو اس طرح ٹھکرا دے گی۔ وہ نہ کبھی اظہارِ محبت کی جرأت نہ کرتا ——

"اف —— ....." اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور دوڑتی ہوئی چلی گئی ——!

خواب بکھر گئے! محل ٹوٹ گئے!! طوفان آیا اور چلا گیا لیکن آندھیوں کے چھوڑے ہوئے ملبے میں کل کتنے دن کے کل کتنے دن رہ گئے اور صرف ایک دن باقی نہ رہا گیا۔

شاہد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے نیچے گرا ہوا کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور اس کے ٹکڑے ہوا میں منتشر ہو گئے وہ مسکرا دیا —— اُف! یہ مسکراہٹ!! کون جان سکتا تھا کہ ہی مسکراہٹ میں کتنا درد، کتنا غم، کتنی تمناؤں کی بربادی پنہاں تھی لیکن اس کے باوجود آنکھ سے دو قطرے بہہ ہی نکلے لیکن وہ کراہ سے یاسمین کا وہ جملہ یاد آتا اور دل میں تیر بن کر چبھ جاتا ——

"تم اتنے گندے ہو! اتنے گرے ہوئے ہو!! یہ مجھے معلوم نہ تھا ——!"

اب وہ اپنا درد کہاں لے جائے؟ کسے بتائے؟ کیا کرے؟ لیکن نہ جانے کیوں وہ مسکرا رہا تھا ——!

"درد دل دے کر گئی چندو! کبھی تمہیں بھی پتہ چل جائے گا کہ درد دل کیا ہوتا ہے؟ میں تمہیں اس کا احساس دلاؤں گا۔ ہاں! ہاں ——!!" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"اے شمع! اے روشنی کے ستم ——!! پروانوں کو جلانا ——!

بے شک تیرا وقار ہے! تیری عظمت ہے ——!!
لیکن تو نے پروانوں کو جلا کر ——! صرف پروانوں کو ——!!
آہ ——!!

پروانے کو تڑپنے کے لئے کیوں چھوڑ دیا —— ؟
کیوں ——؟

دوسرے دن وہ معمول کے مطابق یاسمین سے ناشتے کی میز پر ملا۔ یوں تو یاسمین نے آنکھ نہ ملائی لیکن شاہد کا رویہ بتا رہا تھا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور یاسمین کو اس کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ شاہد بدل چکا ہے!! کوئی طوفان کم بربادیوں کو کہاں تک دیکھے۔ ماہ و سال بیت گئے۔ یاسمین سمجھ گئی کہ کچھ ہوا تھا۔ شاہد اور یاسمین پہلے کی طرح ملتے۔ دونوں کھیلتے، گھومتے پھرتے! وہی باتیں، وہی ہنسی اور وہی پیار! لیکن شاہد دن بدن کم زندہ رہتا جا رہا تھا اب تو اس نے سگریٹ بھی پینا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ کئی دن بیت گئے ——!

ایک رات یکایک یاسمین کو بخار آ گیا۔ شاہد کو اطلاع ملی اور وہ دوڑا ہوا آیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ شاہد نے دیکھا بخار ایک سوتین ڈگری ہے۔ اس نے ایک انجکشن دے کر فوراً برف کی تھیلی کا انتظام کیا اور ساری رات یاسمین کے پاس بیٹھا رہا۔ یاسمین کی ماں نے بہت اصرار کیا کہ وہ سو جائے۔ لیکن شاہد نہ مانا۔ دوسرے دن صبح بخار کم ہوا لیکن پھر شام کو وہی ——!

اسی طرح پانچ دن تک بخار چڑھتا اور گھٹتا رہا۔ ہر رات شاہد نے یاسمین کے پاس اس کی تیمارداری میں جاگ کر گزار دی لیکن یاسمین کو اس بات کا ہوش ہی نہ تھا۔

چھٹے دن وہ ٹھیک ہو گئی۔ لیکن کمزوری کی وجہ اٹھ نہ سکتی تھی۔ شاہد نے گھر والوں کو ہدایت دے دی کہ یاسمین کو مکمل آرام دیا جائے اور اسی دوپہر کو وہ شہر چلا گیا اور کسی کو اطلاع تک نہ دی۔ پھر شام کو جب سے پتہ چلا کہ شاہد اپنے شہر چلا گیا ہے۔ تو گھر میں عجیب افراتفری مچ گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں چلا گیا۔

یاسمین نے بھی یہ خبر سنی اور اس کے دل کو ایک ٹھیس لگی۔ وہ گھر والوں سے سن چکی تھی کہ شاہد نے پانچ دن پورے رات جاگ کر اس کی خدمت کی ہے۔ تو اس کے دل میں عجیب قسم کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا —— تو کیا شاہد اس سے اتنی محبت کرتا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔ اس کے دل میں اضطراب اور تڑپ پیدا ہو چکی تھی —— ایک کشش! نہ جانے کیوں وہ شاہد سے ملنا چاہتی تھی اور وہ ماہ پہلے کی سخت کلامی معاف مانگنا چاہتی تھی! نہ جانے کیوں اس کے دل میں درد سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ شاہد! مجھے معاف کر دو شاہد! مجھے معاف کر دو! مجھے معاف ..... اور اس کی آنکھوں

جاگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ۔۔۔ دوسرے ہی لمحے شاہد آیا۔ وہ کہہ رہا تھا ؎

"اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں"

روشنی جاگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔ "شاہد! مجھے معاف کر دو شاہد۔ مجھے معاف کر دو۔! مجھے معاف کر دو۔۔۔۔" وہ بُری طرح رونے لگی۔

یاسین کی حالت اب سدھر چکی تھی۔ لیکن وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ ہر وقت اُسے شاہد کی پر امید نگاہیں نظر آتی تھیں اور ذہن میں ایک شعر گونجتا رہتا تھا۔ اس نے جانے کتنے خط لکھے۔ لیکن شاہد کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ ہر وقت ڈاکیے کی منتظر رہتی، لیکن تمام خطوں میں اسے شاہد کا خط کبھی نظر نہ آیا۔ پھر وہ کم زور ہوتی چلی گئی۔ دوا بھی کچھ کام نہ کرتی تھی۔ آخر چار ماہ کے بعد ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ یاسین کو ٹی بی ہو گئی ہے۔

دوسرے ہی دن وہ سینی ٹوریم میں داخل کر دی گئی۔ دن گزرتے گئے۔ اور پھر مہینوں میں تبدیل ہو گئے اور وہ ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی صحت یاب نہ ہو سکی۔ ہر ایک دن ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ یاسین صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے! یاسین کی ماں نے سر پیٹ لیا۔

اور یاسین پھر گھر واپس آ گئی۔ تمام رشتہ دار جمع ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق وہ صرف ایک یا دو گھنٹوں کی مہمان تھی۔ عرفان نے فون سے اپنے ابا کو بلا لیا۔ سب کو دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکے۔ گھر میں ایک ماتم شروع ہو گیا۔ لیکن یاسین ان تمام باتوں سے بے نیاز خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ وہ بار بار عرفان کو بلاتی اور پوچھتی۔ "شاہد کا خط آیا بھیا ۔۔۔؟"

اور عرفان سر ہلا کر کہہ دیتا۔ "نہیں ۔۔۔!"

"سب لوگ ڈاکٹر حیران رہ گئے۔ جب بھوں نے دیکھا یاسین زندہ ہے اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن ڈاکٹر اب بھی پر امید نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یاسین صرف چند لمحوں کی مہمان ہے۔ دن گزرتے گئے۔ ایک طرف گھر والے پریشان اور دوسری طرف ڈاکٹر حیران وہ ماہ گزر گئے۔ لیکن یاسین زندہ رہی۔ ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ معاملہ سمجھ سے باہر ہے۔ اسی دن یاسین نے عرفان کو بلا کر کہا:۔

"بھیا! شاہد کو خط لکھا تھا ۔۔۔؟"

"اپنا کہنہ جلانے کتنے خط اور کتنے تار بھیجے جا چکے ہیں۔!" عرفان نے جواب دیا۔

"بھیا تم جا کر شاہد سے کہنا ایک بار۔ میں صرف ایک بار اسے دیکھنا چاہتی ہوں!" ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور یاسین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے! اور عرفان چونک پڑا۔ آج وہ اس راز کو جان چکا تھا جسے گھر والے کبھی نہ پہچان سکے تھے! اور ڈاکٹر حیران ہو گئے تھے۔ وہ تڑپ اٹھا

"یاسین ۔۔۔!" اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی

"ہاں بھیا۔ جلدی کرو! کسی بھی صورت سے شاہد کو لے آؤ۔ اب مجھ میں برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے ..... جاؤ..... ابھی..... ہاں ... ۔۔۔!"

"ٹھیک ہے! میں شاہد کو ضرور لے آؤں گا..... ضرور ۔۔۔!"

کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور دونوں نیچے اتر آئے۔ جیسے ہی شاہد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ یاسین اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔۔۔ ایک ڈھانچہ ۔۔۔ یہ یاسین نہیں ہو سکتی! یاسین تو پھول تھی ۔۔۔ پھول ۔۔۔!!

"نہیں! تم لیٹی رہو ۔۔۔!" شاہد تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے سہارا دے کر یاسین کو لٹا دیا ۔۔۔!

"تم آ گئے شاہد! ۔۔۔ مجھے معاف کر دو ۔۔۔ اور میں ۔۔۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا ۔۔۔!"

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ۔۔۔؟"

"بس ٹھیک ہوں ۔۔۔ اور پگلے پھر ۔۔۔ تو دوا سے تمہارا دل ۔۔۔ ہی مجھے مرنے نہ دیتا ..... ہاں ایک ارمان ہے شاہد! پورا کرو گے ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔!" شاہد نے سر ہلا دیا

"وہ اشعار ایک بار سنا دو ..... تم نے وہ غزل لکھ کر دیئے تھے ۔۔۔!" یاسین نے کہا۔

دفعتاً ایک طوفان بپا ہو گیا اور کمرے کی دیواریں چیخ اٹھیں ۔۔۔! بازگشت ۔۔۔!!!

"تم اتنے کمینے ہو، تم اتنے گرے ہوئے ہو! یہ مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔!" اور شاہد کھڑا ہو گیا

"اور آج! تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے ۔۔۔! بے سود ہے ۔۔۔! بے کار ہے! آج پر دل دے کر اس کو کیا ملے گا؟ کچھ نہیں ۔۔۔! وہ دل دیکھ لیا ۔۔۔!!!

اے شمع کیا تو جانتی ہے پروں کو جلانے کا انجام کیا ہوا ۔۔۔؟

نہیں ۔۔۔! تو سُن! ایک پروانے کا دل بھی جل گیا! اور ۔۔۔! اور دیکھ اک وہ دل کیا ہے ۔۔۔؟ ہاں وہ دل!!!" وہ سر پیٹنے لگا ۔۔۔!

"شاہد ۔۔۔!" یاسین نے شاہد کا ہاتھ پکڑ لیا! لیکن شاہد نے دھیرے سے ہاتھ کھینچ لیا ۔۔۔!

"مجھے کم زور سمجھ کر مجھ سے ہاتھ چھڑا رہے ہو شاہد ۔۔۔؟" وہ کہہ رہی تھی "میرے دل سے چلے جاؤ تو جانوں کہ تم مرد ہو ۔۔۔!"

ایک قیامت بپا ہو گئی ۔۔۔ دیوانۂ محبت جوش میں آ گیا اور شاہد اس طوفان میں گھر گیا ۔۔۔!!

"میرے دل سے چلے جاؤ تو جاؤ ..... میرے دل سے چلے جاؤ تو ..... ۔۔۔!!" آواز ذہن کی ویران وادیوں میں بازگشت بن گئی ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے ۔۔۔!

"یٰسٓ ۔۔۔!" وہ ایک دم سے مڑا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ یاسین کا سر ڈھلک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ بہت دور چلی گئی تھی ..... بہت دور ..... ۔۔۔!"

(باقی صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

کہ اس کا قریب ترین مرگ ماں کی چارپائی کے نزدیک ڈاکٹر سے بات چیت میں مصروف تھا۔ بڑھاپے کی بیماری عورت جس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور جو اپنے انجام سے قطعی بے خبر معلوم ہوتی تھی، پرسکون حالت میں بیت الخلا سے چارپائی پر لٹائی جا چکی تھی۔ اس کی مرگوں باز سال تھی جھڑکی اور گھٹے ہوئے سے جوانی کے جیسے کی تیز دھوپ پھٹ چکی ہری گھاس سے پیدا شدہ بھینی بھینی خوشبو سے بھی جوانی ہوا اندر آ رہی تھی ..... ڈاکٹر کہہ رہا تھا:۔

"ہندوی۔ تم اپنی ماں کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے وہ کسی وقت بھی مر سکتی ہے۔"

کمرے کے سرکش تکیے کو اندر تیوں پر کھاتے ہوئے کہا "مجھے اپنی نسل کی بہت فکر ہے ڈاکٹر صاحب! بیکار نہ ہو سکے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکا۔ ماں! تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" ہندوی نے ماں پر جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

بڑھیا عورت نے نقاہت کی وجہ سے ہندوی کو اشارہ کیا کہ وہ فصل کی طرف ہی توجہ دے اور اسے مرنے کے لئے بیشک اکیلی چھوڑ دے۔

ڈاکٹر صرف اتنا ہی بولا۔ "تم اتنے سنگ دل کس طرح ہو سکتے ہو ہندوی۔ اگر تم اپنی فصل کی دیکھ بھال کے لئے ضروری جانا چاہتے ہو تو "لارپیٹ" کو بلا کر اپنی ماں کی تیمارداری کے لئے چھوڑ جاؤ۔ سنا کچھ تم نے ــــ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو یہ تمہیں تمہاری ماں کے پرکھے کی طرح مر جانے دیں گے۔"

ہندوی کے جذبات، خلق اور خون کے بے جان خیالات جذبات سے گھبرا گیا۔ اس نے تمام صورت حالات کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر سے پوچھا "لارپیٹ کو کس قدر فیس دینا ہوگی ــ؟"

"مجھے کیا معلوم" ڈاکٹر بولا "یہ فیس کا معاملہ اس سے طے کر لینا جس کے لئے تمہیں اس کی خدمات کی ضرورت ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے چار پانچ گنی کم نہیں کر سکتے ہو گے۔"

مترجمہ: محسن پیلیبھی

شیطان

موپاساں کا ایک حسین شاہکار

"وہ بس مر رہی ہے ..... ہے ....."

بڑھیا کی آخری سانس کی گھرگھراہٹ میں دلچسپی کی چمک ہوئی ..... وہ بولی "کیا اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی؟"

"ہاں! اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ــ اس کی موت محض نگرانی کرنے کی محض کسر کیا فیس لوگی۔ تم ہو لارپیٹ میں ایسی نہیں ہوں۔ میرے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ گھر والوں کی تیمارداری اور علاج کر سکوں۔ اسی لئے ماں کی حالت بگڑتی چلی گئی ــ!"

"میری فیس دو قسم کی ہوتی ہے ــ ایک دن کی اور فی رات کی۔ ایک دن سے دو شنبہ کے دن کے دوران کام کرنے کی) اور دو شنبہ رات کو کام کی۔ اور فرنچوں سے دس پندرہ دن کی اور ایک شنبہ"

ہندوی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی ماں کی عمر کی عورتوں کے معاملے میں کافی مضبوط تھی اور ڈاکٹر کے کہنے کے باوجود وہ ایک ہفتہ تک زندہ اس لئے اس نے لارپیٹ سے کہا "بہتر ہو گا کہ تم فیس بتا دو۔ ڈاکٹر کے خیال کے مطابق وہ کسی وقت مر سکتی ہے اگر وہ جلدی مر گئی تو تمہارا نقصان ہو گا کہ پھر کس بیرے ــ"

"میں تمہاری ماں کی حالت کو دیکھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی ہندوی!"

"ہاں ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ چل کر حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

کیوں نہ ہو اسے ایک گھنٹہ کے اندر اندر یہاں پہنچ جانا چاہئے ــ۔"

"آپ ناراض نہ ہوں ڈاکٹر صاحب! وہ آپ کے حکم کے مطابق ایک گھنٹے میں یہاں ضرور پہنچ جائے گی۔"

لارپیٹ ایک بھاری عورت تھی جو فیس لے کر بڑے سے بڑے مریض کا علاج کر دیا کرتی تھی۔ وہ مُردوں کے کفن سیا کرتی تھی اور زندہ لوگوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے سیب کی طرح مرجھائی ہوئی سی، بدمزاج عورت لارپیٹ ان عجیب مخلوق خدا جیسے تھی جو بے سرو سامان طریقوں سے اپنی روزی کماتی ہیں۔ وہ پچھلے برسوں سے اتنی تنگی سہتی رہی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹھوڑی گویا ہڈیوں کو چھونے جا رہی ہے

وہ عمر مُردوں اور قریب المرگ لوگوں سے متعلق بات چیت کیا کرتی تھی۔ وہ ان کی کہانیاں ایسے جوشیلے انداز میں بیان کیا کرتی تھی جیسے ایک شکاری اپنے شکار کھیلنے کے حالات بیان کیا کرتا ہے ..... جب ہندوی اس سے ملنے آیا وہ کپڑوں کو پریس کر رہی تھی۔

"گڈ مارننگ لارپیٹ" اس نے نرمی سے کہا ــ

"تمہارا مزاج کیسا ہے؟"

"گڈ مارننگ ہندوی! میں بالکل اچھی ہوں، اور تم کیسے ہو ــ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر میری ماں قریب المرگ ہے"

"اوہ کیا ہو گیا ہندوی!" بوڑھی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

جب وہ گھر پہنچے تو ہنوری بولا۔ "اگر وہ میری غیر حاضری میں ہی مر گئی ہو۔۔۔!" ..... مگر جب وہ اندر داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ بڑھی عورت ابھی تک زندہ تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح آرام سے لیٹی ہوئی تھی، اس کے سخت تیز ناخنوں والے ہاتھ چادر پر سیدھے پھیلے ہوئے تھے اور گہرے سانس لے رہی تھی۔ لارپیٹ اس کی چارپائی کے نزدیک گئی، اس نے اس کی نبض دیکھی۔ سانس اور دل کی دھڑکن کو محسوس کیا اور پھر اس کا سر سہلا تک کہ گہرا جائزہ لے کر وہ کمرے سے باہر آ گئی ہنوری بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔

لارپیٹ نے پورے طور پر اطمینان کر لیا تھا کہ اس رات اس کی موت نہ ہو سکتی تھی

"اچھا پھر۔!" ہنوری نے اس سے سوال کیا "تم دو گھنٹے کے بعد مرنے میں" بڑھی چڑیل نے کہا "میری فیس پھر فراکس ہوگی۔۔۔"

ہنوری یہ فیصلہ سن کر ہانپنے لگا "پھر فراکس کیا تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔۔۔ وہ تو پھر گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہے گی۔۔۔"

انھوں نے فیس طے کرنے میں کافی وقت لگایا کیونکہ فیصل کی نگرانی ضروری تھی۔ اس لئے ہنوری اس کی منہ مانگی فیس دینے کے لئے مجبوراً رضامند ہو گیا۔ "بہت اچھا۔ پھر فراکس ہی سہی!۔ اس وقت تک کی فیس جب تک کہ میری ماں کی آخری رسومات ادا ہوں گی، اس وقت تک کی فیس۔!"

اور ہنوری فیس طے کرنے کے بعد لارپیٹ کو اپنی بیمار ماں کے سرہانے چھوڑ کر کھیتوں میں چلا گیا۔

ہنوری کے جاتے ہوئے لارپیٹ صفائی کا کام اپنے ساتھ لیتی آئی تھی تاکہ اس کا وقت بے کار ضائع نہ ہو، دفعتہً اس نے ہنوری کی ماں سے پوچھا۔

"کیا تمہاری آخری رسومات پیش از مرگ پادری کے ذریعے ادا ہو چکی ہیں۔۔۔؟"

بڑھی عورت نے نفی میں سر ہلایا۔

تب لارپیٹ جو بہت ہوشیار تھی اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی:۔ "اچھا بات ہے۔ تب تو جا کر مجھے پادری کو بلا لانا چاہئے۔"

یہ سنتے ہی لارپیٹ کی بات سن کر اپنے مذہبی فرض کی ادائیگی کے پیش نظر سفید لبادہ جیب میں ڈال کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک نوکر گھنٹی بجاتا ہوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گویا وہ گھنٹی بجا کر خدا کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ جب پادری کھیتوں سے گزرا تو کسانوں نے احتراماً گھٹنے ٹیک کر ٹوپیاں اتار لیں۔ وہ سب ہی طرح مؤدبانہ انداز میں کھڑے رہے جب تک کہ پادری نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

ہنوری نے جو کھیت میں کام کر رہا تھا انھیں گزرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ مگر اسے نہ ہی کوئی حیرانی ہوئی اور نہ ہی ہمدردی۔!

بڑھی عورت نے گناہوں کا اعتراف کیا اور پادری نے ان کی معافی کا اعلان۔! اور پھر پادری کا روانی مکمل ہونے پر واپس چلا گیا۔۔۔!

لارپیٹ سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم بڑھی عورت مرنے میں کتنا وقت لگائے گی۔ دن قریب الختام تھا۔ شام کے سائے کھڑکیوں پر پھیل رہے تھے۔ مگر بڑھی عورت پورے آرام اور اطمینان سے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں گھورتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ مگر سانس کچھ وقت سے لے رہی تھی۔ جلد دنیا کی آبادی میں سے ایک صحت کم ہونے والی تھی جس کا افسوس کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

رات گئے ہنوری گھر واپس آیا۔ اس نے چارپائی کے قریب جا کر دیکھا کہ ماں ابھی تک زندہ ہے۔ اس نے لارپیٹ کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ وہ اگلی صبح کو پھر آ جائے۔ رات کو وہ خود نگرانی کرے گا۔

اگلی صبح جب ہنوری ناشتے سے بھی فارغ نہ ہوا تھا کہ لارپیٹ آئی اور اس نے آتے ہی پوچھا "کیا حال ہے تمہاری ماں کا۔؟" لارپیٹ نے بڑھی عورت کا مکمل جائزہ لیا اور اندازہ لگایا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ دو یا چار روز یا شاید ایک ہفتہ ہی زندہ رہے۔ اس کے بعد جو اس نے اس خیال کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اسے ہنوری پر بہت غصہ آیا جس نے اسے جھوٹی باتیں کر کے پھنسایا اور ایسا مسئلہ سمجھا کر دیا اسے بڑھی عورت پر بھی سخت غصہ آیا کہ وہ مرتی کیوں نہیں اور زندہ رہنے پر کیوں بضد ہے لیکن پھر وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی اور صبر کی تلقین کرنے لگی۔

ہنوری اس شام خوشی خوشی گھر واپس لوٹا۔ اس نے اپنا سب کام تقریباً نمٹا کر لیا تھا۔ لیکن لارپیٹ نے محسوس کیا کہ وہ جتنا حوصلہ وہاں رہ رہی ہے، اس کا نقصان بھی ہو رہا ہے۔ وہ غصہ کے زیر اثر اس کا گلا دبا دینا چاہتی تھی

اگلے روز ایک خیال لارپیٹ کے دماغ میں پیدا ہوا اور یہ بھول کر کہ وہ ایک قریب المرگ بڑھی عورت کی نگرانی پر مامور ہے زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر ہنستا ہنستا کمرہ پلنگ کے قریب گئی "کیا تم نے کبھی شیطان کو دیکھا ہے؟" اس نے بیمار عورت سے پوچھا۔

"نہیں۔!" ہنوری کی ماں نے ہنستے ہوئے جواب دیا

تب لارپیٹ نے خوفزدہ کرنے کے لئے بھوتوں اور شیطانوں کی خوفناک کہانیاں سنانے لگی۔ شیطان ہمیشہ قریب المرگ لوگوں کے پاس ان کی موت سے چند لمحات پہلے ضرور آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو اور کالا منہ ہوتا ہے اور وہ بہت ہی ڈراؤنی چیخیں مارتا ہے۔ جسے دیکھنے کے بعد کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔" اور پھر وہ ان خوفناک حالات سنانے لگی جن سے وہ دوچار ہوئی تھی۔

بڑھی عورت سہم گئی۔ اس کے ہاتھ پیر اور اس نے اپنے سر کو موڑ کر کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑانے کے لئے

دفعتہً لارپیٹ وہاں سے غائب ہو گئی۔ وہ ہنوری کے کمرے میں گئی۔ اس نے ہنوری کے کپڑے پہنے۔ اور پھر وہ واپس آ گئی۔ اس نے ایک چھوٹی کڑاہی الٹی کر کے سر پر رکھ لی۔ کڑاہی کے تین پاؤں سینگوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے تب اس نے ایک ہاتھ میں جھاڑو لی۔ آتش دان سے ذرا سی راکھ کا ایک ٹکڑا زندہ کوئلہ جس سے ایک خوفناک آگ نکل رہی تھی اور وہ اوپر منہ چھپا کر چڑھ گئی۔ اس نے پردہ پھاڑ دیا اور

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر ملاحظہ کیجئے)

رومان کا ایک ٹکڑا

میرے محبوب

میرے ندیم — میرے!

کبھی کبھی تم بہت یاد آتے ہو میرے محبوب! نجانے کیوں تم اور تمہاری باتیں اتنی شوخ و طاقتور ہیں کہ باوجود فراموش کرنے کی کوشش کے بھی تڑپا دینے اور بیقرار کرنے آجاتی ہیں — آخر کیوں —؟

لیکن تم تو کبھی جانتے نہیں — صرف سوچا کرتے ہو گے، پھر تمہاری مسرور سی ہنسی ترجمانی کرنے لگتی ہو گی اور میں ایک بار پھر تڑپ جاؤں گی — بے چین ہو کر تم سے لپٹنا چاہوں گی —

کیسے آہ! تم مجھ سے صدہا میل دور ہو، لیکن میرے ندیم —! آج بھی میرے خیالات میں تمہارے پیار کی شمعیں روشن ہیں اور میں اکثر تنہائی میں، جب ماضی کی گرد ناک یادوں کو کھرچ دیتی ہوں۔ اور میرا دل اذیت و غم سے کراہنا چاہتا ہے، میں تڑپ اٹھتی ہوں مگر دل کی خاطر تمہارا خیال جو استعارہ جو میری تمام زیست ہے بکھر کر سمٹ جاتی ہوں —

محبوب! آج بھی میری نازک انگلیاں ستار پر لرز رہی ہیں اور اس میں سے میرا زندگی کا ساز نغمہ بن کر ابل رہا ہے — چمبیلی کا گجرا، سبز غبار اور تمہاری یاد کے ساتھ میرے تخیل میں چپکے چپکے خاموش آنسو — میرے خیالات کی دنیا اسی چمبیلی ہی کی طرح تو خاموش ہے، ستار پر نازک انگلیاں پھیرتی ہوں — موت کی خواہش کرتی ہوں۔ کاش کہ موت مجھ سے قریب ہو جاتی، تو یقیناً میرے تخیل کی چمبیلی ہی کی طرح سکون پاتا —!

تار کو چھیڑتی ہوں، اس سے نکلے ہوئے نغمے بے چین، مگر کچھ پر درد لگتے مجھے — اگر کبھی پھر تمہارے نزدیک لے جا سکے ہیں اس مانوس وادی کی طرف جہاں میرا بچپن کھیلا تھا، میرا زندگی بھر کا پیار —!

وہ برسات کا دن تھا، جب اپنے مکان کے سائبان سے کھڑی پانی کی ان ننھی ننھی بوندوں کو دیکھ رہی تھی جن کی ہستی یوں ختم ہو جاتی تھی جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ میرے گرم سانسوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں الجھ کر کچھ ہوتی تھیں، میرے جسم سردی سے بہم جاتا۔

اور میں اپنے چہرے پر بکھری ہوئی زلفوں کو ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ یکایک میری نظر تم پر پڑی، جیسے سنگ مرمر کے بت کے سہارے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے ہوں۔ بال بے ترتیبی سے پھیل گئے تھے تم نادان ہو، بت نہیں۔ کاش کہ بت ہوتے۔

تم سائبان میں میرے قریب پہنچ گئے۔ کپڑوں کو نچوڑ کر خشک کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگے، تم نے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک تمہاری بے باک نظریں مجھ پر مرکوز رہیں، پھر تم جھجکتے ہوئے بولے "کچھ دیر کے لئے کیا میں یہاں رک سکتا ہوں —؟"

تمہاری آواز خلوص سے پُر تھی۔ میں فوراً جواب نہ دے سکی۔ نسوانی حیا کے سبب میری آواز نہ نکل سکی۔ نظریں نیچی کئے رہی، پھر تمہارے قرب کا لطیف احساس ہوتے ہی شرما گئی۔ کچھ دیر تک تم نے وہی سوال دہرایا — کتنے معصوم تھے تم ایک لڑکی سے ایک عورت سے پناہ کی اجازت مانگ رہے تھے جس کے دل میں نہ ماں کی ممتا اور بہن کا پیار تھا۔

جو صنف نازک کی دیوی ہوتی ہے۔ لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ تم میرے مہمان ہو — ایک مسافر ہو۔ میں نے شرماتے ہوئے تم سے اندر چلنے کی درخواست کی تھی۔ کاش! میں تم سے یہ درخواست نہ کرتی، تو آج مجھے یوں تڑپنا نہ پڑتا۔ کچھ سوچنے کے بعد تم میرے ساتھ چلنے کو آمادہ ہو گئے۔ میری رہنمائی میں تم اندر آئے۔ میں نے تمہیں بابو جی کی سفید قمیص اور دھوتی عطا کر دی، تم نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جہاں یہ گمان نہیں تھیں۔ میں نے کہا "میرے میرے پتا جی کے کپڑے ہیں"

"جی! میں تو اب ٹھیک ہوں، اور اب تو بارش بھی ختم ہو چکی ہے"

شاید کبھی کا احسان لینا تم پسند نہیں کرتے، اس لئے جھوٹ بول گئے تھے۔ تمہارے اس تکلیف دہ جھوٹ پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ سردی کے مارے جاڑے کے دانت بج رہے تھے۔ فل پینٹ اور قمیص بھیگ کر چپک گئی تھی اور تم انکاری پر تلے ہوئے تھے۔ تم نے شاید میری خفگی کو محسوس کر لیا۔ بے دلی سے کپڑے لے لئے، اور میں اندر چلے بنانے کے لئے چلی گئی —!

بابو جی کے کپڑوں میں تم ایک بانکی معصوم اور خوبصورت شاہکار لگ رہے تھے۔ میں تمہیں ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ نہ جانے تم کیوں اتنے حسین لگ رہے تھے؟ جانے میں کب تک تم میں ڈوبی رہتی کہ چائے کی تپش نے مجھے چونکا دیا۔ اپنی بے باکی کا خیال آتے ہی میں شرما گئی، چائے کی پیالی تمہاری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "آپ چائے پی لیں تو سردی کی شدت جاتی رہے گی"

"دیکھئے — تم بولے "آپ حد سے زیادہ تکلف کرتی ہیں —" اور میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ باؤلے اس محبت کے جذبات کو کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ میرے دو تین دفعہ اصرار کرنے پر تم نے چائے کی پیالی لے لی اور اپنے ہونٹوں کو پیالے سے لگا دیا۔ میرا دل جانے کیوں اور زور سے دھڑکنے لگا۔ پینے کی نہ جانے کون کون سی بوندیں ہونٹوں پر ٹھہر گئی تھیں، کچھ کہی تو نہیں ہوا تھا، صرف

یلے کے اس کنارے پر تھے جہاں میں خود ..... ؟
تم نے مجھ سے سوال کیا ہے آپ کیا کرتی ہیں۔ آپ کا باجی
ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے ؟"

اتنے سارے سوالات کا جواب دے کر میں نے تسلی
جب میں نے تمہارے متعلق پوچھا۔ تو تم نے بڑی ہی حقارت
ہ لہ۔ اے پاس ہوں۔ اٹھ دیو کے لئے گیا تھا ہر جگہ
قسمت وہاں بھی ساتھ تھی ۔" تم مسکرا رہے تھے مگر
بہت طنزیہ تھی، مجھے انسانیت کے ناطے تم سے ہمدردی
کاش یہ ہمدردی کچھ اور شکل اختیار نہ کرتی ۔۔۔۔
ہ گئی مو ضوع پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی کتنے اچھے خیالات
ارے، جیسے ایک بلند پایہ مصنف یا مفکر کے ہوتے ہیں
ارشاد ختم ہو چکی تھی۔ تمہارے کپڑے بھی خشک ہو چکے تھے
کہ تم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ تم جا رہے تھے، میں نے
ندگی پھر رک جانے کی درخواست کی لیکن تم نہیں رکے
اب تو بارش بھی ختم ہو چکی ہے اور مجھے گھر بھی تو جانا
تم بولے۔

ہیں تمہیں کیسے مجبور کرتی ؟ میں ایک لڑکی تھی ۔ یہ
ھک جاؤ میرے جذبات کو نہ کچلو۔ تم تو ایک اجنبی
را ہی اٹھا ہو اطوفان جو چند منٹ کے لئے رکا تھا
ں پیار بھی کر بیٹھی تو ایک اجنبی سے جس کی نہ تو منزل
کوئی نشان۔ میرا دل تمہاری یادوں سے بھر گیا۔
ن میں دن کاٹنے لگی۔ ظالم میں کس طرح بارش میں
ا ش کہ تم جان سکتے۔ اس دن کہ کسی پیغام کا انتظار تھا
ں کا جائے آ رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی سر جھکائے
آ رہے تھے۔ میں نے تمہیں آواز دی ۔۔۔

"سنیل جی ۔۔۔!"

تم نے مجھے چونک کر دیکھا۔ دیکھ کر پہلے ہر تو خوش ہو گئے
ہاری افسردہ ۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلنے لگی۔
چھا آپ کہاں تک چل رہے ہیں۔ ؟"
"بانداتک ۔" تم نے جواب دیا۔
ندگی کا کاش کہ تم یہ جان سکتے کہ تمہارے اس

عنصر جواب سے میرے دل پر کیسی ضرب پڑی تھی۔ میں دل
برداشتہ ہو گئی۔ سوچا کہ میں ایک عورت ہوں۔ تم سے اپنی
بے قرار تمناؤں اور آرزوؤں کا اظہار کر گئی تھی۔ میری آنکھوں
میں آنسو آ گئے تھے ۔ کاش تم یہ جان سکتے کہ تمہارے اس
دن چلے جانے کے بعد سے میں نے کیسی رنج و نا امیدی کے ساتھ
کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ پھر بھی میں مسکراتے
ہوئے بولی "میں بھی دیر سے چل رہی ہوں ۔" نہ جانے کیسے
میں اتنی بے باک ہو گئی تھی، تمہارے جواب سے میرے اندر کوئی
تبدیلی نہیں ہوئی۔ شاید تم نے میری افسردگی کو محسوس کر لیا
نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ تمہاری آنکھوں میں تڑپ کی
جھلکیاں تھیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھے کبھی نہ تڑپا دو گے
اصرار کرنے پر تم ہو لیے تک چل سکتے تھے۔ پھر کے درمیان
خاموشی ہی رہی۔ تم خاموش رہے اور خاموش ہی چلے گئے
میں تڑپ کر رہ گئی۔ میں اندوہ آرزوؤں کے ساتھ میں سوچنے
لگی ۔ تم اداس کیوں رہتے ہو۔ ؟

مجھے کیا ہو چلا تھا۔ میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔
ہر وقت تمہاری افسردگی کا خیال مضطرب کئے رہتا۔ کمال
ضبط سے تڑپتے ہوئے میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی
تھی کہ کہیں جذبات آنسو بن نہ بہہ پڑیں۔

ایک روز کالج سے میں تمہارے قصد میں کھوئی ہوئی
چلی آ رہی تھی کہ مجھے تمہارے گھر کا خیال آیا۔ اور بھولے پتے
کے سہارے چل پڑی۔ تم مجھ سے کافی دور رہتے ہو۔ پھر بھی
میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی نکالا چھوٹا سا پختہ مکان۔ باہر
دروازے پر دو چار گیندے اور موتیے کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں
دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے پر ایک بوڑھی عورت نکلی۔
میں نے تمہیں پکارا۔ تم شیر خادیتے ہوئے وہ بولیں
"بیٹی تم کس سے ملنا چاہتی ہو۔ ؟"

"سنیل جی سے ۔" بڑی مشکلوں سے تمہارا نام لے
سکی، مجھے لجا آ رہی تھی۔

"وہ تو ہے نہیں ۔ مگر آتا ہی ہوگا ۔"

میں واپس ہونا چاہتی تھی۔ لیکن ماں جی نے روک لیا۔
اور اصرار کر کے مجھے اندر لے گئیں۔ تمہاری ماں کے دل میں
کتنا پیار تھا۔ کتنا خلوص تھا۔ کاش کہ میں زندگی بھر
تمہاری ماں کے قدموں کی پوجا کر سکتی۔

تمہاری شوخ و چنچل بہن مینا ہے نا، مجھے کھینچتی ہوئی
تمہارے کمرے میں لے آئی۔ تمہارا کمرہ کیا تھا۔ دیوار پر بڑے
بڑے جہازوں اور کوہوں کے چترا ویزاں تھے۔ دو چار کرسیاں
تھے۔ کونے میں ایک ٹیبل اور کرسی پڑی تھی جس پر بہت اور
ڈھیر ساری کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کھڑکی تھی جس کے
بغل میں تمہارا پلنگ تھا۔ ایک بوسیدہ چادر بچھی ہوئی تھی
ایک طرف ستار لٹکا ہوا تھا۔ میں مینا سے پوچھ بیٹھی ۔
"یہ ستار کون بجاتا ہے ۔۔۔ ؟"

"بھیا جی ! وہ بہت ہی اچھا گاتے ہیں اور جب گاتے
ہیں نا دیدی تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں ۔"
وہ معصوم اپنی حیرت کو چھپا نہ سکی۔

"اچھا ۔" اور تب مجھے احساس ہوا کہ تم افسردہ
کیوں رہتے ہو۔ ہونا آخر ایک سنگیت کار، جس کے دل
میں داغ جگر میں سوز، آواز میں درد ہو تا ہے

"وہ روز سنگیت سبھا میں جاتے ہیں۔ آپ سنیں
گی ؟" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی معصومیت اور شوخی
اس چھوٹی مینا کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی

میں خیالوں میں گم تھی کہ تم آ گئے۔ بکھرے بال۔
پریشان حال، مضطرب، کھوئے کھوئے سے۔ مجھے دیکھ
کر تم ٹھٹک گئے تم مجھے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں
میں تمہاری آنکھوں کی تاب نہ لا سکی اور میری نظریں خود بخود
جھک گئیں۔ میں نے کہا "نمستے"

"نمستے ۔" تم نے بے رخی سے جواب دیا۔ وہی مانوس
آواز، وہی پرانا انداز

"میں آپ سے ملاقات کرنے آئی تھی ۔" نظریں جھکائے
ہوئے میں نے کہا۔

"بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں میرا خیال ہے۔"
تمہارا جواب طنز سے بھرپور تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم

نے فقرہ مکمل کیا۔

میرا دل جو تمہارے آجانے سے کھل اٹھا تھا، مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں پہلی دفعہ نہیں، تمہارے یہاں ہمیشہ کے لئے آگئی ہوں۔ میں جلدی سے منہ موڑ کر تصویریں دیکھنے لگی کہ تم کہیں میرے آنسو نہ دیکھ لو، سمجھ لو میرے جذبات کو کمزوری نہ سمجھ لو۔۔۔!

تم نے زبردستی چلنے پر مجبور کیا تھا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر میں جانے لگی۔ تم میرے ساتھ باغ کے دروازے تک آئے۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ میرا وجود سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ یہ کہتے کہتے میرا گلا رندھ گیا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ لیکن تم نے میرا آنچل پکڑ لیا پھر تم خود مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ "تڑپا کر، میرے جذبات کو روند کر۔۔۔!

میں رات بھر سو نہ سکی۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی تھیں محبت سے نفرت تھے جس کی بنا پر تم نے میرے جذبات کا قتل کیا۔ مجھے روک بھی نہ سکے۔ بہتے ہوئے آنسو تمہیں تمہارے دامن کی ضرورت تھی۔ تم نے خشک کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں تم سے پیار کرتی تھی۔ کتنی بڑی بھول تھی میری۔ آخر تھے تو تم ایک مرد۔ میں کا دل پتھر ہے، جسم ہوتا ہی نہیں۔ تمہیں میری محبت نہیں چاہئے تھی۔ تم تو میری کمزوریوں کو سنوار رہے تھے، اس لئے تو زندگی سے قدم پیچھے ہٹا لئے تھے۔ تمہیں بھول جانا ہی میرے جذبات کی تسکین تھی۔

دن گزرتے گئے۔۔۔ اور میں تمہیں بھولنے لگی۔ میں خاموش تھی۔ میرے ہونٹ باتوں سے دبے ہوئے تھے میرے دل میں تمہارے لئے اب کوئی عقیدت نہ تھی اور نہ کوئی نفرت!

حسب دستور اُس دن جب میں کالج سے واپس آئی تو تم بابوجی سے باتیں کر رہے تھے۔ آہ! تم مجھے پھر تڑپانے آگئے تھے۔ میں تمام جذبات کو سرد کر چکی تھی۔ تم پھر اس میں چنگاریاں چھوڑنے آئے تھے۔ میں تم سے جانا نہیں چاہتی تھی، مجبوراً جانا ہی پڑا۔ بابوجی نے مجھے بلایا تھا۔

تم نے مجھے نمسکار کیا۔ بابوجی نے کہا

"بیٹی! بیل تمہارا کب سے انتظار کر رہا ہے؟"

حیرت تھی کہ تم ایک سنگ دل میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ تم آج پھر اتر دیو سے مایوس لوٹے ہو۔ بابوجی اُٹھ کر چلے گئے۔ مگر میں بدستور خاموش تھی۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔۔۔" تم مسلسل خاموشی سے تنگ آکر جھلاتے ہوئے بولے۔

میں رونے لگی۔ محبت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ رونے کے سوا کر بھی کیا سکتی ہے۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ چکے تھے

تم نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسوؤں کو خشک کیا بازو کا سہارا دیا۔ مجھے جھلتے ہوئے شرماتے ندی تک لے آئے تھے، تم نے مجھے وہاں ایک گیت سنایا تھا۔ کتنا درد، کتنی تڑپ تھی تمہارے گیت میں۔ اور میں تمہارے گیت کے بول پر تڑپتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ تمہیں لے کر سپنوں کے جزیرے میں پہنچ جاؤں۔۔۔

میں دور ندی کے کنارے سبزہ زار پر اپنی انگلیوں سے ستار کے تاروں پر کوئی نغمہ الاپتی رہتی اور تم میری آغوش میں سر رکھے گھاس پر لیٹے رہتے۔ میں، دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن تم خاموش مجسمے کی طرح پرسکون تھے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں میں تم سے روٹھ کر چلی آئی دل میں یہ تمنا لئے کہ کہ میرا محبوب مجھے منانے ضرور آئے گا۔ لیکن یہ خود پسندی تھی۔ تم تو زندگی بھر کے لئے روٹھ گئے۔ مجھے کھو چکے تھے۔ میں تمہاری نہ ہو سکی۔ کاش کہ تم میرا ساتھ دیتے ہم دونوں دور کسی سمندر میں جا کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جاتے۔۔۔

ایک دن مینا آئی، اس کے ہاتھوں میں تمہارا ہی ستار تھا۔ وہی ستار جسے بارہا میں نے اپنے ہاتھوں سے چھوا تھا ایک مختصر سا خط بھی تھا۔

"بھلا! شادی مبارک ہو۔ غریب ہوں کچھ اور تو نہیں ستار بھیج رہا ہوں۔۔۔

تمہارا بیل۔۔۔"

خط میں ایک تڑپتی آرزو تھی۔ لیکن میں بے خبر تھی۔ شاید تمہارے خوابیدہ تار جھنجھنا اٹھے تھے اور سرد جذبات کراہ اٹھے تھے۔ کبھی کبھی تم گھبرا جاتے ہو گے میرے مجبور لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مجھے بے وفا نہ کہو گے۔ بے وفا سہی تم نے مجھے دوسرے کے سپرد کر دیا۔ جسم دوسرے کا ہے یہ روح نہیں۔۔۔ یہ ہمیشہ تمہاری ہے تمہاری رہے گی۔ تمہاری محبت بازو پھیلائے میرے دل میں آباد ہے اور دن رات میرے تصورات پر چھائی رہتی ہے۔۔۔

بابو جی نے چونا بیل! میں تمہارا انتظار صدیوں کرتی چاندنی رات کو۔۔۔ میں تمہارے ہاتھوں میں اپنی انگلیوں سے شاعری کروں گی۔ آنچل کی ہوا دوں گی۔ تمہاری شکن نیند کے لئے ستار بجاؤں گی۔ میری پلکیں بوجھل ہو کے ہوئے آنسو ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔۔۔

الوداع میرے محبوب۔۔۔!

بقیہ افسانہ آدم ——— صفحہ ——— سے آگے

آنسو آنکھوں ہی میں جذب ہو گئے اور شاہد کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"دیکھ لیا دیدِ دل۔۔۔!"

کہیں سے آواز آئی اور شاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔۔۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ یکایک گلی کی اور بادل اتنے زور سے گرجے کہ فرش و فرش، ہوش بھی کانپ گیا۔۔۔ اور کہیں دور۔۔۔! بہت دور سے خدا بول اٹھا۔۔۔!

"نہیں۔۔۔! نہیں۔۔۔!!" میرا آدم نہیں ہے!!

میرا آدم نہیں ہے! اس کے لئے ایک اور جہاں بناؤ۔۔۔ ایک اور۔۔۔۔۔ جہاں۔۔۔۔۔ بناؤ۔۔۔۔۔!"

اور بادل آنسوؤں کی ندیاں بہانے لگے۔۔۔ ایک شاہد ان آنسوؤں کی پروا کئے بغیر چلا جا رہا تھا۔۔۔

ازراہِ عنایت اپنے حلقۂ اثر میں شمع ہفتہ وار کی توسیع اشاعت فرمائیے

ایک آرزو، ہزار غم

[illegible] کے قریب سے
[illegible] نے [illegible] اور [illegible] کی خوشبوؤں
[illegible] اضطراب [illegible] اتفاقاً [illegible] سرشار [illegible]
[illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]

کہہ گئی ہے کہ میں اس کے بھائی کی شادی میں شریک ہوں۔ اس کے خلوص اور محبت کی قدر کرتے ہوئے میں نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔

"وہ..... آپ کہاں تھے اب تک..... میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔" انجمن کے لہجے میں اب وہ بے تکلفی نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ مصنوعی چاشنی تھی۔

"آپ نے مجھے غلط سمجھا کہ میں نے اپنے تخلص پر دل کو زخمی کر ڈالا ہے اس کا مجھے احساس ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں اور اپنے گرد و پیش کو بھلاتے ہوئے بولا۔

"وہ آپ کی باقی سہیلیاں کدھر گئیں۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سب چلی گئیں۔ کیوں۔ کیا آپ کو ان میں سے کسی سے پھر ملنا ہے۔" وہ ایک ادائے خوت سے بولی

"جی نہیں۔ مجھے تو صرف آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔" میں نے اپنے ذہن اور دل میں اٹھتی ہوئی کمزوری کو دبوچتے ہوئے کہا۔

"چلئے۔ وہاں گھاس پر بیٹھیں۔" وہ اپنے بدن کو اپنے نرم ہاتھوں کے دائروں سے گھیرتی ہوئی میرے ساتھ آ گئی۔ اس کے قریب آتے ہی میرے جسم میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اپنی توجہ اس کے چہرے پر مرکوز کر دی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ انجمن کے چہرے کے نقوش میں حسن اور دلکشی تھی۔ میں اس کی خوبصورتی کو دیکھتا رہا اور وہ میرے چہرے کو پڑھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے یہ بتانا غلط اور نہ ہی مجھے غلط جانئے۔ کیا یہ کافی تاخیر سے آنے کا سبب تو نہیں تھا آپ کے دل میں کسی سے۔ تب آپ مجھے بتا دیں۔"

"جی نہیں۔ وہ اصل میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا..... میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا..... بس یہ سمجھ لیں کہ آپ کی خاطر میں..... انجمن میں نے آپ کو..... آپ کو..... آپ کو..... میری ایک شاعر ہوں۔ شاعری میری روح کی غذا اور میری ذات اور فن کا بہترین سہارا..... اس نے میری بات کاٹ دی اور حیرت سے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"آپ شاعر ہیں۔ یہ کیا تخلص ہے آپ کا۔ بہت مسرت کی بات ہے۔" وہ اپنے چہرے کے نت نئے تاثرات تراشتے ہوئے میری جانب دیکھنے لگی۔

"ہاں! میں نے تخلص کرتا ہوں..... بالکل میں کبھی باقاعدہ انجمن صاحبہ..... میں ایک عمدہ شعر کے تمام تاثر کو پھر کھنگالنے کے لئے تھوڑا رکا۔ وہ اپنے نام پر چونک کر رہ گئی۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ میں ایک شاعر ہوں۔ میری روح ہی میری غذا ہے..... وہ رنگ اور کیف..... نغمہ و نکہت..... یہ سب آپ کے تخلص و وجود میں پایا ہے..... مگر مجھے ان دو گھنٹوں میں آپ کی تلاش میں پتہ چل گیا کہ آپ نے مجھے اپنے اتفاقات کے قابل نہیں سمجھا۔"

"جی..... جی..... وہ دراصل..... میرے بھائی صاحب..... اور گھر کے لوگ میں ان کے ہمراہ تھی۔ ابا جی چند لمحوں کے لئے سہیلیوں سے ملنے کے لیے نہ اٹھ گئے۔ میں آپ کے ساتھ آ گئی ہوں کہ آپ مجھے خود غرض اور مطلبی نہ سمجھ لیں۔" وہ اتنا کہہ کر ایک نوجوان کی جانب بڑھ گئی جو اس سامنے والے گروپ کے درمیان کی طرف کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ اپنے چہرے پر نقاب ڈالے اس محفل سے چلی گئی۔ وہ چلی گئی۔ ساری خوشیوں..... آنچلوں کی سرسراہٹ..... چوڑیوں کی کھنکناہٹ اور پھولوں کی نزاکت..... نقاروں کی چوٹ اور ہونٹوں پر کلیوں کا سرور لے کر چلی گئی..... اور میں اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں اسے روک نہ سکا..... میری قوت گویائی..... اور قوت خود فکر..... مفلوج اور بے جان ہو کر رہ گئی۔ میرے دوست! اور پھر اسی سے میں ان سریلی خاموشی اور خیروں میں پڑا انجمن کے وجود کو تصور میں لیکر ہوا میں پکڑنے کی پرستش کرتا رہا۔ میں..... تو..... تو..... تو..... میری ایک

میں نے انجمن کی اور خاموشی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر گمبھیر خاموشی اور یکدلی سمٹ آئی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات امید و بیم کی حالت میں پھیلتے ہوئے پھر کہا۔ تم..... تم..... تم کیا میرا مذاق اڑا رہی ہو اور میری محبت آفریں جذبے کا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو۔"

"ہاں۔ ضرور۔ آپ کا ادنیٰ خادم۔ شاعر نہیں۔ مس سدھا کہہ..... میں اس کا محبت زدائی کر۔ آپ مجھ سے یہ مذاق نہ کریں۔ میں نے تین سال سے جانتا ہوں۔ ایک مرتبہ وہ خود میرے گھر پر آ کر میری بہن کی شرارت سے مجھے بے وقوف بنا چکی ہے۔" میں نے نیم کا اس کی گود میں پر سے اٹھاتے ہوئے پھر بات اس کے ذہن نشین کرائی۔ وہ عجیب سے پر جلال لہجے میں بولا۔

"لیکن کس طرح..... وہ کیسی..... تم کیا میری یہ پانچ گھنٹے کی پستش بے کار ہو گئی۔" وہ

"اور نہیں تو کیا..... مس سدھا جب کبھی اپنی مسلم سہیلیوں کے ہمراہ کہیں باقی ہے تب وہ اس سدھا انجمن ہوتی ہے اور وہ اپنے کو پنجابی مسلم لڑکی بتاتی ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ ہرگز ہرگز مسلم نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلم گھر اور اصل سے ایک عیسائی لڑکی ہے۔ اس لئے وہ اکثر مسلم میلوں اور تقریبات میں اپنے آپ کو مسلم لڑکی بنا کے پیش کرتی ہے۔ اور اس کے کھلی ذہنیت کا مظاہرہ وہ اپنی سہیلیوں کے درمیان اڑاتی ہے۔ میں نے بھی اس کی اس بصیرت سے متاثر ہو کر اس کو پہچاننا چاہا۔ مگر وہ بے حد ہوشیار اور چالاک نکلی اور میں اس کی چالوں کا شکار ہو گیا۔ اس لئے میں گرفت میں نہ آ سکی اور میں اس کے بعد بھی آج تک محبت نہ کر سکی۔ وہ مجھ سے محبت کے لئے ایسے کردار ادا کرتی ہے اور بس۔" وہ میری خاموشی کو نہ سمجھتا ہوا بولتا رہا۔

"نہ میرے خدا۔ میرے اس کی زندگی..... اور وہ تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔

طرحی مشاعرہ نمبر ۶

ناظم مشاعرہ
حضرت علامہ آغا احسنی گنوری

غزل کے ساتھ اپنا نام طرحی مشاعرہ یا اس کے متبادل
چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں

حضرت ناظم احسنی شکوہ آبادی

نصیب یار ہیں کانٹے ہیں ہم فغاں سے ۔۔۔ شکوہ نہ ہو تو کریں فریاد باغباں سے
نہ تار دامن گلہائے ہیں بدگماں سے ۔۔۔ ہم حال دل چھپا کر پہنچائے رازداں سے
ہوا تو کہنے میں پہنچی ہے بات ان کی ۔۔۔ بہتر کی ہیں لکیریں جو کہہ یا زباں سے
ہوئی ہیں کوششیں ہیں ختم ہی پریشاں ہیں ۔۔۔ ہر وقت واسطہ ہے انساں کا امتحاں سے
ہے قصہ مختصر ان کا بس فسانہ ۔۔۔ مجھ کو غرض نہیں ہے دنیا کی داستاں سے
جگمگا رہے ہیں شمعے بھڑک رہے ہیں ۔۔۔ گلشن میں رونقیں ہیں اک میرے آشیاں سے
ننگ یہ بشتہ لازم فرض ہو گیا ہے ۔۔۔ بھروں سے آستاں ہے تجھ تیں آستاں سے

عبدالحفیظ اکبر بھٹنڈہ

کیا فائدہ دل کا تو پردہ اس جہاں سے ۔۔۔ بہتر ہیں جو جا بے یار نکاں سے
جو یہ اٹھا کر چلتا ہوا یہاں سے ۔۔۔ آزاد ہو گیا وہ فکر فرم جہاں سے
داس کے میرا قصہ کہتے ہیں قصہ خواں سے ۔۔۔ ترنے مجھے بنایا میری ہی داستاں سے
مجھ کو ہی ملے ہے مجھ کو ہی ملے گا ۔۔۔ تقدیر میں لکھا کر لایا ہوں جو جہاں سے
دولت ہے پاس اس کو حزب لیتے ۔۔۔ بازار میں جو ملتی الفت کسی دوکاں سے
ہیں اس کے آستانے سجدے کروں کیونکر ۔۔۔ بھرتی ہے آستاں سے سجدے میں آستاں سے
جینے کے ساتھ جینا جیتے ہیں سکھ کے ساتھ ۔۔۔ اچھی نہیں عداوت یاروں کی دوستاں سے
عبدالحفیظ اکبر بھٹنڈہ

زندہ نہ رہ سکوں گا اٹھا جو میں یہاں سے ۔۔۔ مجھ کو اٹھا نہ دینا تم اپنے آستاں سے
جس گھر جا وہ ہوں میں چھپتے ہے جہاں سے ۔۔۔ واقف ہوں اچھی اس گھر جا دو داں سے
کب تک نہ کرو گے مجھ سے تم بدگماں سے ۔۔۔ کب تک دیا کرو گے دھوکے فریب جانے
بستے ہیں دل لگا کر کے بغیر کیوں کر ۔۔۔ جاؤں گا یہاں کی رنگینیاں یہاں سے
مجھ سے نہیں محبت کتنی ہے کیا بتاؤں ۔۔۔ جب بھی انہیں بلایا آئے وہ لاکھاں سے
ہے بھی نصیب میں کیا رسوائیاں بھی ہوں ۔۔۔ لیں گے نہ در میں عزت دیں گے نہ داستاں سے
حسرت سے دیکھتا تھا تڑپ کے اس کی جانب
جب آشیاں جلا کر نکلا میں گلستاں سے

محمد حسین مبشر۔ جودھپور

صیاد سے عداوت شکر ہے باغباں سے ۔۔۔ اچھا ہوا کیا پیدا الفت ہے گلستاں سے
تعمیر کی فکر ہے اب قفس میں ۔۔۔ صیاد تجھ سے لڑ کے تو میرے آشیاں سے
فکر ہیں آپ لیکے کیا کوئی قسم کھائے ۔۔۔ رہتے ہیں ان دنوں وہ کھنچے کھنچے سے یہاں سے
ہم نے ہے سنا ہوا کہ تھا جس قدر بھی ۔۔۔ اپنا جہاں نچھاور کرتے ہیں ہم جہاں سے
چپ ہیں خاموشی سے باقی ہے بھرم تمہارا ۔۔۔ گزری جو میرے دل پہ وہ کیا کہوں زباں سے
اس کا جنازہ پھر تو شامل ہے میاں ہو ۔۔۔ پردہ اگر دوئی کا اٹھ جائے درمیاں سے
انسان جاہتا ہے سونے تک مبشر ۔۔۔ اہل زمیں کا رشتہ قائم ہے آسماں سے
مبشر جودھپوری

نکلے دعا ئیں جو کر تکلف ہے میری زباں سے ۔۔۔ جو اس قدر ہیں فرمائے دوستاں سے
ہم تیری جستجو میں گزرے کہاں کہاں سے ۔۔۔ کہے سے بنگلے سے بیت سے آستاں سے
کیوں اٹھ کے بیٹھ گئیں شمعے برست گستاں سے ۔۔۔ آئے نہ بات پر میں ہم چل کے باغباں سے
کی جا کے جو ہم نے تجھ سے یہاں وہاں ۔۔۔ آخر وہ کچھیوں سے محفوظ نہ پائے
اس زندگی کا پھر دو اٹھے تو در سے ۔۔۔ شبنم اوس کا جزو دیکھیں تو ہم بھی لیکن
کچھ دن کے سوچا ہم نے ترے مکاں سے ۔۔۔ جہات تھی فروزی دیدات ہو نہ پائی
میرا وہ ناتواں ہیں کب گردش جہاں سے ۔۔۔ مکاں و بیکراں ہیں نشتر مرے مزائم
نذر بھوپتہ پوری

کس کس کو کیا خفا ہے تعمیر آشیاں سے ۔۔۔ سب جانتا ہوں لیکن اب کیا کہوں زباں سے
کیوں غم ہے اس کا افسوس غم ہے اس کا ۔۔۔ اس راز کو جو کھولوں لاؤں سمجھ کہاں سے
ہر ذرہ گھر ہے اس کا ہر گھر ہے اس کا ۔۔۔ آپس میں پوچھتے ہیں فرشتے یہ گھر کے
لب ہیں تو ہیں اپنے اندیشہ خزاں کی ۔۔۔ لکھتے ہے وہ مجھ کو صیاد رائیگاں کی
ہے بھی نہیں ہے ہم کو ہر گز ہوا کی پروا ۔۔۔ اس واسطے نشیمن چھوڑا ہے میں نے اپنا
ہے سنتے ہیں اذیت میرے ہاتھ میں گل ۔۔۔ کیوں کاٹ کر کانٹے اگتی ہے شیخ انجمن کی
جیسے کہ وہ ہستی پائے ہے ہستی کے ساتھ
ہم ہیں تو ہیں جہاں کے ہستی ہے جس سے ہستی

ت تیرتی
ے تشنہ پانی تو یہ گلشن سے
ے دل کی کلی کھلتی ہے جہاں سے
ہ شکل خودی قاتل پہ ابھی ہے
مگر سے ہم نے سیکھا ہے اسی چھن کو
لاہی میرے دل کی کلی کیوں آہا ہے
خیال کیجیں اس بات کو نہ بھولیں
ے جب تھا ملے پھر فرد دل افگنی ہے
بدالقیوم صدیقی مسکت خیرپوری

ب ہوں نکو کرم چھوٹے کے نشاں سے
ت ہوئی یہ دل کی گہرائی فغاں سے
ب سے الجھتی موجوں سے جنگ کرتی
ہ پہ آج مچلے ایسے بھی چند قافلے
ہ ساحل گلشن ، ہیں سواد گلشن
ہ ائیوں کا عالم اس عہد میں نہ پوچھو
ناز زندگی ہیں رنج و محن ہیں ارزاں
دلی شبنم بشکوہ آبادی

ے ہیں حادثے بھی کچھ ایسے دوراں سے
ان دوش پر بکھیرے بیٹھے ہیں گیسوؤں کو
تا ہے ہیں کیوں دوں کیوں تو دنیں جاگتے
ا سکوت بن گیا ہے جلوؤں کا ایک مسکن
ات کی گھٹا ہے یا رات کی ہے ظلمت
مؤں پہ آج شبنم فیض گئی ہے مجھ کو
ابراہیم قمر ۔ بارانوی

ہ ہاں تو پر ذرّیں نہ آسماں سے
روئے ضیئت برق تپاں کی مجھ پر
ہ ہو خود کی منزل سے واقفیت
ہاں منزل آجائے میرے پیچھے
ہ ہوئے ہے جو کہ ذوق طلب کی توفیق

یہ تو ہے تیرے ہاتھ ان کو
ہے سب کچھ تیرے ہاتھ میں

احسان علی بیتاب ماہچوری

رخصتی جہاں سے صورت گلستاں سے
ابھی چمن نکلے مجھ سے نہ گلستاں سے
ے خوار ہو کہ واعظ ، ہو شیخ یا برہمن
کیوں کر نہ کھائے ٹھوکر وہ در بدر کی یارو
لطف و کرم سے دامن آ کے بھر لو اپنا
کر لو نثار آکر دیدار آخری تم
لطاف انصاری سلطان پوری

عالم بدل گیا ہے اب شدت فغاں سے
گزرا ہوں گلستاں سے آیا ہوں کہکشاں سے
دیر و حرم کی باتیں ، دیر و حرم میں ہوں گی
اک ایک خار و گل پر پیرہ رد گی ہے طاری
راہوں میں کاروانوں کی کٹتے ہوئے ہیں منزل
الطاف واقعے ہوتا ہے کیف حاصل
منظہر رتلامی

اہل چمن ہیں خاموش کیا کہوں زباں سے
دنیا جو چاہے سو چے رہتا جو چپا ہے سمجھے
ہر اک ستم تمہارا ہم نے کیا گوارا
میرے وجود سے ہے تیرا وجود ظاہر
قت ایسے آدمی پر قت اس کی زندگی پر
پیش آ رہے ہیں مجھ سے کس بے رخی سے منظر
مقصود نسترنی - اندور

مجھ کو تو پوچھنی ہے یہ بات باغباں سے
ان کی محبتوں کا سایہ اگر نہیں ہے
برداشت کر لیں گے وہ بھی خوشی خوشی سے
الفت کے ماہروں کا یہ مجھ کو مشورہ ہے
انسانیت سے انساں بے گانہ ہو رہے ہیں
مقصود زندگی میں جرأت کی ہے ضرورت
کریم ا سعدی - بھاگلپوری

عاقبت میں ہم اگر چہ برق شرر فشاں ہے
اب سجدہ کر رہے ہے کس آستاں پہ جا کر

ہیں تیرے جستجو میں گزرا کہاں کہاں سے
برق تپاں کی ہافت پھر پوچھ شیوں سے
ہفت ہوں نام تیرا ہر ایک کی زباں سے
جلوہ ہو گیا ہے اپنے ہی کارواں سے
آواز آ رہی ہے یہ آستاں سے
ہم آ گئے ہیں آئے تھے کل جہاں سے

دل میں مچل رہے ہیں سوز فغاں سے
ہیں جستجو میں تیری گزرا کہاں کہاں سے
مجھ کو ہے خاص نسبت تیرے ہی آستاں سے
آنکھ گئے ہیں اب تو اس فکر گلستاں سے
کہتے ہیں گئے ہیں راہوں میں کاروانوں سے
لیتا ہوں نام اکثر جس وقت بھی زباں سے

کیوں برق کو ہے الفت میرے ہی آشیاں سے
مجھ کو ہے تم سے مطلب کیا واسطہ جہاں سے
لیکن بتاؤ کوئی شکوہ کیا زباں سے
سجدوں سے آستاں ہے یہ آستاں سے
جینے کے واسطے جو مرتے ہیں جہاں سے
کیا جانتے وہ کچھ ہیں اس درجہ بے گانے

5 MAR 1964

اس انجمن میں شعلے لگی ہے سبھی کے دل

شعلہ و شبنم دہلی

مارچ
۱۹۶۴ء

زرِ سالانہ
چار روپے
ششماہی
دو روپے

فہرس

۱۱-	حرفِ اوّل	صدر اسرائیل	
۲-	صمد حمیدی		
۳	عیلی اثر		
۴	مصنفِ جلت دبیر کے چند غیر مطبوعہ مشاہیر		
۵	ارشادات		
۶-	۵ غزلیں		
۷	غزلیات		
	"		
۸	افکار فن		
	"		
۹-	جلال و جمال		
	"		
	"		
۱۰	مصور کا شاہکار	(مرقعات)	
۱۱	سہار		
۱۲	گلاب کے پھول		
۱۳	مُدّا		
۱۴	بدگمانی		
۱۵	جھوٹے صنم		
۱۶	طرحی مشاعرہ نمبر ۱	(مختلف شعرائے کرام)	

آبر احسنی گنوری		۵
شاغل قادری		۸
آنند بھارتی		۱۰
مفتون کرنولی		۱۲
نوح ناروی		۱۴
آمر سورتی - ساحر سنبھلی		۱۶
مرزا قریشی - سہیل نارنولی		۱۸
کوثر اعظمی		۱۹
طالب انصاری - ہادی نگلہ بندی		۱۹
مدینے پاک تک بندی		۲۰
تمر خیر پوری - آزاد بارانوی		۲۰
ذاکر شادانی - کاوش حیدری		۲۰
شہرت میرٹھی - ہدایت اللہ ہادی		۲۰
مترجمہ رومش پٹیالوی		۲۱
کیف جھانسوی		۲۳
عشرت امیر		۲۵
مش تبریزی - امین ساز		۲۸
محمد شہید عزمی		۲۹
صمد حمیدی		۳۰
(مرتبہ حضرت ابر احسنی گنوری)		۳۲

جلد ۱۵
شمارہ ۳

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں - دہلی ۶
فون نمبر
۲۶۴۲۴۵

نگراں حصۂ نظم و مشاعرہ
حضرت مولانا ابر احسنی گنوری
ایڈیٹر
بمل جین
معاونینِ خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

اردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد

"قرینے"

ابر احسنی گنوری کی غزلیات کا

دوسرا دیوان

جس میں ۲۲۵ غزلیں اور ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے۔

عام دیوانوں سے ۳ گنا میٹر ہے، اور قیمت صرف 25 — 3 ہے۔

غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے۔ یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا

ملنے کا پتا

ابر احسنی۔ گنور۔ ضلع بدایوں (یوپی)

ملک کے جواں فکر شعراء کی تخلیقات کا مرقع جمیل

فکر نو

اس مشترکہ مجموعہ کلام میں مختلف شعراء کا چیدہ چیدہ کلام یکجا کیا گیا ہے جو کہ زندہ اور متحرک فن کا وہ شاہکار ہے جس کی تخلیق کے لئے زندہ ادب کے خالقوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے اور اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ کرتے رہیں گے اور ایک دن آسمان ادب پر درخشاں ستاروں کی مانند چمکیں گے۔ مرتب — جوہر ہاشمی

(ناشر)

کوآپریٹو پبلشرز ۶/۴ دونتار اسٹریٹ بمبئی ۹

حضرت خرد غوث پوری کا پہلا مجموعہ کلام

رنگ و بو

عمدہ کاغذ معیاری طباعت قیمت 2/50

مکتبہ شعلہ و شبنم، دریبہ کلاں۔ دہلی ۶

آپ احسنی گنوری

حصہ اول

صورِ اسرافیل

بسلسلۂ ماسبق

اس کتاب میں ایک تمام کا عنوان "خدا کا سب سے پہلا حکم اور انسان کا سب سے پہلا فرض" ہے اس کے تحت ایسی بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ہر دین دار کا خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتا ہو ایمان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضد، تقلید اور تعصب کی بنیاد پر کوئی حق نہ مانے مگر دانائی سب مانتے ہیں

خدا کا سب سے پہلا حکم ہے یہ سارے عالم کو
کہ پہچانے وہ اپنے دور کے انسانِ اعظم کو
جو اس کو مان لیتے ہیں خدا کو مان لیتے ہیں
اسے پہچان کر اللہ کو پہچان لیتے ہیں
اسی کے حکم سے ہر حکم کی تصدیق ہوتی ہے
اسی معیار سے ہر امر کی تصدیق ہوتی ہے
جہاں اور جب کہیں خورشید فرمان خدا نکلے
تو واجب ہے اطاعت کے لئے ہر با صفا نکلے
بہاء اللہ ایسے مطلعِ فیضانِ یزدانی
یہی اس دور میں ہے مشرقِ اشراقِ ربانی

ہر دور میں انسانِ اعظم۔ اور خورشید فرمان خدا ۔ خدا کے پیغمبر یا اوتار ہوا کرتے ہیں۔ انھیں کو خدا تمام عالم دم زدن میں سکھا دیتا ہے اور عہدہ رسالت و نیابت نیز صور کر کے ان کے ذریعہ اپنے وہ احکام بندوں تک پہنچاتا ہے جن کو وہ بندوں کے حق میں مفید جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا مجسم نہیں جو ہم سے براہ راست بات کرے۔ بس یہی اوتار اور رسول خدا کا حکم بندوں سے سناتے ہیں اور خدائی مرضی کے مطابق دین جاری کرتے ہیں۔ ان کو خدا عجیب و غریب طاقتیں بخش دیتا ہے جس سے تمام دنیا پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ ظاہری حالت میں چند کو چھوڑ کر ہر اوتار اور پیغمبر بنیادی طور پر کسی بڑی قوم کا پیکر ہوتا ہے اور بالعموم بے پڑھا ہوتا ہے لڑھا بھی ہو تو صرف حرف شناس۔ مگر پھر وہ علم کے ایسے دریا بہاتا ہے کہ بڑے بڑے عالم اس کا علم دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ حکومت اعلیٰ طبقہ والوں نیز گروہ علماء کی ہر شدید اور سخت عداوت کے باوجود اس کا دین پھیل جاتا ہے۔ لاریب اس کی اطاعت سے منہ پھیرنا عذاب الٰہی میں گرفتار ہونا ہے اور خدا سے بغاوت کرنا ہے۔

آخر شعر میں گنی صاحب نے حضرت بہاء اللہ کو یہ منصب دیا ہے۔ اگر نقلی و عقلی دلائل سے یہ ثابت ہو جائے تو پھر سر تسلیم خم کر دینے میں۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے ایسا ہے کہ ناظرین رسالہ ہذا اس کو حیات انسانی کا مقصد اولیٰ سمجھ کر اس دین کے شریعہ کو جو دین سے بنی سے حاصل کر کے مفہوم ایمان عالمی سے مذہبی محبت، ضد اور تعصب کو چھوڑ کر تحقیقات کریں گے اور حضرت علی ہی سے ان کے پتے پر مراسلت کر کے معلومات حاصل کرنا اپنے فرائض میں داخل سمجھیں گے۔

ایک نظم وحدت و محبت کے چند شعر سنئے۔

مذاہب کی حقیقت ایک ہے سب دین واحد ہیں
مساجد گو بہت ہیں متحد سب کے سجدے ہیں
خدا کے سب پیغمبر ایک ہی پیغام لائے ہیں
وہ سب کو ایک ہی منزل پہ لے جانے کو آئے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ سب انسان پاک و نیک ہو جائیں
یہ سب اقوام عالم مل کے باہم ایک ہو جائیں
تعصب، دور ہو جائے تعصب دور ہو جائے
یہ دنیا دوستی کے نور سے معمور ہو جائے

پچھلے دو شعروں میں ایسی حقیقت بیان کی ہے جس کو عوام کے علاوہ تمام اہل علم تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی تمام دینوں کی حقیقت ایک ہے اور تمام پیغمبر ایک ہی دین لے کر آئے ہیں وہ حقیقت جو تمام دینوں کی بنیاد ہے یہ ہے۔

۱۔ خدا کو ایک مانو ۲۔ اسی کو تمام طاقتوں کا مالک جانو۔ ۳۔ اسی کو کل کائنات کا خالق مانو۔ ۴۔ اسی سے اپنی چھوٹی بڑی حاجتیں طلب کرو۔ ۵۔ عبادت صرف اسی کی کرو۔ ۶۔ تمام انسانوں کو بھائی بھائی جانو۔ کسی سے عداوت نہ رکھو۔ ۷۔ جھوٹ، دغا، چوری، زنا، قتل، ایذا رسانی، افترا، تہمت، نفرت، خود تکبر اور تمام نیز اخلاقی افعال سے گریز کرو۔ ہر دین کی یہ بنیاد ہوتی ہے جو کسی دین کی بھی الہامی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے یہ چیزیں مشترک ملیں گی۔ یہی مطلب ہے پہلے اور دوسرے شعر کا جو پیغمبر نے اپنی امت کو یہی دین دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر دینوں میں اختلاف کس چیز کا ہے اور بار بار نئے دین کے آنے کی ضرورت کیا ہے۔ اب تک کیوں ایسا ہوتا رہا۔ اور بقول بہائی حضرات آئندہ کیوں ایسا ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر دین میں تین قسم کے احکام ہوتے ہیں۔ ایک مذکورہ بالا احکام کا حصہ جو مشترک ہوتا ہے۔ ایک حصہ وقتی ضروریات کے احکام پر مشتمل ہوتا ہے جو بدلتا رہتا ہے مثلاً خدا جانتا ہے کہ کس دور میں کھانے پینے، رہن سہن، شادی بیاہ کے سلسلہ میں کن چیزوں سے انسان کی صحت کو خطرہ ہوگا اور کن سے فساد اخلاق کا اندیشہ ہے اور کن میں سہولت ہوگی اور کن میں مفت۔ چیزیں انسان کا غیر ہوتی ہیں ان کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور جو

منع ہے یہ بھی ممانعت کردی جاتی ہے یا حرام قرار دی جاتی ہے اسی طرح خدا جانتا ہے کہ کس زمانہ میں اپنی بھی جماعت وحدت کی پابندی کے ساتھ ممکن ہیں اور کب نہیں۔ ایسی فروعات میں تبدیلی ہر شریعت میں بڑی طور پر ہوجاتی ہے اور ضروری و مفید تبدیلیوں کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے

شائی کے طور پر اب سے دو تین سو برس پہلے لوگ ترجمہ لیتے تھے تو صرف زبانی لیں دین ہوتا رہتا تھا اور اس میں کوئی بے ایمانی کا دخل نہ ہوتا تھا۔ جب انسانی دماغ ترقی کر گیا اور اس زبانی لین دین میں بددیانتی ہونے لگی تو یہ بات میں نے اپنے بچپن میں دیکھی کہ محرر جب کاغذ یا اسٹامپ پر قرض کا قانونی مضمون لکھ چکتا تو قرض گیرندہ سے کہتا قلم چھوڑ وہ قلم چھوڑتا۔ اور کاتب لکھ دیتا یہ کہ بسبب قلم (قلم چھوڑ کر) تحریر میں لایا گیا۔ اس زمانہ میں یہ قلم چھوڑنا بڑا معاملہ تھا کہ اگر قرض گیرندہ پر ناطق کردی جاتی تو وہ صداقت میں انکار یا حیلہ بہانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ حالانکہ نہ اس کا قلم چھوڑنا لکھا ہوتا تھا نہ دستخط، نہ گواہ۔ اب زمانہ ترقی کر کے یہاں تک آگیا کہ کاغذ لکھے جاتے ہیں۔ نشانی انگوٹھا لگائی جاتی ہے دستخط کرائے جاتے ہیں گواہ ہوتے ہیں۔ رجسٹر ہوتے ہیں گورنمنٹ پھر بھی صداقتوں میں قرض لینے سے انکار کرتے ہیں اور اب ضرورت ہے کہ اس سے آگے کوئی بات ایجاد ہو تاکہ بے ایمانی کا امکان نہ رہے اور یہ پرانا طریقہ شرعی سابق منسوخ کر دیا جائے۔ یہی حال شریعتوں کے حصہ دوم کی تبدیلیوں کا ہے۔

تیسری قسم کی آیات یا الفاظ کو متشابہات کہا گیا ہے جن کے لفظی اور ظاہری معنی کچھ ہوتے ہیں باطنی کچھ استعاروں، مجاز مرسل اور تشبیہ میں یہ آیات ہوتی ہیں جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا اور خدا ہی کسی سمجھانے والے کو بھیجتا ہے تو وہ ان کے مطالب سمجھا دیتا ہے یہی مطلب ہے علی صاحب کے مذکورہ اشعار کا۔

نظم اسرار حقیقت جس علی صاحب کچھ نشانیاں ظاہر کرتے ہیں۔ پوری نظم ہماری نظر میں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی صاحب کچھ پر بھی حاوی ہیں۔

فاران کی چوٹی پہ جو کل چمکا تھا
کرمل پہ ہوا آج وہی جلوۂ خود
کہتی ہیں یہ قدرت، زبور و انجیل
قرآن میں ہے اُئے گا وہ رب غفور
صہبون میں لکھا ہے مقام موعود
پہلے سے مقرر تھی یہی ارض ظہور

تقریباً ۲۵۰۰ برس ہوئے ہیں میں بائبل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک آیت نظر آئی جو خاصی دیر تک سمجھ یا دنہیں سکا خدا سیر سے آیا (عیسیٰ) طور پر ظاہر ہوا (موسیٰ) فاران پہ چمکا (حضرت محمد) اور کرمل پہ قیام کیا۔ اور علی صاحب کی نظم پڑھ کر آج معلوم ہوا کہ کوہ کرمل پر حضرت بہاء اللہ نے قیام کیا تھا۔ اگر تاریخی حیثیت سے دیکھیے تو ۳ ہزار برس پہلے کی آسمانی کتاب کی پیشین گوئی جب کہ وہ واقعہ کی صورت اختیار کر لیگی ہو تو پھر بات یقین کی حد تک ضرور جائے گی۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہوا ایران میں پھر محشر جور و جفا برپا
ہوئے قربان کاوِ عشق میں اہل وفا برپا

برپا کے معنی قائم ہونے کے ہیں۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھئے کہ جب کوئی چیز قائم ہوجاتی ہے تو وہ طویل مدت تک قائم رہتی ہے۔ اس مطلع میں اگرچہ علی صاحب نے شاہ ناصر کی ظالم حکومت اور اس کے ارکان و حکام اور علماء کی سفاکی و جلادی اور اس طرف انسانیت ذلیل اور جابرانہ حرکات ناشائستہ کو محشر جور و جفا کا نام دے کر ایک تاریخی حقیقت کو ظاہر کیا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ اس ظلم و جور، اس جفا و ستم کے باوجود کوئی خوف کی بات خود کو باقی و بہائی نہ کہتا تھا اور اگر شبہ بھی ہوجائے کہ یہ باقی و بہائی ہے تو نظام حکام کی مدد سے، ارکان حکومت کی مشہور کیا ہوا نائے دین جو بھی اسلامی کے خیموں کی طنابیں کاٹتے جاتے ہیں کھڑے ہو کر اس کا گھر لوٹتے۔ مستورات کو بے حرمت کرتے، اس کے سامنے ان کے بچوں کو ذبح کر کے جنت کی سند حاصل کرتے پھر اصل ملزم کو چھوڑ دیتے جاکر تو قابل پسندانہ عنایتوں کے ساتھ اسے لٹا جاتا۔ پھر اس کی لاش کفن کو چیتھڑوں میں لپیٹ دفنائی جاتی اور اس طرح دین کی خدمت کی جاتی اور یہ سلسلہ سالہا سال تک قائم رہا۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بہائی دین نہ صرف ایران میں بلکہ ساری دنیا میں قائم لیکن پھیلا ہوا ہو گیا یہ تو ہوا شعر کا ظاہری مطلب مگر میرے خیال میں اولیٰ مصرع ذو معنیین (دو معنی دار) ہو گیا ہے جو انھیں کے عقیدے کی تائید بھی کرتا ہے یعنی لفظ محشر قیامت کے مرادف ہے تو دوسرے معنی اس قرآنی اشارہ کر تے ہیں۔ یعنی قیامت بھی ایران ہوئی یعنی دونوں حضرات باب و بہاء اللہ اسی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان دونوں حضرات نے اپنی ماموریت کا اعلان مکہ اور شام میں کیا۔ وہی شام جس کو رسول کی کسی حدیث میں ارض الشام ارض المحشر کہا شام کی زمین قیامت کی زمین ہے یعنی ارض شام میں قیامت برپا ہوگی اور اسی مطلع سے علی صاحب کی شاعرانہ بصیرت کی نشان دہی ہوتی ہے

ایک غزل میں ایک طنز بھی کی ہے جو بڑی حد تک سچ ہے۔

یہ کہتے ہے ہیں آج تک تقلید کے شیدا
کہ ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے پرانا دین آبا کی

ایک شاعرانہ شعر سنئے جس سے ذاتی شہرت آسودہ ہو سکے گا۔

برق رفتار ہیں واللہ شہیدان وفا
ایک ہی جست میں وہ پایۂ جاناں تک پہنچے

یہ شہید ان وفا حضرت باب کے زمانہ کی طرف اشارہ ہے اور شعر شاعرانہ خوبیوں اور مناسبت

شوق سے بھی ملا ملا ہے

زیر کا شعر بہائی حضرات کے ایک اور عقیدہ کی نشان دہی کرتا ہے۔

یہ دنیا ہے ظلمانی یہی دنیا ہے نورانی
یہیں نارِ جہنم ہے یہیں فردوسِ رضوانی

یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ معروف دوزخ کہیں نہیں ہے۔ اسی دنیا کی راحت و تکلیف کو ہی جنت دوزخ کہا گیا ہے۔

اس مجموعہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میرے سامنے اپنے رسالہ کی کوتاہ دامنی بھی ہے، اس لئے اشارات کے ساتھ اچھے شعر درج کرتا ہوں۔

جہاں میں شورِ بپا ہے کہ جنگِ عالم ہونے والی ہے
جو اس دنیا کا سب آرام و راحت کھونے والی ہے

مگر یہ جنگ گویا خاتمہ ہے دور و محنت کا
اور اس کے بعد ہوگا دور پھر دورِ محبت کا

مقرر ایک دن ہے فتنۂ دوراں کا سو جانا
مقدر ہے زمیں کا جنت الفردوس ہو جانا

بہائی حضرات حضرت بہاء اللہ کی پیشین گوئی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا۔ جنگ ہوگی۔ جنگ ہوگی پھر جنگ ہوگی۔ پھر دورِ رحمت و راحت آئے گا۔ ان میں سے دو جنگیں ہو چکیں۔

کیوں ہو گئے ہو رنج و الم کا شکار تم
وہ عیش کیا ہوا وہ مسرت کہاں گئی

کثرت سے اختلاف ہوئے تفرقے ہوئے
وہ دوستو وہ قوم کی وحدت کہاں گئی

جو ہونا تھا وہ ہو چکا جو ہوتا ہے وہ ہو رہا ہوگا
مضمون وہی ہے فطرت کا عنوان ہے نقد ہے تبصرہ

تمام پارسیان، اہلِ کتاب کو پیشین گوئیاں
کرشن جی نے بھی شبدیہ سنائے ہیں

کہ ہم پھر آئیں گے جیسے کہ آج آئے ہیں
وہ گوتم بدھ کہتے تھے ہزاروں برس آئے ہیں

جو بھگوان رام بار بار لائے ہیں
بتا اک بدھ میرے بعد اس دنیا میں آئے گا

امیتابھ[1] بہا جس کو کہتے ہیں وہی جلوہ دکھائیگا

[1] مراد حضرت بہاء اللہ

جب عالمِ انسان کو تھا منتظر ایوانا یا
تب حضرتِ زرتشت نے مجمر کو جلایا

ایران میں آئے گا وہ "بہرام بہاوند"
کہتے ہیں جسے مظہرِ خلاق برایا

ایران میں وہ نور ہوا ظہور سے ظاہر
صد شکر خداوند کہ مقصود برآیا

کیلم پھونک رہے تھے جو صور اسرافیل
نئی حیات سے اٹھی وہ قوم اسرائیل

کہا میں ہر سریر جگ مگائے گا
تجلیات میں ذاران پر دکھائی دے گا

زمینِ قدس کے سیکوں میں خود میں آؤں گا
یہیں سے اپنی جہاں کو خدا سنائے گا

[1] کوہ کرمل

برد قسلم میں ہوا جلوۂ مسیحائی
مرے جلووں میں نئی زندگی کی جان آئی

کہا مسیح نے میں سر بسر قیامت ہوں
مگر قیامت کبریٰ کی اک علامت ہوں

میں جاؤں گا تو مرے بعد آئے گا مالک
وہ جس کی دیں کا شتاق ہے پر کہ سا اک

اب یہ اللہ کی جانب سے پیام آتا ہے
لیجئے ختمِ نبوت کا مقام آتا ہے

ختم یوں دورِ نبوت کو کیا ختم نے
اب مرے بعد ہی روزِ قیام آتا ہے

ایسا ہے وہ بشیر، ایسا ہے مہدی
وہ جو سلطانِ رسل ہے، وہ امام آتا ہے

[1] مگر مسلمان اس کو حضرت محمدؐ سے تعبیر کرتے ہیں

وہ جس نے مظہرِ اسم کو دیکھا
اسی نے دیکھی صورت خدا کی

خدا تو شکل و صورت سے بری ہے
یہی صورت ہے پر اس کی لقا کی

ہو رہی ہے ہر طرف ہر چیز کی صورت نئی
دیکھتی ہے چشمِ عالم آج کل تصویر تو

آج آئینِ کہن بے کار ہو کر رہ گئے
اب نئے حالات میں لازم ہے اک تدبیر تو

آتشِ دوزخ برستی ہے بموں کی شکل میں
جرم کی صورت نئی ہے کیوں نہ ہو تعزیر تو

ہیں دینِ فطرت میں تشکیلِ نو کی
بلا شک ضرورت نظر آ رہی ہے

تو اس کے سپہ توں پہ بہت ایسی پڑی ہے
جس دل کو ٹٹولا وہ تڑپتا نظر آیا

ہر ایک چیز ہے پابندِ عبرت کی
اجل یہاں ہے معین ہر ایک امت کی

ہر اک اجل کے لئے اک کتاب چلتی ہے
جو اپنے دور میں خود کامیاب ہوتی ہے

ہر ایک دور میں قائم رسول ہوتا ہے
اسی پہ وحیِ خدا کا نزول ہوتا ہے

نبوت کا تسلسل فنا نہیں ہوتا
الوہیت کا تجسّم فنا نہیں ہوتا

[1] آیاتِ قرآنی کا ترجمہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس کتاب پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب حضرت علی کے خطوط، بیان، عہد، بانیِ فکری کا اچھا کارنامہ ہے اور ہر طرح قابلِ

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

شاغل قادری

صمد حمیدی

کسی فن کار کو اس کی زندگی کے پس منظر میں دیکھنے سے ہی اس کے فن کا جلال و جمال جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس لئے میں جب صمد حمیدی کو پیش کرتا ہوں تو سب سے پہلے ان کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ بچہ جس کے ماں باپ کا سایہ ایام طفلی میں ہی سر سے اٹھ گیا ہو۔ اس کی تربیت کس نہج پر ہوئی ہوگی۔ ظاہر ہے۔ یہ درست ہے کہ تربیت میں ماحول کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مگر اس لحاظ سے بھی صمد حمیدی کو سازگار ماحول میسر نہ آیا۔ صاحب گنج میں ان کی نانیہال ہے، جہاں ان کے رشتہ دار کاروبار کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کا ذہن بھی کاروباری ہونا چاہئے۔ صاحب گنج سنتھال پرگنہ کا ایک چھوٹا سا شہر ہے، جہاں صمد حمیدی کی طالب علمی کے دور میں کوئی ایسی ادبی سرگرمی نہ تھی جس سے یہ فیضیاب ہوتے۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوصف بچپن سے صمد حمیدی کا رجحان ادب کی طرف ہے۔ تنہائی کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان کم سنی میں ہی زندگی کی تلخیوں کا تجربہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہی سبب ہے صمد حمیدی نے ایک درد مند دل پایا ہے۔ مگر زندگی کے ہر موڑ پر یہ تلخی جو نظر آتی ہے وہ بھی تلخی کا ہی دین ہے۔

انسان نہ نگاہوں میں پڑھنا سیکھتا ہے، اور نہ بریل میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مگر صمد حمیدی نے پڑھنا سیکھنے سے پہلے ہی لائبریری میں علم حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ کھلی میں تھے کہ صاحب گنج کے چند نوجوانوں نے ایک لائبریری کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس وقت ترقی پسند تحریک کا شباب تھا۔ ادبی رسائل، افسانوں کے مجموعے اور ناول وغیرہ زیادہ تر اسی ایک گروپ کے اداروں میں چھپتے رہتے تھے۔ صمد حمیدی کے کمسن ذہن کو جس نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ تھے منٹو کے افسانے۔ اس کے علاوہ کچھ فرانسیسی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے انہوں نے پڑھے تھے۔ افسانے نے جس کا رنگ و مزاج سراسر خشک ہے متاثر رکھا تھا۔ اس خاص طرز کے افسانوی ادب کو صمد حمیدی نے دلچسپی سے پڑھا اور اپنی رگ و پے میں سمو لیا۔ جو آگے چل کر فردان کا رنگ بن گیا۔ کچھ فرانسیسی ادیبوں کا یہ خیال بھی انہیں خوش آیا کہ ادب نام ہے حقیقت نگاری کا۔ اس کا مفہوم انھوں نے یہ لیا کہ کسی واقعہ کو ادب کے سانچے میں ڈھالتے وقت نام اور مقام بھی حقیقی ہونا لازمی ہے۔ ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، مقصدی ادب مارکسی ادب نئے تجربات، روایت اور بغاوت قسم کی چیزوں نے بھی صمد حمیدی کے ذہن کو ایک خاص انداز میں سوچنے کا ڈھنگ سکھا دیا اور ع

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
اک طرز جنوں اور ہم ایجاد کریں گے

ان کا نصب العین بن گیا۔ کوئی ایسی ترکیب جو کسی دوسرے ادیب نے برتی ہے صمد حمیدی اپنی تحریر میں لانا کفر سمجھتے ہیں۔ اگر ایک جملہ بھی کہیں کسی کا آگیا تو وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، اپنے تجربات، خلوص اور جذبہ کے سہارے وہ لکھتے رہے لیکن صرف لکھ کر کاپی میں رکھ لینے سے فن کار کی تسکین نہیں ہوتی۔ صمد حمیدی نے اپنے احباب کا ایک کاروان تیار کیا اور صاحب گنج تحریری سرگرمی کی رپورٹیں اخباروں میں آنے لگیں۔ اس ادبی مجلس نے صاحب گنج کے علمی حلقہ کو بہت زیادہ متاثر کیا ایک زندگی پیدا ہو گئی، تشنہ کام ادب اس میکدۂ خلوص پر جمع ہو گئے۔ سرکل کی نشستوں میں صمد حمیدی کی تنقید میں بڑی پختگی اور جان دار ہوتیں۔ انہیں اپنے اور اپنے رفقا کی تخلیقات میں "اور بخلیٹی" خلوص اور صداقت کی تلاش ہوتی جس کو نہ پا کر وہ درد دل کو محسوس پہنچتی۔ ان کا مقصد نہ تھا کہ وہ تنہا خیال ہوں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ نئے لکھنے والوں کا ایک صحیح کارواں تیار ہو جائے جس کے لئے اپنے ہر رفیق کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی ترغیب اور لکھتے وقت کسی دوسرے کی تحریر سے متاثر نہ ہونے کا مشورہ دیتے۔

دوسری طرف ان کے رفقا کار کو برابر یہ شکایت رہی کہ صمد حمیدی جانی پہچانی شخصیتوں کی مجسمہ ٹی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جو ایک غلط طریقہ کار ہے۔ ان کے خلاف مستقبل ماسٹر خضر اور بکا کو آپ ادبی سطح سے نکل کر پورے شہر میں چوری کو تیار ہونے لگیں۔ لیکن یہ اپنی دھن میں آگے بڑھتے گئے۔ صاحب گنج کی محدود ادبی دنیا سے نکل کر یہ پٹنہ کلکتہ اور پورنیہ وغیرہ کی سیر کو گئے جہاں کچھ ادیبوں اور شاعروں سے شناسائی ہوئی۔ پھر بھی ان کی تشنگی نہ بجھ کا آخر ایک دن ایسا آیا کہ قطعی بے سروسامانی کے عالم میں پٹنہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں کے ادبی حلقوں میں انہیں پوری تسلیم کی دنیا کے ہر چھوٹے بڑے ادیب، شاعر اور صحافی سے ملے مگر صمد حمیدی نے ادبی دنیا کے تلخ و شیریں تجربات حاصل کئے مگر جس قسم کا افسانوی ذہن صاحب گنج میں ان کا بن گیا تھا اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ہاں نزدیکی کی وسعت قاشیں انھیں پسند کیں اور ان کے قلم سے نکلنے والے

ہے۔ اس پندرہ بیس برس کی اس قسم کی حقیقت نگاری کی روح کارفرما تھی جس میں کرداروں اور مقام کے نام تک بھی فرضی ہونا ضروری تھا۔

دہلی سے جو بہترین درس سے کہ صمد جمیدی آئے وہ یہ تھا کہ افسانہ نگاری ذریعۂ معاش نہیں بن سکتی۔ صاحب گنج لوٹتے ہی انھوں نے سب سے پہلے روٹی کے مسئلہ کو حل کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور ایسلئے ملازمت سے ہم کنار ہونے کے بعد جس فرد درس میں یہ داخل ہوئے اس میں انھیں بنت حنا کی رفاقت کا شرف بھی حاصل ہوا مگر زندگی کی بے ترتیبی اور اول جلول پن نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہی فضول خرچی، سینما بازی، بیلوں، بٹیروں کا چکر اور آوارہ گردی کی بے تکی سی ہے جب کہ یہ دو بچوں کے باپ ہو چکے ہیں، جو کل تھا، جب وہ خود بچے تھے۔ باتیں کیجئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر جمعہ کی نماز پابندی سے پڑھتے ہیں۔ اور روایتی قسم کے مذہبی انسان ہیں۔

صمد جمیدی نے اب تک افسانے، خاکے، انشائیے اور تنقید کتنے لکھے ہیں، اس کا حساب تو وہ جانیں، مگر ہندو پاک کے ادبی پرچوں میں جو چھپ چکے ہیں ان کی تعداد لگ بھگ ایک سو کے ہوگی۔ مگر ان کی ہر تخلیق اپنے فن کی حقیقت نگاری اور فنی وزن کی آئینہ دار ہے۔ اپنی سسرال چودھری محلہ کانپور کے ماحول کی جس افسانہ میں انھوں نے عکاسی کی ہے۔ اس کا عنوان بھی محلہ چودھریاں رکھا ہے۔ اس قسم کی تخلیقات میں "کش مکش" ایک کامیاب افسانہ ہے۔

ابتدائی افسانوں میں ہیئت کی خامیاں بری طرح کھٹکتی ہیں۔ مگر اب ہیئت و معنی دونوں کے اعتبار سے پختگی کا گراف ابھرتا جا رہا ہے۔ صرف غصہ کا جن ہے جو ان کے سر پر سوار ہو کر ان کی انفرادیت کو ابھرنے نہیں دیتا ورنہ صمد جمیدی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ جن اترنے والا نہیں ہے یہ تو کسی کے ہاتھوں اس وقت سوار کرایا گیا تھا جب صمد جمیدی کی کم سنی تھی اور جنیات کے رموز سے ناآشنا۔

جن کا حصہ "دور کا جلوہ" ہے۔ وہ صمد جمیدی کی معلومات و ادبی صلاحیت اور فنی پختگی کے ہرگز قائل نہیں ہو سکتے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ صمد جمیدی آسانی سے کسی کے نزدیک بھی نہیں آتے، وہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو پرکھتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی پسند کا مل گیا تو گرویدہ ہو جاتے ہیں پھر ان کے جوہر دیکھئے! بڑی شخصیتوں سے بلا جھجک ملنا اور ان کے اوٹوگراف لینا ان کی ہابی ہے۔ وہ ایک مخلص دوست ہیں اور اپنے جیسا ہر شخص کو سمجھتے ہیں۔ ان کا قلم زہر اگلتے اگلتے کبھی زہر بھی اگلنے لگتا ہے۔ کئی مدیران جرائد سے یہ الجھ چکے ہیں اور کئی شاعر و ادیب کو ناراض کر چکے ہیں۔ غرض یہ مبنی دوستی انھیں پسند نہیں اور اس عہد کی دوستی کا دارو مدار ہی مفاد پر ہے جس سے صمد جمیدی جیسے یتیم کو دلی کوفت ہوتی ہے اور وہ ہر شخص سے کھنکتے رہتے ہیں مگر کسی کا معیار دوستی انھیں جب بھا جاتا ہے تو پھر اس کی ڈانٹ اور پھٹکار تک خوشی خوشی سہتے ہیں، جیسے کہ وہ ان کا سرپرست ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کو بناؤ سنگار کے لئے ایک سرپرست کی اشد ضرورت ہے جس کا احساس خود انھیں بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی ادبی تربیت کے لئے انھیں کسی استاد کی ضرورت ہے اس قسم کا خیال اگر ان کے ذہن میں پیدا ہوتا تو وہ بھی اپنے بے شمار ہم عصروں کی طرح کسی استاد وقت کی سرپرستی کے سہارے آسمان ادب کا تابندہ ستارہ ہوتے، اس معاملہ میں وہ خود اعتمادی اور خود آگاہی کو خضر راہ بنائے ہوئے کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ آج یا کل لوگ ان کی عظمت فن کو پہچانیں گے۔

بقیہ افسانہ جھوٹے صنم (صفحہ ۲۱ سے آگے)

اگر تو اس دنیا میں کہیں ہے تو آ اور مجھے گلے لگا۔ اپنے ہونٹوں کی گرمی اور لطیف مسکان سے میری روح کو پاکیزگی عطا کر۔ ان آنکھوں کی شوخی اور چمچپاہٹ مجھے عطا کر، جن میں چھل کپٹ قسم کی چیز کا مطلق گزر نہ ہو۔ ان معطر اور عود و عنبر سے لپٹے جسم سے مجھے ہم کنار کر، جو عصیان سے پاک، اور عرقی و پوڈر کی اداوٹ سے بے نیاز ہو۔ میں چہار طرف طبع شدہ مجسموں، بے حجاب اور بیباک نظروں کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں۔ ان میں شیطانی جذبات کی بہتات نے میری رگ رگ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا میرے نازک اور حساس دل میں ناسور سے ڈال دیئے ہیں اے حسن! مجھے ان سے بچا۔ اپنی پر نور روح اور طہارت کا ہالہ پھیلا میرے نظروں میں سما جا۔ تاکہ پھر کوئی یہ نہ کہے کہ حسن اس دنیا میں کہاں، وہ تو عنقا ہو کر رہ گیا؟ اگر ڈھونڈنا ہے تو اپنے دل کے نہاں خانے میں ڈھونڈنا شروع کر..... اگر ایسی بات ہے تو اس دنیا میں تاک جھانک بے کار اور فضول سی بات ہے، نہیں تو اے حسن! تو اپنا جلوہ دکھلاتا کیوں نہیں ——؟؟ آ، چپکے سے چلے آ اور میرے گلے سے لگ جا، پھر میں تجھے پاکر خوشیوں کے ہار گوندھوں گا اور مسرتوں کے گہوارے میں تجھے جھولا جھلاؤں گا۔ پھر تو کہیں مت جانا، جھولا جھولتے رہنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و جملہ تفصیلات شعلہ و شبنم دہلی

(۱) مقام اشاعت دہلی (۲) وقفۂ اشاعت ماہوار (۳) پرنٹر پبلشر ایڈیٹر بمل پرشاد جین قومیت ہندوستانی پتہ ۔۔۔ دریبہ کلاں۔ دہلی (۴) ملکیت ۔ بمل پرشاد جین میں بمل پرشاد جین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

بمل پرشاد جین خالک

مورخہ یکم مارچ ۱۹۶۵ء

آنند سہائے

عیسیٰ اثر

بھاگل پور جس کا تاریخی نام "انگا" ہے قدیم زمانہ ہی سے علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے بالخصوص عہد مغلیہ میں اس کو جو امتیاز و درجہ حاصل تھا اور علم و فن کمال کی جو بلندی پر پہنچا ہوا تھا یہ چھوٹا سا شہر بجا طور پر اس پر فخر کر سکتا ہے۔ اس کے کھنڈروں اور پرانی عمارتوں کے تاریخی واقعات کہنے پر گنگا کے کنارے پر آباد ہے۔ یہ وہی انگا ہے جس کے راجہ نے پانڈوؤں کو مہابھارت کی لڑائی میں مدد کی تھی۔ اور یہ وہی انگا (بھاگل پور) ہے جہاں مغل شاہزادہ شجاع نے مغلیہ تہذیب اور علم و فن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اور آج بھی "شجاع گنج" اسی مغلیہ شاہزادہ کی تاریخی یادگار ہے۔

اس شہر میں حضرت مولانا شہباز کا مزار مبارک ہے اور اسی محلہ کے قصبہ پیرنی میں جو شہر سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر جانب جنوب واقع ہے۔ حضرت مولانا محمد سہول عثمانی جو اپنے وقت کے جید عالم تھے آرام فرما ہیں۔ علماء و فضلا کے علاوہ ایسے ایسے قابل فخر ادیب اور شاعر بھی اس زمانہ میں گزرے ہیں جن کا نام اب بھی دنیائے علم و ادب میں عزت اور فخر سے لیتی ہے۔ علامہ ڈاکٹر عبدالحی حادث۔ ابوالقاسم شیدا۔ محمد شریف عالم۔ حضرت ضیاء الدین احمد ضیاء اور حضرت فقیر حسن ماہر وغیرہم اپنے دور کے بلند پایہ شعراء میں شمار کئے جاتے تھے اور اس دور حاضرہ میں بھی بہت سے نوجوان فن کار زبان و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان میں ایک سید محمد عیسیٰ اثر بھی ہیں۔

آپ کا حقیقی مسکن محلہ پرانہ پور ضلع بھاگلپور ہے۔ جو تقریباً شہر سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے یہ محلہ مختلف علمی سوسائٹیوں پر مشتمل ہونے کے سبب اپنا ثانی نہیں رکھتا آپ کے والد ماجد مولوی سید محمد لیاقت حسین صاحب ریٹائرڈ پولیس افسر ہیں اور آپ بھی ان دنوں اسی محکمہ میں پولیس آفیسر کی خدمات بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ قدیم طریقے کے مطابق ابتدائی

خدمتی کی ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں پائی فیاضان انگریزی تعلیم کے لئے شہر کے ہائی اسکول میں داخل کئے گئے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں۔ ان ہی ایام آپ کثرت سے اشعار بھی کہنے لگے جب فوق شعر گوئی حد فن تک پہنچا تو کسی اچھے استاد فن کو کلام کے دکھلانے کا شوق ہوا۔ آپ ڈاکٹر حادث سے ملے۔ انھوں نے آپ کو ہونہار دیکھ کر آپ کی حوصلہ افزائی کی اور حلقۂ شاگردی میں داخل کر لیا۔ اپنی توجہ خاص سے اثر صاحب کو تھوڑے ہی عرصہ میں کامیاب شاعر بنا دیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں حلقہ مرید آباد اکبر آباد کی سے خطۂ کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ آگرہ سانڈھی میں زیر نگاہ حضرت سیماب اکبر آبادی تحصیل فن کی تکمیل میں چھ سال تک مقیم رہے۔ اس کے علاوہ آپ کو حضرت علامہ آبر آسنی گوری سے بھی شرف تلمذ حاصل ہے

آپ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں آپ کو مغربی مادہ پرستی، جاہ طلبی، حرص زر اور ظاہری طمطراق سے سخت نفرت ہے۔ مشرقی تہذیب، قومی شعار اور روحانیت کے دلدادہ ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی طبیعت میں حد درجہ کی متانت، سنجیدگی اور وضع داری بھی پائی جاتی ہے۔

اگرچہ انسانی سیرت کی یہ قابل تعریف خوبیاں ہیں اور آپ جس محکمہ میں ملازمت کرتے ہیں وہ اپنے نام کے اعتبار سے کس قدر نیک نام ہے محتاج بیان نہیں۔ البتہ آپ کے متعلق ناواقفیت اور ظاہر بین ہر شخص کی اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ تاہم جو لوگ آپ کی طبیعت اور مصروفیات سے واقف ہیں وہ آپ کے خلوص، ہمدردی اور وسیع الاخلاقی اور شکستہ مزاجی کے معترف ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر تجربہ آدمی کی زندگی پر اثر ہمیشہ اور قدامائی ہو۔ ایک بڑا حادثہ، عافیت بن ہمارا سادہ زندگی ہی ملک و ملت کے لئے مفید ہو کر کسی خدمت کے مدارج طے کر سکتی ہے۔ انسان اپنی خاموش علمی و ادبی مصروفیات کے ذریعے سے بھی اپنے وطن کی بڑی خدمت کر سکتا ہے۔ جناب اثر صاحب کا شمار بھی ان با قابل قدر لوگوں میں ہے۔ آپ خاموشی سے کام کرنے والے ہیں طبیعت نہایت صلح جو اور آشتی پسند واقع ہوئی ہے

آپ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی رہے وہاں کے ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل رہی۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب عوام، معززین اور عہدہ دار سب کے سب آپ کے حسن اخلاق، اعلیٰ قابلیت اور وسیع معلومات کی قدر کرتے ہیں اور آپ کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اثر صاحب کی غزلوں اور نظموں میں جو صفائی اور گھلاوٹ ہے اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ انہیں اس فن میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ ان کا تخیل اس قدر وجدانی ہے اور اشعار پڑھتے ہوتے کہ سننے والے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے

حضرت جبریل لاتے تھے پیام اللہ کا
ختم، ختم الانبیاء پر ہے کلام اللہ کا
بہت بلند تخیل سے ہے مقام ترا
سمجھ میں آ نہ سکے جو وہ ہے نظام ترا
جلوۂ کون و مکاں تیرے طلب گار ہیں ہم
اپنے دامن میں چھپالے کہ گنہگار ہیں ہم

۱۹۵۵ء میں سن فرائڈے کے اعزاز میں ایک بزم مشاعرہ ممبئی میں منعقد ہوئی تھی، جس میں دیگر شعراء کرام کے علاوہ حضرت جگر مرادآبادی بھی شریک تھے۔ یوں تو قبل ہی ادوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ مگر اس دفعہ جگر مرادآبادی اثر صاحب کا کلام سن کر بے اختیار کہہ اٹھے "عزیزم! میں تمہیں ہنوز مبتدی سمجھ رہا تھا، مگر تمہارے مطلع نے صاف واضح کر دیا کہ تمہیں اس فن میں خاصی مہارت حاصل ہے ؎

ظلم و ستم کا شوق ستم گر کو جب ہوا
لاکھوں دلوں میں میرا ہی دل منتخب ہوا۔

یہ وہ مطلع تھا جس پر جگر مرادآبادی نے اثر صاحب کو داد تحسین سے نوازا تھا۔ اثر صاحب کی شاعری میں اپنے استاد علامہ سیماب اکبرآبادی کا بہت زیادہ اثر پایا جاتا ہے۔ یہاں ان کے چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو مجھے دستیاب ہو سکے ہیں یہ ؎

شب الم میں آہ و فغاں کا ذکر تھا بے سود
صنم سنا کیے حلقۂ در و صنم نے سنا دیا
نماز جس قدر بھی پڑھ سکے تو پڑھ واعظ
نیاز مند کوئی بے نیاز ہو نہ سکا
اگر اہل جہاں مرا جو سوز غم جہاں ہوگا
لگے گی آگ ایسی تا فلک جس کا دھواں ہوگا
ملیں گے آپ ہاتھوں کو جب ہم نہ ہوں گے
رہے گا فسانہ، سنا کیجئے گا
مرے جب مدد پر صیاد ہوگا
جفا ہوگی، ستم ایجاد ہوگا

ابھی آپ کم سن ہیں، لفظ محبت
جواں ہوتے ہی آپ سمجھ جائیے گا
آتش آہ و فغاں سے میرا سینہ جل گیا
آگ سی دل میں لگی ارمان سارا جل گیا
آج بھی پھرتی ہیں فیروں کی نگاہیں تجھ پر
اے عمارت تری تعمیر پہ رونا آیا
سوز غم فراق سے دل میرا جل گیا
اے دوست اب نظام محبت بدل گیا
بیٹھے ہیں دل بھی بھر کے محبت نہ کر دوں خوب
قربان اس صورت پہ جو حسرت نہ کر دوں خوب
کر کے نہ کبھی دیکھیں مجھے ترچھی نظر آپ
بسمل ہوں ادھر آپ کا، قاتل ہیں ادھر آپ
تخت پر ست تیرا کیا آسرا بہت
آنکھوں میں کاٹنی پڑی شب بلا بہت
کھائی ہے میرے دل نے کسی کی نظر کی چوٹ
اے چارہ گر دکھاؤں کہاں کاری کی چوٹ
آیا نظر کوئی بھی حسیں نوجواں عیش
دل ہو گیا نشانہ، رہا یہ جہاں عیش
دکھلائے جو یہ نالۂ شب گیر اثر آج
ہو جائے زیر و زبر یہ کرۂ زیر آج
اس طرح مجھ پہ ناوک خنجر خونخوار کھینچ
جیسے تنا تعلق کی گرد ابروئے خمدار کھینچ
ہوا ہے جب سے مرا یار گستاخ
تو رہتے سب کے ہم پہلو گستاخ
دم بھر کے لئے جب بھی ہوئی گرم روانہ
دل حلقۂ غم میں ہوا آکر مرا پابند
مانند بوئے گل ہوں جہاں میں اور کیا گھمنڈ
لایا گیا ہے ہوں سوئے فنا گھمنڈ
خود کو بھول اے دل ناداں کہ ہے بھروسا کس پر
سانس ہی اپنی نہیں جب تو بھروسا کس پر
اس طرح مشیت خاکہ ہے اپنی جاں عزیز

ہمارا کہ جس طرح سے رکھے میزباں عزیز
بیٹھا ہوں بھریا میں اور آبدیدہ ہوں
بیزار زندگی سے ہوں آفت رسیدہ ہوں
بے قدری کا جو دیکھو گے تماشا شامل
دل کو تماشے ہوئے تڑپو گے ہمارے شامل
جس دن سے جدا تم ہوئے بہہ رہے ہیں یہ آنسو
گویا اب مری آنکھوں کے تارے ہیں یہ آنسو

خدا آپ کی گریۂ زاری کو روکے فرماتے۔ کہتے ہیں

شکوائی تھا کیا ان سے میری
کر پیار ہوا ہوتے ہوتے
اے درد محبت کچھ تو بتا
گھبرا گیا دل روتے روتے
جو کشتی ڈوبنے لگتی ہے ہر موج
گرنے سے پہلے برق کڑکتی ہے ہر موج
میں اپنے حد فراق ہوں خدا نہ کسی سے نہ کھیلئے
مرا دل ہے خود ہی آشنا مری بات کسی سے نہ کھیلئے
ضیائے روئے روشن سے دل پُر نور ہو جائے
ہر اک ذرہ مری ہستی کا مثل طور ہو جائے

آپ صرف شعر و شاعری ہی نہیں، بلکہ ڈرامہ نویسی میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کو دور جدید کا آغا حشر شانی کہا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ وہ اس لئے کہ تقریباً چالیس ڈرامے منظر عام پر آ چکے ہیں اور کئی ڈرامے دوسروں کے ترجمے ہندی میں کر دیئے گئے ہیں اور وہ تمام ڈرامے کتب فروشوں اور ریڈیو اسٹیشنوں پر نظر آئیں گے۔ ان میں سے چند ڈراموں کے نام درج ذیل ہیں۔

ہر جولی، تھانیدار، فریبی، پھر ملیں گے۔ نقیب۔ ننگ۔ دو صورا۔ تماشہ۔ جگنو۔ سلمیٰ۔ اگر نقاب، اجنبی دھوکہ، پھانسی۔ چندا۔ شکریہ، جہانی وغیرہ وغیرہ

ان کی کئی ڈرامے پر میں ہی جانے کے لئے تیار ہیں علاوہ ازیں آپ کے کلام کا مجموعہ عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے ——

مفتی کوثری

مصنف حیات دبیر کے چند غیر مطبوعہ اشعار

شاہ لکھنؤ جو ۱۵ رجب ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی کی کتب متداولہ اکثر لکھنؤ و فرنگی محل سے پڑھیں ۱۸۷۵ء میں بعمر ۱۷ سال ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین سیشن جج ریاست کوٹہ کے ہمراہ کوٹہ راجپوتانہ میں تشریف لے گئے۔ یہ سلسلہ ملازمت عمر بھر بسر کی۔ پنشن کے بعد ریاست نے بہ معافی امتحان وکالت کی اجازت دے دی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں بہ عمر ۷۹ سال کوٹہ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ وہیں سپرد خاک کئے گئے۔ ریاست سے انھیں وظیفہ شاعری تادم آخر ملتا رہا۔ دربار جانشست بھی مقرر تھی۔ جناب ثابت کے جتنے بھی ادبی کارنامے ہیں۔ کوٹہ کی سرزمین ہی کے پیدا وار ہیں ۱۸۸۵ء سے ۱۹۴۱ء تک اکسٹھ سال کا زمانہ کمال طور پر یہیں گزرا۔ اردو علم و ادب کے لحاظ سے راجپوتانہ کی سرزمین کو بالعموم بنجر کہتے ہیں۔ اردو کے رسائل و اخبارات کا فقدان۔ علمی و ادبی ماحول کی کمی، وسائل و ذرائع کی عدم سازگاری۔ ایسے میں جناب ثابت اردو ادب پر اس تابناکی سے چمکے کہ جو اں قدم سارا تمام اپنے ماحول کو قرطاس ادب کے رنگ برنگے پھولوں سے معطر کر دیا۔ کوٹہ (راجستھان) میں اردو علم و ادب کا جو چرچا زیادہ تر انھیں بہتیرے ادبی شخصیتوں کا رہین منت ہے جو معاشی سلسلے میں کوٹہ کو اپنا وطن ثانی بنا گئے، جیسے خود انہیں معاشی فارغ البالی نصیب ہوئی، انھوں نے یہاں کے معاشرہ و ماحول کو اپنے علم و ادب سے مالا مال کر دیا۔ مقامی لوگوں نے لبیک کہا اور اس طرح یہاں بیرونی و مقامی ادب پرستوں کے تعاون سے اردو کے قدم جمے۔ یہ یہاں پلی، بڑھی اور پنپی۔ جناب ثابت کا نام نامی کی شخصیتوں میں نمایاں ہے۔ موصوف نہ صرف اردو زبان کے ادیب و شاعر تھے۔ بلکہ عربی و فارسی کے بھی فاضل تھے علم عروض سے کما حقہٗ واقف، سلام، رباعیات اور مرثیے، ایک مجموعہ صبر جمیل (تاریخی نام۔ برق قلم) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ حیات دبیر کے علاوہ مرثیہ گویوں کا ایک تذکرہ موسوم بہ "در ثابتین" ۱۳۳۵ھ مطبوعہ اثنا عشری دہلی سے شائع ہوا تھا جس کا مادۂ نام "چراغ محفل" ہے۔ خود یات کا مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ مرحوم کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ایسے صاحب کے قبضہ میں پہنچا جو اب تقسیم ہونے کے بعد بے پتہ ہیں۔ سردست غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت و اشاعت کا کوئی ظاہری امکان نظر نہیں آتا۔ میرے پیر و مرشد کی چند غیر مطبوعہ غزلیں جو میرے ہاتھ لگ گئی تھیں میں نے مناسب سمجھا کہ اس ادبی امانت کو اردو دنیا کے ذوق کی خدمت میں پہنچا دوں شاید اس ذریعہ سے کسی حد تک سبک دوش ہو جاؤں۔

اس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ کوٹہ میں ۱۹۳۷ء سے بزم سخن کے نام سے ایک باقاعدہ انجمن قائم تھی۔ جو اس وقت بزم ادب کے نام سے عمل میدان میں ہے۔ اس کے تحت ہفتہ وار مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں

شاہ لکھنؤ نے اپنے علم و ادب سے ستارہ چمکا اردو کا
زمانہ شیدا سراپا آسماں ہو کر

چاہئے دبیر اردو کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس پر اردو ادب جتنا بھی ناز کرے کم ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اردو کے مشہور مرثیہ گو مرزا دبیر کی علمی و ادبی زندگی کی کہانی ہے۔ مولانا شبلی نے "موازنہ" میں مرزا دبیر کے کلام پر جس بیک انداز سے نظر ڈالی ہے اس کا تڑکا بڑی حد تک حیات دبیر میں دیا گیا ہے۔ کلام دبیر کے محامد و محاسن ایک ایک کر کے گنائے گئے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی میں یہ کتاب چھ سال تک ایم۔ اے کے نصاب میں داخل رہی۔ "انیسے" اور "دبیرئے" گروہوں سے تاریخ ادب کے شخص سا ناواقف نہیں اور ان دونوں گروہوں کی سرگرمیاں معرکہ آرائیاں اور خامہ فرسائیاں بھی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ عقیدت مندیاں اور جانب داریاں اپنی جگہ۔ جانچنا یہ چاہئے کہ اس کا جواب خواہ کچھ ہی ہو۔ ایک خاطر خواہ تعداد یہ ضرور بتلاتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے کلام و حیثیت کا کوئی گوشہ اہل علم و ادب کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہا۔ اور اردو میں معتبر ادبی کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔ "حیات دبیر" بھی انھیں حقیقت مندانہ اور جانب دارانہ تاثرات میں سے ایک ہے۔ فاضل مصنف جناب دبیر سے ۱۵ واسطہ اور ان کے خلف الرشید جناب مرزا وحید سے بلا واسطہ تلمیذ ہیں۔ سلام و مرثیہ گوئی میں مرزا وحید کے شاگرد ہیں۔

فرماتے ہیں ؎

یہ فیض صحبت دبیر و عنایت
ترے سلام کا ہم سر جواب کیا ہوگا
کیوں نہ کہوں جناب آج کر اپنا کلام
ہاں سے بڑھ کر کون کل اس فن میں کامل ادیب ہے؟

۱۹۳۷ء میں حیات دبیر شائع ہوئی، ہمارے ادبی حلقے اس تصنیف سے ناواقف نہیں لیکن حیات دبیر کے مصنف کی زندگی سے شاید بہت کم [illegible] اس کے مصنف اس مولوی فضل حسین

بھی یہ مشاعرے بڑے عروج و شہرت سے ہوتے رہے، لیکن ۱۹۳۵ء تک یہ آندھی چڑھ کر اتر چکی تھی۔ رجحان دیکھا کہ ہو چکا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو ہر بیٹ کالج اور اسٹریچی ہال کی جانب سے ایک مشاعرہ کرزن ہائی سیریل ہال (گاندھی بھون) میں منعقد ہوا جس کا مصرع طرح تھا۔ "آج سے کہدو کہ رہے عشق کا چرچا نہ کریں"۔ جناب محمود نے اپنے شاگردوں کے ساتھ مشاعرے میں شامل ہوئے لیکن وہ یہ تاثر لیا کہ شعراء میں عشق سخن کی طرف سے بے توجہی اور ذوق و شوق کی کمی پیدا ہو گئی ہے۔ اسی روز بزم ادب کے نام سے پھر اس بزم کا احیاء کیا گیا اور طے ہوا کہ ہفتہ وار مشاعرے ہوا کریں۔ جناب محمود نے خود شامل ہونے کا وعدہ فرمایا۔ محمود کی عمر کے لحاظ سے دن کا وقت رکھا گیا۔ مشفق عثمان غنی، مائل کے مکان واقع بازار سنی چوتھ میں یہ مشاعرے ہوتے رہے جناب ثابت ان مشاعروں میں شامل ہوتے اور غزلیں فرماتے۔ کچھ دنوں کافی ہما ہمی رہی۔ مگر افسوس کہ جناب محمود کی پیرانہ سالی ان مشاعروں میں شرکت کی زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ مشاعرے بعد میں بہت دنوں تک جاری رہے۔ لیکن جناب ثابت ان میں شامل ہونے سے معذور رہے میں بزم ادب کا سکریٹری تھا۔ ان مشاعروں کا ریکارڈ میرے پاس موجود رہا، جن مشاعروں میں محمود نے شرکت فرمائی، ان مشاعروں کے لئے کہی ہوئی غزلوں کے منتخب اشعار میں اہل ذوق کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔

مرحوم غزل میں جناب امیر مینائی کے شاگرد تھے چاہے خاندان امیر ہو، چاہے دبستان دبیر ہو مضمون آفرینی اور نکتہ سنجی دونوں اسکولوں کے اوصاف نمایاں ہیں۔ ساتھ ہی زبان کی شوخی و نفاست سے بھی غزلیں ہیں اس لئے آپ کو ان اشعار میں ان خصوصیات کی کمی نہ ملے گی جناب ثابت فرماتے ہیں۔

نیم میں دانہ نظر بھی ہیں تماشا بھی نہ

کا بڑا خاص خیال رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

مضمون کے ساتھ لطف بیاں بھی ضرور ہے
رنگت کی قدر بڑھتی ہے بوئے گلاب سے

لکھنؤ کی پیدائش، اور دہلی کے قریب راجپوتانہ و ماحبستان کی بود و باش نے جناب ثابت کے کلام پر ایک عجیب دلکش امتزاجی رنگ پیدا کر دیا تھا جس میں تیزی بھی ہے اور متانت بھی۔ سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ غزل کہنے کے بعد آپ فرمایا کہتے ہیں "مجھ دیوان نہیں دیتا، ناقہم ہے یا حاسد"۔ ثابت تیری باتوں میں ہم کو تو مزا آیا

لیجئے اب منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

لازم ہے کرم اس پہ ستم جس پہ سوا ہو
پلکوں سے اٹھا اس کو جو نظروں سے گرا ہو

جل جل کے جذب شمع ہیں پروانہ ہو گیا
جاں باز جان دیتے ہی جانانہ ہو گیا

گو کاہلی سے ہم کسی قابل نہیں رہے
اے مفلسی! فراغ تو شاہانہ ہو گیا

یہ واقعہ بھی کم نہیں عبرت کے واسطے
افسانہ گھر کا حال بھی افسانہ ہو گیا

ہم وہ نہ آتے نہیں مگر آپ کے
پھیرا ادھر بھی آج فقیرانہ ہو گیا

اللہ رے غرور رہا تو الگ تعلق
تیرے لئے میں اپنوں سے بیگانہ ہو گیا

تجوا کے میں گرا در دولت کے سامنے
شکر خدا کہ سجدہ شکرانہ ہو گیا

ثابت میں کربلا کے شہیدوں پہ ہوں نثار
کیا کام عاشقوں سے دلیرانہ ہو گیا

چلتا ہی رہا جائیں ہم سے وہ صنم کیا کیا
جب نکلا دم میں دم، دیتا رہا دم کیا کیا

جب دھیان یہ آتا ہے ہوتا ہے ہم کیا کیا
کیا ہو گیا عالم میں سوچا کئے ہم کیا کیا

آذر میں کہاں طاقت اللہ ایسی لیاقت تھی
تیرے پیکر قدرت نے تو شے میں صنم کیا کیا

اصل اور نقل میں ہے فرق نمایاں ثابت
بت نہ کام آئے مصیبت میں خدا کام آیا

غلبۂ شوق رہا جب تک تو بشر کہلایا
آدمیت ہوئی غالب تو وہ انسان ہوا

چند شعر اچھے ہوں جس کے وہ ہے ثابت شاعر
فائدہ کیا جو مرتب کوئی دیوان ہوا

وہ جگنو کو جلا کر کہہ رہے ہیں
کہ ہے یہ بھی دل روشن کسی کا

تو دیکھا ہی کیا اے ابر رحمت
جلایا برق نے خرمن کسی کا

نیامت میں تماشا دیکھتا ہوں
کسی کا ہاتھ ہے دامن کسی کا

اک آہ سرد بھری ہم نے اور شباب نہ تھا
ہوا سے موج نے کروٹ بدلی، حباب نہ تھا

جگر میں آگ لگے جب تو ضبط ہو کیوں کر
زرہ زرہ میں ایسا کوئی کباب نہ تھا

مجھے گناہوں کی شرمندگی نے روک لیا
وگرنہ یاد کی رحمت کا بند باب نہ تھا

غزل کے باب میں ثابت یہ قول فیصل ہے
کہ بعد میر کے آتش کا بھی جواب نہ تھا

ہر چیز ہے زمانہ میں اپنی نظیر آپ
تسبیح کو سمجھئے نہ زنار کا جواب

جرم سبھی مگر مری پوچھی نہ بات بھی
میرا نہ تم کو اپنے گنہگار کا جواب

ثابت اسے بھی اپنا بنانا خدا نصیب
ہوتا کوئی جو احمد مختار کا جواب

یہاں مزار پاؤ گل تو تمام رات
جو شبنم سے تھا داغ معطر تمام رات

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

جناب انصار فضلی داردی کی غزل پر ابوالمختار طرفہ بھنڈاروی کی اصلاح

خدا نا خواستہ دل غم سے گھبراتا — مرے لب پر مقدر را

۱۔ خدا نا کردہ ہو جاتا جو وہ ہمدرد تو کیا ہوتا — لبوں پہ بے خودی میں نام آجاتا تو کیا ہوتا
محبت کو سیاست کا — غم دوراں، غم جاناں سے ٹکراتا

۲۔ کسی کی یاد کا دل کو سہارا مل گیا ورنہ — غم جاناں غم دوراں نہ بن جاتا تو کیا ہوتا
گیا تیری جوانی کا بیاں طول قیامت تک — یہ اور کچھ آگے نکل

۳۔ قیامت تک پہنچ کر رک گیا اچھا ہوا ورنہ — بیان کافر جوانی کا جو چھڑ جاتا تو کیا ہوتا
دبا رکھا تھا جس غم کو مرے قلب تپیدہ نے

۴۔ بڑی مشکل سے جس غم کو دبا رکھا تھا سینے میں — وہ آنسو بن کے محفل میں نکل آتا تو کیا ہوتا

۵۔ گری بجلی، جلا میرا نشیمن، خیریت گذری
یہ شعلہ سارے گلشن کی ہوا کھاتا
خدا نخواستہ گلشن پہ حرف آتا تو کیا ہوتا

توجیہہ (۱) فضلی کے شعر میں یہ دونوں ضروری باتیں غائب تھیں کہ کس کے لبوں پر نام آجاتا اور کس کا نام آجاتا۔ اگرچہ کس کا نام کا اشارہ پہلے مصرع میں موجود ہے۔ مگر اصل ضرورت یہاں دوسرے مصرع میں پر انے وضاحت تھی۔ اصلاح میں ہر دو کمیاں دور ہو گئیں۔ پہلے مصرع کی بندش ڈھیلی اور کھڑی اکھڑی تھی وہ حضرت طرفہ نے چست کر دی۔ گھبراہٹ میں لب پر نام بدست آجانے کا امکان بمقابلہ بے خودی میں نام آنے سے زیادہ قوی ہے

(۲) ۔ اصل میں دوسرا مصرع بہت الجھا ہوا تھا۔ غم جاناں، غم دوراں بنتا۔ یا غم دوراں غم جاناں میں تبدیل ہو جاتا یہ کچھ پتا نہیں چلتا "بن جاتا" بھی اردو کی زبان میں بازاری زبان ہے۔ یاد کا سہارا ملنے کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔ اصلاح میں شعر نہ صرف با معنی ہو گیا۔ بلکہ قوی دلیل سے چست، روان اور بہتر ہو گیا۔ محبت کا تعلق غم جاناں سے ہے اور سیاست کا تعلق غم دوراں سے ہے

(۳) پہلے مصرع میں فضلی نے کہا کہ قیامت تک پہنچ کر بیان رک گیا۔ دوسرے میں کہتے ہیں اگر بیان چھڑ جاتا تو کیا ہوتا۔ گویا بیان چھڑنے سے پہلے قیامت تک پہنچ گیا یہ عجیب بات تھی۔ طرفہ صاحب کی اصلاح نے شعر کو ہموار۔ قابل فہم اور روان بنا دیا۔

(۴) سوال پیدا ہوتا تھا کہ کس نے غم کو دبا رکھا تھا۔ اصلاح میں قلب تپیدہ نے اس کمی کو پورا کر دیا

(۵) خواستہ سے مصرع ناموزوں ہو گیا۔ ناخواستہ ہونا چاہئے۔ گلشن پہ حرف آنا یہ معنی دارد؟ اصلاحی مصرع بہت روان تیز اور دلچسپ ہے۔

ابرار حسنی

ہماری مدد آپ کی مدد ہے

ایک قدیم مقولہ ہے "پاک صاف رہنا ہی عبادت ہے"

پاک و ستھرے ماحول سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بیماریوں پر کنٹرول رہتا ہے۔ ریلوے پلیٹ فارم۔ ویٹنگ روم اور ریل کے ڈبے وغیرہ جہاں کثرت سے لوگ جمع ہوتے ہیں، صفائی وغیرہ کا اہتمام رکھنا زیادہ ضروری ہے تاکہ مسافروں کی صحت کا تحفظ کیا جاسکے۔

بیماریوں سے جہاد کے خلاف آپ اس طرح ریلوے کی امداد کرسکتے ہیں:۔

گردوپیش کے مقامات کو پاک وصاف رکھنے کے لئے اپنا تعاون پیش کیجئے

۔ نیز سینیٹری اسٹاف کی خدمات حاصل کرکے جو حسب ضرورت اسٹیشنوں پر مہیا کی گئی ہیں۔ استعمال میں لائیے۔

نارتھ ایسٹرن ریلوے

نوح ناروی

ارشادات

کیا ہوا اُس کے تغافل پہ اثر تھوڑا سا
اَب مخاطب ہے یہ اندازِ دِگر تھوڑا سا

سینکڑوں رنج دیئے غم دیئے آزار دیئے
کب وہ بے درد رہا مائلِ شر تھوڑا سا

ہے یقیں مجھ کو کہ دو دل کبھی مل جائیں گے
آچلا اب مرے نالوں میں اثر تھوڑا سا

فرق ایسا نہیں کچھ آپ میں ہم میں ، لیکن
پلّا جھکتا ہے ترازو کا اِدھر تھوڑا سا

تو مرے دل میں ٹھہر اور ابھی پار نہ ہو
رحم درکار ہے اے تیرِ نظر تھوڑا سا

نالہ و شیون و فریاد کو جلدی کیا ہے
کھُلنے پایا ہے ابھی بابِ اثر تھوڑا سا

ہم اُسے کثرتِ آزار کا بدلہ سمجھیں
لطف بھی ظلم میں شامل ہو اگر تھوڑا سا

میں بڑے غور سے خوبانِ جہاں کو دیکھوں
حُسن دیدے جو مجھے حُسنِ نظر تھوڑا سا

غیر ممکن جو زیادہ ہو تو کچھ ہرج نہیں
چاہیے ہر کس و ناکس میں ہنر تھوڑا سا

جانبِ منزلِ محبوب بڑھاؤ بھی قدم
رہ گیا ہے ابھی اے نوحؔ سفر تھوڑا سا

ثمر سرحدی
ساحر سہسوانی

دو غزلیں

یہ نہ پوچھو دلِ ناکام کسے کہتے ہیں
کیا کہوں مرکزِ آلام کسے کہتے ہیں
غیر جانیں ہوسِ خام کسے کہتے ہیں
ہم سے پوچھو غمِ ایام کسے کہتے ہیں
کیا خبر صورتِ گرام کسے کہتے ہیں
صبح کہتے ہیں کسے شام کسے کہتے ہیں
جس نے دیکھی نہ تری آنکھ اسے کیا معلوم
کیفِ بے واسطۂ جام کسے کہتے ہیں
آپ الگ بیر الگ دوست الگ دشمنِ غم
اور حالاتِ خوں آشام کسے کہتے ہیں
اس کا احساس بھی شاید نہ ابھی ہو تم کو
شوخیِ گردشِ ایام کسے کہتے ہیں
غیر سے لے کے اجازت جو دیا ہے تم نے
اور پھر زہر بھرا جام کسے کہتے ہیں
کچھ تری نیم نگاہی کو پتا ہو شاید
سببِ لذتِ بے نام کسے کہتے ہیں
طنز مت کر مرے عقلِ بد اندیش نہ کر
عاشقی اور خوش انجام کسے کہتے ہیں
کیا کہا جذبۂ دل میں نہیں کوئی تاثیر
یہ گلہ پھر ہے تو او بام کسے کہتے ہیں
اہلِ دل اور کریں ترکِ وفا ناممکن
آپ ہی کہئے پھر الزام کسے کہتے ہیں
رند بھر رند ہیں اے شیخ انھیں کیا معلوم
کعبہ و جامہ و احرام کسے کہتے ہیں
آج اب کہنا پڑا بر سرِ سخن الہامی
یہ ہے الہام تو الہام کسے کہتے ہیں

غم سے کیوں مخلصی نہیں ہوتی
کیوں میسر خوشی نہیں ہوتی
ہو بھروسا جو اس کی رحمت پر
کوئی منزل کڑی نہیں ہوتی
دور آتے ہیں وہ بھی ہستی میں
جب خوشی بھی خوشی نہیں ہوتی
تیرگی سے مقابلہ کے بغیر
روشنی روشنی نہیں ہوتی
جس کو رونا کبھی نصیب نہ ہو
اس کی کھیتی ہری نہیں ہوتی
غم کے سانچے میں ڈھلنے سے پہلے
زندگی زندگی نہیں ہوتی
درد کی جس میں ہو نہ آمیزش
وہ خوشی بھی خوشی نہیں ہوتی
یہ نمائش کا دور ہے ساحرؔ
بندگی بندگی نہیں ہوتی

طرفہ قریشی

کیا ہوا، جو ہر طرف آوارہ خو جاتی رہی — بوئے زلفِ یار ہی تھی، کو بہ کو جاتی رہی
احتیاطِ بے قرار و الفتِ احتیاط — آنکھ سے آنسو گرا اور آبرو جاتی رہی
مل گیا عرشی بریں تھرائے لوح و قلم — یہ کہاں تک تیرے دیوانے کی ہو جاتی رہی
مسکرا کر یہ کہاں پہنچا دیا تم نے مجھے — دل سے قدرِ کائناتِ رنگ و بو جاتی رہی
قتلِ مینا نے کہہ دی ظرفِ مے خانہ کی بات — اب تو ساقی حسرتِ جام و سبو جاتی رہی
لا بٹھا دا عظ یہاں میں کو بٹھانا ہو تجھے — لے مرے دل سے بتوں کی آرزو جاتی رہی
کیا زمانے کی طرح تم بھی بدل کر رہ گئے — کیوں وہ پہلی بات، اگلی گفتگو جاتی رہی

مل گیا طرفہ مجھے اپنا پتہ اپنا سراغ
تھی جو پیہم ماسوا کی جستجو جاتی رہی

غزلیات

کوثر اعظمی

کبھی جب وہ پئے گلگشت اے کوثر نکلتے ہیں — تو بچھنے کے لئے لاکھوں دلِ مضطر نکلتے ہیں
نہ تھی جب طاقتِ پرواز ہم آزاد پھرتے تھے — قفس میں لائے جاتے ہیں جہاں دو پر نکلتے ہیں
جنھیں اہلِ خرد آرام لینے ہی نہیں دیتے — وہ گھبرا کر قیودِ ہوش سے باہر نکلتے ہیں
نظر ہوتی ہے ہم پر کس لئے ارباب عالم کی — کسی ساعت ترے کوچہ سے جب ہو کر نکلتے ہیں
جسے ہو تابِ نظارہ پئے دیدار آ جائے — حجابِ ناز سے وہ آج پھر باہر نکلتے ہیں
مجھے ہے خوف اس کا خلعتِ فن ہی نہ لٹ جائے — وہ کثرت ہے کہ "شاہر" آج کل گھر گھر نکلتے ہیں

رہِ الفت میں وہ منزل بھی کوثر آ ہی جاتی ہے
مسافر کیا جہاں مجبور خود رہبر نکلتے ہیں

سہیل نارنوی، نواسہ حضرت فرح نار

اُن کا مدت میں نظارا
شوق دونا اب ہمارا
میری سمت ان کا اشارا
ڈوبتے دل کا سہارا
باغِ عالم میں گلوں سے کیا
میرا کانٹوں پہ گزارا
دل سے امیدیں بہت کم تھیں
وقت پر یہ بھی تمہارا
جو گرا تھا چشمِ تر سے اشک
چہرۂ الفت پر ستارا
لگ گئی اس سنگ دل سے
شیشۂ دل پارا پارا
ایک آنسو کا نکلنا تھا
رازِ دل شب آشکارا
کچھ نہیں اب حاجتِ
چشمِ ساقی کا اشا
عشق میں جب وہ ہمارا
سارا عالم ہی ہمارا
بحرِ الفت تھا طلا
موج میں پیدا کنا
فیضِ نوحِ نارنوی کا
اتنا جو مشہور نا

طالب انصاری جمیل پوری

تو دل کی نہ کہو، سمجھو نہ قسمت میری — تم کو سمجھائے گی خود بڑھ کے محبت میری
عشق سے پہلے وجود اس کا نہ سمجھا کوئی — حسن تو اصل میں ٹھہرا ہے بدولت میری
نا خدا کشتی میں کچھ ان بن سی نظر آتی ہے — ہو نہ طوفانِ حوادث کو ضرورت میری
آس آئے گی نہ فردوس بریں بھی مجھ کو — بزمِ محبوب ہی دراصل ہے جنت میری
وقت اُن کا ہے خدائی ہے اُنھیں کی جانب — کون سنتا ہے زمانے میں شکایت میری
باوِ وعدہ سے وہ بھٹکیں تو کوئی کچھ نہ کہے — میں بھٹک جاؤں تو بدنام ہو الفت میری

مجھ میں آثارِ ندامت نہیں اب تک طالب
نالۂ درد سے محفوظ ہے اُلفت میری

افکارِ نو

علامہ بے باک

دنیا میں بے شمار ہیں انسان آج کل — انسانیت کا ہے مگر فقدان آج کل
کہلا بشر یہ کہہ نہیں سکتا یقیں کے ساتھ — انساں ہے کون کون ہے شیطان آج کل
لوٹوں کا گھونسلا کہیں چیلوں کا گھونسلا — گلشن بنا ہوا ہے بیابان آج کل
ہر سُو عیاں یہ قربِ قیامت کی ہے دلیل — ہر سمت آرہے ہیں جو طوفان آج کل
حمد و ثنا کا ورد جو رکھتے تھے صبح و شام — کرتے ہیں فلمی گیت کی گردان آج کل

بے باک سب یہ عشقِ بتاں کا طفیل ہے
سب لُٹ گیا جو آپ کا سامان آج کل

ہادی ناگ پوری

ذکر جب محفل میں آیا سیب یا انجیر کا — پھر گیا آنکھوں میں نقشہ آپ کی تصویر کا

ہو گئے کنگال تو رہتے ہیں ماتھا ٹھونک کر — سب نکمے ہی تو کرتے ہیں گلہ تقدیر کا

کاٹنے کے وقت بو یا ہے تو فاقے بھی کریں — کچھ نتیجہ تو نکموں کو ملے تاخیر کا

صنعت کا ترکہ ملے ذی کیوں نہ محل چھترے اُڑائیں — یہ نکالیں گے دوالہ باپ کی جاگیر کا

بھیجتے ہیں روز اک چاند تاروں کی طرف — بھید کھلتا ہی نہیں کچھ کاتبِ تقدیر کا

جتنے آوارہ ہیں سُن جائیں سب تخریب پر — جس کو محنت سے ملے موقع کوئی تعمیر کا

آنکھ میں نکلا بھی پڑ جائے مری ہادی اگر — نام دیتے ہیں اُسے اہلِ جہاں شہتیر کا

شمس الحق صدیقی قرنفل پوری

زندگی کا ازل سے یہ دستور ہے
کوئی رنجور ہے کوئی مسرور ہے
حسن اپنی جفاؤں پہ مسرور ہے
عشق مرمر کے جینے پہ مجبور ہے
حوصلے دل کے ہمت شکن تو نہیں
کیا ہوا میری منزل اگر دور ہے
میں ہوں بندہ ترا تو ہے آقا مرا
جو سزا دے مجھے دل سے منظور ہے
پوچھتا کیا ہے اے چارہ گر حال دل
پہلے جو زخم تھا اب وہ ناسور ہے

آزاد بدایونی

نظروں میں وہ نقش کف پا ہے کہ نہیں ہے
رہبر تجھے منزل کا پتا ہے کہ نہیں ہے
کہتے ہیں کہ موجود ہے ہر درد کا درماں
کچھ درد محبت کی دوا ہے کہ نہیں ہے
یہ بھوک یہ افلاس یہ محنت یہ مشقت
اس دور میں جینے کی سزا ہے کہ نہیں ہے
کچھ خالق و مخلوق میں حائل نہیں پڑتا
ارشاد نبیؐ حکم خدا ہے کہ نہیں ہے
یہ راہ سخن اس کے یہ پیچیدہ مناظر
آزاد کوئی راہ نما ہے کہ نہیں ہے

ڈاکٹر ادیس عبدالجبار شادان بھوپالی۔ آندھرا

ہر گھڑی کیف میں ساقی تو مے نوش رہے
سامنے جام رہے، بادہ سرجوش رہے
عمر میں کاش اک ایسی بھی گھڑی آجائے
میں کہوں قصۂ غم وہ ہمہ تن گوش رہے
سہل تھا حشر اٹھانا ترے دیوانوں کا
کچھ مگر مصلحتاً سوچ کے خاموش رہے
آنکھوں آنکھوں میں پلا ساقیٔ خانہ بر
نہ خبر ہو تجھے کوئی نہ مجھے ہوش رہے
ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا ہے در پر شادانؔ
تاکہ الطاف سے تیرے یہ ہم آغوش رہے

جلال و جمال

ہدایت اللہ ہادی۔ ناگ پور

اپنے نے کی نصیحت غیروں نے گفتگو کی
پھر بھی وہ کر رہے ہیں ہر اک سے بدسلوکی
جن کو کباب و کلچے ملتے ہوں بے مشقت
پھر ان کو فکر کیوں ہو جنتا اگر ہے بھوکی
آنکھوں سے مفلسوں کی ٹپ ٹپ جو گر رہے ہیں
نسرین، گل نہیں ہیں، بوندیں ہیں یہ لہو کی
انسانیت کا اتنا معیار گر چکا ہے
آقا کو مات دیں، یہ کمبخت گرد کی
گردابوں پر اپنی سر پیٹتے ہو بیکار کیوں
منزل ہی کی ہم نے کس روز جستجو کی
نیلام ہو رہا ہے انسانیت کا ہادیؔ
بولی لگی ہوئی ہے حرمت کی آبرو کی

کاوش حیدری۔ رائے پور

سایہ کا تجربہ گمراہ کن ثابت ہوا
ہم کہیں آگے پڑے ہیں اور ہے منزل کہیں
اپنے اشکوں میں نہ ہو غرق انا کے جذبے سے کہ چراغ
بیٹھ کر رونے سے کٹتی ہے بھلا منزل کہیں
واعظا اک وہم باطل ہے تمنائے سکوں
آبجوئے عشق کے ہوتے نہیں ساحل کہیں
اک نہ اک دن ڈھونڈ ہی لوں گا تجھے اے پردہ دار
قتل کر کے چھپ سکا ہے کوئی قاتل کہیں
منتظر آنکھوں کی سوگند اب تو آ بھی جائیے
مر نہ جائے حسرت دیدار میں بسمل کہیں
کاوشؔ اس کو محفل زہرہ وشاں میں دیکھنا
میرے سینے سے نکل کر کھو گیا ہے دل کہیں

شہرت میرٹھی

کسی کا طور پہ جلوے کی اس کے آرزو کرنا
کسی کا عرش پر جا کر خدا سے گفتگو کرنا
اٹھا کر لے گئی باد خزاں پہلے ہی جھونکے میں
بہت دشوار ہے اب آشیاں کی جستجو کرنا
شب فرقت تو خود صبح ہونے پر یہ کہتا ہوں
کوئی اس چرخ کے چاک گریباں کو رفو کرنا
ہزاروں ہو گئے جنت میں داخل سرخرو ہو کر
وہی خنجر کو آتا ہے قاتل سرخرو کرنا
بلانی چاہئے شمع محبت خانۂ دل میں
اندھیرے میں نہیں ممکن خدا کی جستجو کرنا
ہوئے گم ہم کسی کی جستجو میں اس طرح شہرتؔ
ہوا دشوار آخر ہم کو اپنی جستجو کرنا

مترجمہ روشن پٹیالوی

مصور کا شاہکار

موپاسان کا ایک حسین افسانہ

ایشرتاٹ میں ایک خوبصورت دوشیزہ ایک گاڑی نما سی کو گھمانے لئے جا رہا تھا جس میں ایک بیمار عورت بیٹھی تھی اس کی یہ گاڑی یہ آدمی مشہور مصور ہیبی سمر تھا۔ وہ دونوں ان لوگوں کی طرح متمول تھے جنہیں کوئی بڑی مسرت دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ وہ کھوئے کھوئے سے اپنے اردگرد پُرمسرت لوگوں کو جو اپنوں کو دوڑا رہے تھے دیکھ رہے تھے

عورت نے مرد کی طرف مخاطب ہو کر کہا "آؤ ہم یہاں پر ذرا آرام کر لیں۔

ماہر فن کو دیکھ کر طرح طرح کی باتیں اور چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کسی نے کہا :- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرد نے عورت کی حالت پر رحم کھا کر اس سے شادی کی ہے کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہوگی اور شاید کوئی اور اس کی خبر گیری کرنے والا نہ ہوگا۔

مگر دو نوجوانوں نے جو قریب ہی گھوم رہے تھے کسی دوسرے ہی زاویۂ نظر سے اس سلسلے میں بحث شروع کر دی۔ ان میں سے ایک بولا "میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں سمر کو بخوبی جانتا ہوں۔ اس نے مندرجہ بالا وجہ سے اس عورت سے شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ کچھ اور ہی ہے جس کی وجہ سے عام لوگ کسی عورت سے شادی نہیں کرتے اور وہ وجہ یہ ہے کہ ہیبی سمر مصور ہے۔ مصوری دیگر فنون لطیفہ کے فن کاروں کی طرح ہی پاگل صفت ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک ادیب کو کتابوں سے محبت ہوتی ہے اسی طرح مصور کو مصوری میں کام آنے والے خوبصورت سے از حد محبت ہوتی ہے اور ان دونوں کے بارے میں یہی وجہ شادی کا باعث بنی ..... کیونکہ عورت کے پاس وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتی تھی۔ اس نے سب کچھ حاصل کرنے کے لئے یہ خطرہ مول لیا لیکن وہ اس سے واقعی محبت کرتی تھی یا نہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عورت حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکتی ہے۔ اس کی طبیعت میں متضاد عادات۔ شہوت، حرص، قربانی، نفرت، انس وغیرہ کا ایسا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ بعض اوقات عورت جذبات کے تحت عمل کرتی ہے اور بعض اوقات شرارتاً۔ ہم عورتوں کو اس لئے ناقابل فہم سمجھتے ہیں کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کرنے والی ہے اور پھر ہم اس کی موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے آپ سے مغلوب ہونے کی صورت میں نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کا ہارا ہوتی ہیں۔ خاص طور پر جب کہ سوال شادی کا ہو۔

اور یہی ہیبی سمر اور اس کی اس عورت سے شادی کی کہانی ہے۔ یہ عورت ایک مصور کے لئے مثالی نمونے کا کام دے سکتی تھی اور اس نے ویسا کیا بھی۔ وہ خوبصورت تھی پُرکشش۔ اس کے نقوش دل میں اترنے والے تھے۔ وہ اس کے دل کو فتح کرنے کے ارادے سے چلی جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس پر عاشق ہو گیا۔ اور یہ محسوس کرنے کے بعد کہ وہ جس قدر اس سے محبت کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ اسے چاہتی ہے، آخر کار روزانہ ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور پھر شادی ہو گئی۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جسے بار بار کوئی مرد محبت کرتا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ عورت کبھی بیوفائی نہیں کر سکتا۔ جو وہ یہ بخوبی جانتا ہے کہ وہ پہلے کسی محبت میں مبتلا تھا اور دوسری عورتوں کے بارے میں بھی اس کے ایسے ہی جذبات تھے جو کہ اب ختم ہو چکے تھے

وہ یہ جانتا تھا کہ ان دونوں میں کسی بات میں بھی مماثلت نہ تھی۔ اس کی قسمت فیصلہ نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ وقتی جذبات کا غلبہ ختم ہونے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر اس نے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔

جب وہ آخر ہیبی سمر کی ایک عورت تھی، اس نے ہیبی سمر کو بتائے بغیر نہ چھوڑا جس خوبصورت طریقے سے اس نے اس سلسلے میں عمل کیا اس سے ہیبی سمر کا دماغ مشیدا ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ ہیبی سمر پر غصہ میں نہ کر سکا کہ وہ دوسرے مصوروں کے نمونوں سے کس قدر مختلف تھی۔ موسم گرما کے لئے اس نے ایندھیلی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ گزشتہ شام میں ان کے مابین متعدد جدال کے درمیان کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ یہ بہت خوبصورت اور روشن رات تھی۔ ہم دریا کے کنارے سیر کے لئے گئے ہم دونوں اکٹھے ہی خاموشی سے وہاں گھومنے لگے، ان باتوں کے خواب دیکھتے ہوئے جنہیں ہم کرنا چاہتے ہیں۔

دفعتاً جوزفائن نے ایک چیخ ماری۔

"اوہ! کیا تم نے اس بڑی مچھلی کو پانی سے باہر اچھلتے ہوئے دیکھا تھا۔

"ہاں! اس نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا

وہ ناراض ہو گئی۔ تم نے اسے کس طرح دیکھا۔ جب تمہاری اس طرف پیٹھ تھی۔ مگر چند لمحات کے بعد وہ پھر بولی "کیا تم کل پیرس جا رہے ہو؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا" اس نے جواب دیا

اس جواب سے وہ پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہو گئی "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے وقت ضائع کئے ساتھ سیر کا لالچ اختیار کروں گی تو تمہارا غلط خیال ہے"

اس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیوں کہ عورتیں غصہ کو سرکش اور گستاخ ہوتی ہیں۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے خوب بھڑکا کر غصہ دلائے گی۔ تب وہ ایک بے ربط خطاب اور بے سوچے سمجھے الفاظ کی بوچھاڑ کرے گی جیسا کہ بپھری ہوئی عورتیں کیا کرتی ہیں۔

"تم خاموش رہو۔" اس نے کہا۔

اس نے پر غضب انداز میں جواب دیا "میں خاموش کیسے رہوں؟"

"کیوں کہ تم شام کی سیر کا لطف خراب کر رہی ہو۔" اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔ "تمہاری نفرت اور گھناؤنی چیخ پکار جو اکثر و بیشتر ہوتی ہے۔ آنسوؤں، آہوں اور الفاظ کے ساتھ جو دلوں کو مجروح کیا کرتے ہیں۔ شام کے سکون اور حسن کے بھی برعکس تھا۔"

کچھ ماہ کے بعد حالات ایسے دگرگوں ہوئے کہ اس کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ دن رات آپس میں الجھتے رہتے تھے حتیٰ کہ یہ ان کی عادت بن گئی۔ اس کے باوجود بھی وہ اس سے کنارہ کشی نہ کر سکا۔ نہ ہی وہ اتنی جرأت کر سکا اور نہ ہی اس معاملہ میں اس نے کوئی کوشش کی۔ مگر آخر وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنا تمام سامان اور مکان فروخت کر دیئے۔ اس کی جو قیمت وصول ہوئی وہ اور ایک خط اس کے لئے چھوڑ کر خود کہیں چلا گیا۔

وہ میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ایک شام تقریباً چار بجے باہر کے دروازے پر دستک ہوئی اور آواز سنائی دی۔ میں دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا۔ دروازہ کھلنے پر ایک عورت پرجوش انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور سیڑھیوں کے نیچے آ گئی..... وہ واپس آ گئی تھی ..... جین کہتے ہوئے دیکھا تو وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے لفافہ اس کے ہاتھوں پر دے مارا۔ وہ لفافہ میں بند کئے ہوئے روپے تھے اور پھر وہ دھیمے مگر سخت آواز میں بولی "یہ تمہارا روپیہ ہے۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے سنبھال لو۔" وہ کانپ رہی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی بھی جانا نہ فعل کے لئے تیار تھی ..... مگر میں ہر بھی خفت میں تھا اس کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا اور وہ بھی تشدد پر اتر آیا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" وہ بولا۔

"میں ایک بازاری عورت کا سا سلوک نہیں چاہتی تم نے مجھے حاصل کرنے کی خواہش کی۔ التجا کی۔ تب میں تمہارے پاس آئی۔ میں نے خود تو تمہیں نہیں بلایا تھا۔ تم جب چاہو میرا حق تم پر تمام ہو چکا ہے۔ میں پاک ہی رہوں گی اور اس نے اپنا پاؤں زمین پر مار کر کہا۔ کیا تمہیں ایسا کہنے کی جرأت ہے؟ اور میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اس خیال سے کہ میں اس سے مفصل بات کروں گا اور اسے مطمئن کر دوں گا۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ میری تمام دلائل، التجائیں اور دلیلیں ختم ہو گئیں۔ مگر وہ نہ بولی۔ خاموش ہی رہی۔ وہ از حد غصے میں تھی اور اپنی ضد پر بدستور قائم نظر آتی تھی۔

آخر کار میں نے آخری بے باکانہ کوشش کی۔ "بولو!" میں نے کہا وہ اب مجھے تم سے محبت کرنا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں مگر تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی شادی جیسنٹ ڈالی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو ——

وہ اس کی طرف مڑی

"تم تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ ہوں۔" اس نے جرأت سے جھوٹ بولا

"ہاں ——!"

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کے میز پر ہاتھ جا کھڑی ہوئی "تب اگر ایسا ہی ہے تو میں خودکشی کر لوں گی کیا تم سنتے ہو؟"

اس نے اپنے کندھے جھٹکے "خودکشی کرو۔" کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس کے الفاظ ادا نہ ہو سکے وہ معلوم ہوتے تھے "تم کیا کہتے ہو۔" وہ ہکلائی "خودکشی کرو۔" اپنی بات کو دہرایا۔

"میں کہتا ہوں خودکشی کرو۔ اگر تمہارے اندر اتنی جرأت ہے۔" اس کا رنگ بالکل فق ہو گیا۔

"میں کہتا ہوں۔ مجھے انتہائی قدم اٹھانے کے لئے مجبور نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے۔ تو میں اس کھڑکی سے نیچے کود جاؤں گی۔"

وہ آگے بڑھا۔ اس نے کھڑکی کھول دی اور جھک کر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے پیچھے میں بھی!" اس نے ایک لمحہ خاموشی کی اس کی طرف دیکھا اور پھر اس سے پہلے کہ میں سمجھ سکتا کیا ہو گیا ہے۔ وہ ہوا میں دیوار سے نکل کر نیچے کود گئی۔ میں اور جین خوف زدہ اور مبہوت سے کھڑے رہے۔

قریب لڑکی کو جانے پاس لایا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ چکے تھے۔ وہ تمام عمر کے لئے اپاہج بن گئی تھی۔

اس کے حاشقہ نے شرمندگی اور افسوس کے جذبات سے مغلوب ہو کر اور اس قید محبت کے لئے اس کا محزون ہوتے ہوئے نہ صرف اسے واپس حاصل کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ اور میرے پیارے پڑھنے والو! ان کی کہانی یہاں ختم ہو چکی تھی۔ عورت کرسی پر بیٹھی کانپنے لگی وہ اندر جانا چاہتی تھی۔

مصنف نے بڑی احتیاط سے کیمل اس کے گرد لپیٹا اور کرسی کا رخ قصبہ کی طرف کر دیا اور مصنف اور اس کی بیوی کسی سے بات کئے بغیر اپنے گھر واپس لوٹ آئے ——!

ضروری اطلاع

شائقین کرام طرح طرح کے خطوط لکھ کر اور بیسیوں کے باوجود بھی حضرت مولانا ابو الحسن گنوری صاحب ٹونک خانقاہ ضلع بدایوں (یوپی) کی خدمت میں اصلاح کرنے کی بجائے دیر مشاعرہ بشیر گڑھ روانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ مشاعرہ زیر نظر کی بیشتر غزلیات تحریک اشاعت نہ پہنچنے سے ناشائستہ کی صورت میں کلام شریک کیا جانے لگا۔ جو وقت مقررہ پر حضرت ابو الحسن صاحب کو وصول ہو گا۔ پڑھنے کی نشاندہی اور تبدیلی پتہ کی اطلاع بغیر مشاعرہ بشیر گڑھ سے بھیجے حضرت ابو الحسن کو زحمت نہ دیجئے۔

کیفی جھانسوی

سہارا

راکیش اپنے ڈریسنگ روم میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو شراب کے جام پر جام پیئے جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک جانی پہچانی آواز نے چونکا دیا

"آؤ دن آؤ۔" اس نے نشۂ شراب سے مغلوب کہا۔ دن ڈریسنگ روم میں داخل ہو گیا اور راکیش کو اس حالت میں دیکھ کر ناصحانہ لہجے میں کہنے لگا

"راکیش تم نے پھر شراب پی۔ میں بارہا منع کر چکا ہوں شراب بری شے ہے اسے نہ پیا کرو۔ لیکن نہ جانے کیوں تم باز نہیں آتے ——"

راکیش نے آہ سرد بھرتے ہوئے اپنی خمار آلود نگاہوں کو مخلص دوست دن کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا "میرے دوست دن! کس طرح میں اس کو ترک کر دوں؟ یہ تو میری زندگی ہے میرا سکون ہے، میرا قرار ہے، میری زندگی کے بے شمار غموں کی تو ایک واحد سہارا ہے یہ شراب۔ اس کے بغیر اس کے میرا کوئی مونس و غمگسار جو مجھے اندوہ و الم کے تاریک خانے سے نکال کے میرے مضطرب دل کو ایک صرف ایک ساعت کا سکون دے سکے میرا قرار بن کر مستقیب کر سکے۔ ہاں دن میرے دوست ..... کوئی نہیں ..... ایسا..... کوئی نہیں" اور ایک لمحۂ خاموشی، بیتنے کے بعد صراحی سے پیمانہ میں شراب ڈال کر اسے ہاتھ میں اٹھا کر بہت ہی سنجیدگی سے کہنے لگا "اس مانا کے بعد اگر دنیا میں کوئی شے ہے جو مجھے سکون بخشتی ہے تو یہی شراب ہے۔ یہ شراب جو میں پی رہا ہوں۔ اسے پی کر اپنا ہر درد و الم بھول جاتا ہوں۔ ماضی کی یادگاروں، رنگین خوابوں کو۔ اور امرت چھلکاتی ہوئی جاذبی راتوں کو اسی پیمانۂ شراب میں غرقاب کر دیتا ہوں۔ وہ رنگین راتیں ایک رنگ دل اور عہد لنگن کی تھیں میں گزاری ہیں۔ محبت کے ترانے گائے کرتے ——"

"کون سنگ دل؟" دن نے سوال کیا

"نہ پوچھو دن نہ پوچھو!" راکیش نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے گرفتہ لہجے میں کہا۔

"نہیں راکیش تمہیں بتانا ہی پڑے گا" دن نے استقلال سے کہا۔

"ایک حقیقت کو کیوں افسانہ بنانا چاہتے ہو" راکیش کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔

"حقیقت کا پردہ جب چاک ہو جاتا ہے تو بیچارہ انسان کے اندر کچھ نہیں رہتا اور انسان کو خود بخود احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ حقیقت نہیں ایک حسین خواب تھا۔ وہ محبت نہیں، بلکہ محبت کا ایک دلچسپ افسانہ تھا۔ جو عہد ماضی کی پرسکون آغوش میں کسی کا فرادا کی زبانی سنا تھا ——"

"تم نے ٹھیک ہی کہا دن ——" راکیش نے شراب کے نشے سے مغلوب ہو کر اپنی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے تائید کی۔

"تو پھر مجھے بتاؤ وہ کون ہے جس نے تمہیں فریب دیا تم سے بے وفائی کی اور تمہیں اس حالت پر پہنچایا وہ کون سی سرگزشت ہے جو ہر وقت ہر لمحہ تمہیں تمہاری زندگی سے بیزار کرتی ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ یہ حقیقت ہی ہوگی۔ لیکن میں اسے ایک افسانہ کی شکل میں سننا چاہتا ہوں ——"

"دن، پیارے دن۔ میرے دوست مجھے مجبور نہ کرو ——" راکیش نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"آخر کیوں ——؟" دن نے با اصرار دریافت کیا

"اس لئے کہ محبت میں شکوہ و شکایت زیبا نہیں۔ بلکہ میں تو اسے گناہ کے مترادف قرار دیتا ہوں ——"

"اگر یہ گناہ ہے تو اس گناہ کو میرے سر لے لو یہ گناہ مجھے پر ہے گا ——"

"تو پھر سنو ——"

"ایک تاریک شب تھی، فضا بھی ساکت تھی ہر طرف سناٹے کا عالم تھا۔ میں کناٹ پارک کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا۔ خاموشی، تنہائی اور تاریکی کا لطف لے رہا تھا کہ ناگہاں پارک کے دروازے پر ایک کار آکر رکی اس میں سے چار مرد ایک عورت کو زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے کر اور پارک میں داخل ہو گئے۔ وہ چاروں مرد اس تنہا عورت کو اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ضرور حال میں کالا ہے اور ایک تنہا اور درماندہ عورت کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ میں ان لوگوں کو دیکھتا رہوں اور وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ میں نے غور سے دیکھا وہ نوخیز لڑکی بہت ہی خوبصورت تھی۔ بالکل ایک پری کی مانند تاریکی میں بھی اس کا حسین چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ان ظالموں کی گرفت سے آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لا رہی تھی۔ لیکن ناکام تھی۔ غنڈے اس کی آبرو ریزی پر تلے ہوئے تھے۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ راکیش بزدل کی طرح کیوں کھڑا ہے۔ جا آگے بڑھ اور اس مظلوم و بے کس کی عصمت کا محافظ بن۔ دیر نہ لگا جا۔ یہاں کھڑا کھڑا کیوں گناہگار بن رہا ہے" یا خدا مجھے پھر غرور نفس ہوا اور میں اس مظلوم کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے آگے بڑھا۔ ایک پستول نما ٹارچ میرے ہاتھ میں تھا میں نے اسی کو جنبش کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا "خبردار!

چھوڑو اس لڑکی کو۔ وہ تو گولی مار دوں گا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ چاروں بدمعاش سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے اور پھر بیچاری میرے قدموں میں آگری۔ میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "یہ کیا نادانی ہے۔"

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی" پریمیلا دوشیزہ نے دست بستہ کہا۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید وہ بھی یہی کرتا۔"

"لیکن آپ نے اپنی جان پر کھیل کر میری مدد کی آج کل کون کسی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے ہزاروں میں کہیں ایک ہی آپ کی طرح جانباز ہوتا ہے جو خود کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کے کام آتا ہے اور اسے اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

"یہ آپ کی بلند نظری ہے۔"

"نہیں، میری بلند نظری نہیں۔ بلکہ میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔" کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی۔

"میں آپ کو اپنے ڈیڈی سے ملاؤں گی، وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" پری جمال حسینہ نے جوش و خروش سے کہا۔

"یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔؟"

"اس لئے کہ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں، مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔" میں خاموش رہا۔ البتہ اس نازنین دوشیزہ کے بے مثال حسن کو غائبانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ مختصر سے اس حسن و شباب کے دلفریب مجسمہ کو شاید فرصت کے لمحات میں تراش تراش کر بنایا گیا تھا۔ جس کی ہر ادا قاتلانہ اور ہر فریب قیامت تھی۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔؟"

"اوہ میں تو اپنا نام بتانا ہی بھول گئی۔ میرا نام آشا ہے۔"

"آشا۔ نام بہت خوبصورت ہے۔" میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

"اور ــــ!"

"اور میرا نام شاید راکیش ہے۔" میں نے کچھ اس انداز سے اپنا نام بتایا کہ آشا بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس قہقہہ کی نقرئی آواز نے فضا کے دوش پر رقص کناں ہو کر شب کے تاریک ماحول کا سکوت توڑ دیا

"راکیش بابو اب مجھے اجازت دیجئے اور کل شام اسی جگہ ملنے کا وعدہ کیجئے۔"

"کل شام کو میں یہاں نہیں آ سکوں گا۔ لیکن اس وقت اندھیری رات میں آپ تن تنہا کس طرح گھر جا سکیں گی۔؟"

"میں چلی جاؤں گی، اب آپ مطمئن رہئے۔"

"نہیں! چلئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں۔" آشا نے انکار نہیں کیا اور میں اسے اس کے گھر تک چھوڑ آیا۔

دوسرے دن شام کو اسی پارک میں آشا سے ملاقات ہوئی۔ پھر تو ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر جانے آنے لگے اور اس کے بعد سیر و تفریح کی خاطر جاتے تو ہم دونوں ایک ساتھ جاتے۔ فلم دیکھنے جاتے تو ہم دونوں ایک ساتھ جاتے۔ غرض کہ زیادہ تر ہم دونوں ایک ساتھ رہا کرتے تھے محبت کے گیت گا گا کر، مسکرا کر، سرگوشیاں کرتے زندگی کو خوش گوار بنانے اور حسن و عشق کی دنیا میں کھو کر خود سے بھی بے نیاز ہو جاتے، وہ منظر کبھی نہ بھولوں گا۔ شام ہو رہی تھی افق پر ارغوانی اجالا ہم سے مل رہے تھے آفتاب تو غروب ہو چکا تھا۔ مگر مغرب کی سمت آسمان کے کناروں پر اب بھی سرخی باقی تھی۔ جس کی سحر انگیزیاں عالم لاہوت سے خسرو تھیں۔ فضا کے خوابناک خراماں جھٹپٹے خراماں آلود جھونکے جسم کو چھو چھو کر سینے میں ایک آگ سی لگا رہے تھے۔ گاہ گاہ آشا کے رخ زیبا سے آنچل ہٹ جاتا

بقیہ صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں

قدموں کو دنیا میں اکثر ایسی جگہ پر بھی پڑتا ہے جہاں نرم و نازک ہاتھوں سے گرفتگی میں مصروف کیوں مجھے مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ میں جیسے رخساروں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے آشا ــــ؟"

"تمہیں دیکھ رہی ہوں آشا۔" میں کہا۔

"کیوں ــــ؟"

"تمہاری تصویر آنکھوں سے چاہتی ہوں۔ تاکہ تم ہمیشہ میرے قریب

"آشا!" میں تڑپ سے نہ جانے کیوں درد پیدا ہو گیا۔

"ہوں ــــ!" آشا نے اسی کا جواب دیا۔

"کیا یہ سچ ہے جو تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں راکیش۔ یہ بالکل سچ محبت ہے۔ ایک ایسا تحفہ ہے جو پس لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے۔

"کس بات کا افسوس!" ہوتے بے صبری سے پوچھا

"تمہیں میری محبت کا یقین

"مجبوراً ہم لوگوں نے اختیار نہیں ..... بہت ہی دشوار ہے"

"میں تمہاری باہوں میں رہوں گی ــــ"

"راستہ پُرخار ہے!"

"تم میرے ساتھ رہو گے تو تکلیف احساس نہ ہو گا۔"

"ہماری راہ میں زمانہ دیو طرح کی الجھنیں پیدا ہوں گی۔"

"میں اس دیوار راہ کو توڑ

عشرت امیر ادیب

گلاب کے پھول

وہ کمرے کے اندر بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھی کہ باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے اخبار موڑ دیا اور اسے ہاتھ میں لئے کمرے سے باہر آگئی۔ برآمدے میں ایک خوبصورت سا نوجوان دیکھ کر وہ چونکی۔ نوجوان کے چہرے پر جھائیاں سی اڑ رہی تھیں اور اس نظریں بار بار اپنے کندھے پر لگے گلاب کے پھولوں پر جا رہی تھیں۔

"فرمایئے کیا کام ہے۔" اس نے نوجوان سے بے رخی سے پوچھا۔

نوجوان اب دو قدم آگے بڑھ آیا تھا اس کے لب ہلے۔ اس نے رومال سے پیشانی کا پسینہ خشک کیا پھر بولا۔

"میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں فائدہ آپ مطالبہ کر رہی تھیں۔" نوجوان نے اتنا کہا اور پھر اس کی نظریں پھولوں کی طرف چلی گئیں۔

"جی ہاں۔ وہ کیا کام ہے۔ آیئے تشریف رکھئے" اس نے نوجوان کو برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"میں آپ کے پڑوس میں ہی رہتا ہوں۔ میرا نام کشن ہے۔ میں آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ میری چھوٹی بہن جس کی عمر پانچ سال کی ہے بہت سخت بیمار ہے۔ اُسے گلاب کے پھول بہت پسند ہیں اور اس وقت بھی بیمار ہونے کے باوجود وہ ضد کر رہی ہے کہ اس سامنے والے مکان سے مجھے گلاب کے پھول لا دو اور حقیقت یہ ہے کہ گلاب کے پھول پا کر اس کی طبیعت بہل جاتی ہے اس لئے اگر آپ مجھے دو پھول روزانہ دے سکیں تو۔۔۔ بہت مہربانی ہوگی۔" وہ یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے پتا جی گلاب کے پودے بڑے شوق سے لائے تھے، اور اب بھی ان پودوں میں پھول تھے، خوب بڑے بڑے اور سرخ پھول۔ اس نے سوچا کہ ایک ان پودوں میں سے پھول توڑنا ٹھیک نہیں۔ مگر پھر اس کا دل ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو گیا۔ وہ فوراً بولی:۔

"اچھا میں دو پھول تو نہیں ایک پھول ضرور آپ کو دے دوں گی۔"

نوجوان جواب لینے کے لئے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ نوجوان کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا سکی اور جلدی سے اٹھ کر کارنس کے اوپر گئی۔ گلاب کا پھول ایک ہری ٹہنی پر پتیوں کے بیچ میں کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر پھول کو دیکھتی رہی۔ پھر کارنس پر جھک کر ہاتھ بڑھا کر اس نے پھول کو ٹہنی سے جدا کر دیا ——

پھول لینے کے بعد نوجوان نے مختصر الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر چلا گیا —— وہ برآمدے میں کھڑی نوجوان کو جاتا دیکھتی رہی۔

اب یہ روز کا معمول سا ہو گیا تھا کہ ابا کے جانے کے بعد وہ برآمدے میں بیٹھ کر اخبار پڑھتی رہتی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اور اس کا چھوٹا بھائی گھر میں رہتے تھے۔ اس کے ابا صبح ہی ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے اس کا بھائی بھی اسکول چلا جاتا اور وہ گھر میں تنہا رہ جاتی اخبار پڑھنے میں اب اس کا نہ جانے کیوں دل نہیں لگتا تھا وہ تو بس آٹھ بجے سے ہی اس نوجوان کا انتظار کرنے لگتی۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ اُسے نوجوان سے کوئی مطلب نہ تھا، اُسے تو اس کی چھوٹی بہن سے محبت سی ہو گئی تھی۔ وہ روزانہ نوجوان سے اس کی ننھی بہن کی طبیعت دریافت کرتی تھی۔ نوجوان اسکی کہتا کہ گلاب کے پھول پا کر وہ بہت خوش رہتی ہے اور اب اس کی طبیعت سنبھل رہی ہے۔ قدرے عجیب قسم کی خشک سی پہچان تھی۔

آج بھی وہ اس نوجوان کا انتظار کر رہی تھی۔ گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ رینگتی رہی۔ آٹھ بج گئے۔ پھر نو بج گئے۔ مگر آج وہ نوجوان نہیں آیا۔ دوپہر بجے تک وہ اس نوجوان کے آنے کی راہ تکتی رہی، مگر وہ نہ آیا۔ نہ جانے کیوں اس روز کسی کام میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ عجیب سی بے چینی اس کے اوپر مسلط رہی —— بار بار وہ سوچتی اسے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے، اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب وہ کچھ بدلتی جا رہی ہے، اس میں کچھ تبدیلی ہوتے لگی ہے۔ وہ سوچتی کہ وہ اتنی بے چینی اور بے تابی سے نوجوان کا انتظار کیوں کرتی ہے۔ پھر اسے نوجوان کی کئی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہی باتیں اس کے دل اور جذبات میں ہیجان سا بپا کر دیتیں۔ ایک دن نوجوان نے باتوں ہی باتوں میں اس کا نام پوچھ لیا تھا۔ اور اب وہ پھول لینے کے بہانے بہت دیر تک بے مقصد اور بے سر و پا باتیں اس سے کرتا رہتا۔ اس کے چہرے کو تکتے رہتا اور وہ گھبرا جاتی۔ اس کے دل میں عجیب عجیب خیال سر ابھارنے لگتے۔ کہیں یہ نوجوان مجھ سے عشق تو نہیں کرنے لگا۔ یہ سوچتے ہی وہ پسینہ پسینہ ہو جاتی

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے بہت سے ایسے ناول اور افسانوں کو پڑھا تھا جس میں ہیرو عجیب اور نئے ڈھنگ سے لڑکیوں سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہے کہیں یہ نوجوان بھی تو ان ہی ہیرو جیسوں میں نہیں ــــ پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ان تمام خیالوں کو جھٹک دیتی اور دل ہی دل میں کہتی "بچو نے اگر یہ حرکت کی تو میں بھی وہ مزہ چکھاؤں گی کہ یاد کرے گا ــــ"

اب وہ اس بات کی منتظر رہتی کہ کب کوئی ایسی ویسی بات نوجوان اس سے کہے اور وہ بپھر کر نوجوان کی اچھی طرح مرمت کرے اور اسے خوب کھری کھری سنائے

قریب ایک ماہ ہو گیا۔ نوجوان روزانہ آتا اور پھول لینے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ اور پھر نمستے کہہ کر چلا جاتا۔ اب وہ سوچتی تھی کہ ایک ماہ ہو چکا اور ابھی اس کی بہن ٹھیک ہی نہیں ہوئی۔ آخر ایسی کون سی بیماری ہے اُسے ــــ اس نے سوچا ضرور یہ نوجوان اپنی بہن کا ڈھونگ رچا کر اس سے محبت کرنے کے لئے یہ چال چلا ہے اب اس کے دل میں خدشے ابھرنے لگے۔ پھر اُسے اپنے اوپر حیرت ہوتی۔ آخر وہ اب روزانہ صبح ضرورت سے زیادہ سنگھار کیوں کرنے لگی ہے ــــ پہلے نوجوان کے آنے سے پہلے وہ صبح یونہی بال بکھرائے پھرتی۔ ہونٹوں پر سرخی لگاتی اور نہ رخساروں پر پوڈر مگر اب تو وہ روزانہ صبح ہی سنگھار کر کے کپڑے بدل کے باہر آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی آنکھیں باہر لگی رہتی ہیں کسی کو نوجوان نے ــ ہوں۔ اس نے سر کو جھٹک دیا۔ اُسے اس کی بہن سے بھلا کیا ہے۔

اور پھر ایک ماہ گزرنے کے بعد دوسرا ماہ شروع ہوا ــــ پھر تیسرا ــــ مگر اچانک تیسرے مہینے کے وسط میں نوجوان نے آنا بند کر دیا۔ پہلے دو ہفتے۔ تیسرے دن بھی وہ نہ آیا۔ وہ انتظار کرتی۔ برآمدے میں بیٹھی ۱۲ ــ ۱ بجے تک انتظار کرتی رہتی، مگر نوجوان نہیں آیا۔ اب نہ جانے کیوں وہ اداس اور بے کل سی رہنے لگی ..... نہ جانے کیوں۔ پھر ایک دن اچانک اُسے ایک لفافہ ملا ــ وہ صبح کی ڈاک سے آیا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

ڈیئر جی نمستے

سب سے پہلے میں اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کو دھوکا دیا۔ یعنی میری کوئی بہن وہن بیمار نہیں تھی۔ بہن خدا نے دی ہی نہیں۔ تو بیمار کہاں سے پڑتی ــ پھر آپ سے میں گلاب کے پھول کس کے لئے لے جاتا تھا ــ

سنئے میری ایک محبوبہ ہے، شیلا اس کا نام ہے وہ آپ کے مکان کے پیچھے اور میرے مکان کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے، اُسے گلاب کے پھول بہت پسند ہیں، خاص کر آپ کے یہاں کے بڑے بڑے سرخ گلاب ــ اُسے روزانہ ایک پھول دینے کی خاطر ہی میں نے یہ چال چلی۔ شیلا سے آپ کی لڑائی ہے، اس لئے وہ خود آپ سے پھول لینے نہیں آ سکتی تھی۔ میرے خیال میں اب آپ سب کچھ سمجھ گئی ہوں گی اور ہاں شاید آپ کو یہ سن کر خوشی ہو کہ آشا ماہ ہم دونوں کی شادی ہو رہی ہے .....

بس وہ اتنا ہی پڑھ پائی کہ حفظ اس کی انگلیوں سے نکل کر زمین پر گر پڑا اور وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر گر پڑی ــ اُسے آج معلوم ہوا تھا کہ وہ اُس نوجوان سے محبت کرتی تھی ــــ!

بقیہ افسانہ سہارا ــ (صفحہ ۲۴ سے آگے)

بڑھ کر مقابلہ کروں گی ــــ"

"تو پھر میں بھگوان کو شاہد کر کے اسے حاضر ناظر جانتے ہوئے عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر تمہارا صرف تمہارا رہوں گا۔ اور اگر موت بھی آ گئی تب بھی میری روح تم سے وابستہ رہے گی جو ہمیشہ تمہاری محبت پر جیتی رہے گی ــــ"

ایک حوصلہ کہ ہماری محبت اس [illegible] اور پھر مجھ سے وہ تمام رنگین خواب چھین جنھیں ماضی کی کیف پرور وادیوں میں [illegible] میں زندگی سے بیزار ہو گیا۔ دور دور تک ایک چٹیل میدان کی طرح اجاڑ اور بے [illegible] اور محبت کا وہ رنگین تاج محل تنکا تنکا بنیاد خود میں نے اپنے دل جذبے [illegible] مجھے کیا معلوم تھا کہ آشا میری محبت میری آرزوؤں اور تمناؤں کو کچل کر [illegible] ہو جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آشا [illegible] کر ــ حسین فریب دے کر میرا سب کچھ [illegible] مجھے تباہ و برباد کر دے گی اس نے [illegible] حیثیت کچھ نہ تھی میں غریب تھا، غریب [illegible] بیٹ تھا، مجھے اس کا غم نہیں کہ آشا [illegible] ہو گئی یا وہ ایک دولت مند کی شریک [illegible] جیون کے پاس رہائش کے لئے، عالی شان [illegible] زیبائش کے لئے بیش قیمت زیورات [illegible] ملبوسات ہیں اور سیر و تفریح کے لئے [illegible] محض اس بات کا ہے کہ جب میں غریب [illegible] حیثیت کچھ نہ تھی، تو وہ میرے راستے [illegible] مجھے محبت کے رنگین خواب کیوں دکھائے [illegible] جینے اور ساتھ مرنے کے عہد و پیمان [illegible] میری آواز میں آواز ملا کر محبت کے نغمے [illegible] میری باہوں میں باہیں حمائل کر کے گھوم [illegible] چلی کیوں؟ افسوس! جب میری آشا [illegible] تھا۔ میرے ہمراہ آشا نہ تھی، میری [illegible] بے کسی اور بیسری پر ہنسی تھی، مجھ [illegible] میرے ارمانوں پر ہنسی تھی ــ میں راہ چلتے

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ

شمس نذیر الدین ساز۔ ہبلی

مُوا

رامو کی بیوی کا پیر کیلے کے چھلکے پر پڑتے ہی پھسل گیا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ لیکن کمر پر رکھے ہوئے گٹھڑے کو سنبھال سکی جو دھڑام سے گر کر بکھر گیا تھا۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی ساری کا پلو کر کر جھٹکا۔ اور تیکھی نظروں سے نتھو رام کی طرف دیکھا جو کیلے کے پیڑ تلے چبوترے پر بیٹھا کیلا کھاتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔ نتھو رام نے اپنے قہقہے میں بریک لگاتے ہوئے کہا:۔

"رمیش کی ماں ذرا نیچے دیکھ کر چلا کرو۔" رامو کی بیوی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ چپکے سے اپنا گٹھڑا اٹھانے لگی۔

"کیا ہوا کانتا دیدی" مادھو کی ساس نے پوچھا۔ بنگلور سے گرہی کی چھٹیاں گزارنے اپنی بہن کے ہاں آئی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں بینا" رامو کی بیوی نے بینا کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"کیلے کے چھلکے پر پیر پڑ گیا تھا۔ وہ موا نتھو رام۔۔۔"

"کون نتھو رام۔۔؟" بینا نے کمر پر رکھے ہوئے گٹھڑے کو ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی ریٹائرڈ فوجی جو پیڑ تلے میٹھا گلی کی عورتوں کو چھیڑتا رہتا ہے۔ کم بخت نے کیلا کھا کر چھلکا راستے میں پھینک دیا اور اوپر سے کہتا ہے نیچے دیکھ کر چلا کرو!" بھگوان کرے اس کے ہاتھ میں کیڑے پڑ جائیں۔ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں! موئے کی کوئی ماں بہن ہے نہیں، جو دنیا بھر کی بہو بیٹیوں کو چھیڑتا رہتا ہے۔۔۔۔ پندرہ دن پہلے کا گٹھڑا بھاری ہو گیا ہے۔"

"ہاں کانتا دیدی وہ لڑھکا تو ڑھلان کے نیچے ہی لڑھکتا ہے۔ کل میں کنوئیں سے پانی لا رہی تھی تو مخنیوں ہاتھ بھر کر کہنے لگا کہ شیلا کی بہن پانی بھر بھر کر پانی جوانی خراب کر رہی ہے۔ اپنی بہن سے کہو کہ ذرا مجھے بھی اپنی جیب سے دے گا۔ تیرے پیر نکالے دیتا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہے۔ جیسے جوانی اسی کی ہو۔۔۔۔۔ اور جو اس کے ساتھ حصہ پتا جو اسپتال رہتا ہے۔۔۔۔۔"

"ماں کا دادا۔۔!" کانتا نے کہا۔

"ہاں دیدی، وہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو نتھو رام ہماری گلی کی عورتوں میں بڑی خوبصورت۔۔!" بینا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا

"رمیش کے پتا سے تو کچھ پوچھا نہیں۔؟ نے دے سسر جی کو، موچھیں یہ کھینچ لیں تو پھر نام بھی کانت نہیں۔۔!" کانتا اپنے مکان میں داخل ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ بینا نے ہنس کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ گٹھڑا گھر پر رکھ کر آتی ہوں کانتا دیدی۔"

"ہاں، ہاں! ذرا اپنے ہاں سے ہری مرچ ہو تو ساتھ لیتی آنا۔" کانتا نے دہلیز میں رک کر کہا۔

نتھو رام ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ صبح ہوتے ہی پیڑ تلے چبوترے پر آ جاتا اور اپنی فوجی زندگی کے قصے لہک لہک کر سنایا کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں نوے فیصدی قصے جھوٹے ہوتے تھے۔ وہ عورتوں کو چھیڑتا رہتا تھا۔ اس میں بھی اس کا مقصد یہی کچھ تھا۔ بچپن میں ہی ماں باپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نہ کوئی بھائی تھا اور نہ بہن اور نہ بیوی تھی۔ بس اکیلا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ریٹائرڈ فوجی!۔۔۔۔

گلی کے نکڑ پر اس کا ایک بڑا سا مکان تھا۔ یہ گلی بھر گھروں پر مشتمل ہے۔ پیچھے مکان میں تو میں رہتا ہوں۔ دوسرے مکان میں ڈاک بابو سوہن کمار اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ تیسرے میں ماسٹر اللہ اس کی بیوی۔ جو تھے میں مالا کا مادر۔ پانچویں میں فیلڈ اللہ اس کا پتی رہتے ہیں اور چھٹے مکان میں رہتا ہے یہ ریٹائرڈ فوجی نتھو رام ـــــ گلی کے نکڑ پر نتھو رام کے مکان کے سامنے ایک بڑا سا املی کا پیڑ ہے جس کے نیچے ایک چبوترہ بنا ہے۔ اس پر ہمیشہ جمع ہوتے ہی نتھو رام اللہ مالا کا دادا اپنے اپنے قصے سنا کرتے ہیں اور گپ شپ ہانکتے رہتے ہیں۔ پیڑ کی بائیں جانب ایک کنواں ہے جس سے گلی کے سارے لوگ پانی لیتے ہیں جب عورتیں پانی لے کر چبوترے کے سامنے سے گزرتی ہیں تو نتھو رام گپ شپ بند کر کے انہیں چھیڑنے لگتا ہے اور مالا کا دادا اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا ہے۔ گلی کے لوگ نتھو رام کو نرم پاگل سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔

"یہ لو کانتا دیدی۔" بینا نے رسوئی میں داخل ہوتے ہوئے کانتا کو ہری مرچیں دیں۔

"تھینک یو بینا۔" کانتا نے تھنکا کانتا بینا کی طرف بڑھا کر کہا۔ بینا تھنکا کھینچ کر چھیلتی ہوئی بولی:۔

"تمہارے سسر جی کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں کانتا دیدی۔۔؟"

"سسر جی مدراس میں چھوٹے کاروبار کرتے ہیں بس ایک دو دن میں آنے والے ہیں پھر دیکھ کیسا مزا چکھاتی ہوں اس بڈھے کو۔" کانتا نے پیاز کاٹتے

بولے کہا۔ مینا جو کا ہتا کریار کاٹتے ہوئے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں آتے ہوئے پانی کو پلو سے پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہاں کانتا دیدی، تم ضرور ان کی خبر لو۔ میری دیدی بھی کہہ رہی تھی کہ میرے آنے سے پہلے جب وہ پانی لانے جاتی تھی تو وہ ٹھرا اسی طرح دیدی کو ستاتا تھا۔"

"اس نے کسی کو نہیں چھوڑا مینا بچے بھی نہیں۔ سب کو چھیڑتا رہتا ہے۔ ایک دن تو میں نے اس کی اچھی خبر لی تھی۔" کانتا نے چاقو رکھ کر کاٹی ہوئی پیاز پانی سے دھوتے ہوئے کہا۔

"کیوں، کیا ہوا تھا۔؟" مینا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہوتا کیا۔ پانی لانے گئی تھی کہ میرا گھڑا رسی ٹوٹنے سے کنوئیں میں گر گیا، تو وہ موا نتھو رام ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ رام کی بیوی، اگر تم اپنے ہاتھوں سے مجھے اٹھا کر کنوئیں میں ڈال دو تو تمہارا گھڑا نکال لاؤں۔" مجھے اتنا غصہ آیا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ ایک تو گھڑا گر جانے کا ملال تھا۔ دوسرے یہ موا چھیڑ رہا تھا۔ میں نے اپنا چپل ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی اچھی طرح سے خبر لیتی، تمہاری دیدی نے پکڑ لیا۔ کہنے لگی کہ جانے دو، بوڑھا ہے۔ مگر میں اب چپ نہیں رہوں گی، آنے دو مسسر جی کو۔ میرے مسسر جی کے سامنے تو موا سیدھی طرح بن جاتا ہے۔ پہلے جب وہ یہاں تھے تو اس چوتیے پر نہ نتھو رام پھٹکتا تھا اور نہ ہی مالا کا دادا گیری کے سارے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ آنے دو انھیں۔"

دوسرے دن دوپہر کو کانتا کھانا کھانے کے بعد مینا کے ہاں باتیں کرنے گئی۔ تو مینا نے اس سے کہا۔

"کانتا دیدی، آج تو اسی غضب ہو گیا۔ صبح جب میں پانی لینے گئی تو وہاں نتھو رام کے ساتھ ایک بابو بیٹھا ہوا تھا۔ کالا سا موٹا۔ لمبی لمبی مونچھیں تھیں اس کی۔ وہ تو نتھو رام کا بھی باپ نکلا۔ کہنے لگا کہ ارے جیتی نتھو رام! بہادری گئی کیا ہے۔ اندر سجا ہے میاں ایسی حسین لڑکیاں آتی ہیں۔" اشارہ میری طرف تھا کانتا دیدی۔ تمہارے مسسر جی آئے کہ نہیں، کہو تو میں ابھی تمہارے ساتھ چل کر ان سے کہتی ہوں۔"

"نہیں نہیں!" کانتا نے جلدی سے کہا۔ "میں خود کہہ لیتی ہوں۔ اور پھر مسسر جی ابھی آئے ہی نہیں اچھا اب میں چلتی ہوں۔" کانتا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو نا کانتا دیدی، ابھی ابھی تو آئی ہو۔" مینا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اصرار کے ساتھ کہا۔

"نہیں مینا، میں چلتی ہوں پھر آؤں گی۔" کانتا اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور دماغ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کیوں کہ اس کے مسسر جی رات کو ہی آنے تھے! اور مینا نے جو حلیہ بتا کر شکایت کی تھی وہ پورا اس کے مسسر جی کا تھا ــــ!!

بقیہ شایت لکھنوی صفحہ ۳۷ سے آگے

ضعف پیری میں نہیں دینے کا اماں آپ سے آپ
جائے گا سونے نشیب آپ رواں آپ سے آپ

ماتم عاشق صادق کا مذا دیکھ اثر
ابر گریاں ہے تو ہے برق تپاں آپ سے آپ

قطع تم کرتے ہو جو خیابان جہاں کے دعوے
منہ میں چلتی ہے جو قینچی سی زباں آپ سے آپ

میز کی گرد نہیں دل کا ہے ثابت یہ غبار
اب نہ تا حشر کبھی ان سے صفائی ہو گی

گھر جب بنا لیا تیری دولت سرا کے پاس
اب بھی کہا بھر نہ لوٹا دے رہے گا گدا کے پاس

میں کہتا ہوں کہ مجھ پر آسماں نے ظلم توڑا ہے

وہ فرماتے ہیں تیری آہ صدا کا
یہ دل میں سوچ کر کہ کیا کہتے ہیں
گئی ہے جس سے تھوکر تیرا شکوہ
جو بھولے سے وہ وعدہ وفا
وہ پوچھا رہے ہیں یہ کیا
تم اپنی ناف سکھا دو خوشی سے
تمہاری جانے بلا کون بیچ
مرے دل میں رہے تم کل
بہت زحمت ہوئی تو نے کر
پیری میں غفلتوں نے کیا اندھ
پھر جینا کہ گئی ہیں جاگے جو
یہ بات طے شدہ ہے حسینوں
معشوق کم سنی میں ہیں حاشق
کم ظرف سے نہ مانگ کر ثابت نہ
قطرہ بھی نام کو نہیں جام
کچھ ایسے اشعار بھی ان منتخب
ہیں جو مشاعروں میں مقبول ہوئے
محفوظ ہیں بہر صورت ان کی حفاظت
ان میں انھیں شامل کر دیا گیا، خدا کرے
یہ محفوظ ہو جائیں ــ

نوشتہ باند سیہ بر سفید
نویسندہ نایست فردا

ٹوکن شعلہ و شبنم طرحی مشا

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ
مصرعہ طرح۔ میں بے ادب ہوں ہنسی
آ۔ کہا قوافی۔ گھٹ کیا ہو گا

نام ... ...
پتا ... ...

شعلہ کا کام اپنا کام صفحہ قرطاس پر
صفحہ جاناں (دلبراں) کی خدمت ہے

خورشید عزمی گھنڈوہ

بدگمانی

"فی، فی" سناٹے کی خاموش فضا میں بلبل کی سی آواز گونجی اور پھر کچھ دیر بعد چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سنائی دی

"رضو" اس نے پکارا

"جی" رضیہ نے آہستہ سے کہا

"کیا بات ہے تم کچھ اداس نظر آرہی ہو!"

"ہوں" رضیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

"وجہ" وہ تڑپ اٹھا

جواب میں رضیہ نے اسے بے بسی نظروں سے دیکھا جیسے بکری ذبح کے وقت قصاب کو دیکھتی ہے۔

وہ گھبرا گیا "رضیہ خدا کے لئے زبان کھولو، میں سمجھا نہیں۔!"

"وجہ" (آواز میں لرزش تھی) "تم، صرف تم" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں" اور وہ سکتے میں آگیا "کیا میں تمہاری اداسی کا سبب بن سکتا ہوں؟"

اور حسن غضب میں اور زیادہ نکھر گیا۔

"ہاں اسلم مجھے تم سے خواب میں بھی توقع نہ تھی تم ایسا کرو گے"

"تم آخر صاف صاف کیوں نہیں بتاتی ہو ایک بات ہے۔؟"

"یہی کہ میں تمہارے راستہ میں خار بن کر کھٹکوں"۔ رضیہ کا لہجہ تلخ تھا۔

"کیا میرا راستہ اور تمہارا راستہ مختلف ہے؟"

"ہاں ایسا ہی سمجھو۔!"

"رضیہ میں پاگل ہو جاؤں گا اگر تم صاف صاف نہ کہو گی تو۔!"

آخ تم نے رضیہ کو دھوکا دیا ہے اور کل وہ دنیا سمجھے گی کہ اسلم پاگل ہو گیا ہے، جو سچ ہے، جو کسی ایک کا نہیں ہو کر رہ سکتا ہے" لہجے میں تلخی تھی اور ایک ہی سانس میں رضیہ کہہ گئی تھی کہنے کے بعد خاموش ہو جانے کے بعد پانچ منٹ تک اسے امید تھی کہ اسلم اس کی قلعی کھل جانے پر حواس باختہ ہو جائے گا اور اس سے نظریں نہ ملا سکے گا۔ مگر ردعمل اس کے برخلاف ہوا اور رضیہ کے کانوں میں اسلم کا بے اختیاری قہقہہ گونج اٹھا۔

"اخاہ بابا بابا، میں نہیں جان سکتا تھا کہ رضو تم اتنی جلد ہی بدگمان بھی ہو سکتی ہو۔" اسلم نے ہنسی کو بمشکل ضبط کر کے کہا۔

"اور میں بھی جانتی تھی کہ تم اس بات کو ایسے ہی ہرگز تسلیم نہ کرو گے"

اسلم نے بدستور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کیوں خواہ مخواہ غلط فہمی میں پڑی ہو"

"غلط فہمی۔! ہاں مجھ سے یہ غلطی ہی تو ہوئی کہ تمہاری محبت میں مبتلا ہوئی"

"اچھا ان فضول باتوں کو ختم کرو مجھے آج جلد ہی جانا ہے" اسلم نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں نہیں، اس کے فکر سے آخر تمہیں شوق جو جبراً کھٹی ہو گی" رضیہ نے برجستہ جواب دیا۔

"توبہ بھی، آخر پوری بات سنے بغیر یہ الزام کیوں۔؟"

"مجھے کچھ بھی سننے سے کیا حاصل" اور رضیہ نے منہ پھیر لیا۔

"اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔؟" اسلم کا لہجہ تذبذب کا تھا۔

"یقین دلانے کی چنداں ضرورت نہیں" رضیہ کا لہجہ بے اعتنائی کا تھا۔

اور اسلم نے بڑھ کر رضیہ کو بانہوں میں جکڑ لیا ——— "یہ جو میں نا" اس نے رضیہ کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اور جواب میں رضیہ نے جھٹکا دے کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

اور ایک بار پھر اسلم بے اختیار ہنس پڑا۔

اس کے برعکس رضیہ کا پارہ اور چڑھ گیا

"آپ کو جلد ہی جانا تھا" اچانک رضیہ نے اسے یاد دلایا۔

"فی الحال تم اپنی بدگمانی ہی کو جانے دو" اسلم نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"اسلم۔!" رضیہ تقریباً دھاڑ دینے والی انداز میں چیخی۔

"فرمایئے۔!"

"مجھے جانے دو"

"مگر اس طرح بدگمان ہو کر"

"مجھے بدگمانی نہیں"

"تو یہ خفگی کیا معنی؟"

"میری خفگی سے آپ کو کیا ہو سکتا ہے"

اسلم جذباتی لہجے میں بولا "کیا ہو سکتا ہے؟ یہ کہو کہ کیا نہیں ہو سکتا میں اپنے اندر کی چبھن کو

شعلہ و شبنم دہلی　　ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۷۴۵　　رجسٹرڈ ڈی نمبر ۲۵۴

شمالی ہند کا مقبول ترین کثیر الاشاعت علمی و ادبی ماہنامہ

ہفت رنگ

دل چسپ ناول:

اندھیرے	دو روپے
شمیم	چھ روپے آٹھ آنے
زہرہ	سات روپے آٹھ آنے
جلن	دو روپے
شمع	پانچ روپے
تصویر	چار روپے
انتقام	چھ روپے آٹھ آنے
گناہ	دو روپے چار آنے
سنہرہ کی راجکماری	سات روپے
انجمن کی آپ بیتی	ایک روپیہ آٹھ آنے
چرٹ	تین روپے
انشاءاللہ	دو روپے بارہ آنے
اغوا	تین روپے
نقشہ	ایک روپیہ
آگ	ایک روپیہ بارہ آنے
آنسو	دو روپے بارہ آنے
پھانسی کی کوٹھری سے	تین روپے چار آنے
چوروں کا قاتل	ایک روپیہ آٹھ آنے
ماہ طلعت	تین روپے
اصل بوٹ	ایک روپیہ آٹھ آنے
چراسرار سایہ	دو روپے
آہ رد	ایک روپیہ آٹھ آنے
سردہ فرنسس	ایک روپیہ بارہ آنے
مسکراہٹیں	دو روپے آٹھ آنے
بے غیرت	دو روپے آٹھ آنے
سائی	ایک روپیہ چار آنے
ڈاک گھر	دس آنے
سسرال	دو روپے
لاجونتی	ایک روپیہ
بیگانے	دو روپے آٹھ آنے
اندلس کے دو چاند	چھ روپے
مونڈی کاٹے	ایک روپیہ آٹھ آنے
شیر دل خاتون مکمل	چھ روپے آٹھ آنے
تازیانہ	ایک روپیہ آٹھ آنے
خود دار	دو روپے
پروین	دو روپے چار آنے
گھڑی کا راز	ایک روپیہ آٹھ آنے
بے کس	ایک روپیہ آٹھ آنے
دوشیزہ کابل	چھ روپے
کشمیر کی بیٹی	دو روپے آٹھ آنے

افسانے ہی افسانے:

فریب سلسل	دو روپے
حجاب	دو روپے
وحشتے	دو روپے آٹھ آنے
نہ بھولنے والی بات	دو روپے
ننگی جوانی	دو روپے
جنت و جہنم	دو روپے
کڑوے گھونٹ	دو روپے
افسانہ لکھ رہی ہوں	دو روپے
جب جوانی آتی ہے	دو روپے آٹھ آنے
فلمی پرستان	دو روپے
جھنکاریں	دو روپے
انوکھا سنسار	دو روپے
آخری تحفہ	دو روپے بارہ آنے
سنی سنائی	دو روپے آٹھ آنے
دنیا کی دیوی	بارہ آنے
شرمناک فسانے	ایک روپیہ آٹھ آنے
شوخ نظارے	ایک روپیہ چار آنے
شوخی و تبسم	ایک روپیہ چار آنے
جیل	بارہ آنے
فلمی پریوں کی داستان	ایک روپیہ آٹھ آنے
گیتا بالی (نظم)	ایک روپیہ چار آنے
قاتل	بارہ آنے
دلدل	ایک روپیہ آٹھ آنے

کارآمد کتابیں:

زینت کشیدہ کاری	چار روپے
رشیدہ کی کشیدہ کاری	تین روپے آٹھ آنے
شاہی باورچی خانہ	تین روپے
آفتاب عالم (تواریخ)	نو روپے
سیرت فخر العارفین (دو حصے)	پانچ روپے
آسان شارٹ ہینڈ	دو روپے آٹھ آنے

تیرتھ رام فیروزپوری کے ناول

سراب زندگی	تین روپے آٹھ آنے
انجام ہوس	چار روپے
سرفروش	چار روپے
شاہی خزانہ	تین روپے آٹھ آنے
تہ خانے کا راز	تین روپے آٹھ آنے
گرلی کا بیل	چار روپے
خونی شیطان	چار روپے آٹھ آنے
ویران محل	تین روپے آٹھ آنے
بھرفنا	چار روپے
دیوتا کی آنکھ	چار روپے آٹھ آنے
دغا کا پتلا	تین روپے
اصل شب چراغ	تین روپے
منزل مقصود	تین روپے
شامت اعمال	چار روپے
سزائے والی	تین روپے آٹھ آنے
آزادی	تین روپے
خنجر بدلو	چار روپے
خوف ناک جزیرہ	تین روپے آٹھ آنے
مطلبی دنیا	چار روپے
قاتل کی بیٹی	چار روپے
وادی خوف	چار روپے
فرشتہ انتقام	تین روپے آٹھ آنے
مقدس جوتا	تین روپے
کعب نے کی واپسی	چار روپے آٹھ آنے
دست قضا	تین روپے آٹھ آنے
تلاش اکسیر	تین روپے آٹھ آنے
سانپ کی چوری	تین روپے آٹھ آنے
انصاف	دو روپے آٹھ آنے
محرم	تین روپے
میری تقدیر	چار روپے آٹھ آنے
تلافی گناہ	تین روپے آٹھ آنے

(محصول ڈاک علاوہ ہوگا)

نوٹ

رائد کتابیں مندرجہ ذیل سے پارسل منگائیے

محصول ڈاک میں کافی کمی ہو جاتی ہے

Please Book your orders

SHOLA-O-SHABNAM

Dariba Kalan, Delhi-6.

جھوٹے صنم

صمد حمیدی

صبح سے شام شام سے رات ہو گئی۔

میں بہت اداس ہو گیا۔ "خدایا کیا میری مطلوبہ شے مجھے حاصل نہیں ہو سکے گی ۔۔!"

آج تک میں نے ہزاروں لڑکیاں دیکھ ڈالی تھیں۔ سبھوں کے چہرے پر گہری سرخی پُتی ہوئی تھی۔ لب و رخسار کی شوخ تتلیوں پر کے بدنما داغ سے مشابہ تھیں۔ جسم ڈھیلا ڈھالا تھا۔ ان میں کچھ کے جسموں سے خوشبو کی پٹیں بھی اٹھتی تھیں یہ مہنگا ڈالڈا کشید کی ہوئی تھی۔ لیکن ان کے جسم عصمتوں کی گہری چاہوں سے داغ دار تھے۔ ہوسناکیوں کے جھکڑ پر رقص کرنے کے لئے بے تاب، پتے اور بازو چند ٹکوں کے عوض دنیا جہانی لہو لگانے کے لئے تیار ۔۔۔ میں دیکھتا اور سوچتا ۔۔۔ سوچتا اور دیکھتا رہتا۔

"خدایا کیا میری ایک ادنیٰ خواہش بھی نہیں پوری ہو سکے گی ۔۔۔؟"

میں نے ان پری زادوں کو ۔۔۔ رقص بداماں کٹھ پتلیوں کو۔ بدصورت جسموں، خوبصورت پیکروں، بوڑھی جوان اور نوخیز کلیوں کو ہر طرح سے دیکھا۔ عقابی اور نقابی نظروں سے دیکھا۔ شاعروں، ادیبوں اور مصوروں کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن ہر بار مجھے مایوسی ہوئی۔ ہر بار بری خواہش کو زبردست ٹھیس پہنچی ہے۔

"خدایا کیا میں بے نیل و مرام پھروں گا کیا میری خواہش کبھی تکمیل کے مراحل نہ طے کر سکے گی ۔۔۔؟"

لیکن آرزو، آرزو ہی رہی، تکمیل کے مراحل نہ طے کر سکی۔ میں شہر سے دیہات، دیہات سے شہر پھرتا رہا اپنی مطلوبہ شے کو ہر جگہ ڈھونڈتا رہا۔ میلے ٹھیلے، تیج تہوار، رسم جگہ جگہ۔ لیکن ہر جگہ مجھے خوبصورتی کے بازار میں بدصورتی لپٹی ملی۔ دلکش اور گھناؤنے چہروں پر شیطانیت کی جھلکیاں صاف پڑھی جاتیں۔ کاجل کی شوخی یا فحاشی جم لیتی رہتی اور عورتیں و لڑکیاں ماہرہ نظر آتیں۔ عصمت دریدہ پتلیاں نظر آتیں جن کو کسی ہوس نواز بوم کے گن گانے کی خاطر میں لڑھکنیاں کھانے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے ایسا لگ داغ دار جسموں گناہ میں ڈوبے رخساروں اور میلی کچیلی سے بھرے نینوں سے بھی واسطہ پڑا تھا، مجھے ابھی تک صاف و شفاف شیریں اور پاکیزہ لبوں کی نرم گرم خوشی نہیں حاصل ہوئی تھی تو کیا کروں اور کہاں جاؤں خدایا کہ مجھے ایسے جسموں سے واسطہ نہ پڑے۔ فریب دینے اور فریب کھانے والی تھرکنیوں اور پلکوں سے واسطہ نہ پڑے۔ گناہ کی طرف اٹھتے ہوئے قدم اور ملوث شدہ جسم پھر دکھائی نہ دیں۔ صرف پاکیزگی اور طہارت ہی طہارت ہو۔ طاعت و زہد میں ڈوبی ہوئی سانسیں ہوں۔ معطر فضا ہو۔ لبان اور عود میں بسی بستیاں ہوں ان میں فرشتہ خصلت، نیک و پارسا رہ جبینیں ہوں جن کی نیکی و پاکیزگی دُرِ نجف کی طرح ظاہر اور دُرِ شہوار کی طرح مشہور زمانہ ہوں جو اگر دامن نچوڑ دیں تو فرشتہ وضو کریں۔ خدایا کیا میں ایسی رہ جبینوں، زہد شبستان حرم میں داخل ہو سکوں گا۔ ان سے پاکیزگی اور عفت کے سبق پڑھ سکوں گا۔

رفاصائیں مجھے گھور کے دیکھتیں۔ میرے سراپا کا جائزہ لیتیں، پھر آگے بڑھ جاتیں، جیسے کوئی بات نہ ہو۔ افشاں چھڑکے ہوئے اور لہراتے دوپٹے کو سنوارے، حسینائیں ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر گزر جاتیں۔ اجنتا، ایلورا اور ایجنٹنز کی عورتیں کو شرما دینے والی مسکراہٹ مجھ پر پڑتی اور قہقہے فضا میں بکھر جاتے اور میں یکہ و تنہا رہ جاتا۔ مجھے بری عجیب شے نہ حاصل ہوتی۔ میں نے چاہا کہ شرمانے والی رقاصاؤں، افشاں بکھیرنے والی حسیناؤں اور اجنتا ایلورا اور ایجنٹنز کی مکوتی شبیہوں کو بہت غور کر کے دیکھا۔ مگر مجھے ہر بار بڑی مایوسی ہوئی دیکھا کہ ان میں کسی میں میری مطلوبہ شے کی ایک ذرا سی بھی رمق نہ تھی۔ نہ روح کا تقدس، نہ حیا کی شوخی۔ نہ موتیوں جیسے دانتوں تھے۔ نہ سیب کی مانند فرانی آنکھیں تھیں۔ نہ پیار کو مات کرنے والی چوکڑیاں تھیں۔ یہ سب سب طبع شدہ اور عورتیں تھیں۔ صحیح معنوں میں قدرت کا حسین شاہکار ایک بھی نہیں تھیں۔

میں ہر چہار طرف بناوٹی چہرے، مکر و فریب سے پُر آنکھیں دیکھتا رہتا۔ جن پاکیزہ اور حسین چہروں اور رخساروں کو میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے۔ بلکہ چہار طرف مجھے مکر و فریب کی دنیا ملتی۔ اس میں بس شکلیں ملتیں، ٹھرکیاں، لب اور آنکھیں ملتیں۔ گنہگار جسم و دل ملتے جو ہر وقت روپہلی سکوں کی نقرئی جھنکار پر رقص کناں ہوتے۔ تو خدایا کیا میری مطلوبہ شے مجھے مل سکے گی؟ کیا میں تیری دنیا سے نامراد لوٹ جاؤں۔ کیا میری ایک ادنیٰ خواہش کبھی بھی نہیں پوری ہو سکے گی۔ تو کیا خدا ہے؟ بتا مجھے اے رب دو جہاں بتا ۔۔۔۔؟"

قدوسی مقدس حسن! تو کہاں ہے بتا کہ مجھے کہاں ڈھونڈوں؟ میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا ہوں

(بقیہ صفحہ ۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

طرحی مشاعرہ نمبر ۶۲

مصرع طرح

ہوش جاتا ہے کہیں جوش خدا جوش مجھے

غزل کے ساتھ ذکر اس مشاعرہ یا اس کے متعلق چار آنے کے ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں۔

مرتبہ
مولانا آسی حسنی گنوری

شہرت میرٹھی

دو تڑپنے دو ذرا حشر میں جوش مجھے
سر چھپانے دو مقتل میں بڑی دیر ہوئی
میں گلستاں کو نہ سمجھا کیا جانوں
کون بالیں پہ عیادت کے لئے آیا ہے
پورے ہر سانس کی رفتار یہی کہتی ہے
رہبر میں بیٹھے ہی رہتے ہیں برابر آفسر
سامنے آتا ہے وہ رنگ قریب شہرت

ہرمیش سوز پنیالوی

مجھے مست کئے دیتی ہے مدہوشی مجھے
چند روز اور بھی لیکن تھا کہ میں جی لیتا
مانند صبح کی مانند مجھے جانا ہے
جیتے جی اس کو جدا دل سے نہیں کر سکتا
اس نے انجانی تھی مرے سامنے چہرے سے نقاب
جذبہ بے گرد شِ ایام محبت میں تری
یوں تو سمجھوں غم ہستی کا صلا پایا ہے
محمد عبدالقیوم صدیقی مست۔ فتح پوری

ہے یہ عالم کہ وہ عالم کا نہیں ہوش مجھے
آپ کو دل سے بھلا دوں یہ نہیں ہوش مجھے
حرفِ مطلب پہ مرے کچھ تو کہو ہاں کہ نہیں
میں تو یہ ذکر بھی میرا نہیں آنے پاتا
پھر اسی نکتہ چیں خطاؤں کی معافی مانگوں
آپ نہ چھیڑیں تو ہمیں ٹھوکر سے ہٹا کر پردہ

نشتر ہمدی

موت جب آئی جوانی میں جفا کوش مجھے
وہ تری مست نگاہیں وہ نشیلے اغماز
وہ شبِ مستی و پیمانہ و ساغر لیکن
آج تک راز نہ یہ میری سمجھ میں آیا
موڑ سکتا ہوں کلائی میں قسم کی لیکن
یہ گماں ہوتا ہے ویران ہے سارا عالم
چاک کر دوں گا میں حالات کے پر شہ نشتر

علامہ بیباک

بیقرار ہے وہ رقیبو یونہی خاموش مجھے
کس کو معلوم تقاضا و وفا محبت سن کر
ان کی فرقت میں بچاؤں کا یہ نہی دادیہ
پہلے اس بار تو بخشا تھیں میں نے لیکن
پھر تو مر جاؤں خوشی سے میں تمہارے در پر
وہ تو کہئے ابھی دو چار کنستر پی لوں
دیکھ کر مجھ کو جو بن جاتے ہیں بھیگی بلی

منظہر رقاصی

فیض پہنچے ہے ترا عشق جنوں کوش مجھے
آئی یاد تری مست گھٹا ہوں کا سماں
مجھ کو پروا نہیں دامان وفا ہاتھ میں ہے
دیجیاں زیست کے دامن کی اڑا تا ہے جنوں
جس میں تھا سکوں دونوں جہاں سے بڑھ کر
ربط ہے ساقیٔ گلفام کی آنکھوں سے فقط

مست امروہوی

کر دیا حق نے نگاہوں سے سبک دوش مجھے
جلد کر دے مرے قاتل تو سبک دوش مجھے
قیدِ صیاد میں آیا ہے ابھی ہوش مجھے
عالمِ نزع میں اتنا بھی نہیں ہوش مجھے
آج کر دے گی اجل غم سے سبکدوش مجھے
غرق کر دیں گے کبھی دیدۂ پر جوش مجھے
ہوش اڑ جاتے ہیں رہتا ہے کہاں ہوش مجھے

مست کوٹی

اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے مدہوش مجھے
آپ کرتے نہ اگر دل سے فراموش مجھے
صبح کے ہوتے ہی ہو جانا ہے خاموش مجھے
غم نہ سمجھے ترا احسان فراموش مجھے
بعد اس کے کبھی آیا ہی نہیں ہوش مجھے
فکرِ امروز ہے کوئی نہ غمِ دوش مجھے
سوز مل جائے اگر قبر کا آغوش مجھے

یاد کر کے کبھی اے وعدہ فراموش مجھے
آپ چاہیں تو کریں دل سے فراموش مجھے
کس لئے ہو گئے تم دیکھ کے خاموش مجھے
کر دیا آپ نے اس درجہ فراموش مجھے
کوئی آئے تو نظر تجھ سا خطا پوش مجھے
اس کا کیا غم کہ رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

کون سا جانے چھپا مست یہ کس کا غم ہے
ساری دنیا نظر آتی ہے سیہ پوش مجھے

مست کوٹی

موت جب آئی جوانی میں جفا کوش مجھے
وہ تری مست نگاہیں وہ نشیلے اغماز
وہ شبِ مستی و پیمانہ و ساغر لیکن
آج تک راز نہ یہ میری سمجھ میں آیا
موڑ سکتا ہوں کلائی میں قسم کی لیکن
یہ گماں ہوتا ہے ویران ہے سارا عالم
چاک کر دوں گا میں حالات کے پر شہ نشتر

علامہ بیباک

بیقرار ہے وہ رقیبو یونہی خاموش مجھے
کس کو معلوم تقاضا و وفا محبت سن کر
ان کی فرقت میں بچاؤں کا یہ نہی دادیہ
پہلے اس بار تو بخشا تھیں میں نے لیکن
پھر تو مر جاؤں خوشی سے میں تمہارے در پر
وہ تو کہئے ابھی دو چار کنستر پی لوں
دیکھ کر مجھ کو جو بن جاتے ہیں بھیگی بلی

منظہر رقاصی

فیض پہنچے ہے ترا عشق جنوں کوش مجھے
آئی یاد تری مست گھٹا ہوں کا سماں
مجھ کو پروا نہیں دامان وفا ہاتھ میں ہے
دیجیاں زیست کے دامن کی اڑا تا ہے جنوں
جس میں تھا سکوں دونوں جہاں سے بڑھ کر
ربط ہے ساقیٔ گلفام کی آنکھوں سے فقط

مست امروہوی

کر دیا حق نے نگاہوں سے سبک دوش مجھے
جلد کر دے مرے قاتل تو سبک دوش مجھے
قیدِ صیاد میں آیا ہے ابھی ہوش مجھے
عالمِ نزع میں اتنا بھی نہیں ہوش مجھے
آج کر دے گی اجل غم سے سبکدوش مجھے
غرق کر دیں گے کبھی دیدۂ پر جوش مجھے
ہوش اڑ جاتے ہیں رہتا ہے کہاں ہوش مجھے

مست کوٹی

اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے مدہوش مجھے
آپ کرتے نہ اگر دل سے فراموش مجھے
صبح کے ہوتے ہی ہو جانا ہے خاموش مجھے
غم نہ سمجھے ترا احسان فراموش مجھے
بعد اس کے کبھی آیا ہی نہیں ہوش مجھے
فکرِ امروز ہے کوئی نہ غمِ دوش مجھے
سوز مل جائے اگر قبر کا آغوش مجھے

یاد کر کے کبھی اے وعدہ فراموش مجھے
آپ چاہیں تو کریں دل سے فراموش مجھے
کس لئے ہو گئے تم دیکھ کے خاموش مجھے
کر دیا آپ نے اس درجہ فراموش مجھے
کوئی آئے تو نظر تجھ سا خطا پوش مجھے
اس کا کیا غم کہ رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

کون سا جانے چھپا مست یہ کس کا غم ہے
ساری دنیا نظر آتی ہے سیہ پوش مجھے

مست امروہوی

موت جب آئی جوانی میں جفا کوش مجھے
وہ تری مست نگاہیں وہ نشیلے اغماز
وہ شبِ مستی و پیمانہ و ساغر لیکن
آج تک راز نہ یہ میری سمجھ میں آیا
موڑ سکتا ہوں کلائی میں قسم کی لیکن
یہ گماں ہوتا ہے ویران ہے سارا عالم
چاک کر دوں گا میں حالات کے پر شہ نشتر

علامہ بیباک

بیقرار ہے وہ رقیبو یونہی خاموش مجھے
کس کو معلوم تقاضا و وفا محبت سن کر
ان کی فرقت میں بچاؤں کا یہ نہی دادیہ
پہلے اس بار تو بخشا تھیں میں نے لیکن
پھر تو مر جاؤں خوشی سے میں تمہارے در پر
وہ تو کہئے ابھی دو چار کنستر پی لوں
دیکھ کر مجھ کو جو بن جاتے ہیں بھیگی بلی

منظہر رقاصی

فیض پہنچے ہے ترا عشق جنوں کوش مجھے
آئی یاد تری مست گھٹا ہوں کا سماں
مجھ کو پروا نہیں دامان وفا ہاتھ میں ہے
دیجیاں زیست کے دامن کی اڑا تا ہے جنوں
جس میں تھا سکوں دونوں جہاں سے بڑھ کر
ربط ہے ساقیٔ گلفام کی آنکھوں سے فقط

مست امروہوی

کر دیا حق نے نگاہوں سے سبک دوش مجھے
جلد کر دے مرے قاتل تو سبک دوش مجھے
قیدِ صیاد میں آیا ہے ابھی ہوش مجھے
عالمِ نزع میں اتنا بھی نہیں ہوش مجھے
آج کر دے گی اجل غم سے سبکدوش مجھے
غرق کر دیں گے کبھی دیدۂ پر جوش مجھے
ہوش اڑ جاتے ہیں رہتا ہے کہاں ہوش مجھے

مست کوٹی

اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے مدہوش مجھے
آپ کرتے نہ اگر دل سے فراموش مجھے
صبح کے ہوتے ہی ہو جانا ہے خاموش مجھے
غم نہ سمجھے ترا احسان فراموش مجھے
بعد اس کے کبھی آیا ہی نہیں ہوش مجھے
فکرِ امروز ہے کوئی نہ غمِ دوش مجھے
سوز مل جائے اگر قبر کا آغوش مجھے

یاد کر کے کبھی اے وعدہ فراموش مجھے
آپ چاہیں تو کریں دل سے فراموش مجھے
کس لئے ہو گئے تم دیکھ کے خاموش مجھے
کر دیا آپ نے اس درجہ فراموش مجھے
کوئی آئے تو نظر تجھ سا خطا پوش مجھے
اس کا کیا غم کہ رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

کون سا جانے چھپا مست یہ کس کا غم ہے
ساری دنیا نظر آتی ہے سیہ پوش مجھے

سیوک ناز کی آسی شکوہ آبادی

کوئی مدہوش کوئی کہتا ہے نوش مجھے
دستِ زیدہ سے ترے ساغرِ پرجوش مجھے

تم نہیں اس کا جو پھر جائے زمانے کی نظر
پھانس کو پھانس بنا دیتی ہے دنیا یارب

چشمِ میگوں کی یہ پرکیف تجلی تو نہ
دیکھ کر کس کو میں بے ہوش ہوا تھا نازک

اسماعیل ذبیح مالی گانوی

بن کی زلفوں کی جھلک کر گئی مدہوش مجھے
آئے اس وقت وہ افسوس حیات کو ہی

دیکھ کر جلوہ ترا ہوش بھی کھو بیٹھے
کون سنتا مرا احوالِ پریشاں آخر

میں ہوں قسمت کا ستایا ہوا اس دنیا میں
چار دیئے چھوڑ کے وہ آج اکیلا مجھ کو

نور عباسی ریوا ڈی

کچھ ہے امروز کا غم کچھ ہے غمِ دوش مجھے
امتحانِ ظرف کا مقصود اگر ہے ساقی

ہے بجا ترکِ تعلق کی شکایت لیکن
کیوں نہ رہ جاؤں تری چاہ میں تنہا کر کے

صرف اک آپ کی نظروں میں وفا کوش ہے
ورنہ سب کہتے ہیں عالم میں وفا کوش مجھے

کر دیا تھا کسی کافر نے فراموش مجھے
آگئی یاد کیا کلمہ ترے دامن کی ہوا

گو خطاوار سیہ کار ہوں لیکن پھر بھی
سامنے داورِ محشر کے زباں کھولوں گا

کچھ نہ دیتے مرے اظہارِ تمنا کا جواب
مسکراہٹ ہی شروع جشن کو بس کافی ہے

الطاف انصاری سلطان پوری

جن کی خاطر میں فنا بیٹھا متاعِ ہستی
آج کہتے ہیں وہ احساں فراموش مجھے

لیکن اے دستِ جنوں سر پہ نہ آ جائے کہیں
پھر نہ کر لینا گریباں تار فراموش مجھے

تجھ سا آیا نہ نظر اور خطا پوش مجھے
بزم کی بزم نظر آتی ہے مدہوش مجھے

ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے نوش مجھے
کر دیا جب کہ عزیزوں نے کفن پوش مجھے

آیا محفل میں نظر کوئی نہ دی ہوش مجھے
وہ بھی خاموش رہے دیکھ کے خاموش مجھے

کیا ستائے گا بھلا کوئی ستم کوش مجھے
کل بنائے ہوئے پھرتے تھے جو ہم دوش مجھے

اب زیادہ نہ ستا اے غمِ دوش مجھے
مست آنکھوں سے پلا بادۂ سرجوش مجھے

آپ ہی کہئے یہ کیا کس نے فراموش مجھے
عشق کے فرض سے ہونا ہے سبکدوش مجھے

ورنہ سب کہتے ہیں عالم میں وفا کوش مجھے
محفلِ غیر میں رہنے بھی دو خاموش مجھے

وجہ تسکیں ہے مری قبر کا آغوش مجھے
ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

حشر میں ڈھونڈتی ہے چشمِ خطا پوش مجھے
آپ نے کر تو دیا ہے ابھی خاموش مجھے

آپ دیکھا کئے بیٹھے ہوئے خاموش مجھے
اک جھلک دیکھی تھی باقی نہ رہا ہوش مجھے

میرے معبود یقیناً تری مرضی کے بغیر
کیا ستائیں گے زمانے سے ستم کوش مجھے

جیسے ہی سیرِ چمن کو وہ چمن میں آئے
سارا گلشن نظر آنے لگا مدہوش مجھے

دیکھ کر ان کو میں ایسا ہوا بے خود اطاف
کون ہوں کیا ہوں یہ کچھ بھی نہ رہا ہوش مجھے

نظام الدین ادیب غازی پوری

یاد ہے تیری نظرِ سیہ بر دوش مجھے
غیر ممکن ہے کہ آجائے کبھی ہوش مجھے

کھو گیا یوں بھی کبھی عالمِ تنہائی میں
کر دیا دل کی صدا نے ہمہ تن گوش مجھے

کوئی بھی شاخِ تمنا مری کچل نہ سکی
کر دیا جیسے بہاروں نے فراموش مجھے

دیکھ کر آپ کے بیماروں کی قیامت خیزی
ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

کھو گئے عالمِ اسرار بفیضِ مستی
اور دنیا تو سمجھتی رہی بے ہوش مجھے

لطف یار وفی مالی گانوی

تیرے خانے کا باقی نہ رہے ہوش مجھے
ساقیا اتنی پلا بادۂ سرجوش مجھے

غم نہیں سارے زمانے نے بھلایا مجھ کو
غم ہے یہ کر دیا تو نے بھی فراموش مجھے

تم کی ہر چوٹ پہ اس دل نے بکھیرے نغمے
ضربِ دوراں نہ سمجھ طائرِ خاموش مجھے

تیرا ہر ظلم گوارا ہے ستم پیارا ہے
درد و غم باعثِ تسکیں ہے جفا کوش مجھے

میرے خوابوں نے لطافت کو نچھاور کر کے
اپنی توبہ کا دمِ شرب نہیں ہوش مجھے

ہمایوں فانوس کالی مالی گانوی

ظلم سہتا رہا دنیا کے شب و روز مگر
پھر بھی کہتے ہے سب لوگ ستم کوش مجھے

ہر فرض جس کی پرستش میں کیا کرتا ہوں
کر سکا ہے نہ کرے گا وہ فراموش مجھے

قابلِ داد ہے ہنگامہ پسندی میری
راس آئی نہ کبھی محفلِ خاموش مجھے

بجھ گئی جب سے مری شمعِ تمنا فانوس
ہے بیاباں کی طرح وادیٔ گلپوش مجھے

ستار

نگہِ مست کا ہاں بادۂ سرجوش مجھے
ساقیا ایسی پلا پھر نہ رہے ہوش مجھے

ان کے دامن کی ہوا کا ہے اثر کیا آخر
ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

میں تہی جام لئے بیٹھا ہوں مے خانہ میں
تا کرے نوش سمجھتے ہیں مے نوش مجھے

یہ ارادہ ہے کہ اول منزلِ مقصود و دم
شوقِ دیدار نے بخشا ہے جو جوش مجھے

خلیق انصاری مالیگانوی

بے خودی کا تجھے کیا حال سناؤں ساقی
میں وہ مے کش ہوں کہ آتا ہی نہیں ہوش مجھے

ہوں میں بیکار مگر آپ کا کہلاتا ہوں
سرِ محشر کہیں کر نہ فراموش مجھے

خیر سے آپ کے جلووں کا بھرم کھل گیا
وہ تو یوں کہئے کہ آیا ہی نہیں ہوش مجھے

بھر میں سوزِ فراواں سے پگھلتا جاتا ہوں
کر گیا آپ کا غم آتشِ خاموش مجھے

شمس الحسن صدیقی گرنج پوری

شکوۂ جور جفا کا نہ ہو اب جوش مجھے
ہمت نے کر دیا دنیا سے سبک دوش مجھے
تیری محفل میں ہوا ہے سے کمی مجھ کو
اب نہ آئے گا سر بزم کبھی ہوش مجھے

آپ کہتے ہیں کہ ہم آپ کی بیت ہوں
آپ کہتے ہیں سر بزم جو نے نوش مجھے
کچھ نہ کچھ بات تو ہو جائے تسلی کے لئے
دیکھ کر آپ بھی ہو جائیے تیں خاموش مجھے

قبلۂ مے کدہ ہوں نہیں ہوں ساقی
رند کہتے ہیں مگر آج بلا نوش مجھے
میرے ساقی کی نوازش ہے ہمیشہ مجھ پر
لوگ مے خانہ میں کہتے ہیں بلا نوش مجھے

کچھ نہ دنیا کی رہی ہم کو غم عقبیٰ مجھ کو
زندگی بھر نہ دیا ایسے سوا ہوش مجھے
ہے مری شعلہ بیانی کا اثر محفل پر
آپ کرتے ہیں تو کر دیجئے خاموش مجھے

صدیقی نظیم شکوہ آبادی

کہہ رہیں گھر تا نہ رہا ہوش مجھے
کر گئی ایک نظر آپ کی خاموش مجھے
محمد عالم سلطان پوری۔ رمانی گھاٹ)

جان پہ کھیل گیا دل کی کیا نذر انہیں
پھر بھی کہتے ہیں وہ احسان فراموش مجھے
مجھ کو فرقت ہے مے ناب سے ناصح لیکن
اور تم ہو کہ سمجھ بیٹھے ہو نوش مجھے

جب میں سمجھوں کہ مجھے تو نے بھلا دی ساقی
اپنی بدمست نگاہوں سے نہ کیجے مدہوش
بعد مدت کے تو آیا ہے خدا ہوش مجھے
یاد کیجئے کہ وہ اب کہیں فراموش مجھے

دیکھ شبنم کو وہ احسان کی جتا دیتے ہے
رحم کچھ آ ہی گیا دیکھ کے مدہوش مجھے
سارا عالم نظر آتا ہے تم کو سنسان مجھے

مزمل کالی ناگ پوری

تیری محفل میں جفا ہی سے کمی ہے مجھ کو
اب نہ آئے گا سر بزم کبھی ہوش مجھے
کچھ نہ کچھ بات تو ہو جائے تسلی کے لئے
دیکھ کر آپ بھی ہو جائیے تیں خاموش مجھے
میرے ساقی کی نوازش ہے ہمیشہ مجھ پر
لوگ مے خانہ میں کہتے ہیں بلا نوش مجھے
ہے مری شعلہ بیانی کا اثر محفل پر
آپ کرتے ہیں تو کر دیجئے خاموش مجھے

محمد عالم سلطان پوری۔ رمانی گھاٹ)

مجھ کو فرقت ہے مے ناب سے ناصح لیکن
اور تم ہو کہ سمجھ بیٹھے ہو نوش مجھے
لاؤ دیکھوں کہ وہ اب کہیں فراموش مجھے
یاد کیجئے کہ وہ احسان فراموش مجھے
اپنی بدمست نگاہوں سے نہ کیجے مدہوش
بعد مدت کے تو آیا ہے خدا ہوش مجھے
ہائے کس کس کی شکایت کروں حاکم تم سے
سارا عالم نظر آتا ہے تم کو سنسان مجھے

مکتبۂ شعلۂ و شبنم دلی کی خصوصی پیش کش

صاحب طرز کہنہ مشق نامور شاعر حضرت ضیار فتح آبادی کا نیا مجموعۂ کلام

گردِ راہ

دو آرار ملاحظہ فرمائیے

(۱) ضیار صاحب کی شخصیت کو ان کے احساس اور وجدان میں تلاش کیا جا سکتا ہے، وہ جذبہ کو موزونیت اور سلیقہ سے الفاظ کے پیرہن میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کشتۂ رومانیت نہیں۔ ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی ضابطہ کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ اُن کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے۔ نفاست اور نزاکت ہے۔ اس لئے ان کے لہجہ میں دل آرائی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پُرکاری اور بیشاری سے زیادہ سادگی اور سرشاری ہے ——— (ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی

(۲) ضیار معمولی شاعر نہیں ہیں۔ وہ ہر بات بلندی سے کہتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے اور خیالات لطیف ہیں۔ دل میں جذبۂ ہمدردیٔ انسانی بے پایاں ہے اور ایسا ہی شاعر ملک و قوم کے لئے باعثِ فخر ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا ——— ماہر احسنی

قیمت ——— تین روپے پچاس نئے پیسے

گردِ راہ آج ہی طلب فرمائیے

مکتبۂ شعلۂ و شبنم۔ دریبہ کلاں۔ دلی نمبر ۶

اپریل
۱۹۶۴ء

جلد ۱۵
شمارہ ۴

JAMIA LIBRARY
DELHI.

فہرس

۱	عبداللہ تری کچھ اشعار پر ایک نظر		۲
۲	کوڑیں عدد	مفتی کوثر	۳
۳	غزل	شباب ملیح آبادی	۵
۴	قطعات	کرشن موہن ایم۔اے	۶
۵	غزلیات	سلام سالکی	۶
		مہر نگروی	۶
		محسن آبادی	۶
۶	انکار	نظیر فاطمی پوری	۱۰
		قدر فاروقی	۶
		لطیف انجم	۶
۷	جلال و جمال	کراچی۔ تاباں کا سفر	۱۱
		حسین امیر۔ شمس الدین شمس	۶
		شہاب رضوی۔ شمس جہانی	۶
۸	ازدواج (دوہا سماں)	حسن جمیل روشن پٹنوی ایم۔اے	۱۲
۹	پیار کا پودا	منزل لدھیانوی	۱۴
۱۰	میری یاد کی خوشبو تم ہیں	محمد یحییٰ ان اوریجی	۱۶
۱۱	شبستان تخیل	ہمایوں ادیب	۲۲
۱۲	فوک ناچ	صمد حیدری	۲۴
۱۳	ہری مشاعرہ سیتاپور (مختصر شرکاء کلام)	مرتبہ حضرت ابر احسنی گنوری	۲۵

ہفت آفس
دریبہ کلاں۔ دلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۶۴۷۴۵

نگراں حصہ نظم و مشاعرہ
حضرت مولانا ابر احسنی گنوری

ایڈیٹر
بمل جین

معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
فرد خوشتر پوری

قیمت
اٹھنی پیسے

جناب عبداللہ اختر صاحب مرتبی کے چند اشعار پر ایک نظر

کا اجازت سے کیا تعلق ہے۔ پھر کہاں سے لے کے چلے
کس جگہ لے کے پہنچے۔ بہرحال غائب شعر کس قدر مہمل ہے۔ جو کہ ہیں "کہ" عشق تجھے کچھ ہے

دوسرا مصرع دیکھئے۔

چلے تو نازِ حسینِ خرام لے کے چلے
شکوہ و سبو و شباب و امام لے کے چلے

اول تو شعر میں یہ بات نہیں بنتی کہ ان تمام چیزوں کو لے کے چلنے والا کون ہے اور کہاں سے کہاں جا رہا ہے اور پھر نازِ حسینِ خرام لے کے چلنا کیا ہوتا ہے؟ علاوہ ازیں اس کی تمثیل شکوہ، سبو اور شباب امام سے کس طرح اور کہاں تک ہے؟ دوم حسینِ خرام، نازِ خرام یا نازکشِ حسینِ خرام تینوں الفاظ تو معشوق یا محبوب کی چال سے متعلق ہیں۔ کسی کا مشورہ شعر ہے ؎

خوب ہیں کر شمہ و نازِ خرام تیرے
بیا و شیوہ بہاں را کہ نام تیست

کیا اختر صاحب، بیائے مصاحبہ سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں؟ غزل کی نفاست اور غزل کا انداز شکوہ و سبو و شباب و امام جیسے بھاری بھرکم الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتے۔ اختر صاحب کا ایک اور مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

ترے بادہ و دست کا جام لے کے چلے
خرامِ مہر و وفا کا پیام لے کے چلے

ایک یہ بیان شعر گڑھ لیا۔ یا ہے اختر صاحب کا کمال! یقیناً کوئی بھی اہلِ فن ایسی فاش غلطی کبھی نہیں کر سکتا پہلے مصرعہ کا شتر گربہ دیکھئے "بادہ و دست" کے فوراً بعد "جام" کا آنا "جام" کے بعد "خرامِ مہر و وفا" کا آنا کیا ہوتا ہے یہ وہ نئی بات ہے جو کسی مشاق سے مشاق میں بھی کبھی آ ہی نہیں سکتی۔ دست کے ساتھ گردش کا ذکر ہونا چاہئے تھا نہ کہ خرامِ مہر و وفا کا۔ یہ اخلاقی قدریں ہیں اور لفظ دست حسیت سے متعلق ہے۔ سبحان اللہ، دعویٰ کچھ، دلیل کچھ۔ علاوہ ازیں شعر میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون چلا؟ کہاں سے چلا؟ اور کہاں چلا؟ نیز دونوں مصرعے غیر مربوط۔

تمامِ ساغر و مینا کبھی تھے جم اٹھی
کچھ اس ادا سے مئے لالہ فام لے کے چلے

اس شعر میں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون چلا؟ علاوہ ازیں ساغر و مینا کی تمامیت کیسی ہوتی ہے؟ اختر صاحب نے کیسی دیکھی ہے؟ نہیں معلوم اختر صاحب نے ثانی مصرع میں لفظ "اٹھی" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے؟ کس کے لئے؟ اختر صاحب کا اندازِ کلام ملاحظہ فرمائیے ؎

چلے ہیں جب کبھی تیرے ہی در سے اہلِ جنوں
[illegible]
[illegible] اختر صاحب [illegible]

صفدر کوثر

راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر:-

کوٹہ میں اردو ـــــ مقامی ادبی تحریکات

مکتب اور مدرسے۔ کتب خانے اور دار المطالعے

[illegible]

[illegible] کے ذریعہ یا جائے تو یہ کام سہولت اور زیادہ معلومات افزا ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ریاست کوٹہ کا چپہ چپہ اردو کی ایک مستند ریاست رہا ہے۔ یہاں کی ادبی فضا کا اندازہ اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی ان چند ادبی تحریکات کا جائزہ لینے سے ہو جائے گا جن کے بارے میں اب تک کوئی مستند معلومات فراہم نہیں ہو سکی تھیں۔ ان تحریکات کا جائزہ ان کے قیام کے تاریخی تسلسل کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے مکتب اور مدرسے کے بارے میں چند ادبی تحریکات کا جائزہ اس عنوان میں لیا جا رہا ہے اس سے قبل کے حالات و واقعات تلاش سے پھر دستیاب ہو گئے تو قرطاس و قلم کی نذر کیے جائیں گے۔ اس وقت فراہم شدہ اطلاعات ہی حوالۂ قلم کی جا رہی ہیں۔

مکتب اور مدرسے

مکتبوں کا رواج کوٹہ میں قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے پہلے تعلیم و ادب کی ابتدا عربی کی مذہبی کتابوں اور فارسی کی کلاسیکی و اخلاقی کتابوں سے ہوتی تھی اور یہ سلسلہ بیسویں صدی کے نصف اول تک قائم رہا۔ مولویوں کے کلاسیک مکتب کے علاوہ کہیں کہیں مسجدوں میں بھی مکتب قائم تھے جہاں عموماً صاحبان ریش حضرات بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ان مکتبوں میں بچوں کو قرآن شریف، دینیات، اخلاق، تعلیم، صرف و نحو، فارسی کی ابتدائی کتابیں اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کا دفتر کوئی نہیں تھا۔ زبانی سبق یاد کرنا اور سنانا ہوتا تھا۔ مولوی کریم بخش صاحب کے مکتب اور مسجد کے مکتب میں [illegible]

[illegible] ہیں مولوی فقیر محمد صاحب۔ منشی بھیرون لال صاحب، حافظ [illegible] صاحب، پرشاد حاکم مہتہ اور شہر کے کچھ دوسرے حضرات کے نام ملتے ہیں۔ حافظ غلام نبی خاں صاحب کا مکتب بھی بڑا علم و فضل تھا۔ میں نے اس مکتب سے فیض اٹھایا ہے۔ حافظ غلام نبی خاں صاحب بڑے خوش سیرت اور نیک صورت بزرگ تھے۔ میں نے اپنی ایک رباعی میں ان سے اپنی خوش عقیدگی کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

آنکھوں نے ہری علم کا دریا دیکھا
دنیا میں اک نور سراپا دیکھا
مفتوں مرے استاد وہ حافظ تھے
انسان کی صورت میں فرشتہ دیکھا

شہر میں چار پانچ، محلہ محلہ، قصبوں میں کہیں کہیں اور دیہات میں ایک دو جگہ ایسے مکتبوں کا پتہ چلا ہے یا ملا ہے جو [illegible] کچھ [illegible] کتابوں اور دفتر وغیرہ قصبات کوٹہ میں ایسے مکاتب یا مدرسے تھے جن میں [illegible] مقررہ تھا۔ بلکہ یہ تعلیم [illegible] تعلیم [illegible] کا [illegible] اور [illegible] کی [illegible] ہیں [illegible] ایسے مکتب [illegible] پڑھائی [illegible] تھیں [illegible] باقی تھیں

[illegible] تعلیم [illegible] مسلمان [illegible] مکتب [illegible] مدرسے [illegible] مکتب [illegible]

غزل

[illegible] کی تھی ہو وہ سخن وہ قول وہ بات کیا

[illegible] کے کام نہ آسکے وہ وجود کیا وہ حیات کیا

[illegible] ہے نیاز الم پہ اب کسی بات کا بھی اثر نہیں

تمنا مدعا کیا تو التفات کیا مری مات کیا

[illegible] شیشۂ سر خوشی ترے غم میں رازِ شگفتگی

ترا غم تو ہے مری زندگی ترے غم سے چاہوں نجات کیا

مجھے سانحاتِ زمانہ سے کوئی خوف کوئی حذر نہیں

مری گود میں جو پڑے پلے مجھے ڈس سکیں گے وہ سانپ کیا

وہی وقت حاصلِ زیست ہے ترے قرب میں جو گزر سکے

جو ترے فراق میں بسر ہوئی وہ سحر وہ شام وہ رات کیا

[illegible] کے سینے پہ زخم ہے وہ جبینِ وقت پہ داغ ہے

[illegible] کے خون پہ کہیں اس کو نخلِ حیات کیا

[illegible] کے نگار کچھ اور ہے مرے ظرف کا ابھی امتحاں

مجھے [illegible] ہو [illegible] ترے غم نے زندگی ہی کی بات کیا

مجھے اے شباب نہ چھیڑیے میں ترانے پاؤں کی ٹھوکریں

[illegible] کیا، مرا ذوق کیا، مری ذات کیا مری بات کیا

[illegible]

قطعات

چھپ کر اپنے من کا چاند مچلتا تھا
دنیا والوں سے چھپ کر ہم ملتے تھے
آشا جاگ اٹھی تھی، اور دمکتی تھی
اندھیارے میں نین کنول جب کھلتے تھے

یوں تو نرگس بھی ہے فسوں آگیں
تیری آنکھوں کی بات اس میں نہیں
رنگِ رخسار ہے گلوں میں کہاں
اصل ہے نقل بھی ملی ہے کہیں

اک التفاتِ ناز کی دعوت کہیں جسے
مفتوح ہے وہ درد، محبت کہیں جسے
شامِ وصال بھی یہ تغافل، یہ اجتناب
ایسا ہے یہ وصال کہ فرقت کہیں جسے

نہوں گے جب تک اسرارِ دنیا پر حیران کب تک
پکاریں گے تجھے اہلِ نظر آخر کہاں کب تک

رہیں گے اپنی گل سے اگ دستِ خزاں کب تک
فروغِ رنگ و بو کب تک بہارِ گلستاں کب تک

اسیرِ نے کو ہے سوزِ رات کا دامن سحر تک ہے
چراغِ صبح کے بجھنے پہ اٹھے گا دھواں کب تک

رہے گی تا بکے پیدا قسمت راہ و منزل کی
اڑے گی گردیوں کب تک چلے گا کارواں کب تک

سراپا نور کا چشمہ ہے تیری نظامِ انگڑائی
چلائے گی کرن کے تیر چھلکے گی کماں کب تک

تباہی ہر نفس پہ، ہر قدم پر موت کے پہرے
نہ ہوں گی اس نظامِ زیست میں تبدیلیاں کب تک

عتاب و لطف کی یہ کشمکش دیکھی نہیں جاتی
رہے گا کوئی مرگ و زندگی کے درمیاں کب تک

خلافِ ضبطِ غم آنکھوں میں مایوسی کے آنسو ہیں
ہوا جب دل ہی افسردہ تو امیدیں جواں کب تک

سلام اب تک ہے قوتِ اہلِ دل میں ظلم سہنے کی
مگر دنیا کو پیسیں گے زمین و آسماں کب تک

غزلیات

محمد اسمٰعیل محسن آنندی ناگ پوری

گوشے گوشے سے مری قید کا ساماں نکلا
میں سمجھتا تھا جسے گھر وہی زنداں نکلا

سب جسے کفرِ محبت کا سبب کہتے ہیں
وہ ہی اک سجدہ مرا حاصلِ ایماں نکلا

جس کے رتبے پہ فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے
ساری مخلوق میں ایسا فقط انساں نکلا

تیرے حصے کی خوشی میری جبیں لائی تھی
داغ وہ بعد فنا مہرِ درخشاں نکلا

دل نے تو ضبط کیا ہر غمِ الفت محسن
بہہ چلے مگر دیدۂ گریاں نکلا

نثر محسن

(از دیباچہ شمامت، مولانا نسیم، بھاگلپوری)

وہ کون سا جگر ہے جو دشتِ الم نہیں
دنیا بشر کے واسطے دوزخ سے کم نہیں

غیروں کی دشمنی کی شکایت فضول ہے
اپنوں کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

ساقی اسیرِ نیاز کی رکھ لے کچھ آبرو
جو بار بار آکے جھکے گے وہ ہم نہیں

جو کبر سے بچا وہ گناہوں سے بچ گیا
خوفِ خدا، خدا کی عبادت سے کم نہیں

فتنے اٹھیں، قیامت اٹھے، آندھیاں اٹھیں
تیری گلی میں بیٹھ کے اٹھنے کے ہم نہیں

راہِ حیات میں تو بہت راہبر ملے
افسوس کوئی رہبرِ راہِ عدم نہیں

مترجمِ جلوۂ محسن تو صحرا عشق ہے
رازِ وفا میں جان گنوا جائے تو کم نہیں

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی ضعت ہر قم آلودہ
مجھ کو ڈر ہے ترا ملبوس نہ ہو نم آلودہ

ہو نہ جائیں مری سوزشِ غم سے آلودہ
صرف اک غم ہی نہیں تیرا ستم آلودہ

کیا ہوا تجھ کو غمِ دہر کی گھونٹ اے دوست
تیرے چہرے پہ ہے بھی بھی غمِ آلودہ

تیرا احساس وفا تیرے ادا آلودہ
میرا احساس وفا ہے چشمِ عنایت تیری

ہے یہ ہستی کی طرب کی پیہم کی قسم
بعد مدت کے تو چلے آئے ہو ہم آلودہ

گیا کوسے تو چلے آئے ہو ہم تک لیکن
ذہن و دل اب بھی ہمارے ہیں صنم آلودہ

جیسے سمجھا کہ بہار آنے کو ہوتی ہے واپس
دیکھ کر پھولوں پہ اک آتشِ نم آلودہ

ذوقِ الفت کے تقاضائے مسلسل کی قسم
ہر جفا میں ہے ترا لطف و کرم آلودہ

میرے اشعار میں کچھ بھی ہو مسیحی پیرہن
مگر انگیز ہے رویہ قلم آلودہ

افکارِ نو

نظمہ انجم

ٹوٹے جو شیشۂ خانے کے سب جام ہمیں دو
ہم ڈھالیں گے ان کو یہ نئے کام ہمیں دو

تم سے نہ سنبھل پائے گی فرزانو یہ گتھی
شب بھر نے کو دی ہے غمِ ایام ہمیں دو

دنیا میں جلائے ہیں بہت دیپ ہم نے وفا کے
جادو گری ان کا انعام ہمیں دو

کیا ہو گا جو تھک ہار کے منزل پہ جا کر
کیا ہو گا کہے تم دھوکے یہ ہر گام ہمیں دو

پیمانے کے پیمانے سے کیا کام چلے گا
آواز جو دیتا ہے سرِ بام ہمیں دو

اب تشنہ رہے گا نہ جہاں میں کوئی ہرگز
"ہم سب کو پلائیں گے ذرا جام ہمیں دو"

ہم جام بھی بھر لائیں گے لے لیں گے خدا بھی
تم سے نہ کہیں گے کہ خدا جام ہمیں دو

ہم حرفِ وفا سے تو گزر آئے ہیں انجم
اے اہلِ جہاں کوئی نیا کام ہمیں دو

ادھر دیکھا ادھر دیکھا بالآخر دیکھ لیتا ہے
تمنا کا نہیں پایا جدھر دیکھا ادھر دیکھا

محبت میں یہ تاثیرِ محبت کا اثر دیکھ
جسے بھی دیکھنا چاہا اُسے پیشِ نظر دیکھا

مسافر جو گیا ملکِ عدم کو کب پھرا واپس
زمانے میں تو ہم نے یہ قیامت کا سفر دیکھا

نہیں گزرا کسی کا بھی زمانہ ایک صورت سے
بہاروں کا سماں ہم نے خزاں سے پیشتر دیکھا

دمِ دیدار کیوں مجھ سے خفا وہ شوخ ہوتا
نظر کا کام ہی ہے دیکھنے کا اک نظر دیکھا

تجلی کتنے روشن کی نظر جچتے نہیں دیکھا
کسی کی شکل کو پُر نور ہم نے اس قدر دیکھا

مری جانب سے جب اُن کو کبھی ایسی بدگمانی
نظر سے کیوں نظر اپنی ملا کر اک نظر دیکھا

نہیں ہے وجہ اے آذر اپنے گریہ وزاری کی
کسی کی یاد جب آئی تو خود کو چشمِ تر دیکھا

الوداع

موپاساں کا ایک شاہکار

ترجمہ: [illegible]

[illegible] ہم [illegible] کرنے والے تھے [illegible] کے ساتھ [illegible] تھے جن میں سے ایک [illegible] میرے [illegible] میں [illegible] محسوس [illegible] طرح [illegible] اداسی [illegible] ہے [illegible] آج کے [illegible] سے [illegible] میرا [illegible] گراب [illegible] جذبات سے [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] ہو جاتے ہیں۔

[illegible] میری کا [illegible] تھا جو [illegible] اپنے [illegible] زیادہ تھا۔ وہ [illegible] کا [illegible] دیا تھا۔ اس [illegible] دل [illegible] ہوا تھا۔ اس [illegible] کے [illegible] کے [illegible] ہو جاتا [illegible] گر [illegible] کرتا۔ میں [illegible] اور [illegible] سا [illegible] کہ [illegible] کس [illegible] ہوتا ہوں۔ اور [illegible] کہ میں [illegible] آپ [illegible] ہو [illegible] اس [illegible] میں [illegible] سے [illegible] پیدا [illegible] کے [illegible] اثبات کو قبول نہیں کرتا۔ انھیں [illegible] کے [illegible] کسی شخص کو [illegible] کا [illegible] نہیں [illegible] [illegible] کسی [illegible] ہوتے [illegible] ہم [illegible] [illegible] گر [illegible] ہمارے [illegible] [illegible] ہو [illegible] [illegible] ہو [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible]

...پڑھنے کی اجازت ملنے سے قبل ہی ...
...صاف فرمایئے، کیا آپ مسٹر کاظمی ہیں؟"

"ہاں میڈم!"

"جواب پاکر وہ کھڑکی کے قریب گئی جہاں کاظمی ...
...یہاں طلسم و سحر کے حاضر شاگرد تھے، وہاں عشق ...
...بھی تھا۔

"تب کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں ــــ؟"

یہ پوچھا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ میں نے اس صورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے، لیکن کب اور کہاں۔ یاد نہیں آرہا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے پوچھا:

"ہاں! مگر بات یہ ہے کہ مجھے آپ کا نام یاد نہیں ــــ؟"

اس کا چہرہ قدرے سرخ ہوگیا "میڈم جولی فضیلت"

"کیا ــــ؟" میں نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا یہ وہی لڑکی ہو سکتی ہے جس سے میں نے محبت کی تھی۔ یہ ضبط صورت جو میرے بالکل قریب بیٹھی تھی، جو چار لڑکیوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ کسی وقت وہ کتنی نازک اندام اور حسین تھی۔ قدرت مردوں اور خصوصاً عورتوں سے اس قسم کا مذاق کیوں کرتی ہے۔

میں اسے دیکھ کر سہم گیا۔ پھر اس کا ہاتھ میں نے شدت جذبات کے تحت بڑی محبت سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اس کے شباب کا ماتم کر رہا تھا۔ ایک محبت کے شباب کا جو میرے لئے ایک ابدی کی حیثیت رکھتی تھی۔

اس نے بھی کچھ اضطراب کی حالت میں مجھ سے ــــ میں بہت پریشان ہوں۔ کیا میرے اندر تبدیلی نہیں ــــ کیا کیا جائے۔ خدایا یہ کیا ایسا ہونا تھا۔ اب ...
...اب کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بارہ سال کا وقفہ ہے اور ...
...میری بڑی لڑکی بھی دس سال کی ہو چکی ہے۔

جب اس نے مجھے یہ بتایا، تو میں نے تعجب اور استعجاب سے لڑکی کی طرف دیکھا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ کسی وقت یہ لڑکی اپنی ماں کی طرح ہی جاذب توجہ اور کشش شخصیت کی مالک بن جائے گی بالکل ماں کی طرح جس سے میں کبھی محبت کرتا تھا۔ میری گزشتہ زندگی کے واقعات سینما کی تصویروں کی طرح میرے پردۂ ذہن پر گھوم گئے۔ جب ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے، تو میں نے اس کے خوبصورت ہاتھ کو بوسہ دیا اور اسے الوداع کہی۔

اس شام جب میں اپنے کمرے میں تنہا تھا میں نے طویل عرصہ تک آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، مجھے گویا اپنی جوانی کا نظارہ دکھائی دیا۔ جب میں نے قدرت کا کامل مرقع دیکھا تھا۔ اور اب میں نے تلک بوڑھا ہو چکا تھا

ــــ الوداع ــــ! شباب رفتہ ــــ الوداع

بقیہ کوئٹہ میں اردو صفحہ ۱۲ سے آگے

کرتے ہیں محکمہ تعلیم نسبتاً بہت رہا ہے۔ سہ سالہ فاضلے میں جو انجمن اصلاح تعلیم نے پیدا کر دی ہے، یہاں بھی ان کی اثر اندازی ہے۔ لیکن ماحول اب صاف ہوتا جا رہا ہے اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کوئٹہ کی سعی قابل شکر گزاری ہیں۔

کتب خانے اور دار المطالعے

شہر پریشاد کوئٹہ کے تحت پبلک لائبریری ہے اس میں اردو کتب کا اچھا ذخیرہ رہا ہے۔ سالی۔ جایوں وغیرہ معیاری رسالے بزمانہ ریاست یہاں آتے رہے ہیں "نگار" بھی باقاعدہ زینت رہا ہے۔ اب فضا اس جانب نگاہ انتخاب میں کمی ہے۔ برٹش کالج کوئٹہ کی لائبریری میں بھی اردو کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جو علمی و ادبی تھیں۔ طلبہ ان سے کافی مستفیض ہوتے تھے۔ کچھ ذخیرہ شہر کے دو باب علم و صاحب ذوق کے پاس بھی ہے جو کافی رہا ہے۔ لیکن ...

مطالعہ۔ دار المطالعہ کے طور پر نہیں کیا جاتا تھا کہ ...
...کے بجائے میں یہ لوگ کتابیں پڑھنے کے لئے ...
...لیکھنے زیادہ تھے۔ اب بھی قدر دانوں کے پاس ...
...ہیں۔ اگرچہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اب ان کا ...
...غرق آنا جانا ہے۔

ہر بیت کالج کوئٹہ کی لائبریری ...
تھی، پبلک لائبریری اور ...
میں حاجی محمد عثمان ڈپلم۔ فہم ...
عبد الحمید کی سعی و کوشش سے "دار الاخبار" ...
عمل میں آیا۔ یہاں اردو کے مختلف اخبار و رسائل ...
جنھیں اردو پرست دیکھنے آسکتے ہیں۔ اپنے نام ...
کتب جاری کرا کے پڑھتے۔ معاوضہ میں معقول ...
سفقہ امداد کے بجائے سال بھر کے لئے ...
جاتے تھے۔ دار المطالعہ مغرب اس کے افتتاح کا وقت تھا۔ ...
پہلے یہ دار الاخبار تھا جو ترقہ بڑھ کے ایک کمرہ میں تھا۔ ...
بعد میں گھنٹہ گھر بازار میں حافظ عبد الحکیم کے ...
اوپر والے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ شاید جب کہ ...
کافی عرصہ تک یہاں ہوتا رہا۔ دار الاخبار کو جب ...
منتقل کئے جانے کے سلسلہ میں میں نے ...
کو ایک مضمون بھی سپرد قلم کیا تھا۔ "دار الاخبار کوئٹہ ...
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھئے۔" اس کا ...
مختلف مذہبی و مذہبی اردو اخبار و رسائل ...
رہے ہیں۔ دفتر میں مفتی خلیل احمد تھے، اس کے ...
کارکن تھے۔ ہیں کے دست بردار ہو گئے ...
نے اسے اپنی سپردگی میں لیا۔ لیکن ...
کے لئے بند ہو گیا۔

مدرسہ اسلامیہ یا ...
ہے۔ پانچ چھ سال سے ...
کتابیں مختلف اصناف ...
ہر سال ...
دار الاخبار کی ...

پیار کا چور

فرزانہ شیروی

میں نے پڑھا۔ میں نے چین کی ایک مکمل انجمن، دیپ کو بچاؤں۔ اس کے پاس فوراً جہاں کو روشن کرنے کے لئے اس کی تصویروں کو مکمل کر دے گی۔۔۔ بتا دوں اُسے کہ میں تمہارے ہر مطلب کو سمجھتی ہوں۔ بتا دوں اُسے عرفی کے انگ انگ کی سنسنا۔ اس کے اپنے خیال میں مگر شت پوست کا بنا میرا بدن نہیں۔ جگا دوں اُسے شکر مکرم۔ کہ میں یا میری آواز تم سے دُور کب ہے جو تم اتنے بیزار سے ہو اٹھے ہو لیکن نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی دیپ سو گیا ہے زندگی طویل ہے سفر بہت لمبا ہے۔ پھر دیکھا جائے گا۔۔۔ پھر دیکھا جائے گا سنہرے جُدائی کے پُر سوز لمحات نے ہی دیپ کے خیالوں کو وہ سب کچھ سونپ دیا ہے جو اُسے نہ تھا۔ دیپ تم کیا جانو میں تمہارے پاس رہ کر بھی تم سے اس لئے لگ رہی ہوں کہ تمہاری راہوں میں تلاش کر کے وہ ماہتاب بکھیر دوں جو اُنے فانی دنیا کو اُجالوں سے بھر دیتی۔۔۔ دیپ اب میں جا رہی ہوں اور اس کے بعد میں کبھی آؤں گی۔۔۔ وہ رات دیپ کے خیالوں میں گزری۔ ایک عورت۔۔۔ ایک پیاسی عورت جو گنگا جل کے کٹوروں کو بھرا دیکھ کر جتنی بے تاب ہو سکتی ہے میں جانتی ہوں عورت کی کمزوری ہے تو یہ۔۔۔

رات کے دبیز اندھیرے نے مجھے چھپا لیا تھا واپسی کے قدم جوں جوں راستہ طے کر رہے تھے میرا دل بری طرح بھونک کر بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ خاموش ہو گیا۔۔۔ میں بھی خاموش ہوں لیکن وہ خاموشی کب تک نہیں کرتی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو جاتی۔ تو یہ رات سے آگے مجھے نہ جانے کیا کیا کرنی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی مجھے ڈرا دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے میں تیار تھی۔ جدائی کی قدم اٹھانے میں دروازے تک آ گئی کہ پیر جیسے برف کے ہو گئے ہیں جیسے جم گئے ہوں۔ ایک شعلہ سا بدن میں لپک گیا ایک طوفان تھا جو مجھے بہا لے جانے کو اُمنڈ آیا تھا۔ یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ میرے ضمیر نے مجھ سے اور میرے ضمیر سوال کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں مستعمل ہو گئی۔ اپنے پر قابو پاتے ہوئے میں نے پوچھ ہی ڈالا

"کون ہیں آپ۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے میں کوئی نہیں ہوں۔" وہ گھبرا سا گیا تھا۔

"جی تو آپ کوئی نہیں ہیں۔۔۔ آپ یہاں کیسے آئے ہیں۔۔۔؟"

"جی۔ جی۔۔۔ آپ کا یہ دوال۔۔۔" اس کا منہ ڈوبا جا رہا تھا۔

حالات کے دھارے سے زندگی کا رُخ موڑ دینے والی طوفانی شعاعوں میں قندیل جل رہی تھی۔ بادل کے ٹکڑے اُڑا جا رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی دیپ کے پیروں پر گر کر اس سے اپنے گناہ بخشوا لوں۔ معافی مانگ لوں۔ کہہ دوں کہ دیپ مجھے معاف کر دو میں نے سب کچھ بنا دیکھے کئے تھا۔ مجھے بچا لو۔ میں بچ جاؤں گی۔ دیپ۔۔۔ مگر میں ایسا کچھ نہ کر سکی۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت میں میرا ہاتھ بہت محفوظ تھا۔ میں نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن میرے کانوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے سینے پر رکھ دیئے۔ اس کے دل کی دھڑکن میرے ہونٹوں کے نیچے

...ہ میں ایک شیشہ گر ہے میں ڈیڈی ہوں۔ ایک دن ...ہو گی ختم ہونا ہے۔ اُسے ختم کر دینا ہی مناسب ہے" ...ں نشہ کے خیال مجھے دیپ کے کمرے تک کھینچ لے جاتا ...ہ وہ تو اچھا ہوا شیلا آ گئی۔

"اوہ کام پر نہیں جانا ہے کیا۔" وہ ساتھ سے ...ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"شیلے تم آ گئیں ــــ" میرے ہونٹ مسکراہٹ ...ب گئے۔

"میں جا رہی ہوں کام پر چل رہی ہوں۔" میرے ...پر بجلی سی تڑپ گئی۔

"شیلا ایسے نہیں" میرا منہ بگڑ گیا۔

"تو کیسے۔" میں کسی گہری میں تڑپ اٹھی۔

"شیلے شیلے۔ شیلے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ...جاؤ ــــ اری مان بھی جاؤ۔"

"یہ لو۔" پنجرے سے ایک چڑیا رہا کر دیا گیا تھا ...اور پھر ہم دونوں ایک رکشا پر تھے۔ بازار سے ...تے ہوئے ہمیں کمل کے دروازے پر رک جانا پڑا۔ ...شیلے اور کمل دیپ، جیسے ایک ہی مضمون کے کئی عنوان ...ں۔ کمل تو ہم میرا انتظار کر رہے تھے۔ شیلا تو ہمیں ...تے ہی، سب شوخی بھول گئی۔ بھولی بھولی حیا اس کے ...ہ کی سُرخی میں گھل گئی۔ حالاں کہ کمل کو اس کی یہ ادا ...پسند تھی۔ مگر آج وہ شیلے سے زیادہ میری طرف ...ہا تھا۔

"اوشا، تم نے مجھے سنا ــــ" مسکراہٹوں کی ...ہ کھنچ گئیں۔

"مجھے غیر آپ کے سنانے میں کیسے سن لیتی ــــ"

"ہاں تم بالکل نادان ہو۔ نادان ہو تم سنو ...دیپ کے کمرے میں کوئی آدھا دل نکال آیا۔ وہ ...ہ ...ہ ...

تیری یاد کی خلش تو نہیں

نہیں ہے!

اور یہ سچ بھی کیا ہے ۔ اس نے تو نہ جانے کتنے بھائیوں کی بہنوں سے ایسا پیار کیا ہے جو کسی بہن نے صرف اس لئے کہ کوئی اس کا بھائی نہیں ہے، اس سے نہیں کیا ہوگا۔ اس نے اپنی شادی کے بعد بھی اپنی نندوں، دیوروں، اور سسرال اور پیار کا جنازہ نہ نکلنے کی وجہ کے مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

اور اب عفت! مجھے یہ کہنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی کہ تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا ہے، تمہارا وجود جسم اس کے لئے ایک خوبصورت مکان ہے اس سے تم نہیں، تمہارے اندر کا وہ احساس اور وہ جذبہ ہے پیار ہے جو وہ تم سے شادی کر کے مجھ سے انتقام لے رہا ہے! اور تمہارا پیار بھی ایسا ہی ہے جس میں دولت کی ہوس ہے! اور ..... اس لئے یہ شادی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ٹوٹے ہوئے دلوں سے نکلی ہوئی آہ کا اثر خالی نہیں جاتا ہوں کہ کامل! اس روز ہوٹل میں حقیقت آشکارا نہ ہو گئی ہوتی تاکہ میں تمہارے اس جھوٹے پیار کو ہی سچا پیار سمجھ کر خوش ہوتی میں مبتلا رہتا اور جب یہ دولت نامراد تو سمجھ لیتا کہ چہار دانگ عالم میں میری اور غریبی کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ مگر اب ——— ؟ میں یہ بھی جانتا ہوں عفت کہ جب ہی تمہاری زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ جب تمہیں ایک ایسے سچے پیار کی ضرورت محسوس ہو گی جو سچے دل سے کیا جائے مگر تم اپنے پاس پیسہ نہ پاؤ دولت ہوتے ہوئے بھی، اور اضطراب کو پیدا نہ کر سکو گی جس کے باعث تم اپنے دل میں ایک تڑپ، ایک تڑپ، ایک کسک محسوس کرو گی اور اس وقت تمہیں میرا اور میرے پیار کا خیال آئے گا میری باتیں اور میرے الفاظ یاد آئیں گے۔ مگر اس وقت تمہیں ان چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہ مل سکے گی۔

بس اب خط کو ختم کرتا ہوں ——— !

سلیم

پڑھ کر اس نے سلیم کو خط لکھا کہ
سلیم آ گیا۔ پھر اس نے اس خط کو پھینک دیا
کر دیا اور خود سلیم کی جانب چل دیا۔ مگر اس کو وہاں
سے کہاں جانا تھا۔ اس کا تو گھر وہ تھا ———!

(بقیہ افسانہ پیار کا پھل ——— صفحہ ۱۵ سے آگے)

میں کرسی کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ سامنے بالکل بے جان پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھ بابو کے ہاتھ والی کتاب اچھی طرح پڑھ سکتی تھی ——— میری ہی فتح ہوئی تھی۔

۲۴ جون ——— آج دیپ بابو کے گھر بارات میں پہنچی، دھوم دھام سے بیاہ کیا گیا۔ دھوم دھام تو دل ہی رہ گیا ہے گھر جگمگا رہے اس کا پتہ دیپ کو نہ چلے ورنہ اس کی کہانی کی ٹریجڈی کیا بنے گا ——— میں اپنی زندگی تباہ کر رہی ہوں گی مگر دیپ بابو کی باہوں میں خوشی کے دیپ جلنے کے لئے میری نظر میں ایک انسان کی خوشی بیش بہا ہے ———"

۲۵ جون ——— آج کل جی سے دیپ بابو کے حالات معلوم ہوئے۔ کمل بابو نے کیا کچھ نہ کہہ ڈالا مگر نہیں اب دیپ کو ان باتوں سے نہ ہٹایا جائے گا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آج تک کا ایک لیٹر لکھے وہ ایک ہزار روپیہ پیشگی دے گی۔ کل تو دیپ کو روپیہ سے خریدنا چاہتے ہے مگر کیا پتہ کہ دیپ بابو کیسے چاہتے ہیں اور جیسے وہ چاہتے ہیں وہ ان کو چاہتے ہوئے بھی کیسی انجان بنی ہوئی ہے، مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے یہ ناٹک کیوں رچایا ہے میں مجھتا ہوں ایک مرتبہ میں روٹھ گئی، تو دیپ کے افسانوں کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ اور پھر میں مل گئی، تو اس کی زندگی لکھنے لگی ——— میں نے سمجھا میری جدائی ہی اس کی خوشی ہو گی۔ میں اپنے دل کو مسل کر بے وفا بن گئی ہوں۔ آج بھی دیپ کی تھل میں بے وفا ہوں لیکن ——— دیپ بابو میرے جذبوں میں ہی کی پجاری ہوں۔ تو ان کی محبت کو ٹھکرا دیا ہے اور میں ان کی محبت حاصل ہو گئی ہوں تاکہ صرف اس لئے کہ کوئی پیسے والی ہے میں دیپ بابو کو تیری طرح ٹھکرا نہیں سکتی ——— میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی [illegible]

شہنشاہِ تجمّل

(ان کے نام جو ادب کو ادب سمجھتے ہیں)

ہمایوں ادیب

جیسے ہی بیرونِ ملک سے مختلف قسم کے شاعرے ہوئے شہر کی ادبی فضا بدل گئی۔ جہاں کل تک شعراء کے دل میں ایک دوسرے کے لئے خلوص و محبت کا جذبہ موجزن تھا وہاں اس کی جگہ ذاتی حاسدانہ نفرت اور کینہ و حسد نے لے لی تھی۔ جہاں کبھی کسی کے منہ سے گروپ بندی کا نام تک نہ سنا تھا وہیں ہر شاعر کی زیرِ نگرانی ایک گروپ تھا۔

ادھر گروپ کے اصول کچھ اس طرح تھے۔

(۱) جیسے ہی فلاں شاعر کے یہاں کوئی نشست یا عوامی شاعرہ جو ہماری پارٹی کا کوئی بھی شاعر حصہ نہیں لے گا۔

(۲) جس پر چہ میں دوسرے گروپ کی کوئی غزل نظم شائع ہو، یا جس ریڈیو اسٹیشن سے جائیں، جو ہمارا ایسا نہیں کرے گا، اسے کھڑکی سے نوانا ہے گا۔

(۳) مخالف پارٹی کے لوگوں کو جب بھی موقع ملے ذلیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۴) اگر دوسری پارٹی کے شعراء میں کوئی بڑا ہو کرنا چاہیے افواہ اڑائی جائے کہ ان لوگوں کا صد صحت ادب کی آڑ لے کر عوام کو لوٹنا ہے۔

(۵) ادب زندہ باد۔ مخالف پارٹی مردہ باد وغیرہ۔

جو سلجھے ہوئے شعراء تھے وہ اس بات کو فوراً سمجھ گئے اور انہوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔

لیکن اصل فرق پڑتا تھا نئے پیدا ہونے والے شعراء کی پود پر۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے وہ ان کے چہیتے بن جاتے تھے۔ ان کی غزلیں، نظمیں اور ان کے مجموعے ان کی نگرانی میں شائع ہوتے تھے۔ جن پر وہ رعب گانٹھ کر بڑی بڑی رقمیں اِدھر اُدھر کا خرچہ بتا کر وصول کرتے تھے۔ اگر اس اسکول کو کامیابی حاصل ہوئی تو خرچے کے نام پر لاکھوں روپے ہڑپ کر جائیں گے۔

ہر گروپ کے اصول کے استاد میں ایک ہی بات بہت کامن تھی کہ جو بھی نئی پود سے سینئر ہونے کی کوشش کرے گا اسے ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جہاں شعر کہنے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور وہیں سے سند بھی تقسیم کی جائیں۔ جو شخص مستند ہوگا۔ وہی شاعروں میں بھی حصے سکے گا جس کے پاس مستند ہونے کی ڈگری نہ ہوگی چاہے وہ کتنا بڑا شاعر کیوں نہ ہو نہیں پڑھا جائے گا۔

محض کسی بڑے سرکاری شاعر کو بلا جائے گا تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں کا فرق کس طرح مٹایا جائے گا۔ تو طے پایا کہ جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ ان کے چہیتے اسی اسکول کے کسی مستند شاعر کو روانہ کر دیئے جائیں گے اور جن کا تعلق دہلی اسکول سے ہے۔ ان کے چہیتے دہلی اسکول کے کسی خرد کو بھیج دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں شہر میں شاعری کا اسکول قائم ہو گیا۔

اب شیخ الکل اور استاد و صدر مدرس کو فکر ہوئی کہ ان کی دال اب کیسے گلے گی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کے فرضی بیانات بھیج کر اپنی استادی کی شان بنائے ہوئے تھے بفضلہٖ ان کے ۱۰۔۱۰ مجلے کے بھی چیلے شاگرد ہو گئے تھے۔ جن پر وہ رعب گانٹھ کر بڑی بڑی رقمیں اِدھر اُدھر کا خرچہ بتا کر وصول کرتے تھے۔ اگر اس اسکول کو کامیابی حاصل ہوئی تو خرچے کے نام پر لاکھوں روپے ہڑپ کر جائیں گے۔

ہر گروپ کے اصول کے استاد میں ایک ہی بات بہت کامن تھی کہ جو بھی نئی پود سے سینئر ہونے کی کوشش کرے گا اسے ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جہاں شعر کہنے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور وہیں سے سند بھی تقسیم کی جائیں۔ جو شخص مستند ہوگا۔ وہی شاعروں میں بھی حصے سکے گا جس کے پاس مستند ہونے کی ڈگری نہ ہو نہیں پڑھا جائے گا۔

محض کسی بڑے سرکاری شاعر کو بلا جائے گا تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں کا فرق کس طرح مٹایا جائے گا۔ تو طے پایا کہ جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ ان کے چہیتے اسی اسکول کے کسی مستند شاعر کو روانہ کر دیئے جائیں گے اور جن کا تعلق دہلی اسکول سے ہے۔ ان کے چہیتے دہلی اسکول کے کسی خرد کو بھیج دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں شہر میں شاعری کا اسکول قائم ہو گیا۔

اب شیخ الکل اور استاد و صدر مدرس کو فکر ہوئی کہ ان کی دال اب کیسے گلے گی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کے فرضی بیانات بھیج کر اپنی استادی کی شان بنائے ہوئے تھے بفضلہٖ ان کے ۱۰۔۱۰ مجلے کے بھی چیلے شاگرد ہو گئے تھے۔ جن پر وہ رعب گانٹھ کر بڑی بڑی رقمیں اِدھر اُدھر کا خرچہ بتا کر وصول کرتے تھے۔ اگر اس اسکول کو کامیابی حاصل ہوئی تو خرچے کے نام پر لاکھوں روپے ہڑپ کر جائیں گے۔

ہر گروپ کے اصول کے استاد میں ایک ہی بات بہت کامن تھی کہ جو بھی نئی پود سے سینئر ہونے کی کوشش کرے گا اسے ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جہاں شعر کہنے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور وہیں سے سند بھی تقسیم کی جائیں۔ جو شخص مستند ہوگا۔ وہی شاعروں میں بھی حصے سکے گا جس کے پاس مستند ہونے کی ڈگری نہ ہو نہیں پڑھا جائے گا۔

محض کسی بڑے سرکاری شاعر کو بلا جائے گا تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں کا فرق کس طرح مٹایا جائے گا۔ تو طے پایا کہ جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ ان کے چہیتے اسی اسکول کے کسی مستند شاعر کو روانہ کر دیئے جائیں گے اور جن کا تعلق دہلی اسکول سے ہے۔ ان کے چہیتے دہلی اسکول کے کسی خرد کو بھیج دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں شہر میں شاعری کا اسکول قائم ہو گیا۔

ابے شیخ الکل اور استاد و صدر مدرس کو فکر ہوئی کہ ان کی دال اب کیسے گلے گی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کے فرضی بیانات بھیج کر اپنی استادی کی شان بنائے ہوئے تھے بفضلہٖ ان کے ۱۰۔۱۰ مجلے کے بھی چیلے شاگرد ہو گئے تھے۔ جن پر وہ رعب گانٹھ کر بڑی بڑی رقمیں اِدھر اُدھر کا خرچہ بتا کر وصول کرتے تھے۔ اگر اس اسکول کو کامیابی حاصل ہوئی تو خرچے کے نام پر لاکھوں روپے ہڑپ کر جائیں گے۔

ہر گروپ کے اصول کے استاد میں ایک ہی بات بہت کامن تھی کہ جو بھی نئی پود سے سینئر ہونے کی کوشش کرے گا اسے ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جہاں شعر کہنے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور وہیں سے سند بھی تقسیم کی جائیں۔ جو شخص مستند ہوگا۔ وہی شاعروں میں بھی حصے سکے گا جس کے پاس مستند ہونے کی ڈگری نہ ہو نہیں پڑھا جائے گا۔

محض کسی بڑے سرکاری شاعر کو بلا جائے گا تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں کا فرق کس طرح مٹایا جائے گا۔ تو طے پایا کہ جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ ان کے چہیتے اسی اسکول کے کسی مستند شاعر کو روانہ کر دیئے جائیں گے اور جن کا تعلق دہلی اسکول سے ہے۔ ان کے چہیتے دہلی اسکول کے کسی خرد کو بھیج دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں شہر میں شاعری کا اسکول قائم ہو گیا۔

ذکن شاعر نمبر طرحی مشاعرہ منعقد

قبول موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ [illegible]
مصرعہ طرح۔ جو کوئی بھی قبول فرمائے گا
دینے۔ دینے والا ۔ رکھ دیا دینے

نام ... ...
پتہ ... ...
... ...

نوک خار

صمد رحیمی

اشفاق سے میری دوستی نہیں، بلکہ یوں ہی سی جان پہچان تھی۔ وہ مجھ سے عمر، تعلیم، مالی اور سماجی حیثیت ہر لحاظ سے بڑا تھا اور مجھے اپنے سے بڑوں سے ملنے جلنے کا شوق ہے۔ اس لئے زیادہ میل جول بڑھانا میرے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ عمر تھا کہ میں اس سے تعلق خاطر استوار رکھوں۔ اس لئے جب کبھی وہ مجھے ملتا اس طرح پیش آنے کی کوشش کرتا کہ مجھے اپنے آپ پر اخلاقی طور سے برتر ہونے کا یقین سا آجاتا۔

دیکھنے میں وہ قوی الجثہ، ہر لحاظ سے تنومند تھا اس نے عام رائے یہی قائم کی جا سکتی تھی کہ اس کی گھریلو اور ازدواجی زندگی بھی بڑی پر لطف اور پر سکون گزرتی ہوگی۔ لیکن پرکھنے پر اس کے بڑے ناہموار اور ناخوش گوار گزر رہی تھی ایک دن اس نے کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے اپنے متعلق بہت سی باتیں بتلائیں اور یہ بھی بتلایا کہ عقیدہ اس کی بیوی نے ایک ناگہانی حادثے کے تحت اپنی شدید بدکھوی ہے۔ اس کی نسبت اب عام رائے یہی قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ خیط الحواس اور کسی بڑے جنات کے چپیٹ میں آچکی ہے حالاں کہ اس پر چارے نے دعا، تعویذ، گنڈا اور علاج کروانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن افاقے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے وہ گھر سے کم باہر سے زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔ اس طور پر بڑا تانک کر کم از کم اس کے جذبات سفلی کی کچھ نہ کچھ ضرور تسکین ہو جاتی تھی۔

ایک شام میں وزیر باغ میں اس کے ٹی اسٹال پر بیٹھا چائے کی گھونٹ پر گھونٹ لے رہا تھا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے اور کھانا کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ شاید اس دن شب برات تھی اس کی کوئی قریب تھی۔ مجھے تیج تیوہار سے ذرا کم ہی دلچسپی رہتی ہے۔ اس لئے میں اس کے حدود اربعہ اور محل وقوع سے کم ہی واقف رہا کرتا ہوں۔ بہر حال صاحب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے جانا اور کھانا کھانا پڑا۔ میں لاکھ انکار کرتا رہا لیکن وہ کب میری سننے والا تھا۔

گھر پہنچ کر اشفاق نے آواز دی۔ کسی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ اس کی بہن تھی یا بیوی اس نے مجھے تھوڑی دیر باہر ٹھہرا کر اندر آنے کی دعوت دی کمرہ کوئی بڑا نہیں تھا۔ بس ایک سائیڈ بورڈ اور بادبی خانہ تھا جس میں کل کائنات تھی جس میں کل تین نفوس سانس لے رہے تھے۔ میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو اس نے تھوڑا سا حلوہ اور کچھ نمکین ایک پلیٹ میں لا کر میرے آگے رکھ دیں اور برخوردار قسم کے لوگوں جیسی صورت بنا کر مجھے فرمائش جاں کرنے کو کہا۔ میں نے ساتھ دینے کے لئے اصرار کیا تو معذرت خواہ ہوتا ہوا بولا "ابھی شکم سیر ہو کر چلا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ تکلف برطرف، کہئے تو زیادہ پیش کروں ——؟"

ابھی اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ ایک دلدوز چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ اشفاق ہڑبڑا کر کمرے سے باہر لپکا۔ وہ ایک جوان عورت کو کندے کا سہارا دیئے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا اور بغل میں شاید اس کی بہن بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ خاتون فرش پر ابھی تک مٹی کا ڈھیر طاری تھا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ پانی کے چھینٹے برابر دیئے جا رہے تھے۔ اس نے ذرا آنکھ کھولی اور متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر کوندی اور وہ تڑپ کر اس کے پہلو سے نکل بھاگا۔

اشفاق یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے مجھے کمال عاجزی سے ڈاکٹر بلانے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر نے ہسٹیریا اور ہر سام قسم کی بیماری کی اعداد سے کر چلتا بنا۔!

"بھائی اشفاق! یہ بیٹھے بٹھائے بھابی کو کیا ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ کہی تو نہیں" اور وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا "اکثر ایسا ہوتا ہے" اس نے جواب دیا اور اپنی انگلیوں کے پوروں کو گننے لگا۔

میں نے دیکھا ان ہاتھوں میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں قلم تراش کے چند ایک نشانات ضرور تھے ویسے وہ ایک معمولی ہاتھ تھے، کھردرے، موٹے، جفاکار قسم کے ہاتھ "جی حضوری" اور قصیدہ کہنے والے ہاتھ۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ رات خواب میں بھی مجھے انہی ہاتھ نظر آئے۔ عجیب و غریب ہاتھ۔ گندے، موٹے اور میلے چکٹ ہاتھ۔ گورے چٹے خوبصورت ہاتھ بدصورت ہاتھ خوبصورت ہاتھ۔ موسیقی گھولنے اور رس ٹپکانے والے ہاتھ۔ امرت برسانے اور زہر کا پیالہ پلانے والے ہاتھ جنگ باز ہاتھ۔ امن پسند ہاتھ۔ رنگین ہاتھ، خونی اور ہاتھوں کا یہ ملاقات ہی سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب کہ میری بیوی نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔

"اجی، یہ ہاتھ ہاتھ کی رٹ آپ کو لگا رہے۔ کہیں جوتش وتش دیا تو آج کل نہیں سیکھ رہے ——؟"

میں نے کھسیانی نکال کر اپنی خفت مٹائی۔

"لاؤ تو تمہارا ہاتھ دیکھوں ——!"

"اجی رہنے دو، میرے ہاتھ آپ سے بدرجہا وہیں کم از کم گھر کا کچھ کام کاج تو سنبھال لیتے ہیں!

کیا ہے وہ سب کچھ پیچھے سارا وقت قلم گستاخی میں برباد کرتے ہیں۔ پھر بھی حوا کی کوئی بھی بیٹی نہ لیا ایک نہ دینا دو۔ کچھ تو ڈھر کی تو کرو۔ کب تک ایسے پتلے بنے گا ——"

میں نے دیکھا کہ معاملہ خطرناک مرحلے پر آن پہنچا ہے اس نے بحث فضل خدا کی راہ لی۔ کم از کم بیری کے آپریشن سے تو یہاں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ویسے کچھ بھی کہئے بیوی ہوتی ہے سب کی چہ کلام، چاہے وہ چچا غالب کی ہو، یا صدر حیدر کی ——

لیکن اس نے بات پتے کی کہی تھی، اس لئے مجھے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا پڑا۔ عجیب اتفاق کہ انہیں دنوں میرے ایک ٹریننگ کالج کے دوست نے مجھے ٹیلی گرام دے کر بھاگل پور بلوایا۔ شاید ان کے کالج میں انسٹرکٹر کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ میں نے کوشش شروع کر دی اور گڑی سفارش کے بل بوتے پر لے لیا گیا —— !

رہائش کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ تھوڑی دیر تو اسی دوست کے یہاں گذار دی۔ لیکن تا کے گھر بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہم نکلے نہیں بلکہ نکالے گئے۔ صاحب میں نے دیکھا کہ اس طرح اب کام چلے گا نہیں، تو کیوں نہیں سنجیدگی کے ساتھ کوئی ٹھکانا، سستا مکان ڈھونڈ لیا جائے۔ شاید ڈوبتی کو طرح، مکان کے دروازے بھی کھل جائیں۔ تو صاحب! وہ جو کہا ہے کسی نے، خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے، تو مجھے آپ کے اسی بستی میں ایک لمبا چوڑا ڈھنڈھار مکان مل گیا جس کے ایک طرف خانہ بانک معاف بڑھیا رہتا تھا اور دوسری طرف ویرانے کے متصل یار محمد فضل خانے کے ساتھ ایک کمرہ مجھے الاٹ کیا گیا تھا —— صاحب مکان کیا تھا غالب کے اس شعر کی اچھی خاصی تشریح تھی۔ گھر کو دیکھ کے بیاباں یاد آیا۔

دن تو جوں توں کاٹ ڈالا۔ یعنی کچھ بازی کی نذر ہو گیا کچھ بات —— رات کا تصور ہی کم سے کم انگیز نہیں تھا خوبصورت آوازیں سننے میں آتیں، اف فی آواز

کا ایسی خوفناک ارائی سنائی دیتی کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے بعض وقت کچھ اس قسم کی کھڑ بڑاہٹ اور قدموں کی چاپ سنائی دیتی۔ جیسے ابھی ابھی چھت اور دیوار کے بیچ کی طرف کوئی گیا ہو۔

میں نے بڑے یاس سے دریافت کیا لیکن انہوں نے کمال صفائی سے کام لیتے ہوئے انکار میں جواب دیا۔ اور کچھ ایسی دلیلیں پیش کیں کہ مجھے ان کی باتوں پر ایمان لے آنا پڑا۔

دھیمی دھیمی لالٹین کی روشنی چھوڑ ہی گئی۔ میں نیم غنودگی کے عالم میں پڑا تھا۔ چھت کے سے چمنی ٹوٹی اور چاروں طرف گھور تاریکی چھا گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرا کوئی گلا دبوچ رہا ہو۔ پھر یک بیک زور سے ہنسنے کی آواز ابھری۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ میں نے حلق کی پوری طاقت سے بڑے میاں کو آواز دی۔

"یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے ——" میں نے دل میں سوچا اور واقعات کی کڑیاں ملانے لگا۔ لیکن میری ہر شنودی کوشش رائیگاں گئی۔

اسی حیص بیص میں صبح ہو گئی۔ نور خان چمن خوش الحانیاں کر کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے لگے۔ میں اسی عالم استغراق میں پڑا تھا کہ بڑے میاں کھنکھارتے ہوئے وارد ہوئے۔

"میاں صاحب زادے! مزاج کیسے ہیں، اچھے تو نظر نہیں آتے آپ۔ رات تو آپ بہت زیادہ گھبرا گئے تھے بھئی بات یہ ہے کہ انسان کو فکر و تشبیہات قسم کی کچھ زیادہ ہی گھیرے رہتے ہیں۔ ایک طرف کہنے کو آدمی چاند پر اڑا جا رہا ہے، دوسری طرف اپنے سایہ سے بھی خوف کھانے لگا ہے حالاں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ یہ بات دیکھنے میں نہیں آنی چاہئے۔ آدمی کو نڈر اور بے باک ہونا چاہئے میرے بھتیجے کو آپ نہیں جانتے —— وہ بھی اسی کی ..... ——" اور ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے موتی کی لڑیاں گرنے لگیں —— "میرے ایک عزیز تبدیل ہو کر یہاں آئے، میاں بیوی تھے۔ اللہ داہی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے سمجھا غریب اچھی گزرے گی اور اپنا گھر سمجھ کر آباد سا دیکھے گا کیونکہ اپنے یہاں بھتیجے اصغر کے سوا دوسری کوئی اولاد نہیں تھی۔

اصغر آپ ہی کے کالج کا طالب علم اور ہماری پیری کا معتقد تھا۔ بھابی پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ بھی اسے کم عزیز نہیں رکھتی تھی بڑی ہنس مکھ اور خوش قسم کی لڑکی تھی جب بھی اکبر باہر ہوتا۔ اصغر بھابی کے پاس گھسا۔ طرح طرح کے کھیل کھیلتا رہتا۔ کبھی لوڈو کبھی کیرم کبھی تعلیمی تاش۔ دونوں خوب پیسیاں بگھارتے لطیفے اور چٹکلے کہتے۔ میرا گھر خانہ ویران سے کم نہیں تھا ان لوگوں کے دم سے تھک جلال کے رہ گیا تھا۔ ایک دن بھابی کے پاس میٹھی ڈبیا چ لارنس کو سنا رہا تھا میرے کانوں میں کچھ اس قسم کے فقرے پڑ رہے تھے۔

"محبت ایک جسمانی اور روحانی جذبہ ہے۔ اصغر اسے جسم سے نہیں روح سے لگاؤ ہے۔ اس لئے محبت میں شہوانیت ڈھونڈھنے والے پاگل ہیں ——!"

لیکن اصغر کہے جا رہا تھا۔

"بھابی! آج کل زمانہ بدل گیا ہے اس لئے نظریۂ حیات میں بھی کافی تبدیلی آ چکی ہے۔ آج کے ادیب کا کہنا ہے کہ کچی محبت کی بنیاد جنسی تحفظ پر ہے۔ بغیر اس کے کچی محبت کا تصور کیا اس ہے ——!"

میں نہیں کہہ سکتا۔ بات کیا ہوئی، کیا دیکھتا ہوں اکبر، اصغر پر پل پڑا ہے۔ مار جوتے، لات اور گھونسے کے اور مار کر بھگا دیا ہے۔ نیٹوا دبائے اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔

میں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا لیکن میرے ہاتھ پر بھاوی زخم کیا۔ یہ نشان جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ اسی منحوس گھڑی کی یادگار ہے۔ شکیلہ اور اس کی جنین بچہ کے ساتھ ہی حادثہ پیش آیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اکبر پر اس وقت کون سا بھوت سوار تھا کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں اصغر کا چہرہ

باقی صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیے

طرحی مشاعرہ نمبر ۶۳

مصرعِ طرح

میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

غزل کے ہمراہ لفافہ اندراجِ مشاعرہ، یا اس کے متبادل جوابی لفافہ ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیے

ناظمِ مشاعرہ
حضرت مولانا آبر احسنی گنوری

سید کرامت حسین احسنی فتحپور آبادی

یہ آگ عشق کی لگ جائی تو کیا ہوگا — کسی کے حسن پہ آنچ آگئی تو کیا ہوگا
مری طرف بھی کبھی آگئی تو کیا ہوگا — نگاہِ ناز جو ترچھا گئی تو کیا ہوگا
خطا ہے جب کسی محفل میں مسکرانا بھی — یہ سوچتا ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
ابھی تو تیرِ جدل کو قرار ہے میرے — جو یاد آپ کی تڑپا گئی تو کیا ہوگا
کسی کے دل کو دکھانا کبھی نہیں اچھا — لبوں پہ آہ اگر آگئی تو کیا ہوگا
یہ ہوتی ہے کبھی دل پر ضرور گرتی ہے — نظر نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نظر سے کیوں دلِ نازک کو گرگداتے ہو — یہ بے ادب ہے ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

برہمن شیریں سخن پیالوی

حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا — مریضِ ہجر کو نیند آگئی تو کیا ہوگا
تمنائے عیش کو ہے وقف زندگی میری — طبیعت اس سے بھی گھبرا گئی تو کیا ہوگا
جگا کہ خوب ہے خلد ان کی بزمِ ناز کے بعد — اسی کی خلد میں یاد آگئی تو کیا ہوگا
تری نگاہ کی مستی عجیب مستی ہے — مجھے شراب میں نہلا گئی تو کیا ہوگا
نگاہِ ناز سے دو کام کم خدا کے لئے — کسی کی روح کو برما گئی تو کیا ہوگا
تغافل آشنا ہے کیوں سوزِ دل کی قدر کرو — یہ آگ سینہ میں کب لگا گئی تو کیا ہوگا
نظر جھکا کے کرو سوز سے نہ تم باتیں — یہ اس کے دل کو ادا بھا گئی تو کیا ہوگا

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری

خزاں یہ شکلِ بہار آگئی تو کیا ہوگا — جنوں سے میرے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
ابھی تو جانِ حزیں بندشوں پہ راضی ہے — جو بندشوں سے وہ گھبرا گئی تو کیا ہوگا
حریمِ ناز کے پردے تو اٹھنے والے ہیں — نگاہِ شوق ہی ٹھہرا گئی تو کیا ہوگا
سنا رہا ہوں میں روداد غم جگا ہوں سے — نگاہِ ناز جو شرما گئی تو کیا ہوگا
میں دور ہا ہوں مقدر کو اور دوست ہے خوش — خدا نکردہ ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
یہ جان بوجھ کے تجھ کو بھلا رہا ہوں مگر — جو خود بخود تری یاد آگئی تو کیا ہوگا

نہ چھیڑ بادۂ کہنہ مست دل حزیں کو نہ چھیڑ
لبوں پہ آہ اگر آگئی تو کیا ہوگا

صادق سیمابی - بھنڈ

حیات یاس سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا — فراق ہی میں قضا آگئی تو کیا ہوگا
تمہارے شوق نے تم سا بنا دیا ہے مجھے — جو اب کسی کی نظر کھا گئی تو کیا ہوگا
مرے جنوں پہ ہنستے ہیں دیکھنے والے — مجھے بھی ان پہ ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
کہاں تک آپ کی آمد کا انتظار کریں — ہماری آنکھ جو پتھرا گئی تو کیا ہوگا
نگاہِ خفیف سے اے دوست یوں سمت نہ دیکھ — حیات خوف سے تھرا گئی تو کیا ہوگا
ابھی قفس سے رہائی کی کچھ امید نہیں — ابھی چمن میں بہار آگئی تو کیا ہوگا
مجھے ادب ادب کی صلاح دیتے ہیں — میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
چلا ہوں میں پئے دیدار یار اے صادق — نظر نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

علامہ بیاک مانی گاؤں

کلوٹی شکل سے اپنی نہ تم اٹھاؤ نقاب — اندھیری رات جو شرما گئی تو کیا ہوگا
نہ جانا بھول کے اے شیخ بزمِ ساقی میں — طبیعت آپ کی للچا گئی تو کیا ہوگا
دعائے موت مرے حق میں کر رہے ہو مگر — تمہیں ہی موت کہیں آگئی تو کیا ہوگا
چمک چمک کے حسینو نہ تم چلو ، ورنہ — کرم تعاری جو بجلی کھا گئی تو کیا ہوگا
یہ سوچتا ہوں کہ مرنے کے بعد روح مری — اندھیری قبر میں گھبرا گئی تو کیا ہوگا
بس اتنا سوچ کے بیباک کانپ جاتا ہوں — طبیعت ان پہ مری آگئی تو کیا ہوگا

کریم اسعدی بھاگلپوری

خزاں چمن میں اگر چھا گئی تو کیا ہوگا — ہوا کی کہیں مرجھا گئی تو کیا ہوگا
کسے خبر ہے کہ قیدِ قفس میں اے ہمدم — گلوں کی یاد اگر آگئی تو کیا ہوگا
یہ تیری یادِ مسلسل اور اس پہ تنہائی — طبیعت ایسے میں گھبرا گئی تو کیا ہوگا
ہمارا زخمِ جگر دیکھ کر سرِ محفل — نظر تمہاری جو شرما گئی تو کیا ہوگا
سنا رہا ہوں فسانہ تو درد دل کا انھیں — شکن جبیں پہ اگر آگئی تو کیا ہوگا
کریم پھر نگہِ ناز اس ستمگر کی — دلِ خراب کو تڑپا گئی تو کیا ہوگا

حکیم عبدالباقی حکیم پوربنی

چمن میں دل کے خزاں آگئی تو کیا ہوگا — کسی مراد کی مرجھا گئی تو کیا ہوگا

اب شبستاں میں اس ستم گر کے — ہمارہ آہ اگر چھا گئی تو کیا ہوگا
خیالِ یار سے دل میں سرور ہوتا ہے — نگاہ ان سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
یہ مسکراتے اگر ہیں تو پھول کھلتے ہیں — کبھی جو ان کو ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
جہاں ان کا سریر بزم اک تقاضے ہے — میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
خیالِ وصل سے دل گدگدا رہا ہے حکیم — اگر وہ ساعتِ نیک آگئی تو کیا ہوگا

یہ کس قدر حیراں اداں ..... بات انگیز شعر ہے — آبرو حسنی

منظر ابروی رحمانی

زندگی نو میں خود آگئی تو کیا ہوگا — زمیں فلک سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
وائے حسن مجھے بھا گئی تو کیا ہوگا — بغیر مانگے قضا آگئی تو کیا ہوگا
ہماری بات دلوں میں رہے تو اچھا ہے — یہ بات لب پہ اگر آگئی تو کیا ہوگا
ہے لزم ترکِ مئے و جام پھر بھی لیکن — جو میکدے پہ گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا
وہ سنی ہوں اب ان حسین ماضی بہاروں سے — خزاں پلٹ کے اگر آگئی تو کیا ہوگا
رکھ دیا کے محبت کو اس قدر منظر — یہ آگ سینے میں کھلا گئی تو کیا ہوگا

آن انصاری سلطان پوری

نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا — فضا میں برقی سی لہرا گئی تو کیا ہوگا
ہوا دل تھیں انسانہ حیات مگر — تمہاری روح جو تھرا گئی تو کیا ہوگا
بچا کر نہیں دیتا تری جفا کا جواب — وفا کے نام پہ آنچ آگئی تو کیا ہوگا
ہے سامنے ناصح میں کر تو لوں توبہ — جو میکدے پہ گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا
ہوں کہیں ان کو دیکھ کر الطاف — زباں پہ دل کی جو بات آگئی تو کیا ہوگا

شہزاد خاں شہزاد بہرائچی سیتاپور

اپنی زلفوں کی گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا — کسی کی یاد جو تڑپا گئی تو کیا ہوگا
ہے گر یہ ہنگامہ کوئی برپا ہو — نظر، نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نکالے اپنا جو دور محفل سے — میں بے ادب جو ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
اٹھا گئی یہ نرگس کی شان دیدہ ور — بہار بن کے خزاں آگئی تو کیا ہوگا
ہوا کے بھی دل میں یہی ہے خوف شہزاد — چمن میں اپنے خزاں آگئی تو کیا ہوگا

ناظر کاس گنجوی۔ مالی گاؤں

یہ لب پہ آگئی تو کیا ہوگا — ہماری یاد اسے آگئی تو کیا ہوگا
تمنا ہی کسی کی شوخ ادا — دل و نگاہ کو تڑپا گئی تو کیا ہوگا
یہ دبا دبا ہوں آہ سینے میں — کہیں یہ عرش سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
تو بھی تیرگی ارے توبہ — دل و نظر مرے چھا گئی تو کیا ہوگا
کہے فانوس داستاں پہ ہوئی — انھیں بھی اس کے ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

اسماعیل ذبیح مالیگانوی

فضا پہ کالی گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا — جو قہر جام سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نہ لے کے چل مجھے اے شوق بزم جاناں میں — کچھ ادا دل کو ادا بھا گئی تو کیا ہوگا
کبھی یہ سوچا ہے تو نے بھی اے ستم ایجاد — جو روح سینے میں گھبرا گئی تو کیا ہوگا
نقاب رُخ سے ہٹا ذرا تم خدا کے لئے — نظر نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
ذبیح ان کی جفا بھی ہے زندگی میری — کہیں جفا ہی کمی آگئی تو کیا ہوگا

محمد عالم سلطان پوری

تمہاری یاد اگر آگئی تو کیا ہوگا — جگر میں آگ سی بھڑکا گئی تو کیا ہوگا
یہ سوچ کر نہیں آتا تمہاری محفل میں — میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
میں دل ہی دل میں یہ بڑھتا ہوں اور سوچ کر تا ہوں — جو دل پہ غم کی گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا
زمانہ سن کے ہمارا فسانۂ دل کی کبھی — خدا نخواستہ مُرجھا گئی تو کیا ہوگا
ہمارے دل میں جو روشن ہے آتشِ الفت — یہ سوچتا ہوں وہ بجھا گئی تو کیا ہوگا

شمس الحق صدیقی قمر۔ فتح پور

حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا — بہار ہی میں خزاں آگئی تو کیا ہوگا
عہدِ الم میں تری زندگی کی راہوں میں — تمہاری یاد بھی اور آگئی تو کیا ہوگا
ہمارے حال پہ ہنستے ہیں آج اہلِ چمن — ہمیں بھی ان پہ ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
اسی خیال سے ہیں شوق عرض کرنہ سکا — تری جبیں پہ شکن آگئی تو کیا ہوگا
بچا رہے ہو قمر جام و مے سے اپنی نظر — جو چشم یار کی شہ پا گئی تو کیا ہوگا

محمد علی عاجز ہینگنگھاٹی

نگاہ آپ سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا — شکست میری نظر کھا گئی تو کیا ہوگا
چلا تو ہوں تری محفل سے زندگی لینے — حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
وفا کا ذکر تو جہ طلب سہی لیکن — کسی کو یاد جفا آگئی تو کیا ہوگا
جنوں تو غیر جنوں ہوش بھی نہیں عاجز — اب ایسے وقت بہار آگئی تو کیا ہوگا

ناشر طالب انصاری جبل پور

تمہاری زلف جو بل کھا گئی تو کیا ہوگا — قیامت اور کوئی آگئی تو کیا ہوگا
چراغِ شام نہ روشن ہوا تو بات یہاں پہ — اداسی اور یہاں چھا گئی تو کیا ہوگا
ابھی تو نام بھی لینے سے تم کو نفرت ہے — زباں پہ میری غزل آگئی تو کیا ہوگا
ہے جن کی یاد وہ آتے ہیں بزم میں طالب — طبیعت اور بھی گرما گئی تو کیا ہوگا

شرر سلطان پوری۔ احمد آباد

نظر فریب کہیں کھا گئی تو کیا ہوگا — انھیں بھی شرم و حیا آگئی تو کیا ہوگا
میں توبہ کر تو رہا ہوں مگر مرے ناصح — جو بعد توبہ گھٹا چھا گئی تو کیا ہوگا

یہ ان سے ترکِ مدوسم کرتو لیں لیکن
پھر ان کی یاد جو تڑپا گئی تو کیا ہوگا

چمن میں کرتو رہے ہیں تعمیرِ آشیاں اپنا
بہار بن کے خزاں آگئی تو کیا ہوگا

محمد یامین ویر آزادی

نظر جو کاہے سے بچتا ہوا محفل میں
نظر نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

نہ دیکھ آئینہ پیہم جہاں جاں بھی تو
تمہیں تمہاری نظر کھا گئی تو کیا ہوگا

حیات تم کو بڑی مصلحت میں ملتی ہے
خوشی کی چھاؤں میں غیرت آگئی تو کیا ہوگا

لہو پلا یہ گلستاں بہاروں کو
اگر چمن میں خزاں آگئی تو کیا ہوگا

محمد حسین عسکری دہلوی ۔ جو دہ پد

یہ کشمکش ہی ستم ڈھا گئی تو کیا ہوگا
جہاں تہاں سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

ادب ضرور ہے آئین انجمن کے لئے
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

محمد عثمان جدید لدھیانوی

کشید گی تو ہری شئے ہے پر وطن والو
فضائے دہر پہ مسئلہ لا گئی تو کیا ہوگا

نگاہِ جور سے واقف ہو کچھ چمن والو
شگفتہ شاخ جو مرجھا گئی تو کیا ہوگا

خدا کے واسطے سمجھو نہ تم محفل میں
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

صدیق شبنم شکوہ آبادی

میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا
مری ہنسی انھیں شرما گئی تو کیا ہوگا

کسی ۔ لغزِ پریشاں جو قلب مضطر کو
نئے فریب سے بہلا گئی تو کیا ہوگا

کسی کی بزم میں یہ فکر ہے مجھے شبنم
میں بے ادب ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

شبنم چھپروی ۔ کلکتہ

ہمیں ہے پاسِ ادب ورنہ ہم نہ جائیں گے
کسی کی یاد اگر آگئی تو کیا ہوگا

تلاش جس کی ہے، اے کاش ان کے پیش نظر
نظر فریب اگر کھا گئی تو کیا ہوگا

ایم شفیع عاجز

تو روبرو مرے چلتوں پہ کس کے نہ آ
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

میری بہن! تیری ہستی ہے بوجھ کے لئے
چھوڑ کسی کو تو آگئی تو کیا ہوگا

مصرع طرح طرحی مشاعرہ نمبر ۶۵

چمن میں چاہے جہاں رہوں مراقبہ ہے فصلِ بہار پر

بہار ۔ نگہار قوافی ——— پر ردیف

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ مئی ۱۹۶۲ء

مکتبۂ شعلہ و شبنم دہلی کی خصوصی پیش کش

صاحبِ طرز کہنہ مشق نامور شاعر حضرت ضیا فتح آبادی کا نیا مجموعۂ کلام

گردِ راہ

دو آرا ملاحظہ فرمائیے

(۱) ضیا صاحب کی شخصیت کو ان کے احساس اور وجدان میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ وہ جذبات کو موزونیت اور سلیقہ سے الفاظ کے پیرہن میں پیش کرسکتے ہیں لیکن وہ کشتۂ رومانیت نہیں۔ ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی خاندی کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے۔ نفاست اور نزاکت ہے۔ اس لئے ان کے لہجے میں دل آرائی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پرکاری اور ہشیاری سے زیادہ سادگی شدی ہے ——— (ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی

(۲) ضیا صاحب روایتی شاعر نہیں ہیں وہ ہر بات بلندی سے کہتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے اور خیالات لطیف ہیں۔ دل میں جذبۂ ہمدردی انسانی بے پایاں ہے اور ایسا شاعر ہر قوم کے لئے باعث فخر ہوا کرتا ہے مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا ——— آبر احسنی

قیمت :- ... ... تین روپے پچاس نئے پیسے

مکتبۂ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں ۔ دہلی نمبر ۶

مکتبۂ شعلہ و شبنم دلّی کی خصوصی پیش کش

صاحبِ طرز کہنہ مشق، نامور شاعر حضرت ضیار فتح آبادی کا نیا مجموعۂ کلام

گردِ راہ

دو آرار ملاحظہ فرمائیے

(۱) ضیار صاحب کی شخصیت کو ان کے احساس اور وجدان میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ جذبات کو موزونیت اور سلیقہ سے الفاظ کے پیرہن میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کشتۂ رومانیت نہیں، ان کے یہاں شوق کی بیباکی کے ساتھ انسانیت کی حنابندی کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے۔ نفاست اور نزاکت ہے۔ اس لئے ان کے لہجے میں دل آرائی اور مٹھاس ہے اور ان کی شاعری میں پرکاری اور ہشیاری سے زیادہ سادگی و سرشاری ہے ——— (ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی

(۲) ضیار معمولی شاعر نہیں ہیں۔ وہ ہر بات بلندی سے کہتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے اور خیالات لطیف ہیں، دل میں جذبۂ ہمدردیٔ انسانی بے پایاں ہے اور ایسا شاعر ملک و قوم کے لئے باعثِ فخر ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس نے ایسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا ——— آبرو احسنی

گردِ راہ آج ہی طلب فرمائیے

قیمت ——— تین روپے پچاس نئے پیسے

مکتبۂ شعلہ و شبنم، دریبہ کلاں۔ دلّی نمبر ۶

شعلہ و شبنم دہلی

مئی ۱۹۶۴ء

زرِ سالانہ چار روپے
ششماہی دو روپے

جلد ۱۵
شمارہ ۵

ہیڈ آفس
دریبہ کلاں۔ دہلی نمبر ۶
فون نمبر
۲۶۴۷۴۵

نگراں حصہ نظم و مشاعرہ
حضرت مولانا آبر احسنی گنوری

ایڈیٹر
بمل جین

معاونین خصوصی
جوہر ہاشمی
خرد غوث پوری

قیمت
۲۵ نئے پیسے

فہرس

۱	راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر		مفتی کوڑی
۲	اصلاح		آبر احسنی
۳	ارشادات		نوح ناروی
۴	غزل		آمر سورتی
۵	مجھ سے نہ روٹھو		حسین اسیر جبل پوری
۶	ذکر مآل		دلکش امروہوی
۷	غزل		شیخ سلیم سورتی
۸	انکارِ نو		قمر محمد آبادی۔ شاداں کوڑی
〃	〃		ڈاکٹر نظام الدین نظام
۹	جلال و جمال		انور صدیقی۔ دبیر بھگانوی۔ ناصر کاشمی
۱۰	〃		قمر فتح پوری۔ سرور سلطانپوری۔ عادل ادیب
۱۱	انتقام در انتقام	(مہاساں)	مترجمہ روشن چٹیالوی
۱۲	غزل		ست فتح پوری
۱۳	خاموشی کی آواز		ظہیر کیفی
۱۳	دو غزلیں		مظہر نظامی — بدر القریشی
۱۴	پتھر کے آنسو		منزل لوہا ٹھیری
۱۵	میں مرجاؤں گا		محمد حسین سودائی
۱۶	تشنۂ محبت		کیف جہانسوی
۱۷	جینے کے لئے		یوسف عارفی
۱۸	طرحی مشاعرہ نمبر ۲	(مختلف شعراء کرام)	مرتبہ حضرت آبر احسنی گنوری

باہتمام شعلہ و شبنم پرنٹرز و پبلشرز دیال پرنٹنگ پریس، دہلی میں چھپ کر دفتر شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی سے شائع ہوا۔

JAMIA LIBRARY

مفتون کوٹوی

راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر

کوٹہ میں اردو مقامی ادبی تحریکات اور اردو ادارے

ی قسط میں مکتب اور مدرسے، کتب خانے اور زیر بحث لائے گئے تھے۔ اب اس ضمن میں اور یہاں ہوئے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف ۱۹۵۱-۵۲ء سے جامعہ اردو علی گڑھ کے ات کا سنٹر کوٹہ میں قائم ہے اور اس سنٹر نے کئی ں کو "ادیب کامل" بنا دیا ہے۔ پچھلے چار یا پانچ ور ہر سال تقسیم اسناد کا سالانہ جلسہ کی گھنٹہ گھر کوٹہ میں منعقد ہوتا رہا ہے۔ دو تین ں کا پروگرام ہوتا ہے۔ ایک روزہ اردو کے متعلق اور تقریریں، دوسرے روز مشاعرہ، تیسرے روز لاکار۔ باہر کے شعراء کو بھی شرکت مشاعرہ کی ی جاتی ہے۔ منشی فضل احمد قلعی کی سرگرمیاں اس ہی جانے جانے کے قابل نہیں سعید الحکیم قلعی اور ظفر حسین ضیم بھی اس کے مخلص و سرگرم کارکن ہیں ا حسین انصاری اور محمد حسین ایڈوکیٹ کے ا تعاون دے رہے ہیں اور اب بھی ان کی توجہات ا حال ہیں۔

امتحانات جامعہ کی شاخ باران میں بھی قائم ہے۔ ے بہتر انتظام سے امتحان شروع ہونے سے قبل ایک معلم کی خدمات حاصل کر لی جاتی ہیں لاؤں کی رہنمائی کرتا ہے۔ تقسیم اسناد کا جلسہ ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کتب ں مراکز طلبا کو معمت مہیا کرتے ہیں۔ اندر تحسین ہے۔

ں انجمن ترقی اردو کی شاخ بھی قائم ہے۔ سال بڑے زور شور سے منایا جاتا رہا ہے۔ ے معزز شعراء کے اعزاز میں اکثر نشستیں ا کیا۔ سرکاری اسکولوں میں اردو جاری کرانے حالۂ کوشاں رہتی ہے۔ باراں میں یہ شاخ قائم

ہ اضلاع کی شاخ کوٹہ کا قیام بھی اردو تحریروں اور تقریروں کا سلسلہ اپنے دامن رکھتا ہے ——— یوم النبی کے جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بیرونی علماء کرام تشریف لاتے ہیں، اپنے مواعظ سے، فریضۂ تبلیغ کے ساتھ بالواسطہ نشست و شائستہ اردو کی اشاعت کا بھی باعث ہوتے ہیں بعض مرتبہ فقیہ مشاعرے بھی ان جلسوں کے پروگرام میں داخل ہوتے ہیں۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کے مراکز کوٹہ اور باراں دونوں جگہ قائم ہیں۔ دونوں جگہ نصاب کی کتابیں مہیا ہیں اور امیدواروں کو امتحانات کی تیاری میں مدد پہنچاتی ہیں۔ مرکز باراں میں مدرسہ اسلامیہ کی جانب سے جس کے تحت یہ مرکز قائم ہے، امتحانات سے دو تین ماہ قبل معلم کا بھی انتظام ہوتا ہے جو امیدواروں کو امتحانات کے لئے تیاری کراتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ہاتھوں کوٹہ میں برمکان وکیل محمد ابراہیم خاں صاحب مرحوم مولانا آزاد لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ کتابیں کافی مہیا ہو چکی ہیں۔ ابھی مزید کتابیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ عقیل احمد شاداب، ظفر خیری، پرواز فریدی اور توفیق کوٹوی ایسے نوجوان اور ہونہار اردو پرست اس کے ارتقاء و ارتفاع میں بڑے خلوص کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ ساتھی نوجوانوں نے تعلیم بالغان کا سلسلہ بھی بعد سہ اسلامیہ کوٹہ میں قائم کیا ہے۔ ایک اردو رسالے کا اجرا بھی ان کے زیر غور ہے، خدا ان کو اس میں

سیلانی نوجوان پارٹی بھی مذہبی جذبات میں نکھار پیدا کرنے کے ساتھ اردو نثر و نظم کی اشاعت کا دیرینہ سلسلہ رکھتی ہیں اور یہ پارٹی کوٹہ میں کئی ہیں شمس الدین صاحب، حافظ اکبر صاحب، مولوی مفلح صاحب کی پارٹی سیلانی شریف، مرزا پڑھتی ہے۔ شاعر کی موجودگی میں اس کا کلام اس طرح پڑھا جانا، مفید اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

بعض شخصیتیں مستقل ادارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ لوگ اپنا حلقۂ اثر بہت جلد پیدا کر لیتے ہیں اصحاب کے علم و فن سے اکثر لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔ بڑا فن کار ہونا اور بات ہے اور بڑا استاد ہونا اور بات۔ استادانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں مرزا افضل حسین ثابت لکھنوی سے اکثر بافیض حضرات شعر و ادب میں استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ مدرسہ کے سلسلۂ ملازمت اور پھر یہ سلسلۂ کالات کوٹہ میں تا زندگی رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ اصل بافندہ لکھنؤ کے تھے اسی قسم کی ہستی سوری مظہر الہادی سہیل کی تھی جو مکان

تعلیم میں ملازم تھے اور اسکول میں ہیڈ مولوی تھے انھوں نے یہی لوگوں میں علم و ادب کا صحیح مذاق پیدا کیا اور نابینا ولی کو ان کے مجموعہ کے مطابق بطور خاص لکھا دیا۔ جناب غلام رسول کو فارسی اور اردو شعراء کا کلام یاد کرایا۔ یہ محفل سماع کی جان تھے۔ خوش فکر اور خوش مذاق انسان بھی۔ جناب جہان محمد صاحب حافظ قرآن تھے اور ان کے یہاں محفل ادبی صحبت سے مستفید ہو کر بڑے اچھے وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک نابینا ایک طرف دوسرا دوسری طرف درمیان میں مولوی صاحب بازار میں جا رہے ہیں، مولوی صاحب دونوں کے رہنمائے ظاہری و باطنی تھے۔ یہ

عبدالرشید خاں وحشی نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے اب بمبئی چلے گئے ہیں لیکن جب تک کوڈہ میں رہے۔ یہاں کی ادبی محفلوں کے روح رواں بنے رہے۔ جس محفل میں بیٹھے اپنا رنگ جما کر اٹھے جن احباب کے ساتھ اٹھا بیٹھا انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اور انھیں بھی شاعر کا جوڑ دیا۔ طبیعت رسا، دماغ حاضر ذوق صحیح اور شوق فراواں۔ اپنے گرد ایک اچھا خاصہ حلقہ بنائے رکھتے۔ جو بزم ادب کوڈہ کی زندگی و طاقت بنا رہتا۔ ماسٹر محمد سلیمان رہبر جب تک کوڈہ کے اسکول میں مدرس رہے، اپنی نویں، دسویں جماعت کے طالب علموں سے تقریری مقابلے کرواتے، غالباً ہر اتوار کو دارالخیر کے کمرے میں مقابلے ہوتے۔ انھیں کے جمع کئے ہوئے چندہ سے کچھ اشیاء خرید لیتے اور کامیاب طلباء کو بطور انعام تقسیم کرتے۔ امیر محمد اختر نے جماعت کے اردو طلباء اور اپنے محلہ کے اردو خواں ساتھیوں کا گروہ تھا، اپنے ذوق ادب کی روح سب میں عام کر دی۔ بزم عشرت قائم کی اور اس کے تحت بیت بازی کی پارٹی بنائی، اس کے جلسے اور مقابلے ہوتے تھے رسالہ نکالا اور پھر اس کی تقلید میں کئی طالب علم اس جانب متوجہ ہو گئے۔ صاحبزادہ یٰسین علی خاں نشاط کوڈوی کلکٹر جالندھر ہو کر کوڈہ تعینات ہوئے۔ تین چار سال تک کئی تشنگان ادب کی سیرابی کا باعث بنے رہے۔

۱۹۵۰ء میں تبدیل ہو کر کوڈہ سے اودے پور چلے گئے جناب عتیق شاد شاد میرٹھی مقیم کوڈہ جنکشن اردو علم ادب کے فریفتہ و شیفتہ تھے۔ بڑے پرانے اور تجربہ کار ماہر زبان بھی، واقف عروض بھی۔ ادیب شاعر دونوں نثر بھی لکھتے۔ شعر بھی کہتے۔ کوڈہ سے کئی اردو کتابیں انھوں نے شائع کیں۔ اخیر میں اخبار "نشاد" پندرہ روزہ نکالا۔ ڈیڑھ سال جاری رہا۔ نومبر ۵۹ء کو ان کی اچانک موت ہو گئی۔ کوڈہ کی ادبی محفلوں میں ان کی خالی آج بھی کھٹکتی ہے۔

قصبہ باران میں جناب عبدالرزاق ذکیل نے بھی اردو کی پرستاری کا عملی ثبوت دیا۔ مدرسہ اندلابریری کا قیام وغیرہ انھیں کی سرگرمیوں کے نتائج میں سے ہے انھوں نے مقامی ماحول میں اردو کے فروغ و ارتقا کی جہات نو جہات میں دل لگیں اور اس ضمن میں بزم ندیات بھی کوشاں رہے اور بعد میں بھی یہ کوششیں جاری رہیں تصبہ چھپا ئرد حافظ محمد سبحانی کا جولان گاہ رہا۔ اردو تعلیم کی جانب تاحیر امکان منہمک رہے، وہ ان دنوں پاکستان میں ہیں۔

اردو اداروں میں ان مقالوں کا بھی ضمناً تذکرہ کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، جہاں ادبی نشستوں کے انتظام و انعقاد کے مواقع بہم پہنچے۔ میر عثمان غنی مالی وکیل احمد حسین نہر سرر رفیع الرحمن حیرت اودوی سراج الحق سرکوچ بشیر احمد توفیق۔ منشی عبداللطیف لطیف کے مکانات اس سلسلہ کی تابناک کڑیاں ہیں یہ لوگ تو خود شاعر تھے۔ ان لوگوں کی مہربانیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ جو محض اس زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی بقا و ترقی کے دلدادہ ہیں۔ منشی جمیل احمد غنی یہ خوبیاں بخوبی فہم بہت اچھے ہیں۔ اردو کے پرانے خدمت گزاروں میں۔ ان کے یہاں بزم ادب کا مشاعرہ کئی برس چلتا رہا۔ ماسٹر جگدیش پرشاد کی ہندی کے فروغ نگار کوڈی ہیں۔ قلب و دماغ میں وسعت رکھتے ہیں اور اصحاب کی صحبت میں رہتے ہیں اور اسی لحاظ سے زبان سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں ان کے مکان پر ادب کے مشاعرے کافی دنوں تک منعقد ہوتے رہے محمد حسین ایڈووکیٹ نے اپنے مکان میں شاعروں مشاعروں کا ہمیشہ استقبال کیا بزم ادب کی نشست اب بھی ان کے وکالت خانہ میں ہوتی ہیں خود نہ لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ فیاض اردو پر متفق احباب کو اپنے اخبار کی نشستوں میں بلا بھیجتے ہیں بزم ادب بھی ان کی ہوتی ہے اور وہ احباب بھی جنھیں ان نشستوں اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

ایسا مقام جہاں شاعروں [illegible] برخاست اکثر و بیشتر رہے، ادارہ کی حیثیت [illegible] گا۔ میر عثمان غنی کی بیٹھک اس صلاحیت رکھتی ہے۔ طبیعت زندگی سے اکتا جائے [illegible] کی بھڑاس پیدا ہو شعر سننے پر دل مائل ہو [illegible] چلے جائیے، ایک دو پیغ تکلف احباب کو [illegible] ملیں گے۔ پھر حسب خواہش استفادہ کیجئے۔ شعر پڑھئے، شعر سنائیے داد لیجئے، مؤدب بیٹھئے بے تکلف لیٹ جائیے سامع ہو جائیے ہر قسم کی آزادی [illegible] نیم ادب کے ابتدائی مشاعرے [illegible] تنظیم المسلمین دیوبند کی [illegible] میر صاحب کا یہ مردانہ نشست احباب کے [illegible] اچھا مقام تھی۔ میر صاحب کے پاکستان تشریف لے جانے کے بعد اب وہ بھیتیں باقی ہیں۔ وکیل احمد حسین کا مکان بھی واقع کنڈ بھی حی کا پس احباب کے اجتماع کا مرکز رہتا۔ بزم ادب کے دہان بھی کئی مشاعرے تنقیدیں اور تقریریں۔ بیاضیں اور مقابلے ہوتے رہتے۔ وکیل صاحب بنائی سے [illegible]

نے اکثر ناول خود پڑھتے، انھیں سناتے۔ اور بھی ادبی کتابیں اجتماعی حیثیت سے دہلی مطالعے میں آئیں وہ کراچی سے مغرب کے بعد احباب وہاں اکٹھے ہوتے۔ اور اپنے اپنے ذوق و شوق کے تذکرے کرتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک سال واسوخت امانت وہاں پڑھی گئی۔ بعض دفعہ ایک ایک مصرعے کے صنائع و بدائع پر کافی دیر تک لطف اندوزی رہتی۔ بہت دنوں یہ سلسلہ قائم رہا۔ بعض دفعہ مصرعوں پر مصرعے لگائے جاتے اور تین گھنٹہ تک یہ شغل جاری رہتا۔ اور مصرعے ختم نہ ہو پاتے۔ شعروں پر تنقید ہوتی۔ مطالب سمجھے جاتے شاعر اگر موجود ہوتا تو اعتراضات کا جواب دیتا۔ قیس کو فنی اس زمرے میں یاد آتے۔ افہام و تفہیم کے سلسلہ میں لغات کھل جاتے۔ دراصل سرسند حاصل کی جاتی۔ اطمینان نہ ہونے پر باہر کے کسی استاد سے رجوع کیا جاتا۔ ہمارا طالب علمانہ دور بہر صاحب کی بیٹھک اور بہر صاحب کے مکان کی نشستوں میں انہی مشاغل کے ساتھ اکثر و بیشتر گزرا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہ باتیں بھی ختم ہوئیں۔ جناب ڈم ڈم کی دوکان شاعروں کی آماجگاہ رہی ہے۔ نشستوں کی اطلاعات اور شعراء سے ملاقات کے سلسلہ میں یہ دوکان بڑی اہم خدمت انجام دیتی رہی۔ ادبی جلسوں میں احباب یہیں اکٹھے ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ اس دوکان کے عقیدت مندوں اور تعلق رکھنے والوں میں آپ کسی سے کچھ کہنا چاہیں، ڈم ڈم صاحب سے کہہ دیجئے، رقعہ لکھ کر دے جایئے۔ مکتوب الیہ اور شاہد الیہ تک صحیح پہنچ جائے گا۔ کوئی کے کسی شاعر و ادیب سے ملاقات مقصود ہو اس دوکان کا توسط بڑا کام دے گا کوئی کے کسی شاعر و ادیب کا پتہ معلوم نہ ہو، اس دوکان کی معرفت اکتشاف کرے گی۔ شاعر اور ادیب اگر ادارہ ہو سکتا ہے، تو یہ دوکان ان اداروں کا ادارہ ہے۔

اس دوکان کا محل نہ تو اردو حلقہ کے لحاظ سے نہایت مناسب ہے گھنٹہ گھر بازار میں واقع ہے جہاں ان میں کم از کم ایک دو مرتبہ ہر شخص اپنی ضروریات کے لحاظ سے ادھر ہو کر گزرتا ہے۔ اول تو نیاز مند طبقہ خود یہاں حاضری دے کر یا کم از کم سلام پیش کر کے جاتا ہے۔ ورنہ ڈم ڈم صاحب تاکیں رہتے ہیں۔ ہاتھ کا اشارہ دیا۔ چلا کر آواز سے پکارا اور پیغام ادھر سے ادھر پہنچا دیا۔ کوئی ایک دو روز کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پیغام ضروری ہوا تو ادھر کے کسی معتبر شخص کو پیغام رسانی کی ذمہ داری سونپ دی اور خود سبکدوش ہو گئے اہم معاملات میں حاضری کا حکم پہنچا دیا۔ وہ حاضر ہوا اور گوہر افشانی فرما دی۔ کوئی باہر کسی مشاعرہ میں جائے گا، یہاں حاضری دے کر جائے گا۔ وہاں سے کامیاب آئے گا یا ناکام، یہاں حاضری دے گا سب روداد سنائے گا یہ اطلاعات کے فراہم ہونے کا مرکز بھی ہے اور براڈ کاسٹنگ اسٹیشن بھی۔ ان کا ایک شعر اس دوکان اور ان کے اپنے نظریہ کا آئینہ دار ہے ؎

عشق بھی ہوتا رہے دوکان بھی چلتی رہے
وقت ہو ڈم دم بسر آدھا ادھر آدھا ادھر

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

نقد و تبصرہ

نظارہ و خیال

بہار کے ۲۵ نئے پرانے شعراء کی ایک ایک غزل اور ۱۱ - ۱۱ مختلف اشعار کا مجموعہ مع تصویر و حالات شاعر مرتبہ اختر سانح نصیب۔ ناشر مکتبہ سہیل۔ گیا قیمت ۱/۵۰ صفحات ۱۰۴۔ خوش رنگ ٹائٹل پیج۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہتر۔

بہار نے شعر و ادب کے معاملہ میں ہمیشہ یو۔ پی کے دوش بدوش کام کیا ہے اور ہر دور میں بہتر اور نامور شعراء اور اساتذہ پیدا کئے ہیں۔ صحافت میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ آج بھی اس میں عمدہ فن کار کافی تعداد میں موجود ہیں۔

یہ مجموعہ بہار کی شعری زندگی کا ثبوت ہے۔ انتساب میں مرتب نے بڑا اچھا جملہ لکھا ہے "ان فنکاروں کے نام جو پردۂ خفا میں روح و قلم کرنے کے باوجود اس پردہ بیگانگی دور میں گمنام ہیں"۔ جذبات بہت اچھے ہیں مگر گم نام رہنے والوں میں بھی ایک کمی رہتی ہے۔ اول تو لوگ نہ کو طالب علم بن کر حاصل نہیں کرتے، دوسرے وقت سے پہلے ہی استاد بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسرے زمانہ کا ساتھ نہ دیتے ہوئے، رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت کی جد نہیں کرتے۔ یا کلام کو قابل اشاعت نہیں بناتے۔ اور اب تو یہ بیماری عام ہو گئی ہے کہ لوگ فخریہ کسی سے نہ سیکھنے کا اعلان کرتے ہیں۔ کاش وہ یہ بھی سمجھ سکتے کہ بغیر سیکھے گھاس کھودنی بھی نہیں آتی۔ ایک نہایت قابل ہونہار صاحب دماغ اور صاحب علم جواں سال ایسے ہی شاعر کا ایک شعر سنئے۔ اگرچہ اس شاعر کے اکثر اشعار بہتر ہیں۔

نہیں ہے خیر اب عقل و خرد کی لے .....
بڑھا رہا ہے جنوں ہاتھ دوستی کے لئے

اس میں عقل کا رخ دنیا سے ساقط ہو گیا ہے۔ اگر یہ ہونہار جوان کسی صاحب نظر سے مشورہ کا قائل ہوتا تو اس قسم کی خامیوں کا امکان نہ رہتا اور یقیناً مستقبل میں اس کا کلام سند میں پیش کیا جاتا۔ کیوں کہ فقدت نے اسے بہتر صلاحیتیں مرحمت فرمائی ہیں۔

اس مجموعہ پر مرتب نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں پیش لفظ اختر اورینوی نے لکھا ہے اور تقریظ طیب عثمانی مدیر موصوف نے

لاریب مجموعہ میں بہت سے اشعار صاف ستھرے اور بہتر ہیں اور مجموعہ اس قابل ہے کہ ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کو زینت بخشے ——— آبرو احسنی

حضرت خود غوث پوری کا پہلا مجموعۂ کلام

رنگ و بو

قیمت ——— ڈھائی روپے

مکتبہ شعلہ و شبنم - دریبہ کلاں - دلی

اردو شعری ادب میں گراں بہا اضافہ

نگینے کے بعد

یہ

آبر احسنی گنوری کی غزلیات کا دوسرا دیوان

جس میں

۲۲۵ غزلیں، ایک نظم اور متروکات کی مکمل فہرست ہے

عام دیوانوں سے تین گنا میٹر ہے۔!

قیمت صرف تین روپے ۲۵ نئے پیسے

غزل کا معیار کتنا بلند ہو چکا ہے، یہ قرینے کا مطالعہ بتائے گا

(ملنے کا پتا)

آبر احسنی۔ گنور۔ ضلع بدایوں (یو۔پی)

"شمس کنول ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے ساتھ ایک انتہائی باسلیقہ مدیر بھی ہیں۔ ان کا شعور ادارت داد و ستائش سے بالاتر ہے ــــ!" ــــــــــــــــــــ ڈاکٹر مظفر آہ

"شمس کنول کا پرچا عام روش سے ہٹ کر ہے اس میں بہت سی جدتیں اور ندرتیں ہوتی ہیں" رام آسرا ساگر

"گگن بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا جاتا ہے ــــ!" ــــــــــــــــــــ ماہر القادری

"میں تو ایشا کے ذریعہ محض کوشش کر رہا تھا مگر شمس کنول نے اس کوشش کو پورا کر دکھایا ــــ بون بیلیا

"میں نے زندگی میں اس طرح کا پرچہ آج تک نہیں دیکھا۔ گگن منفرد حیثیت رکھتا ہے، اور پھر میں کنول کی بیباکی کا تو قائل ہوں ــــ" ــــــــــــــــــــ امریک سنگھ مدیر پگڈنڈی۔

"گگن" کا اس لئے بھی انتظار رہتا ہے کہ یہ اور پرچوں سے مختلف ہے۔ تنوع اور گہرائی" ــــــــــــــــــــ ڈاکٹر آمنہ

"شاید دو ہی پرچے ایسے ہیں جو اپنے مدیران کے نام سے ہیں، نگار، (نیاز فتح پوری) اور گگن، (شمس کنول) شمس کا انداز تحریر نہایت مؤثر، شگفتہ اور توانا ہے ــــ!" ــــــــــــــــــــ شبنم رومانی

پہلا اُردو کل چرل میگ زین

ایک پرچا
پچاس نئے پیسے
بارا پرچے
پانچ سو پیسے

گگن بمبئی
ماہنامہ

نمونہ کے لئے
ساٹھ نئے پیسے

ایڈیٹر ــــــــــــــــــــ شمس کنول

خریدار یا ایجنسی کے لئے یہ پتا ہے ــــــــــــــــــــ

دی گگن میگ زین 39/40 بومبل بازار، کلیان۔ مہاراشٹر

ٹوکن شعلہ و شبنم طرحی مشاعرہ نمبر ۶۵

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ مئی ۶۳ء

مصرع طرح ــــ جس میں چاہے جہاں رہوں مراحق ہے فصل بہار پر

ردیف ــــ پر ــــ قوافی ــــ بہار، نکھار

نام ... ...

پتا ... ...

مصرع طرح انعامی مشاعرہ نمبر ۶۶

محبت میں زیادہ غم زیادہ غم نہیں ہوتا

غم، کم قوافی، نہیں ہوتا ردیف

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ جون ۶۳ء

برائے کرم اپنا طرحی کلام بواسطہ حضرت ماہر القادری گگن کے دفتر میں روانہ کیجئے۔ دفتر پہنچنے کی زحمت نہ اٹھائیے (ادارہ)

محسن دموہی کی غزل پر ابر احسنی کی اصلاح

مرے دوست اس پہ بھی غور کر مرے عشق نے تجھے ۔۔۔ ترے آستاں پہ جھکا کے سر اسے آسماں سے ملا

۱۔ (یہ نہ پوچھ عاشقِ زار نے تجھے عہدِ عشق میں) کیا دیا ۔۔۔ (ترے پائے ناز پہ رکھ کے سر تجھے اور اونچا اٹھا) دیا

۲۔ مجھے جب ملا ترا آسرا بڑھی اور جینے کی آرزو ۔۔۔ یہ ترا کرم کوئی کم نہیں مرے حوصلوں کو (مرے ہم نفس ترا شکریہ مرے حوصلے کو) بڑھا دیا

کسی آستاں سے غرض نہیں وہ حرم ہوں یا ہوں صنم کدے

۳۔ نہ جھکی کہیں بھی مری جبیں وہ کلیسا ہو کہ ہو بُت کدہ ۔۔۔ جہاں نقشِ پا ترا مل گیا وہیں میں نے سر کو جھکا دیا

اسی دھن میں عمر گزر گئی کہ نصیب اپنی ہو معرفت ۔۔۔ ایسا گماں ہوا

۴۔ میں تلاش کرتا رہا مگر مرا اپنا کوئی نشاں نہ تھا ۔۔۔ مجھے تم نے مل دیا

یہ روا ہے عشق ہے دوست کیا فدا ڈال اس پہ بھی روشنی ۔۔۔ (اپنا نشاں ملا) مجھے خود سے تم نے ملا دیا

۵۔ ترے رازِ عشق کا فلسفہ نہ سمجھ سکا کوئی آج تک ۔۔۔ ترے غم کو جس نے پناہ دی اُسے تیرے غم نے مٹا دیا

مجھے پہلے اس کی خبر نہ تھی کہ خوشی سے میرے دوست کو ۔۔۔ وہیں رو برو سے پا لیا

۶۔ نہ ملے وہ کعبۂ دیر میں۔ نہ ملے وہ محفلِ عام میں ۔۔۔ (دونے تو مجھ کو کہاں ملے) جہاں میں نے خود کو بھلا دیا

تری آرزو کی دو رنگیاں اسے غم کہوں کہ خوشی کہوں ۔۔۔ اس نے مجھ کو اس نے مجھ کو

۷۔ تا فہم تو مجھ کو ملا مگر۔ نہ سمجھ سکا میں یہ رازِ غم ۔۔۔ کبھی (تیرے غم نے) رلا دیا کبھی (تیرے غم نے) ہنسا دیا

جو رہا قفس سے میں ہو گیا تو پھر اس کا ہو گا مآل کیا ۔۔۔ جو چمن پہ تھا بجلیوں

۸۔ مجھے تو قفس سے رہا کر یہ تک سہارا ہے آخری ۔۔۔ مرا آشیا (تھا جو باغ میں) اسے (باغباں) نے جلا دیا

سرور کوئی روز و شب عشق نے مجھے

۹۔ نہ رہی کشش کسی بات میں نہ (رہی کشش وہ) حیات میں ۔۔۔ یہی سوچتا ہوں میں (رات دن) ترے (غم نے مجھ پر) کیا کیا

تمہید ۱ عاشقِ زار بازاری لفظ عہدِ عشق عشو اور اونچا اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ محبوب پہلے بھی اونچا تھا اور اس کا شعر میں ثبوت نہیں، شعر کا مضمون عامیانہ، زبان بازاری اور شعر بذاتِ خود پست قسم کا تھا۔

۲۔ ہم نشیں یا ہمدم پاس بیٹھنے والے کو کہتے ہیں۔ محبوب کو نہیں، مصرع کی بندش بھی کم زور تھی۔

۳۔ کلیسا کا ذکر کرنا تھا جو ناجائز تھا۔

۴۔ میں شروع مصرع میں "میں" بروزن میم کو خلافِ فصاحت جانتا ہوں "میرا اپنا کوئی نشان نہ تھا" خلافِ اوزان بھی اور ترکیب مہمل اور بے ربط بھی۔ نشان کی تکرار بھی قبیح۔ شعر اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

۵۔ رازِ عشق قبیح، عشق ہی کافی تھا۔ یہاں فلسفہ بے محل لایا گیا۔ مصرع کمزور تھا۔

۶۔ "جو نہ دونے" کھڑے "جہاں میں نے خود کو بھلا دیا" جو نیا دونے کھڑا ہے اس کی مناسبت سے یہ پہلا مصرع ٹھیک ہے۔ نہ دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا بھلانے کا مقام "جہاں" ظرفِ مکانی نہیں، بلکہ ظرفِ زمانی ہے یعنی وقت کے معنی میں۔ مطلب یہ کہ جس وقت میں نے خود کو بھلا دیا، اسی وقت دونے مل گئے۔ اس ظرفِ زمانی کے ساتھ

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

ارشادات

محبت سے خدا محفوظ رکھے — اس آفت سے خدا محفوظ رکھے
خدا سے میں کروں ان کی شکایت — شکایت سے خدا محفوظ رکھے
درِ محبوب تک چل کر نہ پہنچوں — نقاہت سے خدا محفوظ رکھے
ہمارا دل امانت ہے تمہاری — خیانت سے خدا محفوظ رکھے
گلوں کو چھانٹ کر گل چیں نے توڑا — نفاست سے خدا محفوظ رکھے
قیامت ہے تمہاری خوش خرامی — قیامت سے خدا محفوظ رکھے
ادا، غمزہ، کرشمہ، ناز، انداز — ہر آفت سے خدا محفوظ رکھے
ہمیں دینا پڑا اُن کو، دل اپنا — مروت سے خدا محفوظ رکھے
پریشاں ہیں سب اربابِ ضرورت — ضرورت سے خدا محفوظ رکھے
دلِ خود دار ممنونِ کرم ہو — عنایت سے خدا محفوظ رکھے
جو الفت میں ہزاروں رنج و غم ہیں — تو الفت سے خدا محفوظ رکھے

وفاداری کا یہ کہنا ہے اے نوحؔ
بغاوت سے خدا محفوظ رکھے

آمر سہروی

غزل

(تذد مومن)

دستِ بردار جنوں اور پریشاں ہوں گے
مرحلے عقل سے ہستی کے نہ آساں ہوں گے

صرف دیوانے نہ سب چاک گریباں ہوں گے
کچھ انھیں لوگوں میں مستانے غزلخواں ہوں گے

مٹ بھی سکتی ہے کہیں سرخیٔ دامانِ ناحق
داغ تم جتنے چھڑاؤ گے نمایاں ہوں گے

قیدیٔ بادِ مخالف کا ہمیں خوف نہیں
اور ہوں گے جو چراغِ تہِ داماں ہوں گے

کیا خبر تھی کہ محبت کے یہ پُرکیف ارماں
تیر بن کر کبھی پیوستِ رگِ جاں ہوں گے

خود پریشان نہیں ہونے کا کچھ شوق نہیں
تم پریشان کرو گے تو پریشاں ہوں گے

جن پہ ہم اہلِ وفا شوق سے لائے ایماں
کیا خبر تھی کہ وہی دشمنِ ایماں ہوں گے

رنگ پر رنگ بدلتا ہے بدلتا ہی رہے
ہم نہ شاکیٔ مزاجِ غمِ دوراں ہوں گے

دوسرا نام زمانے میں ہے ارماں دل کا
کون سا دل ہے کہ جس دل میں نہ ارماں ہونگے

تھے اسی وہم میں اب امن و سکوں ہو گا نصیب
ہم نہ سمجھے تھے کہ ساحل پہ بھی طوفاں ہوں گے

لاکھ انجامِ محبت ہو سکوں سوز آمرؔ
ہم نہ پھولوں کی طرح چاک گریباں ہوں گے

حسین استعیر۔ جبل پوری

مجھ سے روٹھو نہ تم

دل نہ توڑو مرا مجھ سے روٹھو نہ تم
دیکھو بہرِ خدا مجھ سے روٹھو نہ تم

اک مسافر کا بھی کیا ٹھکانا ہے بھلا
آج ہوں میں یہاں کل چلا جاؤں گا
ساتھ جب تک بھی ہے آؤ ہنس بول لیں
پھر پلٹ کر ادھر میں کہاں آؤں گا
جب چلا جاؤں گا میں تو گھبراؤ گی
اور پھر تم اکیلے میں پچھتاؤ گی

ہو گا ٹکڑے جگر روؤ گی پھوٹ کر
یاد آئیں گی میری وفائیں تمہیں
ڈوب جاؤ گی اشکِ ندامت میں تم
یاد آئیں گی اپنی جفائیں تمہیں
آپ اپنے سے اس وقت شرماؤ گی
اور پھر تم اکیلے میں پچھتاؤ گی

گنگنائے گا جب کوئی میری غزل
تم کو بے ساختہ میری یاد آئے گی
ذہن ماضی کے گنبد میں کھو جائے گا
میری آواز کانوں سے ٹکرائے گی
ہوک اٹھے گی دل میں تڑپ جاؤ گی
اور پھر تم اکیلے میں پچھتاؤ گی

اونچی نیچی ہے یہ زندگی کی ڈگر
راہ چلتے ہوئے ڈگمگاؤ گی تم
سخت دشوار ہو جائے گا یہ سفر
اور کوئی سہارا نہ پاؤ گی تم
عمر بھر در بدر ٹھوکریں کھاؤ گی
اور پھر تم اکیلے میں پچھتاؤ گی

تم کو میری قسم مجھ سے روٹھو نہ تم
مان جاؤ صنم مجھ سے روٹھو نہ تم

پنڈت بشمبر ناتھ امروہوی

ذکرِ حال

ہم نشیں آ کہ سناؤں تجھے افسانۂ حال
ذکر اس حال کا جس حال میں جینا ہے محال
یہ وہی دور ہے جس دور نے انسانوں کی
زمزمہ خیز زبانوں کا تکلم چھینا،
جس نے موسیقی سے موسیقی کی دھن چھینی ہے
مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے ترنم چھینا
چند روندے ہوئے فرسودہ خیالوں کے لئے
بھائی سے بھائی کی بے لوث محبت چھینی
دے کے اس دور نے افلاس کی بیماری کو
حسن کی سادگی اور عشق کی غیرت چھینی
کتنی ماؤں کی امیدوں کے دیئے پھونک دیئے
کتنی بہنوں کی دمکتی ہوئی عصمت چھینی
در و دیوار پہ چھایا ہے اداسی کا غبار
سارے ماحول پہ غربت کا فسوں طاری ہے
آج کے دور میں انسان کا عنوانِ حیات
بھوک ہے، پیاس ہے، افلاس ہے، بیکاری ہے
جب تڑپتا ہے کوئی بھوک کی بے چینی سے
زندگی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ بیماری ہے
خون اگلتے ہوئے ان ایٹمی طوفانوں میں
آج انسان ہے ٹوٹے ہوئے ساحل کی طرح
چھنس کے یہ موت کے پنجوں میں نہ جانے کب سے
زندگی چیخ رہی ہے کسی بسمل کی طرح

شیخ سلیم صدیقی

غزل

گلوں کا ذکر نہ خاروں کی بات کرتے ہیں
ہم اپنے دل کے شراروں کی بات کرتے ہیں

زباں پہ اپنی جب آتا ہے ذکر باغ و بہار
تو داغ دل کی بہاروں کی بات کرتے ہیں

ہمیں تھے وہ جو تلاطم پہ جان دیتے تھے
نہیں ہیں وہ جو کناروں کی بات کرتے ہیں

خزاں کا دل بھی مسرت سے جھوم اٹھتا ہے
ہم اس ادا سے بہاروں کی بات کرتے ہیں

شعور جن کو نہیں ہے زمیں پہ رہنے کا
وہ لوگ چاند ستاروں کی بات کرتے ہیں

نظر میں جن کی نہیں ہے مقام خود داری
وہ دوسروں کے سہاروں کی بات کرتے ہیں

سلیم ان کی جسارت پہ مجھ کو حیرت ہے
زمیں پہ رہ کے جو تاروں کی بات کرتے ہیں

محبت آباد سے

در کے سوئی پہ دو باغ جناں تک پہنچے
عشق میں تیرے طلب گار کہاں تک پہنچے

بجا راہ میں ہیں پاس وفا کے پہرے
کس طرح راز محبت کا زباں تک پہنچے

پہ الفت پہ جلی حرفوں سے یہ لکھا ہے
اپنا ہستی جو مٹائے وہ یہاں تک پہنچے

رجاں کو تو امانت ہی سمجھتے آئے
ہم نہ ہستی کے کبھی سود و زیاں تک پہنچے

گیا جسم کی خوشبو سے خیالوں کا محل
نکہت گل کی طرح آپ جہاں تک پہنچے

وہ عشق میں کچھ ایسے بھی جاں باز ملے
سر کے بل چل کے جو منزل کے نشاں تک پہنچے

اے کمر "آتش گل" دیکھ کے کہنا ہی پڑا
کس طرح کوئی اس انداز بیاں تک پہنچے

افکار نو

شہ نظام الدین نظام

ساقیٔ بزم ہستی تو دیکھ ایک نظر مے خانے کو
ٹھکرا دیا مستوں نے تیرے پیمانے سے پیمانے کو

جائے بقدر ظرف اگر ہے بزم میں ہر مستانے کو
کیوں بات بڑھے میخانے میں کیوں ٹھیس لگے پیمانے کو

ت آتش غم سے جل جل کر دی جان چراغ محفل نے
معراج سمجھتے ہیں عاشق اس شان سے خود جل جانے کو

یرے لبوں کو سی ڈالو، بیداد کرو دنیا والو
میں دم پر بھی دہراؤں گا آزادی کے افسانے کو

روز قدر رہے گا اک روز وفا کام آئے گی
آباد کریں گے جلووں سے وہ اجڑے ہوئے کاشانے کو

محفل میں نظام مضطر کیوں افسانہ الفت کہتا ہے
بیدرد کوئی کیا سمجھے گا، دکھ درد بھرے افسانے کو

خاد کوٹی

یہ دل ہے عشق و محبت کی آرزو کے لئے
نظر ہے وقف نئے ذوق جستجو کے لئے

نہ ناز گل ہے نہ گلچیں نہ فیض بلبل ہے
یہ اہتمام گلستاں ہے رنگ و بو کے لئے

نگاہ رکھتے ہیں جو اپنے شوق بے حد پر
وہ دائرہ بھی بناتے ہیں جستجو کے لئے

نئی سحر ہی فقط میری کد تلاش نہیں
ہزار ناز ہیں غم میں جستجو کے لئے

اگر ہو عزم مصمم تو کچھ نہیں۔ مشکل
ہر ایک راہ کشادہ ہے جستجو کے لئے

نماز عشق تو رسمی کی بات ہے ورنہ
انھیں تو خون مرا چاہئے وضو کے لئے

سکوت غم سے بدلتی نہیں ہیں تقدیریں
ہے خون دل کی ضرورت انھیں نمو کے لئے

ہے جن سے نام ترے میکدے کا اے ساقی
ترس رہی ہیں وہ پیمانہ و سبو کے لئے

تڑپ سے دل کی عبارت حیات دائم ہے
نفس نفس ہے مرا وقف جستجو کے لئے

چلے گا کام نہ محفل میں یاوہ گوئی سے
ہنر بھی چاہئے دنیا میں عیب جو کے لئے

بشر شاہی دہلوی
علی سجاد رسوا ایرانی

غزلیات

جب ہم کو محبت میں جینے کا شعور آیا
سہمی ہوئی آہوں میں انداز غرور آیا

پینے کا مرے ساقی انداز نرالا ہے
زلفیں جو تری بکھریں آنکھوں میں سرور آیا

سب رندانِ ساغر ساقی کے حضور آئے
مینائے غزل لے کر میں اپنے حضور آیا

میری ہی دعاؤں سے میری ہی وفاؤں سے
کچھ حسن پہ نور آیا، کچھ عشق پہ نور آیا

بھولے سے اگر میں نے آپ اپنے ہی جلووں پر
اک بار نظر ڈالی، سو بار غرور آیا

حبیب الرحمٰن راہی

چلا ہے قافلۂ غم کدھر نہیں معلوم
تمام ہوگا کہاں یہ سفر نہیں معلوم

بس اب تو صبر ہی اچھا ہے اے دلِ بیتاب
اٹھائیں گے وہ نظر کب ادھر نہیں معلوم

ابھی تو گھر میں مرے ظلمتوں کے سائے ہیں
کب آئے گی وہ عروسِ سحر نہیں معلوم

نہ حیرت کوئی اس کی نہ میرے خط کا جواب
بھٹک رہا ہے کہاں نامہ بر نہیں معلوم

سمجھ کے سوچ کے اہلِ جنوں کی بات کرے
خرد ہے دور بہت شیخ اگر نہیں معلوم

ہوش گم ہو گئے، بے خودی چھا گئی
جب نظر ان کے جلووں سے ٹکرا گئی

کیوں یہ بے تابیاں، یہ تڑپ کس لئے
اے دلِ مضطرب کس کی یاد آگئی

اب رہے گی نہ گلشن میں یہ تر گی
برق میرے نشیمن سے ٹکرا گئی

دل میں حسرت رہی ان کے دیدار کی
ان کے آنے سے پہلے قضا آگئی

میں جو رسوا ہوا ان کی شہرت ہوئی
میری دیوانگی ان کے کام آگئی

قطعہ تاریخ

انتقال پُر ملال جناب عبدالرحمٰن صاحب ضیا شاگرد رشید حضرت مضطر خیرآبادی

حیائے انقلاب پہ حیا ہوئے شہید، شکر ہے جا کے ان کو ملا ہے کفن کہاں
سارے وطن میں دھوم ہے انکے کلام کی اب ان سا اور شاعر دیرینہ کہاں
آنور بھی کہہ دعا کہ ہو صادق قضا کی ہے یہ سب ہیں مگر کوئی مستند کہاں

کہ فکر سالِ وصل تو بولا سروش غیب
لکھے کہ اب جواب چراغ سخن کہاں

۲۰۰۶ ہجری

دس فکر تاریخ رحلت پہ قدریا کا دل
کہہ رہا ہے کہ کہہ۔ گردشِ چرخ ہے

۱۳۶۹ ہجری

صادق سیمابی۔ لاہور

نذر صدیقی دھلوی

نہ تو کسی نے اب تک مرے عشق کا ترانہ،
کبھی مجھ کو نیند آئی، کبھی سو گیا زمانہ۔
کہیں برق شعلہ زن ہے، کہیں آندھیوں کا خطرہ
ہے مصیبتوں کی زد میں مری شاخِ آشیانہ
ترے دم سے میں نے پایا یہ مقام و بلندی
نہ بھلا سکے گی مجھ کو، کبھی گردشِ زمانہ
میں سمجھ رہا ہوں تا ہے یہ کرم ہے شاعری کا
کہ زمانہ گا رہا ہے مرے نام کا ترانہ

رہبر جگادری

تری زندگی تبسم، مری زندگی شرارہ
وہ حسیں گلوں کا مسکن یہ خزاں کا اک نظارہ
تو ازم دلربائی، تجھے لے گیا جہاں تک
مرے عشق نے دیا ہے ترے حسن کو سہارا
یہ شکستگی ہے دل کی تجھے پا کے کھو چکا ہوں
بڑا تیز بہہ رہا تھا، مری حسرتوں کا دھارا
مری لغزشوں نے رہبر، کئی راستے بنائے
کبھی عیش سے تھی نفرت، کبھی رنج تھا گوارا

عبدالرحمٰن ناصر کاشمیری

عرضِ تمنا صبر و تحمل کی شاکتا ہوں میں
حاشر شیخ و برہمن کو دکھا سکتا ہوں میں
اے جذبِ عشق پیمانۂ صفت کے نثار
اپنے قدموں پر فلک کو جھکا سکتا ہوں میں
کیوں اڑائے کوئی میری خستہ حالی کا مذاق
سازِ غم پر بھی خوشی کے گیت گا سکتا ہوں میں
رہنما ہے میری ہستی اک زمانے کے لئے
راہ پیما ماہ انسانوں کو کر سکتا ہوں میں
آئینہ دارِ جمالِ یار ہے میرا وجود
روشنی ماحولِ دنیا کی بڑھا سکتا ہوں میں

جلال و جمال

شمس الحق صدیقی فرخ پوری

زندگی کا ازل سے یہ دستور ہے
کوئی رنجور ہے، کوئی مسرور ہے
حسن اپنی ادائوں پہ مسرور ہے
عشق مر مر کے جینے پہ مجبور ہے
حسن کی رہگذر آ کے دیکھو ذرا
گوشہ گوشہ جہاں بقعۂ نور ہے
حوصلے دل کے ہمت شکن تو نہیں
کیا ہوا میری منزل اگر دور ہے
پوچھتا کیا ہے اے چارہ گر حال دل
جو ہے زخم تھا اب وہ ناسور ہے
صرف جنت کی خواہش فرخ کو نہیں
بندۂ زاہد کو بھی خواہشِ حور ہے

ظہور احمد سرور سلطان پوری

ضبط کو کیوں کر خوار کروں وہ بھی اتنی رات گئے
آنکھوں کو خوں بار کروں وہ بھی اتنی رات گئے
پینے سے انکار کروں وہ بھی اتنی رات گئے
ساقی سے تکرار کروں وہ بھی اتنی رات گئے
آج میں اُن کو یاد کروں شاد ہو دل ناشاد کروں
رنج و غم سے پیار کروں وہ بھی اتنی رات گئے
عیش و طرب کی محفل میں لے میرے جذبات دل
کیوں غم کا اظہار کروں، وہ بھی اتنی رات گئے
آج سرِ محفل سرور نظم و غزل اپنی پڑھ کر
کیوں غم کا اظہار کروں وہ بھی اتنی رات گئے

مشتاق احمد عادل ادیب

جو دُور دل سے مرا اضطراب ہو جائے
علاجِ دردِ محبت شتاب ہو جائے
اگر بیان کروں اُس کے حسن کا عالم
ہر ایک شعر مرا لاجواب ہو جائے
جو داغ دل پہ ہے میرے کسی کی اُلفت کا
عجب نہیں ہے اگر آفتاب ہو جائے
لے آئی قبر پہ آخر تری کشش اُن کو
دلِ حزیں ترا خانہ خراب ہو جائے

شنکر جے کشن کی وجد آور موسیقی سے آراستہ ایک ناقابل فراموش جذباتی تصویر

شوبھا کھوٹے ۔ آغا
جینت ۔ سدیش کمار ۔
موسیقی : شنکر جے کشن
پروڈیوسر ڈائرکٹر ۔ پرساد
پرساد پروڈکشنز
مدراس کا
انوکھا شاہکار

سنیل دت ۔ سر جادیوی
جمنا ۔۔۔ محمود

بمبئی بمبئی

شکروار • ریگل • مہروا • امبا • کھنہ
۱۰ اپریل • شالیمار • سدرشن
سے نیز رادھو شاہدہ • موہن چترلوک فاری آباد
افتتاح جاری کردہ ۔ راج شری پکچرز چاندنی چوک دلی

مترجمہ روشن چیلاوی

انتقام در انتقام

موپاسان کا ایک حسین شاہکار

یہ کہ اس کی بیوی اس سے ناراض ہوا کرتی تھی وہ اسے کتوں سے پیار کرنے پر کوسا کرتی تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اسٹگروں کا دشمن ہے کیونکہ کبھی کبھی اس حصے میں سنگلاخ علاقہ بڑے کتوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ جنہیں اس کام کے لئے خاص طور پر سدھایا جاتا تھا۔ اس لئے یہاں شام کے وقت یہاں کتوں کو ناجائز حال میں پھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا ان کتوں کے مالی چوکی خانے کے کتوں کے قریب آنے کا خوف ہر وقت بنا رہتا تھا کیونکہ وہ ان کے جانی دشمن تھے

کتوں والے یہ آدمی سنگلاخوں کا دشمن تھا کیونکہ اس نے چوکی خانے کے کتوں کو اسٹگلاخ کے کتوں کا شکار کرنے کی تربیت دی تھی۔ اس نے جو مردنی اور بچے اسٹگروں کے مالی تھے، وہ اس شخص سے نفرت کرتے تھے مگر انہیں بھی اس شخص کی علانیہ توہین کرنے یا اس کے منہ پر اس کے خود کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ جانور وہ خود کو رعایت دہندہ، چوکی خانوں والا آدمی تھا مگر اس کے کتوں کی آنکھیں خونخوار اور تیز دانت تھیں۔ کتوں کے سر بھی کود تھے۔ بیٹھے بڑے اور دانت بھیڑیوں کی طرح تیز اور چمکدار تھے کہ گوشت کو اچھی طرح پھاڑ سکتے ہیں یہ کتے بہت ہی وفادار اور اطاعت گزار تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اسٹگلاخوں کو کس طرح دبوچا جا سکتا ہے اور ان کے حفاظتی کتوں کی کس طرح پھاڑ کی جا سکتی ہے۔

ایسٹنڈ کی بیوی ایک چھوٹی سی دکان کرتی تھی وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ محض چوکی خانے کے افسروں کو ہی اس کی دکان سے سودا سلف خریدنے کی اجازت تھی ایسٹنڈ کا جسم دبلا پتلا، چہرہ زردی مائل۔ آنکھیں بے رونق اور لال سی تھیں۔

وہ خطرناک حد تک تنگ مزاج تھا وہ اپنی بیوی کی بھی اپنے کتوں کی طرح ہی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اسٹگروں کے کہا کرتے تھے کہ ایسی حسین عورت ایسے ناٹے قد کے کروڑ آدمی سے کبھی خوش نہیں رہ سکتی اور جو کچھ وہ اپنے خاوند سے حاصل کرنے میں قاصر رہتی تھی اسے وہ دوسرے ذریعہ سے پایا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ چیزیں نگرانی اور حفاظت سے بھی صاف بچ نکلتی ہیں۔ "فیضان محبت" مگر وہ یہ نہ جانتے تھے کہ کچھ سال پہلے اس نے ایک معمولی واقعہ رونما ہونے پر اپنے وفاداری کا ایک ایسا مزے دار سبق پڑھایا جسے وہ کبھی نہ بھول سکے گی۔ اس نے کسی غیر شخص کو اس کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ لیا سو اس وقت تو اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ مگر جب وہ آدمی چلا گیا تو وہ اپنے وفادار کتے کو کمرے میں لے آیا اور بولا:۔ "اگر تم یہ چاہتی ہو کہ یہ کتے تمہیں ایک خرگوش کی طرح چیر پھاڑ کر نہ پھینک دیں تو گھٹنوں کے بل دوزانو ہو کر بیٹھ جاؤ۔ تاکہ میں تمہیں خوب پیٹ سکوں۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کا خاوند اسے اس وقت تک مارتا پیٹتا رہا جب تک کہ اس کا ہاتھ نہ تھک گیا۔ کوڑے کی چمڑے کی ضربات سے خون بہہ رہا تھا مگر اسے چیخنے چلانے اور گڑگڑانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد سے بظاہر اس پر وہ ہر لحاظ سے ایسٹنڈ کی وفادار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس نے کسی کو بھی یہ نہ بتایا تھا کہ اس کی وفاداری کی اصل وجہ کیا ہے وہ اپنے خاوند سے سخت نفرت کرتی تھی۔ مگر اظہار پر وہ اس کی فرماں بردار اور مطیع نظر آتی تھی اور خاوند سے اس کا سلوک بھی دیکھنے میں باعزت سا ہوتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ مکمل چھ سال انتقام لینے کے منصوبے بناتی رہی۔

آخر کار اس کے وفادار و خاموش عاشقوں سے ایک شخص ایسا مل گیا جو ہر پہلو سے اس کی مدد کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ چوکی خانے کا افسر تھا۔ اس کی مضبوط اور مشیاں کسی قصاب جیسی سخت تھیں وہ چار کتے تھے۔ جنہیں خود ایسٹنڈ نے خاص طور پر تیار کیا تھا۔ یہ چاروں کتے اپنے پرانے مالک کو بھول چکے اور انہوں نے اب اپنی فرماں برداری نئے مالک کو پیش کر دی تھی۔

ایک شام کو جب برگیڈیر ایکہاری ایسٹنڈ کی اس کی دکان پر تھا تو میڈم نے یکایک کہا:۔ "تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

اس نے فرحت بھرے جواب دیا:۔ "میں تمہارے اپنے ذہنی اختلافات کو ترک کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"بہت خوب!" اس نے خاموشی سے کہا "جس طرح میں کہتی ہوں ویسے ہی عمل کرو اور یہ وعدہ بھی کرو کہ تم محض میرے اور صرف میرے رہو گے۔" اور اس نے اس کے کان میں جلدی جلدی کچھ ایسا ہی کرتے ہوئے کہا:۔ "میرے تمہارے واسطے

حیثیت میں ہی تمہارے پاس رہوں گی..... ہائے! میں اس سے کتنی شدت سے نفرت کرتی ہوں۔" اللہ اس نے بڑے تحمل اور ہر اندازہ لگا کر ہمیں بتایا کہ چھ سال ہوئے اس نے کس طرح چاقو سے اس کا جسم چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

اسی شام وہ اپنے جاں نثار کتوں کے ساتھ جو پنجرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"تم ان کتوں کو یہاں کس لئے لائے ہو؟" کتوں والے آدمی نے دریافت کیا۔

"میں ان کے بارے میں ہی تم سے بات چیت کرنے آیا ہوں۔" برگیڈیئر نے جواب دیا۔ "کیوں کہ میرا یہ خیال ہے کہ جب تم نے ان کتوں کو میرے پاس فروخت کیا تو تم نے مجھے لوٹ لیا۔ لوٹ لیا۔ دوست!"

"تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں نہیں سمجھا۔" بسٹنڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ تم نے مجھے کہا تھا کہ تمہارا کتا "بوچر" ملک کے کسی بھی اسمگلر کے کتے کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ کئی اسمگلروں کے کتے اسے آسانی سے مار سکتے ہیں۔ یہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"ناممکن!" بسٹنڈ نے پورے غصے سے کہا

بسٹنڈ کی یہ بڑی شرارت آمیز انداز میں مسکرائی اور برگیڈیئر بھی اس کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔

بسٹنڈ نے وقت اپنی نظریں اوپر اٹھا کر دونوں کی مسکراہٹ کو دیکھا اور ایک شبہ اس کے دل میں یک لخت بیدار ہوا۔ مگر اس کا یہ احساس بعد وقت تھا اس سے پہلے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ کیا ہو گیا ہے، اسے پکڑ کر باندھ دیا گیا۔ اور کمرے کے ایک کنارے دیوار کے قریب گرا دیا گیا۔

"اب فرینڈ!" عورت چلائی..... اور بسٹنڈ کی آنکھوں کے عین سامنے اس کی بیوی اور برگیڈیئر بوسے سے بغل گیر ہو گئے۔

کتوں والے آدمی نے قہقہہ لگا کر کہا: "اوہ مائی

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتح پوری

غزل

چھیڑتی ہے جب محبت سازِ دل — زندگی ہوتی ہے ہم آوازِ دل
دیکھ تو لوں اک نظر ان کو، مگر — ڈر ہے مجھ کو کھل نہ جائے رازِ دل
ایک ہنگامہ ہے بزمِ ناز میں — کون سنتا ہے یہاں آوازِ دل
لب تک آ سکتی نہیں روداد غم — کھل نہیں سکتا ہمارا رازِ دل
نالہ و فریاد سمجھے ہو جسے — ہے وہ آوازِ شکستِ سازِ دل
اک نظر میں ان کا ہو کر رہ گیا — عمر بھر ہم نے اٹھائے نازِ دل
یوں تو بجلی بھی تڑپ لیتی ہے خوب — کچھ نرالا ہے مگر اندازِ دل

رات بھر اے مست میں روتا رہا
آہ و نیشوں سے ملائے ساز دل

— او بے غیرت انسان نما!

"گڈ گڈ" عورت نے..... چٹکی بجا کر کہا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی تمہاری بے عزتی ہو گئی..... ہا..... ہا..... ہا —"

پھر وہ برگیڈیئر کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی "فرینڈ۔ تم اب اس جگہ جا کر جہاں کتوں کو چھپایا ہوا ہے، ان کا کام تمام کر دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو وہ کل فوجی ان سے مجھ پر حملہ کرا دے گا۔"

برگیڈیئر نے اپنی مجبوبہ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اندر..... میں پانچ گولیاں چلیں۔

مگر بسٹنڈ بھی بہت چالاک اور مکار تھا۔ افسر کے چار دن کتے بھی تو کسی زمانہ میں اس کے ہی تھے وہ انھیں اپنی طرف راغب کرنے کے لئے ان کے نام لے کر انہیں پیار سے بلانے لگا۔

آہستہ آہستہ کتوں نے اپنے پہلے مالک کو پہچان لیا۔ وہ اپنی دمیں ہلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ دفعتہً وہ ان کی طرف مڑا..... وہ بے غیرت..... دونوں کتے پر فیض عورت پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے اسے گلے سے پکڑ لیا اور دوسرے نے اپنے دانت اس کے گوشت میں پیوست کر دیئے۔

جب برگیڈیئر واپس آیا، تو اس کی محبوبہ دم توڑ رہی تھی اور کتوں والا آدمی ہنس رہا تھا۔

بسٹنڈ اور برگیڈیئر دونوں ہی گرفتار کر لیا گئے ان پر مقدمہ چلا۔ کتوں والا آدمی بری ہو گیا مگر برگیڈیئر کو جیل بھیج دیا گیا۔

کتے والے آدمی کی اب لوگ اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی پہلے اس سے نفرت کرتے تھے۔ مگر اب وہ اسمگلروں کی طرف دار ہو گیا تھا اور چونگی خانے کے افسروں کے لئے ہتک بن گیا تھا۔

جب کوئی اس کے خونخوار کتوں کی طاقت کی تعریف کرتا، تو وہ آہستہ سے کہا کرتا تھا۔ وہ جہاں کسی اسمگلر کا تعاقب کرنے میں بہت تیز اور ہوشیار ہیں، وہاں کسی عورت کی کھال ادھیڑنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔

خلیہ کیفی اعزہ ہوگا

خاموشی کی آواز

نسرین اور فہیم دونوں ایک دوسرے کے تئیں جو خوش فہمیاں لئے بیٹھے تھے ——

کمسنی کے ان دنوں کے معصوم لمحوں کو پا جانے بھانپ لینے کے نازک جذبات کو بڑی دشواریوں کے بعد اپنی گرفت میں لیا تھا اور ان کی معصوم مگر شعوری خواہشوں کو سال پہلے شادی کے مقدس رشتے میں منسلک کر دینے کی رسم ادا ہو چکی تھی دھیرے دھیرے بیتے بیتے طویل دن مختصر لمحات سے جڑتے رہ گئے اور اب انتظار کی ساعت ختم ہونے کے قریب تھی اور ان دو خوشیوں کے ارمان اور آرزوئیں تکمیل ہونے جا رہی تھیں، کیونکہ اب شادی کے دن قریب تھے ——

اور آج شادی کا دن تھا۔ اس نے ایک نئے جذبے اور خوشی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے سہیلیوں کے درمیان اپنے وجود کو کانپتا اور سمٹتا پایا۔ اس کا اپنے گھر کی خوشیوں میں فہیم کے ساتھ کا گمان ہوا۔ وہ اس احساس سے اور زیادہ سمٹ گئی۔ انتظار کر کے سینکڑوں لمحوں کے حسین خوابوں کی لرزش اور ٹوٹ کتنے دنوں سے وہ اپنے پلکوں کے پیالوں کی خوشیوں کو محسوس کئے اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب سہیلیوں کے درمیان ان کے نرم جسموں کی گرمی سے بچ کر گھر بیٹھے گی اور وہ ایک نشے جذبے کے تحت اپنے آپ میں سمٹ جائے گی۔ شرم اور ایک انجانے سے احساس میں وہ خود کو ہم کنار پائے گی اور آج اس کے خوابوں کو نئی تعبیریں ملنے والی تھیں۔ گھر بھر میں خوشیوں اور ہنگاموں کے پرے تھے، اور گھر کے ہر فرد کے ذہن پر ایک نیا احساس زیادہ بسط تھا۔ باجی کی خوشی خوشی اس کے جہیز کو زمین کے ساتھ سنوار رہی تھیں۔ ان کے معصوم اور جاہلیت سے محروم مگر پوتر دل میں آنے والی نام کا کوئی احساس نہ تھا۔ چھوٹی بہن بھی باجی کی سہیلیوں کے ساتھ مٹکی ڈھولک پر گیت گا رہی تھی —— گیت جو بندنوں کی اور دیکھی جاتی سے پوتر تھے، پیچھے کی پیڑھیوں سے چلے آ رہے تھے۔ خوشیوں اور ارمانوں سے معطر تھے۔ وہ اپنی یادوں اور ارمانوں سے

جیسے جہیز کو بھی تو اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ ہر ایک گیتوں کے لذیذ بول فضاؤں میں بکھر گئے اور وہ خوف سے سہیلیوں کے جھرمٹ میں بے ہوش سی ہو گئی اپنے شانوں سے پھسلتے دوپٹے کو زمین پر لہرائے باجی ایک دم اس کے قریب آ گئیں اور اس کے کانپتے جسم کو اپنی باہوں میں سنبھالتے ہوئے بولیں

"نسرین! —— میری بہن کیا ہو گیا تجھے.....؟"

باجی کی ذہنی چوٹ کھائی آواز تھی۔

"مگر کیا ہوا باجی —— فہیم بھائی تو زخمی ہو کر آ رہے تھے ——!" چھوٹی بہن سلمیٰ اس کی اور سب لڑکیوں کی بے سے گھبرا کر پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں میری بچو —— وہ رات اچانک ہی گھر سے غائب ہو گئے.....!" باجی اپنی سسکیوں پر قابو پا کر بولیں خالہ نے باجی کو سمجھایا "ارشو! تو بھی بچی بن گئی، ارے فہیم رات سے گھر نہیں ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

"خالہ —— آپ نہیں جانتیں، نسرین بھی میری ہی طرح ہمیشہ کنواری.....!" باجی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بکھیرتی ہوئی بولیں۔

"پاگل مت بنو ارشو —— میاں جی نے سخت لہجہ میں کہا "اگر فہیم نے میری بے مروتی کی سزا دی ہے تب میں کبھی بھی اس کے ساتھ نسرین کو منسوب نہیں کر سکتا.....!"

"آہ میرے اللہ.....!" اس نے اپنے چکرائے ذہن کے ذہن کے ساتھ گھر بھر حالات کا جائزہ لیا تو پھر میں شادی خوشیاں کہاں دفن ہو گئیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

اگلے ہی لمحہ ایک بار پھر میاں کی فیصلہ کن آواز نے اس کے جذبوں کو مزید گھائل کر دیا "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ نالائق ہمارے قابل نہیں ہے.....!" اور وہ اپنے بھائی قدموں کی چاپ کو کمرے سے باہر لے گئے۔

اور وہ خود اپنی سہیلیوں کے درمیان گھری، آنسوؤں کو اپنے سرخ کپڑوں میں جذب کرتی رہی۔ نوزیہ نے اسے دلاسا دیا "نسرین رونے سے تو کچھ اب ہونے سے رہا اپنے دل پر قابو رکھو!"

فہیا نے اس کے آنسو اپنی ساری کے آنچل سے پونچھتے ہوئے سمجھایا "اگر تمہارا پریم پوتر ہے تب اس کی شکتی ختم نہیں ہوگی ——!!"

"میرا دم گھٹ رہا ہے، میں کیا کروں.....؟" وہ پھر رو دی۔ آنسوؤں کے شبنمی قطرے اس کی آنکھوں میں اس طرح جم گئے جیسے موتی جڑ منجمد ہو گئی ہوں ——

"بہنا —— میں گیت گاؤں گی نہیں.....؟" نسرین اپنے معصوم جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں ——!" سختی سے باجی نے منع کیا اور وہ سہم کر ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ارشو! اپنی کم نصیبی کا غصہ اس پر مت اتارو!" امی اس کو چمکارنے لگیں اور باجی بڑی تیزی سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

شادی کے ہنگامے اور خوشیوں کی بجائے فضا دیر میں گھر بھر میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ وہ سناٹے سے یہ طرح خائف تھی اور اب تنہائی اپنے پنجے گھورتی کاٹنے

رہی تھی۔ جب فیمینا کا نام پکارا گیا تھا۔ وہ اس کے گھر
میں کامیاب ترین لڑکی تھی۔ اس نے ترنم کی سال گرہ کی تقریب
سے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے۔ وہاں اور بہت سارے لڑکے لڑکیاں
موجود تھیں۔ سبھی کی شکل۔ مگر دلچسپ لڑکے کے اپنے اپنے
خصوصیات تھیں۔ وہ دبلی دبلی سی، اونگ تھونگ ایک کونے
بیٹھی تھی۔ یہ اس کی جبلی فطرت کی خامی تھی کہ وہ کم بولتی
ہنستی تھی۔ مگر جب فیمینا نے بڑے شوخ لہجہ میں اسے چھیڑا
"نسرین تو قدسی چپ بیٹھی ہے، جیسے گوتم بدھ کے
سامنے بیٹھی ہو۔"

اور وہ فیمینا کے اس ریمارک پر شرما کر، لرز کر رہ گئی تھی
اور غیر شعوری طور پر اپنے دل کے سارے جذبوں اور جذبات پر
قابو پا سکا۔ تب بھی کوئی چابک، کوئی چابت اس کے شعور میں
بیدار نہ ہو سکی تھی۔ اور جب اس نے امتحان کے طور پر فیمینا کو
جواب دیا "مجھے نہیں۔ شاید تمہیں کسی کا انتظار ہے۔"
تو ساری سہیلیاں قہقہہ بار ہو گئی تھیں۔

"انتظار ختم، اب آپ اپنا ریکارڈ پروگرام شروع کیجئے۔"
ترنم کی سب کو ہدایت تھی۔

فوزیہ چہکی "پہلے ہمیں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کی
دھن بنا کر گانا چاہئے۔ تاکہ آپ کے بھائی اپنے ٹیپ ریکارڈ
پر یہ کورس کیپچر کر لیں۔"

"اُف فو..... تو یہ بھی....." ترنم فوزیہ کی ناک
پکڑتے ہوئے بولی۔ "بابا معاف کرو، میرے بھائی جان ایسے
نہیں ہیں کہ وہ تم جیسی چڑیلوں کی آوازیں ریکارڈ کریں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے، کہ ہم سب چڑیلیں ہیں، اور
آپ....." فیمینا نے نسرین کی طرف اشارہ کیا۔

"بقیہ تری مت کرو۔ وہ بے چاری کم بولتی ہے، تب
ہی تو تم سب اس کی ہنسی اڑا رہی ہو۔" ترنم نسرین کی
لائی تمام کر باہر لے جاتے ہوئے بولی اور اس کے پیچھے
پیچھے سب چل دیں۔

کھانے کی میز پر سب سہیلیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں کہ
ایک طویل قد کا جاذب نظر نوجوان اس کوچہ میں آ گیا۔ بجلی

تیزی سے کیچن اور دوسرے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اس
نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا دوپٹہ کرسی کی پشت
سے بندھا تھا، وہ اٹھ کر بھاگ ہی نہ سکی تھی۔ اسے پتہ ہی
نہیں چلا۔ فیمینا نے اسے مزید چھیڑنے کے لئے یہ نئی شرارت
کی ہے۔ وہ گھبرائی خرگوشی سی میز کے نیچے جھانکنے لگی۔
تب ہی ایک آواز..... نہیں۔ ریشمی جذبوں کا آہنگ
اس کے دل کی گہرائیوں میں بکھر گیا۔

"گستاخی کے لئے معافی نہیں مانگوں گا۔ اس لئے
کہ میرا اپنا کمرہ ہے.....!" نعیم اپنے مخصوص تبسم کے
ساتھ بولا۔

"جی..... جی.....!" وہ لرز کر اٹھی۔ نعیم نے
تیزی سے اس کے بندھے دوپٹہ کو کھول دیا اور شوخیت
بھرے لہجے میں بولا "حسن کو پھول جوانی کو گل کہتے ہیں!"

"آپ..... دیکھئے..... وہ.....!" وہ اس کو
اپنے سامنے پا کر جلدی سے کمرہ سے باہر چلی گئی لیکن دوسرے
کمرے میں پہنچتے ہی سب لڑکیوں نے اسے پھر گھیر لیا۔

"آواز کا ٹیسٹ تو ہو ہی گیا ہے نا۔" فیمینا
پھر شوخی پر اتر آئی۔

"صرف یہی نہیں، کچھ دھندے، کچھ قسمیں بھی کھا کر
دے آئی ہیں۔" فوزیہ نے اسے مزید شرمندہ کر دیا

"اور کچھ ہلکی پھلکی دھڑکنیں بھی ساتھ لائی ہیں"
ایک اور لڑکی نے چھیڑ کی۔

"وہ دیکھئے میں..... میں، میرا مطلب ہے کہ میرا دوپٹہ
.....!" وہ پوری بات بتلانے لگی۔

"دوپٹہ۔ ہاں، ہاں۔ اب تو دوپٹہ بھی نہیں
سب کچھ ہی بدل جائے گا....." فیمینا نے پھر پیار بھرا
طنز سا کیا۔

"اری تم سب یہاں کیوں کانفرنس سی کر رہی ہو"
ترنم کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"واہ وا..... جیسے بے چاری کو پتہ ہی نہیں ہے"
فوزیہ نے ترنم کو جتایا۔

"تم سب وہاں سے کہاں چلی گئیں....." ترنم نے
اپنی آنکھوں میں کئی سوالیہ جذبے سجاتے ہوئے پوچھا

"اور تو کیا..... اس کیسل ماؤس کو اکیلا چھوڑ دیتیں ہم....."
فیمینا نے پھر شوخی دکھائی۔

"اف فو۔ فیمینا۔ کبھی تم لڑکیوں کو بھی بڑا
نہیں آیا۔ اری اگر وہ بغیر کھٹکے کمرہ میں چلے گئے تھے
تب تم نے ان کی اس ناخواستہ حرکت پر کچھ نہ کچھ دیکھا ہوگا
کہ نہیں....."

"مگر وہ ہیں کون....." ایک اور لڑکی چہکی
ترنم کھانے کے ڈیش میز پر سے اٹھاتے ہوئے بولی

"اری وہ نعیم بھیا ہیں۔ لیکن وہ تو اپنے دوست کے یہاں
گئے ہوئے ہیں....."

"تب ہم سب اپنے کئے شیدا واپس لیتی ہیں۔"
فیمینا نے سب کی نمائندگی اختیار کی اور نسرین کی اچھی بھلی
حالت کو دیکھتے ہوئے پھر بولی۔ "مگر یہ..... انھوں نے ہم
سے پہلے ہی اپنے سارے شیدا فدا سے بھیا کو دے دیئے ہیں۔"

"میری جان۔ یہ مذاق ختم کرو۔ دیکھتی نہیں ہو،
وہ چوتھی کی دلہن بنی آئی تھی اور اب سرخ پیرہن بنی بیٹھی
ہے۔" ترنم نے اتنے نرم لہجہ میں سب کو سرزنش کی کہ
سب خاموشی سے اسی کمرہ میں آ گئیں۔ کھانے پر سب ایسی
چہلیں جیسے وہ "جن" پھر آنے والا ہے
فیمینا کھانے کے دوران چپ نہ رہ سکی، بار بار سب
کو پریشان کرتی رہی

فوزیہ نے فیمینا کو شرمندہ کرنے کے لئے اس کی
چٹکی نکالی "خاموشی سے کھاتی رہو۔ ورنہ ابھی کہ قصہ
منہ میں ٹھونس دوں گی۔"

"اوہ..... ہمگوان تیب میں چلی۔" فیمینا گھبرا
انداز میں میز سے اٹھ گئی۔ ترنم نے اس کو پھر چھیڑا

"ظاہر ہے تو گوشت کھا نہیں سکتی اور میں تجھے کھا نہیں
سکتی۔ پھر بھی کچھ کھا لو۔"

"مگر تو" اپنے کیٹ۔ کے انداز سے ترنم کو

کو نہ نہیں کہا تی ۔۔!" نوید نے پھر چونکا کی۔

"میں ۔۔۔ اب دیکھ دو ۔۔۔ بہت پھر پکا نا تی ۔۔ تم نے سب کو خاموش کر دیا۔

اور نسرین سکون کا سانس لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگی ۔۔ کھانے کے بعد سب نے اپنے اپنے تحفے تم کو دیئے ۔۔ وہ یہ سب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر میں بولی۔

"کیا یہ بھی اس فیشن کی اسکیم تھی، کھانا کھانا اور قیمتی تحفے کرنسی کے بدلے دینا ۔۔!"

"نہیں ۔۔!" فیشن مسکرائی "اس لئے کہ اگر تم ان کو دیکھتے تو جاتیں، تب تک ہم بھوکی ہی رہ جاتیں!"

"قہ قہ قہ ۔۔۔۔!" کئی سنہری قہقہے بکھر گئے اور تم فیشن کے دسپ کا تی سب کو اپنے کمرے میں لے آئی اور اس ہنگامہ خیز ملاقات کے بعد ایک دن فرد تم اس کے گھر اپنے بھائی کو لے آئی۔ اس نے کہ فہیم کی اپنی ضد تھی کہ وہ نسرین سے خود اپنی اس حرکت کی معافی مانگے گا ۔۔ لیکن اپنی شرمندگی کے وہ فہیم کے سامنے اس سے کترا تی تھی۔ مگر جب اتی نے خود ہی اس کو فہیم اور تم کے لئے چائے دینے کو بھیجا تو وہ اس کے سامنے نروس ہو گئی۔ چائے پینے کے دوران فہیم بظاہر تم سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کا اشارہ کس قدر دلچسپ تھا۔

"تم تم تو میں یورپی انگریزی کھانوں کی فضیلت رہے ۔۔ مگر اس وقت تو ہماری میں کچھ کھانے سے تب سرجری سے فیشن کرو تم ۔۔!"

"بھائی جان ۔۔!" تم گھبرا تے ہوئے بولی "میں اپنے بارے میں ایسی غیر سنجیدہ باتیں سننا گوارا نہیں کر سکتی ۔۔!"

"مگر میں سنجیدگی لاؤں کہاں سے ۔۔؟" فہیم نا یہ لہجہ اختیار کر گیا۔

"بذات سے ۔۔ یہ تا سستی کہتی ہے نا ۔۔!" وہ جیتہ بولی۔ اور نسرین کے لبوں پر مسکراہٹ

"اچھا ٹھیک ہے ۔۔ میں غور کروں گا، پھر تم "گی نا ۔۔؟" وہ اپنی شوخ فطرت کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اُف تو یہ ہیں آخر دوسروں کے بارے میں اپنی غیر شائستگی چھپا تیں سکتے آپ ۔۔؟"

"اس کا فیصلہ تم اپنی نسرین سے کبھی بے سکتی ہو کہ میں شائستہ ہوں کہ ۔۔۔۔" اس نے نسرین کے چہرے پر اپنی نگاہیں، ہمدردی، التفات اور حمایت پانے کے لئے جما دیں۔

"آپ تا اس کمرہ کو شاید یورپین انداز سے بنانے پسند ہوئے ہیں نا ۔۔" نسرین کے لبوں نے پہلی بار شاید شوخی کو پا یا۔

"طب ۔۔!" فہیم پھر چہکا "میرا تو کہنا تھا کہ ابھی ہمارے ہندوستان کی کسی بھی عورت کو "یورپین اور" میں نمائندگی نہیں مل سکے گی۔ مگر آپ ۔۔؟" اس نے ایک بار پھر نسرین پر نظر ڈالی ۔۔ اور نسرین جھینپ گئی کیونکہ فہیم کی ذکاوت آمیز شوخی نے اس کو یاد کرا دیا تھا کہ اگر اب کی بار اگر اُس نے کچھ کہا۔ تب وہ اس سے کہیں زیادہ اس کی بات کرے گا۔ اسے لئے وہ جواباً خاموشی اختیار کر گئی۔ مگر تم اُن کا مانتے ہوئے بولی ۔۔

"اب آپ کو مجھ سے بھی معافی مانگنی پڑے گی تب ہی میں بولوں گی ۔۔!" اور وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر کے کمرے کی جانب چلی گئی۔ اور اب وہ پھر تنہا رہ گئی۔

اپنے کمرہ، جذبوں اور خیالوں کے ساتھ وہ عجیب اُلجھن میں گھر گئی۔ فہیم اس کی کشمکش کو پرکھتے ہوئے بولا

"اس دن میں نے چند فرشتہ شستہ باتیں آپ کو کہہ دی تھیں اس لئے معافی چاہتا ہوں ۔۔"

"معافی کیسی ۔۔؟ آپ نے کچھ غلط بات تو نہیں کہی تھی اس دن کہا ۔۔!" اس نے پاگل بچوں کی طرح آنکھیں جھپکائیں۔ اُس کے چہرے پر کھلتی ہوئی دیکھ کر فہیم پھر بولا۔

"آپ یہاں کی تنہا ئیوں اور خاموشیوں۔ گھبراتی نہیں کیا ۔۔؟ ہمارے ہاں تو گھبرا یا کرتے۔

"کام میں وقت نہیں ملتا نہ ۔۔!" اپنے ڈھکے چھپے جذبوں کا اظہار کر بیٹھی۔ اور فہیم بڑے چاؤ سے اُسے اپنے دل کی بات بتانے لگا۔

"میں نے آپ میں ایسی سنجیدگی پائی ہے جس کی میں ہمیشہ متمنا رہا تھا ۔۔!"

"اور میں نے آپ میں انکی کی خوشی ۔۔۔!" اُس نے اپنی ساری جھینپ ختم کر دی اور پھر بولی "یہ چائے پی لیجئے ۔۔۔ یہ ٹھنڈی ہو گئی ہے شاید ۔۔۔"

"نہیں ۔۔ میں سرد چیزوں کا عادی ہوں۔" اُس نے خود بھی سرد تا سا جواب دیا۔

اور وہ اپنے نفیس جذبوں کو سنبھالے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فہیم کی پُرکشش شخصیت نے جو اثر اس کے وجود پر چھا گئی۔ وہ لرزتے لہجہ میں بولی

"پتہ نہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنا بچپن آپ کے ساتھ کھیل کر گزارا ہے ۔۔؟"

"شاید خوابوں کی انجمن میں ۔۔!" فہیم بھی غیر سنجیدہ ہو گیا۔

"ایسا ہی کچھ سمجھ لیجئے ۔۔ مگر لگتا ہے جیسے میرے خواب اب زندگی کے دامن کو چھو رہے ہیں شاید ۔۔" وہ پھر جذباتی ہو گئی۔

"اور میں اس زندگی کو پانے کی کوشش کروں تب ۔۔۔۔۔؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں ۔۔ یہ بات بڑوں کے سامنے دہرانے کی ہے ۔۔!" اُس نے اپنے دل کی بات کہی اپنے جذبوں کی ترجمانی کی ۔۔

اور اب فہیم نے اُس کے سمیں ہاتھ کو تھام لیا اور وہ جھجک گئی۔ کیوں کہ اسی دوران تم بھی واپس آگئی تھی۔ اپنے باریک لہجہ میں نسرین بولی "کچھ لوگ فرشتہ سیرت ہوتے ہیں اور یہ نام ہمیشہ زندگی کو دیتے ہیں۔"

"حضرت بچوں کی بات سے ایک بچہ ہے۔"

"ترنم! میں اپنے بارے میں اس قسم کی خبر سننے کا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں اب تم سے بغیر معافی مانگوائے بات نہیں کروں گا۔" فہیم نے اس کو چھیڑا۔

"چلئے جا" ترنم مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے بولی۔ "اب زیادہ دیر بیٹھ کر اس کا دماغ کیوں خراب کر رہے ہو۔۔۔۔"

اور جواب میں فہیم سنجیدہ ہو گیا اور ترنم اس کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔

وہ تا دیر کھڑی فہیم کو جاتے دیکھتی رہی۔ اور ڈھیر سارے یقینی خواب و خیال میں الجھی رہی۔ تمام دن وہ اسی کیفیت میں ڈوبی ڈوبی کام کرتی رہی مگر آج اس کا دل کسی کام میں لگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ہر لمحہ فہیم کی شوخی بھری باتیں سنتی رہے چھیڑ کرتی رہے اور وہ اسے گدگداتا رہے۔ ستاتا رہے اُسے ایک نئی خوشی کا تیز سے احساس ہوا۔ اداسی بیزاری جھنجلاہٹ وہ مطالعہ کرتے کرتے نیند سے قریب ہو گئی اور پھر کے افسانوی مجموعہ۔ "یہ دل، یہ زخم" کو اپنے سینے پر رکھے سو گئی۔۔۔!

اور اس کیف آگیں ملاقات کے بعد وہ برابر ترنم کے گھر جانے لگی تنہائیوں کے لمحوں میں وہ فہیم کے قریب آتی گئی۔ اور وہ دونوں میں کچھ دھندلے، کچھ پہچان ہونے لگے۔ فہیم اپنی دلچسپ شخصیت کے ساتھ اس کے چہرے پر چھا جاتا۔ ایک دن وہ خود بھی طرح اس کے خیالوں اور خوابوں پر گم ہو گئی۔ مگر اچانک ہی ایک طوفان نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گئی۔ اور اس مرض کے شکنجے میں کھنچ کر بے حد کم زور ہو گئی۔ فہیم ترنم کو ساتھ لئے اس کو روزانہ دیکھنے آتا۔ تسلیاں دیتا ہمیشہ مسکرانے کو کہتا اور اس کے کھنچے پردہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔ مگر یہ مسکراہٹ دیر تک نہ رہتی جب تک وہ اس کے پاس بیٹھا رہتا اس کا دل سنبھلا رہتا۔ مگر جب وہ چلا جاتا اس کا دل پھر بے چین ہو جاتا۔ اس کی ہنسی، اس کی شوخی، اس کی باتیں اس کو بے چین کر دیتیں۔ وہ اس کی صحت یابی کے سلسلے میں ایک تقریب تھی۔ وہ ترنم کو مبارکباد دینے اس کے گھر گئی تھی۔ وہ نہیں ملی۔ فہیم نے پھر سے اپنی خوبصورت باتوں میں الجھا لیا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر وہ کہنے لگا "آپ مسکراتی ہیں اچھی لگتا ہے خاموش رہتی ہیں ....."

اور وہ اس کے خلوص کو پا کر مسرت سی اپنے وجود میں رینگتی محسوس کرنے لگی۔ کافی دیر بعد وہ واپس لوٹی۔ اس دن بھی وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی فہیم نے اس دن اُسے ایک خاص جذبہ سے سرشار دیکھ کر چھیڑا تھا "کیا کسی کو قتل کر دینے کا ارادہ ہے آج....؟" اور وہ فہیم کے شوخ لہجے پر شرما کر رہ گئی تھی۔ اس نے اس کے بالوں میں گلاب کا مسکراتا پھول لگاتے ہوئے اس سے وعدہ لیا تھا "نسرین! اب جب کہ میری دعائیں کامیاب ہو گئی ہیں۔ کیا میں تمہیں اپنا کہہ سکتا ہوں؟"

اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے نرم ہاتھ کا لمس سونپتے ہوئے جواب دیا تھا "زندگی اگر مجھے واپس ملی ہے تب اس کے آپ ہی امین ہیں۔ مگر.....!!" اور اسی لمحہ وہ گھبرا کر اس سے جدا ہو گئی۔ اس کے جسم میں سناٹے دوڑ گئے۔ بھیا کی جھکی نظریں اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ فہیم ڈر کر بھاگا نہیں۔ اپنی جگہ پر ثابت قدم کھڑا رہا۔ اور وہ گھبراتے ہوئے گلا صاف کر کے اندر چلی گئی۔ بھیا میں اور فہیم میں کیا فرق ہوتا ہے اسے پتہ نہیں چلا۔ مگر لگے ہی دن سے گھر والوں کی سختیوں نے اس کے پاؤں میں نئی زنجیریں پہنا دیں۔ مگر اس کے جذبات چاہت کے نام پر سرد نہ ہو سکے۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ اس کے ارادوں میں پختگی آ گئی۔ اور اس کی چاہت میں نکھار۔!!"

اور فہیم نے بھی کھلم کھلا اس کے اور اپنے والدین کے سامنے اپنی محبت کو واضح کر دیا کہ وہ نسرین کو چاہتا ہے۔ اسی سے شادی کرے گا۔!

اور اس کی اٹل چاہت کو دیکھتے ہوئے نسرین کے چچا نے دو سال پہلے اسے فہیم سے منسوب کر دیا تھا۔ شادی کا مسئلہ اس وقت بھی تیزی سے اٹھا تھا۔ جلدی اس کے والدین کی طرف سے تھی۔ مگر فہیم کے والدین نے یہ عذر کر کے شادی آگے کو ملتوی کر دی تھی کہ جب تک فہیم ملازمت نہیں کرتا تب تک شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور میاں بی لاجواب ہو کر رہ گئے تھے۔ اور وہ خود اپنے سارے خوابوں اور چاہتوں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے احساس دلایا گیا تھا یہ دوری جلد ہی قربت میں بدل جائے گی۔ فہیم جلد ہی ملازمت حاصل کر لے گا اس کی ذہانت مناسب کے تحت اسے کہیں بھی ملازمت مل سکتی تھی۔

مگر جب ایک سال یوں ہی بیکاری میں گزر گیا تب اس کو انتظار کے لمحے جان لیوا معلوم ہوئے۔ اپنے ملک کی معاشیات اور اقتصادیات پر کفت خفا تھا۔ وہ سوچتی کیا اسی طور پر ہمارا ملک دنیا کے سارے بڑے ملکوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے گا۔ مگر ملک کے اندر اقتصادی اور معاشی حالات کو بہتر اور اچھا سمجھنے والے ہمارا ملک کتنے پیچھے ہے۔ کتنے تعلیم یافتہ نوجوان بیکار رہ کر اپنی زندگی کی خواہشوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اپنی صلاحیات ضائع کر رہے ہیں۔ سبھی ملازمت نہیں ملتی۔ صنعتی کام نہیں ملتا۔ اکثر و بیشتر وہ افراد ہیں پڑھتی۔ کتنے افراد بے روزگار ہیں۔ کتنے تعلیم یافتہ نوجوان اپنی ڈگریاں پھاڑ چکے ہیں۔ کتنے تعلیم یافتہ نوجوان بے کاری سے تنگ آ کر بوٹ پالش کر رہے ہیں، جنرل اور اخبار بیچ کر گزارہ کر رہے ہیں۔ کتنے خودکشی کر چکے ہیں اور فہیم..... اس کا ایک دم فرسٹریشن کا شکار ہو جاتا۔ فہیم بھی تو اچھا سا ہے مگر بے کار ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ بے کاری سے نکل آتا..... اس کی فرسٹریشن دور کر دیتی۔ مگر اچانک ہی اسے پتہ چلا کہ فہیم

دو غزلیں

منظہر نظامی

حکایت باغباں کی ہے دشمنِ گل کی غفلت کا
یہ جو کچھ ہو رہا ہے کھیل ہے اپنی ہی قسمت کا
وہ آئے سامنے لیکن برا ہو اپنی قسمت کا
نقاب اٹھی تو پردہ پڑ گیا آنکھوں پہ حیرت کا
محافظ ہیں گلوں کے اور گل چیں سے عداوت ہے
سبق سیکھے کوئی کانٹوں سے دستورِ محبت کا
یہ جلد بازی کا کبھی برعکس ہوتا ہے
سبق سیکھے کوئی کانٹوں سے دستورِ محبت کا
ہوا کرتے ہیں اپنے کام میں وہ کامیاب اکثر
بھروسہ جن کو ہوتا ہے خدا پر فتح و نصرت کا
چمن ہی پر نہیں ہے منحصر یہ بات اے منظہر
قفس میں بھی ملے گا آب و دانہ اپنی قسمت کا

بدر القریشی

اس کی کیا شانِ کبریائی ہے
زندگی لے کے موت آئی ہے
عشق کی راہ پُر ہے کانٹوں سے
دل کو ذوقِ برہنہ پائی ہے
شادمانی کے پھول مُرجھائے
جب کلی غم کی مسکرائی ہے
خاکِ ویرانہ چھاننے والے
دل کی دنیا کبھی بسائی ہے
مٹ گیا جو رہِ محبت میں
دائمی زیست اس نے پائی ہے
دل ہے پابند، دلستاں آزاد
کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

اس کے چہرہ و خدا دل کی رنگت ہوئی۔

دسری ۔ میری بہن مبارک ہو تجھے، فہیم کے والد نے خط لکھے ہیں، پڑھو اسے ..... فہیم اپنے فرض کے لئے ایسا کرنے اور اتنے بڑے انعام کے لئے مجبور تھا۔ وہ یہ سب سن کر بھڑک اٹھی۔ اور تیزی سے اس کے ہاتھ سے خط چھینتے ہوئے وہ پڑھنے لگی۔

میرے محترم بزرگ!

میرا یہ خط پا کر آپ میرا فرض ضرور ہوں گے اور میری طرف سے اپنے دل کی بدگمانی کو بھول کر مجھے مزید بدنام نہ کریں گے کیونکہ میں نے اپنے فرض کی ادائگی کے لئے ایسا کرنے کے لئے مجبور تھا۔ مجھے نئی نوکری کا اپوائنٹمنٹ لیٹر ابھی ملا ہے جس میں مجھے آگاہ کیا گیا ہے کہ میری ٹریننگ مکمل ہو چکی ہے لہذا میں جلد از جلد حاضر ہو کر اپنے فرض اور کام کو سنبھال لوں اور محاذِ جنگ پر تعینات ہو جاؤں۔ کیونکہ ہندی جارحیت پسندوں نے وادیٔ اور نیفا میں جو نیا محاذ کھولا ہے اس نے میرے جذبۂ وطنیت کو بری طرح للکارا ہے اسی لئے میری یہ خوشی اور شادی اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک میں اپنے ملک اور دھرتی ماتا کی ایک ایک انچ زمین کو چینیوں کی گرفت سے واپس نہ لے لوں گا۔ اس وقت تک میں واپس نہ لوٹوں گا اور اپنے وجود کو ملک کے لئے قربان کر دوں گا۔

گاڑی میں وقت کم ہونے کی وجہ سے کسی سے ملے بغیر اس یقین کے ساتھ محاذِ جنگ کی جانب جا رہا ہوں کہ کسی قسم کی بدگمانی آپ لوگوں کو بدگمان نہ کرے گی۔ بلکہ آپ لوگ میرے لئے اور ملک کے لئے ۔۔۔ ملک کی بہتری کے لئے کچھ نیک فیصلہ اور دعائیں کریں گے۔

سبھوں کا ۔۔۔ فہیم

اور خط پڑھ کر نہ جانے کیوں اس کی گردن فرد سے تن گئی، اور باپ کے پیچھے اکڑی اور میاں جی کو دیکھ مسکرا رہے تھے۔ اور تبسم ۔۔۔

منزل لودھیانوی

پتھر کے آنسو

اس دنیا کی تعمیر یہ دکھانے کے لئے نہیں ہوئی ہے۔ یہ دنیا خوشیوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ غریب تو اس بے جان مشینوں کی طرح ہیں جو دن رات چل کر مالک کے لئے ڈھیروں مال بناتی ہیں۔ ڈھیر سا مال جس کے سینے میں عشرتیں رقصاں رہتی ہیں اور یہ عشرتیں مالک کے لئے ہوتی ہیں مشینوں کے لئے نہیں۔ غریب تو ان مشینوں کی طرح ہیں جو دن رات تیل پی پی کر کسی گھرانے کو شاداب بنائے رکھتے ہیں، اور یہ شادابی ان مشینوں کی روح چوستی رہتی ہے۔ یا اُن ستاروں کی طرح ہیں جو اپنے جسم و روح کو جلا کر ظلمتوں کے سیلاب میں اجالوں کی کرنیں پیدا کرتے ہیں ظلمتیں جو ستاروں کی قدر پر ہنسا کرتی ہیں اور یہ ہنسی جو دنیا کو روح تک عطا کرتی ہے۔ ان ستاروں کے دل سے نکل کر بھی کتنی دور جا کر دم توڑتی ہے ــــ

یہ ہنسی ــــ ہا ہا ــــ روشنی کی یہ لہر ــــ ہا ہا ہا

اور میری فکروں میں مسکراتی ہوئی روشنی سمٹ آئی۔ یہ ہنسنا جو ہنسی اور روشنی کا ملا جلا روپ تھی میرے خیالوں میں جاگ اٹھی۔ زندگی دس سال پیچھے سرک گئی۔ گزرے ہوئے ملاقات ذہن کے پردوں میں نئے رنگ بھرنے لگے۔ رنگ جن میں محبت اور اس کا تیز جواب مثلاً رہا تھا۔ بالکل ان پتنگوں کی طرح جو اپنے پیارے سے بے نیاز ہو کر اُڑ رہے ہوں ــــ بہت خوبصورت تھی امینہ ــــ ویسے تو لڑکیاں خوبصورت ہوا ہی کرتی ہیں لیکن یہ امینہ تو حقیقی خوبصورت تھی، اس سے زیادہ کسی نے اپنے خوبصورت ہونے کا گھمنڈ نہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ طرح طرح کے بناؤ سنگار کر کے محفل میں جس کی نظروں میں ایک بار آ جاتی رہتی تھی لوگ مجھے ایسی نظروں سے دیکھیں جیسے میں دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی ہوں ــــ یا کبھی کبھی اس کو بے پناہ تعریف خیز نظروں سے دیکھتا دیکھ لیتے۔ زمانے کی بھیدی سمجھ لیتی جیسے دیکھتے اسے اکثر کوئی بڑی بات یاد آ جاتی جس پر یہ کتاب نما لڑکی ہنس دیتی تھی۔ ایک ہنسی میں بھی تھا

اور کوئی چاہے نہ سوچتا ہو لیکن مجھے یہ خیال اکثر آ جایا کرتا کہ امینہ مجھے دیکھ کر منہ کیوں بھگا لیتی ہے۔ جب کہ یہ کہا جاتا ہے کہ تعریف خیز نظریں جوان لڑکی پر دلکشی کرنے کا کام کرتی ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا۔ مگر کچھ سمجھ نہ پاتا اس برس امینہ کا سولھواں سال ہے۔ یا تھا۔ یہ دھوپ کا چاند سولھویں سال میں تھا۔ یہ ایک دست تھا جس کا بایاں کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ چنانچہ جو جو خوبیاں پیچھے والوں میں ہوا کرتی ہیں وہ بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ جو اس کی روحانی زندگی میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ امینہ کو بھی مرکز خیال بنائے ہوئے تھا۔ یہ حسینوں کا گریز ان کے قرب سے زیادہ حسین اور کشش آمیز ہوتا ہے۔ اور مجید یہاں اپنے ماحول کی ہر لڑکی سے کھل کر مل سکتا تھا۔ امینہ سے اُسے بات کرنے کا موقع نصیب نہ تھا۔ اس کی نے اس کے ذہن کو بری طرح امینہ کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ دیوتا نے سب کچھ دے رکھا تھا اور کوئی کام تو تھا ہی نہیں "بھگی بھگی کے بھیرے" اس کا کام اس بن کر رہ گئے تھے جس کی اسٹیشن ہی وہ ڈیوٹی اٹھنے کے خیال تک کر رہا تھا ــــ شاید امینہ اور اس کے ابا کہیں جا رہے تھے۔ دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک طرف سے میں کی کار رکنے کی آہٹ ہوئی ــــ

"آداب عرض ہے" ایک مجسم ارمان کار سے باہر آتے ہوئے مسکرایا۔

"جیتے رہو بیٹے" کسی دوسرے کو کہتے ہوئے سلام کا جواب تو نہیں دے گیا، بڈھے کے چہرے پر ہلکا پن تھا۔

"کہاں تشریف لئے جا رہے ہیں آپ" مصافحہ کو بڑھتے ہوئے ہاتھ مہک اٹھے۔

"کہیں نہیں بیٹا، ذرا اسٹیشن تک جا رہا ہوں" خمیدہ کمر کو جیسے اسٹیشن کی ڈیوڑھی کھا گئی۔

"میں بھی اسٹیشن ہی جا رہا ہوں، چلئے نا آپ بھی میرے ساتھ" کہتے ہوئے مجید نے اقبال میاں کو کار میں بٹھا دیا۔ کار اسٹارٹ کرنی ہی چاہی تھی کہ اقبال میاں بولے۔ یہ امینہ بھی تو جائے گی صاحبزادے۔

مجید کی مسکراہٹ بول رہی تھی "ارے بڈھے امینہ کی وجہ سے تو تجھے کار میں بٹھایا ہے نہ تیرے پیر کون سی کار کی شان کم تھی۔ تاہم ماتھے پر تعجب کی بناوٹی شکنیں اُبھار کر مجید نے کہا "اچھا تو آپ ان سے کہدیں کہ یہ بھی تشریف رکھیں ــــ"

میں پاس ہی ایک اسٹال پر چائے پی رہا تھا

امینہ کار میں بیٹھ گئی اور کار فراٹے بھرنے لگی۔ زندگی کبھی کبھی ناہموار ہو جایا کرتی ہے۔ اُسے میں تو حادثہ ہی کہوں گا اس حادثے نے میرے سامنے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا ــــ ایک طرف امینہ اور اس کا خاندان، دوسری طرف مجید اور اس کی خرد شکن دولت۔ بالکل غیر ارادی طور پر شناسائی ہوتی چلی گئی۔ گھنٹی بجنے سے کچھ پہلے ہی میں کھڑکی پر پہنچ گیا۔ ٹیلوں سے بچنے کے لئے میں کام میں لگا ہوا تھا

لیکن بیچارگی نے جو حوصلے توڑ لئے ہوں۔ میں اس نقاہت سے زیادہ کام نہ لے سکا جس پر مضمحل روح تھکن بیل کی طرح گھنٹے پٹخے قدم ڈال رہی تھی۔ شام تک یہ ادا بھی بڑھتی بڑھتی گئی۔ کبھی یہ خیال بھی آیا کہ ماں کو کیا سوجھی تھی جو بچپنے میں ہی اس لڑکی سے میری منگنی کر ڈالی پھر خیال آیا شاید یہ اس لئے کہ قدرت نے بیٹے کا سہرا دیکھنا تو قسمت میں لکھا تھا۔ منگنی کر کے ہی میری صورت دیکھ گئیں اور ان بے ضابطہ خیالوں نے رات کا کھانا بھی حرام کر دیا تھا۔ کھانے کے ساتھ پہلے والا وہ کڑوا بھی میری نظروں میں گھوم گیا جہاں میں اکیلا رہا کرتا تھا دن بھر فیکٹری کے کام کی تھکن اور ملک کی ڈانٹ ڈپٹ، رچیڈ احساس لئے رائیگاں گزرتا۔ حالانکہ کمرہ میں صرف ایک ہی چارپائی کی جگہ تھی۔ مگر میرے لئے اس وقت یہ بہت کافی تھی کیونکہ دوسری چارپائی سے مجھے مطلب نہ تھا۔ ایک ماں ہی ماں تھی وہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی ــــ اور جب اعجاز اقبال یہاں گھر واپس آئے تو مجید دوستانہ ان کے یہاں کھانے لگا تھا مجید اب مجھ سے بہت کم ملتا۔ وہ کام جو مجھ سے ہی ہو سکتا تھا۔ بغیر میرے سہارے کے پورا ہو رہا تھا تو پھر اسے مجھ سے ملنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتا اور ہوتا چلی گئی اور ایک دن میں اقبال کے یہاں پہنچ گیا۔ ان سے وہ بات دہرائی جو والدہ مرحومہ نے کہہ کی تھی۔ پہلے تو وہ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد بولے "بیٹے یہ آزادی کا زمانہ ہے۔ تم ٹھہرو میں ابھی اعجاز کو بلائے لیتا ہوں۔ یہ تم دونوں کی آپس کی ہم عمروں کی بات تھی۔ آج تم دونوں سیانے ہو گئے ہو تم دونوں آپس میں بات کر لو۔ میں اسے برا نہیں سمجھتا۔" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اعجاز ہم دونوں کے درمیان تھی۔

"پانی تو پی لیجئے۔ آپ کی کہانیاں تو آپ کو یہ سکھا ہی نہیں سکتے۔ ذرا سنئے کہ ابھی آپ نے کیا مانگا تھا۔" اعجاز مسکرا رہی تھی اور اس کی گود میں لگا ہوا اسلم میری گود میں آنے کو مچل رہا تھا۔

مجید نے گلاس اعجاز کے ہاتھ سے لے کر اس سے پہلے کہ وہ کہے کہ "لیجئے نا اسلم کو دیکھئے آپ کی گود کے لئے کتنا مچل رہا ہے" اس سے کہہ دیا کہ تم جا سکتی ہو۔

قصہ کا سلسلہ اتنی دیر ٹوٹا ضرور مگر لیکن بعض بعض یادیں اتنی حسین ہوتی ہیں کہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد بھی ان کی کڑیاں خود بخود جڑ جایا کرتی ہیں۔ میں ایک بار پھر انہی دنوں میں تھا

آج کی امینہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی اور سولھویں سال کا چودھویں کا چاند۔ فتنہ بھری مسکراہٹ لئے خیالوں میں بھی ــــ "کیا بات ہے آپا جان ــــ" اس کی تلخ آواز میرے احساس کو تھرا گئی تھی۔

"بیٹی! یہ افضل آیا ہے۔ اس وقت تم دونوں بچے تھے۔ جب ہم نے اور اس کی ماں نے مل کر تم دونوں کی منگنی کر دی تھی۔ لیکن اب وقت اور وقت کے تقاضے بدلتے جا رہے ہیں۔ اب تم دونوں سے اللہ جان ہو چاہتا ہوں کہ تم خود ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کر لو ــــ"

امینہ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا "ابا جان میں آپ سے زیادہ تو نہیں جانتی لیکن یہ بھی نہیں چاہتی کہ شام تک کے لئے ہوئے دو روپوں سے بیاہ سے آٹھ دال شکرانہ ادا کر دوں۔ ویسے میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی اور یہ جانتے ہوئے کہ آپ سوچ سمجھ کر مجھے جہنم میں دھکیل ہی نہیں سکیں گے۔ کہتی کہتی وہ چلی گئی۔

"امینہ ــــ! ــــ! ــــ!" اور یہ آواز بچے کی ہی میرے منہ سے نکل گئی۔ جیسے سن کر امینہ کمرے سے دوڑ کر آئی۔ "کیا بات ہے، بڑی گھبرائی ہوئی آواز دی آپ نے" میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے اسے ٹالا "دیکھو امینہ میرا کوٹ جلد ٹھیک کر دو۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ دو روپیہ کر کے دو گی ــــ" یہ سن کر امینہ کے آنسو چھلک اٹھے اور اسی سنجیدگی سے اس نے جواب دیا "اچھا ابا جی"

پرانی یاد کا مزہ لیتا وہ کمرے میں چلی گئی۔ اپنے ذہن کی چھائی ہوئی یادوں میں شدت حالی چھوٹے پڑ رہا تھا کچھ دنوں تک میری طبیعت خراب رہی تھی۔ جس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ واقعی مجھے امینہ سے محبت تھی۔ لیکن مایوسی کی وہ آخری حد جو مجید اور امینہ کی شادی کی خبر تھی، سے سن کر میں خود کو بے بس سمجھنے لگا تھا۔ میں نے پھر سے اپنی زندگی کو سنبھال لیا اور ایک دن میں کام پر جا رہا تھا امینہ وہاں اپنی بچی کی کار میں بیٹھی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ کتنی پتھر تھی امینہ ــــ

دیروں کی سیج کے پھول، روز بدلے جاتے ہیں کوئی ایک خرچ چاہے ایک پھول کو کیا کچھ سمجھ کر جب تک وہ مرجھا نہ جائے احتیاط سے رکھے۔ شاید ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ امینہ کی جگہ مجید کے گھر میں شاہدہ نے لے لی۔ شاہدہ ایک مالدار آدمی کی بیٹی تھی۔ پیسے کی بات ایسی ہی ہوتی ہے اور امینہ ایک بار سسرال جا کر پھر نہ آ سکی۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا قدم چلتے چلتے رک گیا۔ آنکھیں اچانک اٹھ گئیں۔ سامنے امینہ کھڑی تھی ــــ

"امینہ تم اور اس وقت" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ برابر روئے جا رہی تھی۔ پتھر کے آنسو بہہ رہے تھے "کیوں آئی ہو امینہ" ہمدردی ایک بار پھر میرے دل میں جاگی۔

"اپنا سہاگ مانگنے" لڑکھڑاتی ہوئی آواز کو سنا۔ ــــ کون مجید، وہ میرے پاس کب آتا ہے۔ میرا تعجب مسکرایا "اچھا نہ بیٹھئے افضل صاحب، آپ کو قدرت نے ہمدرد حساس دل اس لئے عطا نہیں کیا کہ خود پر تنگ ہو کر پتھر روئے جا رہا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو امینہ صاف صاف کہو کیوں آئی ہو" بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی

"میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں، آپ کا گھر آپ کی

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

محمد حسین سودائی قادری بکاتی میرٹھی مقیم ماچھی گاؤں

میں مرجاؤں گا

[illegible] ہے کہ میں کراچی
[illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible] ۔ ۔ ۔ [illegible]
[illegible] ۔ ۔ ۔ [illegible]
[illegible] ۔ ۔

ہو گئی ہے۔ تھا اب بس سیدھے ہاتھ سے دوسرا موڑ چلا جائے۔ اسی راستے سے ہم روز رات تفریح میں گزرتے جاتے اور کبھی ہوٹل سے کھانا کھا کر بھی واپس آ جاتے۔

ناہید نے اگر سہیلی کا بہانہ کر دیا تھا جان پر بن گئی تھی۔

نواب زادہ جوان سال سرزمین دیدہ زیب خود دست بدیاں سارا زادہ اگلا اٹھا۔ اس نے قدم بہ قدم چلنا سیکھا۔ سرتوں کے خدوخال نمایاں ہوئے۔ انجانی خوشی سے جھوم اٹھے۔ جیسے دیکھیں پوری ہو گئیں۔ آشا روپ میں جاگ گئی۔ پیاروں کی نصیب ور فواد ہمارے دلوں کو چھلکنے دیتا ہا ہم ہیں بھرا ناچنے لگے۔ ہم چھتوں کی طرح چھلکنے لگے اور صاف چشموں کا پانی پینے لگے۔ تک آبادی کے ایسٹ ویسٹ میں گھر چھوڑ آئے تھے۔ دو دیے کے قریب ہیلیشن ویسٹ کی رنگینیاں ہم تو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہم تنگ سے محلے میں رہتے تھے ہم دونوں ہی تھک کر چور چور ہو رہے تھے۔

اب ہم بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے۔ میری چھٹیوں کا سارا وقت ناہید کی صحبت اور رفاقت میں گزر رہا تھا اور وہ بھی جس بیدردی سے فرض ادا کر رہے تھے اس کا کچھ حساب نہ تھا۔ مگر مجھے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ ناہید میری رگ رگ پر میں سرایت کر گئی تھی۔ میں وہ بات ناہید کے خیالوں میں گم تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تمام [illegible] ہو چکی تھیں۔ مجھے صرف ایک بات یاد [illegible] کہ ناہید میری جان ہے اور اس کے بغیر میں جی نہ سکوں گا۔ بس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہم ایک دوسرے کے قریب آتے تھے اور تیزی سے ہم ایک دوسرے میں گم ہوتے جا رہے تھے وہ ایک بہت حیرت انگیز بات تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسرت انگیز بھی۔

کالج کی منڈیر تھا اور ہم جو جانے والے تھے۔ دن بھر سمندر کی لہروں اور ریت کے ذروں سے کھیلنے کے بعد ناریل کی قطار کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ناہید کی گود میں سر رکھے میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سلمہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جو میرے وجود کو چیرتی چلی گئیں۔

"تو گویا آپ میری اس حرکت کو شکرا رہے ہیں"

سلمہ نے نہایت گمبھیرتا سے کہا۔

اور میں کانپ کانپ سا گیا۔ پھر اس کے بعد سلمہ چلی گئی۔

میرا ذہن بوجھل ہو گیا تھا۔ مگر ناہید کی رفاقت میں مجھے سکون مل گیا اور میں سب کچھ بھول گیا۔

اب میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی میں جلد ناہید کے منہ سے شادی کا ذکر سن لینا چاہتا تھا اسی کی کھینچی ہوئی لکیر کو پار کر لینا چاہتا تھا۔ مگر ناہید۔ ۹۔ نا ایک ملہوس چٹان تھی۔ اس نے مجھے چھیڑ چھاڑ کر کے کبھی لگے ہی پڑنے نہ دیا۔ شادی سے پہلے کچھ ہو گیا ہو تو مقدور کی بات تھی۔ اس نے مجھ سے صاف ہی کہا تھا میں شادی سے پہلے کوئی غلط قدم اٹھانے کی ہرگز طبیعت نہیں رکھتی۔!

میں بہت پریشان تھا۔ دوسرے دن نیند نہ آئی۔ رات بھر جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ دوسری صبح اطلاع ملی کہ میری شادی کی تاریخ مقرر کی جا چکی ہے اب یہ کھل پڑ گیا۔ میرے سامنے دو راہیں تھیں۔ میں کس کو کس پر ترجیح دوں۔ سلمہ میری منگیتر تھی۔ ناہید میری محبوبہ۔! اور وہ بھی ایسی جو میرے دل و دماغ پر چھا چکی ہے۔

شام تک مجھے تیز بخار چڑھ آیا۔ رات بھر نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑاتا رہا۔ مگر کہنے والی صبح کسی حد تک اطمینان بخش تھی۔ کیونکہ طوفان ٹھہر گیا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک دقتہ جس میں سلمہ سے معذرت کے ساتھ منگنی توڑنے کا اعلان تھا۔ میرے اس فیصلہ سے ان لوگوں پر کیا گزرے گی اس کی مجھے مطلق پروا نہ تھی اسی دن میں نے ناہید سے مل کر شادی کی بات چیت کی وہ بخوشی راضی ہو گئی۔ والدین کا کھٹکا کسی کو بھی نہ تھا نہ مجھے، نہ ناہید کو۔

ٹھیک آٹھ روز بعد شادی قرار پائی۔ میں بے حد خوش تھا۔ انتہائی مسرور۔!

آخر وہ مبارک دن بھی آیا۔ میرے عزیزوں نے مجھے پھولوں کی دبیز چادر اڑھا دی۔ میں بات سے کر ٹھیک آٹھ بجے ناہید کے مکان پر پہنچا۔ برآمدے میں پھولوں کے ایک آراستہ کرسی میں بٹھا دیئے گئے۔ بس دلہن کی اجازت کے نکاح پڑھا جانا تھا۔ حاضرین منتظر بیٹھے تھے۔ کچھ وقفہ کے بعد ناہید کے ابا آئے، ان کے ہاتھ

باقی صفحہ ۳۰ پر دیکھئے

یوسف عارفی

جینے کے لئے

رات کسی مشتعل دریا کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ ہواؤں میں آندھی نہ تھی مگر چلچلاہٹ تھی کہ بدن کا لمس لمس نہیں بلکہ ہتھوڑے کی کسی کاری ضرب کا احساس ہوتا تھا۔ وہ بہت دیر سے میونسپل کی کوڑی کے قریب بائیں جانب والے چبوترے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے بغل میں ٹکی ہوئی تھیلی اس طرح کھنچی ہوئی تھی، جیسے وہ تھیلی نہ ہو، بلکہ کوئی جان دار شے ہو۔ اس کے جسم پر ایک گہرے آسمانی رنگ کا کوٹ تھا۔ کوٹ کی اوپری جیب پر ایک قلم لٹکا ہوا تھا اور بقیہ ساری جیبیں خالی تھیں۔ سفید پتلون جگہ جگہ سے بگلی میلی ہو رہی تھی۔ اس کی بھی تین جیبیں خالی تھیں۔ لیکن بغل میں دبی ہوئی تھیلی بھری ہوئی تھی۔ کتابوں سے، سرٹیفکیٹ سے، اور غالباً نیٹروں سے! یکایک اس کے دونوں جبڑے آپس میں سختی سے بھنچ گئے اور ہونٹ بے سہارا ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ تھرتھرانے لگے۔ پیٹ کی آنتوں نے ایک عجیب سا راگ چھیڑ دیا۔ پھر اس کی آواز اس کے ذہن میں جیسے ہتھوڑے لگاتی محسوس ہوئی۔ وہ جوتے کے فیتے باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چاروں طرف ایک لمبا سکوت طاری تھا۔ ہر گھر پر خاموشی تھی۔ اور ہر چیز جیسے خاموشی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ سکوت کے دامن پر جیسے ہزاروں ہیرے بکھر گئے ہوں۔ دو رات کی پیشانی جیسے ان گنت شکنوں کا شکار ہو گئی۔ اس کے جوتوں کی چاپ برابر گونجتی رہی۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ تھکے ہوئے نڈھال قدم آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ یہ اجنبی گھر، یہ دیواریں، یہ اجنبی گلیاں اور ان کے راستے یہ مہیب سکوت اور یہ رات کا گھور اندھیرا جیسے سب کچھ اجنبی تھے یہاں تک کہ اسے اپنے آپ پر اجنبی ہونے کا شبہ ہوا۔ اور وہ اس شہر میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اس شہر میں آئے صرف ایک رات ہوئی تھی اور یہ دوسری رات تھی۔ پہلی رات تو بڑے فرسٹ ایک ہوٹل کے کمرے میں گزاری۔ صبح انٹرویو ہوا۔ اور انٹرویو کے بعد.....

وہ چونک پڑا۔ اس کے ساتھ کوئی سفید سایہ آ رہا تھا سایہ قریب آ گیا۔ وہ کوئی لڑکی تھی جسم پر سپید اسکوٹ کی شرٹ ساٹن کی سفید شلوار اور سینے پر فیروزی رنگ دوپٹہ تھا۔ اس کی زلفیں کسی جوتشی کی طرح اوپر کو گول سی بنی ہوئی تھیں۔ گلی تنگ تھی، راستہ محدود تھا وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک دوسرے کی سانسیں جسم، سرسراہٹ۔ خوشبو سب کچھ قریب آ گئیں۔ آنکھوں کا آنکھوں سے تصادم ہوا۔ اور ایک بجلی کی سی چمک ذہن کے پردوں میں ڈوب کر ابھری اور مٹ گئی جانی پہچانی نظروں کا ردِ عمل ہونٹوں پر ہوا۔

"تم ——!"

"آپ ——!!"

ہونٹ کپکپائے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

ذہنوں میں خیالات کا ہجوم تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں ایک خوف اپنا منہ چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔ اور ان کی اس اچانک ملاقات کا لمحہ جیسے رُک سا گیا۔ اس ساکت رات کی طرح جس میں اندھیرے کے دیو، سکوت کی مالا جپتے ہیں اور رات سرکنے نہیں پاتی۔

کل صبح ہی ان دونوں کی پہلی ملاقات انٹرویو کے ویٹنگ ہال میں ہوئی تھی۔ انٹرویو کے شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے اور سارے لڑکوں اور لڑکیوں کے دل یاس اور امید کے درمیان بے قراری کے جھولے میں جھول رہے تھے! وہ گھبرائی ہوئی سی آئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے چہرے پر کئی ایک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ہوائیاں تھی، الجھن تھی اور بے قراری تھی۔

"کیا انٹرویو ہو چکا ——؟" اس کی سانسیں جیسے ٹوٹ رہی تھیں۔

"جی نہیں۔ پانچ منٹ بعد شروع ہوگا۔"

"اوہ!" اس کے چہرے پر اطمینان کے سائے رینگ گئے۔

پھر وہ اجازت لے کر اس کے بازو میں بیٹھ گئی دھیرے دھیرے اجنبیت کا پردہ چاک ہونے لگا۔

وہ اسی شہر کی تھی۔ وہ کسی منصفہ کا تھا۔ وہ بی۔ ایس سی تھی اور یہ بی۔ کام۔ چار اکونٹنٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن ایمپلائمنٹ ایکس چینج سے تیس کو بھیجا گیا تھا۔ کچھ کے پاس سفارشی چٹھیاں تھیں اور کچھ کے پاس ڈگریوں کی قابلیت سے بڑھ کر ڈگریاں رکھنے والے تھے۔

پھر ——

انٹرویو شروع ہوا ——

انٹرویو ختم ہوا ——

بننے والوں کی تقدیر بن گئی۔ مختصر سی ملاقات کے لمحے، کچھ تو کامیابی کی خوشی سے اور کچھ ناکامی کے غم سے دوچار ہو کر، فراموش کر دیے گئے

طرحی مشاعرہ نمبر ۶۴

مصرع طرح

جلا کر آپ یہ قندیل خانے میں رکھ دینا

ناظم مشاعرہ

ابرا حسنی گنوری

غزل کے ساتھ اگر اضافی مشاعرہ یا اس کے قبادل چاہا جائے تو اس کے متعلق ضرور ارسال فرمائیں۔

مظہر انصاری ناگپوری

پس مرگ اک نشانی میری مے خانہ میں کھانا
مگر تم کہیں اسکو نہ بیمانے میں رکھ دینا

یہ چنگاری جہاں کی اک نہ اک دن بجھنے والی ہے
بجھے گی اس میں وقت آنے پہ واعظ کے مقدر کی

شہید جور تاباد ہوں اپنی وفا کی داد کا ماتم ہو
جسے سن کر جہاں نالوں کو تم سے عشق ہو جائے

فنا میرا طریق سوز ہاں کبھی کے کام تو آئے
محمد عبدالقیوم مست فتح پوری

نہ ساغر میں نہ شیشے میں نہ پیمانے میں رکھ دینا
جلا کر مے بچے ساقی کو میخانے میں رکھ دینا

تبسم کی جھلک ان کے لبوں پر کچھ تو آجائے
فنا ہستی کا حاصل ہے تو قطرہ خدا کیا

پھر ان کے سامنے آنے کی حسرت کس لئے باقی ہے
محبت ہے کسی جانی پہچانی، مرگ ناکامی

حدیث دیر دل نے مست سن کر دفعتہً چونکی
صادق سیمابی۔ بھٹنی

اگر منظور ہو تقوے کو پیمانے میں رکھ دینا
اگر چاہے بھر کے ساقی کبھی مجھ کو پلانی ہو

برہمن تو کبھی تو بت بھی پھر اس کو کہیں پوجیں گے
جگر دل سر انہیں جو بھی پسند آئے کھا لیں گے

کہیں دیوانہ ہو دنیا سے دنیا میں پھیلنے
مٹانے دل سے ہر اک آرزو کی کیا ضرورت ہے

خدا کا گھر ہے صادق بت کدوں کی کیا ضرورت ہے

اسمٰعیل ذبیح مالیگانوی

تم گلشن میں رکھ دینا ویرانے میں رکھ دینا
مری تربت کا کوئی پھول انجانے میں رکھ دینا

میں پی جاؤں گا تیرا نام لے کر سارا پیمانہ لیکن
پیتی ہے عرق کی بے میخانے میں رکھ دینا

یہ بھاری ہوں بتوں کا دوستو تم بعد مرنے کے
محبت کو مرے دل کے صنم خانے میں رکھ دینا

بٹھا پھر جائے زمانہ سن کے روداد الم میری
جناب شیخ کی دستار میخانے میں رکھ دینا

جہاں میں شمع کا کچھ اور روشن نام ہو جائے
مری میت اٹھا کر تم نہ ویرانے میں رکھ دینا

نقاب رخ اٹھا کر فرط اس لمحے آکر
کوئی ایسا بھی ٹکڑا ہے نہ افسانے میں رکھ دینا

ذبیح زار میری داستان غم جو ممکن ہو
نہیں لائق اگر کہنے کے تو خانے میں رکھ دینا

الطاف انصاری سلطان پوری

مری تشنہ لبی کا سوز میخانے میں رکھ دینا
مے عشرت کدے کے غم کے پیمانے میں رکھ دینا

ہمارا نام کی تھوڑی سی میخانے میں رکھ دینا
اگر کرنا ہی ہے شق تم ابھی محبت پر

کوئی ایسا بھی ٹکڑا ہے نہ افسانے میں رکھ دینا
نظر آتی ہے اس میں کچھ جنوں کی کارفرمائی

یہ سب آبادیاں لیجا کے ویرانے میں رکھ دینا
جہاں مدت کسی کی یاد نے گھر کر لیا ہے دل

دل و جاں، دین و ایماں پہلے تو ساقی کو دینا
تو تم شوق قسمت سے آئی تھی مجھ کو

یہ سب ٹکڑے ہمارے دل کے افسانے میں رکھ دینا
چلے جب لے کے الطاف تجھ کو بزم جاناں میں

کوئی چبھتا ہوا فقرہ اس افسانے میں رکھ دینا
علامہ بے باک۔ مالیگانوی

تو صادق شوق سے تم پاؤں میخانے میں رکھ دینا
مری تصویر دل کے آبنہ خانے میں رکھ دینا

تو میخانہ مرے چھوٹے سے پیمانے میں رکھ دینا
جو یاد اس پری وش کی محبت ہو اگر جاؤ

شبیہ حسن خلوت گر نہ بت خانے میں رکھ دینا
جناب شیخ اک تصویر تم اپنی بھی کھنچوا کر

ہمیں تو ساغر مے چیز نہ افسانے میں رکھ دینا
یہی کافی ہے میری زندگی برباد کرنے کو

کوئی مبہم سا ٹکڑا میرے افسانے میں رکھ دینا
یہ سن کر ہنس دیتا ہوں نہ ناصح مجھے جب یاد آتا ہے

جلا کر آپ یہ قندیل ویرانے میں رکھ دینا
پولیس و ڈاکٹر تو ہی سے میری قتل دو تو تل

مریض دل سے اٹھا کر کون خانے میں رکھ دینا
حکیم جب ابراق حکیم۔ پوری بھاگ پڑے

کہ کوثر کی طرح خاص مے خانے میں رکھ دینا

اگر یہ خیر ممکن ہو تو ویرانے میں رکھ دینا
کسی صورت مری میت کو میخانے میں رکھ دینا

مری میت سے ساقی جام مے خانہ سبو ہر سو
نہ ملنے کی ہر اک قیمتی کو پیمانے میں رکھ دینا

خدا کا گھر ہے واعظ بت کدوں کی کیا ضرورت ہے
مری تصویر لے جا کر صنم خانے میں رکھ دینا

تبسم کا انوکھا زہر پیمانے میں رکھ دینا
تم ایسا کوئی ضرور افسانے میں رکھ دینا

تمہارا بوکھلا کر پاؤں میخانے میں رکھ دینا
ذرا سنبھل محبت جا کے پروانے میں رکھ دینا

شراب ناب کی منگوا کے تم خانے میں رکھ دینا
چراغ حسن میرے دل کے کاشانے میں رکھ دینا

شراب حسن ساقی بھر کے پیمانے میں رکھ دینا
مرے محبوب کے آگے تو نذرانے میں رکھ دینا

ازل سے ظلمتِ شب کا خمیر شعلہ ہے
مرے خلوص سے دامن کو بچا نہ سکو
کوئی دل بھی کھو کر کچھ نہ پایا
فاتحہ بہتر ناک پڑھا

مزاجِ دوست اب برہم نہیں ہے
یہ شعلہ دو دہن اک لگ گئی تو
تمہارا استان اللہ اکبر
فراقِ یار اور آنکھوں میں آنسو
نہ کرا وہ دامنِ الکب غم سے
کہاں بہتر کہاں آذرؔ الم کی
خضر محمد خضر ناگ پوری

اسی اک ضد پہ ہے بنیادِ عالم
میں اوروں کی مصیبت سے ہوں غافل
زمانہ درپئے آزار ہے کیوں
ترا راہِ وفا پہ مرنے والا
کہوں کس سے سنے گا کون میری
مجھے اے خضر اس محفل سے مطلب
کاوش حیدری رائے پوری

یہ پیکا ہے آنکھ میری نم نہیں ہے
یہ غم ہے وہ ستا ئیں گے کسے پھر
بتوں کے آگے غم ہیں قلب و ایماں
شبِ فرقت تا دمِ صبح تصور
تمہاری یاد میں جب دل نہ تڑپے
بڑھی جاتی ہے تاریکی ہی کاوش
کوثر افضلی۔ بھیرہ

نگاہوں ہی کا وہ عالم نہیں ہے
ترے دامن سے ہے مجھ کو تعلق
مرا لغت باغ خشک و سنگ لائی
نہ رکھئے آرزو منزل رسی کی
اے تم بے اثر ہرگز نہ سمجھو
ہوا ہے حسن کی کوثر مطافت

ڈاکٹر تسلیم برہوی۔

مجھے بے مائگی کا غم نہیں ہے
قیامت ہے غمِ غربت اسیری
خدایا جستجو میرا سلامت
پسینہ آگیا خوفِ خزاں سے
جو بجھ جائے خلوصِ دل سے خالی
بانداز سکوں ماتم ہے دل کا
قفس اچھا ہے تعبیں آشیاں سے
نقے خاں طاق شوپورکلاں

یہاں کوثر وہاں زمزم نہیں ہے
مرا دل، دل ہے جام جم نہیں ہے
اٹھا دو تم حجاب رخ اٹھا دو
مرے غم کا اسے غم ہو تو کیوں ہو
نالی کار پر ماتم کناں ہوں
جو غداروں کے طاق سر اڑا دے
مٹی باغ جودھپور

کوئی مونس کوئی ہمدم نہیں ہے
محبت اک جہانِ جستجو ہے
تا دیوانہ سب کہتے ہیں مجھ کو
چلے چلتے ہیں منت آزمانے
سنا اے مطربِ کچھ اور نغمے
گماں ہوتا ہے پھولوں کی نمی پر
وہی پرانی بھیتی

یہ غم بھی ہم نشیں کچھ کم نہیں ہے
بھریں گے کس طرح زخمِ جدائی
الٰہی ہے امتیازِ جیب و داماں
تمہارا غم تو ہے مونس شبِ غم
ترے آگے بتا اے حسنِ آرا
وہی وہ لے کرے کیا راہ الفت
محمد صفدر چاندپوری

جدائی کا تری کچھ غم نہیں ہے

ستا یا درد دل کچھ کم نہیں ہے
نشیمن بھی قفس سے کم نہیں ہے
مجھے ناکامیوں کا غم نہیں ہے
گلوں کے رخ پہ یہ شبنم نہیں ہے
وہ سجدہ معصیت سے کم نہیں ہے
خوشی وجہ ضبطِ غم نہیں ہے
یہاں برقِ تپاں کا غم نہیں ہے

زمیں بھی آسماں سے کم نہیں ہے
مگر یہ جامِ جم سے کم نہیں ہے
یہاں کوئی بھی نامحرم نہیں ہے
ابھی وہ آشنائے غم نہیں ہے
شبابِ رفتہ کا ماتم نہیں ہے
کسی میں کیا اب آدم نہیں ہے

یہاں غم ہیں شریکِ غم نہیں ہے
محبت نقشِ آدم نہیں ہے
ترا احسان مجھ پر کم نہیں ہے
سنا ہے آہ وہ برہم نہیں ہے
ابھی قید وحید کا عالم نہیں ہے
یہ آنسو ہیں مرے شبنم نہیں ہے

کہ ہم کو آہ کوئی غم نہیں ہے
نگاہِ لطف کا مرہم نہیں ہے
ابھی جوشِ جنوں محکم نہیں ہے
یہ کیوں کہہ دوں کوئی ہمدم نہیں ہے
سرِ تسلیم کس کا غم نہیں ہے
کہ جس کا عزم مستحکم نہیں ہے

کہ دونوں میں ابھی الفت کم نہیں ہے

الوداع

موپاساں کا ایک شاہکار

ترجمہ: [illegible]

[illegible] میری ملاقات ہوئی۔ یہ موسم گرما کا ایک نہایت ہی خوبصورت دن تھا۔ صبح سے ہی ایک نیلگوں چادر کی طرح سمندر پھیلا ہوا تھا اور کنارے پر گاؤں میں خوبصورت لڑکیاں گرمی کے موسم میں استعمال ہونے والے ہلکے فراک پہنے اور زرق برق پوشاکیں زیب تن کئے چہل قدمی میں مصروف تھیں ان کے دلوں میں بہت سی حسرتیں بنہاں تھیں اور مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے تحت دل پسند اداؤں کے ساتھ لڑکوں سے کھیل رہی تھیں۔ وہاں کوئی بھی مرد عورت کے بہتے ہوئے جذبوں کو گلے سے لگا کر گھنٹوں تک آسانی سے دیکھ سکتا تھا وہ وہاں کس قدر بے باکی سے پہلی بازی میں مصروف تھیں۔

اور ان عورتوں میں سے ہی ایک عورت سے مجھے عشق ہو گیا۔ شدید عشق۔ پہلی نظر سے ہی۔ خدا جانے اس خلوص سے میری اس عورت سے ملاقات ہوئی جس کو میرا محبوب بننا تھا۔ اور جس سے محبت کر کے میں اپنا مقدر حل کرتا ہے۔ تعارف ہو جانے کے بعد ہی شدت سے اس سے محبت کرنے لگا۔ اس نے میرے دل پر کلی طور سے غلبہ پا لیا اور میں نے غیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے سامنے اپنی شکست قبول کر لی۔ اس کی زلفیں، اس کی آنکھیں، اس کی آواز اور صبح کی خوشگوار ہوا، ان چیزوں نے مجھے پاگل بنا دیا۔ کیونکہ اور محبت نے اس نوجوان لڑکی کو بھی اپنی شدت سے متاثر کیا تھا جیسے کہ اس نے مجھے کر لیا تھا۔

وہ شادی شدہ تھی۔ اس کا خاوند کہیں بیرون ملک تھا اور وہ محبت کرنے کے لئے [illegible] سے ملنا چاہتی تھی۔

اور جب میں نے اس
حسد و رشک کا کوئی جذبہ باقی نہ رہا
میں اس سے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے محبت کرنے لگا
وہ ازحد حسین تھی اور جوان بھی! اسے دیکھ کر مجھے یاد ہوا کہ محبت اپنے جسم کی ہر مختصر تفصیل اور اپنی ہر ادا کے لحاظ سے کتنی جاذب توجہ اور کس قدر پرکشش ہو سکتی ہے ——!

محبت کا یہ سلسلہ تین ماہ تک جاری رہا اور میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ امریکہ کے لئے روانہ ہوا۔ سال گزر جانے کے باوجود بھی میں اسے فراموش نہ کر سکا میں اس کی غیر حاضری میں بھی اس سے اسی شدت سے محبت کرتا تھا جیسا کہ اس کے قریب وہ کر میں ہوا سے اقرار اس سے محبت کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک حقیقی مقدر میں شبیہ ہے جو خوش قسمتی سے مجھے حاصل ہوئی۔

کسی انسان کی زندگی میں بارہ سال کا [illegible] بہت قلیل ہوتا ہے۔ سال کس قدر تیزی سے گزر جاتے ہیں دیکھتے دیکھتے ہی ایک انسان بوڑھا ہو جاتا ہے ——— میں گزشتہ بہار کے موسم میں اپنے [illegible] کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے پیرس آیا۔ جب میں [illegible] ڈبے میں سوار ہوا تو ایک [illegible] ساتھ چار [illegible] سوار ہو گئی۔ میں نے [illegible] اجنبی شکل سے [illegible]

کرنا ماضی کر کے کیا ایک سانس بھی خوشی کا لے سکتا ہوں نہیں، ہرگز نہیں واللہ، میں نے تمہیں چاہا ہے اور تم یہ اقرار خفگی ہو اس بات کی شاہد ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ رضیہ۔۔۔۔"

"وعدے تم اپنے پاس رکھو، مجھے نہیں چاہئیں" رضیہ نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے قبل ہی جواب دیا۔

"اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اب بھی اپنے وعدوں پر قائم ہوں"

"کاش! یہ سچ ہوتا۔!" رضیہ نے غمگین سانس بھر کر کہا

"وہم تم خواہ مخواہ وہم میں مبتلا ہو۔"

"وہم" رضیہ نے دہرایا "خیر وہم ہی سہی، اب آپ یہ بتلائیے کہ ملاقات کب ہو رہی ہے؟"

"کس سے؟" اسلم نے پوچھا اور پھر کچھ جواب نہ پا کر بولا "جب آپ فرمائیں بندہ حاضر ہے"

"اب میں کہاں آپ کو بلا سکتی ہوں۔ عائشہ سے دریافت کیجئے۔"

اب اسلم اپنے قہقہہ پر قابو نہ پا سکا۔ "آہ! حسد، رقابت۔!!!"

رضیہ خاموش کھڑی رہی۔

"خدا کی قسم رضیہ تم نے ذرا سی بات کو نجانے کیا سمجھ رکھا ہے، اتنا اعتماد، اتنا بھروسہ ہم محبت میں بھی نہیں کرتے گے۔!"

"اور اتنا ابھی قصور نہیں ہے، خدا نے عورتوں میں بھی یہ خاصیت دی ہے کہ بھنوروں کی طرح ہر تازہ پھول کا رس چوسیں۔ اور پھر۔۔۔۔" اس سے زیادہ رضیہ نہ کہہ سکی اور آنچل میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

اور جب کچھ دیر بعد رضیہ روچکی تو اسلم نے بیچینی سے کہا:

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور کوئی نئی بات کرو"

اسلم کا خیال تھا اب رضیہ نہ اٹھے گی۔

"ہاں ان باتوں کو چھوڑ بھی دوں تو کیا آپ اپنی نئی محبت سے باز آجائیں گے؟"

"ارے بھئی میں ہر جائی ہوں اور تم ہو کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو۔"

"تو اے ستمگر، مجھے سنانے سے کیا حاصل"

"اے تو یہ!" اسلم بوکھلا گیا اور اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"اور آپ کی سے فرمائش دریافت کرلیں گے اسے کیا دیں گے، قیمت میں ادا کریں گی؟"

"ایسی توفیق خدا ہر خاتون کو عطا فرمائے"

اسلم نے بھی رضیہ کو چھیڑا۔

اب رضیہ سے برداشت نہ ہو سکا اور بغیر کچھ کہے چلنے لگی

"ارے رضیہ، سنو تو، خدا کے لئے رک جاؤ۔ میری بات تو سنتی جاؤ۔ ایسا نہ ہو بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔!"

"وہ تو میں ابھی سے ہو رہی ہوں۔" جاتے جاتے رضیہ نے مڑ کر کہا۔

"یا خدا۔!"

"اسی کو یاد کیجئے جو دل کو مسرت، آنکھوں کو سرور سے لبریز کر دے، خدا کو تو مسجد میں یاد کیجئے۔"

اور رضیہ چلی گئی۔

وہ وہیں بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد۔

"رضیہ میں آج واپس آگیا ہوں۔"

"یہ خوش خبری پہلے کسی سے سنا دو۔"

"رضیہ۔!" اسلم طیش میں آگیا "وہ میری بھابی ہیں میرے دوست عادل کی شریک حیات سمجھیں، اور کچھ نہیں۔"

اور رضیہ پر جیسے بجلی گر پڑی ہو، وہ وہیں کھڑے کھڑے غش کھا کر گر پڑی۔

(بقیہ افسانہ "سہارا" صفحہ ۲۷ سے آگے)

پیچیدہ راہوں میں گم ہو گئی۔ مجھے تنہا دیکھ کر ہر طرف سے افسردہ و غم نے آگھیرا۔ آشا کی یاد آ آ کر مجھے شدت سے تڑپانے لگی۔ میرا جینا حرام کر دیا گیا۔ پھر تمہیں بتاؤ مدن! میں ایسی حالت میں کیا کرتا۔؟ کون تھا جو مجھے تسکین دیتا۔ مجھے صبر کی تلقین کرتا۔ اور دل کی دوا دے کر سکون و راحت سے بہرہ ور کرتا۔ سوائے اس شراب کے جو میری زندگی میں شریک ہو گئی ہے اور رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ وہی زنگین شراب تو ہے جو میرے سینکڑوں غموں کا واحد سہارا ہے۔ میری دنیا ہے میرا سب کچھ ہے، جس کا ایک جام حلق سے اتارنے کے بعد ماضی کی زندگی سے بے نیاز ہو جاتا ہوں اور سب کچھ بھول جاتا ہوں سب کچھ۔ خود کو بھی۔ اپنے آپ کو بھی۔!

بقیہ صدا اسرافیل (صفحہ ۷ سے آگے)

کے مستحق ہیں۔ صحیح اور بلند الطبعت وہی اٹھا سکتا ہے جو کتاب کو از اول تا آخر پڑھے۔ کتاب میں مقصد کو کہیں نہیں جانے دیا۔ چند فقیبیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں لکھی ہیں اور یہ فراخ دلی کا ثبوت ہے۔

مجھے علمی صاحب معاف فرمائیں کہ اشعار میں چند وزنی نقائص بھی واقع ہو گئے جن کی فن شاعری ممانعت کرتا ہے۔ شتاً یہ بھی لیکن۔ صدا بھی ہمیشہ قسم متروکات ہیں اور بھی چند دیگر عیوب نظر پڑے۔

بہرحال کتاب ہر طرح معلومات کا خزانہ اور ہر طرح مطالعہ میں رکھنے کے قابل ہے۔

مصرع طرح انعامی مشاعرہ نمبر ۶۳

جلا کر آپ یہ قندیل ویرانے میں رکھ دینا
ویرانے، ویرانے تو نہ رکھ دینا

قابل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۶۳ء

کرنا ماضی کر کے کیا ایک سانس بھی خوشی کا لے سکتا ہوں نہیں، ہرگز نہیں واللہ، میں نے تمہیں چاہا ہے اور تم اس انتظار کی شدت کو اس بات کی شاہد ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ رضیہ۔۔۔۔"

"وعدے تم اپنے پاس رکھو، مجھے نہیں چاہئیں" رضیہ نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے قبل ہی جواب دیا۔

"اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اب بھی اپنے وعدوں پر قائم ہوں"

"کاش! یہ سچ ہوتا۔!" رضیہ نے غمگین سانس بھر کر کہا

"وہم تم خواہ مخواہ وہم میں مبتلا ہو۔"

"وہم" رضیہ نے دہرایا "خیر وہم ہی سہی، اب آپ یہ بتلائیے کہ ملاقات کب ہو رہی ہے؟"

"کس سے؟" اسلم نے پوچھا اور پھر کچھ جواب نہ پا کر بولا "جب آپ فرمائیں بندہ حاضر ہے"

"اب میں کہاں آپ کو بلا سکتی ہوں۔ خدا سے دعا مانگیے۔"

اب اسلم اپنے قہقہہ پر قابو نہ پا سکا۔ "واہ! واہ! حسد، رقابت۔!!!"

رضیہ خاموش کھڑی رہی۔

"خدا کی قسم رضیہ تم نے ذرا سی بات کو نجانے کیا سمجھ رکھا ہے، اتنا اعتماد، اتنا بھروسہ ہم محبت میں بھی حاصل نہ کر سکے گی۔!"

"اور اتنا ابھی قصور نہیں ہے، خدا نے عورتوں میں بھی یہ خاصیت دی ہے کہ بعض دفعہ کی طرح ہر تازہ پھول کا رس چوسیں۔ اور پھر۔۔۔۔" اس سے زیادہ رضیہ نہ کہہ سکی اور آنچل میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

اور جب کچھ دیر بعد رضیہ روچکی تو اسلم نے بیچینی سے کہا:

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور کوئی نئی بات کرو"

اسلم کا خیال تھا اب رضیہ نہ اٹھے گی۔

"ہاں ان باتوں کو چھوڑ بھی دوں تو کیا آپ اپنی نئی محبت سے باز آجائیں گے؟"

"ارے یعنی میں باہر جا رہا ہوں اور تم ہو کہ کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔"

"تو اسے سنا دو، مجھے سنانے سے کیا حاصل"

"اسے تو یہ!" اسلم بوکھلا گیا اور اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"اور کسی سے فرانسیسی زبان سیکھ کر اسے کیا دو گے، قیمت میں ادا کر دوں گی؟"

"ایسی توفیق خدا ہر خاتون کو عطا فرمائے"

اسلم نے بھی رضیہ کو چھیڑا۔

اب رضیہ سے برداشت نہ ہو سکا اور بغیر کچھ کہے چلنے لگی

"ارے رضیہ، سنو تو، خدا کے لئے رک جاؤ۔ میری بات تو سنتی جاؤ۔ ایسا نہ ہو بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔!"

"وہ تو میں ابھی سے ہو رہی ہوں۔" جاتے جاتے رضیہ نے مڑ کر کہا۔

"یا خدا۔!"

"اسی کو یاد کیجئے جو دل کو مسرت، آنکھوں کو سرور سے لبریز کر دے، خدا کو تو مسجد میں یاد کیجئے۔"

اور رضیہ چلی گئی۔

وہ وہیں بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد۔

"رضیہ میں آج واپس آگیا ہوں۔"

"یہ خوش خبری پہلے کسی سے سنا دو۔"

"رضیہ۔!" اسلم طیش میں آگیا "وہ میری بھابی ہیں میرے دوست عادل کی شریک حیات سمجھیں، اور کچھ نہیں۔"

اور رضیہ پر جیسے بجلی گر پڑی ہو، وہ وہیں کھڑے کھڑے غش کھا کر گر پڑی۔

(بقیہ افسانہ "سہارا" صفحہ ۲۷ سے آگے)

پیچیدہ راہوں میں گم ہو گئی۔ مجھے تنہا دیکھ کر ہر طرف سے افسردہ و غم نے آگھیرا۔ آشا کی یاد آ آ کر مجھے شدت سے تڑپانے لگی۔ میرا جینا حرام کرنے لگی پھر تمہیں بتاؤ مدن! میں ایسی حالت میں کیا کرتا؟ کون تھا جو مجھے تسکین دیتا۔ مجھے صبر کی تلقین کرتا۔ اور دل کی دراڑ سے کرسکون دراڑ سے بہرہ ور کرتا۔ سوائے اس شراب کے جو میری زندگی میں شریک ہو گئی ہے اور رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ وہی زنگین شراب تو ہے جو میرے سینکڑوں غموں کا واحد سہارا ہے۔ میری دنیا ہے میرا سب کچھ ہے، جس کا ایک جام حلق سے اتارنے کے بعد ماضی کی زندگی سے بے نیاز ہو جاتا ہوں اور سب کچھ بھول جاتا ہوں سب کچھ۔ خود کو بھی۔ اپنے آپ کو بھی۔۔۔!

بقیہ صدا اسرافیل (صفحہ ۷ سے آگے)

کے مستحق ہیں۔ صحیح اور بلند الطبع وہی اٹھا سکتا ہے جو کتاب کو از اول تا آخر پڑھے۔ کتاب میں مقصد کو کہیں نہیں جانے دیا۔ چند فقیبیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں لکھی ہیں اور یہ فراخ دلی کا ثبوت ہے۔

مجھے علمی صاحب معاف فرمائیں کہ اشعار میں چند وزنی نقائص بھی واقع ہو گئے جن کی فن شاعری ممانعت کرتا ہے۔ شعر پہ بھی لیکن۔ صدا بھی ہمیشہ قسم کے متروکات میں اور بھی چند دیگر عیوب نظر پڑے۔

بہرحال کتاب ہر طرح معلومات کا خزانہ ہے اور ہر طرح مطالعہ میں رکھنے کے قابل ہے۔

مصرع طرح انعامی مشاعرہ نمبر ۶۳

جلا کر آپ یہ قندیل ویرانے میں رکھ دینا
ویرانے، ویرانے تو نہ رکھ دینا ویرانے

غزل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۶۳ء

طرحی مشاعرہ نمبر ۵۹

مصرع طرح

چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

غزل کے ساتھ قرین انعامی مشاعرہ یا اس کے متبادل
ہمارے نام کے تحت مزید ارسال فرمائیں۔

مرتبہ
مولانا ابرار احسنی گنوری

بیگ احسنی شکوہ آبادی

بہت دشوار جن کو زندگی معلوم ہوتی ہے
سیہ خانے میں دل کے چاندنی معلوم ہوتی ہے
کہ جو ملنے پہ یہاں کی اجنبی معلوم ہوتی ہے
ادھر اڑتی ہوئی کچھ خاک سی معلوم ہوتی ہے
مجھے تو اب اسی میں بہتری معلوم ہوتی ہے
اسی کو پی میں اگر زندگی معلوم ہوتی ہے
"چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

فیم

بہت دشوار ان کو زندگی معلوم ہوتی ہے
مری سادہ مزاجی کا ستانا دل شکن دنیا
تعالی اللہ میرے واقعۂ دل کی تابانی
جہاں پر مشتعل اب ہونے کو ہے زیر فلک شعلہ
بہت مدت میں کھلتا ہے کہ یہ جانِ پریشاں بھی
یہ کیا تنظیم خانہ ہے اے ساقی ے خانہ
پریشاں ہے نظام زندگی کچھ آج کل فیمی
محمد عبد القیوم صدیقی مست ۔ فتحپوری

بہت دشوار ان کو زندگی معلوم ہوتی ہے
بجھتوں میں بھی کچھ زندگی معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بہت ہی اجنبی معلوم ہوتی ہے
جہاں تک دیکھتا ہوں روشنی معلوم ہوتی ہے
اسیر آگہی دیوانگی معلوم ہوتی ہے
محبت رشتہ ایں دلگی معلوم ہوتی ہے
جدھر دیکھو ادھر اک کھلبلی معلوم ہوتی ہے
فراغ دوست میں کچھ برہمی معلوم ہوتی ہے

شعاع مہر میں اتنا دگی معلوم ہوتی ہے

کبھی اظہار غم چاہا نہیں تاہم نگاہوں سے
بجھا دو مشعل تہذیب نو، رہو عمل دائر
جس کے رنگ جلا سے بے خبر رہتا ہے دیوانہ
ضیائے ماہ کامل ہو چلی کم پے بہ پے آخر
نہ جانے کیوں کسی پہلو قرار آتا نہیں اس کو
کہو انصاف سے دیکھی بھی ہیں رنگینیاں اسکی
شناسا دشمن گوہر کوٹری

فراغ طور پر کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے
مرے قلب حزیں کی خستگی معلوم ہوتی ہے
جہاں اس روشنی میں تیرگی معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا اجنبی کو اجنبی معلوم ہوتی ہے
یہی بس چار دن کی زندگی معلوم ہوتی ہے
مزاج دہر میں آشفتگی معلوم ہوتی ہے
فضائے مست میں جو سادگی معلوم ہوتی ہے

حرارت کچھ نگاہ ناز کی معلوم ہوتی ہے
بہکنا دعظ میں واعظ تا تو بین بادہ پر
ستم سہنا جفا برداشت کرنا مسکرا جانا
گماں ہوتا ہے جیسے خود جلا کر رہ گئی دنیا
مرے رنگیں غزل پر لوگ کہ ہر سمت یہ کہتے ہیں
چھٹتا ہے مرے ہر شعر سے سافر محبت کا

مرے زخم جگر میں تازگی معلوم ہوتی ہے
مجھے تو یہ تری قوٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے
محبت کی مجھے یہ دلگی معلوم ہوتی ہے
نگاہ دوست جیسے دل جلی معلوم ہوتی ہے
کہ یہ اصلاح حضرت آبر کی معلوم ہوتی ہے
ہر اک مصرع میں شان آگہی معلوم ہوتی ہے

نہ آتے ہوں جنہیں کی میر کو وہ آتے گوہر
گفتگو کیوں جنہیں کی ہر گلی معلوم ہوتی ہے

سلیم آتی

سلیم آتی ہے جب وہ چاندنی صورت تصور میں
نہ جانے کیوں مجھے ہر رات پونم معلوم ہوتی ہے

پیچ کی طرح لہرا رہا تھا۔ زلزلہ کی سی کیفیت تھی۔ زمین کے بدن کی ساری گرمی ان کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ بھاڑ، بھونچال، بھونڈ، نامراد ایکٹروں نے میرا تین اور دو پاکیزہ باہوں میں اپنی گندگی جذب کی ہے میرے نازک مکانات کی بوقلمونی سے خلاف حسن وصول کیا ہے۔ مجھے ایک زندہ واقعہ بنا دیا ہے جینس کی ساری قیامتیں میرے وجود میں گھل رہی ہیں ——

پھر تم کیوں اس لذت سے محروم رہو جب کہ تم اس کے پورے مستحق ہو ——!"

"بنتی! ضد چھوڑ دو۔ عورت کے وجود کو بدنام نہ کرو۔ تم ایک ماں، ایک بیوی، ایک بیٹی جو خدا اور دنیا کی نظر میں کامل ہے تم تنہا نہیں ہو ——"

"میں جانتا ہوں۔ معاشرہ نفاق سے ساتھ شیطانی سلوک کیا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہر کسی کے لئے اپنا باب مسدود کر دو۔ اس دانائی کو تم کہہ نہ سکو گے کہ وہ صرف تسلیم کیا جا سکتا ہے —— میں اس معاملہ سے نبٹ لوں گا تم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔"

"سودا، سودا! میرے زخموں پر مرہم نہ چھڑکو۔ تم نے نہ جانے کس سماج سے لڑ کر یہ نیا راستہ نکالا ہے۔ میں اس سماج سے لڑ بھی نہیں سکتا۔ میرا کام آسان ہو جائے گ

ان سے بیان کر دوں گا۔ شاید کچھ صحت نکل آئے!

"اچھا تو میں چلتا ہوں" موہن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں" اس نے اٹھ کر موہن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" موہن نے پھر پوچھا گویا کہ اس کا باہر جانا اسے بھی غیر ضروری معلوم ہوا ہو۔

"مجھے بھی جانا ہے پرنسپل صاحب کے ہاں" اس نے کہا۔

دونوں دوست تیار ہوئے اور چل دیئے۔ موہن تو نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ہاں وہ سیدھا پرنسپل صاحب کے دفتر میں گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا ان کے بنگلے پر پہنچا۔ لیکن جب واپس لوٹا تو چہرے پر کوئی تبدیلی عیاں نہ تھی وہی بابو سی اداسی بکھری ہوئی تھی۔ وہ گھر واپس آکر چارپائی پر دراز ہو گیا کہ شاید نیند ہی آجائے، شاید پیچینی ہی کم ہو جائے۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ قدرت مغرب کی آغوش میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بادلوں پر سیندوری کرنیں اپنا پرتو ڈال رہی تھیں کالے کالے بادلوں پر کوئی ایک دو شیزہ کی مانگ میں گئے سندور سے کم نہ تھیں۔ دن بھر اڑنے پھرنے والے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ ان کی چہچہاہٹ فضا میں ایک پیغام چھوڑ رہی تھی۔ سورج اب پوری طرح چھپ گیا تھا۔ لیکن روشنی اب بھی تھی۔ جیسے معشوق کے چلے جانے کے بعد عاشق کا دل حسن کی تجلی سے منور رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح فضا اب بھی منور تھی لیکن اس کے کمرے میں تاریکی تھی۔ وہی دائمی تاریکی دل و دماغ میں تھی ——

کوئی روشنی کی کرن نہ آنی تھی اس کے ظلمت کدہ میں کیا کوئی شمع روشن ہو گی اس کے ویران خانۂ دل میں بھی۔ کیا اس غم کدہ میں کوئی خوشی کا چراغ بھی جلے گا؟ کب ——؟

وہ بالکل پر امید نہ تھا۔

"اف! مجھے تو شرم کے پاس بھی جانا تھا" یہ الفاظ اس کے دل سے نکل کر دیواروں سے ٹکراتے ہوئے سنائی دیئے وہ جلدی جلدی اٹھا اور باہر چل دیا۔ باہر اندھیرا ہو رہا تھا۔ چراغاں ہو چکے تھے۔ شرکی دوکان بہت دور تھی۔ کیا وہ دوکان کے بند ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائے گا۔ یہی وہ کھڑا سوچنے لگا ——

"نہیں، نہیں، دوکان تو بند ہو گئی ہو گی، اب جانے سے کیا حاصل۔ آٹھ دن ہو گئے خدا کو آئے ہوئے، تیسرے کان تک کیا نہیں۔ مگر پھر آنا ایسی جلدی کیا ہے اور پھر اب تو وقت بھی کم ہے۔ آخر کل بھی تو جا سکتا ہے اور پھر گھر پر کوئی ایسا کام بھی تو نہیں ہوتا کہ فرصت ہی نہ ہے۔ اور ہاں اگر آج نہ گئے تو کیا فرق پڑ جائے گا یا کوئی کچہری کی پیشی ہے کہ چوک جائے گی۔ یا کوئی کالج یا اسکول کی حاضری ہے کہ جرمانہ ہونے کا ڈر ہے اور پھر شرنے مجھے بلایا بھی تو نہیں!

وہ رک گیا۔ واپس چلنے کو مڑا۔ لیکن اس کے قدم پھر باندہ کی طرف اٹھ گئے۔ وہ چلتا گیا۔ اپنی دھن میں مست۔ قدم خود بخود بڑھتے گئے۔ باندہ کی سمت۔ اس کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کیا وہ درست راستہ پر گامزن ہے یا بھٹک گیا ہے۔ کون سا چوک کیا ہے کہاں کی سڑک مڑتی ہے۔ اسے کچھ سدھ نہ تھی۔ وہ کھڑا ہو کر پھر سوچنے لگا۔

"اخر دکان پر کوئی نوکر تو ہو گا ہی یا ہو سکتا ہے کہ خود لالہ جی ہی مل جائیں۔ اگر لالہ جی مل گئے تو بات تو مکمل ہو جائے گی"

اس کی نظریں سامنے اٹھیں۔ دکان آگئی تھی لیکن بند تھی۔ کوئی آدمی باہر چبوترے پر بھی نظر نہ آتا تھا۔ یکایک اسے ڈوکر نظر آگیا۔

"لالہ جی چلے گئے کیا؟" اس نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"ہاں بابو۔ وہ تو گئے" ڈوکر نے جواب دیا۔

"کب ——؟"

"بابو جی میں ان کے مکان پر جا رہا ہوں، وہ گھر پر ہی ہوں گے کیا کوئی ضروری کام ہے ——؟"

"ہاں، ہاں، ضروری کام تو ہے ہی" اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر ڈوکر سے مخاطب ہوا۔

"کہاں ہے بھائی لالہ جی کا مکان؟"

"میرے ساتھ چلے چلو بابو، میں ان سے ملوا دوں گا"

"واہ بھائی واہ —— بہت خوب! مجھے بھی ساتھ لیتے چلو۔ لالہ جی گھر پر مل جائیں گے نا؟"

اس نے سوچا خدا کتنا رحیم و کریم ہے۔ دیکھو نا کام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ لالہ جی گھر پر مل جائیں تو خدا بات تو مکمل کر ہو جائے گی۔ دکان پر نہ جانے تک کہاں سے آجاتے ہیں۔ کم بخت بات تک کرنے کی فرصت نہیں دیتے۔ کیا کیا منصوبے دل میں بنا کر لے جاؤ۔ وہاں سب کے سب ریت کے محل کی طرح ڈھے جاتے ہیں کئی مضمون سوچ کر لاتا ہوں سب چوپٹ ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ سب ناول پڑھنے کے شاخسانے ہوتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے فٹوق اتنی بڑھ گئی ہے کہ سینما میں جاؤ تو بیئر۔ بس اسٹینڈ پر جاؤ تو بیئر۔ بازاروں میں تو کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ پرانے بڑ کی طرف کوئی کی نہ پھٹکتا تھا۔ اب ادھر بھی دیکھ لو، کہیں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ چپہ چپہ جگہ پر بیئر ہو تو کوئی حیرانی کی اتنی بات نہیں۔ کتابوں کی دکان پر اتنی بیئر بھاگ کیوں ——؟ اور پھر ناول کی دکانوں پر۔ ناول پڑھنے کا اشتیاق نہ جانے روز بروز کیوں اس قدر بڑھ رہا ہے؟ خیر ہمیں مجھے کیا اعتراض ہے۔ لیکن میرے ناول بھی تو کوئی خریدے اگر یہ سچا کہ میرا بھی ایک ایک ناول خریدیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ؟ کیا میرے ناولوں میں وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو کہ ایک اچھے ناول میں ہونا چاہئے؟ آخر کون سمجھائے ان ناسمجھ عوام کو ——

"اف! کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ میرا ناول کو ہی سمجھا جا سکے کہ خدا کے واسطے میرا بھی ایک ناول

آقا صدیقی مایکانوی

شغل مے نوشی ہے کارِ امتحاں میرے لئے
منتظر محفل میں ہیں قشنہ لباں میرے لئے

اس قدر لطف و کرم اے باغباں میرے لئے
بن گیا صحنِ قفس میں آشیاں میرے لئے

زہر بن جاتی ہیں اکثر عالمِ بے کیف میں
آبشاروں کی ترنم ریزیاں میرے لئے

دل چکا ہے ہر نفس جیسے بھڑکتی آگ میں
ہے گراں کتنا خلوصِ دوستاں میرے لئے

ہے خیالِ دوست اس صورت سے ذہن و فکر میں
چاندنی کا بانکپن بھی ہے گراں میرے لئے

زندگی کو آپ کیوں دیتے ہیں پیغامِ نشاط
زندگی ہے ایک تازہ امتحاں میرے لئے

منزلیں خود پیشوائی کے لئے آجائیں گی
کیوں پریشاں ہے امیرِ کارواں میرے لئے

ختم کاتل مے کدے میں کیوں نہ ہو اپنی نماز
دینے آیا ہے اذاں پیرِ مغاں میرے لئے

غزلیات

آقا جعفری

عروض پر ہی نہیں منحصر مذاقِ سخن
جگر کے خون سے ہوتی ہے شاعری ایجاد

وہی مذاق فسردہ، وہی مزاج کہن
بدل کے دیکھ لیا میں نے زندگی کا چلن

پرست و شوخ نگاہیں، یہ شرمگیں چتون
جیا بھی تو بہ شکن ہے ادا بھی توبہ شکن

سنبھل کے دیکھئے نیرنگیٔ بہارِ چمن
اُلجھ نہ جائے کہیں خارِ شوق میں دامن

ترے خیال کی نیرنگیوں میں گم ہو کر
بدل چکا ہوں میں اکثر نظامِ رنج و محن

تغیراتِ جہاں لیں نہ پھر کوئی کروٹ
نصیب لے تو چلا ہے قفس سے سوئے چمن

بجھا دے بزمِ خرد کا چراغ ناکامی
جگر کے داغ سے کر ظلمتِ جنوں روشن

محمد عبدالقیوم صدیقی مست نج پوری

غزل

رسمِ آہ و فغاں سے بہت دور ہے
اس قدر تیرا بیمار، معذور ہے

روزِ اول سے دنیا کا دستور ہے
ایک مغموم ہے، ایک مسرور ہے

یہ مثل ساری دنیا میں مشہور ہے
آدمی اپنی فطرت سے مجبور ہے

عشق کی جاں فشانی نہ کام آسکی
حسن کی بدگمانی بدستور ہے

روکتا کیوں ہے عشقِ بتاں سے ہمیں
جب کہ واعظ کو بھی خواہشِ حور ہے

کچھ سمجھ میں نہ آیا نظامِ جہاں
کوئی مختار ہے، کوئی مجبور ہے

کوئی عیسیٰ نفس ہو تو پھر ہم کو کیا
آج تک دردِ دل حسبِ دستور ہے

ایک جانب حیا، ایک جانب ادب
کوئی محجوب ہے، کوئی مجبور ہے

کوئی واقف نہیں کیا بتائے کوئی
مست کیا دستِ قدرت کو منظور ہے